تفسیر موضوعی

جلد پنجم

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور

جلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پنجم، ششم

مؤلف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی

مترجم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تنظیم نو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قلب علی سیال

کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

طبع ثانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبہ جدید پریس لاہور

سال اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فروری 2012ء

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ مکمل سیٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے
ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان
کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اوران کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء ومحققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اورافادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کرسکتے ہیں۔آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

ا: اردوخوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء ومحققین کی خدمت میں اسلامی وقرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 5، 6 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔تا کہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جا سکے۔کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جارہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اوراس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اورادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

نوٹ: جلد نمبر 5 کی فہرست تیار ہو رہی ہے۔

فہرست تفسیر موضوعی جلد نمبر 6

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''عصمت''، عقل و قرآن کی روشنی میں

لفظ ''عصمت'' اپنے جملہ مشتقات کے ساتھ قرآن میں تیرہ مرتبہ وارد ہوا ہے۔ یہ لفظ ''ریشہ شناسی'' کے اعتبار سے صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی تمسک و نگاہ داری اور ''ممانعت یعنی روکنا''[۱] قرآن میں بھی یہ لفظ انھی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً افراد باایمان کو اللہ کی رسی کے ساتھ تمسک کا حکم دیتے ہوئے قرآن مجید 'عصمت' کے مادے سے مدد لیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا (آل عمران: ۱۰۳)

''یعنی اللہ کی رسی سے تمسک کرو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔''

اسی طرح عزیز مصر کی بیوی کی دعوت قبول کرنے سے حضرت یوسف کے انکار کا ذکر کرتے ہوئے قرآن اسی لفظ کو استعمال کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ فَاسۡتَعۡصَمَ (یوسف: ۳۲)

''یعنی میں نے اس (یوسف) کو اپنی طرف بلایا لیکن اس (یوسف) نے خودداری سے انکار کر دیا۔''

آپ نے دیکھا کہ پہلی آیت میں ''اعتصام'' سے ''تمسک و نگہداری'' مراد ہے اور دوسری آیت میں امتناع اور روکنا جبکہ دونوں معانی کی بازگشت ایک ہی مادہ کی طرف ہے۔

بعض اوقات لفظ ''عصمت'' سپر یعنی ڈھال کے معنی میں یعنی انسان کو بڑے حوادث سے روکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ لفظ پہاڑ کی بلندی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔[۲]

علیٰ ہذا القیاس لغت عرب میں 'عصام' اس رسی کو کہتے ہیں جس سے حمال اپنے بار کو باندھتے ہیں تا کہ وہ کھلنے، گرنے اور متفرق ہونے سے بچا رہے۔

بہر حال اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ اس لفظ سے مراد اللہ تعالیٰ کے بندگانِ صالح کی ایک جماعت کا نہ صرف ارتکاب گناہ سے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہر غلط کام کی خواہش و ارادہ اور خطا و اشتباہ سے مصئون و محفوظ رہنا ہے۔

---

[۱] مقالیس اللغۃ جلد ۱، ص ۳۳۱

[۲] اوائل المقالات، ص ۱۱۱

بحث کا تاریخی پس منظر

یہودی اپنی ان ناجائز نسبتوں کی بناء پر جو وہ اپنے انبیاء کے بارے میں روا رکھتے ہیں اور عہد نامہ قدیم جن کے ذکر سے بھرا پڑا ہے، عصمت انبیاء کو نہ قبول کرتے اور نہ ہی اس موضوع پر بحث و گفتگو کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی علماء، اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہر گناہ و خطا سے پاک جانتے ہیں، لیکن ان کا یہ اعتقاد اس امر پر مبنی ہے کہ وہ انھیں خود خدا یا تین خداؤں میں سے ایک مانتے ہیں۔ لہٰذا حضرت مسیح کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ انبیاء و اولیائے الٰہی کی عصمت کے متعلق بحث کی بنیاد قرار نہیں پا سکتا۔

اسی اثناء میں تجزیہ نگار مستشرقین مثلاً ''وونالڈسن'' جو ''عقیدۃ الشیعہ'' نامی کتاب کا عیسائی مولف ہے، یا ''گلدزہیر'' یہودی جس نے کتاب ''العقیدہ والشریعۃ'' تالیف کی ہے، نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مسئلہ عصمت کی پہلی بار شیعہ متکلمین نے وضاحت کی ہے، کیونکہ شیعہ علماء نے اپنے پیشواؤں کے مقام اعلیٰ کو ثابت کرنے کے لیے مسئلہ عصمت انبیاء کی اپنے ائمہ کی عصمت کے ثبوت کی خاطر وضاحت و صراحت کی ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے ائمہ کی بطور افرادِ معصوم توصیف کر سکیں۔ [1]

یہ تجزیہ قیاس سے بڑھ کر نہیں۔ مقام افسوس ہے کہ اسلام کی تاریخ اور تاریخ علم کلام اس قسم کے موہومات سے بھری ہوئی ہے اور تجزیہ نگار اس بحث کی اصل کے بارے میں تحقیق کرنے کے بجائے قصہ کہانیوں اور گمان کا سہارا لیتے ہیں جبکہ ہر قسم کے گناہ و خطاء سے مصونیت کے معنی میں عصمت کی حقیقت، عصمت انبیاء سے قطع نظر، قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ قرآن فرشتوں کی ایک جماعت کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے:

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴿۶﴾ (تحریم: ۶)

''(اطراف دوزخ میں) فرشتوں کی ایک سخت گیر جماعت ہے جو ہرگز اس بات سے انکار نہیں کرتے جس کا اللہ تعالیٰ انھیں حکم دیتا ہے اور جس کام کا انھیں حکم ہوتا ہے اس کو بجا لاتے ہیں۔''

گناہ سے ''عصمت'' کی تشریح و مفہوم سے متعلق کوئی بات اس جملہ ''لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یومرون'' سے زیادہ واضح نہیں ہے۔ صدر اسلام کے مسلمانوں نے اس آیہ مبارکہ کی شب و روز تلاوت کر کے عصمت فرشتگان کے مفہوم کو سمجھا ہے اور اس مفہوم کو فرشتوں کے بارے میں ایک مسلمہ بنیاد کی شکل میں قبول کیا ہے۔

یہ آیہ مبارکہ فرشتوں کے ہر قسم کے گناہ سے پاک ہونے کی توصیف کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح خداوند عالم قرآن کی بھی ہر طرح کی خطا و اشتباہ سے پاکیزگی کی تعریف فرماتا ہے اور اس کتاب آسمانی کو ہر قسم کی لغزش سے منزہ قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

---

[1] عقیدۃ الشیعہ، ص ۳۲۸، العقیدہ والشریعہ، ص ۱۸۰

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ (حم السجدہ: ۴۲)

یعنی ''باطل سامنے یا پیچھے سے ہرگز قرآن میں راہ نہیں پاتا۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ (اسراء: ۹)

''یہ قرآن سیدھے اور استوار راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور مومنین کو خوشخبری دیتا ہے۔''

یہ اوصاف اور اسی طرح کے دیگر نظائر جو اللہ تعالیٰ اپنی اس کتاب کے لیے بیان فرماتا ہے، اس کتاب کو خطا واشتباہ سے پاکیزگی کے اعلیٰ ترین مقام (عصمت) پر فائز قرار دیتے ہیں۔

ملائکہ اور قرآن کے بارے میں اس قسم کی آیات مبارکہ کی جانب توجہ کرنے سے مسلمانوں کے قلوب میں ایسے مفہوم کو جنم لینا چاہیے جس کا مستقل تعلق اس کتاب آسمانی سے قائم ہو۔ اسی لیے یہ حقیقت (کسی چیز کا گناہ وخطا سے پاک ہونا) قرآن کے ذریعہ ہی مسلمانوں کے اذہان میں وارد ہوئی ہے۔

عصمت پیغمبر اسلامؐ بزبان قرآن

معلوم ہونا چاہیے کہ عصمت کئی مراحل و مراتب کی حامل ہے جن کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت، ہر قسم کی خطا سے دوری، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخذ وحی میں اشتباہ اور ابلاغ رسالت میں جو آپ کے ذمہ تھا، آپ کی مساعی کا تعلق ہے، یہ سب امور صراحت کے ساتھ آیات قرآنی سے ثابت ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں کوئی باانصاف شخص آپ کی عصمت سے متعلق دلائل سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات مبارکہ سے زیادہ اور روشن وواضح کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (نجم: ۳۔۴)

''وہ اپنی نفسانی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا، بلکہ وحی الٰہی ہی ہے، جس کا اسے القاء ہوتا ہے۔''

یہ آیہ مبارکہ پوری وضاحت کے ساتھ تحقق وتبلیغ وحی میں آنحضرتؐ کی معنونیت اور پیراستگی کی خبر دیتی ہے۔ اسی طرح چند آیات آپ کے قلب وچشم کی ان امور کے بارے میں تصدیق کرتی ہیں جو آپؐ نے معراج کے موقعہ پر ملاحظہ فرمائیں اور واپس آکر بیان کیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ ...... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ (نجم: ۱۱ تا ۱۷)

''جو کچھ آپؐ نے دیکھا، دل نے اس کی تکذیب نہ کی...... آپؐ کی آنکھ نے خطا وطغیان نہیں کیا۔''

ان واضح آیات پر غور کرتے ہوئے جو بعض مراحل عصمت کو بیان کرتی ہیں اور دیگر آیات کی موجودگی میں جو سابقہ انبیاء کی عصمت کے

بارے میں بالعموم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے متعلق بالخصوص وارد ہوئی ہیں، یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ ہم ان دو مستشرق تجزیہ نگاروں، جن میں ایک عیسائی اور دوسرا یہودی ہے، پر انحصار کرلیں اور یہ کہنے لگیں کہ یہ مسئلہ عصمت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں شیعہ علم کلام کے عروج وارتقاء کی پیداوار ہے، بالخصوص جبکہ اس بحث کے سلسلہ کا عہد رسالت سے شروع ہونا خود قرآن سے واضح ہورہا ہے۔

اصول عصمت بزبان امیر المومنین علی

احمد امین جیسے مصر کے بعض مولفین اور اس کی تحلیل فکری کے پیرو یہ ثابت کرنے پر اصرار کرتے ہیں کہ شیعوں نے عدل الٰہی اور عصمت انبیاء سے متعلق بہت سے مسائل گروہ معتزلہ سے حاصل کیے ہیں۔[1] لیکن اس قسم کا تصور ایک خیال خام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان بہت سے عقاید مشترکہ کی بنیاد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات ہیں۔حضرت امیر المومنین نے اپنے خطبات، خطوط اور کلمات قصار میں ایسے بہت سے مسائل کی تشریح فرمائی ہے۔مختلف النوع مسائل میں حضرت کے ارشادات پر غور کرنے سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے۔لہٰذا چند موارد میں اگر معتزلہ شیعوں کے ساتھ اشتراک خیال رکھتے ہیں تو یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے ان حقائق کو مکتب علی سے حاصل کیا ہے۔اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ شیعوں نے اپنے عقائد معتزلہ کے ''واصل بن عطا'' کے قائم کردہ اصول سے اخذ کیے ہیں جو ۸۰ھ میں پیدا اور ۱۳۱ھ میں مرگیا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں مکاتب فکر اپنے عقائد مشترک میں حضرت علی علیہ السلام کے عالمانہ ارشادات کے مرہون منت ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے قطع نظر احمد امین کی گفتگو علماء معتزلہ کی نص کے مقابلہ میں ایک قسم کا اجتہاد ہے کیونکہ یہ حضرات واضح طور پر کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مذہب کو حضرت علی سے منسوب کریں اور اپنی تحریروں میں اپنے نظریات کو آنجناب کے ہاتھ کے پروردہ ثابت کریں۔

'کعبی' جو علمائے اعتزال میں سے ایک ہے، کہتا ہے کہ معتزلہ ایک ایسا اعزاز وافتخار رکھتے ہیں جو دیگر مذاہب کو حاصل نہیں۔وہ اعزاز یہ ہے کہ معتزلہ کے دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں کہ واصل بن عطا نے جو اس مکتب فکر کا بانی ہے، اپنی آراء ونظریات کو پسر علی حضرت محمد حنفیہ اور ان کے فرزند ابو ہاشم سے حاصل کیا، جبکہ حضرت علی نے یہ سب کچھ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیا ہے۔[2] وہ یہ بھی کہتا ہے کہ واصل بن عطاء مدینہ کا رہنے والا تھا۔اس کی پرورش محمد بن علی ابن ابی طالب نے کی اور انھیں سے اس نے علم ودانش حاصل کیا۔

کعبی کہتا ہے کہ واصل بن عطاء مدت تک ابو ہاشم (فرزند جناب محمد حنفیہ) کا ایک ہی مکتب میں ہمدرس رہا۔حضرت محمد حنفیہ کی وفات کے بعد بھی اس نے ان کے فرزند کی مصاحبت ترک نہ کی۔ بہت سے افراد سابقہ کی مشہور باتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جو شخص حضرت محمد ابن علی کے مراتب علم ودانش سے آگاہ ہونا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ ان کی یادگار 'واصل' کو دیکھ لے۔اس کے علاوہ واصل ہی ایسا شخص نہیں ہے جس نے

---

[1] ضحیٰ الاسلام، ج ۳، ص ۲۶۸

[2] رسائل جاحظ، تحقیق عمر ابو النصر، ص ۲۲۸

ابو ہاشم سے علم و دانش میں استفادہ کیا ہو بلکہ عمرو بن عبید نے بھی جو مشائخ معتزلہ سے ہے، ابو ہاشم ہی سے درس حاصل کیا ہے۔[1]

ابن ابی الحدید نے اپنی شرح کے مقدمہ میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے علوم کے بارے میں ایک مبسوط فصل قائم کی ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ امت مسلمہ بہت سے علوم میں حضرت امیر المومنین کی مرہون منت ہے، جو بہت سے علوم وفنون کے موجد ہیں۔علم کلام کے بارے میں گفتو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت مباحث کلامی کے بانی ہیں۔لہٰذا سب علمائے علم کلام کی بازگشت آپ ہی کی طرف ہے۔وہ مزید کہتا ہے کہ معتزلہ، توحید وعدل جن کا شعارِ دینی ہے، تمام فرقہ ہائے اسلامی میں صاحبانِ نظر وفکر وسوچ واقع ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے اصول فکریہ کو ابو ہاشم، فرزند حضرت محمد حنفیہ سے حاصل کیا ہے اور حضرت محمد حنفیہ نے یہ سب کچھ اپنے پدر بزرگوار حضرت علی علیہ السلام سے سیکھا ہے۔

صرف معتزلہ ہی وہ جماعت نہیں جنھوں نے اپنے اصولِ فکریہ کو حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیا ہے، بلکہ فرقہ اشاعرہ بھی جو ابوالحسن علی بن اسماعیل بن ابی بشر سے منسوب ہیں، معتزلہ ہی کے ذریعہ حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتے ہیں۔یہ اس طرح ہے کہ ابوالحسن اشعری قاضی ابوعلی جبائی (متوفی ۳۰۵ھ) کا شاگرد تھا جو خود معتزلہ کے بزرگوں سے ہے۔اس طرح دونوں فرقے حضرت امیر المومنین کو اپنا معلم جانتے ہوئے حضرت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔[2]

معتزلہ کے بزرگوں کے بارے میں ان تصریحات کے بعد بھی کیا احمد امین مصری جو خاندانِ رسالت سے خصوصی دشمنی رکھتا ہے، کے اس اتہام کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ شیعوں نے اپنے عقاید وتعلیمات معتزلہ سے حاصل کیے ہیں؟ احمد امین کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ معتزلہ کے حضرت علی علیہ السلام سے اتصال کا انکار کرے اور خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے دور کے اس روشن فکر طبقہ کو دامن حضرت امیر المومنین سے منقطع و علیحدہ کر دے۔

جاب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے اہل بیت کی عصمت کے مسئلہ کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات میں پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ہم حضرت کے ارشادات میں سے چند ایک بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے خطبہ قاصعہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس طرح توصیف فرماتے ہیں:

ولقد قرن الله به صلى الله عليه وآله من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملئكته يسلك به طريق المكارم و محاسن اخلاق العالم ليله و نهاره[3]

---

[1] فضل الاعتزال، ص ۲۲۶ تا ۲۳۴

[2] شرح حدیدی، ج ۱ ص ۱۷، امالی مرتضیٰ، ج ۱ ص ۱۴۸۔

[3] نہج البلاغۃ، عبدہ خطبہ ۱۸۷ مطبوعہ بیروت

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دودھ بڑھائی کے زمانہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ میں سے بزرگ ترین فرشتہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت وتکمیل کے لیے مامور فرمایا تاکہ وہ شب وروز آپؐ کی بزرگی اور اخلاق حسنہ میں رہبری کرے۔''

اس سے مسلمہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جو شخصیت اللہ تعالیٰ کے بزرگ ترین فرشتہ کے زیر اثر تربیت کے مراحل سے گزرے اس کو ہر قسم کے گناہ ولغزش سے مصون ومحفوظ ہونا چاہیے۔

اسی طرح آل محمد علیہم السلام کے تعارف کے لیے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات ان حضرات مقدس کی ہر گناہ ولغزش کے خلاف عصمت کو روشن وواضح کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت اس طرح ارشاد فرماتے ہیں:

هم عيش العلم، و موت الجهل، يخبر كم حلمهم عن علمهم، و ظاهر هم عن باطنهم و صمتهم عن حكم منطقهم، لا يخالفون الحق ولا يختلفون فيه، هم دعائم الاسلام، وولائج الاعتصام، بهم عاد الحق فى نصابه، و انزاح الباطل عن مقامه، وانقطع لسانه عن منبته، عقلوا الدين عقل وعاية ورعاية لا عقل سماع ورواية۔ [1]

''آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علم ودانش کے لیے سبب حیات اور جہل ونادانی کی موت کا باعث ہیں۔ ان کا حلم تمھیں ان کے علم سے آگاہ کرتا ہے، ان کا ظاہر ان کے باطن سے، ان کا سکوت ان کی حکمت ومنطق سے تمھیں مطلع کرتا ہے۔ وہ نہ کبھی حق کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ ارکان اسلام ہیں، لوگوں کی پناہ گاہ ہیں۔ ان کے ذریعہ حق اپنے حقدار تک پہنچتا ہے اور باطل کیچڑ کٹ جاتی ہے۔ باطل کی زبان جڑ سے نکال دی جاتی ہے۔ انھوں نے دین کا ادراک کیا ہے، ایسا ادراک جو تعمق وعمل سے توأم ہے نہ کہ سننے اور نقل کرنے سے۔''

کون سا جملہ ''ولا يخالفون الحق'' سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ان حضرات اقدس کی عصمت کو ثابت کر سکتا ہے کیونکہ ان تمام مراحل میں ''پیروی حق'' مراد ہے۔ ان مراحل کا تعلق عقیدہ وفکر سے ہو یا بیان وگفتار سے، یا عمل ورفتار سے۔ اس طرح کا ہر شخص معصوم اور گناہ وخطا سے مامون ہوگا۔

---

[1] نہج البلاغہ، عبدہ، خطبہ ۲۳۴

علیٰ ہذا القیاس جملہ "عقلوا الدین عقل وعایۃ ورعایۃ" معارف دینی کے سمجھنے میں ان کی مصونیت کی گواہی دیتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں اپنی حیثیت واقعی کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان اعلیٰ ترین مراحل عصمت پر منطبق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں صاحبانِ ذوق نہج البلاغۃ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔[۱]

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ عصمت کے وسیع ترین معانی خود قرآن واضح کرتا ہے اور اس کے بعد ان کی تشریح حضرت علی علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اس مسئلہ کو شیعوں نے عہد صادقین سے ہرگز اخذ نہیں کیا۔ البتہ ایک بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ ہے کہ مسئلہ عصمت اہلبیت کو امام ہشتم حضرت علی بن موسیٰ رضا کے مجلس مامون الرشید میں ان مباحث و بیانات سے خصوصی واقعیت وحیثیت حاصل ہوئی جو حضرت نے "علی بن جہم" کے سوالات کے جواب میں پیش کیے۔ کیونکہ یہ شخص شدت سے مسئلہ عصمت اہل بیت کا مخالف تھا۔ اس لیے امام علیہ السلام نے عصمت انبیاء سے متعلق اپنے مناظروں میں علل و دلائل وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مخالفین کے دلائل کا جواب دیا۔ آپ کے مناظروں نے اس مسئلہ کو خصوصیت کے ساتھ روشن کیا۔[۲] ہم اس بحث کے آخر میں امام علیہ السلام کے بیانات میں سے چند ایک ہدیہ قارئین کریں گے۔

واقعیت عصمت کا تعارف

اب ہم مسئلہ عصمت کے تاریخی پس منظر سے واقف ہو گئے۔ واضح ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے گناہ و خطا سے محفوظ ہونے کے مدعی خود اللہ کا کلام یعنی قرآن مجید اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے عالمانہ مباحث ہیں۔ مفکرین اسلام نے اس مسئلہ پر ان دونوں عوامل کے زیر سایہ توجہ فرمائی اور بحث و تحقیق کا آغاز کیا ہے۔

اس بحث میں عدالت پسند حضرات نے، وہ معتزلہ ہوں یا شیعہ، مسئلہ کے مثبت پہلو کو اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس مسئلہ کے مخالفین نے اس مسئلہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے نظریات کی تفصیل پیش کی ہے، جن کی تشریح عنقریب پیش کی جائے گی۔

یہ درست ہے کہ مسئلہ عصمت کو علمائے علم الکلام کے مباحث کے ذریعہ پختگی و استحکام حاصل ہوا ہے۔ انہی مباحث سے مسئلہ سے متعلق عقلی و قرآنی دلائل و مراحل کی وضاحت ہوئی ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں امام ہشتم حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے دربار مامون الرشید میں علی بن محمد بن جہم کے ساتھ مذاکرات و مباحث نے اس مسئلہ عصمت کو علم کلام کی تاریخ میں خصوصی طور پر جلا بخشی ہے، بالخصوص اس لیے بھی کہ یہ علی بن محمد بن جہم، خاندانِ علی کے شدید ترین مخالفین میں سے تھا۔ امام علیہ السلام کی پیش کردہ تصریحات سے بہت سی ایسی آیات قرآنی کی وضاحت و تشریح ہو گی جن سے مدد لے کر مخالفین عصمت انبیاء علیہم السلام استدلال کرتے تھے اور اس طرح مسئلہ کے

---

[۱] نہج البلاغۃ، صبحی صالح، خطبہ ۱۸۷ اور نہج البلاغہ عبدہ، خطبہ ۸۳، مطبوعہ بیروت

[۲] بحار الانوار، ج ۱۱ ص ۷۲، ۷۴، ۷۶، ۷۸، ۸۵

مخالفین کا قلع قمع ہو گیا۔

مسئلہ عصمت سے متعلق عقلی و قرآنی دلائل کی شرح سے قبل ہم ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس کا تعلق گناہ وخطا سے عصمت کی حقیقت کی توضیح ہے۔نیز یہ کہ گناہ کے خلاف حضرات معصومین میں عصمت کا مقام کیا ہے؟اس سلسلہ میں مختلف مگر متقارب نظریات پائے جاتے ہیں جن کو ہم ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔البتہ عصمت کی حقیقت بمقابلہ ''خطا ولغزش'' بعد میں پیش کی جائے گی۔

الف: گناہ سے عصمت تقویٰ کا درجہ اعلیٰ ہے

حقیقت عصمت کے بارے میں مختصراً اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ گناہ سے پیراستگی کے مقابل میں عصمت تقویٰ کا بلند ترین درجہ ہے۔ تقویٰ کی کسی ماہیت کا تصور کرلیں، اسے آپ مقام کمال میں عصمت میں موجود پائیں گے۔اگر ہم تقویٰ کو ایک کیفیت باطنی اور حالت نفسانی کے طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، جو انسان کو بہت سے گناہوں سے روکتی ہے، تو چاہیے کہ عصمت کو بھی اسی روشنی میں دیکھیں۔اس کو بھی ایک ایسی باطنی قوت تصور کریں، جو کسی معصوم کو نہ صرف مطلقاً ارتکاب گناہ سے روکتی ہے بلکہ گناہ کے بارے میں سوچنے سے بھی مانع ہے۔یہی وجہ ہے کہ محققین 'عصمت' کی درج ذیل تعریف کرتے ہیں:

قوة تمنع الانسان عن اقتراف المعصية والوقوع في الخطاء [1]

دوسرے لفظوں میں عصمت نفس معصوم میں ایک حالت راسخ یا ایک ملکہ نفسانی کا نام ہے۔یہ ملکہ دیگر ملکات کی طرح ایسے آثار مخصوص رکھتا ہے جو ہرگز اس سے علیحدہ نہیں ہوتے۔آپ اس حالت کو شجاعت، عفت اور سخاوت کی طرح، جن میں سے ہر ایک نفس انسانی میں راسخ و مستقل وجود کے طور پر پایا جاتا ہے اور جو اپنے اثرات کے اظہار کا خواہش مند ہوتا ہے، تصور کر سکتے ہیں۔

جو انسان ذاتی طور پر شجاع و دلیر، سخی و فیاض، عفیف و پاکدامن ہوگا وہ بڑی شدت سے ان صفات کے مخالف اثرات کو اپنے سے دور رکھے گا اور اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ بزدلی وخوف، امساک وبخل اور قبیح وزشت افعال کو اپنی زندگی میں راہ پانے دے۔

عصمت کا لائحہ عمل بھی یہی ہے۔ایک معصوم انسان تقویٰ و پاکدامنی کی اس کامل کیفیت میں جو اس کے نفس وروح میں راسخ واستوار ہو چکی ہوتی ہے، اس درجہ پر پہنچ چکا ہوتا ہے کہ عصیان وتجاوز و گناہ وغلط کاری کو اپنے دائرہ حیات سے دور کر کے اپنے کردار کو گناہ ولغزش سے پاک کر دیتا ہے۔یہ سوال کہ انسان کن عوامل کا مالک ہو کر تقویٰ اور خدا ترسی کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کا نفس شرافت کے ایسے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ کسی عمل بد کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں، ایک الگ بحث کا متقاضی ہے جس کی ہم بعد میں وضاحت کریں گے۔

---

[1] المیزان ج ۲ ص ۱۴۲ مطبوعہ تہران

عصمت نسبی و مطلق

اس مطلب کی وضاحت کے سلسلہ میں ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ عصمت اپنے مطلق و وسیع معانی میں ایک مختصر سی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جو انبیاء وائمہ پر مشتمل ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے افراد 'عصمت نسبی' یعنی صرف چند مخصوص گناہوں سے ہی محفوظ نہیں ہیں۔ اس خصوصیت کے حامل تو بہت سے شریف النفس انسان عام زندگی میں مل جائیں گے۔ یہ شریف النفس لوگ اگرچہ ہر قسم کے گناہ سے محفوظ نہیں ہوتے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گناہوں سے مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ وہ ان مخصوص گناہوں کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ وہ ان گناہوں کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ مثلاً مادرزاد برہنگی کے عالم میں بازار میں گھومنا گناہ کبیرہ ہے۔ ایک شریف انسان نہ صرف یہ کہ ایسا کبھی نہیں کرتا بلکہ وہ ایسا کرنے کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اکثر صاحبانِ عقل اس قسم کے گناہوں کے بارے میں ہرگز نہیں سوچتے جیسا کہ نصف شب کو کسی کے گھر میں مسلح ہو کر ڈاکہ ڈالنا، بے گناہ افراد کو قتل کرنا، خودکشی کرنا وغیرہ۔ ان گناہوں سے شریف النفس لوگ فطرتاً محفوظ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک ایسی کیفیت باطنی کے مالک ہوتے ہیں جو اس قسم کے گناہوں کے ذمہ دار عوامل کو ان کے دائرہ ذہن میں اس قدر مذموم اور قابل نفرت قرار دیتی ہے کہ ان کا وہم و خیال بھی ان کے قلب کے قریب نہیں آنے پاتا۔

'عصمت نسبی' کے تصور کو سمجھنے کے بعد، جو اکثر افراد میں بعض گناہوں کے متعلق وجود رکھتی ہے، عصمت مطلقہ کی ماہیت کو بھی، جس کا تعلق وسعت کے ساتھ ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرنا ہے، سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ 'عصمت مطلقہ' ایک قوت باطنی و حالت نفسانی ہے، ایک قسم کا تقویٰ و اندرونی استقامت ہے، جو معصومین کو نہ صرف ارتکاب گناہ سے بلکہ اس کے تصور سے بھی رو کے رکھتی ہے۔ اگر یہ کیفیت ان سے چھین لی جائے تو پھر وہ عام انسانوں کی مانند ہو جائیں گے جو صرف عصمت نسبی کے حامل ہوں گے، عصمت مطلقہ کے نہیں۔

ب: عصمت، عواقب گناہ کے علم کا نتیجہ

بعض محققین کا نظریہ ہے کہ 'عصمت' عواقب و انجام گناہ سے متعلق علم معصوم کا نتیجہ ہے۔ معصوم کا علم و شعور آثارِ گناہ کے بارے میں اس قدر قوی ہوتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دیگر قوائے انسانی سے مغلوب نہیں ہوتے، بلکہ تمام قویٰ پر ہمیشہ حاوی رہتے ہیں۔[1]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

''شکست ناپذیر علم سے مراد لوازم گناہ کا علم ہی ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ لوازم گناہ کا ہر قسم کا علم مصونیت کا

---

[1] المیزان، ج ۲، ص ۸۲

باعث نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں علم کی واقعہ نمائی کو اس قدر قوی و شدید ہونا چاہیے کہ آثارِ گناہ علم کے سامنے مجسم دکھائی دیں حتیٰ کہ دیدہ دل انھیں اپنے سامنے موجود و محقق پائے۔ یہ وہ منزل ہوگی جہاں صدورِ گناہ ایک محال عادی کی صورت اختیار کر لے گا۔''

یہ نظریہ ہمارے سابقہ بیان کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ دوسرا نظریہ نظریۂ اول کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ خوف الٰہی کی کیفیت مطلقہ، یا بالفاظ دیگر تقویٰ کا مقام اعلیٰ لوازم و نتائج عصیاں کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معصوم بندۂ خدا لوازم و نتائج عصیاں کے بارے میں خلل ناپذیر آگہی کے زیر اثر اس طرح اور اک گناہ کر سکتا ہے گویا اس نے گناہ کے خلاف بیمہ کر لیا ہو۔ پھر وہ اس عالم حیات ہی میں اہل جنت کے درجات، اہل دوزخ کے درکات اور آتش جہنم کی تپش کو اس طرح محسوس کرتا ہے کہ اس کی روح میں ہر قسم کے عوامل گناہ دب کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ درحقیقت اس آیہ مبارکہ کا مصداق بن جاتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ (التكاثر: ٦-٥)

''یعنی ایسا ہرگز نہیں، اگر تمھیں علم الیقین حاصل ہو جائے تو تم جہنم کو دیکھ لو۔''

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ علم الیقین کے زیر سایہ اسی دنیا سے دوزخ کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ لہٰذا ایسے واضح و قاطع علم کا حامل ہرگز آلودۂ گردِ گناہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جس کے زیر اثر علامہ طباطبائی نے عصمت کو بندۂ معصوم کے علم قطعی میں منحصر جانا ہے۔ علم قطعی کی یہی صنف معصوم کے تقوائے اعلیٰ کی پیدائش کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح مندرجہ بالا دونوں نظریات مکمل طور پر ہر لحاظ سے باہم آہنگ ہیں۔

ج: 'عصمت' جمال وعظمت حق تعالیٰ کی علت معرفت ہے

یہاں ایک تیسرا نظریہ سامنے آتا ہے، جس کے تحت عصمت کسی انسان کے لیے مقام ربوبیت کی معرفت کاملہ کا سبب بن جاتی ہے۔ پھر اس نظریہ کے مطابق بندۂ معصوم مراتب معرفت میں بلند ہو کر حق تعالیٰ کے جمال و کمال پر اس قدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ وہ پھر کبھی بھی اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے خلاف قدم نہیں اٹھانے دیتا۔ معبود حقیقی سے انسان کا عشق و تعلق، خالق کے جمال و جلال کا ادراک، انسان کے حق میں اس کے خالق کی طرف سے نعمت ہائے بے پایاں کا ادراک و آگہی، روح انسانی میں اس قدر خضوع و فروتنی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ ارتکاب گناہ تو ایک طرف گناہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ مقام معرفت پروردگار جس قدر بلند ہوگا مراتب عصمت بھی اسی نسبت سے بلند ہوتے جائیں گے۔ لہٰذا اس کمال مطلق کا حامل ہی اپنے عشق پاک و سوز اس کی موجودگی میں یہ معروف جملہ کہہ سکتا ہے:

ما عبدتك خوفا من نارك ولا طمعا فى جنتك بل و جدتك اهلا للعبادة

[۱]

''یعنی میں تیری عبادت تیرے جہنم کی آگ کے خوف سے یا تیری جنت کے لالچ میں نہیں کرتا بلکہ تجھے لائق عبادت جان کر تیری عبادت کرتا ہوں۔''

لہٰذا ہم عصمت کو معصوم کے کمال نفسانی و روحانی کا سبب جانیں۔ معصوم کے علم شکست ناپذیر کا نتیجہ سمجھیں، یا معصوم کی معرفت کامل کا اثر قرار دیں، ہر حالت میں عصمت کی واقعیت اولیائے الٰہی اور ان کی ذوات مقدسہ و بلند کی کیفیات باطنی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ لیکن روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ عامل عصمت ایک امر خارجی ہے جس کو ''روح القدس'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ عامل ہے جو اولیائے خدا کو انجام گناہ و ارتکاب خطا سے روکتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس عامل کے بارے میں بحث کی جائے۔

د: کیا روح القدس معصوم کے لیے مانع گناہ ہے؟

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گفتار و کردار میں استقامت و استقلال مہیا کرنے والا ایک عامل خارجی ہے جس کو ''روح القدس'' کا نام دیا جاتا ہے۔ محدث بزرگ شیعہ کلینی مرحوم نے اپنی کتاب ''حجت'' میں ایک باب قائم کیا ہے۔ یعنی ''وہ روح جو ائمہ کو لغزش سے محفوظ رکھتی ہے۔'' مضمون روایات بظاہر اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ ''روح'' جبرئیل سے بھی زیادہ قوی و طاقتور ہے۔ یہ فرشتہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد یہ ائمہ علیہم السلام کے ساتھ رہا۔ آنحضرت کے قول و فعل کی صحت و استواری اسی ''روح'' کے وجود کے زیر سایہ ہے۔ [۲]

مذکورہ بالا باب کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عامل عصمت ایک عامل خارجی ہے جس کا نام روح ہے۔ یہ عامل حضرت پیغمبرؐ کے ساتھ تھا اور آنحضرتؐ کے بعد ائمہ کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن دوسری روایات ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ''روح'' ان کی ذات و شخصیت سے الگ کوئی چیز نہیں۔ [۳] بلکہ یہ ایک قسم کا کمال نفسانی ہے جو ان کی ذات میں وجود پاتا ہے کیونکہ امام علیہ السلام نے آیہ مبارکہ ''السابقون السابقون اولئک المقربون'' کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ سابقون سے مراد اللہ کے رسول اور اس کے مخصوص بندے ہیں جو ذیل میں وضاحت شدہ پانچ ارواح کے حامل ہوتے ہیں اور انہی ارواح کے ذریعہ یہ حضرات محفوظ ہوتے ہیں:

''جعل فیهم خمسة ارواح: ۱: ایدهم بروح القدس فبه عرفوا الاشیاء

---

[۱] حدیث منسوب بہ امیر المومنین علی علیہ السلام۔ غوالی اللئالی، جلد ۱ ص ۴۰۴

[۲] کافی جلد ۱، کتاب حجت، الروح التی یسدد اللہ بہ الائمہ (علیہم السلام) ص ۲۷۳

[۳] باب ذکر الروح التی فی الامۃ (علیہم السلام) ص ۲۷۱

۲: وایدھم بروح الایمان فبه خافوا الله عزوجل

۳: وایدھم بروح القوۃ فبه قدروا علی طاعة الله

۴: وایدھم بروح الشھوۃ فبه اشتھوا طاعة الله عزوجل و کرھوا معصیته

۵: وجعل فیھم روح المدرج الذی به یذھب الناس وبجیؤون"۔ [1]

ان کو یہ پانچ ارواح عطا ہوتی ہیں:

۱: خدا نے ان کی روح القدس کے ذریعہ تائید فرمائی، جس کے ذریعہ وہ اشیاء کو پہچانتے ہیں۔

۲: ان کی روح ایمان سے تائید کی جس کے زیر سایہ وہ خدائے عزوجل کی مخالفت سے خوف کھاتے ہیں۔

۳: روح قوت وقدرت سے ان کی مدد کی جس سے وہ خداوند تعالیٰ کی اطاعت کے لیے قوت حاصل کرتے ہیں۔

۴: انھیں اطاعت خدائے عزوجل کی محبت کی روح عطا فرمائی جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے اور اس کی نافرمانی کو مکروہ جانتے ہیں۔

۵: انھیں تلاش وسعی کی روح مرحمت فرمائی جس کے سایہ میں وہ حرکت اور آمد ورفت کرتے ہیں۔

اس امر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری چار ارواح ذات نبوی کی شخصیت سے خارج نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ روح القدس بھی ایک کمال نفسی کے سوا، جو حضرت پیغمبر اکرمؐ کی تمام مواقع پر مدد کرتی اور انھیں گناہ ولغزش سے روکتی ہے اور کوئی چیز نہیں۔ اسی لیے ''ملا صالح ماژندرانی'' جیسے شارحین کتاب کافی [2] نے احتمال پیش کیا ہے کہ ان احادیث میں ''ارواح'' سے ان حضرات اقدس کے ''نفوس کاملہ'' ہی مراد ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی گفتگو کی تائید میں صدوق کا ایک جملہ نقل فرماتے ہیں۔

اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام جابر بن عبداللہ انصاری سے فرماتے ہیں:

"یا جابر ان فی الانبیاء و الاوصیاء خمسة ارواح: "روح القدس" وروح الایمان و "روح الحیاۃ" و "روح القوۃ" و "روح الشھوۃ" فبروح القدس

[1] کافی، ج۱ ص ۲۷۲ مطبوعہ دار الکتب اسلامیہ

[2] تعلیقات ملا صالح بر اصول کافی، ص ۱۳۶، مطبوعہ سنگی

یا جابر عرفوا ماتحت العرش الی ماتحت الثری ثم قال: ان هذه الاربعة ارواح یصیبها الحدثان الا روح القدس فانها لا تلهوا ولا تلعب۔"[1]

''اے جابر! انبیاء اور ان کے جانشینوں (اوصیاء) میں پانچ ارواح ہوتی ہیں، جو روح القدس، روح الایمان، روح الحیات، روح القوت اور روح الشہوت سے عبارت ہوتی ہیں۔ روح القدس کے زیر سایہ وہ ان تمام باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں جو عرش اور تحت الثریٰ کے درمیان واقع ہوتی ہیں۔ یہ سب ارواح سوائے ''روح القدس'' کے خلل و آسیب سے دوچار ہوتی رہتی ہیں جب کہ ''روح القدس'' کبھی اشتباہ و لغزش کا شکار نہیں ہوتی۔''

علامہ مجلسی مرحوم نے ان پانچ ارواح کے بارے میں نہایت عمدہ تصریح فرمائی ہے جسے ہم ہدیہ قارئین کرتے ہیں:

''ہوسکتا ہے ہم کہیں کہ یہ پانچوں ارواح انبیاء و اولیاء کے مراتب نفس ناطقہ سے ہوں۔ جس وقت ان کا نفس احکام الٰہی کی پیروی میں عمل و فعل کے اعتبار سے منزل مطالعہ میں ہو تو وہ پانچ مراتب میں تقسیم ہو جاتا ہے، جس طرح علم و دانش کے اعتبار سے یہ چار مراتب یعنی عقل ہیولاتی، عقل بالملکۃ، عقل بالفعل اور عقل مستفاد میں تقسیم ہوتا ہے۔ احتمال یہ ہے کہ روح ایمان اور روح القدس نفس ناطقہ کے مراتب سے ہوں اور دیگر تین ارواح روح حیوانی کے مراتب سے ہوں۔''

اسی طرح یہ احتمال بھی ہے کہ ''روح القدس'' کے علاوہ باقی سب کی سب نفس ناطقہ کے مراتب سے ہوں جبکہ ''روح القدس'' ایک الگ مخلوق اور خداوند تعالیٰ کا ایک عظیم فرشتہ ہو۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''روح القدس'' سے نفس ناطقہ انسانی ہی مراد ہو، اس شرط کے ساتھ کہ یہ نفس ناطقہ لیاقت و شائستگی کے اعتبار سے اس مرتبہ پر ہو کہ معصوم کی روح القدس خارجی سے باطن کا رابطہ قائم رکھے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم عام افراد میں نفس ناطقہ کو عقل مستفاد کا نام دیتے ہیں، جب یہ نفس ناطقہ اس مقام پر پہنچ جائے جہاں یہ عقل بالفعل کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھ سکے، اس کے ساتھ متحد ہو جائے اور اس سے علم حاصل کرے۔[2]

---

[1] کافی جلد ۱، ص ۲۷۲، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

[2] مراۃ العقول ج ۳، ص ۱۶۶

ان احادیث میں دقت نظر اور غور و خوض سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ پانچوں ارواح نفس نبوی کے مختلف مراتب ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی دعوت و مدعا رکھتی ہے۔ایسا نہیں کہ معصومین میں یہ پانچ ارواح الگ الگ پائی جاتی ہوں۔اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ''روح القدس'' ذاتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک الگ روح ہے تو پھر اس میں کوئی شک نہ رہے گا کہ دوسری ارواح ان کی ذات وشخصیت سے الگ کوئی چیز نہیں اور ''روح القدس'' انہی ارواح کی تائید کرتی ہے جو معصومین کی بنیاد عصمت کی تشکیل کرتی ہیں۔

عصمت از خطاء

یہ تینوں تفاسیر جو عصمت کے بارے میں معرض بحث میں آئی ہیں، سب غلط کاری و گناہ کے لحاظ سے عصمت کی تفسیر پیش کرتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ گناہ سے اجتناب و پاکیزگی کے مورد میں عصمت وتحفظ از گناہ انسان کے ملکات نفسانی میں کمال نفسانی اور ایک حالت استقامت کو پیش کرتی ہیں۔ یہ انسان کی صفات شجاعت وعفت کی مانند ہیں، جو اپنی ضد کو اپنے دائرہ عمل سے دور رکھتی ہیں۔لیکن خطاء واشتباہ کے موارد میں، خواہ وہ امورِ شرعی میں ہو یا عادی وعمومی میں، ایک فکر مختلف کی ضرورت ہے، کیونکہ اس قسم کے تجزیہ کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ عصمت اولیائے الٰہی کی گناہ 'عمد' کے سلسلہ میں تفسیر ہو۔ یہ تجزیہ ہرگز ان سے سہواً یا غیر عمداً ارتکاب لغزش کے خلاف توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انتہائے تقویٰ، نفس کی گناہ سے بیزاری یا عظمت خالق سے آگہی اسی صورت میں گناہ کے مانع قرار دیئے جاسکتے ہیں جب انسان اپنے عمل کی نوعیت اور اس کے قبح و برائی سے آگاہ ہو، درآنحالیکہ مفروضہ یہ ہے کہ کسی عمل کی صورت واقعی اس کے فاعل کو مورد توجہ نہیں ہوتی، انسان اپنے فعل کے زشت وقبح سے آگاہ نہیں ہوتا، حقیقت شے پر کسی اور پہلو سے غور کرتا ہے۔لہٰذا لازم ہے کہ خطا سے عصمت کے لیے واقعیت کی نوعیت کچھ اور ہونا چاہیے تا کہ معصوم سہوی وخطا کارانہ لغزشوں سے محفوظ رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم عصمت سے متعلق کسی مختلف پہلو سے غور کریں اور اقرار کریں کہ بندۂ معصوم لطف پروردگار کے سایہ میں علم غفلت ناپذیر کا حامل ہوتا ہے جس کے باعث اشیاء کی صورت واقعی کبھی بھی اس کی قلمروئے فکر سے باہر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا شعور وادراک کبھی خطا کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ان معنی میں عصمت کی بنیاد کسی معصوم کے کائنات اور اس کے لوازمات کے بارے میں وسیع و پختہ علم پر ہوتی ہے جس میں کسی قسم کی غفلت یا شک وشبہ اس کی طرف راہ نہیں پاتے، لہٰذا کسی فعل کی اصلیت اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔

روح القدس، ذریعۂ معصومیت

جس طرح وسیع وغیر مغلوب علم کی مدد سے گناہ سے محفوظ رہنے کے دلائل مہیا کیے جاسکتے ہیں اسی طرح ''روح القدس'' کی رہبری و روشنی میں بھی اس کی تفسیر ممکن ہے۔ یہی نہیں بلکہ سابق میں بیان کردہ احادیث کو بھی ''عصمت'' کے اس پہلو سے مربوط کر سکتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ امام اس بارے میں فرماتے ہیں ''فبه عرفوا الاشياء'' یعنی اس کے ذریعہ انھوں نے اشیاء کو پہچانا۔

''روح القدس'' کے ذریعہ تائید معصومین علیہم السلام کسی طرح بھی سابق میں پیش کردہ نظریہ سے اختلاف نہیں رکھتی، بلکہ دونوں

نظریات باہم کامل طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔علم استوار و غیر مغلوب کے لیے علت و جہت کا ہونا لازم ہے۔لہٰذا ممکن ہے کہ ''روح القدس'' کا محیط عمل قلب اولیاء پر مخفی طور سے پردہ کے پیچھے سے، ان کے احاطہ علم میں حقائق و امور کلیہ سے واقفیت کا موجب بنتا ہو۔

اشاعرہ و حقیقت عصمت

یہاں کتاب و سنت اور عقل کے نظریات کے تحت حقیقت عصمت کی وضاحت اختتام کو پہنچی۔لیکن اشاعرہ کی جماعت اس نظریہ کی وضاحت کے سلسلہ میں اپنا ایک الگ مکتب فکر رکھتی ہیں جس کا ہم کسی حد تک سطور ذیل میں ذکر کریں گے۔

تفتازانی عقائد نسفیہ [۱] کی شرح میں اس طرح رقمطراز ہے:

"العصمة ان لا يخلق الله تعالى الذنب فی العبد مع بقاء قدرته و اختياره۔"

''عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی زندگی میں گناہ کو خلق نہ فرمائے جبکہ بندہ کی قدرت و اختیار گناہ کے بارے میں باقی رہے۔''

اس طرح کی تفسیر 'توحید در خالقیت' کی ناتجربہ کار تفسیر کا نتیجہ ہے۔اس کا خیال ہے کہ خلقت و آفرینش کے ذات خدا میں منحصر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی خلقت، عام اس سے کہ مستقل ہو یا غیر مستقل، مخصوص بہ خدا تعالیٰ ہے۔ بندگانِ خدا فعل خدا یا اس کے ترک کے مظاہر ہیں جبکہ وہ کسی کام کے ترک و اقدام میں ذاتی طور پر معمولی سا اثر بھی نہیں رکھتے۔لہٰذا وہ کہتا ہے کہ عصمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی زندگی میں گناہ کو خلق ہی نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اگر قرآن کی آیات اور خاندانِ رسالت (اہلبیت) کی احادیث میں غور کرتے تو اس تخیل کے علاوہ کوئی دوسرا طرز فکر اختیار کرتے۔ہم اپنی دیگر تالیفات [۲] میں ذکر کر چکے ہیں کہ توحید در خالقیت کے یہ معنی نہیں کہ صفحۂ ہستی میں خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی مستقل یا غیر مستقل فاعل وجود ہی نہیں رکھتا، نہ ہی بندگانِ خدا اپنے افعال کے خالق ہیں اور سب کے سب خدا ہی کی بلا واسطہ تخلیق ہیں۔ بلکہ توحید کی اس نوعیت کے معنی اصلاتی اور استقلالی خالقیت کا ذات خدا میں منحصر ہونا ہے۔ایسا ہرگز نہیں کہ ہر قسم کی تخلیق، حتیٰ کہ تبعی و غیر استقلالی بھی، بلکہ تخلیق تبعی کے سب افراد، اللہ کی طاقت و قدرت کے سایہ میں واقع ہوتے ہیں۔

سابقہ تعریف کی اصلاح کی صورت میں اس طرح کہنا ہوگا کہ عصمت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کا بندہ اپنی زندگی میں مرتکب گناہ نہ ہو۔ یہ

---

[۱] شرح عقائد نفسیہ، طبع آستانہ، ص ۱۸۵۔ اس کتاب کا متن نجم الدین ابی حفص عمر بن محمد نسفی متوفی ۵۳۷ھ کی تالیف ہے جبکہ اس کی شرح سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ نے کی ہے۔متن و شرح دونوں سابق میں اہل تسنن کے حوزہ ہائے علمی میں شامل درس تھی۔

[۲] دائمی منشور جلد ۲

نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی زندگی میں کسی طرح کے گناہ کو خلق ہی نہ کرے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مصلح الدین کستلی (متوفی ۹۰۱ھ) نے عقائد نسفیہ کی شرح پر اپنے حواشی میں عصمت کی اپنی بہترین تعریف کو حضرات اہل سنت کے عقائد کی مخالفت میں قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے:

"واما تفسیر ھا بملکة تمنع عن الفجور فھولا یستقیم علی اصول اھل السنة"۔

''یعنی عصمت کی تعریف، ایسے ملکۂ کمال کے ساتھ، جو معصوم کو ارتکاب گناہ سے باز رکھے، اصول اہل سنت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔'' [۱]

یہاں اہل سنت سے مراد اشاعرہ ہیں جو ظواہر کتاب وسنت میں جمود کے عقیدہ کے لیے مشہور ہیں۔ یہ حضرات ہرگز ان دو منابع کے مضامین میں تجزیہ و تحلیل اور غور و فکر کی اجازت نہیں دیتے۔

یہ مکتب فکر اسی جمود کی بنا پر بعض مسائل کو مسلمانوں کے عقاید کا حصہ جانتے ہیں، جس کو نہ تو عقل ہی تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی منطق قرآن میں فکر عمیق ہی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے کتاب ''مقالات الاسلامیین'' میں اہل حدیث و اہل سنت حضرات کے عقاید کو بیان کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے تفتازانی کی عصمت کی تعریف میں کسی طرح کا ابہام باقی نہیں رہتا کیونکہ یہ ایک مخصوص مکتب فکر ہے جس سے طبعاً ایسے ہی نتائج کے برآمد ہونے کی توقع ہوسکتی ہے۔ اس مکتب فکر کا ادعا یہ ہے:

"ان سیئات العباد یخلقھا اللہ"

''بندوں کے افعال بد کو خود خدا ہی خلق فرماتا ہے۔''

پھر کہتا ہے:

"ان اللہ سبحانہ تنزل الی السماء الدنیا فیقول ھل من مستغفر"۔

''اللہ سبحانہ تعالیٰ دنیا کے آسمان پر اترتا اور پوچھتا ہے کہ کیا کوئی بخشش طلب کرنے والا ہے؟''

یا یہ کہتا ہے:

"والجمعة والجماعة خلف کل بر وفاجر"۔

---

[۱] حواشی شرح عقاید نفسیہ، ص ۱۸۴

یعنی ''نماز جمعہ و جماعت ہر نیک یا بدکردار انسان کے پیچھے پڑھی جاسکتی ہے۔''

"ویرون الدعاء لائمة المسلمین بالصلاح والا یخرجوا علیھم بالسیف"

یعنی ''مسلمانوں کے پیشواؤں کے لیے دعائے خیر واجب ہے۔ اگر امراء فاسد بھی ہو جائیں تو انکے خلاف قوت وطاقت سے ہرگز بغاوت نہ کرنا چاہیے۔''[1]

ایسے مکتب فکر یا ایسے عقائد وآراء سے اس تعریف کے سوا اور کوئی بات نہیں نکلتی کہ انبیاء و اولیاء کی سنت کو تقویٰ و پاکیزگی کے حصول کی خاطر بے سوچے سمجھے اختیار کر لیا جائے۔

عصمت، عنایت وہبی یا امر اکتسابی؟

اب ہم ایک حد تک حقیقت و واقعیت عصمت سے واقف ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عصمت نفس و روح معصوم میں ایک مقام واقعی رکھتی ہے جس کا اپنا ایک مخصوص اثر ہے۔ اس سلسلہ میں منشائے عصمت کے تینوں نظریات میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ ہم عصمت کو ''تقوائے بلند'' کے مقولہ سے سمجھیں، اس کو 'علم شکست ناپذیر'' اور کشش ہائے باطنی کے مقاوم کے طور پر قرار دیں یا اس کو خدا تعالیٰ کی ''شناخت کامل'' کا مقام جانیں، ہر حالت میں 'عصمت' ایک کمال نفسانی قرار پاتی ہے جو اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے۔

اس بحث کے بعد عصمت کے مسئلہ 'وہبی' یا 'اکتسابی' کی بحث سامنے آتی ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عصمت لطف پروردگار ہے یا کوئی ایسی چیز ہے جس کو ہر انسان حاصل کر کے اپنے آپ کو اس سے مزین کر سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'عدالت' اور مراتب تقویٰ کا کچھ حصہ امور اکتسابی ہیں جن کو آزادی فکر کا حامل انسان شہوت اور نفس امارہ کی غلامی پر قابو پا کر حاصل کر سکتا ہے اور ان کیفیات سے اپنے آپ کو آراستہ کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تقویٰ کا مقام بلند یا علم شکست ناپذیر کے ذریعہ حصول مرتبہ کامل، عام اس سے کہ عواقب گناہ کا علم ہو یا عبادت و ریاضت کے سایہ میں خالق کائنات کی عظمت و کمال کا ادراک ہو، قابل اکتساب ہے یا نہیں؟

علمائے علم کلام نے عصمت کو عنایت الٰہی (وہبی) جانا ہے جس کا اقدار و شائستگی کی موجودگی میں کسی بندۂ معصوم پر فیضان ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ہرگز قابل تحصیل و اکتساب نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں عصمت لطف الٰہی ہے جو خاص شرائط کے تحت بندگان معصوم کو عطا ہوتی ہے۔ بہتر آگہی کی خاطر ہم علمائے اسلام کی نصوص کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں:

---

[1] مقالات الاسلامیین ص ۳۲۳، تحقیق محی الدین محمد عبدالحمید

"العصمة تفضل من الله تعالیٰ علی من علم انه یتمسك بعصمته"[1]

''عصمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک تفضّل ہے، اس شخص کے لیے جو اس کی عصمت سے تمسک کا متلاشی ہو۔''

پھر استاد علم کلام شیعہ کتاب ''اوائل المقالات'' کے ملحقات میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''عصمت توفیق الٰہی ہے جس کی مدد سے انسان جملہ مکروہات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطائے عصمت ایک ڈوبنے والے شخص کو رسی پکڑانے کی مثال ہے کہ جب وہ رسی پکڑ لیتا ہے تو ڈوبنے سے نجات پا لیتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کسی ایسی چیز کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور اسے پکڑ لیتا ہے تو اسی کو عصمت کہا جاتا ہے۔ ایسی کیفیت کے علاوہ کوئی حامل عصمت نہیں ہوتا۔''[2]

صرف شیخ مفیدؒ ہی وہ بزرگ نہیں جو عصمت کو موہبت الٰہی (وہبی) جانتے ہیں بلکہ ان کے بزرگ شاگرد سید مرتضیٰؒ بھی اس کو لطف الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

العصمة هی لطف الله الذی یفعله تعالی فیختار العبد عنده الامتناع عن فعل القبیح۔[3]

''یعنی عصمت ایک لطف الٰہی ہے۔ جب وہ کسی بندہ کو عنایت ہوتی ہے تو وہ ترک قبیح کی جانب بڑھنے کا انتخاب کرتا ہے۔''

دو حضرات متکلم، محقق شیعہ: علامہ حلی اور فاضل مقداد، عصمت کے وہبی ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔ اول الذکر اپنی کتاب 'کشف المراد' میں اسے لطف الٰہی قرار دیتے ہیں، جو خداوند تعالیٰ کی عنایت ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے بھی ترک واجب اور ارتکاب گناہ پر کوئی داعی پیدا نہیں کرتا۔ پھر اس لطف کے چار اسباب کا تعارف کرایا ہے۔[4]

موخر الذکر کتاب 'اللوامع الالٰہیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] تصحیح الاعتقاد، ص ۶۱

[2] ملحقات اوائل المقالات، ص ۱۱۱

[3] تکملہ امالی المرتضی، ج ۲، ص ۳۴۷

[4] کشف المراد طبع صیدا، ص ۲۲۸

''عصمت لطف الٰہی ہے جس کی موجودگی میں صدورِ معصیت، دائمی گناہ نہ ہونے کی بناء پر ممتنع ہوجاتا ہے لیکن اس صورت میں بھی انسان کے گناہ کرنے کی قوت محفوظ ہوجاتی ہے۔''

اس کے بعد وہ اشاعرہ کے عقیدہ کو نقل کرتے ہیں کہ ان کے نظریہ کے مطابق عصمت کے معنی ''اطاعت پر قدرت اور گناہ سے ناتوانی'' ہیں۔[1]

اس کے بعد وہ بعض علماء سے نقل کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ معصوم وہ ہے جس کی فطرت کو خداوند عالم نے صاف، مٹی کو پاکیزہ اور جس کے مزاج کو قبول کمال کے قابل خلق فرمایا ہے۔ پھر اس کو عقل قوی اور فکر صحیح عطا فرما کر مزید الطاف سے نوازا۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی ان مہربانیوں کے زیر سایہ واجبات کی انجام دہی اور ترک محرمات پر قادر ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ ملکوت آسمانی کی طرف مستقل طور پر متوجہ اور عالم مادی کے لوازمات سے روگردان رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کا نفس امارہ اس کے نفس ناطقہ سے مغلوب رہتا ہے۔

یہ تمام مباحث اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ علماء شیعہ عصمت کے ایک ''قدر وہبی'' ہونے پر متفق ہیں۔ اشاعرہ کی فکر کے مطابق ہم عصمت کی تعریف سے اس حد تک اتفاق کرتے ہیں کہ یہ ایک امر وہبی ہے لیکن ان کا یہ عندیہ کہ عصمت قدرت گناہ ہی کو سلب کردیتی ہے، ایک بے بنیاد دلیل کا مقام رکھتا ہے۔ ہم آئندہ سطور میں اس مسئلہ پر مزید بحث و گفتگو کریں گے۔

استاد علامہ طباطبائی 'عصمت' کو ایک ایسا علم شکست ناپذیر قرار دیتے ہیں جو کسی معصوم کو عطا ہوتا ہے۔[2] اس سلسلہ میں بعض آیات قرآن 'عصمت' کے وہبی ہونے کی کسی حد تک تائید کرتی ہیں۔

سورہ مبارکہ 'ص' میں حضرات ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد ان کی اس طرح توصیف بیان کی گئی ہے۔

وَاِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِؕ‏ ﴿۴۷﴾ (ص:۴۷)

''یہ سب ہمارے برگزیدہ اور نیک بندوں میں سے ہیں۔''

اسی طرح قرآن بنی اسرائیل کے بارے میں (اس سے مراد ان کے انبیاء ہیں، جملہ افراد نہیں) اس طرح ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدِ اخۡتَرۡنٰهُمۡ عَلٰى عِلۡمٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَۚ‏ ﴿۳۲﴾ (دخان: ۳۲)

''ان کو علم و آگہی کی بنا پر ہم نے عالمین سے انتخاب کیا۔''

قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت کے بارے میں فرماتا ہے:

اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًاۚ‏ ﴿۳۳﴾

---

[1] اللوامع الالٰہیہ، ص ۱۶۹

[2] المیزان، ج ۵، ص ۸۱

(احزاب: ۳۳)

"اللہ کا ارادہ ہے کہ پلید گیوں کو تم اہل بیت سے دور رکھے اور تمھیں پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔"

یہ بات مسلمہ طور پر واضح ہے کہ ہر قسم کے رجس وگناہ سے دوری عطائے 'عصمت' کے سایہ کے بغیر ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں بہت سی اور آیات بھی ہیں جو قرآن سے آشنا حضرات سے مخفی و پوشیدہ نہیں۔ یہ آیات سب کی سب عصمت کے ایک قدر وہبی ہونے پر گواہ ہیں، بالخصوص آیہ تطہیر جو رجس وگناہ سے پاک ہونے کو ارادہ حق تعالیٰ قرار دیتی ہے جس سے ارادۂ تکوینی مراد ہے، نہ کہ تشریعی کیونکہ حق تعالیٰ کا ارادۂ تشریعی تمام افراد انسانی سے متعلق ہے اور خدا ہر انسان سے چاہتا ہے کہ راہ اطاعت اختیار کرے۔[1]

اس امر میں کہ علمائے علم کلام اور ظواہر آیات قرآن 'عصمت' کے وہبی ہونے کی تائید کرتے ہیں، دو سوال سامنے آتے ہیں۔

دو سوالوں کی تفصیل

۱: اگر 'عصمت' مواہب الٰہی ہے، جو ولی خدا کے اختیار میں قرار پاتی ہے، تو پھر معصوم ہونا کسی افتخار و اعزاز کا باعث نہ ہوگا۔

۲: کیا کوئی معصوم قوت عصمت کا حامل ہوتے ہوئے بھی ارتکاب گناہ پر قادر ہوتا ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کیا قوت عصمت معصوم سے اختیار و حریت کو سلب کر دیتی ہے یا نہیں؟ دوسری صورت میں بھی ترک گناہ باعث افتخار قرار نہیں پائے گا۔

یہ دونوں سوال علمائے علم کلام کے درمیان ہمیشہ مورد بحث رہے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ دونوں پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے۔

الف: کیا عصمت موہوبی باعث افتخار ہے؟

عصمت موہوبی اس لحاظ سے باعث افتخار ہے کہ یہ نوازش تمام حالات میں افراد پر مرحمت نہیں فرمائی جاتی بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ افراد متعلقہ میں ایسی اقدار از خود موجود ہوں جن کی موجودگی میں یہ لطف الٰہی ان کے شامل حال ہو۔

ان اقدار میں بعض تو اختیار سے باہر ہوتی ہیں اور بعض مکمل طور پر کسی فرد معصوم کے دائرہ اختیار میں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کمالات روحانی میں سے بعض جو اس الطاف الٰہی کے نزول کی بنیاد ہوتے ہیں، جسے 'عصمت' کہا جاتا ہے۔ افراد معصوم تک بذریعہ وراثت پہنچتے ہیں۔ دورِ حاضر کے ماہرین حیات شناسی نے یہ بات واضح طور پر ثابت کر دی ہے کہ چند ایک صفات اس سے قطع نظر کہ اچھی ہوں یا بری، وراثت کے طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خاندان جن کو انبیاء کی پیدائش کا شرف حاصل ہے عموماً پاک واصیل خاندان ہوتے ہیں، جن میں امتدادِ زمانہ سے کمالات وفضائل روحانی خود بخود جمع ہوتے رہتے ہیں اور پھر قانون وراثت کے تحت

---

[1] اس آیت کے دلیل عصمت ہونے کے بارے میں ہم بعد میں بحث کریں گے۔

نسل در نسل ان خاندانوں میں جاری وساری رہتے ہیں۔

لیکن صرف وراثت ہی وہ عامل نہیں جس کے ذریعہ کمالات روحانی نسل در نسل منتقل ہوتے رہیں۔ بلکہ بعض فضائل ایسے بھی ہیں جو بہ طریق تربیت افراد میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ کمالات وفضائل جو انبیاء علیہم السلام کے خاندانوں میں وجود رکھتے تھے بہ طریق تربیت ان کا انبیاء میں یکے بعد دیگرے انتقال ہوتا رہا۔ نتیجہ کے طور پر یہ دونوں عوامل، یعنی وراثت وتربیت، کمالات روحانی کے حصول کا سبب بنتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے خاندانوں میں مکمل طور پر باایمان، امانت وار باہوش، شجاع اور باکمال لوگ پیدا ہوتے رہے۔

یہ دو عوامل ایسے ہیں جو خارج از اختیار ہیں۔ یہی وہ عوامل ہیں جو کمالات روحانی کے ایک سلسلہ کی پیدائش کا سبب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ دونوں عوامل خلاق عالم کی جانب سے فیضان 'عصمت' کی بنیاد بناتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ صرف یہی دو عوامل ہی پروردگار عالم کی جانب سے فیضان 'عصمت' کے نزول کے اسباب آخر نہیں ہیں، بلکہ فیضان عصمت کے معاملہ میں ایک سلسلہ عوامل اختیاری کا بھی اپنا مقام رکھتا ہے۔ یہاں دو ایسے عوامل کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو مکمل طور پر مقام اختیار پر فائز ہیں۔

۱: انبیاء کے مجاہدات انفرادی واجتماعی: مثلاً حضرات ابراہیم ویوسف اور موسیٰ [1] علیہم السلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبل از بعثت کے مجاہدات اور سعی بلیغ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ 'فیضانِ عصمت' کے لیے بنیاد بنے اور ان حضرات پر اس لطف الٰہی کے نزول کے لیے آمادگی پیدا کی۔ ان حضرات کا جہاد نفس، حرام سے اجتناب، اسی طرح معاشرہ کے عیوب اور برائیوں کے خلاف جہاد، واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ جب لطف الٰہی بنام 'عصمت' ان کو حاصل ہو جائے تو پھر تہذیب افراد ومعاشرہ اس کے فوائد قرار پائیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم دیگر انبیاء میں اس قسم کے سوابق سے باخبر نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قابلیت اس جماعت میں خصوصیت کے ساتھ لطف الٰہی کے فیضان میں موثر ہو سکتی ہے۔

۲: ان حضرات کے اپنے دور رسالت میں ثمر بخش فعالیت کے متعلق علم باری تعالیٰ یعنی یہ جماعت ان افراد پر مشتمل ہے جو مقام نبوت پر فائز ہونے کے بعد تعجب خیز استقامت ولگن کے ساتھ کارِ اصلاح کو ہاتھ میں لے کر انفرادی واجتماعی جہاد کی راہ میں شدید کوششیں سرانجام دیں گے۔

یہ عوامل جن میں بعض تو اختیاری ہیں اور بعض خارج از اختیار انسانی ہیں، اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ فیض الٰہی اس کے مخصوص بندوں پر نازل ہو جس کے نتیجہ میں 'عصمت' افتخارات انبیاء میں سے الگ شمار ہوتی ہے اور جن عوامل کو خود انہوں نے الطاف الٰہی کے لیے بطور بنیاد فراہم کیا ہوتا ہے۔

---

[1] ان تینوں انبیائے اوالوالعزم کے قبل بعثت مبارزات کا قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے جس طرح پیغمبر اسلام کی قبل از بعثت کی تاریخ انتہائی واضح اور صاف وشفاف نکات کی حامل ہے، جو اس عنایت الٰہی کے فیضان کے لیے بنیاد...... ہیں۔

آخر میں ایک نکتہ کا بیان ناگزیر ہے اور وہ یہ ہے:

عصمت کا پہلا مرحلہ جو اولیائے الٰہی کو بچپن کے دور سے عطا ہوتا ہے بعض شرائط (مجاہدات قبل از نبوت) پر منحصر نہیں، بلکہ ان شرائط میں سے بعض عصمت سے بالاتر مراحل کے حصول کے لیے موثر بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

دختر پیغمبر جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی زیارت میں وارد جملوں سے چوتھے عامل (دورِ حیات میں ان کے ثمر بخش افعال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم) کی اہمیت دیگر عوامل سے زیادہ واضح ہو رہی ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

"یا ممتحنه امتحنك الله الذی خلقك قبل ان یخلقك و کنت لما امتحنك به صابرة"

''اے امتحان وآزمائش شدہ بی بی! جس کو اللہ نے اس جہان میں خلقت سے پہلے آزمایا اور آپ کو میدانِ امتحان وابتلاء میں صابر و بردبار پایا۔''

علی ہذا القیاس دعائے ندبہ میں ہم پڑھتے ہیں:

"اولیائك الذین استخلصتهم لنفسك...... بعد ان شرطت علیهم الزهد فی درجات هذه الدنیا الدنیة...... فشرطوا لك ذالك وعلمت منهم الوفاء به۔"

''وہ اولیاء جنھیں تو نے اپنے لیے انتخاب فرمایا ہے، بعد اس کے کہ زہد و پارسائی اس دنیا کی زندگی میں تو نے ان کے لیے شرط قرار دی، انھوں نے بھی اس شرط کو قبول کرلیا اور تو بھی ان کی وفا سے آگاہ ہوا۔''

سید مرتضیٰ کی طرف سے ایک سوال کا جواب

سید مرتضیٰ (۳۵۵ تا ۴۳۶ھ) مسئلہ 'عصمت' کے قابل ستائش ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر چہ عصمت لطف الٰہی ہے جس میں اس کے خاص بندوں کی ایک جماعت شامل ہے، پھر بھی ہر حالت میں قابل ستائش ہے۔ 'عصمت' کے سلسلہ میں اللہ کے ان مخصوص بندوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت وہ لوگ ہیں جو فیضانِ عصمت کے ذریعہ، آزادی وحریت کے باوجود، ترک گناہ سے بہرہ مند ہوتے ہیں، جبکہ دوسری جماعت اپنے لیے فیضانِ عصمت کے ہوتے ہوئے کبھی اس سے اطاعت کی راہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لہٰذا صرف وہ جماعت فیضانِ عصمت سے ترک گناہ میں مدد حاصل کرتے ہیں، وہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ بات ان کے افتخارات میں شمار ہوتی ہے۔[1]

---

[1] امالی سید مرتضیٰ، ج ۲، ص ۳۴۷، ۳۴۸، مولف کی وضاحت کے ساتھ

اس قسم کی تقسیم اسی صورت میں صحیح ہوتی ہے کہ ہم فیضانِ عصمت کے لیے پہلے سے کسی شرط یا قید کے قائل نہ ہوں۔ اس لحاظ سے صاحبانِ عصمت کی دو قسمیں تصور کی جائیں گی۔ لیکن اس کمال کے فیضان کے لیے اگر ہم پہلے ہی سے شرائط واصول موافق کو لازم سمجھیں تو پھر طبعاً اس صورت میں حاملین عصمت ایک سے زیادہ جماعت پر مشتمل نہ ہوں گے۔ لہٰذا صرف اسی ایک جماعت پر فیضانِ عصمت ہوگا جس سے وہ اطاعت خدا اور گناہ سے دوری کی راہ میں مدد حاصل کریں گے۔ پھر یہ امکان ہی نہ ہوگا کہ موافق شراط کی فاقد جماعت پر اس قسم کے لطف و عنایت کا فیضان ہو۔

سید مرتضیٰ مرحوم اپنی گفتگو کے ذیل میں ایک نظریہ پیش کرتے ہیں جواب تک دیکھا گیا اور نہ ہی سنا گیا ہے۔ وہ نظریہ اس طرح ہے کہ جب خدا جان لے کہ کوئی شخص اس کی جانب سے فیضانِ عصمت کے بعد اطاعت خدا اور ترک گناہ میں مدد حاصل کرتا ہے تو ضروری ہوگا کہ اس کے حق میں خدا اپنے لطف کا نزول فرمائے، خواہ وہ شخص پیغمبر یا امام ہی کیوں نہ ہو۔[1]

اس لحاظ سے صرف انبیاء و آئمہ ہی معصوم شمار نہیں ہوں گے بلکہ ممکن ہوگا کہ کوئی شخص جو جماعت انبیاء وائمہ سے نہ ہو وہ بھی عصمت کے لطف الٰہی کا حامل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ دلائل مشہور و معروف سے مطابقت نہیں رکھتا۔

یہاں تک پہلے سوال، یعنی ''عصمت'' معصومین کے لیے باعث افتخار ہے یا نہیں، کا کسی حد تک جواب دیا گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دوسرے سوال کا جواب دیں۔

ب: عصمت و مصونیت اختیاری

جب 'عصمت' انبیاء علیہم السلام سے قدرت گناہ ہی سلب کر لیتی ہے تو پھر ترک گناہ کسی طرح سبب افتخار متصور نہ ہوگا۔

اس سوال کا جواب سابقہ مباحث سے واضح ہو جاتا ہے۔ ہم عصمت کو تقویٰ کا نقطۂ کمال سمجھیں، اس کو عواقب گناہ کے مقابلہ میں علم شکست ناپذیر کا سبب جانیں یا اس کو مقام ربوبیت کی معرفت کی تکمیل کا عکس العمل تصور کریں، عصمت کبھی بھی ارتکاب گناہ کی قدرت وقوت کے مسلوب ہونے کا موجب نہیں بنتی اور ایک بندۂ معصوم کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ دونوں اطراف میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی عقلمند انسان بجلی کے ننگے تار کو یہ جانتے ہوئے کہ اس میں بجلی کی رو چل رہی ہے، ہاتھ نہیں لگاتا، کسی جذامی یا مریض سل کے (یعنی کسی متعدی مرض میں مبتلا مریض) کے بچے ہوئے کھانے کو نہیں کھاتا، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس کام کی قدرت نہیں رکھتا، بلکہ وہ ان افعال کے نتائج کو جانتے ہوئے ان کے ترک کو ایسا کر گزرنے پر ترجیح دیتا ہے اور تمام عمر میں کبھی ایسے کام کے نزدیک بھی نہیں جاتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ کسی کام کو نہ کرنا اور بات ہے اور اس کی انجام دہی پر قادر نہ ہونا بالکل مختلف بات ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ کسی صاحب عقل اور صحت وسلامتی کے خواہشمند انسان کے لیے اس طرح کے فعل کا صدور محال

---

[1] امالی سید مرتضیٰ ج ۲، ص ۳۴۷، ۳۴۸

عادی قرار پائے گا نہ کہ محال عقلی۔ان دونوں محالات میں بہت واضح فرق ہے۔اول الذکر میں انجام فعل کا امکان محفوظ ہے اگر چہ یہ امکان متحقق نہ ہوتا ہو۔جبکہ موخر الذکر صورت میں فعل کے لیے امکان انجام ہوتا ہی نہیں۔لہٰذا ہم یاد دہانی کے طور پر کہتے ہیں کہ فعل قبیح کا صدور اللہ تعالیٰ سے امکان پذیر ہے یعنی خدا اپنے مطیع وفرمانبردار اشخاص کو بھی دوزخ میں ڈال سکتا ہے جبکہ وہ یہ عمل کبھی انجام نہیں دیتا۔صفت حکیمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اپنے مطیع بندہ کو اجر عطا فرمائے نہ کہ سزا دے۔

لہٰذا کسی فعل کا انجام نہ دینا اسکے لیے عدم قوت کی دلیل نہیں۔ایک بندۂ معصوم بلند مقام تقویٰ، ارتکاب گناہ کے بارے میں علم شکست ناپذیر کے حامل ہونے یا اپنے خالق کی عظمت کی معرفت کاملہ کے باعث کسی غلط کام کا اقدام نہیں کرتا حالانکہ اگر وہ چاہے تو دوسروں کی طرح غلط کام یا ارتکاب گناہ کرسکتا ہے۔

قرآن مجید کا فیصلہ

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے حکم قرآن حاصل ہوسکتا ہے:

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(انعام: ۸۷،۸۸)

''ہم نے ان کو چن لیا اور راہِ راست کی طرف ان کی ہدایت کی۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت جس کے ذریعہ اپنے بندوں میں جس کی چاہیے ہدایت فرماتا ہے اور اگر وہ شرک کریں تو جو (نیک) اعمال انھوں نے کیے ہوں گے، حبط ہوجاتے ہیں۔''

اگر کوئی بندۂ معصوم ارتکاب گناہ پر قادر ہی نہ ہو تو جملہ **ولو اشر کوا لحبط عنهم ما کانوا یعملون** جو معصومین کے بارے میں ہے، بے محل قرار پائے گا کیونکہ پھر مفروضہ یہ ہوگا کہ وہ کسی گناہ پر عام اس سے کہ شرک ہو یا کوئی اور گناہ، قادر ہی نہ ہوں گے۔

آیۂ ابلاغ' میں قرآن فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ (مائدہ: ٦٧)

''اے اللہ کے رسولؐ! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا، اسے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے رسالت کی تبلیغ ہی نہیں کی۔''

یہ آیت واضح طور پر پیغمبر اکرمؐ کے ارتکاب عصیان پر قادر ہونے کی تصریح کرتی ہے۔ نیز بتلاتی ہے کہ آنحضرتؐ معصوم ہونے کے باوجود ترک رسالت پر قادر تھے۔

ان دونوں سوالوں کے جواب کے بعد ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم انبیاء کی عصمت کے سلسلہ میں متکلمین کے نظریات کو نقل کر کے اس کے مخالف اور موافق کیفیات کو پیش کریں اور اس کے بعد عصمت کے بارے میں عقلی و قرآنی دلائل ہدیۂ قارئین کریں۔

مراحل و دلائل عصمت

عصمت سے متعلق مقدماتی بحث اختتام کو پہنچی۔ ہم عصمت کی واقعیت و ماہیت اور اس کے منبع و سرچشمہ سے آگاہ ہو چکے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عصمت کے ساتھ اتصال ایک افتخار ہے جو خداوند تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی واضح ہو گیا کہ 'عصمت' ہرگز انسان سے قدرتِ گناہ کو سلب نہیں کرتی۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ 'عصمت' کے بارے میں دیگر مراحل و درجات اور عقلی و قرآنی دلائل سے واقفیت حاصل کریں۔

عصمت کے چند ایک مراحل ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱: وحی الٰہی کی موجودگی میں مصونیت۔

۲: اصول و فروع دین کی تبلیغ و بیان میں احتیاط۔

۳: گناہ سے حفاظت، فعل حرام کی صورت میں ہو یا ترک واجب کی شکل میں۔

۴: مذکورہ بالا امور کے علاوہ دیگر امور میں خطا سے تحفظ، مثلاً اپنی یا دیگر اشخاص کی زندگی سے متعلق تشخیص امور میں اشتباہ حواس۔

مراحل عصمت کو ایک اور پہلو سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ گناہ سے محافظت کا مورد یا تو کفر ہوتا ہے یا معصیت۔ موخر الذکر کی پھر دو قسمیں ہیں: گناہ کبیرہ یا گناہ صغیرہ۔ گناہ صغیرہ پھر دو قسم کا ہے۔ کبھی تو یہ فاعل کی طبع و مزاج کی پستی اور معاشرہ کے تنفر کا موجب ہوتا ہے، مثلاً لقمہ غذا کی چوری؛ کبھی اس طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کی بدزبانی سمجھ لیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں کبھی تو یہ بات عمداً کی جاتی ہے اور کبھی سہواً ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ افعال کبھی تو جان بوجھ کر کیے جاتے ہیں اور کبھی سہواً ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان امور میں مصونیت کا تعلق کبھی تو اعلان بعثت سے قبل کے زمانہ سے ہے اور کبھی اس کے بعد۔

علمائے علم کلام میں سے کسی نے بھی انبیاء علیہم السلام کو 'کفر' کی نسبت نہیں دی۔ سب نے کردارِ انبیاء کو اس سے پاک و منزہ قرار دیا ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے جنھیں 'ازارقہ' کہتے ہیں، انبیاء کے لیے کفر کو صحیح جانا بھی ہے تو اس سے ان کی مراد کفر کے اصطلاحی معنی یعنی انکارِ حق و شرک وغیرہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی مراد معصیت ہے۔ اس چیز کو کفر کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مکتبِ فکر میں ہر قسم کے گناہ کبیرہ کو کفر سمجھا جاتا ہے اور وہ گناہ گار کو کافر کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفر سے دراصل صدورِ گناہ کے معنی مراد لیتے ہیں۔ [۱]

تعجب ہے کہ تفتازانی نے شرح 'عقاید نسفیہ' ص ۱۷۱ پر شیعوں کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ شیعہ 'تقیہ' کے طور پر انبیاء کے لیے اظہارِ کفر کو جائز جانتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے کوئی چھوٹی سے چھوٹی دلیل بھی پیش نہیں کی جبکہ شیعہ اس الزام سے مکمل طور پر آزاد ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے لیے، جو کفار کی شان و شوکت کو مٹانے اور شرک و نفاق کو معدوم کرنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، تقیہ ہرگز جائز نہیں۔ اس قسم

---

[۱] ح تجزیہ قوشچی، ص ۴۶۴

کے مبارزات انکے ہدف کی راہ میں شہادت طلبی وفداکاری کے علاوہ نہیں، بلکہ ہدف کے ساتھ ہم آہنگ وہم پیمان ہیں۔اس کی یہی ایک صورت نکلتی ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر اپنی رسالت سے انکار کر کے کفر کا مظاہرہ کرنے لگیں۔(جو کسی بھی طرح ممکن نہیں)

بہرحال ہم مراتب عصمت کی اول الذکر صورت میں تفسیر کریں یا موخرالذکر صورت میں، خود قرآن ''اخذ وحی'' و''تبلیغ رسالت'' کے مراحل میں عصمت انبیاء کی گواہی دیتا ہے۔اس سلسلہ میں علماء علم کلام میں سے کسی نے بھی اس کیفیت کی مخالفت نہیں کی۔[۱] اس موقعہ پر اہم مسئلہ تیسرا ہے یعنی 'عصمت' بمقابلہ 'معصیت'۔اس کے بعد چوتھا مرحلہ ہے یعنی امورِ زندگی میں اشتباہ وخطا، صلاح وفساد کی تشخیص یا سود و زیاں میں تشخص۔

شیعہ علماء انبیاء علیہم السلام کو بعثت سے قبل یا اس کے بعد ہر قسم کے گناہ سے معصوم اور خطا سے محفوظ مانتے ہیں۔یہ حضرات قبل بعثت یا اس کے بعد انبیاء کے بارے میں کسی طرح کے گناہ کبیرہ وصغیرہ، عمداً یا سہواً کو تسلیم نہیں کرتے۔صرف شیخ مفید صغیرہ سہوی کو، جو خفت طبع کا ترجمان نہ ہو، انبیاء سے قبل بعثت کے زمانہ میں ممکن تصور کرتے ہیں۔[۲] اگر اس مسئلہ میں کوئی اختلاف ہے تو وہ علماء اہل سنت کے درمیان ہے جس کی تفصیل میں جانا طوالت کا باعث ہوگا۔مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ 'حشویہ' عقیدہ کے لوگ بعثت کے بعد گناہ کبیرہ وصغیرہ کے صدور کو جائز سمجھتے ہیں۔جماعت اشاعرہ کے محققین ایسے گناہ کبیرہ وصغیرہ کو، جو خفت طبع کا باعث نہ ہو، اعلان بعثت کے بعد ممنوع جانتے ہیں لیکن گناہ صغیرہ کے صدور کو، جو خفت طبع کا باعث نہ ہو، سہو کی صورت میں جائز قرار دیتے ہیں۔

'اشاعرہ' کی ایک اور جماعت اور معتزلہ میں ابو ہاشم صدور گناہ صغیرہ کو عمداً یا سہواً، باعث تنفر ہو یا نہ ہو، بلا مانع جانتی ہے۔[۳] قاضی عبدالجبار اپنی کتاب 'المغنی' میں معتزلہ کے اس عقیدہ کی ایک مختلف طریقہ سے شرح کرتے ہیں۔محقق حضرات اس کے لیے کتاب 'المغنی' ج۱۵، ص۲۷۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔'عصمت' کے موضوع پر علماء کے یہی نظریات ہیں۔اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ میں عقل وقرآن کے فیصلہ سے واقفیت حاصل کریں۔

تبلیغ شریعت میں مقام عصمت

سب سے پہلے ہم مقام اخذ وحی وتبلیغ کے موارد میں انبیاء علیہم السلام کے مقام اصلی پر عقل کے زیر اثر گفتگو کرتے ہیں۔اس کے بعد دیگر مراتب کا ذکر کریں گے۔

---

[۱] سوائے قاضی عبدالجبار کے جس نے کذب سہوی کو تبلیغ رسالت میں جائز قرار دیا ہے۔(شرح قوشجی، ص۴۶۴)

[۲] دلائل المقالات، ص۳۔یہ نظریہ ایک طرح سے مقدس اردبیلی سے شرح تجرید پر ان کے تعلیقات سے معلوم ہوتا ہے۔صفحہ ۴۶۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۳] شرح تجرید قوشچی، ص۴۶۴

عصمت کے بغیر گفتارِ انبیاء پر وثوق ممکن نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعثت انبیاء کا ہدف ومقصد اصلی بنی نوع انسان میں ایمان اور دین سے واقفیت ورغبت پیدا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے لائحہ عمل سے آگاہ کرنا ہے۔ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے اور ان کی طرف میلان کی بنیادوں میں ایک یہ ہے کہ ان کی طرف بڑھنے والا شخص مطمئن ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے نبی کہتے ہیں وہ خدا سے ماخوذ ہے اور اخذ وحی وتبلیغ میں وہ کسی قسم کے سہو واشتباہ سے دوچار نہیں ہوئے۔ اگر اس مورد میں خطا ولغزش کا کسی طرح بھی احتمال پیدا ہو جائے تو پھر بنائے تصدیق مل جائے گی اور بعثت انبیاء کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ قاضی عبدالجبار نے 'المغنی' ج ۱۵، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵ پر اس دلیل پر انحصار کیا ہے۔

محقق طوسی مرحوم 'تجرید' کے متن میں اس دلیل کی طرف مختصراً اشارہ فرماتے اور کہتے ہیں:

"ویجب فی النبی العصمة لیحصل الوثوق بأفعاله واقواله و یحصل الغرض من البعثة وهو متابعة المبعوث الیهم له۔"

''انبیاء میں عصمت لازمی ہے تاکہ لوگ ان کے افعال واقوال کے بارے میں وثوق حاصل کریں اور نتیجتاً ان کی بعثت کا مقصد، یعنی پیروی انبیاء تحقق پذیر ہو۔''

عقل کا یہ فیصلہ صرف ان دو مراحل (اخذ وحی میں عصمت اور کارِ تبلیغ میں عصمت) سے ہی مخصوص نہیں بلکہ بعض دیگر مراحل پر بھی وارد ہوتا ہے جن کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

اب جبکہ ہم اس مسئلہ میں حکم عقل سے واقف ہو چکے ہیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں نازل ہونے والی آیات سے بھی واقفیت حاصلکریں۔ ان آیات کے علاوہ جو تمام پہلوؤں سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر خصوصیت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں۔ ہم 'اخذ وحی' اور ''تبلیغ رسالت'' کے سلسلہ میں وارد ہونے والی بعض آیات کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلی اور دوسری آیات

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ [1] عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ [2]

---

[1] ''یظهر''، اظهر باب افعال کا مضارع مطلع اور آگاہ کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ آیہ فلما نبات به واظهره الله علیه (تحریم: ۳) میں بھی یہی معنی ہیں۔

[2] لفظ ''من''، من رسول میں بیانیہ ہے۔ من ارتضیٰ کے جملہ سے مقصد کو بیان کرتا ہے۔ یعنی وہ شخص کہ جسے اس نے چنا ہے اور وہ عبارت ہے رسولوں سے۔

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ[1] بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝٢٧ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝٢٨ (جن: ۲۶ تا ۲۸)

''وہ (خدا) عالم الغیب ہے، کسی کو اپنے غیب سے مطلع نہیں فرماتا، مگر وہ شخص کہ جس کو اس نے رسولوں میں منتخب فرمایا ہے اس صورت میں خدا اس رسول کے لیے سامنے اور پیچھے سے محافظ و مراقب قرار دیتا ہے، تا کہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ (اس کے) رسولوں نے اپنے پروردگار کی رسالتوں کی اچھی طرح تبلیغ کی ہے اور اس نے اس چیز کا جو رسولوں کے پاس ہے، احاطہ کرلیا ہے، نیز جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اسے اچھی طرح شمار کرلیا ہے اور اس پر محیط ہے۔''

مصونیت انبیاء جہاں تک اخذ وحی اور لوگوں میں تبلیغ و حفظ وحی کا تعلق ہے، جملہ ''فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصدا'' کی وضاحت سے معلوم ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فعل یسلک کا فاعل ذات خداوند تعالیٰ ہے (یہ ایسا ہی ہے جیسے ارتضی سے ذات خدا مراد ہے)۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ بین یدیہ (اس کے سامنے) اور من خلفہ (اس کے پیچھے) سے کیا مراد ہے۔

من بین یدیہ و من خلفہ (اس کے سامنے اور اس کے پیچھے) کے جملے بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نگرانوں (راصدہا) (مراقب ہا) کو مقرر کر کے اپنے رسولوں کی حفاظت و صیانت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس وحی الٰہی و رسالت کو جس پر انبیاء مقرر ہوئے ہیں کوئی نقصان پہنچے۔

ان دونوں جملوں کی تفسیر میں دو احتمال واقع ہوتے ہیں:

۱: یہ جملے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مراقب قلب پیغمبر کو ہر طرف سے گھیرے رہتے ہیں، جو قلب پیغمبر کو عوامل مخرب کے نفوذ سے بچاتے ہیں، قلب پیغمبر میں فراموشی کو راہ نہیں پانے دیتے اور نہ ہی شیاطین کو اس میں تصرف کرنے دیتے ہیں۔

۲: یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ پیغمبر وحی الٰہی کے اخذ کرنے کے وقت سے اس کو لوگوں تک پہنچانے تک دو حالتیں رکھتا ہے۔

الف) اس لحاظ سے کہ پیغمبر مقام ربوبیت کی جانب متوجہ ہوتا ہے، سامنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ قرآن اس کیفیت کو من بین یدیہ سے تعبیر فرماتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لغت عربی میں یہ جملہ سامنے کے معنی میں آتا ہے۔

ب) لیکن وحی الٰہی کے اخذ کر چکنے کے بعد جب پیغمبر اس کی تبلیغ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔ اب پیغمبر لوگوں کے سامنے ہوتا ہے اور مقام اخذ وحی کی طرف اس کی پشت ہوتی ہے۔ قرآن اس کیفیت کی من خلفہ

---

[1] یسلک یجعل (قرار دیتا ہے) کے معنی ہے اور ضمیر فاعل سے مراد خدا ہے یعنی خدا قرار دیتا ہے۔

سے تعبیر کرتا ہے۔

لہٰذا آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ پیغمبر تمام حالات میں اخذ وحی (من بین یدیہ) کی کیفیت میں ہو، اس کے بعد کی اور تبلیغ آیت سے قبل کی حالت میں ہو یا بعد ابلاغ (ومن خلفه) کی منزل میں ہو، ہر قسم کے اندرونی و بیرونی آسیب سے محفوظ ہوتا ہے۔ نہ تو نفس نبوی اس کیفیت میں متصرف ہوسکتا ہے اور نہ ہی شیاطین خارجی کسی طرح کی اس میں دخل اندازی کر سکتے ہیں۔

بہر حال یہ آیہ مبارکہ واضح کرتی ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ اپنے غیب کو اپنے رسولوں پر ظاہر کرتا ہے تو اپنے ملائکہ کو مامور فرماتا ہے کہ پیغمبر کی 'اخذ وحی' (من بین یدیہ) اور وحی کے حفظ ودفاع اور ابلاغ و بیان (ومن خلفه) کے مراحل میں مراقبت کریں تا کہ وہ اشتباہ ولغزش سے دوچار نہ ہوں۔

اس کے بعد فرشتوں کے تقرر کی ضرورت کی اس طرح وضاحت فرماتا ہے:

"لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم......"

یہ تقرر اس لیے ہے کہ وہ جان لے کہ اس کے رسولوں نے اس رسالت کو جو انھوں نے اپنے ذمہ لی ہے، بخوبی انجام دیا ہے۔ یقیناً لیعلم سے کسب آگاہی مراد نہیں بلکہ اس لفظ سے خارج میں تبلیغ کا تحقق مراد ہے یعنی وہ اس کام کو انجام دیں اور تبلیغ رسالت خارج میں بھی متحقق ہو جائے۔ جہاں کہیں بھی قرآن میں اس قسم کے الفاظ کی خداوند تعالیٰ کی طرف نسبت دی جاتی ہے وہاں اس مضمون کا تحقق مراد ہوتا ہے: جس طرح ارشاد ہوتا ہے:

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝۳ (عنکبوت: ۳)

"حتی کہ رسات گو کی جھوٹوں سے تمیز ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

نتیجتاً یہ کہنا ہوگا کہ آیہ مبارکہ مجموعی طور پر اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسول ہمیشہ ملائکہ الٰہی کی زیر نگرانی اور ان کی نگہداری میں ہوتے ہیں کہ وہ اس کار رسالت کو جس کو انھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے بخوبی انجام دیں۔ اس قسم کی رسالت یعنی اخذ وحی اور تبلیغ رسالت کے مقامات، عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

تیسری آیت

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (بقرہ: ۲۱۳)

"لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے، ان کے

ہمراہ کتاب حق نازل فرمائی تا کہ وہ لوگوں کے درمیان اختلافی موضوعات کا فیصلہ کردیں۔"

آیہ مبارکہ واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ بعثت انبیاء اور نزول کتاب کا ہدف ومقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اولاً لوگوں کے درمیان حق سے فیصلہ کریں اور ثانیاً صحیح اعتقاد وعمل کی طرف ان کی رہبری کریں۔ان دونوں اہداف کا حصول ممکن نہیں، تاوقتیکہ انبیاء علیہم السلام اخذ وتبلیغ وحی کے سلسلہ میں عصمت ومصونیت کے زیر سایہ نہ ہوں، کیونکہ اس صورت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی گفتگو اعتقاد وعمل کے سلسلہ میں حقیقت کی طرف رہبری کا باعث نہ ہوگی بلکہ گمراہی کا سبب بن جائے گی۔

چوتھی آیت

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ (نجم: ۴-۳)

"(ہمارا رسول) ہوائے نفس کے مطابق بات نہیں کرتا بلکہ اس کی گفتگو وحی الٰہی ہوتی ہے جس کا اسے الہام ہوتا ہے۔"

یہ آیہ مبارکہ وضاحت کرتی ہے کہ جہاں پیغمبر نمائندہ خدا کے طور پر بات کرتا ہے وہ سب کی سب وحی ہوتی ہے، جو واقعہ سے ذرہ بھر بھی اختلاف نہیں رکھتی، یہ گفتگو آیت قرآن کی صورت میں ہو یا حدیث کی شکل میں۔

یہ آیات واضح طور پر اخذ وحی اور اس کے حفظ وتبلیغ کے مقام پر انبیاء علیہم السلام کی مصونیت کو ثابت کرتی ہیں۔اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ عصمت انبیاء کے دلائل کے لیے دیگر مراحل سے واقفیت حاصل کریں۔

گناہ سے پاکیزگی

اب ہم انبیاء علیہم السلام کے اخذ وحصول وحی الٰہی، اس کی حفاظت ونگہداری اور لوگوں کے درمیان اس کی تبلیغ وبیان میں خطاء ولغزش سے مبرا ومنزہ ہونے کے دلائل سے مکمل طور پر واقف ہوگئے۔یعنی ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ عصمت کے درجات میں سے دوسرے درجہ، جس کا تعلق ان کے گناہ ونافرمانی خدا سے محفوظ ہونے سے ہے، سے آگاہ ہوں اور اس بارے میں عقلی وقرآنی دلائل پیش کریں۔

پہلے ہم مختصراً عصمت سے متعلق دلائل عقلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس کے بعد دلائل قرآنی پیش کریں گے۔

دلائل عقلی میں سے ہم صرف دو ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں جو سب سے زیادہ وجدان انسانی کے لیے کافی ہیں۔ان میں سے ایک کا ہم انبیاء علیہم السلام کے حصول وحی، اس کی حفاظت اور تبلیغ کی مصونیت کے سلسلہ میں مختصراً ذکر کر چکے ہیں لیکن یہاں ہم اس پر مبسوط طریقہ سے بحث کریں گے۔

ا: عصمت وجلب اعتماد

بعثت انبیاء علیہم السلام کا ہدف ومقصد لوگوں کی ہدایت وتربیت ہے۔اس ہدف کا تحقق چند شرائط کا مرہون ہے۔ان شرائط میں اہم ترین شرط مربی کی بات کی صداقت پر افراد کے ایمان کا ہونا ہے۔اس شرط کے بغیر مربی کی گفتگو اور لائحہ عمل کا نقش برآب ہونا لازم آتا ہے۔

جب عمل مربی اس کے اپنے قول کے مطابق ہوگا تو طبعاً وہ قول سننے والے کے اعتماد میں کشش کا باعث ہوگا اور لوگوں کو اپنی طرف جذب کرے گا۔اس کے برعکس اگر قول وعمل میں تضاد ہوگا تو اس کی بات پر سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائے گی۔پھر ہر صاحب عقل سوچے گا کہ اگر ہمارے رہبر کو اپنے قول کی صحت پر اعتماد ہوتا تو کبھی اس کے خلاف عمل نہ کرتا، بلکہ اپنے لائحہ عمل میں پیش قدمی کرتا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ ماننے میں کیا چیز مانع ہے کہ مربی کسی قیمت پر جھوٹ نہیں بولتا جبکہ بعض غلط کاموں کا ارتکاب کرتا ہے،تو اس بناء پر غلط کام کا انجام دینا مربی کے تربیتی لائحہ عمل کے بے بنیاد ہونے کی دلیل نہیں بنتا۔لیکن اس قسم کا طریق کار ارتکاب گناہ کی موجودگی میں ایک مفروضہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، نہ ہی یہ طریقہ کسی عمومی تربیت کی بنیاد بن سکتا ہے جس کی وجوہات یہ ہیں:

(ا): جیسا کہ ہم نے ماہیت عصمت کی تشریح کرتے ہوئے ذکر کیا کہ تمام گناہوں یا بعض گناہوں کے ارتکاب سے تحفظ کا سبب ایک سلسلہ ملکات یا حالات حاضرہ ہوتے ہیں جو انسان کو غلط اقدامات سے روکتے ہیں۔ان ملکات کو''عشق خدا اور اس کے جمال و جلال'' یا 'نتائج گناہ' کے خوف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اس صورت میں ہم کس طرح گناہوں کے بارے میں اس قسم کے امتیاز کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسا انسان فرض کر لیں جو ہر قسم کے گناہ مثلاً قتل نفس، ہتک ناموس واموال وغیرہ کے ارتکاب پر تو آمادہ ہو لیکن کسی قیمت پر خدا پر جھوٹ نہ باندھے۔لہٰذا اگر کسی شخص کو خوف خدا نہ ہو تو پھر دروغ گوئی اور دیگر گناہوں کے ارتکاب میں اس کے لیے فرق کا احساس بے معنی ہوگا۔

(۲): فرض کریں کہ یہ امتیاز ثبوت و واقع کے لحاظ سے ممکن ہو جائے لیکن پھر بھی اس بات کا ثبوت آسان نہیں ہوگا کہ ایک مدعی نبوت اور لائحہ عمل پیش کرنے والا شخص ان لوگوں میں سے ہو جو کبھی خداوند تعالیٰ پر جھوٹ نہیں باندھتے لیکن دیگر گناہوں کے ارتکاب کی پرواہ نہیں کرتے۔کیونکہ کسی انسان کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ شخص ایسے لوگوں میں سے ہے جو عملی طور پر خداوند تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے اور دیگر گناہوں کے ارتکاب میں امتیاز قائم رکھنے کا قائل ہے۔پھر اگر کوئی مدعی رسالت اس قسم کا دعویدار ہو تو وہ مزید شک وتردید کا باعث ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصد بعثت، جو دراصل لوگوں کی ہدایت وجاذبیت ہے، کا تحفظ لوگوں کے جلب اعتماد کے سایہ کے بغیر ممکن نہیں۔اس قسم کا اقدام عملی جو عمومی بھی ہو، مربی کی آزادروش کے بغیر محقق نہیں ہوتا۔لہٰذا انبیاء علیہم السلام کو اپنے مقام پر عقلاً ہر قسم کے گناہ ومعصیت سے مبرا ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس کے اعتقادات کو اپنی جانب مبذول کر سکیں۔

نیز یہ بھی تصور ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے اعتماد کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کافی ہے کہ انبیاء ظاہری طور پر گناہ کے مرتکب نہ

ہوں۔لیکن اس قسم کی احتیاط اس سے مانع نہیں کہ خفیہ طور پر، لوگوں کی نظر سے دور، گناہ کے مرتکب ہوں۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اس قسم کا تصور ان کی بعثت کے ہدف کی بیخ کنی کا باعث ہے۔انبیاء کے لیے جب کوئی چیز گناہ سے مانع نہ رہے گی اور وہ صرف لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لیے ہی گناہ سے پرہیز کریں گے، تو پھر ان کی صدق گفتاری پر اعتماد ہی ختم ہو جائے گا۔یہ اس لیے کہ عوام الناس کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ شخص احکام الٰہی کے بیان میں جھوٹ نہیں بولتا؟ اس صورت میں جھوٹ اور سچ میں تشخیص کا کوئی پیمانہ لوگوں کے پاس نہیں جس سے جھوٹ اور سچ میں امتیاز ہو سکے۔لہٰذا اگر وہ جھوٹ بھی کہتے ہوں تو یہ جھوٹ صدق سے الگ نہیں ہو سکے گا۔علاوہ ازیں کوئی شخص تھوڑی مدت کے لیے تو لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے، یا اپنے ظاہر و باطن میں منافقانہ تضاد رکھ سکتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ جلد ہی اس کے باطن کا پردہ چاک ہو جائے اور حقیقت سب پر واضح ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کے مفروضہ جات نہ تو بعثت انبیاء کے لیے سازگار ہیں اور نہ ہی عام زندگی میں قابل عمل ہوتے ہیں۔لہٰذا جلب اعتماد کے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں باطنی و ظاہری گناہ سے مبرا ہونے پر اعتقاد رکھنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔پس مذکورہ بالا دو مفروضے یا ان جیسے دیگر تصورات خیالی پلاؤ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

۲: اسباب رغبت و بیزاری

مشہور شیعہ متکلم ''سید مرتضیٰ'' مذکورہ دلیل پر ایک اور پہلو سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہدف بعثت انبیاء اسی صورت میں اطمینان پذیر ہوتا ہے کہ ان آسمانی رہنماؤں کی زندگی میں نقطہ ضعف اور بیزاری و نفرت کے اسباب کا وجود نہ پایا جائے تاکہ لوگ ان کی بات سننے کے بعد ان کی طرف آسانی سے مائل و راغب ہو کر ان کی پیروی کریں۔

''اسی بنا پر علماء کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبران کو ہر ایسی کمزوری سے مبرا و منزہ ہونا چاہیے جو لوگوں کی نفرت اور بیزاری کا موجب ہو، خواہ اس تنفر کے اسباب انکے اختیار سے باہر ہی کیوں نہ ہوں۔لہٰذا جذام و برص اور ایسی ہی دوسری بیماریوں میں مبتلا افراد، جن سے طبعاً لوگ اجتناب کریں، رسالت الٰہی کے مدعی نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایسے عوارض میں مبتلا افراد، کتنے ہی ایماندار اور پاکدامن ہوں، لوگوں کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکتے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعثت انبیاء کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔

''خاندانی یا انفرادی عیوب، بعثت سے پہلے ہوں یا بعد، مدعیانِ رسالت سے لوگوں کی نفرت کا باعث ہوتے ہیں۔پھر رسالت جیسے کار بزرگ کو ایسے شخص کے سپرد کرنا جس کے خلاف نفرت و بیزاری وجود رکھتی ہوں، فعل حکیمانہ نہیں ہوگا کیونکہ ان حالات میں اس کی بعثت کا مقصد پورا نہ ہوگا۔''

اس کے بعد سید مرتضیٰ مرحوم اس دلیل کے بارے میں چند سوالات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ممکن ہے کہا جائے کہ بہت سے فرقے انبیاء سے ارتکاب گناہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔پھر بھی یہ بات لوگوں کے ان کی طرف میلان کو نہیں روکتی۔''

سید مرتضیٰ کے اس سوال کے جواب کو ہم نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ:

''سکون و اطمینان قلب کے درجات و مراتب ہوتے ہیں۔ جو سکونِ قلب انسان کو اقوال معصوم سے حاصل ہوتا ہے کسی اور کے اقوال جیسا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ انسان دونوں کے اقوال کی تصدیق اور ان کو تسلیم کرے، تاہم لازماً وہ سکون خاطر جو ایسے افراد کے اقوال سے حاصل ہوتا ہے جو گناہ سے ہر طرح پاک و منزہ ہوں، عام آدمیوں کے اقوال سے ہر طرح بلند و ارفع ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیات ہرگز یکساں نہیں ہو سکتیں۔''

یہ کیفیت نہ صرف معصوم و غیر معصوم انسانوں میں حکم فرما ہے بلکہ یہی حکم و کیفیت ان انسانوں کے بارے میں بھی کارفرما ہے جن کے لیے ہم گناہ صغیرہ کے ارتکاب کو جائز جانتے ہیں، لیکن ان کو ارتکاب کبائر سے پاک جانتے ہیں۔ یہی بات ان اشخاص کے لیے بھی ہیں جن کو ہم دونوں اقسام گناہ سے پاک سمجھتے ہیں۔ ہمارا اطمینان و اعتماد پہلے شخص کی بات پر دوسرے کی نسبت زیادہ ہے۔

اس بحث سے بہت سے دوسرے سوالات کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے تجاذب اور میلان کے لیے کافی ہے کہ انبیاء علیہم السلام بعثت کے بعد گناہ سے پاک رہیں، خواہ قبل بعثت خطا سے پاک نہ رہے ہوں۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کا گناہانِ کبیرہ سے پرہیز ہی کافی ہے اگرچہ گناہانِ صغیرہ سے دوری نہ بھی اختیار کریں۔

ایسے سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کی طرف تجاذب و میلان کے اسباب جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر اعتماد و اطمینان ایمان و میلان زیادہ ہوگا اور ہدف بعثت بصورت کامل جامہ عمل سے آراستہ ہوگا۔ [۱]

یہاں ایک اور سوال بھی کبھی کبھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ:

''عقلائے عالم اپنے لائحہ عمل کی تبلیغ میں کامل طور پر مبلغ کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ بسا اوقات ایسے افراد سے مدد حاصل کر لیتے ہیں جن کے صفحۂ حیات پر ایک یا زیادہ نکات ضعف پائے جاتے ہیں۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اسی طرز عمل کو اختیار کرنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے؟

لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے۔ عقلائے عالم کے اس قسم کے مبلغین پر انحصار کی دو میں سے ایک وجہ ہو سکتی ہے، یا تو وہ افراد کامل پر اختیار نہیں رکھتے، یا وہ کسی ہدف کے بارے میں ایک معینہ حد تک تحقیق کرنے پر اکتفا کر لیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی ذات باری تعالیٰ کے بارے میں ہرگز عاید نہیں ہوتی۔ [۲]

---

[۱] تنزیۃ الانبیاءؑ، ص ۴-۶

[۲] المیزان، ج ۲، ص ۱۴۱

قرآن و عصمت انبیاء

اس قسم کے عقلی دلائل پر غور کرتے ہوئے اس موضوع پر قرآن کی عقل کے ساتھ ہم آہنگی کا تصور کرنا چاہیے۔ اتفاق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا مسئلہ واضح صورت اور مطابق موقعہ شکل میں عصمت ملائکہ کی طرح پیش نہیں کیا گیا۔ تاہم غور و خوض کر کے اس موضوع پر ہم نظریات قرآن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہاں چند آیات قرآن پیش کرتے ہیں:

قرآن سے پہلی گواہی

قرآن میں تین آیات وارد ہوئی ہیں جن کو ایک دوسری میں ضم کر کے ہم عصمت انبیاء کو ثابت کر سکتے ہیں، وہ تین آیات یہ ہیں:

۱: أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ (الانعام: ۹۰)

''وہ (جن انبیاء کا نام گذشتہ آیات میں لیا گیا) ایسے لوگ ہیں جنھیں خدا نے ہدایت فرمائی ہے، اس بنا پر ان کی پیروی کرو۔ کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ یقینا (قرآن) عالمین کے لیے وسیلہ یاد دہانی کے سوا اور کچھ نہیں۔''

۲: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۗ

(زمر: ۳۶،۳۷)

''جس کو خدا گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور جس کی اللہ رہنمائی کرے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔''

۳: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۗ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یٰس: ۶۰ تا ۶۲)

''اے اولادِ آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی عبادت کرنا۔ یہی راہ راست ہے اور شیطان نے تم میں سے زیادہ لوگوں کو (خدا کی نافرمانی

کے زیر اثر) گمراہ کیا ہے۔ تم سوچتے کیوں نہیں؟''

ان تینوں آیات کے مفہوم کو ایک دوسرے میں ضم کرنے سے گناہ کے بارے میں عصمت انبیاء کے متعلق نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پہلی آیت میں جملہ ''اولئک الذین ھدی اللہ'' کے مفہوم سے یہ حکم ملتا ہے کہ انبیاء ہدایت یافتہ ہیں، اس لیے ان کی پیروی کرنا چاہیے۔

دوسری آیت بذریعہ جملہ ''من یھد اللہ فما لہ من مضل'' حکم دیتی ہے کہ جو لوگ ہدایت الٰہی کے سرا پردہ میں قرار پائے ہوتے ہیں ہرگز مضل و گمراہ نہیں ہوتے یعنی اضلال و گمراہی ان تک راستہ ہی نہیں پاتی۔

تیسری آیت جملہ ''ولقد اضل منکم جبلا کثیرا'' حکم دیتی ہے کہ جو شخص جس قدر بھی خدا کی نافرمانی کرے وہ اسی قدر راہ راست سے منحرف ہو جاتا ہے۔ ضلالت و گمراہی گناہ و نافرمانی سے توام اور اس کے ہمراہ ہیں۔ پس جو شخص خدا کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ بھی ہو جائے گا۔

ان تینوں مضامین میں غور کرنے سے مذکورہ آیات سے عصمت انبیاء وضاحت کے ساتھ مستنبط کی جا سکتی ہے۔ جب گناہ و نافرمانی ضلالت و گمراہی ہے، دوسری طرف انبیاء ہدایت یافتہ ہیں جن کی طرف ضلالت راہ نہیں پا سکتی، تو پھر نتیجہ یہ نکلا کہ گناہ و نافرمانی انبیاء کی زندگی میں راہ نہیں رکھتی اور وہ گناہ و خطا سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی مطلب کو ہم منطق کی زبان میں اس طرح کہہ سکتے ہیں:

''ہر قسم کی معصیت و گناہ ضلالت و گمراہی ہے۔ ضلالت و گمراہی مقام انبیاء تک راہ نہیں پاتی۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ معصیت و گناہ مقام انبیاء تک راہ نہیں پاتے۔''

قرآن سے دوسری گواہی

قرآن ان لوگوں کو جو خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، خوشخبری دیتا ہے کہ وہ ان حضرات کے ہمراہ ہوں گے جن کو خداوند عالم انعامات کا مستحق قرار دیتا ہے۔ یہ حضرات ۱: انبیاء ۲: صدیقین ۳: شہداء (براعمال) ۴: صالحین پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝٦٩ (نساء: ۶۹)

''جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ایسے لوگوں کے ہمراہ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے مستحق نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین پر مشتمل ہیں اور وہ کیا ہی اچھے مصاحب ہیں۔''

اس اعتبار سے ''انبیائے الٰہی'' ان حضرات میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں، یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرے

پہلو کی طرف سورۂ حمد میں ارشاد ہوتا ہے "یعنی وہ لوگ جن پر انعام خدا ہوتا ہے نہ کہ ناراضی خدا، جو گمراہ نہیں ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

"ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے نعمات عطا فرمائیں۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تو غضبناک ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔"

ان دونوں آیات مبارکہ کو ایک دوسرے میں ضم کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے مصداق ہیں۔

لہٰذا اس بات پر غور کرنے سے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی معصیت اور نافرمانی ضلالت اور گمراہی کی اقسام ہیں ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام ضال و گمراہ نہیں ہوتے لہٰذا طبعاً وہ عاصی و گنہ گار نہیں ہوتے جس کا نتیجہ گناہ سے عصمت اور پاکیزگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن سے تیسری گواہی

قرآن انبیاء علیہم السلام کا ایسی صفات کے ساتھ ذکر فرماتا ہے جیسا کہ "ہدایت"، "اجتبائ" وغیرہ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ (مریم: ۵۸)

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے انعام کے مستحق ہیں، یہ مشتمل ہیں ان انبیاء پر جو آدم کی ذریت سے ہیں، ان میں سے ہیں جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا، ابراہیم و یعقوب کے خاندان سے ہیں اور ان میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا۔ وہ ایسے لوگ تھے جن پر خداوند رحمن کی آیات تلاوت ہوتی تھیں تو وہ خاک پر گر جاتے اور سجدہ کرتے جبکہ وہ گریاں بھی ہوتے۔"

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو مندرجہ ذیل صفات سے متصف کیا گیا ہے:

۱: اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

۲: هَدَيْنَا

۳: وَاجۡتَبَيۡنَا

۴: خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو توان صفات سے یاد فرماتا ہے لیکن بعد والی آیت میں ان کے مخالفین کا بالکل مختلف اور متضاد صفات کے ساتھ تعارف کراتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ (مریم: ۵۹)

''ان کے بعد ناشائستہ اولاد بروئے کار آئی جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفسانی کی پیروی کی۔ وہ جلد ہی اپنی گمراہی کے نتیجہ کو پہنچ جائیں گے۔''

اس آیت میں دوسری جماعت کا مندرجہ ذیل صفات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

۱: اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ

۲: وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

۳: يَلۡقَوۡنَ غَيًّا

ان دونوں جماعتوں کی صفات کے تقابل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انبیاء دوسری جماعت کے بالکل برعکس ہیں۔ یعنی انھوں نے نہ تو خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور نہ ہی گمراہ ہوئے کہ ان باتوں کے مجازات سے دوچار ہوتے۔

ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کے افراد جو نہ تو کبھی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتی ہے اور نہ ہی جس کو گمراہی کے مجازات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، معصومین کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ یہ اس لیے کہ ایک گنہگار آدمی ہمیشہ خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور اس کو گمراہی کے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جو حضرات اس قسم کے اعمال سے دور رہیں وہ طبعاً معصوم اور گناہ سے پاک ہی ہوں گے۔

قرآن سے چوتھی گواہی

دنیا کے عظیم مصلحین اپنے قول و عمل سے معاشرہ کی راہ راست اور خوش بختی کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ ان سے متعلق عوام الناس اپنے رہنماؤں کے اقوال و افعال کو اپنے لیے نمونہ قرار دے کر دونوں شعبوں میں ان کی یکساں پیروی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی بھی ان دونوں شعبوں میں عوامل تربیت کے اعتبار سے فرق نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مصلح یہ کہنے لگے کہ ''میرے اقوال کو نمونہ بنانا نہ کہ میرے

عمل کو" تو لوگ اس بات کو بعید از عقل جانتے ہوئے اس کے گرد و پیش سے پراگندہ ہونے لگیں گے۔

جب کسی معاشرہ کی یہ حالت ہو تو قرآن فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (نساء: ۶۴)

"ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت و پیروی ہو"

گذشتہ بحث پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ آیت اس نتیجہ کی حامل ہے کہ پیغمبر کے اقوال و افعال دونوں کی پیروی لازم ہے یعنی اگر اس کا قول حجت اور پیروی کے قابل ہے تو اس کا فعل بھی یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے۔لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام کے افعال و اعمال اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کے مطابق ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی پیروی میں نہ صرف یہ کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہوگی بلکہ ان کے جملہ افعال پیروی کے قابل ہوں گے۔

لیکن اگر ہم انہیں گناہ سے معصوم اور نافرمانی خدا سے پاک نہ جانیں، یہ اعتقاد رکھیں کہ ان سے بھی کبھی نہ کبھی صدور گناہ ہو جاتا ہے، یا وہ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہو جاتے ہیں، تو اس صورت میں لوگوں کو ناواقفیت میں اس آیت کے حکم کے مطابق ان کے افعال کی پیروی کرنا ہوگی جبکہ دوسری طرف پیروی کرنے والوں کو ان کے قوانین الٰہی کے خلاف افعال کی پیروی سے اجتناب کرنا چاہیے۔لہٰذا اس صورت میں مکلفین کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ کیا ایسا کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ان کی پیروی کا حکم بھی دیتا ہو اور اس سے منع بھی کرتا ہو؟ اس قسم کی تکلیف امر محال ہے۔لہٰذا یقیناً کہنا ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیروی کے لازم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے انحراف یا کسی طرح کے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔

قرآن سے پانچویں گواہی

قرآن کی آیات کا ایک سلسلہ حکم دیتا ہے کہ ہم پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر مشروط پیروی کریں اور ان کی دعوت کو مکمل طور پر قبول کریں۔اس قسم کی آیات آپ کی عصمت پر گواہ ہیں۔اس قسم کی آیات اور ان کی دلالت کی وضاحت یہاں پیش کی جاتی ہے:

۱: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ (آل عمران: ۳۱)

"کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، پھر خدا بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

۲: پھر فرماتا ہے:

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (نساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی پیروی کی پس اس نے اللہ کی پیروی کی۔''

۳: پھر فرماتا ہے:

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَخۡشَ اللّٰهَ وَيَتَّقۡهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۵۲﴾

(نور: ۵۲)

''جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، اللہ کا خوف رکھتے ہوں اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرتے ہو، وہی کامیاب ہیں۔''

قرآن مسلمانوں کے اس رجحان کے بارے میں کہ بعض مقامات پر پیغمبران کی پیروی کریں، تنقید کرتے ہوئے اس طرح فرماتا ہے:

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ ؕ لَوۡ يُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ

(حجرات: ۷)

''جان لو کہ اللہ کا رسول تمہارے درمیان ہے۔ اگر بہت سے موارد میں وہ تمہاری پیروی کرنے لگے تو تم سب زحمت میں پڑ جاؤ گے۔''

اس قسم کی آیات جو پیغمبرؐ کا غیر مشروط طور پر 'مطاع' (وہ جس کی اطاعت کی جائے) کے طور پر تعارف کرواتی ہیں، حتیٰ کہ آپ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کا حصہ قرار دیتی ہیں، دو لحاظ سے انبیاء کی عصمت پر گواہ ہیں:

الف: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام زبانی دعوت اطاعت کے لیے لازم اور رضائے خدا کا موجب ہے۔ ضروری ہے کہ اس کی مکمل اطاعت کی جائے۔ اگر وہ اپنے قول میں معصیت و گناہ سے محفوظ نہ ہوں تو اس صورت میں ان کی تمام زبانی دعوت کا بطور 'لازم الاجراء' تعارف نہیں کرایا جاسکتا، جبکہ مندرجہ بالا غیر مشروط پیروی اس بات پر گواہ ہے کہ آنحضرتؐ کے فرمان رضائے الٰہی سے سوئی کے ناکہ کے برابر بھی تجاوز نہیں کرتے اور ہمیشہ مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں۔

ب: تبلیغ فعلی و عملی لوگوں کی نگاہ میں تبلیغ لفظی و قولی سے زیادہ اثر و نفوذ رکھتی ہے۔ پس جو عمل بھی اللہ کے رسولوں سے واقع ہوتا ہے بذات خود اطاعت و پیروی کا حکم رکھتا ہے۔ انبیاء کی حیثیت معاشرہ میں اس قدر حساس و نازک ہوتی ہے کہ سب لوگ ان کے تمام اقوال و افعال پر غور کرتے اور ان کی حیات مقدسہ کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اب اگر انبیاء اپنے افعال کے اعتبار سے معصوم اور بے گناہ واقع نہ ہوں تو پھر ہرگز ان کا تعارف بطور 'مطاع' غیر مشروط نہیں کرایا جاسکتا، بالخصوص جبکہ قرآن ان کی حیات طیبہ کو

''اسوہ'' قرار دیتا ہے اور اسلامی معاشرہ کو حکم دیتا ہے کہ رسول کی گفتار و کردار مسلمانوں کی زندگی کے لیے نمونہ ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (احزاب: ۲۱)

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شخص کے لیے بہترین اسوہ و نمونہ ہیں جو خدا اور دوسرے گھر کی امید رکھتا ہو اور خدا کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا افراد بشر کے لیے اسوہ و نمونہ ہونا بذاتِ خود اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ آپ کے قول و عمل میں کسی طرح بھی غلطی نہیں اور وہ عین حقیقت و رضائے خدا ہے۔

قرآن سے چھٹی گواہی

قرآن بعض آیات میں قول شیطان نقل کرتا ہے۔ بارگاہ الٰہی سے مطرود ہونے کے بعد اس نے کہا:

فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾

(ص: ۸۲، ۸۳)

''تیری عزت کی قسم! میں تیرے سب بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلَص (لام پر زبر) بندوں کے۔''

یہی مضمون سورۂ حجر کی آیات ۳۹، ۴۰ میں بھی آیا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

''وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ''

''میں ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جو مخلَص ہیں۔''

آیات کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کے مخلَص بندوں کے اغوائے شیطان سے محفوظ ہونے پر دلیل ہے اور اغوائے شیطان سے تحفظ کے معنی عصمت مطلقہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی طرح کا ارتکاب گناہ کرتا ہے وہ ہمیشہ اغوائے شیطان ہی کے تحت ہوتا ہے۔ نیز جو گناہ بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے شیطان اس میں حصہ دار ہے۔

شیطان کا کام قلوب انسانی میں وسوسہ ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی شخص کا اغوائے شیطان سے محفوظ رہنا معصیت و سرکشی سے محفوظ ہونے کی دلیل ہے کیونکہ گناہ و غلط کاری خواہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہو شیطان کے اغواء اور دعوت و تحریک سے الگ نہیں ہوتی۔

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے اغوائے شیطان سے محفوظ ہوں تو طبعی طور پر وہ گناہ سے بھی ہر طرح محفوظ ہوں گے۔

یہ آیات قرآن کا ایک حصہ ہے جو اللہ کے مخلص بندوں کا گناہوں سے محفوظ ہونے کے طور پر تعارف کرواتا ہے۔ اس سلسلہ میں اور آیات بھی ہیں جو اس جماعت کی ستائش و توصیف میں وارد ہوئی ہیں:[1]

ان آیات مبارکہ کے علاوہ اور آیات بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے مصادیق کی نشان دہی کرتی ہیں اور ان میں سے بعض کا تعارف کرواتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ (ص: ۴۵ تا ۴۷)

''ہمارے بندوں ابراہیم و اسحق و یعقوب کو یاد کریں جو صاحبانِ نعمت و بصیرت ہیں۔ ہم نے انھیں دوسرے گھر کی یاد کی بناء پر خالص اور پاک دل قرار دیا۔ وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور اچھے لوگوں میں سے ہیں اور یاد کیجئے اسماعیل، یسع اور ذوالکفل کو جو سب نیکوکار اور صالح بندے تھے۔''

یہ انبیائے کرام جن کے اسمائے گرامی ان آیات میں لیے گئے ہیں، جملہ **انا اخلصناھم بخالصة** کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مخلَص (لام پر زبر) بندوں کے طور پر متعارف ہوئے ہیں۔ آیات مبارکہ کے اس سلسلہ کو جن میں مخلص بندوں کے مصادیق کا تعارف کرایا گیا ہے، پہلی آیات کے ساتھ ملانے سے، جن میں مخلص بندوں کو وساوس شیطان سے بالکل محفوظ قرار دیا گیا ہے اور بالکل معصوم تسلیم کیا گیا ہے، واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کی یہ جماعت، جن کے اسمائے گرامی ان آیات میں لیے گئے ہیں، قطعی طور پر معصوم اور گناہ سے محفوظ ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک بنیادی اصول کے پیش نظر یعنی کوئی بھی انبیاء سے عصمت کی علیحدگی کا قائل نہیں ہوا، نہ ہی یہ کہ ان میں سے بعض کو معصوم اور بعض کو غیر معصوم قرار دیتا ہو، کہا جا سکتا ہے کہ اس جماعت انبیاء کے ساتھ دیگر انبیاء کی عصمت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

اس بیان کے ساتھ ہی ان آیات مبارکہ سے جو سورۂ انعام میں وارد ہوئی ہیں اور جو انبیائے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، عصمت انبیاء کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ قرآن ان آیات میں انبیاء کا ذکر کرتا، ان کی تعریف و توصیف کرتا اور فرماتا ہے:

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾ (انعام: ۸۷)

''ان انبیاء کو ہم نے برگزیدہ کیا اور سب کی راہِ راست کی طرف ہدایت فرمائی۔''

---

[1] سورۂ صافات آیات ۴۰، ۷۴، ۱۲۸، ۱۶۰، ۱۶۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں اجتبینا سے مراد فیضان عصمت ہی ہے۔ پھر جب انبیاء کی ایک جماعت معصوم اور گناہ سے محفوظ ہو تو یقینا باقی تمام انبیاء بھی اسی طرح معصوم اور محفوظ از گناہ قرار پائیں گے کیونکہ انبیاء کے بارے میں کسی قسم کے امتیاز وفصل کا کوئی قول وجود نہیں رکھتا۔

اس مفصل بحث میں مسئلہ عصمت پر اہم مباحث واضح طور پر سامنے آئے اور سب کے لیے دلائل قرآنی کی وضاحت ہوئی۔ یہ اہم مباحث درج ذیل امور سے عبارت ہیں:

۱: نزول وحی کے سلسلہ میں مصونیت انبیاء کرام

۲: اصول وفروع دین کے بیان وتبلیغ میں مصونیت

۳: فعل حرام یا ترک واجب کی صورت میں گناہ سے تحفظ۔

تاہم ان تینوں عنوانات کے واضح ہو جانے سے بھی مباحث عصمت ختم نہیں ہوتے۔ ایک اہم مسئلہ ابھی باقی رہ جاتا ہے جس کا تعلق زندگی میں انبیاء کے سہو ونسیان انسانی افکارِحیات سے ہے۔ یہ مسئلہ ''سہو النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، جو فریقین کی کتب میں مذکور ہے۔

ہم اس مسئلہ کی تحقیق کو اس کتاب کی چھٹی جلد پر اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ چھٹی جلد ''پیغمبر اکرمؐ کی شخصیت بطریق وحی الٰہی'' کی تصریح و وضاحت پیش کرے گی، ایسی شخصیت جس کی قرآن تصویر کشی اور وضاحت کرتا ہے۔

منجملہ ان مسائل کے جو آپ کی شخصیت معنوی کو پیش کرتے ہیں ایک مسئلہ آپ کے گناہ وخطا سے محفوظ ہونے کا ہے۔ اس بحث میں آنحضرتؐ کی عصمت ذاتی کے بارے میں آیات پیش کی جائیں گی۔ نیز وہ آیات سامنے لائی جائیں گی جو بظاہر آپ کی عصمت کے منافی خیال کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سہو النبی کے مسئلہ پر، جس کی طرف ایک جماعت مائل ہے، ضروری بحث کی جائے گی۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کو زیر بحث لایا جائے جو بظاہر انبیاء کی عصمت مطلقہ کے منافی ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں وہ آیات پیش کریں گے جو مزید بحث ووضاحت کی محتاج ہیں۔ تاہم آیات کا وہ سلسلہ جو عدم عصمت کی جانب ابہام واشارہ کرتی ہیں بہت ہی کمزور ہے بلکہ کوئی دلیل ہی نہیں رکھتیں۔ صرف ایک جماعت نے اپنے عقیدہ کو ان آیات پر بار کر دیا ہے۔ ہم انھیں معرض بحث میں نہیں لائیں گے۔

مخالفین عصمت کے دلائل

مسئلہ عصمت علم کلام کے اہم مسائل میں سے ہے جس سے بہت سے مسائل اصول اعتقادی تشکیل پاتے ہیں۔ اگر اس اصل (یعنی علم کلام) کو کسی نقصان کا سامنا ہو تو بہت سے مباحث کی شکل وتصور تبدیل ہوجائے یا بگڑ جائے۔ ان مسائل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قرآن کی ان کے بارے میں یہ عنایت ہے کہ وہ انھیں کبھی صراحت کے ساتھ اور کبھی بہ اشارات پیش کرتا ہے۔

ہم نے سابقہ مباحث میں عصمت انبیاء سے متعلق آیات کو مختلف مراحل میں پیش کیا۔ اس سے ہر منصف مزاج شخص (بشرطیکہ وہ پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکا ہو) کے لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ تمام انبیائے خدا اخذ وتلقین وحی، اس کے ضبط وتحفظ اور لوگوں کو اس کی تبلیغ وتعلیم کے بارے میں ہر قسم کی خطاء ولغزش سے محفوظ تھے۔ علی ہذا القیاس واجبات کے بجالانے اور محرمات کے ترک کرنے میں ان کی ذوات مقدسہ معاشرہ کے لیے اسوہ ونمونہ کی منزل میں ہیں۔

اس تمام کیفیت کے باوجود تاریخ کے تمام ادوار میں عصمت انبیاء کے مخالفین نے آیات قرآن کے ایک سلسلہ کو عدم عصمت انبیاء کے لیے بالعموم اور عدم عصمت پیغمبر اسلامؐ کے لیے بالخصوص بطورِ استدلال استعمال کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے تمام ذہنوں کو مشکوک اور آلودہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے ایک مرقع دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ان کے مقام اصلی سے نیچے لانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور نبوت ورسالت، نیز امامت کے مناصب کو معاشرہ کی منازل اور مناصب کے ہم ردیف قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ ہم مذکورہ آیات کو کسی قدر معرض بحث میں لائیں اور نتیجتاً مخالفین کے دلائل کو ناکارہ بنائیں۔

مخالفین عصمت کی پہلی دلیل

آیات کے اس سلسلہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱: آیات جو بظاہر تمام انبیاء کی عصمت کے لیے ساز گار نہیں۔

۲: آیات جن کا ظاہر بعض انبیاء، مثلاً حضرات آدم، یونس، داؤد وغیرہ کی عصمت سے موافقت نہیں رکھتا۔

۳: آیات جو براہِ راست پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں۔[1]

ہم یہاں ان تینوں سلسلہ ہائے آیات کی وضاحت پیش کرتے ہیں جو زیادہ تر مخالفین عصمت انبیاء بطور دلائل اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس بحث کو کہ یہ آیات مخالفین کے مدعاء بحث کے لیے بہت کمزور وضعیف ہیں، ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

---

[1] اس حصہ کی آیات پر چھٹی جلد میں بحث کی گئی ہے جو شخصیت پیغمبر از نظریہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہو ونسیان سے محفوظ ہونے پر مشتمل ہے۔

آیاتِ سلسلۂ اول

اس حصہ میں ہم ان آیات کے صرف دو حصوں پر روشنی ڈالیں گے جن کا مخالفین عصمت انبیاء زیادہ تر سہارا لیتے ہیں۔ ان آیات کا پہلا حصہ سورۂ یوسف اور دوسرا سورۂ حج میں ہے۔

ہم سورۂ یوسف سے شروع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٩﴾ (یوسف: ۱۰۹)

''ہم نے تم سے پہلے کچھ افراد کو شہروں میں بھیجا اور ان کی طرف وحی کی۔ کیا انہوں نے زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے آنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ آخرت کا گھر تو صرف پرہیزگاروں ہی کے لیے خوب ہے۔ کیا تم سوچتے نہیں؟''

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾ (یوسف: ۱۱۰)

''شہروں کے باشندوں نے اپنے آپ کو مخالفت انبیاء میں مستقل کر دیا حتی کہ ہمارے رسول مایوس ہو گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا ہے۔ اس موقع پر ہماری نصرت آن پہنچی۔ ہم جس کو چاہیں نجات دیتے ہیں اور گنہ گاروں سے عذاب کو پلٹایا نہیں جا سکتا۔''

کوئی شک نہیں کہ لفظ حتی کسی کام کی غایت اور انتہا کے بیان میں آتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی جملہ مقدر ہو جس کی انتہا کو یہ لفظ بیان کر رہا ہو۔ یہاں وہ جملہ یہ ہے:

''انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت و تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کرتے رہے۔ ان کی اقوام ان کے خلاف مقاومت کرتی رہیں اور مائل برحق نہ ہوئیں۔ حتی کہ انبیاء کی مایوسی کا لمحہ آن پہنچا۔''[1]

---

[1] گویا مندرجہ ذیل جملہ مقدر ہے "وما ارسلنا من قبلك الا رجالا فتراخی نصرهم حتى اذا استيأسوا عن النصر" (کشاف، ج ۲ ص ۱۵۷) یا جملہ "انا اخرنا العقاب عن الامم المکذبة لرسلنا حتى اذا بلغوا الى حالة يأس الرسل عن ايمانهم" (مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۷۱) یا ان کے مشابہ کوئی جملہ۔

عربی لغت میں ''یاس'' اور استیاس'' کے الفاظ میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ پہلا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں ناامیدی ایک حالت نفسانی کی شکل میں ظاہر ہو اور انسان بالکل مایوس ہو جائے۔ دوسرا لفظ باب ''استفعال'' کے حکم کے تحت یاس و ناامیدی کے آثار و علامات کے ظہور کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ انسان کو یاس و ناامیدی کا شکار بنا دیتا ہے جبکہ مقام یاس اس کے قلب میں محقق نہ ہوا ہو۔

بحث و دلیل کی آماجگاہ دوسرا جملہ ''وظنوا انهم قد كذبوا'' ہے۔ ''انہوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے گمان کر لیا کہ اللہ نے نصرت کے معاملہ میں ان سے جھوٹ کہا ہے۔

اس جملہ کو سمجھنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

الف: ظنوا اور كذبوا کے جملوں کے فاعل کون ہیں؟

ب) وہ بات کیا ہے جس کے بارے میں جھوٹ کا گمان ہوا؟

ذیل میں ہم دونوں مطالب کی تشریح کرتے ہیں:

الف: زیر نظر آیت میں الرسل ایک اسم ظاہر ہے اور چار ضمیریں ہیں جن میں دو ضمیر متصل ہیں۔ یعنی ظنوا اور كذبوا میں ''واؤ''۔ اسی طرح منفصل ضمیریں ہیں یعنی انهم اور جاءهم، پھر متن آیت حتى اذا استيئس الرسل وظنوا انهم قد كذبوا جاءهم نصرنا کی طرف توجہ کرتے ہوئے سب ضمائر کا مرجع ایک ہی جاننا چاہیے۔ ان ضمائر میں بعض کو 'رسل' اور باقی کو ان کے علاوہ (الناس) کی طرف نہیں پلٹایا جا سکتا۔ لہٰذا جو تفسیر بھی مرجع ضمائر کی علیحدگی کی بنیاد پر قرار پائے گی وہ ظاہر آیت کے خلاف ہوگی۔ لہٰذا جب تک کوئی دلیل قاطع اور یقینی نہ ہو اس طرح خلاف ظاہر کا ارتکاب درست نہیں۔

ب: آیہ مذکورہ کے ماقبل میں تکذیب کنندہ اقوام کو سزا اور پرہیزگار لوگوں کے نیک انجام کا ذکر ہے۔ یہ بات قابل غور ہے۔ اسی طرح انبیاء و صاحب ایمان لوگوں کی نجات اور مجرموں کی تباہی مذکور ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس بحث میں جس بات کو جھوٹ قرار دیا گیا ہے اس کا تعلق انبیاء و صاحبانِ ایمان کی نصرت اور ان کے مخالفین کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب ہم آیت کے ظاہری معنی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان چند ایک احتمالات کا ذکر کرتے ہیں جو مفسرین نے اس بارے میں پیش کیے ہیں۔[1]

پہلی تفسیر

جملہ ''وظنوا انهم قد كذبوا'' سے مراد یہ ہے کہ انبیاء نے یہ خیال کیا کہ چھوٹی سی جماعت جس نے بظاہر ان پر ایمان ظاہر کیا۔

---

[1] مفسرین نے جو احتمالات پیش کیے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جن کی ہم اس جگہ تشریح کر رہے ہیں۔ لیکن اہم احتمالات یہی ہیں جن کو ہم نے اس بحث میں پیش کیا ہے۔

دراصل ان سے جھوٹ کہہ رہے تھے اور حقیقتاً اللہ کے یہ رسول بالکل تنہا تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکش و گمراہ اقوام ان کی مخالفت اور ان کے خلاف ظلم کرنے میں اس قدر پختہ اور مستقل تھے کہ انبیاء یہ گمان کرنے لگے کہ حقیقت میں کوئی شخص بھی ان پر ایمان نہیں لایا حتی کہ وہ مختصر سا گروہ بھی جنہوں نے اظہارِ ایمان کیا تھا، جھوٹ بول رہے تھے۔ [۱]

مفسرین کے پیش کردہ احتمالات میں یہ احتمال ایک طرح سے بہترین قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پیش نظر ضمائر میں افتراق پیدا نہیں ہوتا، لیکن دوسرے نظریہ (جو کچھ گمان ہوا وہ جھوٹ تھا کہ وہ انبیاء کی نصرت اور گمراہوں کی ناپیدی کا مسئلہ تھا) کے ساتھ یہ احتمال مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ اس احتمال میں یہ تخیل پیدا ہوا ہے کہ ایک جماعت کا اظہارِ ایمان مبنی بر دروغ تھا، جبکہ آیت کے سیاق و سباق میں اس بات کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہوگا کہ لفظی و اصطلاحی معنی کے اعتبار سے آیت ایک خاص مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہ یہ کہ اقوام انبیاء ہٹ دھرم اور ان کے مقابلہ میں بہت شدید تھیں، خدا کی نصرت میں تاخیر ہوتی تھی اور جماعت اقل کا ایمان جس کا وہ اظہار کرتے تھے واضح اور مستقل نہ تھا حتی کہ انبیاء کو یہ گمان ہونے لگتا کہ ان کا ادعائے ایمان جھوٹ پر مبنی ہے۔

قطع نظر اس سے آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ یہ گمان خلاف واقعہ اور بالکل بے بنیاد تھا۔ (انبیاء کی تصدیق کرنے والوں نے ہرگز جھوٹ نہ بولا تھا)۔ لہٰذا اگر انبیاء نے باایمان افراد کے بارے میں ایسا گمان کیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان سے تشخیص امور واقعی میں اشتباہ و لغزش واقع ہوئی۔ یہ مطلب انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

اگر آیت واقعی اس جماعت قلیل کے ایمان کے کذب سے متعلق ہو تو لازم ہے کہ آیت اس بارے میں وضاحت کرے جو انبیاء کی حمایت میں ہو، درآنحالیکہ آیت کی ایسی چیز کی نشان دہی نہیں کرتی۔ بلکہ آیت تو کہہ رہی ہے "ہم نے ان کو ان کے پیغمبر کے ساتھ نجات عطا فرمائی۔" یہ نہیں کہا کہ "ان کا ایمان اللہ کے رسولوں پر صادقانہ تھا۔"

دوسری تفسیر

"ظنوا" کی ضمیر سے لوگ یا پھر مومنین کی جماعت مراد ہے۔ یعنی انبیاء کی دشواریاں اور مشکلات اس نوبت کو پہنچ گئیں کہ لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ جو وعدۂ نصرت انبیاء سے کیا گیا ہے وہ جھوٹ ہے۔ [۲]

---

[۱] طبرسی نے اس نظریہ کو نظریہ دوم کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ (مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۷۱)

[۲] المیزان ج ۱۱ ص ۳۰۷۔ یہ نظریہ سعید بن جبیر سے نقل ہوا ہے۔ علامہ طباطبائی مرحوم نے اس وجہ کو انتخاب کیا ہے۔ وہ آیت میں ایک جملہ کو مقدر جانتے ہیں جیسا کہ فرماتے ہیں: "حتی اذا استیئس الرسل من ایمان اولئك الناس وظن الناس ان الرسل قد کذبوا ای اخبروا بالعذاب کذبا......"

اس تفسیر پر اگرچہ سابقہ اعتراض وارد نہیں ہوتا تاہم یہ بظاہر آیت کے خلاف ضرور ہے کیونکہ ظاہر آیت چاروں ضمیروں کے مرجع کا اتحاد ہے۔اس تفسیر میں پہلی ضمیر 'ظنوا' کا مرجع لوگ ہیں اور باقی تین ضمیروں کا مرجع پیغمبر ہیں۔لہٰذا جب تک کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو ظاہر آیت کے خلاف بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔آیت کا ظاہر یہ ہے کہ تمام ضمائر کا مرجع اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

تیسری تفسیر

آیت کی تمام ضمیریں ''رسل'' کی طرف لوٹتی ہیں۔ظاہر ہے کہ پیغمبر ہی ایسا گمان کرتے تھے۔اس قسم کا گمان ہر ایسے انسان کی طبیعت کا مقتضی ہے جو مشکلات اور دشواریوں کے انبوہ کثیر میں پھنسا ہوا ہو اور جس کا استغاثہ جواب نہ پائے۔یہ وہ کیفیت ہوگی جو ایک لمحہ ناپائیدار کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اس کے دل میں یہ گمان پیدا ہو کہ نصرت خدا کا وعدہ مبنی بر دروغ ہے۔پھر فوراً ہی فکر صحیح اس لمحہ ناپائیدار کی جگہ لے لے اور وہ سوچے کہ وعدۂ نصرت پروردگار مشروط بہ شرائط ہے جو ہنوز متحقق نہیں ہو پائیں۔

یہ تفسیر وحدت مرجع ضمائر کے تحفظ کے باوجود مقام انبیاء سے مطابقت نہیں رکھتی، جو عصمت مطلقہ کے حامل ہوتے ہیں اور ہمیشہ ''روح القدس'' ان کی تائید کرتا ہے۔ان سے یہ گمان، خواہ وہ ایک لحظہ برق آسا کے لیے ہو، بالکل ناپائیدار ہو اور فوراً ہی فکر صحیح اس کی جگہ لے لے، ہرگز ممکن نہیں۔[1]

چوتھی تفسیر

اس تفسیر میں چاروں ضمائر کے مرجع کی وحدت محفوظ رہتی ہے۔اس میں انبیاء کی عصمت مطلقہ پر بھی کوئی حرف نہ آئے گا۔یہ بات اس صورت میں واضح ہو جائے گی جب ہم اس آیت کی نظائر کو تفسیر کی صورت میں آیت کے بدلے آیت کے مطابق معرض بحث میں لائیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں، جب وہ اپنی قوم کے ہاتھوں غضبناک ہوئے، انھیں چھوڑ دیا اور اس مقام سے روانہ ہو گئے، اس طرح فرماتا ہے:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ (انبیاء: ۸۷)

---

[1] یہ احتمال ابن عباس سے نقل ہوا ہے۔کشاف اس بارے میں کہتا ہے:

''فان صح هذا عن ابن عباس فقد اراد ما يخطر بالبال و يحبس في القلب من شبه الموسوسة و حديث لنفس على ما عليه البشرية وما الظن الذى هو ترجيع احد الجائزين على الاخير فغير جائز على رجل من المسلمين فما بال رسل الله الذين هم اعرف الناس بربهم و انه متعال عن خلف المعياد منزه عن كل قبيح۔''

''مچھلی والا (یونس) غصہ کی حالت میں اپنی قوم سے دور ہو گیا، اور اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر عرصہ (حیات) کو تنگ نہیں کریں گے۔''[1]

حضرت یونس کا یہ گمان ہرگز گمان قلبی نہ تھا۔ یعنی اس قسم کے گمان کا ان کے قلب میں گزر ہی نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان کا عمل، اپنی قوم کو چھوڑ دینا اور ان سے الگ ہو جانا اس امر کی نشان دہی کرتا تھا کہ انہیں ایسا گمان ہوا ہے۔ لہٰذا جب ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور وہ مچھلی کے شکم میں پہنچ گئے تو ذکر خدا کرنے لگے اور عرض کی:

"اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"

''تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک و منزہ ہے، میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔''

قرآن بنی النضیر کے یہودیوں کے بارے میں، جنہوں نے ایک مسلمان کو قتل کرنے کے بعد گرفتاری کے خوف سے اپنی دکانیں بند کر دیں اور اپنے قلعوں میں پناہ لے لی، اس طرح فرماتا ہے:

وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ (حشر: ۲)

''انہوں نے خیال کیا تھا کہ ان کے قلعے عذاب الٰہی سے ان کی حفاظت کر لیں گے۔''

یہودیوں کے اس گمان کا باعث ان کی صورت حال کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے سوچ لیا ہے کہ ان کے قلعے ان پر مسلمانوں کے تسلط میں مانع ہوں گے، ورنہ وہ ان میں پناہ حاصل نہ کرتے۔ ان کے اس ظن کو ثابت کرنے کے لیے ان کا عمل کافی ہے، خواہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

ہم بھی بعض اوقات دنیا پرست و حریص لوگوں کے بارے میں، جو شب و روز دولت جمع کرنے اور عمارات و محلات بنانے میں مصروف رہتے ہیں، اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں شخص گمان کرتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسے موت نہیں آئے گی۔ اس قسم کی تنقید کا باعث اس کا عملی کردار ہوتا ہے اور اس کے شب و روز کے مشاغل اس کے متعلق اس قسم کے ظن کی گواہی دیتے ہیں اگرچہ اس کے دل میں یہ خیال کبھی نہ آیا ہو اور دوسرے لوگوں کی طرح جانتا ہو کہ موت ضرور آئے گی۔

اس قسم کے اشتباہ و نظائر پر غور کرنے سے آیہ مبارکہ ''وظنوا انهم قد كذبوا'' کے معنی و مقصود کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو یہ ہے کہ وعدۂ نصرت غلط ہے، انبیاء کی فکر و سوچ کے مطابق نہیں بلکہ ان کے نفوس و ارواح اس مقام سے بلند و بالا تھے کہ اس قسم کے شیطانی افکار سے آلودہ ہوتے۔ اس کے بالمقابل وضع خارجی اس طرح ضرور تھی کہ کہا جا سکتا تھا گویا انبیاء نے گمان کیا کہ وعدۂ نصرت صحیح نہ تھا۔ اس کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ

---

[1] آیت میں 'نقدر' ضیق و تنگی کے معنی میں ہے جیسا کہ ''ومن قدر عليه رزقه'' (سورۃ طلاق آیت ۷) ''وہ کہ جس پر طریق زندگی تنگ ہو۔'' یہ لفظ کبھی بھی قادر ہونے کے معنی میں نہیں ہو گا۔ افسوس ہے کہ بعض مدعیانِ تفسیر نے اس کے دوسرے معنی لیے ہیں۔

ایک طرف تو مخالفین کی جانب سے مسلسل سنگ باری، ان لوگوں کی طرف سے محاذ آرائی جن کی ہدایت پر یہ مامور تھے، دوسری طرف ایمان لانے والوں کی بہت قلیل تعداد اور تیسری طرف مومنین کی فریاد، ایام زحمت کی طوالت، نصرت الٰہی میں تاخیر، حتی کہ اللہ کے نبی اور باایمان افراد چشم براہ ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ''متی نصر اللہ'' (اللہ تعالٰی کی مدد کب آئے گی)، غرضیکہ اس قسم کے حالات و کیفیات خارج سے ہر دیکھنے والے کے دل میں اس گمان کا باعث ہو سکتے ہیں کہ نصرت کا وعدہ کہیں جھوٹا تو نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ گمان انبیاء کا نہ تھا اور نہ ہی ان کی زبان سے کبھی ایسا ظاہر ہوا تھا بلکہ زبانِ حال اور ان کی حالت زار کا ظاہری نتیجہ تھا جس سے ہر بادی النظر میں دیکھنے والے کے دل میں یہ گمان پیدا ہوتا تھا۔

قرآن صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے امم سابقہ کی کیفیات اور ان کے انبیاء کی مشکلات کی تشریح کرتا ہے کہ ان کی حیات مقدسہ (بأسائ) شدت و تنگی سے آمیختہ تھیں لیکن ابھی تم مسلمانوں کے لیے یہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین امم سابقہ کی طرح فریاد بلند کرتے ہوئے کہہ اٹھیں کہ اللہ کی طرف سے نصرت کب آئے گی اور یہ انتظار کب ختم ہو پائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾ [1] (بقرہ: ۲۱۴)

''کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی امم سابقہ کی کیفیات تم پر نہیں آئیں؟ وہ امتیں جو سختی و شدت میں مبتلا تھیں (تم تو اس قسم کی کیفیات سے دوچار نہیں ہوئے) حتی کہ ان کے پیغمبر اور مومنین کہہ اٹھیں کہ اللہ تعالٰی کی مدد کب آئے گی۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالٰی کی نصرت قریب ہی ہے۔''

ایسے بحرانی حالات، مشکلات کا ہجوم، انھی میں نالہ و فریاد عوام الناس، طول مشقت، نصرت خداوندی میں مصلحت آمیز تاخیر، یہ سب حالات مل کر یہ تخیل تجویز کرتے تھے کہ وعدۂ نصرت مبنی برحق نہ تھا درآنحالیکہ یہ فکر و اندیشہ انبیاء کے ذہن میں ہرگز نہ تھا۔ یہ حضرات ہمیشہ اللہ کے وعدہ کے حق اور مستقل ہونے پر ایمان رکھتے تھے اگرچہ حالاتِ حاضرہ و انداز فکر و عوام اور شرائط زندگی انبیاء کے عقیدہ کے خلاف شاہد تھے۔

آپ اس جواب کو زبان علمیہ میں بھی بیان کر سکتے ہیں اور وہ اس طرح کی فرض کریں کہ آیت سے بظاہر مراد یہ ہے کہ انبیاء سے کذب اور جھوٹ بولا گیا۔ ان حضرات سے جھوٹ کہے جانے کے معنی یہ ہوئے کہ خود اللہ تعالٰی نے ان سے جھوٹ بولا ہوگا کیونکہ اسی نے وعدۂ نصرت کیا تھا جبکہ نصرت نہ فرمائی۔

لیکن سوچنا پڑے گا کہ خدا کی طرف یہ نسبت دروغ ''اضلال و استہزاء و کید و مکر'' کی نسبتوں سے بالاتر نہیں جو قرآن میں مذکور ہیں،

---

[1] حتی جملہ لما یاتکم سے متعلق ہے۔ مثل سے و زلزلوا تک جملہ معترضہ ہے اور یاتکم کا فاعل ہے۔ حقیقت میں اس طرح فرماتا ہے:
ولما یاتکم ذلک الوضع حتی یقول الرسول ......

جبکہ یہ صفات بھی جھوٹ ہی کی شاخیں قرار پا سکتی ہیں۔جس طرح قرآن میں ان نسبتوں میں سے کسی نسبت کا خداوند تعالیٰ کی طرف ذکر کسی پریشانی کا باعث نہیں بنتا اور سب لوگ بڑے حوصلہ اور سکون سے ان آیات کی بہتری کی طرف تفسیر کرتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات ''خذ الغایات و اترک المبادی'' کا مصداق ہیں۔(یعنی ان مفاہیم کے مقام ربوبیت کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں نتائج کو لے لو اور مقدمات کو چھوڑ دو) خداوند عالم میں آثار ''مکر و کید'' اور ''استہزاء و اضلال'' کے آثار تو ہیں لیکن یہ سب خود کوئی وجود نہیں رکھتے۔مثلاً نتیجہ مکر تو مورد خدا میں موجود ہوتا ہے جبکہ مکر بذاتِ خود جو ایک عاجز و کمزور فرد کا کام ہے، کوئی وجود نہیں رکھتا۔

اس بیان کی رو سے زیر بحث آیت کے لیے ہم کہتے ہیں کہ اس سے دو مطالب سامنے آتے ہیں:

۱: (معاذ اللہ!) خدا نے انبیاء علیہم السلام سے جھوٹ بولا ہے۔

۲: اس دروغ گوئی کا نتیجہ کیا ہے؟

ہم مطلب اول کو مبادی و مقدمات کہتے ہیں اور دوسرے کو آثار و غایات کا نام دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بھی ''مکر و اضلال وغیرہ'' جیسے الفاظ سے مطلب اول کو قطعاً کوئی مدد نہیں ملتی۔یہ امر محال ہے کہ دانا و توانا اور ہر شخص اور چیز سے بے نیاز پروردگارِ عالم کسی سے جھوٹ کہے، جبکہ دوسرا مطلب یعنی جھوٹ کا نتیجہ جو 'عدم موفقیت'' اور کسی کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا ہے، واقعیت میں جلوہ نما ہو۔یعنی اللہ کے رسولوں نے اپنے آپ کو مقام ''عدم موفقیت'' اور ''خود واگزاری'' میں دیکھا، جملہ ''**وظنوا انهم قد كذبوا**'' کے معانی کو اپنی قلمروئے زندگی میں موجود پایا۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ (معاذ اللہ) انبیاء کرام سے جھوٹ بولا گیا بلکہ انہوں نے اس کے آثار و لوازم کو، جو عدم موفقیت اور طریق تبلیغ میں شکست کی صورت میں ہوتے ہیں، خود مشاہدہ و محسوس کیا۔لیکن خدا کی نصرت اچانک آن پہنچی اور اس نے ان افکار کو معدوم کر دیا۔

قرائن ظاہری پر غور کرنے سے، جن کا ہم نے اس سلسلہ میں ذکر کیا، واضح ہو جاتا ہے کہ آیت صرف ایک ہی معنی نہیں رکھتی۔آیت کا مقصد ہرگز عصمت انبیاء کے خلاف نہیں۔انبیائے الٰہی کی یہ تعریف ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ اللہ کی طرف سے وعدہ خلافی کا گمان کریں۔جبکہ ایک عام آدمی بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ گمان نہیں کرتا چہ جائیکہ انبیاء اور وحی سے تعلیم پانے والے ایسا کریں۔

ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں کہ ''استیاس'' یاس و ناامیدی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس مقام میں قرار پانے کے ہیں۔اسی طرح آیت میں 'ظن' سے مراد بھی اس کے مقام میں قرار پانا ہے نہ کہ ظن حقیقی۔یعنی ان کی وضع و کیفیت اس مقام پر پہنچی ہوئی تھی کہ ان تصورات کے مطابق معلوم ہوتی تھی۔لہٰذا یہ وضع اور ہجوم مشکلات خود اس بات کے متقاضی تھے کہ ہر شخص میں اسی قسم کی فکر پیدا ہوا اور وہ سوچنے لگے۔

ہم ان چاروں مباحث کو قارئین کرام کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ وہ خود اس سلسلہ میں فیصلہ کر سکیں۔

مخالفین عصمت کی دوسری دلیل

ہم مخالفین عصمت کی پہلی دلیل اور نتائج سے واقف ہو چکے۔اب ہم اسی موضوع پر ان کی دوسری دلیل کو معرض بحث میں لاتے ہیں

جو سورۂ حج کی آیات ۵۲، ۵۳ اور ۵۴ پر مبنی ہے جن کی تفسیر میں ان لوگوں نے کسی قدر ناموزونیت سے کام لیا ہے۔ ان آیات مبارکہ کا متن و ترجمہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾

''ہم نے کوئی رسول و نبی آپ سے پہلے نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب بھی وہ کوئی خواہش کرتا تو شیطان اس کی تمنا میں مداخلت کرتا۔ اس وقت جو کچھ شیطان القاء کرتا ہے خدا اسے محو کر دیتا اور اپنی آیات کو مستحکم فرماتا ہے۔ اللہ دانا و حکیم ہے۔''

۲: لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

''جو کام شیطان انجام دیتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس جماعت کے لیے سبب آزمائش قرار دیتا ہے جن کے قلوب مریض ہیں، وہ قسی القلب ہیں اور ظالموں کے درمیان انتہا درجہ کا اختلاف ہے۔''

۳: وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

''تاکہ صاحبانِ علم جان لیں کہ قرآن برحق ہے اور آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے، اس پر ایمان لے آئیں اور ان قلوب اس میں خضوع کریں۔ یقیناً اللہ ان لوگوں کی جو ایمان لے آئیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔''

مخالفین عصمت اپنے استدلال کی بنیاد پہلی دو آیات پر قائم کرتے ہیں جو کہتی ہیں کہ جب بھی کوئی نبی کسی چیز کی تمنا کرتے تو شیطان ان کی آرزوؤں میں مداخلت کرتا اور خداوند عالم القائے شیطانی کو اسی وقت محو نا پید فرما دیتا۔ مثلاً اس طرح فرض کریں کہ شیطان انبیاء کے فکر یا بیان میں مداخلت کرتا اور خلاف حقیقت بات کو ان کی زبان پر جاری کر دیتا یا ان کے ذہن میں کوئی ایسی بات ڈال دیتا تو خداوند تعالیٰ ایسی باتوں کو ان کے ذہن سے محو فرما دیتا۔

اس قسم کی غلط و غیر مناسب تفسیر مفاد آیت سے ناواقفیت کی پیداوار ہے جو ابھی درج ذیل تین مطالب پر بحث سے واضح ہو جائے

گی ۔وہ تین مطالب یہ ہیں:

الف: انبیاء کی تمنا سے کیا مراد ہے؟

ب: انبیاء کی تمناؤں میں مداخلت شیطان کیسے ہوتی تھی؟

ج: اس مداخلت کے اثرات کے خدا کی جانب سے محو نا پید ہونے سے کیا مراد ہے؟

ان تینوں مطالب کی وضاحت مکمل طور پر مخالفین عصمت کو خاموش کر دے گی ۔

الف: تمنائے پیمبراں

عربی زبان میں لفظ "تمنیٰ" کسی شے کے وجود کو فرض کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔انسان کی آرزو کو اس لیے "تمنیٰ" کہتے ہیں کہ خارج میں کی چیز کو فرض کر لیا جاتا ہے ۔[1]

جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے ان کی تمنا آئین الٰہی کی تبلیغ اور اپنی اقوام کے درمیان اس کی نشر و اشاعت کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی ۔ یہ حضرات قسم قسم کے مصائب و شدائد برداشت کر کے اپنے ہدف کی راہ میں استقامت کے ساتھ اپنی قوم کی ہدایت کے منصوبے بناتے تھے ۔اس امر میں ان کی سعی پیہم اور استقلال ، جو ان کی پوری حیات طیبہ پر محیط ہوتا تھا ، واضح ترین شاہد ثابت ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ (یوسف: ١٠٣)

"اکثر لوگ ایسے ہیں کہ آپ ان کے ایمان لانے کی جس قدر بھی تمنا کریں ، ایمان نہ لائیں گے ۔"

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بے نظیر استقامت کے ساتھ اپنی قوم کو توحید پرستی کی دعوت دی ۔لیکن اس کا نتیجہ وہی تھا جس کا خود ان ہی کی زبانی ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾ ثُمَّ اِنِّىْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ اِنِّىْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ﴿٩﴾ (نوح: ٧تا٩)

"اور میں جب بھی انہیں تیری طرف بلاتا ہوں تا کہ تو انہیں بخش دے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ، اپنے سروں پر کپڑا ڈال لیتے (تا کہ میری بات نہ سن پائیں) اور اس کام میں اصرار و تکبر کرتے

---

[1] مقاییس ، ج ۵ ، ص ۲۷٦

ہیں۔ میں نے انھیں واضح اور ظاہر دعوت بھی دی اور کبھی خفیہ طور پر بھی تیری طرف پکارا۔''
یہ ہیں وہ تاکیدی دعوتیں جو تمنائے انبیاء علیہم السلام کی مظہر ہیں جن کو آیت زیر بحث بیان کرتی ہے۔

ب: تمنائے انبیاء میں مداخلت شیطان

تمنائے انبیاء علیہم السلام میں مداخلت شیطان دو طرح پر متصور ہوتی ہے:

۱: انبیاء کے عزم و ارادہ میں خلل پیدا کرتا ہے، ان کے قلوب میں وساوس ڈال کر ان کی روح میں یاس و ناامیدی پیدا کر کے انہیں ان کے مقاصد کو بروئے کار لانے سے روکتا اور کہتا ہے کہ یہ لوگ قابل ہدایت نہیں ہیں، لہٰذا انہیں دعوت دین دینا بے کار ہے۔

یہ احتمال قرآن مجید کی دیگر آیات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن کریم واضح دلائل پیش کرتا ہے کہ شیطان بندگانِ خدا پر دسترس نہیں رکھتا اور بندگانِ خدا کا کامل ترین مصداق اللہ تعالیٰ کے پیغمبران ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ (حجر ۴۲ و اسراء: ۶۵)

''میرے بندوں تک تجھے رسائی اور ان پر تیرا تسلط نہیں ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ خود شیطان واضح طور پر معترف ہے کہ میں خدا کے مخلص بندوں تک رسائی نہیں رکھتا۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے:

فَبِعِزَّتِکَ لَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۸۳﴾

(ص: ۸۲، ۸۳)

''تیری عزت کی قسم! تیرے سب بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے ان کے جو ان میں مخلص ہیں۔''

اپنے فرائض کی انجام دہی میں سستی اغوائے شیطانی کا مصداق ہے جو آیات سابقہ کے مطابق انبیاء پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

۲: لوگوں کو انبیاء کے خلاف بھڑکانا، اقوام میں ان کی مخالفت کو ہوا دینا، ان کے منصوبوں کو خراب کرنا، ان کی تمناؤں کے حصول کو ناکام بنانا، یہ سب انبیاء کی تمناؤں میں مداخلت شیطان کے مصادیق ہیں جن پر آیات قرآن شاہد ہیں:

یَعِدُهُمۡ وَیُمَنِّیۡهِمۡ ؕ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾ (نساء: ۱۲۰)

''شیطان ان سے وعدہ کرتا ہے، ان کو آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے لیکن اس کے وعدے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔''

وَقَالَ الشَّیۡطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَکُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَوَعَدۡتُّکُمۡ فَاَخۡلَفۡتُکُمۡ ؕ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ

فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (ابراھیم:۲۲)

''جب کام نکل جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ خدا نے تم سے ٹھیک وعدہ کیا تھا میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا۔لیکن میں نے اس سے مختلف کیا۔ میں تم پر دسترس نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمھیں (برے افعال کی) دعوت دی اور تم نے میری اس دعوت کو قبول کرلیا۔لہٰذا مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو برا کہو۔''

یہ اور دیگر ایسی ہی آیات جو فعالیت انبیاء کو ناکام بنانے اور لوگوں کو انوارِ الٰہی کی مخالفت پر تحریک کرنے کے بارے میں شیاطین کی مساعی کو بیان کرتی ہیں، اس بات پر واضح ترین گواہ ہیں کہ انبیاء کے فرائض اور خواہش کے خلاف لوگوں کو دعوت دینا ہی انھیں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ معلمین اور ان کی درسگاہ کے خلاف بھڑکانا کہلاتا ہے۔

ج: مداخلت شیطان کا ابطال

انبیاء کی مساعی کو ناکام کرنے کے لیے شیطان کی مداخلت کے اثرات کا ابطال ہی وہ منزل نصرت پروردگار ہے جو ہمیشہ انبیاء اور باایمان افراد کے شامل حال رہی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (مومن:۵۱)

''ہم اپنے انبیاء اور باایمان افراد کی اس حیات دنیوی میں مدد کرتے ہیں۔''

مداخلت شیطان کی ناپیدی کبھی دشمنانِ حق کی تباہی، کبھی ان کے تختۂ زمین کے الٹنے یا انھیں غرق دریا کردینے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔نتیجتاً اللہ کے نبی اور مومنین ان سے نجات پالیتے ہیں۔ یہ مسئلہ حضرات نوح، لوط، شعیب، موسیٰ اور اسی طرح دیگر انبیاء کی تاریخ اور قصوں سے مکمل طور پر واضح و مشخص ہوجاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ ایک پرانی سنت کو بیان فرماتا ہے کہ ایک طرف تو انبیاء خدا ہمیشہ مقاصد خداوندی کو سامنے لانے کے لیے منصوبہ بندی کرتے اور میدانِ عمل میں داخل ہوتے تھے اور دوسری طرف شیاطین اور سعادت کے دشمن انسان لوگوں کے قلوب میں وسوسے ڈال کر انھیں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے خلاف جنگ کرنے کی رغبت دلاتے، زندگی کے ماحول میں حق و باطل کے درمیان نبرد آزمائی کی صورت پیدا کرتے اور شیطان سے فریب کھائے ہوئے لوگ انبیاء کے مقاصد کے تحقق میں تعویق و تاخیر اور آسیب وخلل پیدا کرتے تھے۔اس کے نتیجہ میں آخر امدادِ غیبی پہنچ جاتی، انبیاء اور مومنین کی استعانت کرتی اور ان کی سرزمین کو مخالفین کی ہلاکت و ناپیدی کے ذریعہ پاک کردیتی تھی۔

آیات قرآن مجید میں غور وخوض سے یہ سنت الٰہی واضح ہوجاتی ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے دوسری اور تیسری آیات میں غور کرنے سے

انبیاء کے لائحہ عمل کے خلاف شیطان کی مداخلت کے اسباب کی تصریح ہوتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان کی مداخلت کا مقصد اور اس کے بعد اس کے افعال کا ابطال انسان کی آزمائش کی منزل ہے۔ یہاں لوگوں کی دو جماعتیں ہیں۔

۱: ایک جماعت مریض وسنگدل لوگوں کی ہے جو شیطان کے فریب میں آکر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (حج: ۵۳)

''انبیاء کے مصلحانہ لائحہ عمل میں شیطان کی مداخلت مریض قلوب کے لیے سبب امتحان ہے جو حق وحقیقت سے گہری مخالفت کی بناء پر اس کی پیروی کرتے ہیں۔''

۲: حق کی دانا وآشنا جماعت، یہ جماعت انبیاء کے لائحہ عمل اور مساعی کو حق جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ[1] اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ (حج: ۵۴)

''جب وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان کے قلوب اس کے مقابلہ میں خاضع وخاشع ہوتے ہیں۔''

جیسا کہ فرماتا ہے:

فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ (حج: ۵۴)

''وہ ان پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے سامنے ان کے قلوب خاضع وخاشع ہوجاتے ہیں۔''

خلاصۂ بحث یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی مساعی پیہم، ہدایت اقوام کے سلسلہ میں ان کے منصوبے اور لائحہ عمل، اس کے خلاف شیطان کی سازش اور انبیاء کے خلاف لوگوں کی تحریک مومنین وآگاہ لوگوں، نیز کفار ومریض قلوب کے لیے منزل آزمائش ہے۔ پہلی جماعت مقام آزمائش میں کامیاب نکلتی ہے، حق کو باطل سے الگ کرلیتی ہے، انبیاء کی دعوت کی حقانیت کو تسلیم کرتی ہے اور حق کے مقابل خشوع وخضوع روا رکھتی ہے۔ دوسری جماعت حق کے خلاف شقاوت وتمرد کی بناء پر شیطان سے فریب کھاتی اور اپنے کفر پر باقی رہتی ہے۔

چند سوالات اور ان کے جوابات

۱: پہلی آیت میں ''ایاته'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: چونکہ موضوع بحث اللہ کے تمام پیغمبر ورسول ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے: ''من رسول ولا نبی''، لہٰذا اس سے آیات قرآن یقینا مراد نہیں ہیں بلکہ ان سے مراد دلائل ہدایت، علائم حقانیت اور انبیاء علیہم السلام کے سعادت آفرین نصب العین ہیں جو سب کے

---

[1] جملہ لیجعل پر عطف جو گذشتہ آیت میں ہے۔

سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں شمار ہوتے ہیں۔

۲: "فيؤمنوا به" کے جملہ میں مرجع ضمیر کیا ہے؟

جواب: یہ کے لفظ میں متمنا (آرزو شدہ) جس کا شاہد 'اذا تمنیٰ' کا جملہ ہے کی طرف لوٹتی ہے۔ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہو۔

۳: بعض مفسرین اس آیت کی ایک شان نزول نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مسجد الحرام میں سورۂ 'النجم' کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ آیت "ا ر ء يتم اللات و العزى و منوة الثالثة الاخرى" پر پہنچے تو یکا یک شیطان نے آپؐ کی زبان مبارک پر "تلك الغرانيق العلى و ان شفاعتهن ترتجى" کے جملے جاری کروا دیئے۔ مشرکین ان جملوں کی ادائیگی سے خوش ہو گئے کہ آنحضرتؐ نے ان کے خداؤں کی تعریف کی ہے۔ پھر دو جملوں کے بعد آیات کی تلاوت فرمائی۔ یعنی آیت الكم الذكر و له الانثى تلك اذا قسمة ضيزى ان هى الا اسماء سميتموها انتم و اباو كم ما انزل الله بها من سلطان... تا آخر سورۃ جو آیت سجدہ ہے (اسجدوا لله و اعبدوا) کی تلاوت فرمائی جس پر خود آنحضرتؐ، مسلمان اور مشرک سب سجدہ میں گر گئے۔ مشرکین بہت خوش تھے کہ آنحضرتؐ نے ان کے خداؤں کا اچھائی سے ذکر فرمایا ہے۔ اس موقع پر جبرئیل امین نازل ہوئے، آنحضرتؐ کو اس غلطی سے آگاہ کیا اور کہا کہ یہ جملے جو آپؐ نے کہے وحی الٰہی نہ تھے اور نہ ہی میں یہ جملے لایا ہوں۔ اس موقع پر یہ تینوں آیات زیر بحث نازل ہوئیں[1] کیا یہ شانِ نزول درست ہے؟

جواب: یہ شان نزول کئی جہات سے باطل و بے بنیاد ہے۔ ہم نے کتاب 'فروغ ابدیت' میں اس شانِ نزول کے بے اصل ہونے پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس میں سے کسی قدر یہاں بھی پیش کرتے ہیں:

۱: اگر یہ شانِ نزول صحیح و درست ہو تو لفظ "تمنى" کی جگہ کلمہ "تلى" استعمال ہونا چاہیے اور اس طرح کہنا ہوگا "وما ارسلنا من رسول و لا نبى الا اذا تلى القى الشيطان۔" حالانکہ لفظ "تمنى" استعمال ہوا ہے جو لغت قرآن اور عرب کے معروف کلام میں آرزو کے علاوہ اور کسی معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اگر کسی شاعر نے اپنے شعر میں اس لفظ کو تلاوت کے معنی میں استعمال کر بھی لیا ہو تو یہ استعمال شاذ کے حکم میں داخل ہوگا اور قرآن ہرگز اس معنی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

۲: شانِ نزول کا متن خود اس کے جھوٹ ہونے پر شاہد ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ جملے اپنی زبان مبارک پر جاری فرمائے اور پھر باقی آیات کی تلاوت جاری رکھی۔ جب آخر سورہ پر (جو سجدہ کی آیت ہے) پہنچے تو آپ خود اور مشرکین سجدہ میں گر گئے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مشرکین مکہ جو سب اہل زبان تھے، بلکہ ان میں

[1] تفسیر طبری، ج ۱۷، ص ۱۳۱، الدر المنثور، ج ۴، ص ۳۶۷، مجمع البیان، ج ۴، ص ۹۱

بعض تو سخنور اور فصاحت و بلاغت اور لغت کے بھی ماہر تھے، اس جملہ کو سن کر کیسے اتنے خوش ہو گئے، کہ اپنے جامہ میں پھولے نہ سمائے، حتی کہ آپ کی تلاوت کو غور سے سنا کیے اور سورہ کے اختتام پر آنحضرتؐ کے ساتھ ہی سجدہ میں گر گئے، حالانکہ بعد میں آیات سب کی سب ان 'غرانیق' خیرہ سر و تیرہ بخت کی مذمت میں ہیں۔ مثلاً آیہ مبارکہ "ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباؤ کم" یعنی "یہ سب بت خدائی کے لیے صرف خدا کا نام رکھتے ہیں، تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے انھیں غلطی سے خدا کہا ہے حالانکہ ان کے خدا ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔"

نہ صرف یہ آیت بتوں کی مذمت کرتی ہے بلکہ آخر سورہ تک اس سورہ کی اکثر آیات کسی نہ کسی طرح خود بتوں، بتوں پر ایمان رکھنے والوں اور ان کی طرف میلان رکھنے والوں، سب کی مذمت کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ١لْاُوْلٰى ﴿٥٠﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿٥٢﴾ (نجم: ۵۰ تا ۵۲)

"اس نے قوم عاد و ثمود کو نا پید کر دیا، ان میں کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ظالم و طغیان پیشہ قوم نوح کو اس سے پہلے نیست و نابود کر دیا تھا۔"

۳: شانِ نزول کا ظاہر یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے بے ساختہ یہ دو جملے کہہ دیئے جبکہ آپؐ سے پہلے کسی نے یہ جملہ نہیں کہے تھے حالانکہ زمانہ جاہلیت کے عرب طواف وسعی کے دوران یہ جملے کہہ کر سنت حج بجالاتے تھے۔

۴: انبیاء کی عصمت مطلقہ اور عصمت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو دلائل قطعی اور قرآن کی آیات صریح سے ثابت ہے، اس قسم کی شانِ نزول کو باطل قرار دیتی اور اس کو دشمنانِ اسلام کے افکار کی پیداوار قرار دیتی ہے۔ اگر اس شان نزول کو درست و صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر ایک ناقابل تلافی زد پڑے گی۔

اس شان نزول پر اس سے کہیں زیادہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو ہم نے بیان کیے، لیکن ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس بحث کی ابتداء میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ مخالفین عصمت انبیاء دو قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان میں بعض دلائل تمام انبیاء پر وارد کرتے ہیں ان میں سے اہم ترین کو ہم نے اس بحث میں ہدیہ قارئین کر دیا ہے۔

ان دلائل میں بعض خاص افراد کے بارے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی آیات اب بالترتیب قارئین کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔

عصمت آدم وسرگذشت شجر ممنوعہ

عصمت انبیاء کے مخالفین کی قوی ترین دلیل حضرت آدم وحوا کا واقعہ ہے جنہوں نے نہی خداوند تعالیٰ "ولا تقربا هذه الشجرة" کی صریح مخالفت کر کے اپنے کردار کی سزا پائی جوان کا بہشت سے اخراج تھا۔

قرآن نے واقعہ آدم کو مختلف سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔اس کی زیادہ تر تفصیل سورۂ ہائے بقرہ آیات ۳۵،۳۸،اعراف آیات ۱۹،۲۵اور طہٰ آیات ۱۱۵،۱۲۳میں پیش ہوئی ہے۔جو صاحبان اس سلسلہ میں زیادہ تحقیق کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ ان آیات کو یکجا کر کے مطالعہ فرمائیں اور تفسیر موضوعی کے طریق کار کے مطابق آیت بہ آیت تفسیر کر کے اس نہی حکم خدا اور اس کی مخالفت کی سزا کا مطالعہ کریں۔ہم اپنے موضوع کے مطابق تینوں سورتوں کی آیات کو اکٹھا کر کے یہاں پیش کرتے ہیں اور اصول تفسیر کی پیروی کرتے ہوئے آیت بہ آیت اس واقعہ کی تفسیر وتفصیل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں قرآن اس واقعہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

۱: وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ (بقرہ: ۳۵)

"ہم نے آدم سے کہا کہ تم اپنی زوجہ کے ہمراہ بہشت میں سکونت اختیار کرو اور اس میں ہر جگہ سے جو چیز تمھیں پسند ہو کھاؤ، لیکن اس درخت کے نزدیک نہ جانا کہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

۲: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

(بقرہ: ۳۶)

"پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور پھر انھیں اس مقام سے نکلوا دیا۔ہم نے ان سے کہا نیچے اتر آؤ جبکہ تم میں سے بعض ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے اور اب تمھارے لیے روئے زمین پر رہنے میں استقرار وفائدہ ہے۔"

۳: فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

(بقرہ: ۳۷)

''آدم نے اپنے پروردگار سے کلمات کی تلقی کی اور اس پر توبہ کی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔''

قرآن اس واقعہ کو سورۂ اعراف میں مفصل تر بیان فرماتا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

۱: وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝۱۹ (اعراف:۱۹)

''اور اے آدم تم اپنی زوجہ کے ساتھ بہشت میں سکونت اختیار کرو اور جو چاہو کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا کہ ظالموں میں سے ہوجاؤ گے۔''

۲: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۝۲۰ (اعراف:۲۰)

''پھر شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تا کہ ان کی مخفی برائیاں ظاہر ہوجائیں اور اس سے جھوٹ موٹ کہا کہ تمھارے پروردگار نے اس درخت (کے پھل کھانے) سے تمھیں اس لیے منع فرمایا تھا کہ اس کو کھا کر کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا ہمیشہ کے لیے جنت میں رہ جاؤ۔''

۳: وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ۝۲۱ (اعراف:۲۱)

''اور ان کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔''

۴: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝۲۲ (اعراف:۲۲)

''شیطان دھوکہ سے انھیں ان کے مقام سے نیچے لے آیا۔ انھوں نے اس درخت کا پھل چکھا تو ان کی برائیاں ظاہر ہوگئیں، برہنہ ہوگئے اور جنت کے درختوں کے پتے اپنے گرد لپیٹنے لگے تا کہ اپنی برائیوں کو چھپائیں۔ (اس موقعہ پر) ان کے پروردگار نے ان کو پکار کر کہا کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہ

کیا تھا اور تمھیں نہیں بتایا تھا کہ شیطان تمھارا کھلم کھلا دشمن ہے۔''

۵: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۲۳) (اعراف: ۲۳)

''ان دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

ان آیات میں سورۂ بقرہ کی آیات کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ زیادہ تفصیل و شرح سے بیان ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کے اجمال و اختصار کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ اعراف مکی سورتوں سے ہے اور پہلے نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا سورۂ اعراف میں تفصیل آ جانے کے بعد ضرورت نہ تھی کہ سورۂ بقرہ، جو مدینہ میں نازل ہوئی، اس میں دوبارہ اس کا مفصل ذکر کیا جائے۔

باوجودیکہ سرگذشت آدم ان دو سورتوں میں نازل ہو چکی تھی پھر بھی سورہ طٰہٰ میں یہ قصہ اس طرح پیش کیا گیا کہ کسی حد تک اس قصہ میں پیش آنے والی مشکلات کو حل کر دیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

۱: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۱۱۵) (طٰهٰ: ۱۱۵)

''ہم نے پہلے سے ہی آدم سے عہد لے لیا تھا لیکن وہ بھول گیا اور اس میں ہم نے استواریٔ عہد نہ پائی۔''

۲: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى (۱۱۶) (طٰهٰ: ۱۱۶)

''جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ اس نے انکار کر دیا۔''

۳: فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۱۱۷) (طٰهٰ: ۱۱۷)

''پس ہم نے کہا: اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ کہیں یہ تمھیں جنت سے نہ نکال دے کہ تم مشقت و زحمت میں پڑ جاؤ۔''

۴: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى (۱۱۸) (طٰهٰ: ۱۱۸)

''یہ جنت تیرے لیے ہے اور یہاں تو بھوکا اور برہنہ نہ رہے گا۔''

۵: وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۱۱۹) (طٰهٰ: ۱۱۹)

''یہاں تجھے پیاس نہ لگے گی اور نہ ہی تو تمازت آفتاب سے پریشان ہوگا۔''

۶: فَوَسۡوَسَ اِلَیۡهِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡكٍ لَّا یَبۡلٰی ﴿۱۲۰﴾ (طٰهٰ: ۱۲۰)

''شیطان نے اسے وسوسہ میں ڈالا اور کہا: اے آدم! کیا تو چاہتا ہے کہ عمر جاودانی کے درخت اور ملک فنا ناپذیر کی طرف میں تیری رہنمائی کروں؟''

۷: فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخۡصِفٰنِ عَلَیۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾ (طٰهٰ: ۱۲۱)

''آخر کار ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا اور ان کے جسم کا ناخوش آیندہ ظاہر ہوگیا۔ پس انھوں نے جنت کے پتوں سے اپنے بدنوں کو چھپایا۔ (اس طرح) آدم نے حکم عدولی کی اور بیراہ ہوا۔

۸: ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیۡهِ وَهَدٰی ﴿۱۲۲﴾ (طٰهٰ: ۱۲۲)

''پھر اس کے پروردگار نے اسے چن لیا۔ اس کی توبہ قبول فرمائی اور اس کی ہدایت فرمائی۔''

ان تمام آیات مبارکہ میں غور کرنے سے، جو ان تینوں سورہ ہائے قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کی نہی حکم الٰہی کی مخالفت میں نازل ہوئی ہیں۔ مندرجہ ذیل سوالات تفصیل کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور عصمت انبیاء کے قائل حضرات کو چاہیے کہ کسی حد تک ان کے جوابات کو سامنے رکھیں:

۱: جملہ ''ولا تقربا هذه الشجرة'' میں جو سورۂ ہائے بقرہ و اعراف میں واقع ہے، نہی الٰہی کی کون سی قسم مراد ہے، مولوی یا ارشادی؟

۲: سورہ بقرہ میں جملہ ''فازلهم الشيطان'' اور اس کے متوازی سورۂ اعراف میں جملہ ''فدلهما بغرور'' سے کیا مراد ہے؟

۳: نص قرآن کے مطابق شیطان اللہ تعالی کے مخلص بندوں تک جو انبیاء علیہم السلام رسائی نہیں پاتا۔ پھر جملہ ''فوسوس لهما الشيطن'' کے مطابق اس نے کس طرح حضرت آدم علیہ السلام تک رسائی حاصل کی؟

۴: سورۂ بقرۃ کے جملہ ''فتكونا من الظالمين'' یا سورۂ اعراف کے جملہ ''ربنا ظلمنا انفسنا'' سے کیا مراد ہے؟

۵: اگر حضرت آدم علیہ السلام سے گناہ سرزد نہیں ہوا تو پھر سورۂ طٰہٰ میں جملہ ''وعصى ادم ربه فغوى'' کے کیا معنی ہوئے؟

۶: اگر ان سے گناہ کا ارتکاب ہی نہیں ہوا تو پھر سورۂ بقرہ کا جملہ ''فتاب علیہ'' کیا مفہوم رکھتا ہے؟

۷: اگر نہی الٰہی کے خلاف عمل گناہ نہ تھا تو سورۂ اعراف کے جملہ ''و ان لم تغفر لنا و ترحمنا'' کے کیا معنی ہوئے؟

اب ہم اس مقام پر ان آن پہنچے کہ آیت بہ آیت تفسیر کے طریقہ سے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات پیش کریں۔

ا: "لاتقربا" میں نہی کی کون سی قسم ہے؟

صاحبان امرونہی سے جو اوامرونہی صادر ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

الف: امرونہی مولوی

اس سے مراد یہ ہے کہ امر کرنے والا اس منصب کا، جو اسے خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے یا اجتماع معاشرہ سے اسے ملا ہے، سہارا لے کر امرونہی کو بروئے کار لائے، مطابق اصطلاح با اختیار گفتگو کرے، یہ سوچ کر احکام امرونہی کا اجرء کرے کہ وہ بڑا ہے اور فرمانروا ہے، جبکہ اس کے سامنے والے اشخاص اس سے چھوٹے اور حکم بجالانے کے لیے ہیں۔ نیز امرونہی درحقیقت مولویت وعبودیت کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ [1]

ب: امرونہی ارشادی

اس سے مراد یہ ہے کہ حکم دینے والا اپنی برتری، مقام اور اختیار فرمان دہی کا اظہار نہ کرے۔ جو احکام وہ اپنے ماتحت لوگوں کو دے ان میں پند ونصیحت کی صورت پیدا کرے، غیر جانبدار لیکن خیر خواہ افراد کی طرح دلسوز و نیک اندیش ہو کہ ماتحت کے لوازم ورد عمل اس کو سمجھائے۔ اس صورت میں امرونہی محور ارشاد وہدایت کے گرد گردش کرتے ہیں۔

وضاحت موضوع کی خاطر ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک طبیب اپنے مریض کو ہدایت کرتا ہے کہ فلاں غذا سے پرہیز کرے اور دوائیاں بھی استعمال کرے۔ حکیم اگرچہ ہدایت دے دیتا ہے کہ بیمار ہر روز اس طرح عمل کرے، تاہم بیمار کا ہدایات حکیم سے انحراف اس اعتبار سے کہ یہ حکم طبیب کی مخالفت ہے، خارج میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس انحراف کا نتیجہ وہ نقصان ہر حالت میں مریض ہی کا ہوگا، طبیب نے اس بارے میں کچھ کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ اس کے علاوہ حکیم کی ہدایات کی مخالفت کسی طرح کا کوئی خارجی ردعمل نہیں رکھتی۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اگر خربوزہ کسی کے لیے نقصان دہ ہے اور اس کے کھانے سے اسے بخار ولرزہ طاری ہوتا ہے، تو وہ اگر طبیب کے منع کرنے پر کان نہ دھرے، تو اس کا ایک ہی اثر ہوگا یعنی اسے بخار ولرزہ پکڑ لے گا تاہم اس کے علاوہ حکیم کا حکم نہ ماننے کے باعث اسے اور کوئی سزا نہیں دی جاسکے گی۔

اس کی دوسری مثال اس طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ مولویت کی بنیاد پر حکم دیتا ہے کہ لوگوں پر لازم ہے کہ وہ نماز پڑھیں، زکوۃ وخمس ادا کریں، روزہ رکھیں اور جہاد کریں۔ پھر اس کے بعد بطور ارشاد فرماتا ہے: "اطیعوا اللہ" اب اگر ہم اس آخری امرونہی کے اجراء سے روگردانی کریں تو صرف اوامر سابقہ کی پیروی نہ کرنے اور ان کے ترک کی سرزنش کا ہم پر اطلاق ہوگا جبکہ "امر بہ اطاعت" یا "نہی از مخالفت" کے باعث

---

[1] اگر اس صورت میں آمر کا ارادہ وفرمان شدید ہو تو اسے واجب کہیں گے ورنہ بصورت دیگر اسے مستحب کا نام دیا جائے گا۔ اسی طرح نہی بھی ناہی کے ارادہ وخواہش میں شدت وضعف کے مطابق تحریمی وتنزیہی مولوی کی اقسام میں تقسیم ہوگی۔

کم سے کم ردعمل بھی ظاہر نہ ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اوامر اول کے عدم اجراء سے ایسے اوامر (نماز پڑھو وغیرہ) سے انحراف کا ردعمل ہماری طرف ظاہر ہوگا۔ امر ثانوی یعنی "اطیعوا اللہ" صادر ہو یا نہ ہو کیونکہ پیروی و اطاعت کا حکم بھی اگر چہ بصورت ظاہر حکم و فرمان ہی ہے، تاہم اس کی روح و حقیقت 'ارشادی' ہے نہ کہ مولوی۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھے تو وہ دو جرائم کا مرتکب نہیں ہوگا یعنی ایک تو یہ کہ اس نے حکم نماز کو ترک کیا اور دوسرے یہ کہ "اطعیو اللہ" کے حکم پر عمل نہیں کیا جو دوسری آیت میں وارد ہوا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ "تارک الصلوٰۃ" کی ایک سے زیادہ سزا نہیں اور وہ ترک نماز کی سزا ہے۔

کیا ثمر درخت کھانے کی ممانعت نہی ارشادی تھی؟

اب یہ تحقیق لازم قرار پاتی ہے کہ کیا درخت کا پھل کھانے کی ممانعت نہی مولوی تھی اور مولویت کی بنا پر صادر ہوئی تھی؟ اس صورت میں طبعی طور پر لوازم طبیعی اور آثار خارجی (جنت سے اخراج، لباس کا اتر جانا، دنیا میں اتر آنا، زحمات و مشقات میں مبتلا ہونا وغیرہ) کے علاوہ یہ نہی اپنی ذیل میں سزا بھی رکھتی تھی۔

یا پھر یہ کہ کیا اس نہی سے مراد صرف عمل کے لوازم طبیعی کے بارے میں ارشاد تھا؟ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنے دوست کو استعمال منشیات سے روکے جس کا نتیجہ تدریجی موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دراصل یہاں پر ثمر درخت کے کھانے کی ممانعت کی یہ صورت نہ تھی کہ خداوند عالم آقا و مولا ہے، آدم و حوا اس کے بندہ ہیں، لہٰذا بندہ کو جو حکم دیا جائے وہ بلا چون و چرا اس کی اطاعت کرے۔ بلکہ یہ ممانعت اس لحاظ سے تھی کہ درخت معہود کے پھل کا کھانا ناگوار نتائج کا حامل تھا اور اپنے بندے کو پیار و محبت کی بناء پر اس سے روکا گیا تھا۔

اس موضوع پر اور وارد شدہ آیات مبارکہ کی تحقیق و مطالعہ زیر بحث 'نہی' کے ارشادی ہونے کو بخوبی ثابت کرتا اور بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اس نظر سے نہ تھا کہ میں مولا ہوں اور تم میرے بندے ہو، کہ اس کی نافرمانی اصطلاحی طور پر معصیت قرار پائے، بلکہ یہ صرف ارشاد تھا اور اللہ تعالیٰ نے ایک ناصح مشفق کے طور پر آدم و حوا سے فرمایا تھا:

> "جب تک تم اس درخت سے نہ کھاؤ گے ہمیشہ جنت ہی میں رہو گے، جس کے نتیجہ میں تم کبھی بھوک، پیاس، عریانی اور تمازت آفتاب نہ دیکھو گے اور اگر اس سے کھالو گے تو اس کے مخالف ردعمل سے دوچار ہو جاؤ گے۔"

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿١١٧﴾

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

(طٰہٰ: ۱۱۷ تا ۱۱۹)

''ہم نے کہا: اے آدم! یہ (شیطان) تمھارا اور تمھاری زوجہ کا دشمن ہے۔ کہیں یہ تمھیں بہشت سے باہر نہ نکال دے جس سے تم تیرہ بخت ہو جاؤ۔ اب تو نعمات بہشت کے ہوتے ہوئے نہ تو تمھیں بھوک لگتی ہے، نہ تم برہنہ ہوتے ہو، نہ تمھیں یہاں پیاس یا تمازت آفتاب تنگ کرتی ہے۔''

یہ ہیں وہ قرائن جو اس نہی کے ارشادی ہونے کی تائید کرتے ہیں:

۱: جملہ ''فتشقی ''کو''فاء ''نتیجہ کے ساتھ لایا گیا ہے جو اس امر پر بہترین شاہد ہیں کہ اس نہی کی مخالفت کا نتیجہ (اصطلاحاً غرض نہی) یہ تھا کہ آدم اور ان کی زوجہ 'شقاوت' (بدبختی) پیدا نہ کریں۔ اس کے بعد کی آیت مبارکہ ''ان لك الا تجوع فیها ولا تعری'' اس شقاوت و بدبختی کو بیان کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے یا نہ کھانے میں فرق یہ ہے کہ نہ کھانے کی صورت میں عریانی و پیاس اور بھوک نہ ہوگی جبکہ مخالف صورت میں یعنی اس کا پھل کھا لینے سے یہ سب صورتیں وارد ہوں گی۔ اس تشریح میں کسی مواخذہ کا ذکر تک نہیں جو تمام نواہی مولوی میں ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں تو اس عمل کے طبیعی ردعمل کو بیان کیا گیا ہے خواہ اللہ تعالیٰ اس سے منع فرمائے یا نہ فرمائے۔

ہم زیادہ واضح طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہی وہ معنوی کیفیات نہیں رکھتی جو درگاہِ ایزدی سے دوری کا باعث بنتی ہوں بلکہ اس کی تمام کیفیات حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ محترمہ کی شخصی زندگی کی وضع سے متعلق ہیں۔

۲: اس بات کا دوسرا شاہد کہ پروردگار عالم اس نہی کے وقت منزل مولویت میں نہ تھا، بلکہ ان کی خیر خواہی اور نصیحت کے لہجہ میں ان سے ارشاد فرما رہا تھا، یہ ہے کہ شیطان نے گفتگو کے دوران اپنے آپ کو ان کا ''ناصح'' قرار دیا اور کہا:

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (اعراف: ۲۱)

''شیطان نے آدم وحوا کے لیے قسم کھائی اور کہا کہ میں تمھیں نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں۔''

یہ بات بذات خود دلیل ہے کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد بھی خیر خواہی و نصیحت کا پہلو رکھتا تھا۔ شیطان نے یہ مطلب اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے اخذ کیا تھا اور پھر اپنے آپ کو ناصح کی کیفیت میں ان کے سامنے پیش کیا تھا۔

۳: جب آدم وحوا نے نتیجہ مخالفت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا یعنی اس درخت کا پھل کھاتے ہی فوراً ان کے لباس گر گئے اور خاص قسم کی ندامت و پشیمانی سے اپنی عریانی کو درختوں کے پتوں سے ڈھانپنے لگے تو اچانک ایک آواز کو یہ کہتے ہوئے سنا:

اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ

مُّبِيْنٌ﴿۲۲﴾ (اعراف: ۲۲)

''کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور تم سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلم کھلا دشمن ہے۔''

یہ جملہ ایک مشفق و مہربان ناصح کی گفتگو کی طرح ہے کہ جب نصیحت حاصل کرنے والے نے اس کی نصیحت سے روگردانی کی اور اپنے اس عمل کی پاداش میں گرفتار ہوا تو وہ ناصح مشفق بطور ملامت کہتا ہے: ''کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ یہ کام نہ کرو، یہ غذا نہ کھانا یا فلاں جگہ مت جانا؟ اب جبکہ تم نے میری نصیحت کی خلاف ورزی کی ہے تو اپنی جزا کو خود دیکھ لو۔''

لہٰذا آدم کی مخالفت کا نتیجہ ان کے لباس کا گرنا اور ان کا جنت سے نکلنا تھا جس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

۴: اگر یہ نہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہی مولوی ہوتی تو اس کے لوازمات پیروی توبہ کر لینے سے ختم ہو جاتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدم وحوا نے توبہ کی لیکن مخالفت نہی کے لوازمات یعنی بہشت سے اخراج وغیرہ ختم نہ ہونے پائے۔

اگر ان قرائن کو اکٹھا کر کے دیکھا جائے تو ہر اس انسان کے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے جو پہلے ہی کوئی فیصلہ نہ کر چکا ہو۔ وہ آسانی سے سمجھ جائے گا کہ یہ نہی ارشادی تھی، جس کا مقصد حضرت آدم اور ان کی زوجہ محترمہ کو ان کے لوازمات اعمال کے سلسلہ میں روکنا تھا اور بس۔ یہ نہی مولوی نہ تھی جو نافرمانی کا رنگ رکھتی ہو۔

اس کا ایک اور جواب بھی ہے جس کا بعض مفسرین نے سہارا لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا عمل اللہ تعالیٰ کے کسی قطعی و یقینی حکم کی نافرمانی نہ تھی، بلکہ وہ صرف ایک ترک اولیٰ کے مرتکب ہوئے تھے، جبکہ انبیاء علیہم السلام سب اللہ تعالیٰ کے قطعی و حتمی فرمان کی مخالفت سے محفوظ ہوتے ہیں نہ کہ ترک اولیٰ سے بھی۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء گناہ مطلق سے محفوظ ہوتے ہیں، ''گناہ نسبی'' سے نہیں۔ گناہ مطلق سے وہ گناہ مراد ہے کہ جو بھی اس کا مرتکب ہو گناہ گار شمار ہوگا۔ مثلاً جھوٹ، غیبت وغیرہ۔ ''گناہ نسبی'' ان اعمال جائز کو کہتے ہیں جن کے لیے انبیاء علیہم السلام کی شان و عظمت مقتضی ہو کہ وہ ایسا عمل نہ کریں۔ بعض ایسے اعمال بھی ہوتے ہیں جن کو سرانجام دینے سے کسی جماعت کے نزدیک کسی قسم کا اشکال پیدا نہیں ہوتا لیکن انبیاء سے ان کا صدور عیب شمار ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف غفلت کے ساتھ ایک عام آدمی کی نماز تو قبول ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے کسی ولی، جیسا کہ انبیاء سے ایسی نماز مطلوب نہیں ہوتی۔ علیٰ ہذا القیاس ایک عام متوسط درجہ کے آدمی کی طرف معاشرہ اسلامی کے لیے سو روپے کی امداد قابل ستائش ہو سکتی ہے لیکن ایک امیر کبیر اور خوشحال شخص کی طرف سے یہ امداد ناشائستہ شمار ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک تیسرا جواب بھی ہے جس کی طرف توجہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عصمت کے معاملہ میں محور بحث تشریع الٰہی کی مخالفت ہے۔ یعنی جہاں ماحول تکلیف شرعی سے متعلق ہو اور شرعی الٰہی کا اعلان انبیاء کے ذریعہ سے ہو تو اس صورت میں مسئلہ عصمت انبیاء و اولیاء علیہم السلام خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک حضرت آدم وحوا کا تعلق ہے، وہ وہاں رہتے تھے جہاں مندرجہ بالا قسم کی کوئی تکلیف شرعی موجود نہ تھی۔ وہاں نہ کوئی نبی پہلے آیا تھا اور نہ ہی کسی شریعت کا قیام ہوا تھا، نہ ہی لوگ زیر بار تکلیف شرعی ہوئے تھے۔ صرف ایک فرد کو خطاب ہوا تھا جو کبھی نتائج اطاعت اور

تکلیف مخالفت سے روشناس نہ ہوا تھا، نہ ہی اس سے آشنا تھا۔ اس صورت میں ایک خاص بات کے متعین کرانے کے لیے جس کے لیے شیطان نے آدم کے سامنے قسم کھائی تھی، ان کے عمل کو خلاف عصمت قرار دیا جا سکتا ہے؟

۲: حضرت آدم کی عصمت ولغزش

"فاز لھما الشیطان" کا جملہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۶ میں اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ اسلام نہی الٰہی کے مقابلہ میں لغزش سے دوچار ہوئے۔ پھر یہ لغزش کس طرح "عصمت" کے ساتھ سازگار ہے

اس سوال کا جواب صاف ظاہر ہے۔ لغزش کبھی بھی "ذنب" و "گناہ" سے تعبیر نہیں کی جاتی۔ جب انسان کسی ناصح مشفق کی بات پر کان نہ دھرے اور زندگی میں مشقت وزحمت سے دوچار ہو جائے تو اس کا یہ عمل بھی لغزش کا مصداق ہوتا ہے۔ لغزش زندگی میں صرف اوامر مولوی کی مخالفت ہی میں منحصر نہیں ہوتی۔ جب کسی بزرگ ہستی کے حکم پر، جو جنبہ ارشادی اور پند ونصیحت کا عنوان رکھتا ہو، کان نہ دھریں اور نتیجہ کے طور پر نقصان سے دوچار ہوں تو وہاں بھی لفظ لغزش صادق آئے گا۔

۳: شیطان اور قلب آدم میں وسوسہ

خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں آدم وحوا کے بارے میں فرماتا ہے:

فَوَسۡوَسَ لَهُمَا الشَّيۡطٰنُ (اعراف: ۲۰)

"شیطان نے (آدم وحوا) کو وسوسہ میں ڈالا۔"

پھر خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے:

فَوَسۡوَسَ اِلَيۡهِ الشَّيۡطٰنُ (طٰهٰ: ۱۲۰)

یہ دونوں آیات بتاتی ہیں کہ شیطان کے وسوسہ نے حضرت آدم پر اثر کیا، درآنحالیکہ قرآن مجید دیگر مقامات میں فرماتا ہے کہ شیطان مخلصین اور خاصان خدا (جن کی جماعت میں انبیاء شامل ہیں) تک راہ نہیں پاتا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عِبَادِىۡ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ﴿۴۲﴾

(حجر: ۴۲)

"تو میرے مخصوص بندوں تک رسائی وتسلط نہیں رکھتا سوائے گمراہوں کی جماعت کے جو تیری پیروی کرتے ہیں۔"

پھر شیطان کی زبانی فرماتا ہے:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

(ص: ۸۲، ۸۳)

''تیری عزت کی قسم میں تیرے مخلص بندوں کے سوا سب کو گمراہ کروں گا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی صراحت کے باوجود شیطان نے حضرت آدم تک، جو خدا کے پیغمبر اور اس کے مخلص بندوں سے تھے، کس طرح رسائی حاصل کی؟

اس سوال کے جواب کی کئی صورتیں ہیں:

الف) اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور خالص بندے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اس نے برگزیدہ کیا ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ان کے شمار میں اس لیے آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں برگزیدہ فرمایا ہے۔ قرآن اس حقیقت کی صراحت فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾ (انعام: ۸۷)

''اور ہم نے انھیں برگزیدہ فرمایا اور ان سب کی راہِ راست کی طرف ہدایت کی۔''[۱]

یہ تو ایک پہلو ہوا، دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس دن حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اس دن تک وہ مقام اجتبینا یعنی برگزیدگی تک نہیں پہنچے تھے، نہ اصطلاحی طور پر برگزیدہ ہوئے تھے، بلکہ جب انہوں نے بعض کلمات کی تعلیم کے بعد توبہ کی تو خداوند تعالیٰ نے انھیں منزل برگزیدگی پر فائز فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾

(طٰهٰ: ۱۲۱، ۱۲۲)

''آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی اور راہِ سعادت گم کر بیٹھے۔ پھر ان کے پروردگار نے انھیں چن لیا، ان پر رحمت نازل فرمائی اور انھیں ہدایت فرمائی۔''

لہٰذا اجتبہ یعنی برگزیدگی آدم کی منزل چونکہ ان کی لغزش کے بعد ظہور میں آئی اس لیے شیطان کا نفوذ اور ان کے دل میں وسوسہ پیدا کرنا دیگر آیات قرآنی کے، جو بندگانِ مخلص میں شیطان کے عدم نفوذ کا ذکر کرتی ہیں، منافی نہیں۔ (مگر یہ توجیہ اشکال سے خالی نہیں ہے، بناء بر مبانی مذہب۔ مترجم)

ب) گنہگار لوگوں میں شیطان کا نفوذ حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالنے سے واضح طور پر مختلف ہے۔ قرآن نے ان دونوں

---

[۱] سورۂ مریم، آیت ۵۸ بھی اسی موضوع پر ہے۔

وسوسوں کے درمیان تفاوت کے لیے دو مختلف الفاظ سے استفادہ کیا ہے۔ قرآن لوگوں کے قلوب میں وسوسہ ڈالنے کے لیے لفظ 'فی' استعمال کرتا ہے جو قلوب و نفوس میں کسی شے کے نفوذ کرنے کے لیے آتا ہے اور فرماتا ہے:

"یوسوس فی صدور الناس" درآنحالیکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں 'لام' یعنی "**فوسوس لهما الشیطان**" یا لفظ الی جیسے **فوسوس الیه الشیطان** استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان کی خصوصیات سے واقف لوگوں کے لیے لفظ 'فی' کا دوسرے دونوں الفاظ سے فرق واضح ہے۔ پہلا لفظ قلوب اور نفوس میں رسوخ پانے کے معنی میں آتا ہے جبکہ دونوں موخر الذکر الفاظ انسان کے قریب ہونے کے معنی میں ہیں جو چیز انبیاء کے قلوب میں جگہ نہیں پاتی، وہ کسی چیز کا ان کے نفس و روح میں رسوخ و نفوذ حاصل کرنا ہے نہ کہ ان کے قریب ہونا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام کی روح و نفس میں گھر نہیں کرتا اگر چہ ان کے قریب ہوجاتا ہے۔

ج) یہاں ایک تیسرا جواب بھی سامنے آتا ہے۔ شیطان متذکرہ بالا آیات مبارکہ کے مطابق مخلص حضرات کے نفوس میں اپنی قوت سے اس طرح تسلط و تصرف نہیں رکھتا کہ ان کی زندگی کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرف چاہیے انھیں کھینچ لے جائے کیونکہ 'وسوسہ' روح و نفس پر اختیار کے اقسام میں سے نہیں ہوتا۔

ارشاد ہوتا ہے:

۱: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴿۴۲﴾

(حجر: ۴۲)

"تو میرے بندوں پر تسلط نہیں رکھتا سوائے اس کے جو گمراہ (زیاں کار) ہو اور تیری پیروی کرتا ہو۔"

۲: اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ﴿۹۹﴾ (نحل: ۹۹)

"وہ مومن اور اللہ پر توکل رکھنے والے لوگوں پر تسلط نہیں رکھتا۔"

۳: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّکَ وَكِیْلًا﴿۶۵﴾

(اسراء: ۶۵)

"تو میرے بندوں پر تسلط نہیں رکھتا اور کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان کا محافظ ہو۔"

یہ آیات مبارکہ مخلص بندوں پر شیطان کے تسلط کی نفی کرتی ہیں جبکہ وسوسہ ڈالنا، ترغیب دینا اور تشویق کرنا افکار و اندیش ہائے انسانی پر تسلط جمانے سے بالکل الگ چیز ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں وسوسہ دھوکہ وفریب کی شکل میں تھا نہ کہ ان پر شیطان کے تسلط کی شکل میں اور جس چیز کی انبیاء میں نفی کی گئی ہے وہ تسلط ہے نہ کہ وسوسہ و دعوت و ترغیب و تشویق۔

سابقہ جواب سے یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ان آیات مبارکہ کی تصریح کے مطابق شیطان انبیاء پر تسلط نہیں رکھتا اور

انھیں غلط کام کرنے پر نہیں ابھارتا، تو اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دوسرے لوگوں پر اس قسم کے افعال کے لیے قوت رکھتا ہے۔ لیکن یہ مطلب دو لحاظ سے درست نہیں۔

۱: اس مطلب میں ارتکاب گناہ کے لیے جبر و اکراہ کے علاوہ اور کوئی بات لازم قرار نہیں پاتی۔ اس صورت کے معنی یہ ہوئے کہ گنہگار افراد شیطان کے زیر تسلط قرار پائیں گے اور نہ چاہتے ہوئے بھی گناہ اور غلط افعال کے مرتکب ہوں گے جبکہ جبر و اکراہ کا بے بنیاد ہونا عقل و خرد اور آیات قرآنی کی رو سے کسی پر پوشیدہ نہیں۔

۲: خود شیطان گنہگار لوگوں پر اپنے ہر قسم کے تسلط و اختیار کی نفی کرتا ہے اور اپنی قوت کی حدود کو صرف دعوت و ترغیب گناہ میں منحصر کرتا ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ (ابراهیم: ۲۲)

''جب خدا کا حکم صادر ہوگا تو شیطان گنہگاروں سے کہے گا: خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا جبکہ میں نے اپنے وعدہ کے خلاف کیا، میں تم پر ہرگز تسلط نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمھیں دعوت دی جو تم نے قبول کر لی۔ اب مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا نجات دہندہ نہ تھا، نہ ہی تم میرے دہندہ ہو۔''

شیطان کی اس تصریح پر غور کرتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شیطان مخلصین اور انبیائے کرام کے علاوہ دوسرے لوگوں پر تسلط و اختیار رکھتا ہے اور صرف انہی حضرات پر نہیں رکھتا۔ جبکہ متذکرہ آیات کے مطابق وہ کسی پر بھی تسلط نہیں رکھتا۔

جواب: یہ درست ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں شیطان گنہگاروں پر اپنے ہر قسم کے تسلط کی نفی کرتا ہے۔ خداوند تعالیٰ بھی اس کی بات کی تردید و انکار کے بغیر نقل فرماتا ہے۔ یہ اس کی بات کی صداقت کی دلیل ہے۔ لیکن اس تصریح کے باوجود قرآن دوسرے مقام پر شیطان کے دوستوں اور پیروؤں پر تسلط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۠ (نحل: ۱۰۰)

''اس کا تسلط ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

دونوں قسم کی ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس تسلط کا شیطان انکار کرتا ہے، اس تسلط سے مختلف ہے جس کی موجودگی کو قرآن شیطان کے دوستوں پر ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں انواع تسلط کا فرق ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

جس تسلط کی مطلقاً نفی ہوئی ہے، خواہ وہ مخلصین و انبیاء اور اولیاء پر ہو یا خاطی و گنہگار لوگوں پر، تسلط ابتدائی ہے جس کا شیطان خود اپنے مقام پر مقر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ شیطان جب چاہے اولادِ آدم پر کود پڑے اور انھیں گمراہی و ضلالت کے جال میں پھنسا دے۔ اس قسم کے تسلط سے چونکہ جبر لازم آتا ہے اس لیے ہمیشہ کے لیے اس کی نفی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی کوئی قوت شیطان کو نہیں دی۔ شیطان اس سلسلہ میں ٹھیک کہتا ہے کہ

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ (ابراھیم: ۲۲)

''مجھے تم پر کوئی تسلط و اختیار نہ تھا سوائے اس کے کہ تمھیں ارتکاب گناہ کی دعوت دوں۔''

لیکن یہاں ایک اور قسم کا اختیار ہے جو افرادِ بشر خود شیطان کو دے کر اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی زمام حیات شہوات کے حصول کی خاطر شیطان کے اختیار میں دے دیتے ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں۔ یہ اختیار مخلص و مطیع بندوں پر عاصی و طاغی لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ شیطان اول الذکر جماعت پر کوئی اختیار نہیں رکھتا جبکہ موخر الذکر جماعت پر اپنا پورا تصرف رکھتا ہے۔ یہ آیت جس میں شیطان کہتا ہے ''وما کان لی علیکم من سلطان'' ابتدائی تسلط کی ناظر ہے جس کا سابق سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا لطف و کرم ہے کہ اس نے شیطان کو اس قسم کا تسلط مرحمت نہیں فرمایا۔ ورنہ انسان بے راہ روی پر مجبور ہوتے اور کبھی ملامت و سرزنش کی طرف رخ نہ کرتے۔

لیکن ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''انما سلطانه علی الذین یتولونه والذین هم به مشرکون۔'' یہ آیت اس تسلط کو ظاہر کرتی ہے جو لوگ خود شیطان کو دے دیتے اور اپنی زندگی کو اس کی خواہشات کا کھلونا بنا دیتے ہیں الذین یتولونه کا جملہ اس تسلط کا شاہد ہے جو شیطان کے دوست اس کو بخشتے ہیں۔ ان لوگوں نے شیطان کی خواہشات کی پیروی اور اس کی ولایت کو قبول کر لینے کی بناء پر اس کو اپنی گردن پر سوار کر رکھا ہے اور وہ بھی ان لوگوں کی دوزخ کے کنارے تک رہبری کرتا ہے۔ پس ابتدائی تسلط کی نفی اس تسلط کے اثبات کے ساتھ جو لوگ خود شیطان کو بخشتے ہیں، کسی طرح بھی منافی نہیں۔

اس بات کا دوسرا شاہد کہ یہ تسلط ابتدائی تسلط نہیں بلکہ شیطان کی پیروی کی پیداوار ہے، آیہ مبارکہ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ۝۴۲

(حجر: ۴۲)

''میرے بندوں پر تجھے تسلط نہیں ہے سوائے ان گمراہوں کے جو تیری پیروی کرتے ہیں۔''

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں پہلا جملہ، جو شیطان کے ہر قسم کے تسلط کی نفی کرتا ہے، اس کی پیروی کرنے والی جماعت کو مستثنیٰ کر رہا ہے جبکہ یہ جماعت اپنے اوپر اس کے تسلط کے مقدمات فراہم کر چکی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ جماعت ابتداء ہی سے شیطان کے تسلط

کے زیر اثر تھی۔

ان مباحث سے ہم یہ نتائج نکالتے ہیں کہ:

۱: ابتدائی و ناخواستہ تسلط مطلقات منفی ہے اور آیہ مبارکہ "وما کان لی علیکم من سلطان" تسلط شیطان کے اس حصہ پر شاہد ہے۔

۲: شیطان کو لوگوں کا عطا کردہ تسلط "ولایت بخشی" کے زیر اثر انھوں نے خود اس کے لیے ثابت کیا ہے۔ اس قسم کا تسلط ایک خاص طبقہ سے متعلق ہے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے شیطان کو اپنا ولی قرار دے لیا ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا شیطان ان کی مذمت میں کہتا ہے: "فلا تلو مونی ولوموا انفسکم" اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ کہ مجھے۔ یعنی یہ کام تم نے خود کیا ہے۔ یہ وہ کھانا ہے جو تم نے خود پکایا ہے اور اپنے کاسہ میں ڈالا ہے۔ اب میں کیا کروں جبکہ مخلصین اور صالحین اس قسم کے تسلط سے انکار کرتے ہیں اور ان پر یہ اختیار وجود نہیں رکھتا۔

۳: شیطان تمام انسانوں کو وسوسہ اور دعوت و ترغیب دلاتا ہے، حتیٰ کہ پیغمبر و مخلصین بھی ان سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی ہے جس کی موجودگی میں وہ محرمات میں شیطان کے زیر اثر نہیں آئے۔

۴: ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا کا مقصود؟

حضرت آدم علیہ السلام واضح طور پر کہتے ہیں:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا ۫ (اعراف: ۲۳)

"پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

جاننا چاہیے کہ ہر ظلم جرم و گناہ کی تعریف میں نہیں آتا چہ جائیکہ وہ اپنے نفس پر ہو۔ عربی لغت میں ظلم حد سے تجاوز کرنے اور بے موقعہ کام کرنے کو کہتے ہیں۔ [1] جو شخص اپنے ناصح کی بات نہ سنے اور ایسا کام کرے جو اس کی مصلحت کے خلاف ہو تو یقیناً اس نے حد سے تجاوز کیا اور بے موقعہ کام انجام دیا۔

اس بات کا واضح گواہ کہ نفس پر ظلم لازماً جرم و گناہ نہیں ہوتا۔ یہ ہے کہ قرآن مجید نفس پر ظلم کو عمل بد یعنی گناہ کے مقابل شمار کرتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۱۰﴾

---

[1] ابن منظور لسان العرب میں کہتا ہے: الظلم: وضع الشئ فی غیر موضعه ظلم عربی لغت میں کسی چیز کو اس کے محل کے غیر میں قرار دینا ہے۔ نیز کہتا ہے حد سے عدول اور حد سے تجاوز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(نساء: ۱۱۰)

''جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے نفس پر زیادتی کرے، پھر خدا سے مغفرت طلب کرے، تو خدا کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔''

لہٰذا نفس پر ظلم کسی شخص کے ارتکاب جرم و گناہ کی دلیل نہیں۔ خودسر و خودرائے لوگ اپنے رہنماؤں اور ہمدرد مشیروں کی مخالفت کے زیر اثر برے نتائج وانجام سے دو چار ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں پھر بھی بسا اوقات وہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس بحث سے فتکونا من الظالمین کے معنی بھی، جو سورۂ بقرہ میں ہے، واضح ہو جاتے ہیں جس کے تکرار کی ضرورت نہیں۔

۵: عصمت اور الفاظ ''عصی'' غوی اور تاب

عصی اور عصیان موجود زمانہ کی اصطلاح میں جرم و گناہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا عربی لغت میں یا زمانۂ نزول قرآن میں بھی ان الفاظ کے یہی معنی لیے جاتے تھے یا اس زمانہ میں ان کے وسیع تر معانی سمجھے جاتے تھے جن میں گناہ و جرم بھی شامل تھے یا اس زمانہ میں بھی ان کے صرف یہی مصادیق تھے۔

ابن منظور ''لسان العرب'' میں کہتا ہے: 'عصیان،[۱] اطاعت کے خلاف معنی رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی بات کی پیروی کرے تو اسے 'اطاع' کہتے ہیں اور اگر مخالفت کرے تو 'عصی' کہلاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ ہر قسم کی مخالفت یا پیروی سے انحراف 'عصیان' کی اصطلاح میں نہیں آتا۔ مخالفت یا انحراف از پیروی اصطلاحاً اس وقت گناہ و جرم شمار ہوگا جب یہ امر مولوی کی مخالفت ہو۔ نہ کہ امر ارشادی، امر استحبابی یا بمطابق اصطلاح نہی کراہتی کی۔ لہٰذا صرف جملہ عصی عصیاں کی اصطلاح کے تحت نہیں آئے گا۔

اسی طرح لفظ 'غوی' لغت عربی میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''خسارت و زیاں کاری''، ''فساد و تباہی''، ''ضلالت و گمراہی''۔ ابن منظور نے اپنی لغت میں اس کے تینوں معانی میں صراحت کی ہے۔[۲] ان میں سے کوئی معنی بھی لے لیے جائیں وہ گناہ کے معنی میں لازم نہیں آتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اس مخالفت کے باعث ایک بے ضرر زندگی سے، جس کی قرآن مجید سورۂ طٰہٰ میں توصیف بیان کرتا ہے محروم ہو گئے اور نقصان سے دو چار ہوئے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے ان کی زندگی فساد و تباہی کی طرف مائل ہو گئی اور اس کا

---

[۱] لسان العرب کی عبارت کا متن اس طرح ہے: العصیان خلاف الطاعة. والعاصی الفصیل اذا لم یتبع امه ج ۱۴، ص ۶۷۔ حیوان کا وہ بچہ جو اپنی ماں کے پیچھے نہ جائے، عاصی کہلاتا ہے۔

[۲] وہ کہتا ہے: الغی: الخیبة، الفساد، الضلال، سابقہ ماخذ، ص ۱۴۰۔ بہ تلخیص

پورا نظام بگڑ گیا۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے حضرت آدم علیہ السلام نتیجتاً راہِ سعادت کو گم کر بیٹھے اور انجام کار زندگی کی راہ میں بھٹک گئے۔ تیسرے معنی یہ ہوئے کہ آپ ان تینوں مطالب میں جسے بھی انتخاب کریں اس سے ان کی گنہگاری ثابت نہ ہو پائے گی یعنی ان کا اقدام خسارت وزیاں کاری کے معنی میں ہوا، نظام زندگی کے درہم برہم ہونے کے معنی میں یا راستہ سے بھٹک جانے کے مفہوم میں۔

فرض کیجیے کہ لفظ 'غوی' اس آیت میں 'ضل' (راہ سے بھٹک گیا) کے معنی میں آیا ہے۔ تاہم جاننا چاہیے کہ ہر گمراہی، یعنی راستہ سے بھٹک جانا، گناہگار ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ الحاد وشرک یا موکد ولازم الاطاعت احکام باری تعالیٰ سے انحراف کفر وعصیاں کا موجب ہوتا ہے۔ یہی نتیجتاً اصطلاحی معنی ضلالت میں آتے ہیں۔ لیکن حیات دنیوی میں انسان کی گمراہی ان دو انواع گمراہی میں منحصر قرار نہیں پاتی۔

اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے مراحل میں تعلیم وتحصیل، کاروبارِ تجارت، ازدواج یا اپنے خاندان کی صحیح سطور پر تشکیل کے لیے اپنے ناصح کی ہدایات پر کان نہ دھرے اور اس کے نتیجہ میں گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہو جائے تو اسے ضال وگمراہ شمار کیا جائے گا لیکن اسے ان تمام مسائل میں معصیت خدا کا ہرگز مرتکب نہیں سمجھا جائے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام آرام وسکون اور ہر قسم کے مصائب ودشواریوں سے پاک زندگی گزار رہے تھے۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ وہ ارشاد پروردگار میں بے توجہی کے باعث اس سعادت بھری زندگی سے ایک سخت وبدبختی کی زندگی میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح وہ عرصہ حیات میں گم ہو کر صحیح راہ سے بھٹک گئے۔

٦: "فَتَابَ عَلَيۡهِ" سے کیا مراد ہے؟

داستانِ حضرت آدم علیہ السلام میں فتاب علیہ دو موقع پر استعمال ہوا ہے، ایک سورۂ بقرہ کی آیت ۳۷ میں اور دوسرے سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰ میں دونوں مواقع میں فاعل فعل خداوند تعالیٰ ہے، آدم نہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ لغت عرب میں یہ لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے، لفظ ''علیٰ'' اور الی کے ساتھ۔ علی کے ساتھ اس کا استعمال کسی بزرگ ہستی کے لطف وکرم کے ساتھ توبہ کرنے والے کی طرف رجوع کرنے کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حرف ''الیٰ'' کے ساتھ یہ لفظ ندامت وپشیمانی کے عالم میں توبہ کرنے والے کی اپنے مولیٰ کی جانب توجہ کو ظاہر کرتا ہے۔

قرآن مجید جہاں بھی اس لفظ کی خدا کی طرف نسبت کو ظاہر کرتا ہے تو حرف ''علیٰ'' استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

لَقَدۡ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ فِىۡ سَاعَةِ الۡعُسۡرَةِ (توبہ: ۱۱۷)

''اللہ تعالیٰ نے لطف ومرحمت کی نظر سے اپنے نبی، مہاجرین اور انصار کی طرف دیکھا، وہ کہ جنھوں نے سخت ترین لمحات میں اس کی پیروی کی۔''

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ اس لفظ کی بندگانِ خدا کی طرف نسبت دیتا ہے تو حرف 'الی' استعمال کرتا ہے۔ مثلاً:

تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ (تحریم: ۸)

''خدا کی طرف لوٹو اور توبہ نصوح انجام دو۔''

اس اصول کی بناء پر دونوں سورتوں میں آدم علیہ السلام کے گناہ سے توبہ کرنے کی کوئی صراحت موجود نہیں بلکہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے رجوع فرمایا ہے۔ یہ حضرت آدم کی اللہ تعالیٰ کی طرف بازگشت ہرگز نہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ آیہ مبارکہ فتلقی ادم من ربه کلمات فتاب علیه میں فتاب علیه کا جملہ ایک اور جملہ کی تقدیر کو بیان کر رہا ہے اور وہ یہ کہ "تاب ادم فتاب الله علیه" (آدم نے توبہ کی۔ اللہ نے بھی اس کی توبہ قبول فرمالی اور انھیں لطف و رحمت کی نظر سے دیکھا)۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ انسان کی توبہ اس کے صدورِ گناہ کی دلیل نہیں۔ انبیاء و اولیا جیسے برگزیدہ انسان جو معرفت باری تعالیٰ کے معاملہ میں بلندترین منزل پر ہوتے ہیں، ہمیشہ اپنے آپ کو انجام فرائض کی راہ میں حق تعالیٰ کے حضور مقصر و کوتاہ جانتے ہوئے ہر لحظہ زبان استغفار کھولے رہتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کے عظیم لطف و کرم اور اپنی اس کوتاہی کے پیش نظر جو ان سے ہدایت ناصح کے خلاف سرزد ہوئی تھی، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لطف عظیم کے سامنے شرمندہ جانا۔ لہٰذا یقیناً انھیں اظہارِ ندامت اور راہ توبہ اختیار کرنا پڑی اور انھوں نے مصمم ارادہ کیا کہ خدا کے سوا کسی اور کی بات کو قبول نہ کریں۔

مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ اقدام اگرچہ عمل جائز و مباح تھا، تاہم ان کے مقام بلند کی عظمت کے پیش نظر یہ عمل ایک قسم کا جرم نسبی قرار دیا جائے گا نہ کہ جرم مطلق۔ اس صورت میں ان کی توبہ اپنے مقام پر واضح تر معنی کی حامل نظر آئے گی۔

اس بحث سے آیہ مبارکہ ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى (طٰہٰ: ۱۲۲) میں جملہ هدی کے معنی بھی بالکل واضح ہو گئے کیونکہ ہدایت اس بے راہی و پریشانی کے جواب میں ہے جو حضرت آدم کو لاحق ہوئی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے آپ مقام نبوت پر فائز ہوئے اور راہ سعادت آپ کو دوبارہ حاصل ہو گئی جیسا کہ اجتبٰه کا جملہ ظاہر کر رہا ہے۔

۷: وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا میں غفران کے معنی؟

لغت عرب میں 'غفران' کے معنی پردہ کے ہیں۔ تاہم پردہ و پنہانی کی درخواست ایک فعل غیر صحیح کی علامت تو ہو سکتی ہے، صدور گناہ کی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم کا عمل صحیح نہ تھا اور نہ ہی ان کے مقام بلند کے متناسب تھا۔ اسی لیے بزرگانِ دین و علماء اس عمل کو ترک اولی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ صورت حال گنجائش رکھتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ ان کے عیب کو چھپا لے، نظرانداز فرما دے اور انھیں اس خسارہ سے جس سے وہ دوچار ہوئے ہیں، ایک حد تک نجات مرحمت فرمائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾ (اعراف: ۲۳)

امید ہے اب آپ ان توضیحات وتشریحات کی مدد سے، جو کیفیت ''نہی از شجرہ'' کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں، مخالفین عصمت آدم کے تمام سوالات ودلائل کے جوابات دے سکیں گے۔

عصمت آدم کی ایک اور دلیل

اب ہم عصمت انبیاء کے خلاف بڑے بڑے اور پرانے شبہات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ مناسب ہے کہ اس جماعت منافی عصمت انبیاء کے ایک اور شبہ پر بحث کریں۔ یہ لوگ مندرجہ ذیل آیات مبارکہ کے تحت حضرت ابوالبشر علیہ السلام کے تحفظ عصمت کے خلاف استدلال کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ شبہ سے آگاہی کی خاطر متن آیات معہ ترجمہ نقل کیا جائے جو اس طرح ہے:

۱: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴿۱۸۹﴾ (اعراف: ۱۸۹)

''خدا وہ ہے جس نے تمھیں نفس واحد سے پیدا کیا اور اس کی زوجہ کو بھی اسی کی جنس سے قرار دیا ہے تا کہ اس سے اسے سکون وآرام حاصل ہو۔ جب اس نے اس سے قرب کیا تو ہلکا سا حمل اس نے اٹھا لیا کہ اپنے کام کاج بھی کر سکے۔ جب وہ وزنی ہو گیا تو دونوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اگر وہ انھیں فرزند صالح عطا فرمائے تو وہ سپاس گزاروں میں سے ہوں گے۔''

۲: فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَاۗءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴿۱۹۰﴾ (اعراف: ۱۹۰)

''جب اللہ تعالیٰ نے انھیں فرزند صالح عنایت فرما دیا تو اس فرزند میں، جو انھیں عطا کیا گیا تھا، انھوں نے خداوند تعالیٰ کے لیے شریک قرار دے دیا۔ خداوند عالم اس سے برتر ہے کہ وہ لوگ اس کے لیے کوئی شریک قرار دیں۔''

۳: اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ﴿۱۹۱﴾ۡ (اعراف: ۱۹۱)

''کیا تم ایسی چیزوں کو (اللہ کا) شریک قرار دیتے ہو جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں اور جبکہ وہ خود مخلوق ہیں۔''

۴: وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ﴿۱۹۲﴾ (اعراف: ۱۹۲)

''نہ تو وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی مدد کرتے ہیں۔''

کیفیت استدلال

ان آیات مبارکہ سے نفی عصمت انبیاء کے لیے طرزِ استدلال اس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے کہ پہلی آیت میں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم اور زوجھا سے مراد ان کی زوجہ محترمہ یعنی جناب حوا ہیں۔ اس صورت میں اتھما صالحا جعلا لہ شرکاء میں ضمیر تثنیہ کا مصداق حضرت آدم اور ان کی زوجہ (جناب حوا) قرار پائیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں حضرات اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرزند صالح پا لینے کے بعد شرک و دوگانہ پرستی کرنے لگے۔

دوسرے لفظوں میں بنیاد استدلال یہ ہوئی کہ ہم یوں کہنے لگیں کہ نفس واحدۃ اور زوجھا سے مراد وہی واحد شخصی (آدم وحوا) ہیں، نہ کہ ''واحد نوعی'' یعنی ہر شخص کے باپ اور ماں کے معنی میں کیونکہ جس طرح تمام افراد بشر آدم وحوا نامی باپ اور ماں سے پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح ہر انسان ایسے باپ اور ماں سے جو اس کے قریب ترین باپ اور ماں ہوں، دنیا میں آیا ہے۔

اگر ہم کہیں کہ نفس واحدۃ اور زوجھا سے مراد انسان کے وہی قدیم باپ اور ماں، آدم وحوا ہی ہیں تو یقینا آیت دوم میں ضمیر تثنیہ کے مرجع وہی دو افراد قرار پائیں گے اور وہ آیت ان دونوں کے شرک کو ظاہر کرے گی۔

لیکن اگر ہم کہیں کہ ان سے مراد واحد نوعی ہے جو ہر شخص کے نزدیکی ماں باپ سے مطابقت رکھتا ہے تو پھر دوسری آیت میں تثنیہ کی دونوں ضمیروں کا مرجع وہی پدر و مادرِ نوعی ہوں گے اور ان آیات کا حضرت آدم علیہ السلام سے کوئی ارتباط نہ ہوگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسانوں کے والدین مشکلات میں تو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں اور اسی سے اپنی حاجات براری کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے تو آسودگی کی حالت میں راہ شرک اختیار کر لیتے ہیں۔

اس بحث میں جس چیز کی وضاحت لازمی ہے وہ یہ ہے کہ نفس واحدۃ سے مراد آدم شخصی نہیں۔ بلکہ آدم نوعی ہے۔ باپ اور ماں کی اصطلاح کی نسبت ہر شخص کے لیے اس کے اپنے والدین سے ہے اور آیہ مبارکہ ایک سنت کلی کے طور پر تمام انسانوں کی ان کی اولاد سے نسبت قائم کرتی ہے نہ کہ صرف ایک شخص واحد یعنی حضرت آدم ابوالبشر اور ان کی زوجہ محترمہ حوا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نفس واحدۃ کی اصطلاح قرآن مجید میں کبھی واحد شخصی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے اور کبھی واحد نوعی کے معنی میں۔ نمونہ کے طور پر یہ اصطلاح درج ذیل آیات میں واحد شخصی کے طور پر آئی ہے۔

۱: يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ (نساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے ڈرو۔ وہ خدا جس نے تمھیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا، اس

کی زوجہ کو اسی کی جنس سے قرار دیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں۔"

۲: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى (حجرات: ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔"[1]

لیکن یہی لفظ قرآن مجید میں واحد نوعی، یعنی انسان کے باپ اور ماں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (زمر: ٦)

"تمھیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا اور اس کی زوجہ بھی اسی کی جنس سے قرار دی گئی ہے۔ پھر تمھارے فائدے کے لیے آٹھ اصناف کے چوپائے خلق فرمائے اور تمھیں تمھاری ماؤں کے شکموں میں تین تاریکیوں (شکم، رحم اور بچہ دان) کے اندر گوناگوں اور پے در پے تبدیلیوں کے ساتھ خلق فرمایا۔"

یہاں نفس واحدۃ اور زوجھا سے ہر انسان کے اپنے اپنے ماں باپ مراد ہیں نہ کہ حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ جناب حوا۔ اس پر جملہ یخلقکم فی بطون امھا تکم شاہد ہے۔ یعنی ہم نے تمھیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں تین تاریکیوں کے پردہ میں نئی نئی خلقتیں بخشیں۔ یہ فقرہ بتلاتا ہے کہ آیت کا ہدف انسان کی خلقت کو بیان کرنا ہے۔ نیز یہ کہ کس طرح خداوند عالم ہر شخص کو ماں باپ سے پیدا کرتا ہے اور کس طرح وہ تین زندانوں میں، جو ایک دوسری کے اندر مقفل و بند رہتی ہیں، انسان کو نئی نئی صورتیں بخشتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جملہ نفس واحدۃ نوعی ہونے سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، بہ نسبت ایک شخص واحد کے جس کا نام آدم ہے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے کہ وہ قرائن پیش کریں جو شاہد ہیں کہ زیر بحث آیہ مبارکہ سے واحد نوعی ہی مراد ہے نہ کہ شخصی۔ اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں۔

واحد نوعی کے شاہدین

الف: یہ آیہ مبارکہ سورۂ اعراف میں وارد ہوئی ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ عہد و پیمان اور میثاقوں کے ایک سلسلہ کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جو انسان اور خلق کائنات کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ افسوس ہے کہ انسان نے ان میں سے اکثر کو اپنے زیر پا روند ڈالا ہے اور ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ یہ عہد و پیمان مندرجہ ذیل آیات سے عبارت ہوتے ہیں۔

---

[1] سورۂ انعام، آیت ۹۸ کی طرف بھی رجوع فرمائیں۔

۱: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا (اعراف: ۲۶)

۲: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ (اعراف: ۲۷)

۳: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳۱)

۴: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (اعراف: ۳۵)

۵: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ (اعراف: ۱۷۲)

۶: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا (اعراف: ۱۸۹)

اگر ان تمام آیات کو برابر رکھ کر ان کے مفادات میں غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان آیات مبارکہ کا ہدف میثاق و پیمان کا ایک سلسلہ ہے جو بنی نوع انسان کے افراد سے فطری وتکوینی صورت میں یا لسانی وزبانی طور پر لیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ نوع بشر کی اکثریت نے ان میثاق ہائے کا کوئی احترام نہیں کیا، بلکہ غالباً ان کو توڑ ہی ڈالا ہے۔ ان میں ایک تو آیت زیر بحث ہی ہے جو بتلاتی ہے کہ حالت بے چارگی میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور اس سے فرزند صالح کی استدعا کرتے ہیں۔ پھر جب ان کی درخواست قبول کر لی جاتی ہے تو وہ ایک بار پھر شرک کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

اسی سورۂ مبارکہ میں ان تمام مواثیق کی یاد دہانی اس بات کی دلیل ہے کہ آیت زیر بحث صرف نوع بشر ہی سے متعلق ہے نہ کہ خصوصیت کے ساتھ صرف حضرت آدم وحوا سے۔ پھر فرزند صالح کے حصول کی درخواست، اس پر عہد و پیمان قائم کرنا اور اس عہد کو حاجت براری کے بعد توڑ ڈالنا معاشرۂ انسانی کی خصوصیات سے ہے، دو عظیم اور اصلی بزرگوں سے اس کا ہرگز تعلق نہیں۔

ب: مضمون آیت اس بات کا مظہر ہے کہ فرزند صالح کی درخواست کرنے والا کوئی ایسا شخص جو صالح اور غیر صالح اولاد کا مزہ پا چکا ہے یا اس کے اثرات معاشرہ یا اپنی طول عمر میں دیکھ چکا ہے۔ اس تجربہ کے بعد اس کو یہ فکر لاحق ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے فرزند صالح کے لیے درخواست کرے اور اللہ سے یہ عہد کرے کہ اگر اس کی درخواست درجہ قبولیت پر فائز ہوگئی تو وہ شاکر وسپاس گزار بندوں میں ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون حضرت آدم وحوا سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ عام دوسرے انسانوں کی زندگی کے مطابق ہے جو اجتماعی زندگی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

ج: ماں باپ کی اللہ تعالیٰ سے پیمان شکنی اور ان کے میلانِ شرک کو پیش کرنے کے بعد آیت اول کے ذیل میں ان کے اس میلان پر تنقید کی غرض سے ارشاد ہوتا ہے۔ "فتعالی اللہ عما یشرکون"، یعنی "اللہ تعالی برتر ہے اس شرک سے جس کے وہ قائل ہوئے ہیں۔" یہاں لفظ جمع یشرکون استعمال ہوا ہے، صیغہ تثنیہ یعنی یشرکان نہیں لایا گیا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں ماں باپ کی نوع مراد ہے، صرف آدم وحوا مراد نہیں ورنہ صیغہ تثنیہ کے بجائے لفظ جمع لانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

د: انبیاء علیہم السلام کی عصمت یعنی ان کے ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہونے کا مسئلہ اگرچہ مورد اختلاف ہے اور مسلمانوں کی ایک اقلیت انھیں ارتکاب گناہ سے معصوم نہیں مانتی، تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ حضرات شرک ودوگانہ پرستی سے بالکل محفوظ ہیں۔

"جعلا لہ شرکاء فیما اتھما" کا جملہ شرک درعبادت کا ناظر ہے۔ اس جملہ کو اگر آدم وحوا کی طرف منسوب کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ پیغمبر کی طرف نسبت شرک راجع ہوگی جبکہ اللہ کے پیغمبر کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔

قرآن پوری صراحت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے روحانی انقلاب کے بعد ان کا ایک برگزیدہ و ہدایت یافتہ فرد کے طور پر تعارف کرواتا اور فرماتا ہے:

ثُمَّ اجۡتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ (طٰهٰ: ۱۲۲)

"خدا نے انھیں منتخب فرمایا، ان کی طرف رحمت وشفقت کی نگاہ کی اور ان کی ہدایت فرمائی۔"

اس آیت کی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام بہ نص قرآن ہدایت یافتہ قرار پاتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت میں وضاحت کی گئی ہے کہ جس کی خدا ہدایت فرماتا ہے وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ (زمر: ۳۷)

"جس کی اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے، اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں۔"

حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور ایسے شخص کے لیے کسی طرح کی گمراہی نہیں۔ علاوہ ازیں ایسے ہدایت یافتہ شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پیمان باندھے اور پھر اسے توڑ کر مشرکین میں شمار ہونے لگے۔

یہ قرائن وشواہد واضح کرتے ہیں کہ یہاں ان انسانوں کی کیفیت مطلق کا بیان مراد ہے جو حاجت وضرورت کے وقت بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتے ہیں اور مراد پوری ہو جانے کے بعد پھر راہِ مخالفت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیات قرآنی میں اس موضوع پر بہت سے شواہد پائے جاتے ہیں جن کو ہم یہاں اختصار کی بناء پر نقل نہیں کر رہے۔

قرآن اور عصمت شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام

عصمت انبیاء علیہم السلام کے طرفداروں اور اس کے مخالفین نے اپنے اپنے مدعا کے بارے میں سلسلہ ہائے آیات سے استدلال کیا ہے۔ ہم اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں نازل شدہ آیات سے واقف ہوئے اور ثابت کر چکے کہ جن آیات کا مخالفین عصمت آدم نے اپنے مدعا کے حق میں سہارا لیا ہے وہ زبانی باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اور مذکورہ آیات کسی طرح ان کے مدعا پر شاہد نظر نہیں آتیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی وہ بزرگ نہیں ہیں جو مخالفین عصمت کی بدگمانی و دست برد سے محفوظ نہیں رہے بلکہ اس بدگمانی کو شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کی حیات طیبہ تک بھی پہنچایا گیا ہے اور چند آیات سے ان کو بھی تحفظ از گناہ کے خلاف نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہم یہ سلسلہ اب قارئین محترم کے سامنے پیش کرتے ہیں:

مندرجہ ذیل آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۝۴۵ (هود: ۴۵)

''اور نوحؑ نے اپنے پروردگار سے عرض کی کہ میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ (میرے گھر والوں کی نجات کے بارے میں) حق ہے اور تو حکم کرنے والوں میں سے اچھا حکم کرنے والا ہے۔''

۲: قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۝۴۶ (هود: ۴۶)

''اللہ نے فرمایا: اے نوحؑ! وہ تیرے اہل سے نہیں۔ وہ عمل غیر صالح ہے۔ اس چیز کے لیے درخواست نہ کر جس سے تو واقف نہیں۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ تو جاہلوں میں نہ ہو جائے۔''

۳: قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِىْ وَتَرْحَمْنِىْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۴۷ (هود: ۴۷)

''اس (نوحؑ) نے کہا: پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ایسی چیز کی خواہش کروں جس سے میں آگاہ نہیں۔ اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانیوالوں میں سے

ہو جاؤں گا۔"

مخالفین عصمت نے عمداً یا سہواً متذکرہ بالا آیات سے مندرجہ ذیل استدلال قائم کیا ہے:

الف: حضرت نوح علیہ السلام مدعی ہوئے کہ ان کا بیٹا ان کے خاندان کا فرد ہے اور عرض کیا: ان ابنی من اھلی۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے ان کی اس بات کو تسلیم نہ کیا اور فرمایا: انہ لیس من اھلك "وہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔"

اس سوال و جواب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے نظریہ میں خطا کی اور خلاف واقعہ بات کہہ دی۔

ب: "فلا تسئلن مالیس لك بہ علم انی اعظك ان تکون من الجاھلین" کا جملہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے شان ومقام پیغمبر سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کیا اور قرآن مجید ان کو عتاب کی صورت میں اس قسم کے سوالوں کے تکرار سے روکتا ہے۔

اب اس سلسلے میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے سوالات جو جہالت پر مبنی ہوں انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کے پیش نظر انھیں ہرگز زیب نہیں دیتے۔

ج: والا تغفرلی و ترحمنی جیسے جملے ان کی لغزش کے مظہر ہیں جس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش کی استدعا کرتے ہیں جبکہ عصمت کی موجودگی میں بخشش کی استدعا زیب نہیں دیتی۔

پہلی دلیل کا جواب

حضرت نوح علیہ السلام نے خلاف واقعہ بات کہی تھی یا نہیں؟ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں اگر چہ جواب اول ایقان و پختگی کے اعتبار سے دوسرے جواب کے ہم پلہ نہیں بنتا۔ تاہم دونوں جواب اس طرح ہیں:

جواب اول

اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت نوح علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے سب گھر والوں کو (سوائے ان لوگوں کے جن کی ہلاکت کا پہلے ہی اعلان ہو چکا تھا) نجات مرحمت فرمائے گا۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

(ھود: ۴۰)

"ہم نے نوح سے کہا: ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا اور اسی طرح اپنے گھر والوں کو، سوائے ان کے جن کی ہلاکت کا پہلے ہی سے اعلان ہو چکا ہے، کشتی میں سوار کرلو۔"[1]

---

[1] سورۂ مومنون کی آیت ۲۷ کا بھی قریب قریب یہی مضمون ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جملہ "واھلك" کو وسیع معنی میں لیا کہ خداوند عالم ان کے خاندان کے تمام افراد کو مومن ہوں یا کافر، نجات عطا فرمائے گا۔ سوائے ان کی زوجہ کے جس کی ہلاکت کے بارے میں پہلے ہی انھیں بتایا جا چکا تھا۔

پس جس وقت بیٹے کی ہلاکت کا سامنا ہوا تو حضرت نوحؑ نے اپنے دل میں کہا خدائے برحق و عادل کا وعدہ کہاں اور ان کے بیٹے کنعان کا غرق ہونا کہاں۔ یہ دونوں باتیں باہم متناسب نہیں۔ لہٰذا اس مشکل کو اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے حل کر لینا چاہیے۔

اصولی لحاظ سے لفظ 'اھلك' کا حضرت نوح علیہ السلام کی نظر میں ہر چیز پر اطلاق ہوتا تھا، وہ سب کو اپنے اندر شامل کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اس کے ساتھ حضرت نوحؑ کا کوئی جسمانی یا ایمانی رشتہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ پھر کیونکہ بیٹے کا غرق ہونا لفظ 'اھلك' سے متناسب معلوم نہ ہوتا تھا اس لیے انھوں نے اپنی حیرت و پریشانی کو دور کرنے کی غرض سے زبان دعا و مناجات کو کھولا اور عرض کیا: "رب ان ابنی من اھلی و ان وعدك الحق و انت احکم الحاکمین۔"

لہٰذا حضرت شیخ الانبیاء نے کلام خدا پر اپنی سمجھ کے سلسلہ میں صرف ایک سوال کیا تھا اور وضاحت چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس جواب سے "انه لیس من اھلك" ان کے سوال کی کیفیت واضح ہوگئی کہ "اھلك" سے ان کے گھر کے وہ افراد مراد ہیں جو جسمانی رشتہ کے علاوہ ان کے روحانی و ایمانی رشتہ میں بھی منسلک ہوں۔ نیز اس منزل پر صرف مادی و جسمانی تعلق کافی نہیں۔

اگر "واھلك الا من سبق علیه القول" کے جملہ میں 'اھلك' سے ان کے خاندان کے تمام افراد مراد ہوتے تو پھر جملہ "الا من سبق علیه القول" سے صرف ان کی زوجہ ہی مراد ہوتی۔

اس جواب کا تجزیہ کئی طرح سے نامکمل ہے کیونکہ اولاً حضرت نوحؑ جیسے بزرگ پیغمبر کی حیثیت کے سامنے بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'واھلك' کے لفظ سے اپنے تمام اہل خانہ کی نجات کا استنباط کریں، بلا امتیاز اس کے کہ وہ مومن ہوں یا کافر، بالخصوص جبکہ وہ روئے زمین پر تمام کفار کی بربادی کے خواہشمند ہوں، جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی مناجات میں عرض کرتے ہیں:

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ (نوح: ٢٧-٢٦)

"پروردگار! روئے زمین پر کفار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ، کیونکہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور کافر و گناہ گار کے سوا کوئی پیدا نہ کریں۔"

کیا یہ صحیح ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنی اس دعا کے باوجود کلمہ 'اھلک' سے اپنے تمام وابستگان کو مراد لیں خواہ وہ ان سے کوئی روحانی رشتہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں؟ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دعا کے پیش نظر و اھلک سے صرف با ایمان لوگ ہی مراد لیے ہیں اور بس۔

ثانیاً: اس قسم کا کوئی شاہد موجود نہیں حضرت نوحؑ نے "الا من سبق علیه القول" سے صرف اپنی زوجہ مراد لی ہو، بلکہ کہا جا سکتا ہے

کہ اس جملہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے گھر کے تمام کافر رشتہ دار شامل تھے جنہوں نے ان کے زمانہ رسالت میں ہٹ دھرمی ظاہر کی تھی اور ایمان نہیں لائے تھے۔

ثالثاً: اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے حضرت نوحؑ کو صراحت کے ساتھ بتلا دیا تھا کہ تمام ظالمین برباد و نابود ہو جائیں گے۔ اس لیے کشتی بناتے وقت ارشاد ہوا تھا:

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (ھود: ۳۷)

''ان لوگوں کے بارے میں بالکل کچھ نہ کہنا جنھوں نے شرک کر کے ظلم کیا، وہ سب کے سب غرق ہوں گے۔''

اسی لیے آیت ۴۰ کا جملہ ''الا من سبق علیه القول'' اسی اصول کامل کا مظہر ہے جس کو آیت ۳۷ بیان کر رہی ہے کہ تمھارے خاندان کے لیے ہمارا وعدۂ نجات کہ ان سب کو کشتی پر سوار کر لینا اسی اصول کامل سے مشروط ہے جو یہ ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والوں میں کوئی ظالموں سے نہ ہوگا کیونکہ ان کی ہلاکت و نابودی قطعی و حتمی ہو چکی ہے۔

ان تمام اشکالات پر غور کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ جواب اتقان و پختگی کے معیار تک نہیں پہنچتا، اس لیے ہم دوسرا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

جواب دوم

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ظاہر میں مومن لیکن بہ باطن کافر تھا۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنے گھر والوں کو کشتی میں سوار کیا تو اپنے بیٹے سے بھی کہا:

يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (ھود: ۴۲)

''اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔''

پھر فرماتے ہیں ''ولا تکن مع الکافرین'' یعنی کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ یہ نہیں کہتے ''ولا تکن من الکافرین'' یعنی ''کافروں میں سے نہ ہو۔'' اس طرزِ گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کے ایمان کے معتقد تھے اور اسے مومن و خدا پرست جانتے تھے ورنہ اس کو بلاتے وقت وہ کلمہ ''مع'' کے بجائے لفظ ''من'' استعمال کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بیٹے کی ہلاکت و نابودی کو پانی میں اس کے ڈوبتے ہوئے مشاہدہ کیا تو حیران رہ گئے اور اپنے آپ سے کہا کہ میرا اپنا بیٹا کس طرح لقمہ سیلاب بن گیا حالانکہ وہ مومن تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا نجات مومنین کے سلسلہ میں پختہ وعدہ ہے اور وہ کسی طرح قابل شک و تردید نہیں۔ ذہنی تصورات کا خلاصہ سوال کا قالب اختیار کر گیا اور عرض کی ''رب ان ابنی من اهلی'' یعنی پروردگار! میرا

بیٹا میرے اہل سے ہے چنانچہ اسی کا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ تمھارے خیال کے برعکس وہ فرد ناصالح ہے۔ اس لیے اس کا غرق ہونا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے منافی نہیں۔

اس اعتبار سے نہ تو حضرت نوح علیہ السلام نے کوئی غلط بات کہی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف نقض عہد کی بات قائم ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کو اپنے بیٹے کے بارے میں مغالطہ ہو گیا تھا جس کی اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی۔

اللہ تعالیٰ کے جواب کی وضاحت

قرآن پوری صراحت کے ساتھ کنعان کو خاندان حضرت نوح علیہ السلام کا فرد قرار نہیں دیتا اور فرماتا ہے:

ان لیس من اهلك

''وہ تمہارے خاندان کے افراد سے نہیں۔''

پھر اس نفی و انکار کی علت کے اظہار کے لیے فرماتا ہے:

"انه عمل غير صالح"

''یہ کارہائے ناشائستہ کا خوگر ہے۔''

یہ نفی اور اس کا تجزیہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ کسی خاندان کا فرد ہونے کے لیے رشتہ روحانی رشتہ نسبی پر غالب آتا ہے اور جو شخص کسی انسان کے ساتھ روحانی اور فکری رشتہ نہیں رکھتا، وہ اس سے نہیں ہوتا خواہ وہ اس کا دلبند ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص جسمانی رشتہ کے اعتبار سے دور بھی ہو لیکن مکتب فکر اور راہ و روش میں آپ کے ساتھ ہم آہنگ ہو تو بے شک وہ آپ سے اور آپ کے خاندان سے شمار ہوگا۔

حضرت سلمان فارسیؓ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رشتہ روحانی و ایمانی میں منسلک تھے۔ اس لیے آنحضرتؐ کے خاندان سے شمار ہوئے جیسا کہ آنحضرتؐ نے سلمان فارسیؓ کے بارے میں فرمایا:

"سلمان منا اهل البيت"

''سلمان ہمارے خاندان کا فرد ہے۔''

جبکہ ابولہب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسبی چچا ہوتے ہوئے بھی فکری و روحانی فقدان کی وجہ سے اس خاندان سے دور اور راندہ کہلایا، حتیٰ کہ آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس پر نفرین بھیجی اور تبرا فرمایا:

"تبت يدا ابی لهب"

مادی معاشروں میں خاندان کا فرد ہونے کے لیے عنصر قرابت ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے یا حسبی ہونا اپنائیت کہلاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کے علاوہ ایک اور عنصر ہے جس کو اس سے زیادہ معتبر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس عنصر کو کسی خاندان کا اہل وحصہ ہونے کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قرآن مجید مومنین کو 'اھل' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور حضرت لوطؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ (اعراف: ۸۳)

''ہم نے لوط اور ان کے خاندان کو نجات مرحمت فرمائی سوائے ان کی زوجہ کے جو (عذاب میں) پیچھے رہ جانے والوں سے ہے۔''

لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ (صافات: ۷۶)

''ہم نے اس کو اور اس کے خاندان کو ایک بڑے غم سے نجات دی۔''

ان دونوں موارد میں ان دونوں کے خاندانوں کے علاوہ مومنین کی جماعت بھی شامل ہے۔

امام ہشتم حضرت امام رضا علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے معاملہ میں فرماتے ہیں:

''کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ جب اس نے خدا کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے باپ سے اس کی نفی فرمادی۔ اسی طرح جو شخص ہماری اولاد میں سے اللہ کی نافرمانی کرے گا وہ ہم میں سے نہیں۔''

پھر راوی کی طرف رخ کر کے فرمایا:

''تم اگر اللہ کی اطاعت کرو گے تو تم ہم اہلبیت پیغمبر میں سے ہو گے۔''[1]

پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن 'اھل' کے بارے میں صرف یہی ایک اصطلاح رکھتا ہے، بلکہ قرآن کبھی اس لفظ کو ان موارد میں بھی جہاں صرف رشتہ جسمانی پایا جاتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ اس کا شاہد یہ ہے کہ 'واھلك' کے جملہ کے بعد فرماتا ہے "الامن سبق علیه القول۔" اس قسم کا استثناء اس بات کا شاہد ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی انسان کے ساتھ صرف جسمانی رشتہ رکھتے ہیں کسی خاندان کا حصہ سمجھتا ہے۔ درحقیقت موخر الذکر مصداق میں لوگوں کی اصطلاح کو مدنظر رکھا گیا ہے جبکہ عرفان ومعنوی لحاظ سے معاملہ اس مصداق کے خلاف ہے۔

یہاں تک سوال اول کا جواب واضح ہو گیا۔ اب ہم سوال دوم کے جواب کو ضروری سمجھتے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین ج ۲ ص ۳۷۰

دوسرے سوال کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے منع فرمایا تھا جن کا وہ علم نہ رکھتے تھے اور جن کے بارے میں سوال کرنا جہالت کی نشانی ہوتی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی شے کی نہی مخاطب سے اس کے صدور کی دلیل سمجھی جائے۔ بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اس قسم کے سوال کی گنجائش موجود ہو اور ایسے سوال کا موقع بن جائے تو اس صورت میں صحیح ہوگا کہ حکیم مربی زیر تربیت شخص کو متنبہ کر دے کہ ایسا سوال نہ کر بیٹھے کہ جاہل افراد میں شمار ہونے لگے۔

اتفاق یہ ہے کہ اس صورت حالات میں اس قسم کے سوال کا موقع پیدا ہو چکا تھا اور گنجائش ہو گئی کہ حضرت شیخ الانبیاء اپنے بیٹے کی نجات کا اللہ تعالیٰ سے سوال کریں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انھیں فوراً خبردار کر دیا اور اس قسم کے سوال سے منع فرما دیا۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ اس قسم کے سوال کا موقع فراہم ہو چکا تھا، اس بنا پر ہے کہ حضرت نوحؑ علیہ السلام اپنے بیٹے کے باایمان ہونے پر اعتقاد رکھتے تھے اور اس کی غرقابی کو ایک فرد مومن کا غرق ہونا جانتے تھے۔ یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے مطابق معلوم نہیں ہوتی تھی جو ان کے خاندان کے مومنین کی نجات کے لیے کیا گیا تھا۔ اس حالات میں اللہ تعالیٰ نے انھیں دو باتوں کی تنبیہ فرمائی۔

اول یہ کہ ان کا بیٹا ان کے خیال کے برعکس مومن نہ تھا بلکہ کافر تھا۔ وہ اپنی غلط کاریوں میں اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اسے 'عمل غیر صالح' کا مجسمہ قرار دیا گیا اور اسے ایسے افعال کا صرف انجام دینے والا ہی نہیں سمجھا گیا تھا جیسا کہ "انہ عمل غیر صالح" کا جملہ ظاہر کرتا ہے۔

دوئم اندیشہ تھا کہ کہیں پھر وہ اپنے بیٹے کی نجات کا سوال بھی نہ کر بیٹھیں کیونکہ اس قسم کی درخواست ایک جاہلانہ عمل ہوتا جو انبیاء علیہم السلام کے مقام سے بعید ہوتا ہے۔ اس بات کا شاہد کہ اس قسم کی درخواست حضرت نوح علیہ السلام نے نہیں کی تھی یہ ہے کہ خداوند عالم ان سے اس طرح خطاب فرماتا ہے:

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۝۴۶

(ھود: ۴۶)

"جس چیز کی خوبی و برائی کے بارے میں تمھیں علم نہیں مجھ سے اس کا سوال مت کرنا۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں مبادا کہ تم جاہلوں میں سے ہو جاؤ۔"

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اگر اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی درخواست کی ہوتی تو یقیناً وہ جاہلوں کی جماعت میں شمار ہونے لگتے، حالانکہ آیت اس حقیقت کی صراحت کر رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس وقت تک اس جماعت کا فرد نہیں بنے تھے۔ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس طرح کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کر بھی چکے تھے اور فلاتسئلن کی نہی سے مراد یہ ہو کہ اس قسم کے

سوالات کا تکرار نہ کیا جائے۔لیکن یہ خیال کسی صحیح دلیل پر مبنی نہیں ہے کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی تو "لئلا تعودا لی مثلہ" کہنا چاہیے تھا جیسا کہ ایسے ہی دیگر مواقع پر ارشاد ہوتا ہے:

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا (نور: ۱۷)

"اللہ تعالیٰ تمھیں نصیحت کرتا ہے، مبادا کہ پھر سے ایسے کام کی طرف لوٹو۔"

یہی وجہ ہے کہ نوحؑ اس بات کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور عرض کرتے ہیں:

اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ (هود: ۴۷)

"میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ایسی چیز تجھ سے طلب کروں جس کی خوبی اور برائی سے واقف نہ ہوں۔"

پس واضح ہو گیا کہ ماليس لك به علم یا ليس لی به علم کے جملوں سے مراد کسی مبہم یا مجہول شے کے بارے میں سوال کرنا نہیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ انسان ہمیشہ مجہول و مبہم باتوں کے بارے میں ہی سوال کرتا ہے نہ کہ معلوم اشیاء کے بارے میں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں پوچھا جائے جن کے بارے میں انسان کچھ نہ جانتا ہو۔لہٰذا ان کو چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ایسی چیز کا سوال کرے جس کے پس و پیش کو جانتا ہو اور اس کے حسن و قبح کو سمجھ چکا ہو۔

تیسرے سوال کا جواب

اگر حضرت شیخ الانبیاء سے کوئی غلط کام یا گناہ سرزد نہیں ہوا تھا تو پھر منزل اعتذار و معافی میں آکر کیوں عرض کیا:

وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۴۷﴾ (هود: ۴۷)

"اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔"

اس سواب کا جواب باطن بھی رکھتا ہے اور ظاہر بھی۔اس قسم کی آیات کا ظاہرا اگرچہ توبہ و ندامت ہوتا ہے لیکن اگر غور کریں تو اس سے لباس توبہ میں شکر و سپاس گزاری مراد ہوتے ہیں، کیونکہ یہ تو صحیح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے کوئی گناہ یا حکم عدولی نہیں ہوئی تاہم ایک غیر مناسب سوال کا موقع ضرور پیدا ہو گیا تھا۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ان کے شامل حال نہ ہوتا تو پھر اور بھی ایسے سوالات کر لیتے۔چونکہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ان کے حق میں وارد ہوا اس لیے وہ ایسے سوالوں سے باز رہے جو انھیں جاہلوں کے گروہ میں شامل کرانے کا باعث ہوتے۔پس ضروری تھا کہ اس نعمت کے لیے شکر و سپاس بجالاتے۔

انبیاء و اولیائے خدا کی عصمت کے اصولی طور پر یہ معنی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسدید و مناہی و عنایات و الطاف خفی سے بے نیاز ہو جائیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ عصمت کے بلندترین مقام تک پہنچ جائے پھر بھی اللہ تعالیٰ کی عنایات اور توجہ

خاص کا محتاج رہتا ہے۔

خداوند عالم جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (اسراء: ۷۴)

''اگر ہم نے تمھیں ثبات و استواری کی قوت نہ بخشی ہوتی تو قریب تھا کہ تمھیں اس سے کم ہی کا سہارا لینا پڑتا۔''

یہ صحیح ہے کہ ''رکون بر ظالم'' (ظالم کی طرف جھکاؤ) کا موقع آنحضرتؐ کی زندگی میں آن پہنچا تھا لیکن لطف پروردگار کا نزول ان تمام مواقع کی شکست کا موجب بن گیا۔ درحقیقت غیبی بندشیں اور الطاف الٰہی ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے شامل حال رہتی اور ان کو ہر قسم کی لغزش سے محفوظ رکھتی ہیں۔

فرض کریں کہ اس آیہ مبارکہ کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ سے توبہ و ندامت کا مظہر ہے لیکن توبہ انبیاء سے ارتکاب گناہ یا حکم عدولی مراد نہیں ہوتے کیونکہ انبیاء علیہم السلام اس عظیم نگاہ و بنیش کے ہوتے ہوئے جو انھیں حاصل ہوتی ہے، جب اپنے اعمال و افعال کو مقام خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو سب کے سب بول اٹھتے ہیں: ''ما عبدناك حق معرفتك'' یعنی ''ہم نے تیری معرفت کا حق ادا نہیں کیا۔'' اسی لیے قصور و نارسائی یا مباح و ترک اولیٰ ایسے کاموں کی انجام دہی کے بالمقابل، جو مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہوتے، دعا و راز و نیاز کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور خداوند بزرگ و برتر سے مغفرت و مہربانی کے طالب ہوتے ہیں۔ اس بات کی مثال آپ سرگذشت حضرت آدم علیہ السلام میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

قرآن اور عصمت حضرت یوسف علیہ السلام

سورۂ یوسف کی تمام آیات حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے علم و دانش، بردباری، صبر، پاکیزگی اور ان کی تعجب خیز خودداری پر شاہد ہیں۔قرآن مجید خاندان یعقوب کے اس جوان رعنا کو'اسوۂ تقویٰ'،نمونہ پاکیزگی اور مظہر عفت و عصمت کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔اسی سلسلہ میں قرآن کریم دوسرے لوگوں کو عفت و پاکدامنی کے خوبصورت نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں اس راہ پر چلنے کا شوق دلاتا ہے۔اس کے باوجود بعض کوتاہ نظر لوگ اس سورۂ مبارکہ کی ایک آیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے میلانِ گناہ یا غلط کام کرنے کے سلسلہ میں ان کے عزم صمیم پر شاہد قرار دیتے ہیں۔وہ اپنے خیال خام میں اس آیت سے عدم عصمت انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں اپنے دلائل میں اضافہ کرتے ہیں۔ان کی اس دلیل کے ابطال کے لیے متعلقہ آیت کے موضوع کی وضاحت کرتے ہیں اور اس سے پہلے ہم ایک نکتہ کا ذکر کرتے ہیں۔

سخت ترین حالات میں عفت

عام حالات میں عفت پاکدامنی کی حفاظت سہل و آسان کام ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ عفت و پاکدامنی کی حفاظت محال ہو جاتی ہے۔پھر اگر ان حالات میں عصمت الٰہی اور امداد غیبی انسان کی فریاد کو نہ پہنچے تو تقویٰ و پرہیز گاری کے توڑنے والے عوامل پاکیزگی کے ہر قسم کے عزم کو شکست سے دوچار کر دیتے ہیں اور انسان خواہشات کے گرداب میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

جن حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام گھرے ہوئے تھے وہ موخر الذکر قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔عفت و پاکیزگی کے معیار میں اگر حضرت یوسف علیہ السلام ایک عام انسان ہوتے تو یقینا اپنی زندگی سے متعلق ان حالات سے شکست کھا جاتے......اور ان کا دامن عصمت آلودہ ہو جاتا۔عفت و شہوت کے عوامل کے درمیان کش مکش سے ان کا سلامت رہنا، عقل و نفس کے درمیان جنگ کے دوران ان کا سرفراز و سربلند رہنا، ایک امداد غیبی کے باعث تھا جس کا نام عصمت ہے جو انھیں حاصل تھی۔یہ حقیقت ان کے حالات زندگی کے مطالعہ سے واضح و روشن ہو جاتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے عرصہ حیات میں بھرپور جوانی کو پہنچے تو ان کا تجاذب جنسی اور کشش باطنی بہت زیادہ جوش پر تھے۔ ان کی زندگی ایسے حالات میں گزر رہی تھی کہ اگر امداد غیبی ان کو نہ پہنچتی تو یقینا گناہ ایک خوفناک دھاکہ کی صورت میں ان کی زندگی میں رونما ہوتا۔ اگر زمانہ کے پردوں کو ہٹا دیں اور انحالات کا مطالعہ کریں جن میں وہ زندہ تھے تو ہم دیکھیں گے کہ یوسفؑ ایک جوان زیبا و خوب صورت، دلربا چہرہ اور جسم دلآراء رکھتے ہیں۔وہ ایک نوجوان، انتہائی حسین وجمیل عورت کے گھر میں رہتے ہیں جو ہر روز اپنے آپ کو سنگھار کی آخری حد تک سنوارتی ہے، زیبا ترین لباس پہنتی ہے اور مختلف طریقوں سے یوسفؑ سے اظہار عشق کرتی ہے، یوسف کو پھانسنے کے لیے ہر قسم کے جال بچھاتی ہے۔اسے اپنے وسیع و عریض قصر میں تہ بہ تہ کمروں میں لے جاتی ہے جہاں اس کے اور یوسفؑ کے سوا کوئی تیسرا آدمی نہ ہو۔پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ قصر کے دروازے بند کر دیتی ہے تا کہ کوئی اندر نہ آنے پائے۔اس طرح وہ اپنے آپ کو اتنی بڑی کامیابی کے سامنے پاتی ہے جس کا

وہ مہینوں سے انتظار کر رہی ہے۔ اب وہ اپنی مخصوص عشوہ گری اور فریب کاری کے ساتھ بڑے ناز و انداز سے اس پاکدامن کنعانی نوجوان کی طرف رخ کرتی اور کہتی ہے:

ھیت لک یعنی ''جو کام تیرے لیے تیار کیا گیا ہے اس کے لیے جلدی کر۔'' وہ اس موقع پر اس طرح کا جواب پاتی ہے:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

(یوسف: ۲۳)

''میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ عزیز مصر میرا ولی نعمت ہے۔ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔''

ایک طرف ایک عشوہ گر عورت کا بدکاری پر اصرار و تاکید اور دوسری طرف ایک نامحرم عورت کی طرف ہاتھ بڑھانے سے ممانعت، اس بات کا سبب بنے کہ ایک نیا خیال یوسفؑ کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا، اس نے سوچا کہ اس منزل گناہ پر زیادہ دیر رکنا خطرناک ہے۔ لہٰذا فوراً اس محل سے دور نکل جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر یوسف تیزی کے ساتھ دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں کہ اس کو کھول کر اپنے آپ کو اس عفریت شہوت سے نجات دلائیں۔

عزیز مصر کی بیوی بھی ان کے پیچھے بھاگتی ہے کہ انھیں باہر نکلنے سے روکے۔ جب وہ یوسف کا کمرے سے نکلنے کا مصمم ارادہ پاتی ہے تو پیچھے سے ان کی قمیص کے دامن کو پکڑ کر جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر یوسفؑ کی قمیص اوپر سے نیچے تک پھٹ جاتی ہے۔

اس جوان کنعانی کی زندگی کا یہ گوشہ اس قدر شدید ہے کہ اگر یہ حالات کوہ و دریا پر وارد ہوں تو ان کو بھی انکے مقام سے اکھاڑ ڈالیں اور ایک طوفان عظیم کھڑا ہو جائے۔ لیکن یہ جوان خواہشات کے طوفان میں پہاڑ سے بھی زیادہ استقامت کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور ہرگز اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

اب دیکھنا ہوگا کہ کون سے عوامل اس بات کا سبب بنے کہ یہ نوجوان استقامت و عزم صمیم کے ساتھ ان شدید حالات میں نہ صرف یہ کہ جادۂ عفت سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ اس کی طرف مائل ہونے کی کوئی علامت بھی اس کے کردار میں نہیں پائی جاتی۔

کیا آپ خیال کریں گے کہ اس بات کے فاش ہو جانے کے خوف نے اسے روکے رکھا؟

کیا اس کی فطرت اور یعقوبؑ نامی نبی کے خاندان سے اس کی نسبت اس کی حفاظت کا سبب بنی؟

کیا احترام قانون کے احساس نے اسے خیانت سے باز رکھا؟

ان تمام عوامل میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ جو اس جوان رعنا و قوی کو پاکبازی و عفت قائم رکھنے پر مجبور کر سکے۔

اس راز کے فاش ہونے اور عزیز مصر کے اس واقعہ کی اطلاع پانے کا مرحلہ بہت بعید تھا کیونکہ عزیز مصر کی بیوی نے یقیناً اپنے محل میں اس بات کو بہت محفوظ کیا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے شوہر پر اس قدر قابو پا رکھا تھا کہ جب ساری بات اس پر ظاہر ہو بھی گئی تو اس نے کوئی سخت اقدام اپنی بیوی کے خلاف نہ کیا بلکہ اتنا کہا: ''استغفری لذنبك'' (اپنے گناہ سے توبہ کر)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کچھ ظاہر ہونا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے ناموس کے معاملہ میں بہت لا پرواہ شخص تھا۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو خاندان نبوت سے انتساب تو برادران یوسف میں بھی موجود تھا لیکن اس انتساب کی وجہ سے وہ اپنے فعل قبیح سے نہ رک سکے اور ایسے جرم کا ارتکاب کر گزرے جو زنا و بدکاری سے بھی بدتر تھا۔

طوفان شہوات کے مقابلہ میں احترام قانون اور خواہشات کے سمندر کی پہاڑوں جیسی بلند نہریں ایسا عامل ثابت نہیں ہوتے جو عفت آفریں ثابت ہو۔ لہٰذا ہمیں یہاں کوئی اور ایسا عامل تلاش کرنا پڑے گا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو لغزش سے روکے رکھا، جس کا انھوں نے بہت ہی مختصر سے جملہ معاذ اللہ سے جواب دیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان تھا جس سے ان کا قلب مملو تھا، ان کے قلب میں اس کے غیر کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یعنی یہ عصمت الٰہی تھی جس نے طوفان شہوات کے مقابلہ میں ان کی حفاظت فرمائی اور انھیں پاکبازی بخشی۔ اس کے بغیر استقامت و مقاومت کا تصور خواب و خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب اظہار خیال کے طور پر لوگ ان کے بارے میں جو چاہیں کہتے رہیں اس کی کوئی سند نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بیشتر اندیشہ ہائے باطل یہود کی روایات کی صورت میں پائے جاتے ہیں جن کو اسرائیلیات کا نام دیا جاتا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ شخص جس کی خداوند تعالیٰ، عزیز مصر کی بیوی اور دیگر زنانِ مصر تقویٰ و پاکیزگی کے لیے تعریف کرتے ہیں، اسی کو یہ داستان گو ایک طومار کھڑا کر کے آلودگی گناہ میں ملوث شخص کے طور پر متعارف کروانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حادثہ میں حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی معمولی سی غلطی بھی سرزد ہو جاتی تو ان کی شکست خوردہ عاشق اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی اور حضرت یوسفؑ سے اپنا انتقام لیتی۔ اس کے برعکس ہوا یوں کہ اس عورت اور دیگر زنانِ دربار مصر نے اس خیال ہی کے خلاف گواہی دی اور کہنے لگیں:

حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۵۱﴾ (یوسف: ۵۱)

''(دربارِ مصر کی عورتوں نے کہا) ''ہم نے تو اس میں کوئی بدی نہیں دیکھی۔ اس وقت عزیز (مصر) کی بیوی نے کہا اب جبکہ حق واضح ہو چکا ہے، میں نے ہی اسے اپنی طرف دعوت دی تھی اور وہ سچوں میں سے ہے۔''

لہٰذا اگر حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی معمولی سی لغزش بھی سرزد ہوئی ہوتی تو قرآن اسے یقینا آدم و حوا اور یونس کے قصوں کی طرح پیش کرتا اور ہرگز انھیں اسوۂ تقویٰ، نمونہ پاکیزگی اور داستانِ عفت کے طور پر سامنے نہ لاتا۔

اب ہم اس آیت قرآن پر بحث کرتے ہیں جن کا مخالفین عصمت انبیاء سہارا لیتے ہیں۔ آیہ مبارکہ اس طرح ہے:

---

[1] اللہ تعالیٰ اس عامل کو 'برہانِ رب' سے تعبیر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ (یوسف: ۲۴)

''اس عورت نے (یوسفؑ) کا قصد کیا اور وہ بھی اگر اپنے پروردگار کی برہان کو نہ دیکھتا تو اس (عورت) کا قصد کرتا۔ ہم نے اس لیے ایسا کیا تا کہ بدی و قباحت کو اس (یوسفؑ) سے دور رکھیں اور وہ تو ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔''

مخالف عصمت لوگوں نے اس آیت کی تفسیر میں جملہ ''وھم بھا'' کو ایک کامل جملہ گردانا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں: ''یوسفؑ نے بھی عزیز مصر کی بیوی کی طرح ہی اس کی طرف گناہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، فرق صرف اس قدر ہوا کہ یوسفؑ نے ارادۂ گناہ کے بعد ''برہانِ رب'' کا مشاہدہ کیا اور اس کو دیکھ کر ارتکاب گناہ سے ہٹ گئے لیکن جملہ ''لو لا ان رابرھان ربه'' میں ''لولا'' کا جواب ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کا جواب ''لفعل و افتراب'' بنتا ہے۔ لہٰذا اس تفسیر کے اعتبار سے اس آیت میں ہمیں دو کامل جملے نظر آتے ہیں:

۱: ''وھم بھا'' (اس نے گناہ کا ارادہ کیا)

۲: ''لولا ان رابرھان رب: لاقترب'' اگر وہ اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھتا تو مرتکب گناہ ہو جاتا۔''

لہٰذا مخالفین عصمت کے خیال کے مطابق پہلا جملہ حضرت یوسفؑ کے اس عمل کے ارتکاب کے لیے پختہ ارادہ کو ظاہر کرتا ہے جس سے وہ بعد میں برہان خدا کے مشاہدہ کی وجہ سے باز رہے۔[1]

حامیان عصمت کے دلائل

عصمت انبیاء علیہم السلام کے حامی اس آیہ مبارکہ کی ایک اور طریقہ سے تفسیر کرتے ہیں۔ انہوں نے مذکورہ نظریہ سے انکار کیا ہے۔ ہم یہاں ان کی بحث کی وضاحت کرتے ہیں:

۱۔ ھم جملہ وھم بھا میں تصمیم و ارادہ کے معنی میں نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ عصمت کے ساتھ سازگار نہ ہو۔ بلکہ اس سے قلب انسانی میں ایک گمان کا پیدا ہونا مراد ہے جو ہر انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ مؤلف روح البیان اس نظریہ کو اختیار کر کے کہتا ہے کہ: یوسفؑ فطرت انسانی کی تحریک اور جوانی کی خواہش سے مجبور ہو کر اس عورت کی کشش پر آگے بڑھے۔ یہ وہ کشش تھی جو

[1] اسی نظریہ کو مفسرین کی ایک جماعت مثلاً فخر رازی نے مفاتیح الغیب ج ۵، ص ۱۲۰ المنار، ج ۱۲ ص ۲۸ نے نقل کیا ہے۔ اسرائیلی افسانے بھی اس کی تائید کرتے ہیں عجیب بات یہ ہے کہ رازی نے واحدی سے کتاب ''البسیط'' میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک جملہ نقل کیا ہے جس سے ان لوگوں کی تمام انبیاء کے بارے میں ایسی باتوں کی بے پائیگی ظاہر ہوتی ہے۔

انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہے اور ہرگز انسان کے عزم و قصد اا س سے تعلق نہیں ہوتا۔[1] مفسرین کی ایک جماعت نے بھی اس نظریہ کو اپنایا ہے۔

ناپختگی دلیل

لفظ ھم عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسفؑ صدیق دونوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے اور دونوں اس واقعہ میں شریک ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

"ولقد ھمت بہ......

"وھم بھا......

اگر جملہ اول میں "ھم" عزم و ارادہ کے معنی میں ہو تو بالکل اسی طرح ہوگا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسرے جملہ میں یہ اسی معنی میں کیوں نہیں اور دونوں جملوں میں فرق واقعۂ ظاہر کے خلاف ہے۔

۲: شیخ محمد عبدہ نے سید محمد رشید رضا کے بیان کو نقل کرتے ہوئے لفظ 'ھمت' کو عزیز مصر کی بیوی کے پختہ ارادہ کے معنی میں اختیار کیا ہے۔ ان کے نظریہ کی بنیاد اس نکتہ کلی پر ہے جو عاشقوں کے درمیان پایا جاتا ہے کیونکہ جب بھی کوئی عاشق شکست سے دوچار ہوتا ہے تو معشوق سے اس کا انتقام بدزبانی سے شروع ہو کر مار پیٹ اور قتل کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ عزیز مصر کی بیوی نے بھی یہی لائحہ عمل اختیار کیا اور چاہا کہ اپنے معشوق سرکش سے اس طرح انتقام لے۔[2]

لہٰذا اگر لفظ 'ھم' زلیخا کی جانب سے مارنے کے ارادہ کو ظاہر کرتا ہے تو فطرتاً حضرت یوسفؑ کی جانب سے بھی وحدت سیاق کے حکم کے مطابق اسی معنی میں ہونا چاہیے۔

چند ایک معاصر مولفین نے صاحب 'المنار' کے اس خیال کو نقل کرنے کے بعد اس کی تائید کی اور کہا ہے کہ گذشتہ آیت میں 'ولقد ھمت بہ' سے ان تمام ممکنہ مراحل کا ذکر واضح ہو جاتا ہے جو عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسفؑ کی اپنی طرف موافقت کے حصول کے لیے طے کیا ہوں گے۔[3] حتیٰ کہ اس نے واضح طور پر حضرت یوسفؑ سے کہا "ھیت لك": "جلدی کرو"۔ یہ آخری اقدام تھا جس کو خاتون مصر یوسفؑ

---

[1] روح البیان ج ۴، ص ۲۳۷

[2] المنار، ج ۱۲، ص ۲۷۸

[3] یعنی آیہ مبارکہ "وراودتہ التی ھو فی بیتھا عن نفسہ و غلقت الابواب و قالت ھیت لك" اس عورت نے جس کے گھر میں یوسف رہتے تھے مطلب براری کی تمنا کی، دروازے بند کر دیے اور کہا کہ "جس کام کے لیے وہ آمادہ ہے اس میں جلدی کرو" جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب جملے عزیز مصر کی بیوی کے ارادہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس نے دو مرتبہ اس کام کا ارادہ کیا ہو۔

سے مطلب براری کے لی یا اختیار کر سکتی تھی۔ اس صورت میں اگر ہم "ولقد همت به" کہیں تو اس کا مطلب اس فعل کا عزم ہوگا اور اس کے معنی تکرار کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گے۔[1]

جواب: لغت عرب میں لفظ 'هم' ،عزم و تصمیم کے معنی میں آتا ہے۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ عزم و ارادہ کس چیز کا ہے، اس کو قرائن سے سمجھنا چاہیے۔ زیر بحث آیت میں کوئی ایسا قرینہ نظر نہیں آتا جس سے مار کٹائی کا ارادہ ظاہر ہوتا ہو۔

لکھنے والا معاصر جو بیان تائید مؤلف المنار کے لیے پیش کرتا ہے اس صورت میں قابل قبول ہوگا جب تکرار موضوع بے فائدہ ہو لیکن اگر مطلب سابقہ کی تکرار کسی اور مطلب کے مقدمہ کی خاطر ہو تو اس صورت میں تکرار بے فائدہ نہ ہو گی بلکہ مستحسن اور خوبصورت متصور ہوگی۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ پہلی آیت 'وراودته التی' طرفین کی کشمکش کو بیان کرتی ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ایک طرف سے رجحان و اظہارِ خواہش اور دوسری طرف سے انکار کی کیفیت انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن دو اہم مطالب جو دوسری اور تیسری آیات میں بیان ہوئے ہیں اس میں ظاہر نہیں ہوتے۔ یہ دونوں مطالب ان سوالات سے عبارت ہیں:

(ا) اس انکار کی علت کیا تھی؟

(ب) حضرت یوسفؑ نے اس مخمصہ سے کیسے نجات حاصل کی؟

قرآن مجید ان دو مطالب کی وضاحت کی طرف دوبارہ لوٹتا ہے اور اصل مسئلہ کو بطور مقدمہ اور تمہید پیش کرتا ہے تاکہ ان دونوں مطالب کی صراحت ہو سکے۔ پس "همت به و هم بها" دونوں کا ذکر کرنے کے بعد موضوع اول یعنی علت نجات یوسفؑ کے متعلق فرماتا ہے:

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ (یوسف: ۲۴)

''اور وہ بھی ارادہ کر لیتا اگر اس نے اپنے پروردگار کی واضح دلیل نہ دیکھی ہوتی۔ یہ اس لیے کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی ہٹائے رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

پھر دوسرے موضوع کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ (یوسف: ۲۵)

''دونوں دروازے کی طرف بھاگے اور یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔''

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں تکرار مسئلہ اور عزم و تصمیم گناہ عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے تھی۔ اس سے دو اہم مطالب کی

---

[1] جمالِ انسانیت، ص ۷۹

طرف اشارہ ہے جن کے بارے میں اس داستان کو پڑھنے والا منتظر ہے اور ہم اصل موضوع کی طرف بازگشت کی حصول نتائج کے لیے لازم جانتے ہیں۔

مولف کتاب نے ایک اور وجہ ''عبدہ'' کے نظریہ کی تائید میں بیان کی ہے۔یعنی اگر ہم کہیں کہ دونوں موارد میں ھم سے مراد مار کٹائی ہی ہے تو پھر اس صورت میں لفظ سوء اور فحشاء کے آیت میں دو مختلف معانی قرار پائیں گے۔ پہلے لفظ سے مراد مارنا ہوگا اور دوسرے لفظ سے عمل خلاف عفت ہی مراد لیا جائے گا۔لیکن اگر ہم کہیں کہ دونوں الفاظ سے صرف عمل خلاف عفت ہی مراد ہے تو پھر دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہوں گے اور یہ بات فصاحت قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ توجیہہ بھی چنداں پائیدار معلوم نہیں ہوتی۔بعض موقعوں پر تاکید یا تفنن الفاظ عبارت کی فصاحت کے اظہار کے طور پر بھی ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں میں ہوسکتا ہے کہ نفسانی کی خاطر خیانت ہے جبکہ ''فحشاء'' کا مطلب خلاف عفت عمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے ''برہان رب'' کے سایہ میں انھیں ان دونوں گناہوں سے محفوظ فرمایا۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے تعبیر قرآن کے مطابق دونوں گناہوں کو حضرت یوسف علیہ السلام سے دور رکھا کیونکہ شوہر دار عورت کے ساتھ ایسے تعلق سے دو الزام سامنے آتے ہیں اور یہ عمل 'فحشاء' کے دائرے میں ہوتے ہوئے حقوق مردانہ میں بھی خیانت کے مترادف ہوگا۔البتہ اگر تعلق بے شوہر کی عورت سے ہو،جس میں عورت پر جبر و اکراہ کا داخل نہ ہوتو ایک ہی الزام عائد ہوگا۔

اب ہم آیہ مبارکہ کی وضاحت صحیح پیش کرتے ہیں تاکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح صاف ہو جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نہ صرف یہ کہ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ ان کے ذہن میں ارتکاب گناہ کے تصور تک نے بھی کوئی جگہ نہیں پائی۔

''برہان رب' کا تصور

سورۂ یوسفؑ کی ایک آیت عصمت انبیاء کے حامیوں اور مخالفین دونوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔دونوں جماعتوں نے اس آیت کی اپنے عقاید کے مطابق تفسیر کی ہے۔ہم اپنے سابقہ مباحث میں دونوں مکاتب خیال کی توجیہات سے واقف ہو چکے ہیں اور اس سلسلہ میں دونوں کے ناپختہ طریق تصور کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔اب ہم اس منزل پر ہیں کہ اپنے نظریات کو جن کی بہت سے محققین تفسیر نے حمایت کی ہے، ہدیہ قارئین کریں۔اس طرح ہم ایک بار پھر طرفداران عصمت انبیاء کے دلائل کی طرف رجوع کریں گے۔خداوند عالم عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسفؑ کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝۲۴ (یوسف: ۲۴)

''عزیز مصر کی بیوی نے اس (یوسفؑ) کا قصد کیا۔اگر وہ (یوسفؑ) اپنے پروردگار کی برہان کو نہ دیکھتا تو

وہ بھی اس (عورت) کا قصد کرتا۔ ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ ہم بدی وقباحت کو اس (یوسفؑ) سے ہٹا دیں اور وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہے۔''

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

(یوسف: ۲۵)

''وہ دونوں دروازہ کی طرف بھاگے۔ عزیز مصر کی بیوی نے یوسف کی قمیص کو پیچھے سے پھاڑ ڈالا۔ اسی وقت دونوں نے اس عورت کے مالک کو گھر کے دروازہ پر موجود پایا۔ اس عورت نے کہا: ''اس شخص کی سزا جو تیرے اہل کی طرف قصد بد کرے زندان یا عذاب دردناک کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔''

پہلی آیت میں جو مخالفین عصمت انبیاء کے پاس دلیل ہے، ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا لازم ہے اور وہ یہ ہے:

لفظ 'لولا' (جس کو عربی زبان میں لولائے امتناعیہ کہتے ہیں) جواب کی احتیاج رکھتا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کے معنی ہماری زبان میں 'اگر یہ نہ ہوتا'' کے مترادف ہیں۔ مثلاً ہم کہیں ''اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میں غرق ہو جاتا۔'' اس جملہ میں ''میں غرق ہو جاتا'' کا جملہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا کا جواب ہے جس کے بغیر جملہ مکمل نہیں ہوتا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

گر نبودے عزم جوزا خد متش
کس ندیدے برمیان او کمر

''اگر ستارۂ جوزا اس کے موافق نہ ہوتا تو اس کی کمر پر کوئی کمر بند نہ دیکھتا۔''[1]

اس شعر میں ''کس ندیے''، ''گر نبودے'' کا جواب ہے۔

اسی طرح عربی زبان میں بھی لفظ ''لولا'' فارسی کے ''اگر نبود'' کی طرح احتیاج جواب رکھتا ہے۔ یہ جواب تین طرح کا ہو سکتا ہے:

۱: اس کا جواب واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے، جیسے:

''لولا علی (علیه السلام) لهلك عمر'' یعنی اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔''

۲: بعض اوقات اس کا جواب محذوف ہو جاتا ہے اور قرائن سے سمجھا جاتا ہے، جیسے:

[1] فارسی کے اس شعر کا عربی میں اس طرح ترجمہ ہوا ہے۔

لولم تكن نية الجوزاء خدمته
لمارايت عليها عقد منطق

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝ (نور: ۱۰)

''اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم نہ ہوتا (تو تم سب ہلاک ہو جاتے) اور اللہ توبہ قبول کرنے والا حکیم ہے۔''

ترجمہ میں جو الفاظ قوسین کے درمیان ہیں، وہ لولا کا جواب ہیں۔ ان الفاظ کو کہیں ذکر نہیں کیا گیا لیکن ان کی ضرورت قرائن سے معلوم ہوتی ہے۔

۳: کبھی کبھی لولا سے سابقہ جملہ جواب محذوف کی جگہ لے لیتا ہے۔ مثلاً:

"قد كنت هلكت لولا انى نجيتك"

''تو ہلاک و ناپید ہو جاتا اگر میں نے تجھے نجات نہ دی ہوتی۔''

"قد كنت هلكت" جو "لولا" سے پہلے آیا ہے، "لولا" کا جواب ہے جو محذوف ہے، کیونکہ جملہ کا واقعی شکل کچھ اس طرح ہے:

"لولا انى نجيتك قد كنت هلكت"

عربی زبان کی نظم و نثر دونوں میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

اب ہم اپنے بیان کی طرف لوٹتے ہیں اور آیہ زیر بحث میں لولا کا جواب تلاش کرتے ہیں۔

آیت زیر بحث میں جملہ کی ظاہری شکل اس طرح ہے:

"وهم بها لولا ان را برهان ربه" ظاہر ہے کہ اس جملہ میں لفظ "لولا" کے جواب کی احتیاج ہے لیکن بظاہر جملہ میں اس کا جواب موجود نہیں۔ لہٰذا اس کا جواب [1] تقدیر میں سمجھنا چاہیے اور جو بات جواب محذوف کا قرینہ قرار دی جا سکتی ہے وہی لولا پر متقدم جملہ ہوتا ہے اور وہ ہے جملہ وهم بها۔ لہٰذا جملہ کی شکل واقعی اس طرح ہوگی:

"لولا انه ابرهان ربه لهم بها۔" یعنی ''اگر وہ (یوسفؑ) اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیتا تو وہ بھی عزیز مصر کی بیوی کا قصد کرتا۔'' لیکن چونکہ وہ اس قسم کی رویت و شہود سے دو چار ہو چکا تھا لہٰذا اس کا یہ قصد نہ ہوا اور نہ ہی اس کے ارادہ نے اس عورت کا رخ کیا۔

اس گفتگو میں غور کرنے سے ہمیں آیہ مبارکہ میں دو جملے نظر آتے ہیں، ایک مطلق جملہ ہے اور دوسرا شرطیہ۔ پہلا جملہ ولقد همت به ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ عزم و ارادہ تحقق پا چکا تھا۔ دوسرا جملہ "لولا ان را برهان ربه لهم بها" ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مانع یعنی ''برہان رب'' کی موجودگی میں ارادہ متحقق نہیں ہوا تھا اور قلب یوسفؑ سوچ کی آلودگی سے بھی پاک تھا۔

---

[1] علماء ادب کا اتفاق ہے کہ لولا کا جواب اس پر مقدم نہیں ہوتا۔ اس لیے پہلا جملہ اس کے جواب کا قرینہ تو بن سکتا ہے، خود جواب نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جملہ "ولقد همت به وهم بها" میں لام قسم کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قسم کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا لام قسم کے اعتبار سے آیہ مبارکہ کا مفہوم معطوف "وهم بها" اور معطوف علیہ "ولقد همت به" اس طرح ہے:

''خدا کی قسم زلیخا نے یوسفؑ کا قصد کیا اور خدا کی قسم اگر یوسفؑ نے برہان رب کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ بھی اس کا قصد کرتا۔'' (لیکن چونکہ یوسف نے اسے (برہان کو) دیکھ لیا تھا اس لیے وہ عزم جاتا رہا۔'')

آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام اس تفسیر کی طرف ایک مختصر سی عبارت میں ارشارہ فرماتے ہیں:

"ان یوسف کان معصوما، والمعصوم لا یهم بذنب ولا یاتیه" [1]

''یوسف معصوم تھے۔ فرد معصوم نہ تو گناہ کا قصد کرتا ہے اور نہ ہی اس کا ارتکاب۔''

اس صورت میں نہ صرف یہ کہ یہ آیہ مبارکہ حضرت یوسفؑ کی گناہ میں آلودگی کی شاہد نہیں بلکہ ان کی ہر قسم کے گناہ، حتیٰ کہ اندیشہ گناہ کے خلاف بھی عصمت کی دلیل ہے۔''

برہان رب کا مقصود

لغت عرب میں برہان کے معنی حجت قاطعہ، ''شاہد واضح'' اور مبین حقیقت کے ہیں، [2] جو چیز شک و تردید کو قطع کرے، حقیقت کی وضاحت کرے اور اصطلاح میں علم و یقین کے لیے مفید ہو، اس کو 'برہان' کہتے ہیں۔

اگر قرآن معجزہ کو برہان کا نام دیتا ہے تو فرماتا ہے:

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ ؕ (قصص: ۳۲)

''تیرا عصا اور ید بیضا تیری رسالت پر گواہ ہیں، اللہ کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔''

اگر قرآن خود پیغمبر کو 'برہان' کہہ کر پکارتا اور فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (نساء: ۱۷۴)

''اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک گواہ و برھان آیا ہے۔''

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۲، ص ۴۲۱

[2] ابن منظور ''لسان العرب'' میں کہتا ہے۔ البرهان: الحجة الفاصلة البينة يقال: برهن يبرهن برهنة اذا جاء بحجة قاطعه للرد الخصم" (لسان العرب، ج ۱۳، ص ۵۱) یعنی برہان ایسی فیصلہ کن اور واضح دلیل ہے جس کے لیے عرب کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے برہان قائم کی، یعنی ایسی دلیل لایا جس نے مد مقابل کے عناد کو توڑ کر رکھ دیا۔

اگر قرآن مشرکوں سے کہتا ہے:

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۶۴ (نمل: ۶۴)

''کیا خدا کے علاوہ بھی کوئی اللہ ہے۔ کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل اور گواہ لے کر آؤ، اگر تم سچے ہو۔''

اگر قرآن تمام کا تمام اس لیے ہے کہ یہ معجزہ، حجت واضح اور اپنے پیش کرنے والے کے لیے دلیل قاطع ہے، اسی طرح اس ماحول میں وجودِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کا ایسی کتاب پیش کرنا کہ اس کے مقابلہ میں عرب کے تمام فصحاء و بلغاء عاجز و ناتواں ہو گئے، بذات خود ایک گواہ قاطع اور حقیقت کے لیے دلیل واضح ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخصیت کسی اور جہان سے تعلق رکھتی ہے اور مکہ کے ماحول یا عالم مادہ سے بالاتر و برتر مقام کی تربیت یافتہ ہے۔

ان حالات میں لغت و قرآن کی نظر سے 'برہان' کے معنی میں غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس مقصود کلی سے کیا مراد ہے؟ یہاں مفسرین نے کئی وجوہات کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر ناپختہ و ناقابل قبول ہیں۔ مثلاً:

۱: زنا کی حرمت اور اس پر مترتب عذاب کے بارے میں یوسفؑ کا علم و آگہی۔

۲: صفات واضح جو انبیاء اور برگزیدہ حضرات میں پائی جاتی ہیں اور انھیں عفت و پاکدامنی اور پلیدگی سے نفس کی حفاظت کی دعوت دیتی ہے۔[1]

یہ مسلم امر ہے کہ یہ صفات واضح جب تک کوئی مستحکم و استوار سہارا نہ رکھتی ہوں، تحریم زنا اور اس کے اخروی مفاسد کے بارے میں تنہا علم عام کی معاون نہیں ہوسکتیں بلکہ طوفان غرائز کی شکست و ریخت کرنے والی امواج مناسب و آمادہ اور تیار ماحول کی موجودگی میں سب کچھ ریزہ ریزہ کر دیتی اور بہا کر لے جاتی ہیں۔

ایک جماعت نے اسے نبوت، بعض نے عصمت اور کچھ لوگوں نے لطف الٰہی و امدادِ غیبی سے اس کی تفسیر کی ہے اور شاید یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کی جانب رجوع کرتی ہیں۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد فحشاء کی واقعیت کا تجسم اور ان کے دنیوی و اخروی زندگی میں وحشتناک نتائج ہیں۔ اس قسم کا تجسم نبوت و عصمت اور الطاف الٰہی من جانب اللہ کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے۔

اس قسم کی واقعیت کے اظہار نے، جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ''را برھان ربہ'' ان کی نظر میں افق کو اس قدر روشن کر دیا کہ شک و تردد کا معمولی سے معمولی شائبہ بھی ان کے دل میں باقی نہ رہا۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے حجت ہائے عقلی افق دلائل علمی کو انسان کے سامنے واضح کر دیتے ہیں اور انسان کو واقعیت و قاطعیت سے ہمکنار کر دیتے ہیں، اسی طرح واقعیت عمل کا سامنا، جو لوازم نبوت و عصمت اور الطاف الٰہی سے ہے، اسے روشنی بخشتے ہوئے قاطعیت مہیا کرتا ہے اور اسی اعتبار سے ان اعمال کے انجام کو اس کے ذہن میں واضح کر دیتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۲۵

یہاں بعض مفسرین نے ''برہان رب'' کے اور معنی بتائے ہیں جو کسی طرح بھی انبیاءؑ کے مقام نبوت وعصمت سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ بعض اوقات توقلم ان کے بیان سے شرماتا ہے۔ غالباً اسرائیلی روایات نے اس قسم کی توجیہات وتشریحات کو جنم دیا ہے۔

بعض مولفین اس بات کے مدعی ہیں کہ دروازوں کا کھلنا معجزہ کی شکل میں واقع ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ سابقہ آیت میں......

''غلقت الابواب و قالت هیت لك..... '' یعنی دروازوں کا بند کرنا پیش کیا گیا ہے، لیکن ان کے کھلنے کی بات درمیان میں نہیں آئی، لہٰذا فطری طور پر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ان کا کھلنا مراد ہے۔[1]

یہ تفسیر سیاق آیات اور اس کشمکش کے ساتھ جو عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے درمیان واقعہ ہوئی، یہاں تک کہ نوبت پیراہن یوسفؑ کے پھٹ جانے تک جا پہنچی، مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ قرآن اس طرح فرماتا ہے:

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ؀ (یوسف: ۲۴)

''اور اگر وہ اپنے پروردگار کی برہان کو نہ دیکھتا تو اس کا قصد کرتا۔ ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ ہم اس سے بدی اور فحشا کو پلٹا دیں کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔''

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ (یوسف: ۲۵)

''دونوں دروازے کی طرف دوڑے، عزیز مصر کی بیوی نے یوسفؑ کی قمیص کے دامن کو پیچھے سے پھاڑ دیا اور دروازہ پر اس کے شوہر سے ان کا سامنا ہو گیا تو اس عورت نے کہا............''

دوسری آیت ظاہر کرتی ہے کہ اس مقام سے نکل بھاگنے کا خیال حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں ایک شعلہ کی طرح لپکا اور انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس محل سے باہر نکل جائیں۔ اس بنا پر وہ دروازہ کی طرف دوڑے۔ وہ عورت بھی انھیں باہر نکلنے سے روکنے کے لیے دروازہ کی طرف تیزی سے بڑھی۔ اس طرح حقیقت میں تو دونوں ہی دروازہ کی طرف لپکے تھے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا دروازہ کی طرف بھاگنا صرف عفریت شہوت سے نجات حاصل کرنے کے لیے تھا جبکہ اس عورت کا مقصود انھیں دروازہ سے باہر نکلنے سے روکنا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی کوشش تھی کہ دروازہ کھل جائے جبکہ اس عورت کی خواہش اس کے بالکل برعکس تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے یوسفؑ کو پیچھے کھینچنے کے لیے ان کے دامن کو اس زور سے کھینچا کہ پیرہن اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا۔

اب اگر سابقہ آیت میں 'برہان رب' سے دروازہ کا ارادۂ الٰہی سے کھلنا مراد لیا جائے تو دروازہ کے کھل جانے کے بعد کے دو حادثوں کی

---

[1] تفسیر آیات مشکلہ قرآن

توجیہہ، جن کا ذکر بعد والی آیت کر رہی ہے، بہت مشکل ہوگی۔ وہ دو حادثے یہ ہیں:

۱: اگر وہ دروازہ ارادۂ خدا سے کھل گیا تھا تو باہر نکلنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کہ وہ پہلے باہر نکل جائے، بلاوجہ ہوگی۔ اس طرح ان میں سے ایک کا دوسرے سے ایک لمحہ کا تقدم ایک کی پاکیزگی اور دوسرے کی بدی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

۲: اگر دروازہ ان کے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے سے پہلے ہی کھل گیا تھا تو اس صورت میں دروازہ کی طرف بڑھنا، قمیص کے دامن کو کھینچنا اور اس کا اوپر سے نیچے تک پھٹ جانا مکمل طور پر غیر ضروری قرار پائے گا۔

اس حادثہ کا وقوع ثابت کرتا ہے کہ ہم وثوق کے ساتھ یہ کہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دروازہ کو کھولنے کے لیے اس کی طرف بڑھے تھے اور عزیز مصر کی بیوی انھیں دروازہ کھول کر باہر نکلنے سے روکنے کے لیے ان کی طرف بڑھی تھی۔ اس کش مکش میں، جبکہ ان میں سے ایک یعنی حضرت یوسفؑ دروازہ کھول کر باہر بھاگنا چاہتے تھے جبکہ دوسری چاہتی تھی کہ دروازہ بند رہے اور وہ کمرے کے اندر ہی رہ جائیں، حضرت یوسفؑ کے پیرہن کا دامن پھٹ گیا۔ انجام کار وہ طاقتور مجاہد، یعنی حضرت یوسفؑ فریق ثانی کی پوری کوشش کے باوجود دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

اس کیفیت کی موجودگی میں ''برہانِ رب'' کی یہ تفسیر کہ دروازہ کا کھلنا تائید غیبی کے طور پر تھا، درست قرار نہیں دی جاسکتی۔

قرآن اور عصمت حضرت موسیٰ علیہ السلام

۱: قطبی کا قتل

حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے حالات زندگی میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو دو افراد کو، جن میں ایک بنی اسرائیل سے تھا اور دوسرا فراعنہ سے، دیکھا کہ شدت کے ساتھ آپس میں دست و گریبان ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ آپ اس کی مدد کے لیے آئے اور ایک مکہ اس قبطی کے سینہ پر مارا جس سے وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے اپنے عمل کی ان الفاظ میں تصریح فرمائی:

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ۱: (قصص: ۱۵)

''یہ کار شیطان ہے جو کھلم کھلا دشمن اور گمراہ کرنے والا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ظالم کہا اور خداوند تعالیٰ سے طلب مغفرت کرتے ہوئے عرض کیا:

۲: رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾

(قصص ۱۶)

''پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ مجھے بخش دے۔ خدا نے اس کو بخش دیا وہ بخشنے والا رحیم ہے۔''

۳: جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبطی کے قتل کا مجرم قرار دیا تو انہوں نے اپنے اس عمل کو اس طرح بیان کیا:

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ (شعراء: ۲۰)

''میں نے یہ کام انجام دیا در آنحالیکہ میں گمراہوں سے تھا۔''

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جملے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی زبان سے ادا فرمائے ہیں تو پھر یہ کس طرح ان کی عصمت کے لیے ساز گار ہیں؟

جواب: قرآن مجید نے قتل قبطی کا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دو سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ان آیات کے متن سے واقفیت حاصل کریں۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ (قصص ۱۴)

’’جب وہ قوی و جوان ہو گیا تو ہم نے اسے حکمت و دانش سے سرفراز فرمایا۔ ہم اس طرح نیکو کاروں کو اجر دیتے ہیں۔‘‘

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (قصص: ۱۵)

’’اور جس وقت لوگ غافل تھے (اپنے کاروبار بند کر کے گھروں کو جا چکے تھے) وہ (حضرت موسیٰ) شہر میں داخل ہوئے، دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک ان کے پیروکاروں سے اور دوسرا دشمنوں سے تھا۔ اچانک ان کے پیروکار نے موسیٰ کو مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰ نے اس (دشمن) کو گھونسہ مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر (موسیٰ) نے کہا: یہ کار شیطان تھا جو دشمن اور کھلم کھلا گمراہ کرنے والا ہے۔‘‘

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾

(قصص: ۱۶)

’’(موسیٰ نے کہا) ’’پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، مجھے بخش دے۔ پس اس (اللہ) نے انھیں بخش دیا۔ وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔‘‘

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ (قصص: ۱۷)

’’(موسیٰ نے) عرض کیا: ’’پروردگار! اس نعمت کے شکرانہ کے طور پر، جو تو نے مجھ پر ارزانی فرمائی ہے، میں کبھی مجرموں کی پشت پناہی نہ کروں گا۔‘‘

سورۂ شعراء میں بھی یہ ہی قصہ اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے جس میں اس طرح فرماتا ہے:

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ (شعراء: ۱۸)

’’(فرعون نے موسیٰ سے کہا) کیا ہم نے پیدائش کے دن سے تیری تربیت نہیں کی اور سالہا سال تک تم

نے ہم میں زندگی بسر نہیں کی۔''

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ (شعراء: ١٩)

''اورتم نے کیا جو کچھ کیا، جبکہ تم نے خدمات ونعمات کا کفران نعمت کیا۔''

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ (شعراء: ٢٠)

''(موسیٰ نے) کہا: میں نے وہ کام کیا جبکہ میں افرادِ ضال میں تھا۔''

اب ہم واپس پلٹتے ہیں اور موارد سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں:

ا: اس میں کوئی شک نہیں کہ فراعنہ سوائے ایک شخص مومن کے جو فرعون کے دربار میں تھا، بنی اسرائیل کو ضعیف کر رہے تھے۔ ان کے بیٹوں کے سر قلم کر دیتے اور ان کی بیٹیوں کو کنیزیں بنا لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان دو آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ ۭ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤﴾ (قصص: ٤)

''فرعون نے ان پر غلبہ کیا، وہاں کے رہنے والوں کو کئی جماعتوں میں تقسیم کر دیا، ایک جماعت کو ضعیف و ناتواں بنا دیا، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو کنیزیں بنا دیتا تھا۔ یقیناوہ مفسدین سے تھا۔''

ایک دوسری آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٢﴾ (شعراء: ٢٢)

''یہ کون سی نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے۔ (ہم نے تیری تربیت کی) جبکہ تو نے تمام بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا۔''

لہٰذا ایک قبطی کا قتل، جو ایسی قوم کا فرد تھا، جنہوں نے ہزاروں بے گناہ بچوں کے سر قلم کر دیئے تھے اور ان کی عورتوں کو کنیزیں بنالیا تھا، عقل و خرد اور موسیٰ کے وجدانِ بیدار کے نزدیک چھوٹا سا جرم نہیں بنتا۔[1] بالخصوص ان حالات میں جبکہ وہ قبطی چاہتا تھا کہ اسرائیلی کو قتل کر

[1] مورخین کہتے ہیں کہ وہ قبطی نانبائی تھا۔ اس نے ایندھن کی لکڑیاں خریدی تھیں اور مصر تھا کہ وہ اسرائیلی ان لکڑیوں کو اس کے کام کی جگہ پہنچائے۔ اسرائیلی انھیں اٹھانے سے انکاری تھا۔ اسی کشاکش میں اس کی نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پڑی اور اس نے ان سے مدد مانگی۔ (بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۵۷)

دے۔ اب اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی فریاد سن کر مدد کو نہ پہنچتے تو دوسرے ہزاروں اسرائیلیوں کی طرح یہ شخص بھی اپنی جان کھو بیٹھتا۔ چونکہ قبطی حکمران جماعت سے تھا۔ اس لیے اس کا اسرائیلی کو قتل کر ڈالنا کسی طرح کا ردعمل پیدا نہ کرتا۔ اگر ہم یہ بحث نہ کریں تو ظاہر ہے کہ اس قبطی کے اقدام کی سب تعریف کرتے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کی تفسیر کرنا لازم ہے جو انہوں نے اس وقت کی تھیں۔ ان کا تجزیہ اس طرح ہے:

"ھذا من عمل الشیطان" کا جملہ دو احتمال رکھتا ہے:

الف) لفظ ھذا طرفین کے نزاع اور کش مکش کی طرف اشارہ ہے جس کا نتیجہ مقتول کے انجام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ قتل ایک اسرائیلی پر زبردستی کرنے کی وجہ سے رونما ہوا۔ اگر مقتول اس اسرائیلی سے معترض نہ ہوتا تو اس حادثہ سے بچ جاتا۔[1]

اس تفسیر کی بنا پر آیت میں کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ب) لفظ ھذا اگر خود حضرت موسیٰ کے کام کی طرف اشارہ ہو یعنی کہا جائے "خود میرا کام ایک شیطانی عمل ہے۔" اپنے کام کی اس تشریح کی علت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک قبطی کا قتل، پھر وہ بھی ان حالات میں، ایک بے موقعہ اور جلد بازی کا عمل تھا کیونکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر سے کام لیتے تو یہ قبطی بھی باقی تمام قبطیوں کے ساتھ چند سال بعد دریا کی موجوں کا شکار ہو جاتا اور موسیٰ دربدری سے دوچار نہ ہوتے۔

ایک قبطی کا قتل اس نظام حکومت میں ایک درخت کی جڑ کو برقرار رکھتے ہوئے صرف ایک شاخ کاٹ ڈالنے کے مترادف تھا۔ اصل میں شاخ کو قطع کرنے کی بجائے لازم تھا کہ جڑ اور ریشہ کو کاٹا جاتا ورنہ صرف شاخ کا قطع کرنا تو گرفتاری کا سبب تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہوا۔ لہٰذا جب عامل قتل کا پتہ چل گیا تو فوراً انتظامیہ شہر کے اجلاس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم دے دیا گیا۔ اگر فرعون کے اپنے ہی گھر کا ایک فرد حضرت موسیٰ کو شوریٰ کے اس فیصلہ سے مطلع نہ کرتا تو انھیں گرفتار کر کے حکم شوریٰ کا اجراء کر دیا جاتا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَةِ یَسۡعٰی ۫ قَالَ یٰمُوۡسٰۤی اِنَّ الۡمَلَاَ یَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِیَقۡتُلُوۡكَ فَاخۡرُجۡ اِنِّیۡ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیۡنَ ﴿۲۰﴾ (قصص: ۲۰)

"ایک شخص شہر کے علاقہ بعید (فراعنہ کے مرکز سرداران) سے آیا اور اس نے بتایا کہ یہ لوگ آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اس لیے فوراً شہر کو چھوڑ دیں۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔"

اس بنا پر ایک مفسد کا قتل، جس کا اصلاح نظام میں معمولی سا اثر بھی نہیں پڑتا، کسی انسان کی گرفتاری و ابتلاء و دربدری کا سبب بن سکتا ہے، ایک عجلت کا کام تھا جس کے حضرت موسیٰ مرتکب ہوئے تھے اور جس کو شیطان کی طرف نسبت دینا صحیح تھا، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ

---

[1] یہ تفسیر ابن الجہم کی خبر کے مطابق حضرت امام رضا علیہ السلام سے منسوب ہے۔ بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۵۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

"العجلة من الشیطان"، یعنی جلد بازی کارِ شیطان ہے۔

اس بیان سے دوسرے جملہ کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

۲: "رب انی ظلمت نفسی" "پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔"

لغت عرب میں 'ظلم' بے موقع کام کو کہتے ہیں۔ عرب کے مولفین لغت کے مطابق "وضع الشی فی غیر موضعه" ظلم کہلاتا ہے۔ ستمگری و تعدی اور تجاوز کو ظلم اس لیے کہتے ہیں کہ ستمگر و ظالم کا کام ہمیشہ بے محل و بے مورد ہوتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل عجلت کے تحت غیر ضروری اور بے محل تھا۔ یہ ایسا فعل تھا جس کے اسباب ان کی وطن سے دوری اور دربدری نے مہیا کیے تھے۔ اس قصہ میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں "ظلمت نفسی" یعنی میں نے اپنے اوپر ظلم کیا نہ خدا پر اور نہ کسی دوسرے شخص پر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ فعل حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ترک اولیٰ تھا۔ دونوں حضرات پر ان دونوں کاموں کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اپنے فعل کے نتیجہ میں حضرت آدم علیہ السلام کو راحت سے چاہ زحمت میں گرنا پڑا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا گھر اور اپنی قوم کی زندگی چھوڑ کر مدین میں غربت و گلہ بانی کی مشقت اٹھانا پڑی۔ دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت) دم) نے اپنے عمل کے بعد اس میں خود اپنے اوپر ظلم کرنے کا اعتراف کیا۔ حضرت موسیٰ نے کہا: "ظلمت نفسی" اور حضرت آدم و حوا نے عرض کیا: "ربنا ظلمنا انفسنا"۔

۳: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نفس پر ظلم کا اعتراف کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کی اور عرض کیا: "فاغفر لی فغفر له انه هو الغفور الرحیم"

"پس مجھے بخش دے۔ (اللہ نے) انھیں بخش دیا۔ بے شک وہ بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

اسی طرح حضرت آدم و حوا نے اپنے اوپر اعتراف ظلم کے بعد عرض کیا تھا:

وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۲۳ (اعراف: ۲۳)

"اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

یہاں طلب مغفرت کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کے شایان شان یہ ہے کہ اس قسم کے بے جا کاموں کے بعد (اگر چہ یہ معصیت و گناہ کی تعریف میں نہیں آتے) اظہارِ اعتراف کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی درخواست مغفرت صدور جرم و گناہ یا کسی عمل محرم و مخالفت نہی الٰہی کی علامت نہیں ہوتی۔ تاہم جب ہم حضرت موسیٰ کے مقام بلند اور منزل واقعی پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان سے اس کام کا سرزد ہونا مناسب نہ تھا نہ ہی ان کے شایان شایان تھا۔ لہٰذا جب انھوں نے اپنے اس عمل کو اپنے مقام بلند سے ملاحظہ کیا تو اسے متناسب و معقول نہ پایا۔ لہٰذا خداوند عالم سے درخواست مغفرت کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو "نسبی حکم عدولی" یا "ذنب مقام" سے تعبیر

کیا جائے کیونکہ بزرگوں کا مقولہ ہے حسنات الابرار سیئات المقربین ''نیک لوگوں کے افعال نیک مقربین بارگاہ الٰہی کے لیے گناہ کے درجہ میں ہوسکتے ہیں۔'' یہ اس لیے کہ افراد مقربین سے عام افراد کی نسبت مافوق اور بلند تر توقعات رکھی جاتی ہیں۔ یعنی بسا اوقات ایک عام آدمی کا عمل مستحسن ہوتا ہے جبکہ وہی عمل کسی خاص شخص کے ہاتھوں کا رِناز یبا سمجھا جاتا ہے۔

اس سے قطع نظر احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طلب مغفرت سے مراد اپنے عمل کے اثر وضعی سے نجات حاصل کرنا ہو کیونکہ ایسا عمل، پھر اس خاص ماحول میں ردعمل کے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لیے سورۂ طٰہٰ میں قبطی کے قتل کے بیان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ (طٰهٰ: ۴۰)

''تم نے ایک انسان کو قتل کیا تو ہم نے تمھیں غم واندوہ سے نجات دی۔''

یہی احتمال حضرت آدم علیہ السلام کے طلب مغفرت پر بھی صادق آتا ہے۔

۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جو آخری جملہ باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے:

فعلتها اذا و انا من الضالین۔ اس جملہ کی تشریح ہم دو نکتوں میں پیش کرتے ہیں:

الف) خداوند عالم اس عمل (قتل قبطی) کے صدور سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس طرح توصیف فرماتا ہے:

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ (قصص: ۱۴)

ب) حضرت موسیٰ علیہ السلام ارتکاب قتل، اپنے اوپر اعتراف ظلم اور درخواست مغفرت کے بعد بھی اپنے عمل کی ماہیت کو دفاع مظلوم اور مجرم سے لڑائی ہی قرار دیتے ہیں، حالانکہ موقع ووقت کے اعتبار سے ان کا یہ فعل بے موقع قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ (قصص: ۱۷)

''پروردگار! اس نعمت کے شکر کے طور پر، جو تو نے اپنے لطف وکرم سے مجھ پر فرمائی ہے، میں کبھی بھی مجرموں کا ساتھ نہ دوں گا۔''

یعنی جس طرح اب تک میں مظلوموں اور رنجیدہ لوگوں کی مدد کرتا رہا ہوں، آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ جملہ اس امر کی تشریح کرتا ہے کہ ان کا عمل اپنی ماہیت کے اعتبار سے بالکل صحیح و باموقع تھا اگرچہ وقت و مقام کے لحاظ سے بے موقع ہوا تھا۔

ان دو نکات کی وضاحت کی روشنی میں اب ہم لفظ ''ضال'' کی وضاحت کرتے ہیں۔

جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے واقعہ کے آغاز میں تعریف وتوصیف فرماتا ہے، ان کی روشنی میں ہم ہرگز ان کے عمل کو راہ حق سے گمراہی کے معنی نہیں دے سکتے، بلکہ لفظ ''ضل'' اور 'ضال' ایک نسبت سے نسیان، غفلت اور انجام عمل سے بے خبری

کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قرض کا لین دین کریں تو ایک لکھنے والا اسے تحریر کرے اور دو شخص بطور شاہد اس کی تصدیق کریں اور گواہی دیں۔ ایسے موقع پر علت شاہدین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ (بقرہ: ۲۸۲)

''اور اگر ان میں ایک بھول جائے یا اس کے دل سے بات نکل جائے تو دوسرا اسے یاد دلائے۔''

ظاہر ہے اس آیت میں لفظ ''تضل'' نسیان و غفلت کے معنی میں آیا ہے۔

کبھی کبھی یہ لفظ موقع کی مناسبت سے غائب و مخفی ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور عرب اس لفظ کو چھپنے یا غائب ہونے کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذَا ضَلَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ (سجدہ: ۱۰)

''اگر ہم زمین میں غائب ہو جائیں یا چھپ جائیں پھر بھی دوبارہ نئی آفرینش میں ہوں گے۔''[1]

اس لفظ کے ان مستعملہ معنی میں غور کرتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے سامنے ''اعتذار'' کی کیفیت سے مراد یہ تھی کہ میں گھونسہ مارتے وقت اس کے عواقب سے بے خبر تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ فعل اس کے قتل کی صورت اختیار کرے گا، ورنہ میں نہ اس کا مرتکب ہوتا اور نہ ہی اپنے لیے یہ تمام دردسر فراہم کرتا۔ یعنی ایک طرح کی غفلت و بے خبری مجھ پر وارد ہوئی، اس کام کا انجام میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میرے قابو سے باہر ایک عمل صادر ہو گیا۔

ایک اور دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کی نفی یا تشکیک کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔

۲: حضرت موسیٰ کی حضرت ہارونؑ سے نزاع

حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ اور آئین و احکام دین کے حصول کے لیے مامور ہوئے کہ میقات پر تشریف لے جائیں۔ اپنی عدم موجودگی میں انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ لیکن حضرت موسیٰ کی قوم نے ان کی عدم موجودگی میں سونے کے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کے درمیان واپس تشریف لائے اور یہ معاملہ مشاہدہ فرمایا تو اس قدر ناراض ہوئے کہ الواحِ تورات کو نیچے پھینک دیا اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰٓى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِىۡ مِنۡۢ

---

[1] لسان العرب، ج ۱۱، مادہ ضل، ص ۳۹۲-۳۹۳

بَعۡدِیۡ ۚ اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ ۚ وَاَلۡقَی الۡاَلۡوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیۡهِ ؕ (اعراف: ۱۵۰)

''جب (حضرت) موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضب وغصہ میں لوٹے تو کہا کہ میرے بعد تم نے میری بہت بری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں جلد بازی سے کام لیا؟ پھر انہوں نے الواح کو پھینک دیا اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔''

سورۂ طٰہٰ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کا سر اور ڈاڑھی پکڑ لیے، جیسا کہ قرآن مجید حضرت ہارون علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے:

یَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡیَتِیۡ وَلَا بِرَاۡسِیۡ ۚ (طٰهٰ: ۹۴)

''میرے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں کام (الواح توراۃ کا پھینکنا اور حضرت ہارون سے دست وگریبان ہونا) مقام عصمت انبیاء کے لیے مناسب ہیں؟

جواب: سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم قارئین کرام کے ذہنوں کو چند نکات کی طرف متوجہ کریں، جو یہ ہیں:

۱: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار کے میقات کی طرف تشریف لے جا رہے تھے تو اپنے بھائی کو اپنا جانشین قرار دے کر انھیں اس طرح نصیحت فرمائی:

اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾ (اعراف: ۱۴۲)

''تم قوم کے درمیان میرے جانشین بنو۔ ان کی اصلاح کرنا اور مفسدین سے نہ ہونا۔''

۲: حضرت ہارون علیہ السلام نے خود مقام نبوت پر فائز ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ کی نصیحت پر پورا پورا عمل کیا اور جب ان کی قوم نے بچھڑے کو پوجنا چاہا تو ان کی طرف رخ کر کے فرمایا:

یٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ وَاَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ ﴿۹۰﴾ (طٰهٰ: ۹۰)

''اے میری قوم تم اس بچھڑے کی وجہ سے مقام آزمائش میں ہو۔ تمھارا پروردگار رحمان ہے۔ میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔''

جیسا کہ آیہ مبارکہ کا لب ولہجہ صراحت کر رہا ہے، حضرت ہارون نے جہاں تک بھی حالات نے اجازت دی، اپنے فرض وذمہ داری کو انجام دیا۔ سختی سے کام نہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ چاہا کہ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں قوم کے درمیان افتراق پیدا ہو۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ﴿۹۴﴾

(طٰہٰ: ۹۴)

''اگر میں نے سختی سے کام نہیں لیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں آپ یہ نہ کہنے لگیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت کا خیال نہ کیا۔''

۳: حضرت موسیٰ علیہ السلام میقات میں وحی الٰہی کے ذریعہ بنی اسرائیل کے انحراف سے مطلع ہو چکے تھے۔ خداوند عالم نے انھیں بتلا دیا تھا کہ:

فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡۢ بَعۡدِکَ وَاَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ﴿۸۵﴾ (طٰہٰ: ۸۵)

''ہم نے تمھاری قوم کی تمہاری غیر حاضری میں آزمائش کی اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا۔''

۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خبر کو سن کر بہت غمگین ہوئے اور اپنی چند سال کی زحمت ومحنت کو فناء ونا پید ہوتے پایا۔ لہٰذا جب اپنی قوم میں واپس آئے تو اپنی زحمتوں اور قوم کی موجودہ نادانی وحماقت سے شدید غم وغصہ میں مبتلا ہوئے۔ اس لیے اپنی قوم کی طرف رخ کر کے فرمایا:

بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ ۚ (اعراف: ۱۵۰)

''کیسی بری تم نے میری جانشینی کی۔ کیا فرمان پروردگار میں تم نے عجلت سے کام لیا؟''

سورۂ طٰہٰ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے بھی بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا:

اَلَمۡ یَعِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَیۡکُمُ الۡعَہۡدُ (طٰہٰ: ۸۶)

''کیا تمہارے پروردگار نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا اس کا عہد طویل ہو گیا تھا؟''

۵: ان حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے غصہ اور باطنی تکلیف وپریشانی کو دو صورتوں میں ظاہر کیا:

(i) توریت کی الواح کو دور پھینک دیا۔

(ii) یہ سوچ کر کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے قوم کے اس فعل بد کے مقابل میں مناسب رد عمل کا اظہار نہیں کیا، ان سے کہا:

مَا مَنَعَکَ اِذۡ رَاَیۡتَہُمۡ ضَلُّوۡۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیۡتَ اَمۡرِیۡ﴿۹۳﴾ (طٰہٰ: ۹۳-۹۲)

''کیا وجہ ہوئی کہ جب تم نے انھیں گمراہ ہوتے دیکھا تو تم نے میری پیروی نہ کی؟ کیا تم نے میری حکم عدولی کی؟''

اب دیکھنا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم الشان پیغمبر نے یہ دورِ عمل اپنی طرف سے ظاہر کیے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا طریق کار بے شک گستاخی و برائی کے لحاظ سے حد و اندازہ سے بڑھ کر تھا۔ یہ بات ہرگز درست نہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معاملہ ان کے ساتھ ملائمت ونرمی سے پیش آتے۔ اگر چہ بنی اسرائیل کو اپنی خطا وفعل قبیح کی گہرائی واہمیت کا احساس نہ تھا، تاہم اللہ تعالیٰ کا پیغمبر جانتا تھا کہ کیسا خطرناک واقعہ رونما ہوا ہے اور اگر وہ اپنی طرف سے شدید ردعمل کا اظہار نہ فرماتے تو ممکن تھا کہ وہ قوم آسانی سے اس کردار قبیح سے دستبردار نہ ہوتی۔ نیز یہ کہ توحید باری تعالیٰ کی طرف پلٹنے کے بعد بھی ان کے اذہان کی گہرائیوں میں اس عمل قبیح کے اثرات موجود رہنا ممکن تھے۔

اس لحاظ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے آئے اور ان کی افسوسناک اور انتہائی پریشان کن وضع وکیفیت کا مشاہدہ فرمایا تو فطرتاً ایسے شخص کے ردعمل کا مظاہرہ کیا جو اپنے دائرۂ عمل اور ادارہ کی قلمرو میں جب کسی ناپسندیدہ شے کو دیکھتا ہے تو سب سے پہلے اپنے نزدیک ترین شخص کو، جو اس کی عدم موجودگی میں سرپرستی کے عہدہ پر فائز ہو، موردِ مواخذہ قرار دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ ذمہ دار شخص دوسرے فرد کو اپنے میں سے اور اپنے آپ کو اس سے سمجھتا ہے۔ پھر جب اس نزدیک ترین شخص کی برأت وصفائی ثابت ہو جاتی ہے تو پھر وہ دیگر اسباب وعوامل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تا کہ فساد کی جڑ کا پتہ لگا کر اسے منقطع کرنے کی کوشش کرے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کا مواخذہ کیا اور ان کو باز پرس کا مورد قرار دیا۔ اگر انھیں چھوڑ دیتے اور اصطلاح کے مطابق کسی اور کا گریبان پکڑ لیتے تو ان کا عمل اصولی وصحیح شمار نہ ہوتا۔

لیکن الواح تورات کو دور پھینک دینے، حضرت ہارون کے سر اور ڈاڑھی کو پکڑ کر کھینچنے کا سبب، قطع نظر اس کے کہ وہ حضرت ہارون کے اقدامات اور ادائیگی فرض کے نتیجہ سے واقف نہ تھے، صرف مکمل طور پر ایک تربیتی پہلو کا آئینہ دار تھا تا کہ اس طرح وہ ہٹ دھرم اور مفسد قوم اپنے قصور کی گہرائی یا قباحت کردار کی تہ تک پہنچ جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو یہ منظر گوسالہ پرستی خدا پرستی کی طرف لوٹ جائے۔

اس بات کا مشاہدہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے الواح تورات کو دور پھینک دیا (وہ الواح جن کے حصول کے لیے انھوں نے چالیس روز میقات میں بسر کیے تھے) اور اپنے بھائی سے دست وگریبان ہوئے تھے، اس بات کا سبب بن گیا کہ دوسرے لوگ اپنے افعال کی اہمیت کو سمجھ لیں، ان کے نفس وروح میں گہرا انقلاب پیدا ہوا اور عملی طور پر اپنی غلطی کی اہمیت کا ادراک کر سکیں۔

پس جب ان کے بھائی یعنی حضرت ہارون کی بے گناہی ثابت ہوگئی اور موخر الذکر نے اپنے معقول اقدام کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۡ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ (اعراف: ۱۵۰)

''اس قوم نے مجھے تنہا وناتواں پایا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں۔ پس ایسا کام نہ کریں کہ دشمنوں کی

شماتت میرے خلاف پیدا ہو جائے اور مجھے ظالموں کی قوم سے قرار نہ دیں۔"

اس پر فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جذبہ شفقت میں تحریک ہوئی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا رخ کیا اور عرض کی:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

(اعراف: ۱۵۱)

"پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما لے کہ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

خود اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ طلب مغفرت جبکہ دونوں کسی معمولی سے گناہ کے بھی اس سلسلہ میں مرتکب نہیں ہوئے تھے، ان کے اپنے احساس فرض اور ذمہ داری کی عظمت کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے تمام انبیاء علیہم السلام ہمیشہ پروردگارِ عالم سے طلب مغفرت کیا کرتے تھے جس کی وجہ صدورِ گناہ نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے احساس ذمہ داری کی عظمت و بزرگی کے باعث ہوتی تھی جو وہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور رکھتے تھے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا غضبناک و خشمگیں چہرہ اصلی و واقعی گنہگاروں کی طرف کر کے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ (اعراف: ۱۵۲)

"وہ لوگ جنھوں نے بچھڑے کو اپنا پروردگار قرار دے لیا، عنقریب وہ اپنے خدا کے غضب میں شامل ہوں گے۔ اس دنیا میں ذلت و خواری انھیں گھیر لے گی۔ جو لوگ خدا پر افترا باندھتے ہیں ہم انھیں اسی طرح سزا دیتے ہیں۔"

قرآن اور عصمت حضرت سلیمان علیہ السلام

قصص انبیاء میں لکھتے ہیں کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام عصر کے وقت چابک اور تندور گھوڑے دیکھنے لگے۔ اس کام میں آپ اس قدر منہمک ہو گئے کہ نماز عصر قضا ہوگئی اور آفتاب غروب ہوگیا۔ نماز عصر کی خاطر آپ نے اللہ تعالیٰ کے ملائکہ سے درخواست کی کہ سورج کو پلٹا دیں۔ چنانچہ سورج پلٹ آیا اور آپ وضو کر کے نماز بجالائے۔ چونکہ گھوڑوں کا گلہ نماز کی فراموشی کا سبب بنا تھا اس لیے انھوں نے سب گھوڑوں کو پے کروا دیا اور ان کی گردنیں اڑا دیں۔ مصنفین لکھتے ہیں کہ یہ سب مطالب سورۂ ص، آیات ۳۱، ۳۲ سے اخذ ہوتے ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ کیا ان آیات کی یہ تفسیر صحیح ہے؟

جواب

اس موضوع پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ آیات کا متن پیش کیا جائے اور پھر ان کا تجزیہ کریں۔ لہٰذا پہلے ہم متعلقہ آیات کو نقل کرتے ہیں:

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰ (ص: ۳۰)

''ہم نے داؤد کو سلیمان بخشا۔ وہ کیا ہی اچھا بندہ تھا کہ اللہ کی طرف بہت متوجہ ہوتا تھا (اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرتا تھا)۔''

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝۳۱ (ص: ۳۱)

''اس وقت کو یاد کریں جب چابک و تیز رو گھوڑے ان (سلیمان) کے سامنے پیش ہوئے۔''

فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝۳۲

(ص: ۳۲)

''اس (سلیمان) نے کہا: ''میں اللہ کی یاد کی خاطر گھوڑوں کو پسند کرتا ہوں۔ وہ انھیں دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔''

رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝۳۳ (ص: ۳۳)

''حکم دیا کہ انھیں (گھوڑوں کو) واپس لے آئیں۔ پھر وہ (سلیمان) ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔''

پیشتر اس کے کہ ان آیات کی تفسیر کریں، چند نکات پیش کرتے ہیں:

۱: 'صافنات' جمع ہے صافنہ کی۔ 'صافنۂ چابک و تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی تین ٹانگوں پر کھڑا ہو کر کبھی کبھی چوتھی ٹانگ کو فضا میں بلند کرتا اور کبھی اپنے سم کی نوک کو زمین پر مارتا ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ وہ چلنے کو تیار ہے۔

۲: "جیاد" جمع ہے 'جواد' کی جس کا مادہ 'جودٗ ہے، گویا تیز رو گھوڑا دوڑنے کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ یہ لفظ جان دینے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "فلان یجود نفسه" یعنی "فلاں جان دے رہا ہے۔"

۳: 'خیر' کے عربی میں ایک ہی معنی ہیں اور وہ 'شر' کی ضد ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ 'مال' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ان ترك خیرا (بقرہ:۱۸۰)

"اگر کچھ مال ورثہ کے طور پر چھوڑ جائے۔" آیت زیر بحث میں جیسا کہ پہلے بیان ہوا "الصافنات الجیاد" سے تیز رفتار گھوڑے مراد ہیں جو مایہ حیات، وسیلہ زندگی اور سراسر خیر و نفع ہوتے ہیں۔ اسی اعتبار سے مفسرین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"الخير معقود بنو اصی الخيل"

"نفع و منفعت گھوڑوں کی پیشانیوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

۴: 'حب' ضد ہے 'بغض' اور "احببته خببته" کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ لفظ "میں اسے دوست رکھتا ہوں" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۵: 'حب الخیر' جانشین اور بدل ہے فعل "اجبت" کے محذوف مفعول کا۔ اس جملہ کی تقدیر اس طرح ہے۔ احببت الخيل حب الخير۔ پس جملہ کا مطلب ہے "تیز رفتار گھوڑوں کے ساتھ میرا تعلق و محبت، امر خیر سے لگاؤ ہے۔" کیونکہ ایسے گھوڑے وسائل زندگی اور بقائے حیات کا سبب ہوتے ہیں۔ ان تیز رفتار گھوڑوں سے دشمن توحید یعنی کفار سے جہاد کر کے انکے نظام کو درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔

اس جملہ کا تجزیہ و تحلیل بعد میں آنے والے لفظ یعنی 'عن ذکر ربی' پر غور کرنے سے زیادہ مناسب طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ لفظ 'حب الخیر' خود مفعول ہے، بدل و جانشین مفعول نہیں۔ پھر جیسا کہ ہم نے آغاز بحث میں عرض کیا 'خیر' سے مراد گھوڑے ہیں۔ پس جملہ کی ترکیب واقعی اس طرح ہے 'احببت الخير حبا عن ذكر الله'، یعنی میں ان گھوڑوں کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ اس پسند کی اصل یاد خدا ہے جس کا حکم ہے کہ ہمیشہ دشمن کے خلاف جہاد کے لیے تیار رہو۔ ہرگز یہ تصور دل میں پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم مال و منال اور آرائش نظام اور اپنی طاقت کی نمائش کو دوست رکھتے ہیں۔ اگر یاد خدا اور اس کے احکام کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم کبھی بھی ان گھوڑوں کی طرف متوجہ نہ ہوتے نہ ہی اس فوجی نمائش میں دل لگاتے۔

۶: حتی توارت بالحجاب

'حتی کہ پس پردہ چھپ گیا۔'

'توارت' کا فاعل 'الصافنات الجیاد' ہے جو پہلی آیت میں آیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس قدر دور ہو گئے کہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

۷: 'ردوھا' جس وقت وہ قوی و باشکوہ گھوڑے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو دوبارہ ان پر مقرر ملازمین اور مربیوں کو حکم دیا کہ انھیں دوبارہ حاضر کریں۔ آخر یہ کیوں؟ اس نکتہ کا جواب آنے والے جملہ میں پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

۸: "فطفق مسحا بالسوق والاعناق" جب مجاہدین کے گھوڑے اپنے سواروں سمیت بارگاہ حضرت سلیمان علیہ السلام میں واپس لوٹے تو انھوں نے ان گھوڑوں کے مالکوں کی قدردانی کے طور پر گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا۔ حضرت سلیمان کا یہ عمل ایک طرح سے گھوڑوں کے مالکوں کے کام سے لگاؤ اور محبت کا اظہار تھا اور ان کے سواروں کا حوصلہ بڑھانے کے مترادف تھا جو حضرت سلیمان کی فوج میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

اب ہم آیت کے مفرد الفاظ اور جملوں کے مقاصد سے واقف ہو گئے۔ اس تجزیہ کا نتیجہ، جو جملوں کے ظاہری معانی کے بالکل مطابق ہے، یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی، جو اس قدرت و قوت کی امارت و فرماں روائی کے مالک تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے انھیں مرحمت فرمایا تھا اور جس کا ذکر مختلف سورہ ہائے قرآن، بالخصوص 'سورۂ نمل' میں ہے، ایک روز عصر کے وقت اپنے سبک رفتار اور چالاک گھوڑوں کا معائنہ فرما رہے تھے۔ سوار ایک قطار میں آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس حالت میں اپنے ساتھیوں سے ایک نکتہ کے اظہار میں فرمایا: ''ان گھوڑوں اور ان کے سواروں سے میرا تعلق و محبت، ایک عمدہ وجہ کے باعث ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے آئین پر عمل سے ہے۔ اس مظاہرہ کی اصل اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے تعلق ہے۔''

پھر جب گھوڑے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو حکم دیا کہ انھیں واپس لائیں۔ اس حالت میں انھوں نے سواروں اور گھوڑوں پر ملازم لوگوں کے کام کی تعریف کے طور پر گھوڑوں کے سروں، صورتوں، گردنوں، پنڈلیوں اور پاؤں پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح ایک عادل فرمانروا کا گھوڑوں کے معائنہ کا کام اختتام کو پہنچا۔

درحقیقت یہ آیات ایک بہت بڑے بادشاہ کے انتظامی ڈھانچہ کو بیان کرتی ہیں جو مکمل طور پر ایک خدائی لائحۂ عمل کے مطابق تھا۔ یہ تفسیر جس کی ہلکی سی شکل سید مرتضیٰ مرحوم کی ''تنزیۃ الانبیاء''، فخر رازی کی ''مفاتیح الغیب'' اور مجلسی کی ''بحار الانوار'' میں نظر آتی ہے مکمل طور پر آیات کے ظاہری معنی کے مطابق ہے۔ [۱]

---

[۱] تنزیہ الانبیاء، ص ۹۵-۹۷، مفاتیح الغیب، ج ۷، ص ۱۳۶، بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۱۰۲-۱۰۴، تفسیر بشرا اور دیگر تفاسیر جنھوں نے تھوڑا بہت اس تفسیر کا ذکر کیا ہے، لیکن اس پر زور نہیں دیا۔

اب ہم اس مقام پر پہنچتے ہیں کہ ایک اور تفسیر پر تنقید کریں جو آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق کی گئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام عصر کے وقت گھوڑوں کی ایک قطار کے معائنہ میں مصروف تھے کہ سورج غروب ہو گیا۔ اس پر انھوں نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کو واپس پلٹائیں تاکہ آپ عصر کی نماز بجالائیں۔ یہاں پہنچ کر اس تفسیر کے ماننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ چونکہ گھوڑوں کا یہ معائنہ ادائیگی نماز میں مانع ہوا اس لیے انھوں نے گھوڑوں کو طلب فرمایا اور تلوار ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ماری اور جملہ "فطفق مسحا بالسوق والاعناق" سے یہی مراد ہے۔ دوسری جماعت والے جو کسی حد تک زیادہ روشن فکر رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سورج کے پلٹنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی گردن اور پنڈلیوں کو وضو کی خاطر دھویا، کیونکہ ان کے دین میں وضو کرنے کا یہی طریقہ مروج تھا۔ یہ تفسیر بہت سی کتب تفسیر میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو قبول و تسلیم بھی کیا گیا ہے اور اس کو بنظر تردید و تنقید بھی دیکھا گیا ہے۔ ان تمام مدارک کی طرف حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

سید قطب تفسیر 'فی ظلال' میں اس مشہور تفسیر کو عقلی و اسلامی اصول کے خلاف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''مجھے سبک رفتار اور تند رو گھوڑوں کے قصہ میں کوئی صحیح و معقول تفسیر نظر نہ آسکی۔ جو کچھ مفسرین نے لکھا ہے وہ اسرائیل کی گھڑی ہوئی تفاسیر کا حصہ ہے جس کی سند احبار و علمائے یہود تک پہنچتی ہے یا ایک سلسلۂ تاویلات ہے جس کی کوئی سند دستیاب نہیں۔''

پھر مزید کہتے ہیں کہ ''صرف ایک ہی حدیث ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور وہ حدیث ابو ہریرہ سے منقول ہے۔[1]

اب ضروری ہے کہ ہم اس حدیث کے نکات منفی اور اس کے ضعف پر تنقید پیش کریں کیونکہ یہ تفسیر کسی طرح اصول عقلی و اسلامی سے مطابقت نہیں رکھتی اور نہ ہی آیات متعلقہ کے ظاہری معانی سے۔

۱: اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعم العبد انہ اواب کے الفاظ سے تعریف فرماتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح متصور ہوگی کہ ابھی اس آیت کی سیاہی بھی خشک ہونے نہ پائی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کی ایسی تشریح فرمانے لگے جو ہرگز اس سے کسی طرح مطابقت نہ رکھتی ہو؟ اواب کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرتے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص اواب کس طرح گھوڑوں کے معائنہ میں اس قدر محو و مصروف ہوا کہ فریضہ الٰہی یعنی نماز عصر ہی کو فراموش کر بیٹھا؟

۲: متذکرہ تفسیر میں احببت حب الخیر عن ذکر ربی کے جملہ کے ساتھ صرف اس صورت میں کوئی مطابقت رکھ سکتی ہے جب لفظ 'احببت' (میں دوست رکھتا ہوں) اپنے دامن میں کوئی اور معنی بھی رکھتا ہو۔ مثلاً انتخاب کرنا یا بلند مرتبہ کرنا یعنی گھوڑوں سے تعلق کو

---

[1] جس حدیث کو سید قطب نے صحیح جانا ہے ان احادیث سے کم نہیں جنہیں اسرائیلی قرار دیا گیا ہے۔ محققین، کتاب 'فی ظلال القرآن'، ج ۲۳، ص ۱۰۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ذکر اللہ یعنی نماز سے افضل تر مانا جائے، حالانکہ اس معنی کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ [1]

۳: اگر 'احببت' کے معنی وہی ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا تو لازم تھا کہ 'عن ذکر اللہ' کے بجائے علی ذکر اللہ' ہوتا جیسا کہ ایسے ہی مقامات پر لفظ 'علیٰ' استعمال ہوا ہے جیسا کہ:

فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم سجدہ: ۱۷)

''انہوں نے کوردلی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (توبہ: ۲۳)

''اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں۔''

۴: آیہ مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ 'توارت' کی ضمیر 'صافنات الجیاد' کی طرف لوٹتی ہے جو سابقہ آیت میں آئی ہے۔ اس ضمیر کا مرجع سورج کو قرار دینا، بالخصوص جبکہ اس کا ذکر تک آیت میں نہیں، آیت کے ظاہر کے خلاف ہے سوائے اس کے کہ اس سے قبل 'بالعشی' آیا ہے جو 'توارت' کی ضمیر کے مرجع کی تعیین کے لیے کافی نہیں ہے۔

۵: جملہ 'ردوھا علی' کا ظاہر یہ ہے کہ اس کی ضمیر (ھا) ''صافنات الجیاد'' کی طرف پلٹتی ہے۔ لیکن اس تفسیر کی بناء پر اس کی ضمیر (ھا) کو 'شمس' کی طرف لوٹنا چاہیے درآنحالیکہ آیت میں شمس (سورج) کا ذکر تک نہیں۔

۶: اگر اس سے مراد فرشتوں سے خطاب ہے جنہوں نے ان کے لیے سورج کو پلٹایا تو حضرت سلیمان کا فرشتوں کو اس قسم کا آمرانہ خطاب ان کے مقام و منزل سے مطابقت نہیں رکھتا۔

۷: عالم آفرینش میں انبیاء علیہم السلام کا تصرف مقام اعجاز و اظہار کرامت میں بالکل ممکن ہے۔ آیات قرآن مجید مکمل طور پر اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن یہ موقع مقام اعجاز اور اظہار کرامت کا ہرگز نہ تھا کہ وہ جناب اس قسم کے عظیم کام میں ہاتھ ڈالتے جبکہ وہ نماز فریضہ قضا کر سکتے تھے۔ پھر اگر نماز جاتی رہی تو وہ نماز نافلہ تھی، جیسا کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے اور اس نماز کے فوت ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہ تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی ولایت تکوینی سے نماز کو قضا کرنے کا فائدہ اٹھاتے۔

۸: جو لوگ کہتے ہیں کہ ''ردوھا علی'' سے مراد سورج کے پلٹنے کی درخواست ہے ''فطفق مسحا بالسوق والاعناق'' سے مراد گھوڑوں کی گردنیں اور پاؤں کاٹنا ہے تو وہ جملہ دوم کے جملہ اول کے ساتھ رابطہ میں مشکوک ہو جاتے ہیں کیونکہ اس بناء

[1] یہ بات مسلم ہے کہ متذکرہ تفسیر دوسرے معنی کو اختیار کیے بغیر ہرگز کوئی وجود نہیں رکھتی، خواہ متن میں کسی شک کے پیدا ہونے سے یا کسی اور طریقہ سے جن کا زمخشری نے کشاف، ج ۳، ص ۱۳ پر ذکر کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

پر یوں کہنا چاہیے۔ "ردوھا علی فتوضا و صلی کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ سورج کے پلٹنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ان گھوڑوں سے انتقام پر ادائے نماز کو مقدم رکھتے۔ مگر آیت میں وضو اور نماز کا کوئی ذکر یا اشارہ تک نہیں۔

اس تفسیر کی بنا پر جس میں دوسرے جملہ کو دھونے بلکہ پنڈلیاں اور گردن دھونے کے معنی میں لیا گیا ہے یہ اشکال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک اور ابہام کا پہلو ہے جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے۔

:۹ اگر "فطفق مسحا بالسوق والاعناق" سے پنڈلیوں اور گردن کا دھونا مراد ہو، جیسا کہ وضو میں ہوتا ہے، تو پھر اولاً 'غسل' کے بجائے 'مسح' کا لفظ استعمال ہوا ہے، ثانیاً 'عنق' کے بجائے 'اعناق' جو جمع ہے، استعمال ہوا ہے حالانکہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک ہی گردن تو رکھتے تھے، ثالثاً، لفظ 'سوق' کا استعمال اور اس سے دو پنڈلیاں مراد لینا بھی آیت کے ظاہری معنی کے خلاف ہے۔

:۱۰ اگر فطفق مسحا کے جملہ سے مراد گھوڑوں کی گردنیں مارنا یا انھیں پے کرنا مراد ہے تو پھر مسحا کے بجائے کلمہ ضرباً یا 'قطعاً' کیوں نہ استعمال کیا گیا حالانکہ یہ کلمات عربی زبان میں بڑی ندرت کے ساتھ قطع کرنے اور کاٹنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔[1]

:۱۱ اگر ان جانوروں کے قتل ہی سے اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنا مقصود تھا، کیونکہ یہ حیوان حضرت سلیمان علیہ السلام کی نماز قضا ہو جانے کا سبب بنے تھے، تو اس میں ان بے زبان جانوروں کا تو کوئی قصور نہ تھا، جو انسانی معاشرہ کی خدمت کے لیے ہیں، کہ حضرت سلیمان تلوار نکال کر ان کی جان لے لیتے۔ پھر اگر ان گھوڑوں کا قتل اس بنا پر تھا کہ وہ حضرت سلیمان کی نماز قضا ہونے کا سبب بنے تھے تو حضرت سلیمان کو چاہیے تھا کہ ہر قسم کی ایسی سرگرمی و مصروفیت کو ختم کر دیتے جو یاد خدا میں حائل ہو سکتی تھی اور ایسی کسی چیز پر رحم نہ کرتے کیونکہ دنیا سراسر لہو و لعب کا مرقع ہے اور انسان کو خدا سے دور رکھنے کا باعث ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ (حدید:۲۰)

"یقیناً دنیا تو فقط کھیل کود، سرگرمی و زینت اور ایک دسرے پر فخر و مباہات کا سبب اور دولت و اولاد کی زیادتی کا باعث ہے۔"

:۱۲ وہ روایات جن کا یہ تفسیر سہارا لیتی ہے، بہ لحاظ مضمون اس قدر تعجب خیز ہیں کہ کوئی شخص بھی ان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ مثلاً سیوطی "درمنثور" میں لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے گھوڑے پر دار تھے جنھیں دریا سے نکالا گیا تھا اور اس قسم کے گھوڑے نہ تو ان سے پہلے اور نہ ہی ان کے بعد کسی کے لیے فراہم ہوئے تھے اور نہ ہوں گے۔ علاوہ ازیں ان گھوڑوں کی تعداد جو اس واقعہ میں مارے گئے

---

[1] تنزیہ الانبیائ، ص۹۶-۹۷

بیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔[1]

ان باتوں کو دیکھتے ہوئے جو بعض روایات کے متن میں پائی جاتی ہیں، ان کو بلا کم و کاست اسرائیلیات کا حصہ قرار دینا چاہیے جو لاشعوری طور پر کتب تفسیر و حدیث میں داخل کر دی گئی ہے۔

حضرت سلیمان کی عصمت پر ایک اور دلیل

قرآن مجید حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کے ایک گوشتہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَيۡمٰنَ وَاَلۡقَيۡنَا عَلٰى كُرۡسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴿۳۴﴾ (ص: ۳۴)

''ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ایک بے روح انسانی جسم ان کی کرسی پر ڈال دیا۔ انھوں نے توبہ کی اور اللہ کی طرف لوٹے۔''

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِىۡ وَهَبۡ لِىۡ مُلۡكًا لَّا يَنۢۡبَغِىۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِىۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ﴿۳۵﴾ (ص: ۳۵)

''(سلیمان نے) کہا: خداوند! مجھے بخش دے اور مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کے پاس نہ ہو۔ یقیناً تو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔''

ان آیات سے مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱: حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کی نوعیت کیا تھی؟

۲: اللہ تعالیٰ سے حضرت سلیمان کی طلب مغفرت کس طرح ان کے مقام عصمت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے؟

۳: وہ اپنے لیے حکمرانی کیوں طلب فرماتے ہیں؟

۴: وہ ایسی حکومت کیوں چاہتے ہیں جو اور کسی کو نہ مل سکے۔ کیا اس جملہ سے بخل کی بو نہیں آتی؟

جواب

۱: پہلے سوال کے بارے میں بظاہر آیت اس سے زیادہ نہیں بتاتی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جسم حضرت سلیمان کے تخت پر پھینک کر آزمایا۔ یہ جسم کس کا تھا اور کس طرح حضرت سلیمان کے لیے آزمائش کا سبب بنا، آیت سے اس بارے میں کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا سوائے اس

[1] الدر المنثور، ج ۵، ص ۳۰۵

کے کہ فرماتا ہے۔ ''ثم اناب'' پھر وہ خدا کی طرف لوٹے۔'' کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کوئی ایسا کام سرزد ہوا جس کی خاطر وہ معرض آزمائش میں آئے اور انھوں نے توبہ کی۔

اس مقام پر بالخصوص ایسے مفسرین نے جو ہر صورت میں جمع روایات کی کوشش کرتے ہیں، کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر و بیشتر اسرائیلیات سے مشابہت رکھتے ہیں اور ان کا مرجع احبار یہود اور ان کی کتابیں ہیں۔ ان سب احتمالات میں سے صرف ایک کسی حد تک قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہے جو یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک بیٹا تھا جس سے انھیں بہت محبت تھی اور اسے اپنے مستقبل کی امیدوں کا سہارا جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے کی جان لے لی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے بے روح جسم کو اپنے سامنے پایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان مصائب میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے صبر و مقاومت کو آزمایا اور اسی ضمن میں فہمائش کی کہ ہر عمل سے پہلے تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا چاہیے۔

مشکل اور سخت امتحانات و آزمائشات استعداد کے ابھرنے اور قابلیت کے ظہور و جلا کا سبب ہوتے ہیں۔ اس حادثہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا صبر و بردباری، کہ انھوں نے اپنے فرزند کا جسد بے روح اپنے تخت پر دیکھا، اللہ تعالیٰ کی رضا پر ان کے جذبہ تسلیم و رضا کی نشان دہی کرتا ہے۔

۲: مندرجہ بالا گفتگو سے دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اپنے بیٹے سے محبت اور اسے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز جاننا عام لوگوں کے لیے نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں بلکہ اس دنیا کی معلومات کی نسبت جو وہ عالم آفرینش میں رکھتے ہیں، ترک اولیٰ بھی شمار نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دنیوی معلومات کی اس منزل پر ہوتے ہیں کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی خواہش اور مرضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اس صورت میں یہ حادثہ ایک طرح پر ترک اولیٰ شمار کیا جا سکتا ہے جس کے اثرات توبہ اور طلب مغفرت سے ختم ہو جاتے ہیں۔ فرزند کا وجود امیدوں کا مسکن اور آرزوؤں کی تجلی گاہ کا مظہر ہوتا ہے۔ تاہم چاہیے کہ اپنے کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے، اس کی قضاؤ قدر کو تسلیم کیا جائے اور ہمیشہ کہا جائے:

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴿۴۴﴾ (مومن: ۴۴)

''میں اپنے کام کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کے حالات و کیفیت سے ہر طرح واقف ہے۔''

اصولی طور پر مغفرت اور بخشش کی درخواست ارتکاب جرم یا گناہ کی علامت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اولیائے الٰہی کی مسئولیت و بزرگی کی منزل ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ وہ مقام ربوبیت کی طرف متوجہ ہو کر بخشش کی استدعا کرتے رہیں اور جب بھی کوئی ایسا کام کریں، جو اگرچہ مباح ہو، لیکن ان کے شایانِ شان نہ ہو تو اس کے لیے بارگاہ ایزدی میں توبہ کریں اور طلب مغفرت کریں۔

۳: تیسرے سوال کے جواب میں اجمالاً عرض کیا جاتا ہے کہ ملک و حکومت کے بارے میں جو کچھ ذہن میں آتا ہے وہ ظلم و تعدی و بے لگام قوت و اختیار کا تصور ہے۔ اس قسم کی حکمرانی کی درخواست کسی عقلمند انسان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام اس کی

خواہش کریں۔

لیکن جس حکومت کی درخواست حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی تھی اس کا تعلق ایسی قوت واختیار سے تھا جو منظم و با قاعدہ ہو اور بے لگام نہ ہو، جو شدید حالات میں بھی مقام نبوت کے لازمی اختیار کے ماتحت اور وحی آسمانی کے تابع ہو۔ظاہر ہے کہ اس قسم کی حکمرانی کی خواہش اللہ تعالی کے آئین اور اس کی مخلوق کی خدمت کے مترادف ہے۔

اس بات کا شاہد کہ حکمرانی سے حضرت سیمان علیہ السلام کی مراد ایسی ہی باضابطہ و با ختیار حکومت تھی ، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب خود اپنے لیے بادشاہی کے عنوان پر ارشاد فرماتا ہے تو فوراً کلمہ قدوس کو استعمال فرماتا ہے جو طہارت کے لیے مبالغہ کا صیغہ ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ (حشر: ۲۳)

''خدا بس وہی ہے جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں وہ بہت ہی منزہ و پاک بادشاہ ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر خداوند عالم صفحہ ہستی کا بادشاہ ہے تو وہ دنیا میں آلودہ دوسرے بادشاہوں کی طرح نہیں، بلکہ وہ بالکل طاہر و پاک و بےعیب ہے۔

سیرت نگاروں نے جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''ما انا بملك'' یعنی میں بادشاہ نہیں ہوں کیونکہ اس لفظ سے لوگوں کا تخیل انہی بے لگام وشخصی اختیارات کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔لیکن وہ منضبط اختیار جو دین خدا اور لوگوں کے لیے سعادت حاصل کرنے کے لیے قرار پائے اور ایسے انسان کے پاس ہو جس کو شخصی ہوس اختیار نہ ہو، الطاف الٰہی میں سے ایک لطف ہے جسے وہ اپنے مخصوص بندوں پر مرحمت فرماتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قسم کے عادل ومنصف اور متواضع حکمران کے لیے ارشاد فرماتے ہیں:

ارایتم ما اعطی سلیمان بن داؤد من ملکه فان ذالك لم یرده الا تخشعا ما کان یرفع بصره تخشعا لربه"[1]

''جو عظمت وقوت اور حکومت اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان ابن داوٗد کو عطا فرمائی تھی، اس کے بارے میں تم نے سنا ہے۔لیکن اس وسیع قدرت کے حصول نے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع و خضوع کے سوائے اور کوئی چیز نہ آنے دی۔ وہ خدا کے سامنے اپنے خضوع کی بناء پر اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف بلند نہ کرتے تھے۔''

---

[1] روح البیان ج۸ ص۳۹

۴: اس بحث سے چوتھے سوال کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن مجید بعد کی آیات میں اس کی وسیع کیفیت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

''ہم نے انھیں قدرت عطا فرمائی، ہوا کو ان کے لیے مسخر فرما دیا جو آہستہ آہستہ چلتی تھی اور جہاں وہ چاہتے تھے لے جاتی تھی۔ شیطان کو، جس کی فطرت میں تمرد و سرکشی ہے، ہم نے ان کے لیے مسخر کر دیا کہ اصلاح مملکت اور دریاؤں سے منابع گرانبہا کے حصول میں ان کی خدمت کرتے تھے، اس کے علاوہ طوق و زنجیر میں گرفتار ایک جماعت ان کے زیر تسلط قرار پا چکی تھی۔'' [۱]

اس قسم کی قدرت الٰہی اور عظمت، جس نے عالم طبعی کی توانائیوں اور سرکش شیاطین پر اختیار فراہم کیا ہو، کسی شخص کے لیے قرار نہیں پائیں سوائے اس کے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا معصوم فرد ہو کیونکہ وہ حضرت اور ان جیسے افراد اس قسم کی قدرت و توانائی کو اپنی شخصی تمناؤں کے حصول، ظلم و تعدی اور دوسروں کی سرکوبی کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ اس قسم کی حکومت صرف حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام اور معصوم انسانوں کے لیے ہی سزاوار ہوتی ہے جو قدرت کو وسیلہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، ذاتی مقاصد سے نہیں۔ وہ اس قوت کو عدالت کے قیام اور توحید الٰہی کی ترویج کے لیے استعمال کرتے ہیں، اپنی ذاتی آرزوؤں اور خوابوں کی تکمیل کے لیے بروئے کار نہیں لاتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایسی حکومت کی درخواست کی تھی جس میں ہوا، دریا اور شیاطین ان کے اختیار و قبضہ میں قرار پائیں اس قسم کی حکومت عام اور غیر معصوم کے لئے ہرگز زیبا نہیں۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرض کیا کہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کو حاصل نہ ہو۔ اس سے ان کی مراد عام لوگ تھے نہ کہ معصوم و پاک ہستیاں جیسے کہ ان کے والد گرامی حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔ کیونکہ اس قسم کی درخواست خصوصی جبکہ دوسرے لوگ ان جیسی شان و املاک رکھتے ہوں صحیح نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک انسان کامل کے مقام کے لیے مناسب نہیں چہ جائیکہ انبیاء کے شایانِ شان ہو۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہنا ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایسی سلطنت و حکمرانی کی درخواست کی تھی جو ان کی نبوت و رسالت کی علامت قرار پائے اور معجزات انبیاء کا مقام حاصل کر لے۔ لہٰذا اگر وہ کہتے ہیں: ''لا ینبغی لا حد من بعدی'' تو اس سے ان کی مراد وہ افراد ہیں جو ان کی قلمروئے نبوت میں جاگزیں تھے نہ کہ تمام انسان جو قیامت تک روئے زمین پر قدم رکھیں گے اگر چہ ان کی طرح معصوم اور گناہ سے محفوظ ہی ہوں اور اس سے ترویج عدالت اور دین توحید کے علاوہ کوئی فائدہ نہ اٹھائیں۔ [۲]

---

[۱] سورہ ص آیت ۷ و تا ۴۰ کی طرف رجوع کریں۔

[۲] تنزیہ الانبیاء ص ۱۰۰، المیزان، ج ۱۷، ص ۲۰۵

قرآن اور عصمت حضرت ایوب علیہ السلام

صبر و استقامت کی چٹان

حضرت ایوب علیہ السلام انبیائے عالی مقام سے ہیں جو صبر و استقامت کی منزل میں زباں زد خاص و عام ہیں۔تورات کے برخلاف کہ جس میں عنوان پیغمبران کے تحت ان کا ذکر نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سورۂ نساء کی آیت ۱۶۳ اور سورۂ انعام کی آیت ۸۴ میں ان کا اسم گرامی انبیاء کی فہرست میں شامل کیا ہے۔تاہم قرآن مجید ان کے بعض ایسے جملے نقل فرماتا ہے جو بظاہر مقام نبوت کے ساتھ، جو سراسر عصمت و پیراستگی کی منزل ہے، سازگار معلوم نہیں ہوتے۔مثلاً:

"مَسَّنِیَ الضُّرُّ" (انبیاء ۸۳)

مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ﴿۴۱﴾ (ص: ۴۱)

ان حالات میں لازم آتا ہے کہ رفع ابہام کی خاطر ہم مندرجہ ذیل موضوعات پر بحث و تحقیق کریں:

۱: تین کلمات ضر، نصب اور عذاب کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲: حضرت ایوب علیہ السلام کے مصائب جن کو یہ الفاظ اجمالاً بیان کرتے ہیں، کیا تھے؟

۳: اس سلسلہ میں جس کو دوسرا جملہ ظاہر کرتا ہے، شیطان کی مداخلت کس طرح ہو سکتی ہے؟

تینوں کلمات کے لغوی معنی

قرآن مجید کئی سورتوں میں بالخصوص سورۂ 'ص' میں ان کے واقعات و مصائب کی تشریح کرتا اور فرماتا ہے:

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴿۸۳﴾ (انبیاء: ۸۳)

''اور اس وقت کو یاد کرو، جب ایوب نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا: خدایا! ناگوار حالت اور سخت ابتلاء نے مجھے آلیا ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ﴿۸۴﴾ (انبیاء: ۸۴)

''ہم نے اسے جواب دیا اور اس کی وضع ناگوار و ابتلاء کو دور کر دیا، اس کے گھر والوں کو واپس پلٹا دیا، ان

جیسے اور بھی اسے عطا فرمائے اور یہ سب کچھ ایوب پر ہماری رحمت کی وجہ سے تھا اور یہ عبادت گزاروں کے لیے قابل ذکر بات ہے۔''

یہی مضمون سورۂ ''ص'' میں ایک اور طرح سے وارد ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ؁

(ص: ۴۱)

''اے ہمارے بندہ ایوب کو یاد کرو کہ جب اس نے کہا کہ شیطان نے مجھے رنج و عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔''

دونوں آیات مبارکہ بہ اعتبار مضمون ایک دوسری کے قریب ہیں اگر چہ طرزِ تعبیر میں مختلف ہیں۔ اب ہم متذکرہ تینوں کلمات کی وضاحت کرتے ہیں:

ضر سے کیا مراد ہے؟

'ضر' بروزن 'شر' فائدہ کے بالمقابل یعنی نقصان کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ (اعراف: ۱۸۸)

''کہہ دیجئے کہ میں اپنے لیے کسی سود وزیاں کا مالک نہیں ہوں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔''

لیکن 'ضر' بروزن 'حر' وضع بد، بری حالت، ابتلاء اور مصیبت کے معنی میں ہے۔ جب کوئی شخص فقر و تنگدستی یا مرض و بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے۔[1]

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَاۗىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ (یونس: ۱۲)

''جب بھی کوئی انسان ناگوار حالت میں ہو تو ہر حالت میں لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور کھڑا ہو کر ہمیں پکارتا ہے۔ جب ہم اس کی ابتلاء کو دور کر دیتے ہیں (تو ہمیں بھول جاتا ہے) گویا یہ وہی شخص نہ تھا جس

---

[1] لسان العرب، جلد ۴، مادہ 'ضر'

نے ہمیں ابتلاء کے دور کرنے کے لیے پکارا تھا۔"

اس لحاظ سے جملہ مسنی الضر سوائے اس کے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس قسم کی مصیبت و بیماری میں مبتلا تھے۔لیکن اس مصیبت کی نوعیت کیا تھی، اس کو مطلب دوم میں بیان کیا جائے گا۔

نصب وعذاب سے کیا مراد ہے؟

"نصب" بروزن "ظلم" رنج وتعب کے معنی میں ہے۔[١] بیماری اور شر وبلا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس لیے کہ ان موارد کا رنج وزحمت سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

لفظ "عذاب" کا مصدر "عذب" ہے۔(فعل باب تفعیل)۔بعض اہل لغت نے اس کو عقوبت وانجام کے معنی میں لیا ہے۔[٢] جبکہ اس کے اصلی معنی جزاو مکافات نہیں بلکہ اس کے معانی میں سے ایک جزا بھی ہے۔عذاب وسیع معنی کا حامل ہے جو ہر قسم کی جسمانی یا روحانی تکالیف جو انسان پر وارد ہوتی ہیں، خواہ ان کا مستحق نہ بھی ہو، کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا ظالم شکنجہ والے کو معذب اور اس کے عمل کو عذاب کہتے ہیں۔[٣]

ابن فارس کہتا ہے: "عذاب" اصل میں "ضرب" کے معنی میں ہے۔اس لیے تازیانہ کے سرے کو "عذبہ" کہتے ہیں لیکن بعد میں شدید وسخت کاموں کو جن کا تحمل انسان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔"عذاب" کا نام دیا جانے لگا۔[٤]

یہ تینوں الفاظ اس سے زیادہ کسی چیز کو ظاہر نہیں کرتے کہ ایک قسم کی وضع ناگوار (ضر) رنج وتعب (نصب) اور حالت درد وتکلیف (عذاب) حضرت ایوب علیہ السلام پر واقع ہوئے۔انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اس تکلیف سے انھیں نجات دلا دے۔ظاہر ہے کہ اس قسم کی عرضداشت میں صدورِ گناہ کی کوئی علامت نہیں اگر ان میں تزکیہ وکمالات حاصل شدہ کے دور میں ہونے کی شہادت نہ ہو۔(جیسا کہ ہم بعد میں اشارہ کریں گے)

ابتلائے ایوب کی کیفیت

ان دونوں سورتوں کی آیات سے ابتلائے حضرت ایوب علیہ السلام کی وضاحت نہیں ہوتی۔سورہ ص کی آیت ۴۲ سے صرف ایک اشارہ ملتا ہے کہ ان کا عارضہ اس پانی میں نہانے سے جو بطور اعجاز ان کے پاؤں کے نیچے سے نکلا تھا، درست ہو گیا تھا گویا ان کا یہ عارضہ کسی قسم کی جسمانی بیماری تھی جو اس پانی میں نہانے سے راحت میں بدل گئی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[١] مقاییس اللغۃ، ج۵، ص۴۳۴

[٢] لسان العرب، ج۱، ص۵۸۵

[٣] تنزیہ الانبیاء، ص۶۱

[٤] مقاییس اللغۃ، ج۴، ص۲۶۰

ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ (ص: ۴۲)

''ہم نے اس سے کہا اپنے پاؤں کو حرکت دو (پانی ظاہر ہوا) یہ پانی ہے نہانے کے لیے، ٹھنڈا ہے اور پینے کے لیے ہے۔''

حضرت ایوب علیہ السلام کے پاؤں کے نیچ سے چشمہ آب کا جاری ہونا حضرت اسمعیل علیہ السلام کے پاؤں کے نیچے زمزم کے معجزانہ طور پر جاری ہونے کے عین مطابق ہے۔ خداوند عالم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتا ہے:

أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ

(اعراف: ۱۶۰)

''ہم نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو! اس سے بارہ چشمے (قبائل بنی اسرائیل کے ہم عدد) خارج ہوئے۔''

روایات تاریخ میں حضرت ایوب کی تکلیف کا ایک بیماری کی صورت میں پتہ چلتا ہے۔ چند ایک روایات میں، جو یہودیوں سے موصول ہوئی ہیں، آپ کی علالت کی ایسی نوعیت بیان کی گئی ہے جو مقام انبیاء کے شایانِ شان نہیں۔[۱]

امام جعفر صادق علیہ السلام ایک طویل روایت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری نے (تندرست ہوجانے کے بعد) ان کی شکل، چہرہ اور باقی اعضائے جسم پر معمولی سا اثر بھی نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی انہیں ایسے اثرات ظاہر ہوئے جن سے نفرت و بیزاری کا کسی طرح کا بھی تصور پیدا ہو۔[۲]

ابتلائے ایوب میں شیطان کا دخل

حضرت ایوب علیہ السلام بعض اوقات مقام دعا میں عرض کرتے ہیں: ''مسنی الضر'' کبھی کہتے ہیں: ''مسنی الشیطان بنصب و عذاب'' ان دونوں جملوں کے تجزیہ کی خاطر، جس کے ضمن میں تیسرے مطلب کی واقعیت بھی واضح ہوجاتی ہے، دو طریق نظر آتے ہیں:

۱: ''ضر'' سے تو حضرت ایوب علیہ السلام کی وہی طویل علالت مراد ہے، جبکہ ''نصب و عذاب'' سے جسمانی بیماری کے علاوہ کوئی اور رنج و تکلیف مراد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد راہبوں کی شماتت ہے جو شیطان کی تحریک سے حضرت ایوب علیہ

[۱] بحارالانوار، ج ۱۲، ص ۳۴۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۳۹ وغیرہ

[۲] خصال، ج ۲، ص ۳۹۹

السلام کو طعن کرتے اور کہتے کہ آپ کون سے گناہ کے مرتکب ہوئے کہ اس نبوت کو پہنچے؟ یہ وہ موقع تھا جہاں حضرت ایوب کا صبر و تحمل جواب دے جاتا ہے، جہاں شیطان ان کے عارضہ کو ہوا دیتا ہے اور حضرت ایوب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی تکلیف کو رفع فرمائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"ان اللہ ابتلی ایوب بلا ذنب فصبر حتی عیر و ان الانبیاء لا یصبرون علی التعییر"۔[1]

''حضرت ایوب، بغیر اس کے کہ ان سے گناہ سرزد ہوتا، بلا ومصیبت میں مبتلا ہوئے۔ انھوں نے صبر و استقامت سے کام لیا حتی کہ (شیطان نے) انھیں سرزنش کی اور انبیاء ہر قسم کی شماتت پر صبر نہیں کرتے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ شیطان کا حضرت ایوب علیہ السلام کے عارضہ جسمانی میں کوئی دخل نہ تھا۔ شیطان صرف ان کی روحانی اذیت میں شریک تھا جو راہبان بنی اسرائیل کی طرف سے انھیں پہنچتی تھی۔ شیطان کا اثر اس حد تک تھا کہ وہ ان راہبوں کے قلوب میں وسوسے ڈالتا اور ان کو اس کام کا شوق دلاتا جو حضرت ایوب کی تکلیف کا سبب بنے۔ یہاں تک شیطان کے دخل کا کامل امکان موجود ہے۔

۲: ان تینوں کلمات سے صرف ایک ہی چیز مراد ہے اور وہ عارضہ بدنی و بیماری جسم ہے، جو حضرت ایوب کو لاحق ہوئی تھی اور اس میں ایک طرح پر شیطان کا بھی دخل تھا۔

جو لوگ حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف کی اس وجہ کو اہمیت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شیطان نے خداوند عالم کے حضور عرض کیا ''ایوب تیرا بندۂ شاکر و سپاس گزار اس لیے ہے کہ تو نے بہت سی نعمات اس کے اختیار میں دے رکھی ہیں۔ اگر تو مجھ کو اس پر اس طرح مسلط فرمائے کہ وہ تمام نعمات اس سے چھین لوں تو پھر تو اس کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔'' اس طرح شیطان نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حضرت ایوب کے مزاج و مال میں تصرف کیا، لیکن انھیں ہر حال میں صابر و شاکر پایا اور اس طرح شیطان کا اندیشہ باطل ثابت ہوا۔[2]

یہی وجہ ہے کہ دوسری سورت میں آپ اپنی ابتلاء کے فاعل کا نام لے کر فرماتے ہیں: "مسنی الشیطان"

یہ سب اگر چہ کسی قدر بعید معلوم ہوتا ہے تاہم محالات میں سے نہیں اور اصول و معارف اسلامی کے چنداں خلاف بھی نہیں کیونکہ اگر انبیاء علیہم السلام مادی اسباب سے متاثر ہو کر کسی علالت و مرض میں مبتلا ہو جائیں تو اس میں کوئی چیز مانع بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے کسی وقت شیطان جیسا کوئی عامل (صحت و اموال کے زیاں کی صورت میں) ان پر اثر انداز ہو جائے۔

---

[1] بحار الانوار ج ۱۲، ص ۳۴۷، چاپ اسلامیہ

[2] مدرک سابق

زمخشری کشاف میں اس سبب کے رد میں کہتا ہے کہ اگر شیطان کو اس قسم کا تسلط حاصل ہو جائے تو پھر روئے زمین پر کسی صالح و نیک شخص کے جان و مال اس کے شر سے محفوظ نہ رہیں۔ شیطان صرف لوگوں کے قلوب میں وسوسے ڈالتا ہے، ان کے جان و مال میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرتا۔

یہ بات صرف اس صورت میں درست ہے کہ اگر شیطان ہمیشہ کے لیے ایسی قدرت مطلقہ کا حامل ہو نہ کہ صرف ایک ہی موقعہ پر، وہ بھی اذن الٰہی سے، ایک مصلحت کی خاطر اسے یہ قوت حاصل ہو۔

بندگانِ خدا پر شیطان کے تسلط کی حدود، ان کے قلوب میں وسوسے ڈالنا، ان کو معصیت کی دعوت اور شوق دلانا، ایک بالکل الگ بحث ہے جس میں ہم اس وقت داخل ہونا نہیں چاہتے تاہم یہ تسلط ایک جزوی شکل میں، محال نہیں اور نہ ہی عدل الٰہی کے اصول کے خلاف قرار پاتا ہے۔

آخر میں ہم دو نکات کے ذکر کو ناگزیر سمجھتے ہیں جو یہ ہیں:

۱: ابتلائے ایوب کا مقصد؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں کمالات باطنی کے ظاہر ہونے کے لیے وارد ہوتی ہیں۔ بہت سے ایسے افراد دنیا میں موجود ہوتے ہیں جو اپنے اندر باطنی شائستگی کا ایک سلسلہ محفوظ رکھتے ہیں جو اس وقت تک ظاہر نہیں ہو پاتیں جب تک ایسے مخصوص حالات پیدا نہ ہوں جو ان کمالات باطنی کے اظہار کا سبب بنیں۔

حضرات ابراہیم، ایوب اور دیگر انبیاء علیہم السلام سخت ترین آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ ان آزمائشوں میں انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ ان کے قلوب پر ذات باری تعالیٰ اور اس کی رضا کے سوا اور کوئی شے غالب نہیں۔ ان آزمائشوں میں قتل اولاد اور طویل عوارض جسمانی شامل ہیں جن کو انھوں نے مستقل ارادہ اور صمیم قلب کے ساتھ قبول کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکیں۔ یہ سخت ترین حالات ایک بھڑکتی ہوئی بھٹی کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے عمل سے خالص اور ناخالص کو جدا کرتی ہے۔

جو شخص اٹھارہ یا بیس سال تک درد، بیماری اور فقر و ناداری میں گزار دے اور پھر خالق کا تہ دل سے شکر گزار و سپاس گزار رہے، وہ واقعی اس منزل پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں فرمائے:

اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ (ص: ۴۴)

''ہم نے اسے صابر پایا، کیسا اچھا بندہ تھا کہ وہ اپنے خدا کی طرف رجوع و توجہ کرتا تھا۔''

واضح ہے کہ یہ کمالات یعنی خداوند تعالیٰ سے تعلق اور اس کے علاوہ کچھ نہ چاہنا، سوائے شدید حالات کے ابھر کر شباب پر نہیں آتے۔

سورۂ انبیاء کی ۸۴ ویں آیت حضرت ایوب علیہ السلام کی صحت یابی کو اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت اور دوسروں کے لیے سبب عبرت بیان کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَ ذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ

فلسفہ ابتلاء صرف اسی قدر نہیں۔ اس سلسلہ میں کئی اصطلاحی مدارج پائے جاتے ہیں جن کا ذکر اپنے مقام پر ہو چکا ہے۔ [1]

۲: قسم ایوب اور حیلہ شرعی

حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری کے دوران اپنی زوجہ محترمہ کی طرف سے کوئی خلاف طبع عمل مشاہدہ فرمایا اور قسم کھائی کہ صحت یاب ہونے کے بعد اس کو چند کوڑے ضرور ماریں گے۔ لہٰذا صحت یابی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ درج ذیل آیت کے مطابق عمل کریں:

وَخُذۡ بِيَدِكَ ضِغۡثًا فَاضۡرِبۡ بِّهٖ وَلَا تَحۡنَثۡ ؕ اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ (ص: ۴۴)

''باریک باریک لکڑیوں کا ایک مٹھا لے لو اور اس کے ساتھ مارو۔ اپنی قسم کو نہ توڑو۔ ہم نے اس کو صابر و بردبار پایا۔ وہ کیسا اچھا بندہ تھا کہ جس کی بازگشت اللہ کی طرف تھی۔''

سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کا عمل قسم کی ادائیگی کے لیے ایک حیلۂ شرعی ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اس خاتون نے اختلاف اور اس سزا کی مستحق ہونے کے باوجود اپنے شوہر کی طویل علالت کے دوران قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ یہاں تک کہ جب سب نے حضرت ایوب علیہ السلام سے منہ موڑ لیا تو اس وقت بھی یہ خاتون اپنے شوہر سے متعلق فرائض کو پورا کرتی رہیں۔ لہٰذا وہ اس سلسلہ میں عفو و بخشش کی حقدار تھیں، تاہم دوسری طرف اللہ کا نام اور احترامِ قانون بھی درمیان میں تھے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں خداوند عالم نے اپنے حکم مولویت کے طور پر، جس کا اسے اختیار کامل ہے، اس قسم کی صورت حقیقی کو صورت واقعی میں قبول فرمایا۔ یہ ایک مقام استثناء ہے اور ہوس بازوں کے حیلہ شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں یعنی وہ افراد جو چاہتے ہیں کہ محرمات الٰہیہ کا صورتِ شرعی سے ارتکاب کریں۔ یہ درحقیقت ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہیں۔

---

[1] شناخت صفات خدا، بخش عدل و بحث ''فلسفہ بلاہا'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

قرآن اور عصمت حضرت یونس علیہ السلام

مخالفین عصمت انبیاء علیہم السلام حضرت یونس کے مشہور واقعہ کو بہت بڑی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہم عام طور پر اس واقعہ کو اجمالی صورت پر جانتے ہیں۔ ہم اس بارے میں نازل شدہ آیات مبارکہ قرآن مجید اور ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ پھر ان کی وضاحت کریں گے۔

ارشاد ہوتا ہے:

۱: فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸

(یونس: ۹۸)

''کیوں کوئی آبادی بھی (برمحل) ایمان نہ لائی تا کہ ان کا ایمان ان کے لیے سودمند ہوتا۔ سوائے قوم یونس کے، جب وہ ایمان لے آئے اور ہم نے ذلیل کرنے والا عذاب ان سے برطرف کر دیا اور ایک مدت تک انھیں نعمت (حیات) سے بہرہ مند کیا۔''

۲: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷ (انبیاء: ۸۷)

''مچھلی کا ساتھی (یونس) جس وقت غضبناک ہو کر گیا اور اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے، پھر اس نے تاریکیوں میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو منزہ و پاک ہے۔ میں ہی ظالموں میں سے تھا۔''

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸

(انبیاء: ۸۸)

''ہم نے اس کی پکار کا جواب دیا اور اسے اندوہ سے نجات عطا فرمائی۔ ہم اسی طرح مومنین کو (غم سے) نجات دیتے ہیں۔''

۳: وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۳۹ؕ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝۱۴۰ فَسَاهَمَ

فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ (صافات: ۱۳۹ تا ۱۴۸)

''یونس رسولوں میں سے تھا۔ جب اس نے سرنشینوں سے پُر کشتی کی طرف فرار کیا تو انھوں نے قرعہ ڈالا (قرعہ اس کے نام پر نکلا) اور وہ مغلوب ہو گیا۔ اسے بہت بڑی مچھلی نے نگل لیا جبکہ وہ سرزنش کا مستحق تھا۔ اگر وہ (شکم ماہی میں) اللہ کی تسبیح نہ کرتا تو اس کے شکم میں روزِ قیامت تک رہتا۔ اس کو ہم نے نجات دی اور سبزہ سے خالی زمین پر اسے پھینک دیا جبکہ وہ بیمار بھی تھا۔ اس کے لیے ہم نے کدو کی ایک بیل اگا دی اور اسے ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ افراد کی طرف بھیجا۔ وہ ایمان لے آئے اور ہم نے بھی انھیں زندگی سے بہرہ مند فرمایا۔''

۴: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ (قلم: ۴۸ تا ۵۰)

''اپنے پروردگار کی تقدیر پر صابر رہ اور یونس کی طرح نہ ہو جا جبکہ اس نے خدا کو پکارا در آنحالیکہ وہ سخت غمگین تھا۔ اگر خدا کی رحمت نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ بیابان میں پھینکا جاتا جبکہ سرزنش کیے جانے والوں میں سے تھا۔ اللہ نے اسے برگزیدہ کیا اور اسے صالحین میں قرار دیا۔''

یہ سب آیات وہ ہیں جو حضرت یونس علیہ السلام کی رسالت اور ان کی عجیب و غریب سرگذشت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں غور کر کے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق تمام سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ ان میں بعض باتیں مقام عصمت سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تاہم مفید تر بحث کی خاطر پہلے مختصر طور پر ان کی سرگذشت کو بیان کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد متعلقہ سوالات کی وضاحت کریں گے۔

حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو سرزمین عراق میں تبلیغ کرنا شروع کی لیکن اس تبلیغ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ صرف دو آدمی ان پر ایمان لائے جن میں سے ایک عبادت گزار اور دوسرا عالم تھا۔ اول الذکر نے ان سے درخواست کی کہ قوم پر عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا

فرمائیں۔ دوسرے نے صبر وبردباری کا مشورہ دیا۔ آخر حضرت یونس علیہ السلام اس قوم سے اس قدر تنگ آ گئے کہ ان پر نفرین کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک معینہ دن کو اس قوم پر عذاب نازل کرنے کا حضرت یونس سے وعدہ کر لیا۔ جب روزِ عذاب قریب آ گیا تو حضرت یونس اس عابد کو ہمراہ لے کر اس مقام سے چلے گئے۔ جب روزِ عذاب آن پہنچا اور نزول عذاب قطعی و یقینی ہو گیا تو لوگ قوم کے عالم کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو۔ گریہ و نالہ کرو اور بیابان کا رخ کرو۔ بچوں کو ماؤں سے اور حیوانوں کو ان کے بچوں سے الگ کر دو۔ اس طرح ندامت و توبہ کی راہ اختیار کرو۔"

ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور لطف و کرم جوش میں آ گئے اور عذاب کی نشانیاں جاتی رہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کی کیفیت سے آگاہی سے پہلے، یا ان کی نجات سے آگاہی کے بعد لیکن انکے ایمان سے مطلع ہوئے بغیر، دریا کی طرف روانہ ہوئے اور کشتی میں سوار ہو گئے۔ اتفاق سے دریا میں طوفان آ گیا۔ کشتی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ملاح نے خطرہ کا اعلان کیا اور کہا کہ کسی ایک شخص کو قرعہ اندازی کی مدد سے دریا میں پھینک دیا جائے۔ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ملاح نے کہا کہ ایک بہت بڑے دریائی جانور نے کشتی کو روکا ہوا ہے اور اپنی خوراک مانگتا ہے۔ لہٰذا لاچاری ہے کہ ایک نہ ایک آدمی کو اپنی جان کی قربانی دینا ہوگی۔

یہ بھی روایت ہے کہ ملاح نے کہا: "کوئی ایسا غلام کشتی پر سوار ہے جس نے اپنے مالک سے فرار کیا ہے۔ لہٰذا اس کو قرعہ اندازی کر کے دریا کے سپرد کر دینا چاہیے۔" [۱] آخر کار قرعہ اندازی ہوئی اور حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا۔ جب انھیں دریا میں پھینکا گیا تو آپ کو ایک بہت بڑی مچھلی نے نگل لیا۔ پھر ان تاریکیوں میں جو رات، دریا اور شکم ماہی کی تاریکی پر مشتمل تھیں، حضرت یونس اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انھیں نجات دی اور انھیں مچھلی کے پیٹ اور پھر دریا سے باہر نکالا جس کے بعد وہ اپنی قوم میں واپس آ گئے۔ [۲]

اب جبکہ ہم مختصراً اس قصہ سے واقف ہو گئے تو آیات قرآن مجید کے سلسلہ میں جو سوالات اٹھتے ہیں ان کے جواب دیتے ہیں۔

۱: قوم یونس کی توبہ کیوں قبول ہوئی؟

قرآن مجید شاہد ہے کہ کسی سرکش قوم کا نزولِ عذاب کے وقت ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں رکھتا اور عذاب الٰہی ان لوگوں کو ناپید کر دیتا ہے۔ سورۂ یونس کی آیت ۹۰ میں دریا میں غرق ہوتے وقت فرعون کے ایمان لانے کا ذکر آتا ہے اور پھر اعتراض کے لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ﴿۹۱﴾ (یونس: ۹۱)

---

[۱] یہ خصوصیات جو روایات پیش کرتی ہیں اخبار احاد ہیں جن پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ اصل واقعہ قطعی طور پر یہی ہے۔

[۲] حضرت یونس علیہ السلام کا پورا واقعہ تفاسیر میں موجود ہے۔ اس کی تفاصیل مجلسی نے بحار میں، بحرانی نے برہان میں اور عبد علی نے نور الثقلین میں پیش کی ہیں۔

''کیا اب جبکہ اس سے پہلے مدت العمر تو نے ہماری مخالفت کی تو مفسدین سے تھا۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم یونس کا ایمان دیگر اقوام کے ایمان سے کس طرح مختلف تھا کہ ان کا ایمان مفید ثابت ہوا جبکہ دیگر اقوام کے ایمان نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ قرآن اختصار کے ساتھ ایمان کی ان دونوں قسموں کی طرف سورۂ یونس میں اشارہ فرماتا ہے: **فلولا کانت قریۃ امنت......''**

ہم یہاں ایمان کی ان دونوں اقسام کے فرق پر گفتگو کرتے ہیں۔

ایمان جدی و ایمان صوری

قوم یونس کا ایمان علامات عذاب کے مشاہدہ کے بعد ایمان جدی وآگاہانہ تھا۔ علامات عذاب نے ان کی جہالت و نادانی کے پردوں کو اس طرح چاک کر دیا کہ پھر اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک وہ لوگ کفر کی جانب ہرگز نہ پلٹے۔ اسی لیے قرآن ان کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴿۹۸﴾ (یونس ۹۸)

''ہم نے انھیں مدت معینہ تک زندگی عطا فرمائی۔''

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو قوم نے ان کا والہانہ استقبال کیا، گویا علامات عذاب نے ان کے ذہنوں کو ہلاک کر رکھ دیا تھا کہ پھر زندگی کے آخری لمحہ تک جادۂ توحید سے ان کے قدموں میں لغزش نہ آئی۔ اس کے برعکس اقوام دیگر کا ایمان یا ان کے وعدے کہ عذاب کے برطرف ہونے پر ایمان لے آئیں گے، جدی یا پختہ نہ تھے۔ جب بھی ان سے عذاب کو دور کر دیا جاتا تھا تو پھر اپنی پہلی حالت کفر پر عود کر آتے تھے۔ فراعنہ کے زمانہ میں یہ مسئلہ ہمیشہ پیش آتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان، ٹڈی دل اور دیگر آفات نازل کیں۔ اس وقت وہ سب حضرت موسیٰ کا دامن تھام لیتے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴿۱۳۳﴾ (اعراف: ۱۳۳)

''ان کی (بیداری) کی خاطر ہم نے طوفان، ٹڈی دل، آفت ہائے زرعی، جوئیں، مینڈک اور خون، جن میں سے ہر ایک ہماری آیات میں سے تھی، نازل فرمائیں۔ لیکن انھوں نے تکبر کیا اور وہ ایک گنہ گار قوم تھی۔''

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ

كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿١٣٤﴾

(اعراف: ۱۳۴)

''اور جب عذاب ان پر مسلط ہوا تو انھوں نے کہا: اے موسیٰ اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اس کو پورا فرمائے۔ اگر وہ ان بلاؤں کو برطرف کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے اور نبی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے۔''

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰٓ أَجَلٍ هُم بَٰلِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ﴿١٣٥﴾

(اعراف: ۱۳۵)

''جب ہم نے مدت معینہ کے لیے ان سے عذاب کو ہٹالیا تو فوراً انھوں نے پیمان شکنی کا ارتکاب کیا۔''

خلاصہ یہ کہ جو چیز قوم یونس کو فرعون جیسی دیگر اقوام سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے علامات عذاب کو دیکھ کر نصیحت پائی اور فوراً ہی ایمان جدی اختیار کر لیا جبکہ فرعون کی قوم نے تکبر کیا، مکر وفریب سے کام لیا، جیسا کہ ان سے متعلق آیات میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ انھوں نے ایمان لانے کا وعدہ کیا لیکن اس وعدہ کو وفا نہ کیا اور سب کے سب غرق دریا ہو گئے۔ اب بھی اگر انھیں نجات دی جاتی تو دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جاتے، بالکل اسی طرح جیسے پہلے عذاب کے برطرف ہونے کے بعد انھوں نے اپنے وعدہ پر عمل نہ کیا اور کفر کی طرف پلٹ گئے تھے۔

لہٰذا علامات عذاب کے سامنے آنے پر ایمان کی دو قسمیں سامنے آتی ہیں:

الف) ایمان اختیاری

ب) ایمانِ اضطراری

الف) ایمان اختیاری

علاماتِ عذاب کا مشاہدہ جہل وغرور کے پردوں کو اس طرح تار تار کر دیتا ہے کہ نور ایمان سے فضا روشن ہو جاتی ہے۔ پھر اگر عذاب برطرف بھی ہو جائے تو انسان اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے۔ یہی وہ ایمان اختیاری ہے جو تکامل وارتقاء کا سبب اور موجب نجات ہے۔

ب) ایمانِ اضطراری

یہ ایمان کی وہ قسم ہے جس کا منشاء دل سے قبول کرنا نہیں بلکہ اس کا باعث خوف وہراس ہوتا ہے۔ ایسے ایمان سے فضائے روح غبار تکبر سے پاک نہیں ہوتی اور پردہ ہائے جہالت اپنے مقام پر باقی رہ جاتے ہیں۔ ایمان کی یہ قسم نہ تو تکمیل ایمان فراہم کرتی ہے، نہ موجب

نجات اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے۔

قوم یونس کا ایمان قسم اول سے تھا، جبکہ قوم فرعون کا ایمان، جب وہ دریا کے منجدھار میں تھی، دوسری قسم کا یعنی اضطراری تھا۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ (یونس: ۹۹)

''اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو وہ تمام جو روئے زمین پر ہیں ایمان لے آتے۔ تو کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہو؟''

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ سب انسان ایمان لے آئیں۔ اس امر کی دلیل اللہ تعالیٰ کا اتنے انبیاء و رسل کو بھیجنا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مندرجہ بالا آیت سے کیا مراد ہے؟

ظاہر ہے کہ اس سے مراد ہی ایمان اضطراری و اجباری ہے جو مشیت تکوینی اور اللہ تعالیٰ کی خواہش اجباری کے تحت پیدا ہوتا ہے لیکن مشیت پروردگار ہرگز اس ایمان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ انسانوں سے چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مکمل حریت و آزادی کے ساتھ اس کی ذات اقدس پر ایمان لائیں اور اس کے انبیاء کی پیروی کریں۔

اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ باری تعالیٰ لوگوں کا ایمان لانا چاہتا بھی ہے اور نہیں بھی چاہتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے ایمان اختیاری سے بہرہ مند ہوں جسے اصطلاحی طور پر اللہ کا ارادۂ تشریعی کہتے ہیں۔ وہ جبر کے ذریعہ لوگوں کے ایمان لانے کو قطعاً پسند نہیں کرتا جس کو اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کا ارادۂ تکوینی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خواہش تکوینی کے مقابلہ میں کوئی چیز مقاومت نہیں کرسکتی، نہ ہی کوئی شے اس سے مجال اختلاف رکھتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جو ایمان ارادۂ تکوینی کے تحت وجود پائے وہ ایمان جبر ہوگا جس کی کوئی حیثیت واہمیت نہیں ہوتی۔

۲، برطرفی عذاب تکذیب یونس نہ تھی

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ پروردگارِ عالم اپنے انبیاء و رسل کی ہمیشہ مدد فرماتا ہے اور کبھی بھی ان کی تکذیب کے پہلو فراہم نہیں فرماتا۔ اگر اولیاء اللہ میں سے کوئی کسی طرح کی غیب کی خبر دے اور وہ بات پوری نہ ہو تو یہ بات لوگوں کی نظر میں ایک طرح کی تکذیب شمار ہوتی ہے۔ لیکن اخبار و روایات میں ایسے واقعات بہت کم ہوں گے، جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے کہ جہاں اللہ کے اولیاء کی فراہم کردہ خبریں پوری نہ ہوئی ہوں اور یہ بات ان کی تکذیب کا باعث قرار پائی ہو، کیونکہ ہمیشہ قرائن سے ان کی صداقت کی گواہی ملتی ہے اور انکے بیان کردہ قول کے عدم وقوع کی وجوہات کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں علامات عذاب ان کی قوم پر ظاہر ہوگئی تھیں اور سب کو یقین ہوگیا تھا کہ اگر کوئی بچاؤ کی صورت

نہ سوچی گئی تو بلا وعذاب انھیں گھیر لے گا۔ اور حضرت یونس علیہ السلام کی خبر غیبی متحقق ہو جائے گی۔ اسی لیے انھوں نے ایسی تضرع وزاری پر عمل کیا جس کی ان کی قوم کے عالم نے انھیں تعلیم دی تھی، انھوں نے ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا اور رحمت خدا کو اپنے اعمال کے ذریعہ پکارا اور اس آیۂ مبارکہ کے عین مطابق طرز عمل اختیار کیا:

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ (اعراف: ۹۶)

''اگر شہر و دیار کے سب باشندے ایمان لے آتے اور پرہیز گار ہو جاتے تو ہم یقیناً زمین و آسمان کے تمام دروازے برکات ان پر کھول دیتے۔''[۱]

یہ اپنی نوعیت کا کوئی ایسا تنہا واقعہ نہیں کہ کسی ولی خدا نے خبر دی ہو اور وہ واقعہ نہ ہوا ہو۔ ایسے اور بھی واقعات ہیں، اگر چہ تعداد میں بہت کم ہیں، جو قصہ حضرت یونس سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی باوجود عدم وقوع ایسے قرائن وشواہد متن حادثہ میں شواہد پیش کرتے ہیں کہ ولی خدا اپنے مقام پر بالکل صادق تھے، پھر بھی اگر ان کی کہی ہوئی بات پوری نہیں ہوئی تو اس کے لیے ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنھوں نے واقعہ کے رونما ہونے کے حالات کو بدل کر رکھ دیا۔[۲]

۳: مخالفین کے دلائل

متذکرہ بالا دو سوالات سورۂ یونس کی ایک آیت سے متعلق تھے جس کی تفسیر سے قوم یونس کی توبہ قبول ہونے کے اسباب و علل اور حضرت یونس علیہ السلام کی عدم تکذیب واضح ہو گئے۔ تاہم مخالفین کے کچھ دلائل سورۂ انبیاء کی ان آیات پر مبنی ہیں جن کا متن و ترجمہ ہم قبل ازیں پیش کر چکے ہیں۔ مخالفین کے دلائل کے مسکت جواب کی خاطر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم درج ذیل نکات کی تشریح کریں۔

الف) 'مغاضبا' سے کیا مراد ہے؟ وہ کس پر غصہ کر رہے تھے؟

ب) فظن ان لن نقدر علیه، سے کیا مراد ہے؟

ج) انی کنت من الظلمین، حضرت یونس علیہ السلام کس طرح کہتے ہیں؟

کیا یہ تینوں باتیں حضرت یونس علیہ السلام کے مقام عصمت سے مطابقت رکھتی ہیں؟

ان تینوں سوالوں کے جواب یہ ہیں:

الف) 'مغاضبا' سے مراد حضرت یونس علیہ السلام کا ان کی قوم پر غم وغصہ تھا۔ جس شخص نے سالہا سال بڑی دل سوزی سے اپنی قوم کو راہ

---

[۱] اس بحث کی تفصیل کتاب ''البداء فی الکتاب و السنة'' میں مطالعہ فرمائیں۔

[۲] مدرک سابق

سعادت کی دعوت دی ہو اور صرف دو آدمی اس پر ایمان لائے ہوں، ایک عابد اور دوسرا عالم، تو ان حالات میں غم وغصہ ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہر طرح گناہ سے معصوم ہوتے ہیں تاہم ان کے بشریت کے پہلو بھی مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔

بڑی نادانی اور ناسمجھی کی بات ہوگی اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ اس کلمہ سے مراد یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ پر ناراض تھے کہ اللہ نے ان کی قوم پر عذاب کیوں نہ نازل فرمایا۔ اس طرح کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے خلاف تہمت اور سوء ظن کے سوا اور کچھ نہیں۔[1]

ب) 'فظن ان لن تقدر عليه' سے مراد یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا خیال تھا کہ ہم ان پر زندگی تنگ نہیں کریں گے۔ 'نقدر' آیت میں 'قدر' سے ہے، جس کے معنی سختی اور تنگ کرنے کے ہیں، جیسا کہ ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰـهُ اللّٰهُ ۭ (طلاق: ۷)

''وہ شخص جس پر زندگی تنگ ہو جائے اس سے جو خدا نے اسے دیا ہے (وہ حدامکان میں) خرچ کرتا ہے۔''

اسی طرح دوسرے موقع پر فرماتا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ (اسراء: ۳۰)

''اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کے رزق کو وسیع کرتا اور تنگ بھی کر دیتا ہے۔''

اس لحاظ سے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ اپنی قوم پر غضبناک تھے تو انھیں چھوڑ دیا اور خیال کیا کہ ہم ان پر عرصہ حیات کو تنگ نہیں کریں گے۔[2]

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ 'نقدر' مادہ 'قدر' سے تنگی کے معنی میں ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح حضرت یونس علیہ السلام کے ذہن میں یہ گمان پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان پر تنگی مسلط نہیں فرمائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ کام کیا تھا کہ انھوں نے اس علاقہ کو انتہائی عجلت اور سرعت سے خیر باد کہہ دیا، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ آخری لمحہ تک اسی جگہ توقف کرتے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنی قوم کی سرزمین کو چھوڑ دیا، دریا کی طرف چلے گئے اور کشتی پر سوار ہو گئے۔

اس طرح اس سرزمین کو چھوڑ دینا عملی طور پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کا یہ فعل ان کے مقام وموقع کے اعتبار سے بالکل مناسب تھا اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ ہرگز عرصہ حیات ان پر تنگ نہیں فرمائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کا گمان فکر واندیشہ کے طور

---

[1] تنزیہ الانبیاء ص ۱۰۲

[2] یہ تفسیر حضرت امام رضا سے منقول ہے جب مامون نے آنجناب سے اس آیت کے معنی دریافت کیے۔ نور الثقلین، ج ۴

پر ان کے قلب وذہن میں نہیں آیا تھا لیکن ان کا طریق کار اس اندیشہ کی غمازی کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تصور کے مطابق صورت حالات پیدا نہیں کرے گا۔

اس قسم کا بیان فارسی زبان میں بھی مثالیں رکھتا ہے۔ مثلاً کوئی سالخوردہ ضعیف بوڑھا جس کا آفتاب زندگی غروب ہونے کے قریب ہو اور وہ ہر طریقہ سے مال ومنال کے حصول میں مصروف رہے تو ہم کہتے ہیں ''وہ خیال کرتا ہے کہ کبھی نہ مرے گا۔'' لازماً یہ اندیشہ اس کے ذہن میں ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کو موت نہ آئے گی تاہم اس کا عمل اس خیال کی پختگی کی علامت ہوگا۔ حضرت یونس کا عمل بھی اسی نوعیت کا تھا۔

اس طرح سے اپنے علاقہ کو ترک کر دینا اولیاء اللہ کے مقام کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ جو حضرات مظاہر رحمت حق تعالیٰ اور فیض پروردگار کا ذریعہ ہوتے ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ تعلق اور مہر ومحبت رکھیں۔ لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام کا یہ عمل وہی ہے جس کو اصطلاح علماء میں ترک اولیٰ کہتے ہیں۔

ج) 'الظالمین' سے کیا مراد ہے جن میں حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے آپ کو قرار دیا؟

'ظلم' لغت عربی میں 'وضع الشئ فی غیر موضعه' کو کہتے ہیں۔ یعنی انسان کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جس کے بارے میں صحیح یہ ہو کہ اس کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔ نفوس وناموس اور اموال میں زبردستی وتجاوز کو اسی لیے ظلم سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ بے محل اور بے جا کام ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کا عمل ان کے مقام کے شایانِ شان نہ تھا۔ رحمت ومہربانی کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام ان کے درمیان رہتے اور جہاں تک ممکن تھا ان کی امداد فرماتے۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے اپنے علاقہ کو ترک کر دیا اور اپنی قوم کو ایک بے چرواہے کے ریوڑ کے طور پر چھوڑ دیا۔ یہ کام ہرگز ان کے مقام سے متناسب نہ تھا، اگرچہ انھوں نے احسن طریقہ ہی سے اپنے فرض کو انجام دیا ہو۔

"الظالمین" کی تفسیر کے دو اور احتمال

۱: خداوند عالم سورۂ قلم میں اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر صابر وشاکر رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿٤٨﴾

(قلم: ۴۸)

''اللہ کے حکم پر صابر وشاکر رہو، مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے ہمیں اس وقت پکارا جب وہ غصہ میں تھا۔''

یہ آیات ایک طرح سے واضح کر رہی ہیں کہ خداوند عالم کی جانب سے حضرت یونس علیہ السلام کو ملامت کا سبب مصائب مشکلات اظہارِ بے صبری اور آخر کار اپنی قوم کے لیے عذاب کا طلب کرنا تھا۔ اسی لیے خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نصیحت کر رہا ہے مبادا کہ آپ کا جام صبر بھی لبریز ہو جائے، عنان صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے اور اپنی قوم کے لیے عذاب طلب کرنے لگیں۔ یہ حقیقت 'اذ نادی' کے جملہ پر غور کرنے سے خوب واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یونس نے ہمیں قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے پکارا، جبکہ وہ غصہ کے عالم میں تھے۔[1]

لہٰذا ان سے جو ترک اولیٰ سرزد ہوا وہ ان کی قوم پر نزول عذاب کی درخواست تھی حالانکہ ان کے مقام کا تقاضا تھا کہ زیادہ سے زیادہ صبر اور مزید شکیبائی سے کام لیتے۔

۲: چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملامت کی علت ایک تیسری چیز تھی۔ وہ یہ کہ وہاں سے نکل جانے کے بعد انھوں نے اپنی قوم کی کیفیت کے بارے میں ٹوہ لگائی اور مطلع ہوئے کہ قوم سے عذاب ہٹا دیا گیا ہے۔ (شاید وہ قوم کی توبہ وایمان سے آگاہ نہ تھے) اس خبر سے انھیں بہت غصہ آیا اور وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر نہ گئے۔[2]

بہر حال ان کی ملامت کا سبب درج ذیل تین امور میں سے ایک ہو سکتا ہے:

الف) اس مقام کو وقت سے پہلے ترک کر دیا اور اپنی قوم کے ساتھ ممکنہ وقت تک توقف نہ کیا۔

ب) ان کا جام صبر لبریز ہو گیا اور اپنی قوم کے لیے عذاب طلب کر بیٹھے۔

ج) اپنی قوم کی حالت کی ٹوہ لگائی اور معلوم کر لیا کہ ان سے عذاب کو ہٹا لیا گیا ہے رکھتے ہوئے چونکہ ان کی توبہ وایمان سے آگاہ نہ تھے اپنی قوم پر غم وغصہ دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان میں سے کوئی بھی سبب ملامت ہو، وہ فعل حرام نہ تھا اور نہ ہی نہی الٰہی کا مورد تھا۔ لہٰذا طبعاً یہ صرف ایک ترک اولیٰ تھا جو حضرت یونس علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا۔

آخری سوال جو ان کے بارے میں واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ قرآن حضرت یونس کے عمل کو اس غلام کے عمل سے تشبیہہ دیتا ہے جو اپنے آقا سے فرار کر رہا ہو، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (صافات: ۱۴۰)

''جبکہ اس نے ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا۔''

---

[1] ہرگز یہ تصور نہ کرنا چاہیے کہ ندا کے معنی اس میں وہی ہیں جو آیہ فنادی فی الظلمات ان لا الہ الا انت میں ہیں بلکہ وھو مکظوم کے قرینہ سے اس کا تعلق اپنی قوم پر عذاب کی درخواست ہے۔

[2] بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۴۰۰

لغت عرب میں اباق ایسے غلام کے فرار کو کہتے ہیں جو اپنے مولا و آقا سے بھاگ رہا ہو۔ طبعاً حضرت یونس کا عمل اسی نوعیت کا حامل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کے دریا کی طرف چلے جانے اور اپنے علاقہ عمل کے ترک کرنے کو، اس ذمہ داری کے پیش نظر جو ان کے ذمہ تھی، ایک غلام کے اپنے مولا و آقا سے فرار کے مترادف جانا ہے۔ یہ کیفیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اپنے فرض سے مختلف، اگرچہ الزام کے طور پر نہ سہی، بری بات متصور ہوگی اور ملامت کی مورد قرار پائے گی۔

قرآن میں مقامات انبیاء علیہم السلام

منکرین عصمت انبیاء علیہم السلام کے اہم ترین شبہات اور بڑے بڑے دلائل صحیح ترین الفاظ میں یہی آیات قرآن تھیں جن کا فصل سابقہ میں تجزیہ پیش کیا گیا اور تفسیر کی گئی ہے۔ہم نے واضح کر دیا ہے کہ متذکرہ آیات میں عصمت انبیاء کی نفی میں کوئی دلائل نہیں پائے جاتے۔

اس موضوع پر ایک سلسلہ آیات ہے جو ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ان میں سے بعض آیات بظاہر پہلی نظر میں سابقہ ذکر شدہ آیات کی طرح آنحضرتؐ کی عصمت کے حق میں نہیں جا تیں۔آیات کا یہ مجموعہ ایک طرف تو ایک خاص قسم کی وسعت کا حامل ہے اور دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ ہم اس مجموعہ، یعنی تفسیر موضوع کی چھٹی جلد میں ''محمدؐ در قرآن'' کی بحث میں اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آیات کے اس سلسلہ کی ہم چھٹی جلد میں ہی وضاحت کریں اور اس عظیم شخصیت کی تمام خصوصیات، جن کی طرف قرآن میں خصوصی طور پر اشارہ کیا گیا ہے، کو یکجا کردیں۔تاہم بعض خام خیالیوں کی تلافی کی خاطر جن کا مخالفین عصمت نے انبیاء واولیاء کے بارے میں اظہار کیا ہے، ہم مقام انبیاء واولیائے خدا کی قرآن کی نظر میں تشریح کرتے ہیں تاکہ اس ذریعہ سے ہم ان کی قوت روحانی اور ان پر اللہ تعالیٰ کے الطاف کا ادراک کرسکیں۔

منزل اعجاز میں انبیاء واولیاء خدا کی قدرت نمائی، کرامات کی شکل میں خطاء وگناہ کے خلاف ان کی عصمت و بزرگی کی ایک اور علامت ہے۔اللہ تعالیٰ کی مشیت حکیمانہ کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی قوتیں صرف ان حضرات پاک ومنزہ میں قرار پائیں جو ہر طرح کے گناہ سے محفوظ ہوں تاکہ وہ ان سے مشروع موارد کے علاوہ اور کسی جگہ بہرہ مند نہ ہوسکیں۔

تاریخ بشریت ایسے افراد کی خبر دیتی ہے جنھوں نے اپنے علم ودانش کے مقامات ومواہب کے برقرار رکھنے کے لیے اپنے علم کا مول ڈالنا شروع کردیا اور شہرت ودولت کے پیچھے پڑ گئے۔نتیجتاً ان کے علم ودانش انکے لیے وبال جان وایمان بن گئے۔بے مہار فضیلت وقدرت سعادت کے لیے مصیبت اور بدبختی کی بنیاد بن جاتے ہیں چہ جائیکہ وہ الطاف عظیم اور بزرگ قوتیں حاصل ہوں جو حضرات یوسف، موسیٰ، داوٗد اور سلیمان علیہم السلام کو حاصل ہوئیں۔اگر ان میں نفسانی کمالات اور عصمت جیسی اپنے اوپر قابو پانے کی قوت نہ ہوتی تو عام افراد پر اس قسم کی قوت کا عطا ہونا نہ قرین مصلحت ہوتا اور نہ ہی عمل حکیمانہ قرار پاتا۔

اسی لیے انبیا کی قدرت نمائی اور ان کے منزل معنوی، جو ان کی ولایت تکوینی کا حصہ ہوتے ہیں، غیر مستقیم طور پر ان کی عصمت کی ایک دلیل کی جانب ہماری رہبری کرتے ہیں۔لہٰذا ہم کتاب کے اس حصہ کو اللہ تعالیٰ کے انبیاء ورسل کے مقامات کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔

انسان کی مخفی قوتیں

مدت مدید سے عقلمند انسان نفس انسانی کی مخفی قوتوں کی موجودگی سے آگاہ ہو چکے ہیں۔اگر انسان ان قوتوں کے صحیح استعمال سے آشنا ہو جائے تو وہ حیرت انگیز خارق العادت افعال کے ایک سلسلہ کا موجد ہوسکتا ہے۔یہ ایسے افعال ہوں گے جن کی علوم ودانش بشری کے

ذریعہ کسی طرح تشریح و توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ انسان ان قوتوں کے حصول کی خاطر سنگین و شدید قسم کی ریاضتوں سے گزرتے ہیں یا ایسے درویش حلقوں سے کیفیت وجدان حاصل کر کے منازل ترقی پاتے ہیں جن کے افراد بعض حالات میں خود جذب کی حالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں ریاضت کش افراد اور بعض خانقاہوں میں زندگیوں بسر کرنے والے درویش خارق العادت افعال کے ایک سلسلہ کے عامل نظر آئیں گے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ملک ایران میں 'قادریہ' حلقہ کے درویش وجد و سماع کی محفلوں میں سینکڑوں تماشہ دیکھنے والوں کے سامنے خارق العادت افعال کر کے دکھاتے ہیں۔ مثلاً کوئی درویش تیز نوک والی سیخ اپنی آنکھ میں چبھو لیتا ہے، کوئی تیز خنجر سے اپنی ناک کاٹ لیتا ہے، کوئی بڑی سی سوئی سے اپنے ہونٹ سی لیتا ہے، کوئی تلوار سے اپنے پہلو میں شگاف ڈال لیتا ہے، کوئی مٹھی بھر پتھر یا ڈھیلے کھا جاتا ہے، کوئی بوتل توڑ کر اس کا شیشہ نگل لیتا ہے، اسی طرح بجلی کی مثبت و منفی تاروں کو ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔

جو لوگ ان افعال کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے ان لوگوں کو ساحر، جادوگر، ماہر شعبدہ باز، بازی گر، اعجوبہ، دیوانہ، مومن یا اللہ کے خاص بندہ کا نام دیتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کا تعلق ان میں سے کسی سے بھی نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ تمام حالات و کیفیات میں سب کچھ کرنے پر قادر نہیں ہوتے بلکہ عملیات کے ایک سلسلہ کی بجا آوری کے بعد جو روح کے عالم طبیعت سے انقطاع یا بے توجہی کا باعث ہوتا ہے، اس قسم کے افعال کو انجام دے سکتے ہیں۔ یہ لوگ خاص حالات کے تحت روح کی مخفی قوت پر قابو پا کر اس قوت سے ایسے افعال کی انجام دہی میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جونہی کہ وہ مخصوص حالات بدل جاتے ہیں تو اس مخفی قوت سے ان کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اور پھر وہ ان افعال کا معمولی سا نمونہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔

سوچنا یہ ہے کہ وہ حالات اور مواقع کیا ہیں جن سے انھیں یہ قدرت و قوت حاصل ہوتی ہے اور ان کو اس قوت کے مرکز سے ملاتے ہیں؟ ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے اور یہ ہمارے موضوع سے باہر بھی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اگر آپ قریب سے دیکھیں اور ان سے رابطہ قائم کریں تو عین ممکن ہے کہ آپ ان عوامل سے آگاہ ہو جائیں جو اس قوت سے استفادہ کرنے میں معاونت ہوتی ہیں۔ تاہم جو کچھ بھی ہو، یہ دونوں گروہ (ریاضت گزار اور درویش) ایک خاص قسم کی ریاضت یا عملیات کی مدد سے اپنے اندر جھانکنے، مادی دنیا سے بلند تر فکر سے رابطہ کرنے، عالم طبیعی سے اپنا رابطہ منقطع کرنے، بدن سے انقطاع فکر کی تحریک پیدا کرنے اور تند و تیز کیفیات یا رقص آور نواہائے موسیقی کی مدد سے بلندی وارتقائے وجدان کو حاصل کر لینے اور ایک طرح سے مادی عالم سے اپنے رشتہ کو توڑ لینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ موقع ہوتا ہے جب مخفی روحانی قوت خارق العادت عملیات کے لیے میدان پیدا کرتی ہے اور ایسے افعال کو انجام دینے لگتی ہے جن کو مختلف مواقع پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کے آئین مقدس میں اس مخفی قوت سے آشنائی یا اس سے رابطہ بذریعہ ریاضت قطعی حرام اور فطرت کے متضاد ہے۔ اسلام میں وجد و سماع و شور و جذب کے جلسوں کا انعقاد قطعی ممنوع ہے اور ان کی حرمت پر تاکید ہے، اگرچہ اکثر درویش اپنے ان اشغال کو مقدس ناموں سے تعبیر کرتے ہوئے شور و جذب کے مرحلہ اول سے آخری مرحلہ تک 'مراقبہ'، 'کمال عبودیت'، 'ذکر آزاد' وغیرہ جیسے الفاظ سے استفادہ کرتے ہیں

حالانکہ ان تمام کیفیات میں کوئی بھی کیفیت جذبہ الٰہی یا شعلہ معنوی نہیں کہلا سکتی جوان کے دل میں پیدا ہوا ہو بلکہ ہوتا صرف یہ ہے کہ وہ اپنی توجہ کو جسم سے کم کرتے اور عملیات روحانی کے میدان کو وسیع کرتے ہیں۔

دراصل اس قوت روحانی پر تسلط پانے کا صحیح راستہ عبودیت اور بندگی خدا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی نفس انسانی کو عجیب قدرت وقوت بخشتی ہے اور اسے افعال خارق العادۃ کے ایک سلسلہ پر مسلط کر دیتی ہے۔ یہ وہ مطالب ہی جن پر اس حصہ کتاب میں تحقیق و تدقیق کے مراحل طے کیے جائیں گے۔

ان دونوں قسم کے اختیار و تسلط میں جو فرق ہے اسے ایک اور حصہ میں بیان کیا جائے گا۔ کسی شخص کو نہ چاہیے کہ تسلط و اختیار کی ان دونوں اقسام کو ایک ہی تسلسل میں قرار دے۔ ریاضت کرنے والے لوگوں کے عملیات کے بیان سے ہمارا مقصد صرف ایک ذہنی تقریب کے اظہار سے زیادہ نہیں ہے۔[۱]

فطرت میں تصرف

اسلامی فلاسفروں نے روحانی ونفسانی قواء کے سلسلہ میں عالم فطری میں امکان تصرف پر عمدہ اور جالب نظر بحثیں کی ہیں جن کے ایک حصہ کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

۱: 'شیخ الرئیس' عظیم اسلامی فلاسفر فرماتے ہیں کہ اگر کسی عارف سے آپ کو یہ خبر ملے کہ وہ اپنی قوت سے کوئی ایسا کام انجام دے سکتا ہے، کسی چیز کو متحرک کر سکتا ہے، یا خود کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو دوسروں کی قوت سے باہر ہو تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار نہ کرو کیونکہ اگر آپ فطری طریقے استعمال کریں تو اس مقصد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔[۲]

۲: 'شیخ اشراق' فرماتے ہیں:

اگر عالم بالا سے نفس انسان پر متواتر، پے در پے مدد پہنچنے لگے تو تمام عالم اس کا مطیع ہو جائے گا اور اس کی دعا مستجاب ہو گی۔ ایسا نور جو عالم بالا سے نفوس انسانی پر منعکس ہوتا ہے وہ علم وقدرت کی اکسیر ہے، تمام عالم اس کے ذریعہ انسان کا مطیع ہو جاتا اور نفوس میں اس سے خلاقیت کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔[۳]

---

[۱] روزنامہ کیہان نے اپنے ایک شمارہ میں ایک مبسوط مقالہ خارق العادۃ کاموں کے سلسلہ میں درویشوں کے ایک گروہ کی تفصیلات کے ساتھ چھاپا ہے۔ (کیھان، ۱۶ بہمن ۵۴ ۳ شمارہ مسلسل ۹۷۸۱۔

[۲] اشارات جلد ۳، نمط دہم، ص ۳۹۷۔ "اذا بلغک ان عارفا اطاق بقوته فعلا او تحریکا او حرکة یخرج عن وسع مثله فلا تتلقه بکل ذالک الاستنکار فلقد تجد الی سببه سبیلا فی اعتبارک مذهب الطبیعة"

[۳] حکمت اشراق، مقالہ ۵

۳۔ ''صدرالمتالہین'' مرحوم فرماتے ہیں:

''انبیاء علیہم السلام کے معجزات وکرامات تین اصولوں پر قائم ہیں جن میں پہلی اصل ''قدرتِ روحی'' کہلاتی ہے جو عالم مادہ کو اپنی تسخیر کے ماتحت لے آتی ہے۔

ان تمام اقوال کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہوجائے کہ تکوین میں تصرف کا مسئلہ، جس کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں ''ولایت تکوینی'' کہتے ہیں، ایک دیرینہ مسئلہ ہے جو ہمیشہ علماء کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اصول علم کی بنیاد پر قائم ہے۔فطرت میں امکان تصرف کے مخالفین نے کسی موقعہ پر بھی ان علماء کے نظریات کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ عوام کے جذب تخیل کی خاطر اسے تصوف کی غلط اصطلاح دے دی ہے۔انھیں یہ معلوم نہیں کہ مشرق میں اگر عالم کہلانے کے کچھ لوگ مستحق ہوسکتے ہیں تو وہ یہی پیشوا یا ان جیسے دوسرے افراد ہیں جن کے عظیم علمی افکار پر عالم بشریت بجاطور پر فخر کرسکتا ہے۔

ہمارے مباحث کی بنیاد چونکہ ان مسائل میں آیات قرآن مجید سے تشکیل پاتی ہے لہٰذا ہم اپنی بحث کو اسی راہ پر چلائیں گے اور فلسفیانہ، تجرباتی اور مشاہداتی مباحث کو جو سینکڑوں لوگوں نے پیش کی ہیں، کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔قرآن کی رو سے اس تحقیق کے ساتھ ساتھ کچھ اور دلائل کا بھی، جنکا ان حضرات کی عصمت سے تعلق ہے، اضافہ کرتے ہیں۔

ولایت تشریعی وتکوینی

اس حصہ میں موضوع گفتگو عظیم رہبروں اور اولیائے الٰہی کے معنوی مقامات، روحانی قدرتوں اور قانونی ورسمی مناصب کی وضاحت ہے۔

علمی کتب میں اولیائے خدا کے معنوی مقامات کو'ولایت تکوینی' اور ان کے مناصب رسمی کو'ولایت تشریعی' کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ایران کی درسگاہیں اپنا کام شروع کرتیں اور فارسی زبان کے احیاء پر غور کرتیں صحیح تر الفاظ میں اس کی وسعت کی فکر پیدا کرتیں، اس ملک کے عوام لفظ ولایت کو ماضی کی حکومت (ریاست) اور آج کل کے صوبہ جات (استان) کی جگہ استعمال کرتے تھے اور صوبہ کے حاکم کو'والی' (گورنر) کہتے تھے۔

جو لوگ فقہی مسائل سے کسی قدر واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ باپ یا دادا چھوٹے بچے پر ولایت شرعی رکھتا ہے اور شارع مقدس کی طرف سے اس کو اختیار حاصل ہے کہ بچہ سے متعلق اموال یا دیگر امور میں تصرف کرے۔

ایک باپ کنواری بیٹی پر ولایت شرعی رکھتا ہے اور اس کی شادی باپ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔اسی طرح سب جانتے ہیں کہ حاکم شرع عمومی اموال مثلاً سرکاری زمینوں زکوٰۃ اور خمس پر ولایت شرعی رکھتا ہے اور امام علیہ السلام کے زمانہ میں ان تمام امور کی ولایت خود آنجناب کے اختیار میں ہوتی ہے جبکہ زمانہ غیبت امام میں یہ ولایت مجتہد جامع الشرائط کے قبضہ میں ہوتی ہے۔

یہ مثالیں اس لیے پیش کی جارہی ہیں کہ ثابت ہوجائے کہ عام لوگ اکثر ان الفاظ سے واقف ہیں اگرچہ وہ ان کے دقیق معانی نہ بھی جانتے ہوں۔

عام طور پر لفظ 'ولایت' (واؤ کے نیچ زیر کے ساتھ) دوستی کے معنی میں اور ولایت (واؤ پر زبر کے ساتھ) سرپرستی اور اختیار پر تصرف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[1] کبھی کبھی دونوں لفظ دونوں معنی بھی دیتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مندرجہ بالا مثالوں میں 'ولایت' سے مراد اس کے موخر الذکر معنی ہیں یعنی تصرف بر تسلط واختیار۔

اس بحث میں 'ولایت' کی تشریح بمعنی دوستی مراد نہیں ہے کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ اہل بیت رسالت کے ساتھ محبت ودوستی رکھنا ہم سب پر فرض ولازم ہے۔ قرآن نے ان سے محبت کو اجر رسالت قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:[2]

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ (شوریٰ: ۲۳)

''کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے قرابت داروں کے ساتھ مودت رکھو۔''

اس بحث کا مقصد صرف ان مناصب ومنازل کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاک اولاد کو تشریعی اور تکوینی لحاظ سے مرحمت فرمائے ہیں۔

ولایت تشریعی سے مراد وہ قانونی مقام ومنصب ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص کو اس کے قانونی مقام کے عنوان سے عطا ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں 'ولایت تشریعی' وہ مقرر شدہ مقام ومنصب ہوتا ہے جو اجتماعی ضروریات کی دیکھ بھال کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منتخب جماعت کو عطا فرمایا جاتا ہے جیسا کہ مقام نبوت وزعامت وغیرہ، جن کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

اس کے برعکس 'ولایت تکوینی' ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ، خواہ وہ پیغمبر ہو یا امام یا کوئی اور شخص، عبودیت وبندگی کے مراحل کو طے کر کے تکامل روحانی کے مقام کو حاصل کرتا ہے اور اپنی ذات سے خارج دنیا پر اپنا تسلط پیدا کر لیتا ہے۔[3]

تبحر علمی اور پیشوایانِ اسلام کے مقامات بلند سے تعارف کے لیے وسیع مطالعہ وعلمی واقفیت ناگزیر ہیں۔ ہماری یہ کتاب ان مباحث کی گنجائش نہیں رکھتی۔ شیعہ علماء اور بزرگوں نے اس سلسلہ میں نہایت مفید تحریریں پیش کی ہیں جن میں سے اکثر علمی زبان اور دور حاضر کے اکثر نوجوانوں کی سطح معلومات سے بلند تر تحریر کی گئی ہیں۔ عظیم شیعہ محدث ''کلینی'' مرحوم نے، جو غیبت صغریٰ کے زمانہ میں زندہ تھے اور ۳۲۹ھ

---

[1] هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ (کہف: ۴۴)

[2] البتہ بمنزلہ اجر نہ کہ بذات خود اجر کیونکہ آنحضرتؐ اور دیگر انبیاء کا اجر واقعی صرف ذات پروردگار پر ہے جیسا کہ فرماتا ہے: اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (شعرا: ۱۰۹)

[3] اس لحاظ سے ''ولایت تشریعی'' ایک وضعی ومقرر شدہ مقام ہے جس کا نتیجہ مسلمانوں کے امورِ شرعیہ پر تسلط قائم کرنا ہے ولایت تکوینی کا تعلق کمال روحانی وخصوصیت وجودی سے ہے جس کا نتیجہ ایک طرح پر کون ومکان پر تسلط ہوتا ہے۔

میں جنھوں نے وفات پائی، ''اصول کافی'' کی کتاب الحجۃ میں اس مسئلہ پر نہایت عمدہ وقیمتی احادیث پیش کی ہیں جو اسلام کے پیشوایانِ عظیم کے مقامات بلند و بالا کی وضاحت کرتی ہیں۔ اس کتاب میں جن مفاہیم وحقائق کو پیش کیا گیا ہے، ان کو سمجھنے کے لیے دقیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔

انبیاء وائمہ علیہم السلام کی ولایت تشریعی وتکوینی کا موضوع آخری زمانہ میں زبان زد عام وخاص ہو گیا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ میں بہت سے سوالات کیے جاتے ہیں اور ولایت کے بارے میں مختلف نظریات کا اظہار ہوتا ہے۔ مسئلہ عصمت پر بحث کو مکمل کرنے کے لیے اور نوجوانانِ قوم کو حقیقت سیر وشناس کروانے کے لیے ہم اختصار کے ساتھ دونوں قسم کی ولایت کو مورد تحقیق قرار دیتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم ولایت تشریعی کی اقسام کو، وہ حقیقی ہوں یا باطل، معرض بحث میں لاتے ہیں۔

۱: تشریع احکام کی تفویض

تشریع احکام کی تفوض سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''تشریع قوانین'' کا اختیار انبیاء وائمہ علیہم السلام کے سپرد کردیتا ہے تاکہ وہ خود اپنی طرف سے جس کو چاہیں حلال اور جسے چاہیں حرام قرار دے دیں۔ دوسرے لفظوں میں تشریع کا اختیار ان کے ارادہ وخواہش کے محور کے گرد گردش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ مقام ومنصب وتشریع کے تمام پہلوؤں کو ان کے سپرد فرمادیتا ہے۔

ان معنی میں ولایت تشریعی نہ صرف یہ کہ ثابت نہیں ہوتی بلکہ آیات قرآنی اور احادیث اسلامی اس قسم کے تسلط واختیار کو انبیاء وائمہ علیہم السلام کے لیے صحیح قرار نہیں دیتیں۔ مثلاً مشرکین کا اصرار تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مضامین قرآن میں تغیرات کو راہ دیں۔ اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہہ دیں کہ:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮

(یونس: ۱۵)

''میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں اور عظیم دن کے عذاب سے جو گنہ گاروں کو دامن گیر ہوگا، بہت ڈرتا ہوں۔''

جب مشرکین آنحضرت کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو قرآن مجید نے حکم دیا کہ ان کے جواب میں کہہ دیں:

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم: ۳)

''جو کچھ میں کہتا ہوں وحی الٰہی ہے جو مجھ پر نازل ہوتی ہے۔''

اس قسم کی سپردگی واختیار کا بے بنیاد ہونا اس قدر واضح وروشن ہے کہ کسی بحث کا محتاج نہیں۔ آیات قرآن مجید اور بہت سی روایات شاہد ہیں کہ تشریع احکام صرف ذات باری تعالیٰ کی جانب سے ہے اور یہ منصب اللہ تعالیٰ نے کسی کے سپرد نہیں فرمایا۔

''ولاایت تشریعی'' کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چند ایک امور میں اپنے پیغمبرؐ کی درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور

انھیں اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس بات کی تصدیق آنحضرتؐ کی عصمت کے پیش نظر چنداں مشکل نہیں اس لیے کہ آنحضرتؐ درستی و راستی کے دائرہ سے ہرگز قدم آگے نہیں بڑھاتے اور مصالح و مفاسد کی اچھی طرح تشخیص فرماتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے اس قدر مزید کہنا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند امور میں احکام کے ایک سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے تشریع کی درخواست کی جس کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی عظمت و بزرگی کے پیش نظر قبول فرمایا۔ اگر اس سلسلہ میں صحیح روایات موجود نہ ہوتیں تو آنحضرتؐ کے لیے ان معنی میں ولایت تشریعی ہرگز ثابت نہ ہوسکتی، لیکن ''محدث کلینی'' مرحوم نے اصول کافی میں اس سلسلہ میں روایات نقل کی ہیں جن میں سے چند ایک کو ہم نقل کرتے ہیں۔[1]

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خداوند عالم نے ایک شب و روز میں پانچ دو رکعتی نمازیں واجب فرمائی ہیں۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر و عصر و عشاء کی ہر نماز کے ساتھ دو رکعت اور نماز مغرب کے ساتھ ایک رکعت کا اضافہ فرما دیا۔ یہاں 'فرض اللہ' اور 'فرض النبی' کا مسئلہ سامنے آیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس بات کو قبول فرمایا۔ آنحضرتؐ نے روزانہ نوافل کو ۳۴ رکعت مقرر فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی قبول فرمایا۔ خداوند عالم نے ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے واجب قرار دیئے۔ لیکن آنحضرتؐ نے ماہ شعبان کے روزے اور ہر ماہ میں تین دن کے روزوں کو مستحب قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام کیا، لیکن آنحضرتؐ نے ہر مست کرنے والی شے کو حرام قرار دیا''............وغیرہ

ان تمام احکام میں ''ولایت تشریعی'' خاص حدود کے اندر جو اس کو حاصل ہیں، انہی معنی میں ہے جن کا ذکر ہوا، یعنی آنحضرتؐ نے درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ آنحضرتؐ کا کام، سوائے ایک درخواست کے، وہ بھی اجازت کے انتظار کے ضمیمہ کے طور پر اور کوئی چیز نہ تھی یا یہ کہ صرف اتنے موارد میں آنحضرتؐ کو اختیار تفویض کیا گیا جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

۲: سیاسی و اجتماعی اختیارات

''ولایت تشریعی'' کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شارع مقدس کی حیثیت سے مسلمانوں کے سیاسی رہنما اور اجتماعی رہبر ہیں۔ آنحضرتؐ کے اس میدان میں وسیع اختیارات کے بارے میں متعدد آیات گواہی دیتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء: ۵۹)

---

[1] اصول کافی، ج ۱، ص ۲۶۵، باب التفویض الی رسول اللہؐ۔

''اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے درمیان اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

اسی طرح فرماتا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ (احزاب: ۶)

''پیغمبرؐ مومنین پر ان کے نفسوں سے زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔''

ان وسیع اختیارات میں ایک اسلامی معاشرہ میں عدالت کا ادارہ تھا۔ آنحضرتؐ اپنی حیات طیبہ کے دوران خواہ بذات خود یا باہر کے مقامات پر قاضیوں کے تعین کے ذریعہ اس ادارہ کو منظم فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے امور حقوقی یا اپنے جھگڑوں میں آنحضرتؐ کے فیصلوں کو بلاحیل وحجت قبول کریں۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾ (نساء: ۶۵)

''تمہارے پروردگار کی قسم! وہ کبھی بھی واقعی مومن نہ ہوں گے جب تک تمھیں اپنے موارد اختلاف میں حکم ومنصف قرار نہ دیں، تمھارے فیصلہ پر ہرگز ملول نہ ہوں اور تمھارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کردیں۔''

امورِ اجتماعی میں رہنمائی کے تقاضوں میں اسلام کے مالی واقتصادی امور بھی شامل ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ اپنی حیات طیبہ کے دوران اس کا انتظام خود فرماتے تھے۔ قرآن نے اس معاملہ میں آپ کو ذیل کے فرمان سے مخاطب کیا:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَتُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا (توبہ: ۱۰۳)

''ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لے لو اور اس طرح انھیں پاک قرار دو۔''

دوسری آیات میں مالیات کی مقدار اور ان کے مصارف باریک بینی کے ساتھ متعین ہوئے ہیں۔

آیات وروایات کے مطابق جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں حضرت رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کی نوعیت یہ تھی کہ آپ اپنے دورِ رسالت میں مسلمانوں کے عظیم پیشوا، حاکم معاشرہ اور امت کے سیاسی فرماں روا تھے۔ جن امور کو ایک فرمانروائے مطلق انجام دیتا ہے، آپ بھی انھیں انجام دیتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپؐ کی حکمرانی اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ اللہ کی جانب سے آپ کو سپرد ہوئی تھی۔ ایسا نہیں کہ لوگوں نے آپ کو ان مناصب کے لیے منتخب کیا ہو۔

۳: معارف واحکام اسلام میں مرجعیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری امورِ سیاسی واجتماعی میں ہی منحصر نہ تھی بلکہ آنحضرت آیات قرآنی کے مطابق اس آسمانی کتاب کے معلم واستاد تھے۔[۱] مشکلات قرآن کے حل کرنے والے تھے[۲]۔ سنن واحکام الٰہی کو بیان کرنے والے تھے[۳]۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ اور نصوص قرآن کا اتفاق ہے کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات میں آپ کی گفتار ورفتار بندوں کے لیے ان کی ذمہ داریوں پر سند وحجت ہیں۔

ہم ولایت تشریعی کی ان اقسام سے جو شارع مقدس کی جانب سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین کے لیے ثابت ہوتی ہے، واقف ہو گئے۔ اس کے بعد اب ہم ولایت تکوینی کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

ولایت تکوینی

''ولایت تکوینی'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بندگی کی منازل کو طے کر کے اس قدر کمال قرب معنوی حاصل کرے کہ پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان واجازت سے جہان وانسان میں تصرف کر سکے۔

''ولایت تشریعی'' کے برعکس ''ولایت تکوینی'' ایک طرح کے ''اکتسابی'' کمال وواقعیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے بعض مراتب کے حصول کی راہ سب کے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ ''ولایتِ تشریعی کی جو منازل بیان ہو چکی ہیں، سب کی سب اللہ تعالیٰ کے کرم ولطف سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے چند مقامات کے حصول کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سوا کوئی شے اس میں دخل انداز نہیں ہو سکتی۔

'ولایت تکوینی' ایک کمال روحی ومعنوی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دانائے رموز افراد اور قوانین شرع کے زیر سایہ عمل کرنے والے انسانوں میں پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خارق العادت اعمال کے ایک مجموعہ کا منبع بن جاتا ہے۔

نہایت اختصار کے ساتھ (تشریح بعد میں پیش کریں گے) ہم یہ کہتے ہیں کہ احکام اور سنن دینی کے مطابق عمل پیرا ہونا بظاہر ایک طرف سے اجتماعی واخلاقی اصول پر عمل کرنے کے مترادف ہے، لیکن اس راہ کو طے کرنے سے انسان کے اندر ایک سلسلہ واقعیت، صفات اور کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان کی مدد سے جب کمال روحانی ایک مناسب حد تک پہنچ جاتا ہے تو نفس انسانی اس عالم میں درج ذیل امور کی انجام دہی پر قادر ہو جاتا ہے:

---

[۱] يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورۂ جمعہ: ۲) ''ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

[۲] وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (نحل: ۴۴)

''ہم نے آپ کے لیے ذکر (قرآن) کو بھیجا تا کہ جو کچھ ہم نے نازل کیا ہے اس کو لوگوں میں بیان کر دیں۔

[۳] وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر: ۷)

''جس بات کا رسول حکم دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اسے چھوڑ دو۔''

۱: جہان وانسان میں تصرف

۲: ضمائر وقلوب کی واقفیت جو علم غیب کا حصہ ہے۔[۱]

۳: انسان کے اعمال پر ان لوگوں کی شہادت جو اس لطف پروردگار کے حامل ہیں اور جن کو قرآن مجید ''شہداء'' کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ باقی یہ بات کہ اعمال پر شہادت سے کیا مراد ہے تو یہ ایک بالکل الگ بحث ہے۔

اس کے باوجود عملی طور پر ہماری گفتگو کا مرکز تکوین میں تصرف ہی ہے۔اس مقصد کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ مقدمہ کے طور پر ہم کسی قدر روح انسانی کی عظمت اور قوتوں کے بارے میں جو انسان کی روح و نفس میں مخفی ہیں، مختصر بحث پیش کریں۔

عالم آفرینش میں تصرف

انسان دو اجزاء یعنی جسم اور نفس ناطقہ کا مرکب ہے۔دوسرے لفظوں میں اس طرح کہیے کہ انسان کی انسانیت صرف جسم و بدن میں ہی منحصر نہیں بلکہ انسان باطن اور جان رکھتا ہے جو اس کی واقعیت و اصلیت کو تشکیل دیتی ہے۔انسان کی تکمیل اور ارتقاء کی راہ میں جسم و مادہ کے لحاظ سے کچھ حدود پائی جاتی ہیں اور انسان کی پیش رفت بلحاظ مادہ بالکل محدود اور اندازہ کے مطابق واقع ہوتی ہے، لیکن روح و معانی کے اعتبار سے انسان کی راہِ تکمیل میں اس طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لحاظ سے انسان اپنے اندر ترقی و ارتقاء کے لیے کافی سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے اور بعض اوقات تو وہ اطاعت پروردگار کے زیر سایہ راہِ حق پر چلتے ہوئے انتہائی بلند چوٹیوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

ریاضت گزار انسانوں کے تعجب خیز کارنامے جو ایک عام انسان کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں، اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کے اندر عجیب و غریب قوتیں کارفرما ہیں جو مخصوص حالات میں ظاہر ہوتی اور بروئے کار آتی ہیں۔یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ایک نگاہ سے ٹھنڈے پانی کو جوش میں لے آتے ہیں، میز کو ہاتھ لگائے بغیر زمین سے بلند کر لیتے ہیں، انسان کو فضا میں معلق رکھتے ہیں، رسی کو ہوا میں اچھال دیتے ہیں اور وہ وہیں معلق ہو جاتی ہے، سبزہ جس کو اگنے میں دو ماہ درکار ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنی قوت یا ارادہ سے اسے دو گھنٹہ میں اگا دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔[۲]

ممکن ہے ہمیں ان تمام امور میں شک و تردد ہو لیکن اجمالی طور پر ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر کوئی انسان اپنی روح کی تربیت کر لے تو وہ تعجب خیز نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔اگر اس دنیا میں کچھ لوگ محیر العقول کام انجام دے لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کم خوری و کم خوابی (تھوڑا کھانا اور کم سونا) انسان کی توجہ کو جسم و بدن کی طرف کم کر دیتے ہیں۔اس طرح انسان کی روح کو مہلت مل جاتی ہے کہ اپنی مخفی قوتوں کی تربیت کرے اور زیادہ سے زیادہ روحانی قوت مہیا کرے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسم کی طرف توجہ اور روحانی اقدار کی طرف توجہ دو مختلف چیزیں ہیں جب کوئی شخص اپنے جسم کی طرف متوجہ ہو جائے اور اپنے آپ کو جسمانی لذات اور مادی شہوات کے سپرد کر دے تو یہ جسمانی پرورش

---

[۱] اس سلسلہ میں اسی مولف کی کتاب ''آگاہی سوم'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۲] سالنامہ نورِ دانش، ۱۳۲۵

اس کو باطنی قوتوں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی اور نہ ہی روحانی ومعنوی تکمیل یا روحانی قواء کی پرورش کرنے کا جذبہ پیدا ہونے دیتی ہے۔ تاہم اگر انسان مادی امور اور لذائذ جسمانی کی طرف اپنی توجہ کم کردے، اپنے اندرونی رجحان اور باطن کی طرف زیادہ رجوع کرے تو پھر وہ اپنی مخفی قوتوں کو ظاہر کر سکتا ہے اور اپنی قوت وتوانائی کو بڑھا سکتا ہے ریاضتیں کرنے والے بہت سی شدید ریاضتوں کی مدد سے، جو اسلام کے مقدس آئین نے حرام قرار دی ہیں، اپنے آپ کو اقدارِ جسمانی سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی ریاضتیں جو آئین اسلام کی رو سے حرام ہیں، اس قدر شدید اور تکلیف دہ ہوتی ہیں کہ عام انسان ان کا ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ خود ایسی ریاضت کرنے والے بھی اس راہ میں بتدریج اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں اور ان کے زیادہ سے زیادہ عادی ہوکر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ یہ لوگ عمر کا ایک حصہ کمر کو جھکائے ہوئے گزارتے ہیں یا دونوں ہاتھ باندھ کر زمین پر آہستہ آہستہ رہنے دیتے ہیں جس سے دونوں ہاتھ ایسی حالت میں رہنے سے خشک ہوجاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی حیوانی وشہوانی قوت کو کم کرنے کے لیے چھت کے نیچے نہیں سوتے، طویل وقفوں کے روزے رکھتے ہیں، تلوار کی دھار پر چلتے اور اپنے بدن کو تیز درانتی سے کاٹتے ہیں وغیرہ۔

یہ لوگ یہ سب کام اس لیے کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو علائق مادی اور قوانین فطرت کے تسلط سے آزاد کرلیں اور امورِ مادی کی طرف توجہ کو کم کرکے اپنی روح کے لیے ایسے مواقع پیدا کریں کہ وہ اپنی مخفی قوتوں کی پرورش کرے۔

اس امر میں کسی بحث وگفتگو کی گنجائش نہیں کہ ریاضت گزاروں کے یہ افعال فطرت انسانی اور اسلام کے مسلّم قوانین کے خلاف ہیں کیونکہ یہ ریاضتیں جسم وجان کو ضرر پہنچانے اور ایک طرح کی رہبانیت پر مشتمل ہیں جو اسلام کے آئین نے بالکل حرام وممنوع قرار دی ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ باطنی ومخفی قوتوں کے ابھارنے اور بروئے کار لانے کے لیے اس قسم کی انسانی اقدار سے متضاد ریاضتوں کی ضرورت نہیں جو اصول آفرینش ہی کے خلاف ہوں۔ اس کے برعکس ان قوت ہائے مخفی کے شعلہ زن ہونے کے لیے دوسرا طریقہ بھی ہے جس کے بارے میں ہم آئندہ مناسب مقام پر گفتگو کریں گے۔ لیکن ان مرتاضین کے عجیب وغریب افعال مغرب کے باشندوں یا مغرب زدہ لوگوں کے لیے عجوبہ روزگار ہیں، جو مادہ کو عالم ہستی کا آخری مرحلہ سمجھتے ہیں، وجودِ ہستی کو مادہ اور قوت کے مساوی جانتے ہیں۔ ان مرتاضین کے یہ حالات ان مغرب زدہ لوگوں کے اصالت مادہ کے مفروضہ کو متزلزل کردیتے ہیں۔ ان کے لیے ثابت ہوجاتا ہے کہ عالم مادی اور توانائی کے ماوراء ایک بہت بڑا عالم مخفی وجود رکھتا ہے جو عجیب وغریب قوتوں کا مرقع ہے۔ اس عالم کی موجودات کا عمل قوانین مادی اور قوت ہائے طبیعی کا مرہون منت نہیں بلکہ یہ عالم اصول مادی پر ایک طرح کی حکومت رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ذیل کا واقعہ پیش کردیں جس نے ایک انگریز پادری کو امور غیبی کا معتقد بنادیا۔

''ہاریکن'' نامی ایک ریاضت گزار نے ہندوستان میں اپنی زبان کو الٹ رکھا تھا، اپنے لبوں کو سی کر جسم کے تمام سوراخوں کو سربمہر کر رکھا تھا۔ لوگوں نے اس کو ایک تابوت میں رکھ کر سربمہر کردیا اور قبر میں رکھ کر دن رات اس پر پہرہ دینے لگے۔

---

[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''لا رهبانية في الاسلام'' اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ نہج البلاغۃ حکمت ۲۵۳

چھ سات دن کے بعد تابوت کو قبر سے نکالا گیا، دیکھا کہ اس کی مہریں صحیح و سالم ہیں۔ اس مرتاض کو باہر نکالا گیا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں، ہاتھ پاؤں خشک تھے، کھال میں جھریاں پڑ گئی تھیں اور نبض کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کے منہ ناک اور کانوں کو کھول کر گرم پانی اس کے سر اور چہرہ پر ڈالا گیا اور مصنوعی تنفس دیا گیا، جس کے نتیجہ میں نصف گھنٹہ کے بعد وہ شخص پوری طرح بیدار ہو گیا۔[1]

یہ عمل کچھ بھی ہو، اس کو موت یا تجدید حیات کا نام دے لیں، یا اسے خواب گراں یا بہت گہری نیند کہہ لیں، کسی طرح بھی دورِ حاضر کے محدود علم انسانی کے کسی اصول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مادہ اور قوت مادہ کے عالم سے ماوراء ایک دوسرا عالم بھی ہے جس کو کوئی شے اس عالم سے مشابہت نہیں رکھتی نیز یہ کہ انسان کی شخصیت و اصلیت اس کے جسم و بدن ہی میں منحصر نہیں بلکہ انسان جسم و جان کا مرکب ہے جن میں سے ایک کے علیحدہ ہو جانے سے دوسرا ختم نہیں ہو جاتا۔

عبادت پروردگار کی قوت

روح اور نفس ناطقہ کے تکامل و ارتقاء کا صحیح ترین راستہ تعلیمات اسلامی پر عمل کرنے عبودیت پروردگار کے طریق پر چلنے اور صراط مستقیم کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے انسان دو طرح کی زندگی کا حامل ہے، ایک ''حیات ظاہری'' اور دوسری ''حیات معنوی و انسانی''۔

'حیات ظاہری' حیات حیوانی کو کہتے ہیں جس کے تمام انسان حامل ہیں۔ انسان نے ہر قسم کی افراط و تفریط کو روکنے کے لیے حیات حیوانی کے لیے ایک خاص لائحہ عمل منظم کیا ہے۔ اسلام کا لائحہ عمل نہ صرف یہ کہ مادی دنیا میں انسان کو بہترین زندگی فراہم کرتا ہے، بلکہ حیات معنوی کے تحقق کے لیے بھی اس کی راہ ہموار کرتا ہے۔

انسان کی حیات معنوی کی بنیاد اس کے اعمال و دنیا پر منحصر ہے۔ حیات معنوی کا انجام انسان کے یے سعادت و خوش بختی بھی ہو سکتا ہے اور شقاوت و بدبختی بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے حرکات و سکنات اور افعال و کردار اس کی حیات معنوی کو سنوارتے اور اس کی رحانی قوت کو ابھارتے ہیں جس کا نتیجہ انسان کی سعادت و بلندی کردار یا شقاوت و بدبختی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کے قوانین یا اقدارِ دینی اگرچہ بظاہر انفرادی مجموعہ اعمال یا اجتماعی عمل کی شکل میں سامنے آتے ہیں تاہم یہی قوانین یعنی واجبات پر عمل اور ترک محرمات روح انسانی میں کمالات پیدا کرتے اور عالم احساس کے پردہ میں انھیں ذخیرہ کرتے ہیں۔ یہی وہ روحانی اور معنوی اصلیت ہوتی ہے جو شقاوت یا سعادت پیدا کرتی ہے اور نعمت ہائے بہشت یا اذیت ہائے دوزخ کو جگہ دیتی ہے۔

ظاہری زندگی کے پیچھے (جب ظاہری زندگی اقدارِ دینی اور قوانین الٰہی سے عبارت ہو، ایک زندہ اصلیت اور حیاتِ معنوی کا وجود ہوتا ہے جو تمام خوش بختیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ اصلیت و واقعیت ہی وہ ولایت کہلاتی ہے جو افرادِ انسانی میں کم یا زیادہ کیفیت میں پائی جاتی ہے اور

---

[1] سالنامہ ''نورِ دانش'' ۱۳۲۵

جو عجیب و غریب کیفیات کے ایک سلسلہ کا سبب قرار پاتی ہے۔

کچھ لوگ اسلامی قوانین کے اسرار و رموز کو مسائل زندگی میں منحصر قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام اسلامی قوانین صرف زندگی کی خاطر وضع ہوئے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ احکام و قوانین اس کے علاوہ دوسرے نتائج کے بھی حامل ہیں جو یہ ہیں کہ انسان ان عملی و اجتماعی قوانین کے زیر سایہ اس بات کی توفیق حاصل کرتا ہے کہ اپنی روح کو صفاتِ زشت سے پاک کر کے قرب معنوی و کمال وجودی پیدا کر لے۔

انسانی عبودیت، بندگی خدا اور عبادت میں اخلاص کے زیر سایہ اپنے لیے تکمیل باطن کے ذرائع کا حامل ہے۔ یہ تکامل باطن اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ تکامل جسم و مادہ کی حدود سے باہر ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے اس معنوی تکامل کے ذریعہ اپنی کیفیت کی مناسبت سے ایسے مقامات حاصل کر لیتا ہے جنھیں وہ بعض اوقات اس عالم میں یا اپنی موت کے بعد بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

روح انسان کے جسم پر ایک براہ راست اثر رکھتی ہے۔ مثلاً خوف کے عالم میں انسان کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور خجالت و شرمندگی کے مواقع میں سرخ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے جسم کے افعال ہماری روح اور نفس ناطقہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے اعمال، ہماری روح اور نفس ناطقہ اپنے اثرات و واقعیت کو ظاہر کرتے ہیں اور صفاتِ ثابت و متغیر کے ایک سلسلہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہماری زندگی کی مستقبل کی کیفیات انھی اثرات کی مرہون منت ہوتی ہیں جو ہمارے نیک و بد اعمال ہمارے نفس میں بطور یادگار چھوڑتے ہیں۔

جو لوگ کسی طبیب کی زیر نگرانی ہوتے ہیں اور ورزش یا غذا و دوا سے متعلق اس کی ضروری ہدایات پر عمل کرتے ہیں، یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ صرف سادہ اور عام قسم کے کاموں کے ایک سلسلہ کو انجام دے رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہی ورزشیں، جب طبیب کی نگرانی کا دور ختم ہوتا ہے، تو کیا کیا اثرات ان کے جسم و روح اور نفس میں بطور یادگار چھوڑ جاتی ہیں۔ پھر جب وہ اپنے ماضی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اندر کتنے قیمتی نتائج جمع کر لیے ہیں۔

ایک بیمار آدمی اپنے طبیب کی ہدایات پر یکے بعد دیگرے عمل کرتا ہے۔ وہ بظاہر تو یہ سمجھتا ہے کہ دوائی کھا رہا ہے لیکن اس بات سے بالکل بے خبر ہوتا ہے کہ یہ دوائیاں اس کے نفس پر کون سے اچھے اثرات چھوڑ سکتی ہیں۔ لیکن جب نقاہت و کمزوری کا زمانہ ختم ہوتا ہے تو پھر اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ بیماری کے طویل عرصہ میں دوائی کے استعمال اور مخصوص غذا کھانے سے اس نے کس طرح اپنی تندرستی کا ذخیرہ کیا ہے۔

آسمانی شرائع کے قوانین اور وہ وظائف جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے متعین فرمائے ہیں، اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ عبادات و وظائف ظاہری اپنے مقام پر شارع مقدس کے ساتھ لگاؤ کے مظہر نہیں ہوتے۔ اگر اسلام نے ان عبادات و اعمال کے بجا لانے کا حکم دیا ہے تو اس کا مقصد ان فوائد و اثرات کا حصول ہے جو ان کے ذریعہ انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور اس کا سبب وہ قرب ہے جو انسان حق تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے اور اس تکمیل انسانیت کا باعث بنتے ہیں جو خداوند عالم انسان کو بخشتا ہے۔ باایمان لوگ پہلے ہی لمحہ سے کہ جب وہ احکام دین پر عمل پیرا ہوتے ہیں، لاشعوری طور پر صراط تکامل پر قدم جما لیتے ہیں اور اپنے باطن میں صفات و کمالات کو جمع کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ سب لوگوں کا کمال روحانی یکساں تو نہیں ہوگا، جن مقامات کو وہ اس راہ میں حاصل کرتے ہیں وہ بھی انفرادی طور پر متفاوت ہوں گے کیونکہ ہر شخص کا معیارِ اطاعت و بندگی بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت مرکز کمال وقدرت کا سبب ہے

اس امر میں کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس کے قرب اور اس کے احکام کی مخالفت اس سے دوری کے اسباب ہیں دیکھنا یہ ہے کہ قرب سے، جو نزدیکی کے معنی رکھتا ہے، کیا مراد ہے؟

یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ اس قرب سے مراد قرب مکانی ہے کیونکہ خداوند عالم نہ تو جسم وجسمانیت رکھتاہ اور نہ ہی اس کے لیے مقام کی کوئی خصوصیت ممکن ہے جس کے لحاظ سے انسان بطور مقام اس سے نزدیک ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہم سے خود ہماری ہی نسبت قریب تر ہے۔[1] لہٰذا اس قرب سے قرب مقامی وقربِ اجتماعی مراد نہیں ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ایک وزیر کا معاون سب سے زیادہ وزیر کے قریب اور اس کا مقرب ہوتا ہے۔ بلکہ یہ قرب 'قربِ معنوی' کی ایک قسم ہے۔ اس موقع پر لفظ 'قرب' کا استعمال ایک طرح کی مجازی کیفیت کا حامل ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ یہاں قرب مکانی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

لیکن یاد رکھیں کہ خداوند عالم سے تقرب نہ تو قرب مکانی ہے اور نہ ہی قرب اجتماعی ومجازی بلکہ ایک ایسی حقیقت کا مظہر ہے جس کو اللہ کے بندے اطاعت وعبادت اور عمل خالص کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، تکمیل درجات کی مدد سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتے جاتے اور بندہ وخالق کے درمیان فاصلوں کو کم سے کم تر کرتے رہتے ہیں۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا کیا جائے کہ اگر خداوند عالم مکان نہیں رکھتا اور اس قسم کا تقرب اجتماعی نہیں تو پھر ''قرب الٰہی''، بندہ کے مقامات بلند کے حصول اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کمالِ مطلق اور غیر محدود ہے اور راہ عبودیت وبندگی پر گامزن ہونے والے ان کمالات کے زیر سایہ جو وہ اس راہ پر چلنے سے حاصل کرتے ہیں، انجام کار کمالات جامع کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسرے لوگوں کی نسبت جو اس قسم کے کمالات نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ کے زیادہ مقرب وزیادہ نزدیک ہوجاتے ہیں۔

عالم آفرینش میں ہر شخص اپنے کمال وجود کی مناسبت سے ذاتِ پروردگار سے قرب رکھتا ہے۔ لیکن جس قدر کوئی شخص اپنے وجود کے اعتبار سے کامل ہوگا اسی قدر وہ ذات پروردگار سے، جو کمال محض اور غیر محدود ہے، قریب تر ہوگا۔

اسی لیے یہ بات مسلم ہے کہ فرشتے ان کمالات کے باعث جو انھیں حاصل ہیں، بہت سی موجوداتِ عالم کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ تقرب ونزدیکی رکھتے ہیں۔ اسی بناء پر ملائکہ میں ایک جماعت ''حاکم ومطاع'' کا درجہ رکھتی ہے اور دوسری مطیع وفرمانبردار۔

انسان جو مرتبہ وجودی کے اعتبار سے بالاتر درجات کا حامل ہے، جمادات ونباتات اور حیوانات کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ سے نزدیک تر ہے۔ اس قرب وبعد کا پیمانہ صرف کمالِ وجودی ہی ہے جو اسے مرکز کمال مطلق سے نزدیک تر لے جاتا ہے۔

---

[1] نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴿١٦﴾ (سورہ ق:١٦)

ان کمالات کے علاوہ جو بقدرِ ضرورت ہر انسان کے وجود میں پائے جاتے ہیں، انسان عبودیت و بندگی اور دینی احکام کی بجا آوری کے ذریعے بہت سے دوسرے کمالات بھی حاصلکر سکتا ہے۔ طریق بندگی اور اطاعت الٰہی طے کر کے انسان ذاتِ باری تعالیٰ کے درجات تقرب کو طے کرتا اور مرحلہ حیوانی سے آگے نکل کر فرشتگانِ خدا سے بھی بلند تر مقام کو پا لیتا ہے۔

کمال سے کیا مراد ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پروردگارِ عالم کمال مطلق اور لامحدود ہے تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ''صفاتِ جمال'' ہوتی ہیں جن کا تعلق اس کے علم، قدرت، حیات اور ارادہ سے ہے۔ جب کوئی بندہ راہِ اطاعت پر چل کر درجات کمال کی جانب قدم بڑھاتا ہے تو وہ زینہ کمال کے ذریعے بلند تر منازل کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پھر انسان کمالِ وجودی میں ترقی، علم وقدرت میں اضافہ، ارادہ میں زیادہ پختگی اور حیاتِ جاودانی حاصل کرتا ہے۔ ان حالات میں ان فرشتگان سے بالاتر اور بہتر کمالات سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

ہر انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ دنیا پر اپنا تسلط و اقتدار قائم کرے اور جس کام کو عام لوگ انجام نہیں دے سکتے اس کو کر کے دکھائے۔ ریاضت کرنے والوں کی ایک جماعت حرام اور تکلیف دہ ریاضتوں کی مدد سے نفس و روح کو طاقت دے کر بعض قسم کی توانائیاں حاصل کر لیتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ راہِ حق جس میں دونوں جہانوں کی سعادت پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ انسان پروردگارِ عالم کے سامنے تذلل اور خضوع کا راستہ اختیار کرے، پھر بندگی کی راہ پر گامزن ہو کر وہ مقامات اور قوت حاصل کر کے خود اپنی ذات اور دنیا پر تسلط قائم کرے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں سالکانِ راہِ حق اور عبودیت و بندگی کے راہ پیماؤں کے مقامات بلند کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ کو اس طرح نقل فرماتے ہیں:

ماتقرب الی عبدا بشی احب الی مما افترضت علیه و انه لیتقرب الی بالنافلة حتی احبه. فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به ولسانه لاذی ینطق به و یده التی یبطش بها. ان دعانی اجبته و ان سالنی اعطیته[1]

''کوئی بندہ اپنے کسی ایسے عمل کے ذریعہ مجھ سے تقرب حاصل نہیں کر سکتا، جو مجھے فرائض و واجبات کی ادائیگی سے زیادہ محبوب ہو (پھر فرمایا): میرا بندہ نافلہ نمازوں کی ادائیگی سے مجھ سے اس قدر نزدیک

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۲، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

ہو جاتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتا ہے، اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ چیزوں کو اٹھاتا ہے۔ جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے میں جواب دیتا ہوں اور مجھ سے جو کچھ مانگتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں۔''

اس حدیث میں غور و فکر کرنے سے ہم ان کمالات کی عظمت سے جو انسان فرائض و نوافل کی انجام دہی سے حاصلکرتا ہے، پوری رہبری حاصل کرتے ہیں۔ اس کیفیت میں انسان کی اندرونی قوت اس حد تک ترقی کر لیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ ان آوازوں کو سن لیتا ہے جن کو عام قوت سماعت سے نہیں سنا جا سکتا، ان صورتوں اور اجسام کو جن کو عام آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، دیکھ لیتا ہے۔ آخر کار اس کی خواہشات عملی جامہ پہن لیتی ہیں اور اس کی حاجات پوری ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ خدا کا دوست ہو جاتا ہے اور اس کا عمل خدا کا عمل کہلانے لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے کان اور آنکھیں خداوند تعالیٰ کے کان اور آنکھیں بن جاتے ہیں، سے مراد یہ ہے کہ اس کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے زیر سایہ زیادہ دیکھتی ہیں، اس کے کان بہتر سنتے اور اس کی استعداد وسیع تر ہو جاتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسان کے لیے بہت ہی عجیب و غریب استعداد و لیاقت کا تعارف کرواتے ہیں۔ آنحضرت عبودیت و بندگی ہی کو بصیرت عمیق، شنوائی بلند اور دیگر کمالات کے حصول کا ذریعہ شمار کرتے ہیں اور بس۔

کتب اخلاق اور سیر و سلوک میں ایک مشہور جملہ پایا جاتا ہے جس کی عام طور پر صحیح تفسیر نہیں کی جاتی۔ وہ جملہ یہ ہے:

العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة

''بندگی اور راہِ خدا پر چلنا ایک گوہر ہے جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ قدرت و توانائی و ربوبیت کا حصول ہے۔''

اس جملہ میں 'ربوبیت' سے مراد خدائی نہیں کیونکہ انسان، جو ممکن الوجود ہے، کبھی بھی اپنی حدود امکانی سے تجاوز نہیں کر سکتا، بلکہ اس سے مراد بزرگی و بادشاہی اور زیادہ سے زیادہ کمالات، قدرت اور بالاتر توانائیوں کا حصول ہے۔

اب ہم عبودیت و بندگی کے عجیب و غریب اثرات اور اللہ تعالیٰ کے صراط مستقیم پر چلنے کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور آیات قرآن مجید کی مدد سے ایک خدا پرست انسان کے نفس و روح، جسم و بدن، کائنات اور دنیا پر تسلط و اختیار کو ثابت کرتے ہیں۔

بندگی درج ذیل اثرات کی حامل ہوتی ہے۔[1]

[1] اس حصہ میں عبودیت و بندگی کے ساتھ واضح اثرات کا ذکر ہوتا ہے جو عبارت ہیں: (۱) نفس پر تسلط (۲) بصیرت خاص (۳) پراگندہ افکار پر تسلط (۴) روح کی جسم سے علیحدگی (۵) بدن میں تصرف (۶) عالم میں تصرف (۷) اجسام لطیف کا دیکھنا

۱: نفس پر تسلط

عبودیت کا سب سے پہلا اثر انسان کا خواہشات نفسانی پر تسلط ہے۔ اس تسلط کے نتیجہ میں نفس امارہ کو لگام دی جاتی ہے، روح انسانی نفس پر برتری حاصلکر لیتی ہے اور انسان کمال روحانی کے اعتبار سے اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ نفس امارہ پر اسے مکمل اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر قابو پالیتا ہے اور نفس اس کے مکمل اختیار میں آ جاتا ہے۔ کمال کی اس منزل کو نفس پر حکمرانی کہتے ہیں۔

اس منزل کی طرف قرآن مجید کی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ‌ؕ (عنکبوت: ۴۵)

''یقیناً نماز انسان کو برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے۔''

یعنی نماز انسان کے اندر وہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے جس کے زیر سایہ نماز گزار اپنے آپ کو گناہ سے روک لیتا ہے۔''

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَۙ‏ ﴿۱۸۳﴾ (بقرۃ: ۱۸۳)

''ہم نے تم پر سابقہ لوگوں کی طرح روزہ واجب کیا ہے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔''

روزہ ذاتِ اقدس پروردگار عالم کے حضور ایک قسم کی عبودیت و بندگی ہے جو تقویٰ، ضبط نفس اور انسان کو گناہ سے روکنے کی کیفیت پیدا کرتا ہے جس کا نتیجہ نفس پر حکمرانی اور ہوا و ہوس پر قابو حاصل کرنا ہے۔

۲: بصیرت خاص

عبودیت کی اقدارِ بلند میں سے ایک یہ ہے کہ خلوص و روشنی قلب کے سایہ میں انسان ایک خاص قسم کی بصیرت حاصل کر لیتا ہے اور حق و باطل میں واضح طور پر امتیاز کر لینے کی صلاحیت کی وجہ سے ہرگز گمراہ نہیں ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّـكُمۡ فُرۡقَانًا (انفال: ۲۹)

''اے ایمان والو! اگر تم پرہیز گار ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ تمھیں ایسی قوت عطا فرمائے گا جس سے تم حق و باطل کے درمیان تمیز کر سکو گے۔''

فرقان سے مراد وہ خاص بصیرت ہے جو انسان کے لیے حق و باطل کے درمیان فرق کو پہچاننے کا سبب بنتی ہے۔

ایک اور آیہ مبارکہ میں فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (عنکبوت: ۶۹)

''جو لوگ ہماری راہ میں سعی و کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔''

تیسری آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (حدید: ۲۸)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دو حصے تمھیں عطا فرمائے گا اور تمھارے لیے ایک نور مقرر فرمائے گا جس کے ذریعہ راستہ پاؤ گے۔''

اس آیہ مبارکہ کے معنی واضح کرتے ہیں کہ تقویٰ و ایمان اس دنیا کی زندگی میں ہی نور فراہم کرتے ہیں اور یہ نور پاکیزگی و طہارت کی طرف انسان کی رہبری کرتا ہے۔

۳: پراگندہ افکار پر تسلط

انسان کی مختلف قسم کی آرزوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ عبادت کے دوران اس کے قوائے عقلی ایک نقطہ پر مرتکز ہوں کہ وہ غیر خدا کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے۔ جو لوگ دورانِ عبادت اپنی توجہ مختلف سمتوں میں رکھتے ہیں وہ اصطلاح کے مطابق حضوریٔ قلب سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنے افکارِ منتشر پر، جو قوت متخیلہ کی پیداوار ہوتے ہیں، اختیار نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چار رکعت کی نماز کو بہت ہی منتشر افکار کے ساتھ پورا کرتے اور ایک بے روح ڈھانچہ کی مانند اس کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

احادیث اسلامی میں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''قلب انسان (قوائے ادراکی) پر وہاں کی مانند ہے جو کسی درخت پر آویزاں ہوں اور ہوا انھیں ادھر ادھر اور اوپر نیچے حرکت دیتی رہتی ہو۔''

مولانا روم اس حدیث کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

در حدیث آمدہ کہ دل ہچو پری است
در بیابانے اسیر صرصری است
باد پر راہ ہر طرف راز گزاف
گہ چپ وگہ راست صدہا اختلاف[1]

---

[1] مثنوی مولانا روم، دفتر سوم

ترجمہ: حدیث میں آیا ہے کہ انسان کا دل پر وبال کی مانند ہے جو بیابان میں تیز ہواؤں کا اسیر ہوتا ہے۔ ہوا اس کو ہر طرف اڑائے پھرتی ہے۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں، سینکڑوں مختلف سمتوں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی بندگی کی راہ پر گامزن لوگ اس تکامل وقوت کے ذریعے، جس کو وہ بندگی کے زیر سایہ پیدا کر لیتے ہیں، اپنے تمام پریشان تخیل پر قابو پا لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی قوت متخیلہ پر، جو ایک پرندے کی طرح شاخ بہ شاخ اڑتا رہتا ہے، مسلط رہتے اور اس کو پوری طرح اپنے اختیار میں رکھتے ہیں۔ یہ لوگ دورانِ عبادت اس طرح مرکز فکر و حضوریٔ قلب پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ غیر خدا سے ہر طرح غافل ہو کر اللہ تعالیٰ کے جمال و کمال میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ نماز کی حالت میں اگر تیر کی نوک ان کے پاؤں سے نکالی جائے تب بھی ان کی توجہ پریشان نہیں ہوتی۔ ان کا بچہ بلندی سے گر جاتا ہے، بیوی اور بچہ فریاد بلند کرتے ہیں لیکن نماز کی حالت میں وہ ہرگز اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ نماز سے فارغ ہو کر ادھر ادھر دیکھتے اور اس واقعہ سے مطلع ہوتے ہیں۔ [۱]

شیخ الرئیس بوعلی سینا فرماتے ہیں:

> ''عبادت انسانی قوائے فکری کے لیے ایک طرح کی ورزش ہے جو تکرار اور بارگاہِ خداوندی میں حضوری کی عادت کے زیر اثر فکر انسانی کو طبعی و مادی مسائل سے ہٹا کر تصورات ملکوتی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ انسان کے قوائے فکری اس کے باطن اور فطری تلاش حق کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے اور ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔'' [۲]

۴: جسم کی روح سے رہائی

عالم طبیعی میں روح و جسم ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ مستحکم رکھتے ہیں۔ چونکہ روح جسم کے ساتھ ''تعلق تدبیری'' رکھتی ہے اس لیے جسم کو فناء و خرابی سے محفوظ رکھتی ہے۔ دوسری طرف روح اپنی فعالیت کے لیے جسم کی محتاج ہے اور جسم کے اعضاء و جوارح کی مدد سے سن اور دیکھ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن کبھی کبھی روح اس کمال و قدرت کے زیر اثر جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی سے اسے حاصل ہوتا ہے، جسم کی طرف توجہ سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو جسم سے جدا کر سکتی ہے۔

جوان آدمی کے لیے، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو عالم طبیعی کو مادی نظریات کے تحت دیکھتے ہیں، اس قسم کے مطالب کا تصور مشکل ہوتا ہے۔ تاہم راہ حق پر چلنے والوں کے لیے یہ کام اس قدر آسان ہے کہ جب بھی چاہیں اپنے آپ کو خواہشات جسم سے علیحدہ کر سکتے ہیں۔

---

[۱] یہ دو واقعات امیر المومنین علیہ السلام اور حضرت سجاد علیہ السلام کے حالات سے نقل ہوئے ہیں۔

[۲] اشارات ج ۳، نمط نہم ص ۳۷۰۔ تحت عنوان 'تنبیہ'

ہم نے اپنی زندگی میں ایسی شخصیات دیکھی ہیں، ان کو جانتے بھی ہیں اور ان کے زبانی ایسے مطالب کو سنا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کے لیے ایک امر عادی ہے اور ایک ملکہ کی صورت میں ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو احکام اسلام کو وظائف عملیہ کے ایک سلسلہ سے زیادہ نہیں سمجھتے، جو نفس انسانی میں معمولی سی واقعیت بھی پیدا نہیں کر سکتے، وہ ہرگز ان لوگوں کے بارے میں اس قسم کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے، جو واقعیت دینی کو سمجھتے ہیں، بلکہ بعض اوقات اپنے غلط اندازہ اور عوام الناس کے افکار کو منتشر کرنے کی خاطر اس قسم کے مطالب کو تصوف کی ایک قسم قرار دے کر اس طریق ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی بندوں کا معاملہ بناوٹی صوفیوں سے جو سوائے ظاہر سازی، عوام فریبی، مسلمانوں میں تفرقہ اندازی، مسجد کے مقابلہ میں خانقاہ کی تاسیس، چند ایک غیر صحیح اوراد و اذکار کے کوئی اور مقصد نہیں رکھتے، بالکل جدا ہے۔ وہ بے ضمیر انسان جو اللہ تعالیٰ کے بندگان حقیقی کے کمالات و تصرفات کے منکر ہیں، حقیقت میں تصوف کے مخالف نہیں اگرچہ اس کی مخالفت کا اظہار بھی کرتے ہوں۔ بلکہ وہ کمال انسانی کے دشمن ہیں اور نہیں چاہتے کہ بشر خاکی کے اس کمال کا اعتراف کریں جس نے اسے قبلہ و مسجود ملائکہ بنایا تھا۔ لہٰذا اس قسم کے لوگوں سے جو عبادات اسلامی کو ایک قسم کے وظائف و اوراد کا ایسا مجموعہ جانتے ہیں جن سے انسان کی روح اور اس کے نفس ناطقہ پر معمولی سا اثر بھی نہیں پڑتا اور نہ ان سے کوئی کمال حاصل ہوتا ہے، یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا عالم بشریت کی عظیم ترین شخصیت روحانی و معنوی کمالات اور تقریب کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک متقی ترین شخصیت کے مساوی ہو سکتی ہے بالخصوص جبکہ اول الذکر نے اپنے متعلقہ فرائض کو پورا کیا ہوتا ہے اور موخر الذکر نے ایسا نہیں کیا ہوتا؟

۵: بدن میں تصرف

بندگی و عبادت انسان کو ایسی قوت عطا کرتی ہے کہ اس کا جسم انسان کامل کے فرمان و ارادہ کے ماتحت ہو جاتا ہے۔ پھر انسان خود اپنے جسم کے دائرہ اختیار میں بلکہ دوسروں کے بارے میں بھی خارق العادت افعال انجام دینے لگ جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

''جب بھی انسانی ارادہ کسی عمل کی انجام دہی کے لیے قوی ہو جاتا ہے اور اس کی توجہ اور خواہش کسی حقیقی مورد کے بارے میں پختہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کا جسم اس عمل کی انجام دہی میں کسی قسم کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتا۔''[۱]

اس سلسلہ میں ہمارے پاس اتنے شواہد موجود ہیں کہ ہم ان کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔[۲]

---

[۱] وسائل، ج ۱ ص ۳۸ ''ماضعف بدن عما قویت علیه النسیه۔''

[۲] روز نامہ کیہان، مورخہ ۱۵ ماہ بہمن، ۱۳۵۴ میں تصاویر و تفصیل کے ساتھ ایک جماعت کے اپنے جسم پر تصرف کو پیش کیا ہے۔ (ہم نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے)

٦: تصرف در جہان

عبادت و بندگی کے ذریعے نہ صرف پورا جسم انسانی اس کے زیر فرمان اور اس کے ارادہ کا محل نفوذ قرار پاتا ہے بلکہ تمام عالم طبیعی انسان کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ پھر پروردگار کے اذن سے اس قوت وقدرت کے زیر سایہ، جو تقرب خدا سے حاصل ہوتی ہے، وہ عالم طبیعی میں تصرف کرتا ہے اور اس طرح ایک سلسلہ معجزات وکرامات کا موجد بن کر عالم تکوین وفطرت میں تصرف کرنے کی قابلیت حاصل کر لیتا ہے۔

علمائے کرام معجزہ کے سلسلہ میں مبسوط اور طویل مباحث پیش کرتے ہیں اور معجزہ کو کبھی بھی معلول بغیر علت نہیں جانتے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ معجزہ وہ معلول ہے جو طبیعی اور عام علت نہی رکھتا۔ معجزہ کی علت پیغمبر کا ارادہ اور اس کی قوت روحانی ہوتی ہے۔ یہ ارادہ وقوت روحانی بھی اس قوت و ارادہ کو ماتحت کارفرما ہوتی ہے جس کو خداوند عالم نے اس کے اختیار میں دے کر اسے یہ اجازت دی ہوتی ہے کہ اللہ کے حکم سے کائنات اور عالم طبیعی میں تصرف کرے۔

لہٰذا معجزہ معلول بغیر علت نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی علت کا معلول ہوتا ہے جو عام نہیں ہوتی اور ہمیشہ یہ علت معجزہ کے ہمراہ ہوتی ہے۔

اولیاءالٰہی کی قدرت نمائی بروئے قرآن

اب جبکہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے ہم اپنے مدعا کے ثبوت میں آیات سے شواہد پیش کرتے ہیں جو سب کے سب اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اولیاء الٰہی بعض مصلحتوں کی بنا پر پروردگارِ عالم کے اذن سے اس قوت کے تحت جو اللہ تعالیٰ نے انھیں ودیعت فرمائی ہے، عالم طبیعی میں تصرف کر سکتے ہیں۔ عالم خلقت ان کے عالم جسم کی مانند ہو جاتا ہے جس میں وہ بعض حالات میں تصرف کر سکتے ہیں۔

الف) تصرف یوسفؑ برائے بینائی حضرت یعقوبؑ

حضرت یوسف، داوٗد اور سلیمان سے متعلق آیات کا مطالعہ اور وضاحت اور ان کے حیرت خیز افعال اس نکتہ کی طرف ہماری رہبری کرتے ہیں کہ عالم تکوین میں تصرف اس قدر مشکل و پیچیدہ نہیں کہ ہم اولیائے الٰہی کی قوت میں شک یا اس کی تردید کرنے لگیں۔ قرآن مجید نے مطالب اصلی کے سمجھنے کے لیے چند ایک مثالیں پیش کی ہیں جن کے انجام دینے والے تربیت الٰہی اور کمال روحانی ومعنوی کے اعتبار سے کسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام بلند تک رسائی نہیں رکھتے۔ جب ایسے حضرات عنایات پروردگار کے سایہ میں اس قسم کے تصرفات پر قادر ہوں تو دیگر اولیائے خدا جو بہتر منزلِ تقرب الٰہی پر فائز ہیں اور جہانِ آفرینش کے رموز پر بہتر اختیار کے مالک ہیں، یقیناً زیادہ قوت کے مالک ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ان مباحث میں روئے سخن صرف ان لوگوں کی طرف ہے جو قرآن مجید کو تسلیم کرتے اور اس کی تعلیمات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایسے مقامات ہیں جس طرح حضرت یعقوب حضرت یوسف کی خواہش کے مطابق دوبارہ بینائی حاصلکر لیتے ہیں یا ہوا حضرت

سلیمان کے حکم سے حرکت میں آ جاتی ہے یا رک جاتی ہے، یا تانبے کا چشمہ حضرت سلیمان کے حکم سے آب رواں کی صورت اختیار کر لیتا ہے، چاند یقیناً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آلہ وسلم کی خواہش پر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، یا سنگریزے آپ کی تسبیح کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا دو شخصیات کے موازنہ سے اس قسم کے معجزات کی صحت میں، جو عالم تکوین میں تصرف کے مظہر ہیں، کسی قسم کا شک یا تردد نہ ہونا چاہیے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت یعقوب نے اپنے فرزند دلبند کی مفارقت میں اس قدر گریہ فرمایا کہ آخری عمر میں اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ سالہا سال کے طویل عرصہ کے بعد ایک خوشخبری لانے والے نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر حضرت یعقوب کو پہنچائی۔ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو ہدایت کی کہ ان کے پیرہن کو حضرت یعقوب کے چہرہ پر ڈال دیں تا کہ ان کی بینائی لوٹ آئے۔

قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ (یوسف: ۹۳)

''جاؤ اور میری یہ قمیص میرے پدرِ بزرگوار کے چہرہ پر ڈال دو تا کہ وہ بینائی کی نعمت کو دوبارہ حاصل کر لیں۔''

خوشخبری دینے والے نے آ کر پیراہن یوسف کو حضرت یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا اور اسی وقت ان کی بنائی لوٹ آئی۔'' قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ (یوسف: ۹۶)

''جب خوشخبری دینے والے نے آ کر پیراہن یوسف اوران (یعقوب) کے چہرہ پر ڈالا تو اسی وقت ان کی بینائی لوٹ آئی۔''

اب دیکھنا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بنائی کا لوٹ آنا کس چیز کا معلول ہے؟ کیا یہ عمل براہِ راست خداوند عالم کا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادہ وخواہش کو اس میں کسی طرح کا دخل نہ تھا؟ یا ایسا ہے کہ یہ عمل حضرت یوسف کے ارادہ وخواہش کا معلول تھا اور اس قوت کے زیر اثر واقع ہوا تھا جو سرچشمہ قدرت سے حضرت یوسف نے حاصل کی تھی اور جس کی مدد سے وہ اس پر قادر ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس قسم کے کام کو سرانجام دے سکیں؟

پہلا احتمال بہت کمزور و بے بنیاد ہے کیونکہ اگر حضرت یعقوب کا شفا پانا اللہ تعالیٰ کا براہِ راست فعل ہوتا تو پھر ضروری نہ تھا کہ حضرت یوسف اپنے بھائیوں کو یہ ہدایت کرتے کہ ان کی قمیص ان کے پدرِ بزرگوار کے چہرہ پر ڈال دیں تا کہ وہ بینا ہو جائیں پھر یہ بھی ضروری نہ تھا کہ بشیر حضرت یوسف کی ہدایت پر عمل کرتا اور ان کے پیرہن کو ان کے والد بزرگوار کے چہرہ پر ڈالتا۔ بلکہ یہی کافی تھا کہ حضرت یوسف دعا کرتے اور ان کی دعا مستجاب ہوتی۔ لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم کہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ارادہ، ان کی خواہش اور ان کی قوتِ روحانی ان کے پدرِ بزرگوار کی بنائی کی واپسی کے لیے موثر ثابت ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کام کے لیے ایک سادہ سا ذریعہ، یعنی اپنا پیرہن اپنے بدرِ بزرگوار کے چہرہ پر ڈالنے سے کیوں استفادہ کیا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اعجاز و کرامت کی منزل میں ہمیشہ سادہ ذرائع ہی سے استفادہ کیا کرتے ہیں اور معجزہ و صنعت میں جو فرق پائے جاتے ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس کام کو ایک نبی معجزہ کے طور پر انجام دیتا ہے، ایک عام شخص اسے بطور جادو کر گزرے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک عام آدمی اسی کام کی انجام دہی کے لیے نہایت پیچیدہ علمی و صنعتی ذرائع کو بروئے کار لائے، جبکہ انبیائے کرام نہایت سادہ ذریعہ سے (کہ قطعاً اس ذریعہ اور اس کے نتیجہ کے درمیان کوئی رابطہ وجود نہ رکھتا ہو) اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنا دیں۔

مثلاً آرمسٹرانگ نے ایک فضائی گاڑی کے ذریعہ، جس کو ایک میزائل نے اٹھا رکھا تھا اور جو اسے زمین کی کشش ثقل کے دائرہ سے باہر لے گئی، چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ امریکی فضا نوردی کا محکمہ وہ ذریعہ بنا جس نے عالمی اخبار کے مطابق، تیس لاکھ ماہرین کی مدد سے جو اس منصوبہ کو عملی شکل دینے میں مصروف رہے، اس کام کو انجام دیا در آں حالیکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بہت سادہ ذریعہ یعنی براق پر اتنا طویل راستہ طے فرمایا جو زمین اور چاند کے درمیان مسافت سے بہت زیادہ تھا۔

عالم تکوین میں تصرف کے سلسلہ میں انبیائے کرام کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ہمیشہ سادہ ذرائع سے استفادہ فرماتے رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اپنے پدرِ بزرگوار کے چہرہ پر اپنا پیرہن ڈالنے سے استفادہ کیا۔ درآنحالیکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کی واپسی کا حضرت یوسف کے ارادہ اور قوت روحانی ہی سے تعلق تھا۔ اگر انبیاء علیہم السلام ان مواقع میں اس قسم کے سادہ ذرائع استعمال نہ کرتے تو اس صورت میں ان کے عمل (مثلاً ضائع شدہ بینائی کا پلٹ آنا) کے اسباب واضح نہیں ہوتے۔

ب) حضرت موسیٰ کا عالم تکوین میں تصرف

قرآن مجید مکمل صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تنگی آب سے دوچار ہوگئی۔ حضرت موسیٰ نے ان کے لیے پانی کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ہدایت کی کہ پتھر پر اپنا عصا ماریں۔ پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے جن میں ہر ایک بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ سے متعلق تھا اور سب نے اپنے اپنے چشمے کو پہچان لیا۔ آیہ مبارکہ کا متن یہ ہے:

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ (بقرة:٦٠)

”اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ہم نے ان (موسیٰ) کو ہدایت کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ اچانک اس (پتھر) میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور بنی اسرائیل کے سب قبیلوں نے اپنے اپنے چشمہ کو پہچان لیا۔“

صرف یہی ایک موقعہ نہیں جب حضرت موسیٰ نے اپنے عصا سے اس قسم کا خارق العادۃ کام انجام دیا ہو۔ ایک اور موقعہ پر وہ اپنا عصا مار کر دریا کے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، دریا کی تہ ظاہر ہو جاتی ہے اور بنی اسرائیل آزادی کے ساتھ وسط دریا سے عبور کر لیتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ‌ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ‌ۚ﴿۶۳﴾ (شعراء: ۶۳)

''ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ دریا میں شگاف پڑ گیا اور اس کا ہر حصہ کوہِ عظیم کی مانند ہو گیا۔''

اب غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ خارق العادۃ کام براہ راست خداوند عالم کے کام ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ کیوں موسیٰ کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ پتھر یا دریا پر اپنا عصا ماریں؟ اگر حضرت موسیٰ کے ارادہ اور خواہش کا ان باتوں میں کوئی معمولی سا بھی دخل نہیں تو پھر خدا کیوں انھیں ایسے بے معنی کام کرنے کا حکم دیتا ہے؟ بلکہ اسی قدر کافی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے، اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرماتا اور بنی اسرائیل کی پیاس پتھر کے پھٹنے سے بجھ جاتی اور دریا کے شگافتہ ہونے سے وہ اسے عبور کر جاتے۔

لیکن دونوں صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے بعد انھیں اس بات پر مامور فرماتا ہے کہ اپنے عصا کو پتھر اور دریا پر ماریں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کاموں کی علت حضرت موسیٰ کا ارادہ اور خواہش تھی یا بہتر الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ یہ حضرت موسیٰ کی معنویت ہے جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کاموں کی انجام دہی پر قادر فرمایا۔ باقی رہا یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیوں نہایت سادہ سے اوزار یعنی اپنے عصا سے ہی سب کام لیتے ہیں تو ہم اس نکتہ کی سابق میں وضاحت کر چکے ہیں جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ج) انصارِ سلیمان کا مظاہرہ قوت

قرآن مجید بہت سے مواقع پر کرامات و معجزات کو ان کے حاملین کی طرف نسبت دیتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ قرآن ان معجز نماؤں کے ارادہ و خواہش کو معجزات کے رونما ہونے کے بارے میں موثر جانتا ہے۔ قرآن ان تمام کاموں کو توحید افعالی یا اس بات کے کہ تمام کام خداوند تعالیٰ کی قدرت و قوت سے انجام پاتے ہیں، منافی نہیں جانتا، کیونکہ اگر یہ حضرات اپنے حیرت انگیز اور خارق العادت کاموں میں ذمہ دار اور مستقل ہوتے اور مقام ایجاد میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز ہوتے تو اس صورت میں توحید افعالی اور اس امر میں کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی قادر مطلق نہیں، تضاد پیدا ہو جاتا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ان حضرات کے ایسے تمام افعال ایک ایسی قوت کے زیر اثر انجام پاتے ہیں جو پروردگارِ عالم نے ان کی بندگی و اطاعت کے سایہ میں انھیں عطا فرمائی ہے تو یہ اعتقاد نہ صرف یہ کہ توحید افعالی کے ساتھ کسی طرح تضاد نہیں

رکھتا بلکہ توحید افعالی کی اس کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اب تصریحات قرآن پیش کرتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباہ کو اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ آپ کے حضور پہنچتی، حضرت نے اپنے حاضرین مجلس سے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ (نمل: ۳۸)

''اے میرے درباریوں! تم میں سے کون اس (بلقیس) کا تخت میرے سامنے (بلقیس مع اس کے ہمراہیوں کے) مطیعانہ وارد ہونے سے پہلے لاکر پیش کرسکتا ہے؟''

حاضرین مجلس میں سے ایک نے کہا:

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

(نمل: ۳۹)

''اس سے پہلے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں (دربار برخواست ہو) میں اسے لے آؤں گا اور میں اس کام کی طاقت رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں۔''

ایک اور شخص نے جس کا نام مفسرین آصف برخیا بتلاتے ہیں، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا وزیر اور ان کا بھانجا بھی تھا، عرض کیا کہ وہ چشم زدن میں اسے حاضر کرسکتا ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ (نمل: ۴۰)

''ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا (اس کتاب کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے بارے میں دوسرے مقام پر گفتگو ہوگی) یہ کہا کہ اس سے پہلے کہ آپ آنکھ جھپکیں میں اس (تخت) کو آپ کے دربار میں حاضر کردوں گا۔ اچانک حضرت سلیمان نے تخت کو اپنے سامنے حاضر پایا اور فرمایا کہ یہ فضل و نعمت مجھ پر میرے رب کی طرف سے ہے۔''

ان آیات کے مطالب میں ہمیں غور کرنا چاہیے تاکہ سمجھ سکیں کہ ان خارق العادۃ افعال کا عامل (تخت بلقیس کا حاضر کرنا جو دربار حضرت سلیمان سے کئی فرسخ کے فاصلہ پر تھا) کیا ہے؟ کیا اس خارق العادۃ فعل کا فاعل براہِ راست اللہ تعالیٰ ہے اور وہی عالم طبیعی میں اس تحرک کو انجام دیتا ہے جبکہ آصف برخیا اور دوسرے افراد صرف دیکھنے والے ہیں اور ان کاموں میں کوئی معمولی سا دخل بھی نہیں رکھتے؟ یا اس طرح ہے کہ ان کاموں کے کرنے والے دوسرے لاکھوں کاموں کی طرح جنھیں عام انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انجام دیتے ہیں، خود وہی انسان

ہیں، کیا حقیقت یہ تو نہیں کہ یہ حضرات اس قوت کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اور خود اپنے ارادہ سے اس قسم کے خارق العادة کے عامل ہوتے ہیں؟ تینوں آیات بظاہر موخرالذکر نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ

اولا: حضرت سلیمان علیہ السلام ان لوگوں سے یہ کام کروانا چاہتے ہیں اور ان کو اس کام پر قادر جانتے ہیں۔

ثانیاً: جس شخص نے کہا تھا کہ میں تخت بلقیس کو حضرت سلیمان کے دربار برخواست کرنے سے پہلے لے آؤں گا، وہ اس جملہ میں اپنی توصیف بیان کرتا ہے کہ وانی علیه لقوی امین یعنی میں اس کام کو کرسکتا ہوں، اس کی قوت رکھتا ہوں اور اپنے بارے میں مطمئن ہوں۔

اگر اس شخص کا وجود و ارادہ اس کام کے لیے کافی نہ ہو اور اس کی حیثیت تھیٹر کے اداکار کی مانند ہو تو پھر یہ کہنے کی کہ میں اس کام کو کرسکتا ہوں اور امین ہوں، کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

ثالثاً: دوسرے شخص نے کہا کہ میں اسے بہت تھوڑی دیر میں (پلک جھپکتے ہی) لے آؤں گا بلکہ اس خارق العادۃ کام کو اپنی طرف نسبت دے کر کہتا ہے: اتیك لے آتا ہوں۔"

اگر ضروری ہوتا کہ قرآن مجید اس حقیقت کی وضاحت کرے کہ اولیاء کے نفوس پر ان کے ارادے اور خواہشات، معجزات و کرامات اور خارق العادۃ افعال پیش کرنے کے سلسلہ میں دیگر شخصیات اثر رکھتی ہیں تو اس سے زیادہ واضح کون سے الفاظ ہو سکتے ہیں تاکہ اس زمانہ کے شاکی لوگ ان کو تسلیم کرلیں اور تاویلات میں نہ پڑتے پھریں۔

رابعاً: خداوند عالم دوسرے شخص کی حیرت انگیز توانائی کا سبب اس کی علم کتاب سے واقفیت کو قرار دیتا ہے۔ یہ وہ علم و حکمت ہے جو عام آدمی کے دائرہ اختیار سے قطعی باہر ہے۔ یہ علم ان علوم سے ہے جو بعض بندگانِ خدا کے لیے ہوتے ہیں۔ ان علوم سے واقفیت اس قرب الٰہی کی مرہون منت ہوتی ہے جو اس قسم کے بزرگ حضرات کو اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

قال الذی عندہ علم من الکتاب

"جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا، بول اٹھا۔"

حضرت سلیمانؑ کی قوت کا ایک اور مظاہرہ

قرآن مجید حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں مکمل صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ ہوا ان کے فرمان کے مطابق جس طرف وہ چاہتے تھے چلتی تھی۔ ہوا کی گردشت جو نظام آفرینش کا حصہ ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ارادہ کے مطابق متعینہ رخ پر چلتی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝۸۱ (انبیاء: ۸۱)

''اور ہم نے تیز وتند ہوا کو سلیمان کے قابو میں کر دیا اس طرح کہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے برکت عطا فرمائی، چلتی تھی اور ہم تو ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔''

اس میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ آیہ مبارکہ پوری صراحت کے ساتھ ہوا کی رفتار، گردش اور سمت کے تعین کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم اور ارادہ کے ماتحت قرار دیتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے ''تجری بامرہ'' ان کے حکم کے مطابق چلتی تھی۔''

ایک اور آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چیز جس کو حضرت سلیمان سواری کے طور پر استعمال کرتے تھے صبح سے ظہر تک ایک ماہ کی مسافت اور ظہر سے رات تک ایک اور ماہ کی مسافت طے کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے یہ خاص بندے (حضرت سلیمان) اس فاصلہ کو جسے عام سوار یاں دو ماہ میں طے کرتی تھیں، ایک دن میں طے کر لیتے تھے۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مطیع بنا دیا تھا اور ان کے لیے ہوا کو مسخر فرما دیا تھا، تاہم ''تجری بامرہ'' (حضرت سلیمان کے حکم سے چلتی اور انھیں کے حکم پر رکتی تھی) کا جملہ بصراحت یہ بتلاتا ہے کہ حضرت سلیمان کا حکم و ارادہ ہوا کے اس طبیعی وجود سے فائدہ اٹھانے میں مکمل طور پر موثر تھا۔ مثلاً ہوا کے چلنے اور سمت و وقت کا تعین اور اس کے رکنے کے مواقع کا تعلق بالکل حضرت سلیمان کے حکم و ارادہ کے مطابق ہوتا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق آیات مبارکہ سے ایک اور نکتہ بھی سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی شدید اشیاء کو ان کے لیے مسخر فرمایا تھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے ان اشیاء سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مثلاً تانبہ جو ایک دھات ہے اپنی پوری سختی کے باوجود ان کے لیے بحکم خداوند تعالیٰ چشمہ رواں کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور آپ اس سے جس طرح چاہتے فائدہ اٹھاتے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ (سباء: ۱۲)

''اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ جاری فرما دیا۔''

وہ مخلوق جو عام آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی مثلاً جنات، ان کے لیے تسخیر ہو چکے تھے اور جس طرح حضرت سلیمان انھیں حکم دیتے وہ بجا لاتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِيۡرِ ۝۱۲ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ (سبا: ۱۲، ۱۳)

''اور جنات کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے کام کرتی تھی...... وہ ان کے لیے جو کچھ وہ چاہتے انجام دیتے تھے۔''

ان سب آیات کا بظاہر یہی مطلب ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یکساں طور پر ہوا وغیرہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان سب قوتوں کو ان کے تابع فرمان کیا تھا لیکن اس کے باوجود خود حضرت سلیمان کا ارادہ بے اثر نہ تھا۔ تانبے کی کان کا آب رواں کے چشمہ کی شکل اختیار کرنا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک حضرت سلیمان کا ارادہ نہ ہوتا اور نہ ہی جنات ان کا کوئی کام کرتے۔

یہ سب واقعات ایک قسم کی ولایت تکوینی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک نبی اس قرب کی بدولت جو اس کی ذات باری تعالیٰ سے حاصل ہے، اس منزل کا حامل ہو جاتا ہے کہ تمام عالم طبیعی، حتی کہ غیر مرئی موجودات یعنی جنات وغیرہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے زیر فرمان ہوتے ہیں اور ان کے دائرہ احکام سے باہر نہیں ہوتے۔

د) تصرفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بعض فوق العادۃ افعال کی نسبت دیتا ہے اور بتلاتا ہے کہ یہ سب افعال انکی باطنی قوت اور ارادۂ قوی کے باعث واقع ہوئے، جیسا کہ فرماتا ہے:

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ (آل عمران: ۴۹)

"میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک شکل بناتا ہوں اور پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، پیدائشی نابینا کو بینا اور مبروص کو شفا دیتا ہوں اور مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کر دیتا ہوں۔"

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مندرجہ ذیل امور کو اپنی طرف نسبت دیتے ہیں:

۱: مٹی سے پرندہ بنانا

۲: اس مٹی کے پرندہ میں پھونک مارنا اور اسے زندہ کرنا

۳: پیدائشی نابینا کو بینا کرنا

۴: برص کا علاج کرنا

۵: مردوں کو زندہ کرنا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو ان تمام افعال کا فاعل جانتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں اور پھر اللہ تعالیٰ انھیں انجام دے۔ بلکہ فرماتے ہیں "میں یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیتا ہوں۔" سوال یہ ہے کہ ان تمام افعال کے سلسلہ میں اذن خدا سے کیا مراد ہے؟ کیا ان میں اذن سے مراد ایک اجازت لفظی ہے؟ یقیناً یہ اجازت لفظی نہیں بلکہ اس سے اذن باطنی مراد ہے جو اس

معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندہ کو ایسا کمال اور قدرت وطاقت عطا فرما دیتا ہے کہ وہ ایسے امور کے انجام دینے کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔

اس قسم کی تفسیر کا ثبوت یہ ہے کہ انسان نہ صرف امور غیر عادی میں اذن پروردگار کا محتاج ہے بلکہ ہر بات میں اذن خدا کا محتاج ہے اور کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتا۔ تمام افعال کے بارے میں اذن الٰہی سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت ورحمت سے فاعل پر نوازش فرماتا ہے۔ زیر بحث آیہ مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مندرجہ بالا امور کے تحقق کی اپنی طرف نسبت دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور آیہ مبارکہ میں خداوند عالم بھی پوری وضاحت کے ساتھ مذکورہ امور کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت دیتا اور فرماتا ہے:

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ (مائدہ:۱۱۰)

''جب تم نے میری اجازت سے پرندے کی شکل بنائی اور اس میں پھونکا، وہ میرے حکم سے پرندہ ہو گیا، پیدائشی نابینا کو بینا اور مبروص کو میرے اذن سے شفا بخشی اور مردوں کو زندہ کیا۔''

آیئے اس آیہ مبارکہ کے جملوں میں غور وخوض کریں تاکہ واضح ہو جائے کہ قرآن مجید کی نظر میں ان سب امور کا فاعل اور انجام دہندہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ کہیں بھی یہ نہیں فرماتا، ''میں نے پرندہ بنایا''، ''میں نے شفا دی''، ''میں نے زندہ کیا'' بلکہ فرماتا ہے:

''تو نے بنایا ہے۔'' اذ تخلق

''تو نے شفا بخشی'' وتبری

''تو نے زندہ کیا۔'' اذ تخرج الموتی

اس سے زیادہ صراحت اور کیا ہوگی۔

لیکن اس بات کی وضاحت کے لیے کہ کوئی شخص ایجاد وتخلیق کے کام میں آزاد وخود مختار نہیں، نیز فرقہ معتزلہ کے غیر صحیح افکار اور دوگانہ پرستوں کے خیالات پر غور کرتے ہوئے، جن کا خیال ہے کہ انسان اپنی آفرینش میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن اپنے افعال وکردار میں مکمل طور پر خود مختار اور خدا سے بے نیاز ہے، ان تمام مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کاموں پر اذن الٰہی کی قید لگائی گئی ہے اور توحید در افعال کے موضع کی، جو مراتب توحید سے ہے رعایت کی ہے۔

جس طرح انسان اپنے تمام عمومی اور غیر عمومی امور میں اذن الٰہی سے بے نیاز نہیں، یعنی اس کا کھانا، پینا، سانس لینا، سب کام اللہ تعالیٰ کی رضا سے انجام پاتے ہیں، اسی طرح غیر معمولی امور اور اعجاز وکرامت بھی اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہی متحقق ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح اذن الٰہی ان سب امور میں اس بات کا سبب نہیں بنتا کہ فعل کو اس کے فاعل سے چھین لے، اسی طرح اعجاز سے منسلک اذن الٰہی کا وجود ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ ہم حضرت عیسیٰ کو صرف اذن خدا سے متعلقہ امور کا فاعل سمجھنے لگ جائیں۔

ہمیں قرآن مجید میں ایسی آیات ملتی ہیں جن میں غیر خدا یعنی مخلوق کے افعال بھی اذن الٰہی کے تابع نظر آتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ: ۹۷)

''(جبرئیل نے قرآن کو) اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے قلب پر نازل کیا۔''

اس میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ منزل ربوبیت سے وحی کا لانے والا ایک فرشتہ ہے اور وحی کا لانا حقیقتاً اور واقعتہً جبرئیل کا فعل ہے جو اس کام کو اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے انجام دیتا ہے۔ یہی کیفیت ان آیات مبارکہ کی ہے جن میں ایک چھوٹی جماعت کی بڑی جماعت کے مقابلہ میں کامیابی کا ذکر ہے مثلاً:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ (بقرہ: ۲۴۹)

''کتنی چھوٹی جماعتیں ہی جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی جمعیتوں پر غالب آ جاتی ہیں۔''

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ (بقرۃ: ۲۵۱)

''اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ (طالوت کی فوج جالوت کے لشکر پر) غالب آ گئی اور داوٗد نے جالوت کو قتل کر دیا۔''

اسی طرح اور بہت سی آیات ہیں۔ کیا کوئی شخص ان امور میں یہ کہنے کا مجاز ہے کہ ان افعال کا انجام دینے والا دراصل اللہ تعالیٰ ہے اور انسان ان تمام امور میں فعل خدا کو صرف دیکھنے والا ہے؟ یا اس طرح کہنا چاہیے کہ درحقیقت ہر آدمی ان موارد میں کام و فعالیت کا ذمہ دار ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی ہستی ممکن الوجود کسی موقع پر کسی عمل کو اذن باری تعالیٰ کے بغیر انجام نہیں دے سکتی۔ (اس موضوع کی تفصیل علم کلام کی کتب میں خصوصاً جبر و اختیار کے ابواب میں ملاحظہ فرمائیں)[1] اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ حکم خدا کے بغیر اس دنیا میں کسی کام کی ابتداء کا باعث بن سکتا ہے تو پھر اس کو جماعت مفوضہ میں شمار کیا جائے گا جو کہ باطل اور گمراہ جماعت واقع ہوئے ہیں۔

افعال اولیاء الٰہی کی غلط تفسیر

بعض اوقات اس قسم کے خارق عادت افعال کی اس طرح تفسیر کی جاتی ہے کہ ان تمام افعال کا واقعی انجام دینے والا تو صرف خدا ہی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے جملہ معجزات اللہ تعالیٰ کی قدرت وقوت سے ان کے ارادہ کے مطابق واقع ہوتے ہیں تا کہ ان کے دعویٰ کا صدق ثابت ہو جائے اور انبیاء وآئمہ علیہم السلام چونکہ ان افعال کے صدور میں واسطہ کا کام دیتے ہیں لہٰذا ان افعال کے وقوع و ایجاد کو ان کی طرف نسبت دینے میں کوئی چیز مانع قرار نہیں پاتی۔ خلاصہ یہ کہ پروردگار عالم نے انبیاء وآئمہ علیہم السلام کو خلق فرمایا انھیں مرتبہ کمال پر فائز کیا اور ان پر ان تمام باتوں کا الہام فرماتا ہے جو نظام عالم کے لیے بہتر ہیں۔ لہٰذا وہ جو ارادہ بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کے

---

[1] اسی مولف کی کتاب ''شناخت صفات خدا'' ص ۱۹۶-۲۰۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

مطابق اشیاء کو خلق فرما دیتا ہے۔[1]

لیکن قرآن مجید کی آیات مبارکہ واضح طور پر انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اس سے بالاتر مقامات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ اس طرح کی آیات مبارکہ جس طرح سطور بالا میں بیان ہوا، اس قسم کے جملہ افعال کے صدور کو انبیاء و اولیاء کرام سے نسبت دیتی ہیں اور اس نسبت میں کسی قسم کی منزل مجاز کو شامل نہیں کرتیں جیسا کہ ہم "تخلق" اور "تبری" کے جملوں کی تشریح کے دوران وضاحت کر چکے ہیں۔

اعجاز و معجزہ کی یہ تفسیر گویا توہمات شرک کے دور کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے اور یہ خیال کیا گیا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ خود انبیاء علیہم السلام ان جملہ امور کے فاعل ہیں تو ہم ایک قسم کے شرک و دوگانگی کے مرتکب ہو جائیں گے۔ لیکن جاننا چاہی کہ ارتکاب شرک تو اس صورت میں قرار پائے گا جب ہم انبیاء کو ایجاد و انجام کی منازل میں مستقل و مختار تسلیم کرنے لگیں اور ان کی فاعلیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ کی نفی کر دیں۔ لیکن جب ہم ان افعال کی انجام دہی کو ان کے عمومی افعال مثلاً بولنا، حرکت کرنا وغیرہ کی طرح ہی تصور کریں، ان سب باتوں کو انسانی اختیار کی حدود میں جانیں، انسان کے اختیار کو ذاتِ باری تعالیٰ کا معلول قرار دیں اور ان کے تمام افعال کو نظام آفرینش کی طرح، جس کے تمام اسباب ذاتِ احدیت کی جانب منتھی ہوتے ہیں، تصور کریں تو پھر ہم ہرگز کسی طرح بھی شرک کے مرتکب قرار نہیں پائیں گے کیونکہ اس طرح ہم یہ اعتراف کریں گے کہ جملہ علل و اسباب، عام اس سے کہ طبیعی ہوں یا مجرد، ذاتِ پروردگار ہی پر جا کر منتھی ہوتے ہیں۔

اس سے قطع نظر مذکورہ مطالب کو تحریر کرنے والا دو صفحات کے بعد ایسی عبارت پیش کرتا ہے جو ہرگز اس تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتی، بلکہ اس کے برعکس، جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس سے زیادہ قریب ہے۔[2]

ھ) تصرفات حضرت خاتم النبینؐ

شق القمر کا مسئلہ مسائل اسلامی میں سے ایک ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی آیات وضاحت کرتی ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں معجزہ کے طور پر چاند دو ٹکڑے ہوا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② (قمر: ۱، ۲)

"قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔ جب وہ کوئی نشانی (اعجاز) دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے اور کہتے

---

[1] حاشیہ انیس الموحدین ص ۲۴۲، ۲۴۳۔ اس نظریہ کو علامہ مجلسی مرحوم نے بھی بحار الانوار، ج ۲۵ ص ۲۵۰-۲۶۱ میں پیش کیا ہے۔

[2] صفحہ ۲۴۵ پر لکھتا ہے: خداوند تعالیٰ نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ علیہم السلام کو ایک حد تک موجودات عالم میں تسلط و تصرف کا اختیار عطا فرمایا ہے، یہاں تک کہ جواہر و اعراض ان کے مقابلہ میں کمزور ہیں اور وہ حضرات اپنے وجود ذہنی سے عالم طبیعی میں وجود خارجی کے باعث بن سکتے ہیں۔" اسی طرح صفحہ ۲۵۰ پر ایسے جملے ہیں جو ہماری تفسیر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ص ۲۴۸ ک

ہیں کہ یہ سب سحر و جادو ہے۔''

چاند کے دوٹکڑے ہونے کو ہرگز اس آیت میں قیامت کے دن سے منسلک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آیت کے آخر میں ہے کہ جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے اور کہتے ہیں کہ یہ سب جادو ہے۔'' یہ اس بات پر شاہد ہے کہ چاند کا دوٹکڑے ہو جانا دنیا میں معجزہ کے طور پر مخالفین کی نظروں کے سامنے واقع ہوا لیکن انھوں نے اسے سحر و جادو قرار دیا۔

علاوہ ازیں سنی و شیعہ علماء کی کتب میں اس سلسلہ کی بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں جو سب اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ یہ آیات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دوٹکڑے ہونے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

مرحوم طبرسی فرماتے ہیں:

''سب مفسرین اس آیت کو زمانہ پیغمبرؐ میں شق القمر کے معجزہ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔''[۱]

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''تمام مفسرین معتقد ہیں کہ مذکورہ آیات سے رسول اکرمؐ کے زمانہ میں چاند کا شق ہونا مراد ہے۔''[۲]

شق القمر کے بارے میں یقیناً کوئی ایسا مخفی عامل کارفرما تھا جو اس قسم کے اثر کو سامنے لاسکا کیونکہ یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضرتؐ نے قوت بشری کے ذریعے ہی ہ کام انجام دیا بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ نے قوت بشری و طبیعی سے کسی مافوق قوت کی مدد حاصل کی اور اس قسم کے کام کے فاعل قرار پائے۔

اس بات کی دلیل کہ آنحضرتؐ کا ارادہ و خواہش اس عمل میں موثر کردار کے حامل ہیں، یہ ہے کہ یہ کام عین اسی وقت انجام پایا جس آپ سے اس کی خواہش کی گئی تھی۔ بعض روایات کے مطابق اس طرح ہے کہ جونہی آنحضرتؐ نے اپنی انگشت مبارک سے چاند کی طرف اشارہ فرمایا، چاند دوٹکڑے ہو گیا۔ اس بات کا سبب کہ آنحضرتؐ نے اسی طرح کے سادہ و عام وسیلہ و ذریعہ سے اس کام کو انجام فرمایا، وہی ہے جس کی طرف ہم سابق میں اشارہ کر چکے ہیں۔

نہج البلاغۃ سے گواہی

جناب امیر المومنین علیہ السلام اپنے خطبہ قاصعہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''میں جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ قریش آئے اور کہنے لگے کہ آپ ایسے مقام بزرگ پر فائز ہونے کا دعوی کر رہے ہیں جس کا آپ کے بزرگوں نے دعویٰ نہیں کیا۔ ہم ایک

---

[۱] مجمع البیان، مطبوعہ صیدا، ج ۵، ص ۱۸۶

[۲] مفاتیح الغیب، مطبوعہ مصر، ج ۸، ص ۷۴۸، ذیل تفسیر سورۂ قمر

کام چاہتے ہیں جس کو اگر آپ عملی جامہ پہنا دیں تو ہم جان لیں گے کہ آپ اللہ کے نبی اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اور اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ جادوگر اور جھوٹے ہیں۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''تم چاہتے کیا ہو؟''

انہوں نے کہا:

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ دعا کریں کہ یہ درخت اپنے مقام سے اکھڑ کر آپ کے سامنے آن کھڑا ہو۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا کر دیا تو کیا تم اس کی وحدانیت کی گواہی دو گے۔''

سب نے کہا:

''جی ہاں!''

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''جو کچھ تم مجھ سے چاہتے ہو وہ تو میں کر کے دکھا دوں گا لیکن میں جانتا ہوں کہ تمھاری ایک جماعت پھر بھی ہدایت نہیں پائے گی۔ نیز تمہارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بدر کی زمین پر مارے جائیں گے اور انھیں ایک کنوئیں میں پھینک دیا جائے گا۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درخت کی طرف دیکھا اور فرمایا:

''اگر تو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں تو اپنی تمام جڑوں سمیت اپنی جگہ سے اکھڑ جا اور خداوند عالم کے حکم سے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جا۔''

حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

''اس خدائے بزرگ کی قسم جس نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے، وہ درخت، اس حالت میں کہ ایک خوفناک آواز اس سے نکل رہی تھی، ایسی آواز جو پرندوں کے اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے سے نکلتی ہے، وہ درخت اپنی تمام جڑوں سمیت اپنی جگہ سے اکھڑا، آنحضرتؐ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، اپنی بلند شاخوں سے آنحضرتؐ پر سایہ کیا اور کچھ شاخیں مجھ پر بھی ڈالیں کیونکہ میں حضرتؐ کے دائیں پہلو میں کھڑا تھا۔''

''اس متکبر اور مغرور جماعت نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اعجاز کو دیکھ کر ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ یہ درخت دو حصوں میں بٹ جائے، نصف حصہ وہیں کھڑا رہے اور دوسرا نصف اپنی جگہ پر پلٹ جائے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا۔ پس وہ درخت اسی صورت پر آ گیا جیسا وہ چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ اب دوسرا نصف حصہ درخت بھی اپنے مقام پر واپس چلا جائے۔ آنحضرتؐ نے حکم فرمایا اور وہ آدھا درخت بھی اپنے مقام پر چلا گیا۔''[1]

جو حضرات نہج البلاغۃ کے عربی متن سے استفادہ کر سکتے ہوں ان کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ درج ذیل نکات کا خیال رکھیں۔

۱: جب قریش نے آنحضرتؐ سے اس قسم کے معجزہ کی خواہش کا اظہار کیا تو آپؐ نے ان کے جواب میں فرمایا:

''ان اللہ علی کل شئی قدیر''

''خداوند عالم یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہ اس لیے فرمایا کہ وہ لوگ اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوں کہ میں اس کام کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت سے امداد کا طالب ہوں اور ہرگز محدود طاقت بشری سے اس کام کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا۔''

۲: جس وقت آپ نے درخت کو مخاطب فرمایا تو اس طرح ارشاد فرمایا:

''فانقلعی بعروقك حتی تقفی بین یدی باذن اللہ''

''پس اپنی جڑوں سمیت اپنی جگہ سے اکھڑ کر بحکم خدا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جا۔''

معلوم ہوا کہ جب بھی پیغمبر چاہتے ہوں کہ اپنے ارادہ وخواہش سے ایسا کوئی خارق العادت کام انجام دیں تو ہمیشہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح باذن اللہ کا کلمہ استعمال کرتے ہیں تا کہ ہم سب کو سمجھائیں کہ کوئی شخص کسی بھی کام کی انجام دہی میں پروردگار عالم کی قدرت ورضا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، تاہم پورے کا پورا خطبہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ایسے امور میں درحقیقت پیغمبر ہی کا ارادہ وخواہش کارفرما ہوتے ہیں۔ لہٰذا جونہی کہ قریش نے چاہا آنحضرتؐ نے فوراً درخت کو حکم فرمایا کہ اپنی اصل حالت پر پلٹ جائے۔ چنانچہ آپ کا پہلا حکم اس طرح تھا:

''اے درخت! اگر تو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں، تو تو ایسا اور ایسا عمل بجالا۔''

---

[1] نہج البلاغۃ، فیض الاسلام خطبہ ۱۸۷ (قاصعہ)

اس قسم کی ولایت تکوینی کے اس قدر شواہد حدیث، تفسیر اور تاریخ کی کتب میں پائے جاتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے ایک فیصد کے بیان کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تاہم ہم نے اپنے مطالب کے ثبوت میں نصوص قرآنی اور نہج البلاغۃ سے آگے قدم نہیں اٹھایا تا کہ عام افراد حتیٰ کہ بہت زیادہ شک کرنے والے یا دیر سے یقین کرنے والے افراد بھی اعتبار کرلیں۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس جماعت میں بعض لوگ پہلے سے اپنے دل میں فیصلہ کیے ہوئے ہیں اس لیے اگر وہ راہِ حق کی طرف نہ لوٹیں۔ تو ہمیں وہی جملہ ان کے بارے میں کہنا پڑے گا جو آنحضرتؐ نے قریش سے فرمایا تھا۔ یعنی

"وانی لا علم انکم لا تفیئون الی خیر"

''اور میں جانتا ہوں کہ تم راہ حق کی طرف نہیں لوٹو گے۔''

لیکن ایک مسلمان مولف کا فرض یہ ہے کہ انتہائی غیر جانبداری سے اور تعصب سے ہٹ کر، جو کتاب خدا کا طریق کار ہے، حقائق کو سپرد قلم کرے تا کہ واقعات پر اطلاع پانے والے اور حقیقت کے متلاشی جو وجدانِ زندہ سے بہرہ ور ہیں اس سے استفادہ کرسکیں۔

ہم نے آغاز بحث میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور راہِ عبودیت کے طے کرنے سے انسان کے باطن میں ایک خاص قسم کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور انسان اس قوت کے زیر سایہ مندرجہ ذیل امور پر قابو پالیتا ہے:

۱: ضبط نفس

۲: بصیرت خاص

۳: پراگندہ افکار پر تسلط

۴: بدن کا روح سے تخلیہ

۵: بدن میں تصرف

۶: عالم آفرینش میں تصرف

یہ سب باتیں صحیح عبودیت اور عبادت کے آثار سے ہیں۔ اب ہم اس منزل پر ہیں کہ عبودیت کی ساتویں خصوصی کیفیت کے متعلق گفتگو کریں لیکن ضروری ہے کہ پہلے بطور مقدمہ ایک مطلب آپ کی خدمت میں پیش کریں۔

لطیف اجسام دنیا

عالم ہستی میں بعض ایسے اجسام بھی وجود رکھتے ہیں جو مادی اجسام سے لطیف تر ہیں۔ ایسے اجسام کے لیے جسم ''برزخی'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس قسم کے اجسام مادی جسم نہیں رکھتے لیکن شکل و رنگ و سمت و جہت جیسے خواص کے حامل ہوتے ہیں جو خواص اجسام میں شامل چیزیں ہیں۔

ہمارے مطلب کی وضاحت کے لیے بہتر ہوگا اگر آپ ذہنی ہیولوں اور صورتوں کے تصور کو سامنے رکھیں اور جو کچھ ہم عالم خواب میں مشاہدہ کرتے ہیں اسے بھی تحقیق و مطالعہ کے لیے سامنے لائیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان ان دونوں مواقف میں انسانی ہیولوں، صورتوں اور اجسام سے سروکار رکھتا ہے جو سب کے سب جسم کے خواص و آثار سے تعلق رکھتے ہیں، پھر بھی وہ مادہ جسمانی نہیں رکھتے۔

انسان ایک ہی لحہ میں ایک بڑے شہر یعنی تہران یا لاہور کی صورت اس کی تمام حدود اور خصوصیات کے ساتھ اپنے ذہن میں مجسم کر لیتا ہے۔ اب جو کچھ اس کے ذہن میں ہے اس کی کوئی مادی حیثیت نہیں ہوتی اگر چہ یہ تخیل صورت وشکل اور رنگ و فاصلہ درمیانِ اجسام کا حامل ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ان چیزوں کی ہے جو ہم خواب کے عالم میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہ دونوں کیفیات ہمیں عالم برزخ سے آشنا کر سکتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان چھوٹے چھوٹے نمونوں سے عظیم حقائق اور وسیع و عریض عالم کی تہ تک پہنچ سکتا ہے جن کی طرف قرآن مجید چند آیات مبارکہ میں اشارہ فرماتا ہے:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ (فاطر: ۱)

''حمد و سپاس ہے اللہ تعالیٰ کے لیے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور اس نے پیغام رساں فرشتے قرار دیئے ہیں جو دو یا تین یا چار پردوں کے حامل ہیں۔''

اس آیت مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ فرشتہ نام کی کوئی مخلوق اس عالم ہستی میں موجود ہے جو متعدد پروں کے ساتھ فضائے بے کراں میں پرواز کرتے ہیں۔ اب اگر ہم اس لطیف مخلوق خدا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ صفحہ ہستی اس قسم کے موجودات سے بالکل خالی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ حق نہیں رکھتے کہ بلاوجہ ظاہر آیت کی تاویلکر نے لگیں یعنی اس طرح نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت فرشتہ بس یہ ہے، بلکہ بعید نہیں کہ فرشتے طاقتور موجودات ہوں جو کبھی اپنے مثالی اور برزخی وجود سے یا اپنے گوناگوں پر و بال کے ذریعہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں۔ دوسرے لفظوں میں ممکن ہے کہ انسان یا کسی اور ہستی یا مخلوق کی شکل میں متمثل اور مجسم ہو کر سامنے آجائیں۔

اس بات کا شاہد یہ واقعہ ہے کہ ایک فرشتے جس کا نام 'روح' ہے حضرت مریم کے لیے انسان کی شکل میں ظاہر ہوا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم: ۱۷)

''روح (جبرئیل یا کوئی اور فرشتہ) اس کے سامنے انسان مکمل جسم میں ظاہر ہوا۔''

۷: اجسام لطیف کا مشاہدہ

آثارِ ولایت میں سے ایک جو عبادت اور قوت روحانی کا ماحصل ہے، یہ ہے کہ اجسام لطیف کو دیکھنے کی قوت پیدا ہو۔ نہ صرف اجسام

لطیف کو دیکھ سکے بلکہ ان کی آوازوں کو بھی سننے کے قابل ہو۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام آغازِ بعثت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی وضع زندگی کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں:

''میں نورِ وحی کو دیکھتا تھا، بوے نبوت کو سونگھتا تھا، نزولِ وحی کے وقت شیطان کی فریاد کو میں نے سنا اور آنحضرتؐ سے پوچھا: ''یہ فریاد کس کی ہے؟'' آنحضرتؐ نے فرمایا: ''یہ شیطان کی فریاد ہے کیونکہ جو اس کی پرستش کرتا تھا اب یہ اس سے مایوس ہوگیا ہے۔ اے علی! جو کچھ میں دیکھتا ہوں، تو بھی دیکھتا ہے، جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تو بھی سنتا ہے! فرق صرف اتنا ہے کہ تو نبی نہیں ہے۔ لیکن تو میرا وزیر اور صراط مستقیم پر ہے۔''[1]

فرشتوں کو دیکھنے اور ان کی غیر معمولی آوازوں کو سننے پر قادر ہونا کمالِ روحانی کی علامت اور حیات معنوی کا نتیجہ ہے جو راہِ عبودیت پر چلنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نص قرآن کے مطابق، جبرئیل امین کو ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے نزدیک دیکھا۔[2] جبرئیل کو دیکھنا قوتِ روحانی اور کمالِ معنوی کی منزل ہے جو انسان کو اس قدر طاقت بخشتا ہے کہ انسان اس قسم کی ہستی کو دیکھ پائے۔

بنی اسرائیل کی خواتین میں صرف حضرت مریم فرشتہ کو دیکھنے پر قادر تھیں۔ انہوں نے فرشتہ سے باتیں کیں اور وہ انھیں بشارت دیتا ہے کہ وہ جلد ہی ایک فرزند کی ماں بنیں گی۔[3] یہ سب تصرفات اس روحانی کمال کا نتیجہ ہیں جس کی وہ حامل تھیں۔

ولایت تکوینی سے متعلق سوالات کے جوابات

'اشاعرہ' حضرات اہل سنت کے علم کلام کے علماء کی ایک جماعت ہیں جو معارف عقلی کے بارے میں خاص قسم کے عقاید رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ حضرات تمام موجودات عالم کو اللہ تعالیٰ کا براہ راست فعل جانتے ہیں۔ ہم جس چیز کو سبب جانتے ہیں وہ اسے ایک آلہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جب ایک بڑھئی لڑکی کو آری سے چیرتا ہے تو چیرنے والا تو درحقیقت بڑھئی ہی ہوتا ہے لیکن آری اس کا اوزار اور وسیلہ کہلائے گا......'اشاعرہ' کی نظر میں تمام اسباب طبیعی کی مثال بڑھئی کی آری کی طرح ہے۔ بلکہ ان کی ایک جماعت کے خیال میں تو اسباب طبیعی کی حیثیت بڑھتی کی آری سے بھی کم ہے کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق اسباب خود اپنے مقام پر کوئی خاصیت واثر نہیں رکھتے جبکہ ہماری نظر میں آری کم از کم لکڑی چیرنے کی خاصیت تو ضرور رکھتی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، فیض الاسلام، خطبہ ۱۵۷ (قاصعہ)

[2] سورہ النجم آیہ ۱۳، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ ۱۴ یعنی ایک بار پھر اسے دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس (ایک درخت ہے عرش کے دائیں طرف)

[3] سورۂ مریم، آیات ۱۷ تا ۲۱

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آگ کا جلانا اور آفتاب کا روشنی دینا براہ راست افعال باری تعالیٰ ہیں۔ان کے مطابق آگ وحرارت اور سورج وروشنی کے درمیان چھوٹے سے چھوٹا بھی کسی طرح کا رابطہ نہیں۔ یہ صرف ارادۂ باری تعالیٰ کا کرشمہ ہے کہ آگ سے جلانے اور سورج سے نور کو پیدا فرماتا ہے حالانکہ خود آگ اور سورج اپنے ان نتائج میں کسی قسم کا معمولی سا دخل بھی نہیں رکھتے۔

اس طرزِ تفکر کے بے بنیاد ہونے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف وجدان وتجربہ اس نظریہ کے خلاف شاہد ہیں بلکہ نصوص قرآن بھی اسکے خلاف واقع ہوئی ہیں۔قرآن مجید اسباب طبیعی کو آثار ونتائج میں موثر قرار دیتا ہے۔[1] یہی طرزِ تفکر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ بعض علماء چند ایک موارد میں اس مکتب فکر کے قائل ہو گئے اور وہ انبیاء کے معجزات کو براہ راست ذات باری تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ حضرات انبیاء کرام کو ذریعہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے حتیٰ کہ جو شخص مسائل اسلامی کے بارے میں معمولی سا ادراک بھی نہیں رکھتا، اس سلسلہ میں اس طرح لکھتا ہے۔

"عالم طبیعی میں ارادۂ پروردگار کا تصرف اور طرزِ عمل دو طرح پر ہوتا ہے، ایک مستقل واستمراری اور دوسرا ناگہانی واچانک۔ پہلی قسم سنتہائے طبیعی پر مشتمل ہے جو مخلوق خدا کے لیے مستقل قوانین کا درجہ رکھتی ہیں۔ دوسری قسم معجزات سے تعلق رکھتی ہے جو عالم طبیعی میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ معجزات امورِ طبیعی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تحت انبیاء کی رسالت کے ثبوت کے طور پر عالم طبیعی سے ظاہر ہوتے ہیں اور قوت بشری کسی طرح بھی ان کے ظاہر ہونے میں دخل انداز نہیں ہوتی۔"

یہ اشعری عقیدہ کا مکتب فکر ہے جو تمام طبیعی اور غیر طبیعی واقعات کو براہِ راست فعل خدا جانتے ہیں۔ یہ لوگ اسباب ومسببات کے قائل نہیں جن پر خلقت وآفرینش کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

مندرجہ بالا عقاید پیش کرنے والا اپنے طرز فکر کے لیے کچھ دلائل پیش کرتا ہے جس کا ہم مختصر ذکر کرتے ہیں:

۱: قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾ (یس: ۸۲)

"(معجزات میں) اس کا امر اس طرح ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے (اور اسے حکم دیتا ہے) تو اس سے کہتا ہے 'ہو جا' تو وہ چیز بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔"

(یعنی صورت تکوینی اختیار کر لیتی ہے) لہٰذا معجزات کا وقوع خلاق عالم کے ارادہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسباب وتوانائی سے بالاتر ہے۔

---

[1] ہوا اور بارش کی پیدائش اور بارش سے نباتات کی پرورش کے بارے میں متعلقہ آیات قرآن مجید کی طرف رجوع فرمائیں۔ہم نے اسباب طبیعی کے بارے میں نظریہ قرآن کی اس مجموعہ کی پہلی جلد میں وضاحت کر دی ہے۔

جواب: ان عقاید کے داعی کو چاہیے کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ یہ آیہ مبارکہ انبیاء کے معجزات سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ استدلال کے طور پر پیش کی جانے والی آیت مبارکہ سورۃ یس کی آیت ۸۶ ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق کا تعلق معاد سے ہے جن میں معجزات انبیاء کی کوئی بحث نہیں ہے۔ لہٰذا سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنے والے نے اس آیہ مبارکہ کا، جو معجزات انبیاء سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی، کیوں سہارا لیا ہے؟

۲: ولایت تکوینی اس ارادہ کی شان و اہمیت کو ظاہر کرتی ہے جس کی تمام کائنات سے نسبت ہے۔ اس کے مقاصد مادی زندگی اور قوت سے بالکل خارج ہیں۔ یہ چیز خلاق عالم کے ارادہ اور اللہ تعالیٰ کے دارۂ اختیار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

جواب: ولایت تکوینی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں میں سے کوئی بندہ تکامل روحانی کے زیر اثر اس قوت کے تحت جس کو اس نے مرکز قدرت سے حاصل کیا ہے، عالم کے کسی حصہ میں تصرف کر سکے۔ لہٰذا ہم کسی دلیل کے تحت یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فعل اس ذات کی جانب سے ظہور پذیر ہوا ہے جو عالم مادی سے باہر زندہ ہے؟ ہم آخر اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کے منکر کیوں بنیں؟ جب بھی اللہ تعالیٰ چاہے کہ اپنے کسی بندہ کو ایسی قوت عطا فرمائے تو ارادۂ خدا کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ کیا یہ امر محال ہے کہ قدرتِ خدا ان چیزوں سے تعلق نہ رکھے۔

۳: اس کے بعد لکھنے والا 'باذن اللہ' کے جملہ سے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے متعلق ہے، استدلال کرتا ہے۔

اب جبکہ بحث یہاں تک پہنچ چکی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ولایت تکوینی کے بارے میں کسی قدر مفصل گفتگو کریں تاکہ بہت سے اندیشہ ہائے باطل و افکارِ نارسا کی پورے طور پر وضاحت ہو جائے۔

الف) توحید اور ولایت تکوینی

عالم آفرینش عالم اسباب و مسببات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارادہ حکیمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ واقع ہونے والا ہر حادثہ اپنے مخصوص اسباب کا مرہون منت ہو۔ اس کے باوجود اسباب و علل کا تمام نظام اللہ تعالیٰ کی ذات پر منتہی ہوتا ہے اور اسی سے یہ اپنی قوت و طاقت حاصل کرتا ہے۔ وہی وہ ذات ہے جو سبب کو پیدا کرتی ہے، پھر اسے قوت و طاقت بخشتی ہے اور اسے اس کے مخصوص معلول کی ایجاد پر آمادہ فرماتی ہے۔ درحقیقت تمام کائنات میں موثر حقیقی صرف ایک ہی ہے اور تمام نظام کائنات، جو اسباب و مسببات کی شکل میں جلوہ گر ہے، سب اسی موثر حقیقی سے مدد حاصل کرتا اور اسی پر منتہی ہوتا ہے۔

حقیقت توحید یہ ہے کہ ہم ہر سبب کو اس کے نتائج کے اعتبار سے مستقل نہ جانیں اور یہ خیال بھی نہ کریں کہ حضرت احدیت کی قدرت ربوبیت کی موجودگی میں کوئی اور ہستی اپنے مقام پر مستقلاً کسی چیز کو خلق کر سکتی ہے، نظام آفرینش میں تصرف کرنے کی اہل ہے اور اس کا ارادہ خداوند عالم کے ارادہ سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہی توحید در افعال ہے جس کے بارے میں مراتب توحید کے ذکر میں مفصل بحث و گفتگو ہو چکی ہے۔

اس بنیاد کو قبول کر لینے سے اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے بارے میں ولایت تکوینی پر اعتقاد نہ صرف یہ کہ شرک کی آمیزش نہیں رکھتا بلکہ یہ

عین توحید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بھی ہم کسی کی معمول کی حرکات کو، خواہ وہ بالکل عمومیت کی منزل پر ہوں، یعنی چلنا پھرنا، بات چیت کرنا وغیرہ یا وہ غیر معمولی حرکات یعنی انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء کی کرامات ہوں، مستقل و با اختیار سمجھ لیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ وہ شخص ان افعال کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے علیحدہ انجام دیتا ہے تو اس صورت میں ہم شرک میں آلودہ ہوں گے۔

لیکن انسان کو اگر ہر مقام و منزل میں ہر قسم کے افعال و ایجاد میں مستقل تصور نہ کریں، اس کے عمل کو ارادۂ خدا سے علیحدہ نہ جانیں تو اس صورت میں نہ تو ہم جادۂ توحید سے متجاوز ہوں گے اور نہ ہی صراط مستقیم سے منحرف قرار پائیں گے۔

جاننا چاہیے کہ توحید و شرک کی اصلیت و بنیاد یہ نہیں کہ ہم تمام عمومی و طبیعی افعال کو بندوں کی طرف ہی منسوب کر دیں، ان کو ایسے تمام افعال میں مستقل و مختار جانیں اور ایسے بڑے بڑے کاموں کو، جو نظام طبیعی کے دائرہ سے باہر ہیں، براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دیں کیونکہ اس طرح تو شرک سے فرار ہوتے ہوئے بھی ہم شرک سے دوچار ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اصلیت توحید یہ ہے کہ بندگانِ خدا کو تمام افعال کے مقام فاعلیت میں اللہ تعالیٰ کی قوت و تصرف سے بے نیاز نہ جانیں، خداوند عالم کے ارادہ و مشیت کو انسانوں کی خواہش سے ماوراء سمجھیں اور اس سلسلہ میں خارق العادۃ اور دیگر افعال میں کسی طرح کا فرق نہ رکھیں۔

اصولی طور پر اس طرح ہونا چاہیے کہ ہم تمام موجوداتِ عالم کے مقام و اصلیت کا مقام ربوبیت کی مناسبت سے اندازہ لگائیں اور تحقیق کریں۔ دنیا میں کوئی وجود، عام اس سے کہ مجرد ہو یا مادی ہو، اذن و قدرت خداوند تعالیٰ کے بغیر کسی فعل کا فاعل نہیں ہو سکتا۔ ہر فاعل کی حیثیت بطورِ فاعل اور ہر موثر شے کی تاثیر، آفتاب کی درخشندگی سے لے کر ماہتاب کی نور افشانی تک، عوام الناس کے چلنے پھرنے اور بولنے چالنے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کو شفایاب کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے تک، ایک قوت کے اثر سے ہوئی ہے جو خداوند تعالیٰ سے اخذ ہوتی ہے، ایک قوت کے زیر سایہ عمل کرتی ہے جو ہر وقت مقام ربوبیت سے انسان تک پہنچتی رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں فاعل دانا اور غیر دانا اور عمومی و غیر معمولی افعال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس طرح انسان کے تمام افعال ایک معنی میں خود اس کے معلول اور دوسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے معلول ہوتے ہیں۔

اس حقیقت کو صرف فلسفہ کے دلائل ہی سے ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ اہل بیت رسالت کی متواتر احادیث میں یہ حقیقت بطور "بل امر بین الامرین" وارد ہوئی ہے۔ کیونکہ ایک جماعت نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کے افعال کو براہ راست فعل خدا سمجھا اور اپنے آپ کو آلہ کار سے کسی طرح بہتر نہیں جانا۔ یہ جبر یہ عقیدہ کے لوگ ہیں جن کو اصطلاح علماء میں "مجبرہ" کہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں "مفوضه" کی جماعت ہے جو انسان کو اس کے افعال میں بالکل با اختیار اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف یہ کہتے ہیں "ہم اپنے وجود اصلی کے لیے خداوند عالم کے محتاج ہیں، افعال و ایجاد میں نہیں۔"

مکتب تشیع کے معصوم ائمہ نے کتاب خدا یعنی قرآن مجید اور علوم نبوی سے استفادہ کرتے ہوئے ان دونو مکاتب فکر کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے:

لا جبر ولا تفویض بل منزلة بین المنزلتین[1]

''نہ تو جبر صحیح ہے اور نہ تفویض بلکہ ایک منزل ہے ان دونوں منازل کے درمیان (یعنی ان دونوں راستوں کے مابین ایک راستہ)۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مردہ کو زندہ کرنے کو فعل خدا کا نام دیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے ''خدا نے زندہ کیا کیونکہ تمام قدرتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات والاصفات ہے۔ اگر خدائے بزرگ حضرت عیسیٰ کو قوت عطا نہ فرماتا تو وہ ہرگز نہ کسی بیمار کو شفایاب کر سکتے اور نہ ہی ان سے کوئی مردہ زندہ ہوتا۔'' اسی طرح ہم اس فعل کو حضرت عیسیٰ کا فعل قرار دیتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ''حضرت عیسیٰؑ نے مردہ کو زندہ کر دیا کیونکہ جو قدرت ذاتِ باری تعالیٰ نے انھیں عطا فرمائی تھی وہ اسے اس موقع پر کمال حریت و آزادی کے ساتھ بروئے کار لائے۔''

قرآن مجید ایک مقام پر قبض روح کو فعل خدا گردانتے ہوئے فرماتا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر: ۴۲)

''اللہ تعالیٰ لوگوں کی جانوں کو موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔''

لیکن ایک اور مقام پر اسی کام کو فرشتہ موت کا فعل قرار دیتا اور فرماتا ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ: ۱۱)

''کہہ دیجئے کہ ملک الموت جس کو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری جان لے لیتا ہے۔''

ان دونوں نسبتوں میں اصل نکتہ یہ ہے کہ فرشتہ موت اللہ تعالیٰ کا مامور کردہ اور اس کا غیبی کارندہ ہے۔ یہ فرشتہ اس قوت و طاقت کے ساتھ، جو اسے پروردگارِ عالم کی طرف سے مرحمت ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے لوگوں کی روح قبض کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حیرت خیز اعمال کی انجام دہی میں اسی حیثیت کے مالک ہیں جو ملک الموت کو حاصل ہے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور اور اس کی قدرت کے زیر سایہ اپنے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ولایت تکوینی کے بارے میں شرک کی ہر قسم کی فکر و سوچ قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور خداوند عالم کے لیے علل جہانی کی نسبت میں عدم دقت کی وضاحت کرتی ہے۔

ب) ولایت تکوینی اور موضوع بشریت

کبھی کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کے خارق العادہ کام کا انجام دینا اور آفرینش میں تصرف مقام بشریت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا بشریت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان صرف امور عمومی کی انجام دہی پر قادر ہے اور اس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرکانِ

---

[1] بحارالانوار، ج ۵، ص ۷۱

قریش نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند ایک معجزات کا مطالبہ کیا تو آنحضرتؐ نے ان کے جواب میں فرمایا:

سُبۡحَانَ رَبِّیۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۳﴾ (اسراء: ۹۳)

''پاک ومنزہ ہے میرا رب کیا میں ایک پیغام رساں بشر کے علاوہ اور کچھ بھی ہوں؟''

اس بات کے جواب میں ہم مختصراً کہتے ہیں کہ آخری دو صدیوں میں جب مستشرقین کی توجہ اسلام کے سمجھنے کے سلسلہ میں زیادہ ہوئی تو انھوں نے ایک بات یہ بھی کہی کہ پیغمبر اسلامؐ ہر قسم کے اعجاز وکرامت سے خالی تھے۔ یہ لوگ اپنے اس خیال کے ثبوت میں متذکرہ بالا اور دوسری ایسی ہی آیات سے استدلال کرتے ہیں۔[1]

ان آیات سے ولایت تکوینی کے بارے میں استدلال کرنا، علاوہ اس کے کہ ایک طرح کا عیسائیت کی طرف رجحان ظاہر کرتا ہے، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ استدلال قائم کرنے والے آیات کے صحیح مقاصد ومعانی سے واقفیت نہیں رکھتے جب وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے آپ کو بطور بشر متعارف کرواتے ہیں اور منزل اعجاز کو ارادہ ومشیت خالق پر محمول کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب ''رسالت جہانی پیامبراں'' میں ان آیات کے مطالب پر مفصل بحث کی ہے۔ یہاں اس بحث کا دہرانا مناسب نہیں، تاہم مختصراً اس بحث کے مطالب کو پیش کرتے ہیں۔

---

[1] 'مشکوۃ صدق' کے مولف نے، جو بیت المقدس کے عیسائی علماء میں سے ایک ہے، اپنی کتاب میں بہت سی آیات کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب کا فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ لاہور میں بھی چھپی ہے۔ آخری ایام میں عیسائی دنیا کے استعمار کے ایک ملازم نے ایک کتاب بعنوان ''رسالتِ بست وسہ سالہ'' آنحضرتؐ کے بارے میں تحریر کی ہے۔ اس نے بھی ان آیات کا بیشتر حصہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ ہم نے اس پر تنقید کی صورت میں ایک کتاب ''بعنوان ''رازِ بزرگِ رسالت'' تحریر کی ہے جو کافی مشہور ہوئی ہے ہم نے ان آیات مبارکہ کو جمع کر کے ان کے اہداف ومقاصد کو اس کتاب میں واضح کر دیا ہے۔

وہ لوگ انبیاء علیہم السلام سے سات معجزات طلب کرتے تھے جن میں سے بعض محال و ناممکن تھے[1] مثلاً خداوند عالم کو دکھانا، جیسا کہ وہ کہتے تھے او تاتی باللہ یعنی خدا کو ہمارے پاس لے آ۔

بعض دوسرے مطالبات تھے جو مقصد رسالت سے پورے طور پر مختلف اور اس کے منافی تھے، مثلاً آسمان کو ان کے سر پر گرانا جوان کے موت کا سبب بنے۔ ایسی سب صورتوں میں مقصد رسالت ہی جو ہدایت و رہبری ہے، ختم ہو کر رہ جاتا، جیسا کہ وہ کہتے تھے:

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (اسراء: ۹۲)

''آسمان ہمارے سروں پر گرا دیجیے۔''

ان کے علاوہ بعض اور لوگ تھے جو ممکن ہے ہدف رسالت سے مغائرت نہ رکھتے ہوں لیکن وہ کسی طرح بھی آنحضرتؐ کی راست گوئی اور آپ کے عالم وحی سے کسی طرح کی مطابقت کی دلیل و گواہ بننا نہ چاہتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے: ''بے شک تمہارا کوئی باغ اور نہایت عمدہ گھر ہو۔'' جیسا کہ کہتے ہیں:

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ (اسراء: ۹۱)

''تمہارے پاس بے شک کھجوروں اور انگوروں سے بھرا ہوا باغ ہو۔''

حالانکہ ثروت و تمکنت کسی رسول کی رسالت کی دلیل نہیں ہوتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ''اوناسس'' یونانی زبان میں اربوں کے مالک، سب کے سب آسمانی پیغمبر ہوتے۔

---

[1] انبیاء اکرم سے ان کا مطالبہ سورۂ مبارکہ اسراء آیت ۹۰ تا ۹۲ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝۹۲ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳

''اور انہوں نے کہا ہم تجھ پر بالکل ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ زمین سے ہمارے لیے چشمے نہ نکالے، یا یہ کہ تیرا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس کے درمیان پانی کی نہریں جاری ہوں، یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے حاضر کرو، یا یہ کہ تیرا زرنگار گھر ہو، یا یہ کہ تو آسمان پر چڑھ جائے اور پھر تیرا آسمان پر چڑھ جانا ہمارے ایمان لانے کے لیے دلیل نہیں بنے گا مگر یہ کہ ہم پر ایسی کتاب نازل کرے، جسے ہم پڑھیں۔ آپ کہہ دیں کہ منزہ پاکیزہ ہے میرا پروردگار۔ کیا میں ایک پیغام پہنچانے والے بشر سے زیادہ ہوں؟''

قرآن مجید ان کی ایسی درخواستوں پر تنقید کرتے ہوئے ذیل کے دو جملے ارشاد فرماتا ہے:

۱: سبحان ربی۔ منزہ ہے میرا پروردگار۔ اس جملہ سے پیغمبر اکرمؐ نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ کی رویت ومشاہدہ، جو ان کی درخواست کا مقصد تھا اور اسی طرح ہدف ومقصد رسالت کے منافی کام مثلاً آسمانوں کو ان پر گرانا یا ایسے ہی لغو و بے معنی اور غیر موثر افعال کا انجام دینا اور ایسے دیگر کاموں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ وتقدیس فرمائیں۔ لہٰذا فرمایا کہ میرا اللہ اس سے پاک ومنزہ ہے کہ اسے دیکھا جائے یا رسالت کے ہدف ومقصد کے منافی کوئی کام انجام دے۔

۲: هل کنت الا بشرا رسولا کہہ کر اللہ تعالیٰ کو، استدلال کرنے والوں کے تصور کے خلاف، کہیں بھی اپنے پیغمبرؐ کو عاجز وناتواں شخص کے طور پر متعارف کرانا مقصود نہ تھا۔ بلکہ اس جملہ هل کنت الا بشرا رسولا یعنی ''میں پیغام لانے والے بشر سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوں'' سے آنحضرتؐ نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ پیغام لانے والے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطیع ہیں، جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اس کو بجالاتے ہیں، سب کام خداوند بزرگ کے ہاتھ میں ہیں اور ایسا ہرگز نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ ان کے ہر مطالبہ کو تسلیم فرمالیں۔

دوسرے لفظوں میں آیہ مبارکہ نے جواب کی منزل میں اللہ تعالیٰ کو پاک ومنزہ قرار دینے کے بعد دو کلموں یعنی 'بشر' اور 'رسول' کا سہارا لیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ان کاموں کے بارے میں مجھ سے اس لیے تقاضا کرتے ہو کہ میں ایک بشر ہوں تو تمہاری یہ درخواست درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے امور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے محتاج ہیں اور عام انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔ اس کے برعکس اگر تمہارا مطالبہ اس بنا پر ہے کہ میں پیغمبر ہوں تو پیغمبر جس چیز پر مامور ہوتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے پیغمبر اسے بجالاتا ہے اور خود اپنے مقام پر آزادی اور اختیار نہیں رکھتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ معجزہ پیش کرنا اس طرح پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے یا جب بھی لوگ مطالبہ کرنے لگیں فوراً معجزہ دکھادے۔ وہ ایک پیغمبر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی وارادہ کی من وعن پیروی کرتا ہے۔ لوگوں کا مطالبہ اس کے لیے تکلیف معجزہ پیدا نہیں کرتا۔ اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح ہی ہیں کہ معجزہ کا اختیار اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل دو آیات سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (رعد: ۳۸)

''کوئی پیغمبر یہ حق نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرے۔''

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ؀ (مومن: ۷۸)

''کوئی پیغمبر یہ حق نہیں رکھتا کہ خداوند عالم کی اجازت کے بغیر معجزہ پیش کرے۔ جب پروردگار عالم کا

فرمان آن پہنچتا ہے تو سرکش افراد کے بارے میں فیصلہ ہوسکتا ہے اور اہل باطن نقصان اٹھاتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارادہ حکیمانہ اور معجزہ کے لیے اجازت ہر موقع اور محل میں موجود نہیں ہوتی بلکہ اس کی کچھ شرائط ہیں۔ یہ آیات مبارکہ جو معجزہ طلب کرنے والوں کا نفی میں جواب دے رہی ہیں، اس بات پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اذن، شرائط کے محقق نہ ہنے کی بناء پر نہیں ہوتا۔ یہ مطلب اس بات کے مطابق نہیں کہ ہم کہہ دیں کہ چونکہ پیغمبرؐ اسلام قرآن کے سوا اور کوئی معجزہ نہیں لائے، اس لیے اصطلاح کے مطابق ایک خاص نفی ایک عام نفی کی گواہ نہیں ہوا کرتی۔

ج) ولایت تکوینی اور مسئلہ غلو

مسئلہ ولایت کے تصرف کے بارے میں باطل تصورات وخیالات میں یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ اس قسم کا اعتقاد ائمہ حق کے بارے میں غلو کو ظاہر کرتا ہے جبکہ اس قسم کے اعتقاد کا غلو سے ہر گز کوئی تعلق نہیں۔

’غالی‘ وہ ہوتا ہے جو بندگانِ خدا کو مقام عبودیت سے بالاتر لے جائے، ان کے لیے صفات وافعال خداوند عالم ثابت کرے۔ مثلاً یہ کہے کہ نظام آفرینش کی جملہ تدابیر آئمہ معصومین کے ہاتھ میں ہیں اور انھیں پر خالق، رازق، محی اور ممیت جیسی صفات کا اطلاق ہوتا ہے۔

حقیقت غلو یہ ہے کہ ہم انھیں خدا جانیں یا انھیں افعال خداوندی کا فاعل تسلیم کریں[1]۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی بھی ولایت تکوینی کا حصہ نہیں ہے، کیونکہ ان حضرات کو نہ تو کوئی خدا سمجھتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے افعال کو ان کے لیے ثابت کرتا ہے، اس کے برعکس ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات ایک سلسلہ علل کے تحت، جس کا عصمت کے موضوع میں ذکر ہو چکا ہے، ایسی قوت کے حامل ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ان حالات میں جو ارشاد واصطلاح کے ذمہ دار ہوں، عالم آفرینش وخلقت میں تصرف کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ افکار ونظریات کی یہ دونوں اقسام ایک دوسرے سے اس قدر بعید ہیں کہ ان دونوں کے درمیان بہت مشکل سے کوئی مشابہت نظر آسکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پروردگارِ عالم اپنے کسی بندہ کو لوگوں کے لیے ارشاد وہدایت کی منزل میں کسی کام کی انجام دہی کی طاقت دیتا ہے تو خود اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی بندۂ صاحب ولایت منزل عبودیت سے آگے بڑھتا ہے۔ ایک انسان کامل کی حیثیت اس کے پروردگار کے سامنے ایک بیٹے کی حیثیت کی مانند ہے جو اپنے باپ کی دوکان میں باپ ہی کے سرمایہ سے تجارت کرتا ہے یا وہ انسان کامل ایک وکیل کی مانند ہے جو اپنے موکل کے سرمایہ سے اپنا کاروبار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بیٹے اور اس وکیل کا دائرہ اختیار وقدرت، باپ اور موکل کے ارادہ وخواہش کی ایک شاخ ہوگی۔ اس لحاظ سے اس قسم کے قدرت واختیار ہرگز شرک کے معنی میں نہیں آسکتے، بلکہ ان میں تو شرک کی بو یا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔

اس کیفیت کو اس طرح سمجھیں کہ اگر خداوند عالم کسی فرشتہ یا فرشتوں کی کسی جماعت کو یہ طاقت عطا فرمائے کہ وہ قوم لوط کی سرزمین پر

---

[1] افعالِ خداوندی سے مراد یہ ہے کہ فاعل اپنے فعل میں مستقل ہو اور اس کے انجام دینے میں کسی مقام پر کسی سہارے کا محتاج نہ ہو، خواہ اس کا فعل طبیعی صورت میں انجام پائے یا بطورِ معجزہ۔ اس بات کی تفصیل اس کتاب کی دوسری جلد میں آچکی ہے۔

بمباری کر کے اسے زیرو زبر کر دیں تو ان میں اس قسم کی قوت کا وجود کبھی بھی شرک اور فرشتوں کا خدا کا شریک ہونا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر اس قسم کی طاقت اپنے کسی بندہ یا بندوں کی کسی جماعت کو عنایت فرما دے تو اس کا یہ عمل اس کے دامن کبریائی کو گرد آلود کرنے کا ہرگز باعث نہیں بن سکتا۔

امام ہشتم کی ایک دعا

بہتر ہوگا اگر ہم اس مقام پر امام ہشتم علیہ السلام کی ایک دعا پر غور کریں جس میں آپ نے اپنے زمانہ کے غالیوں سے دوری اور برأت چاہی ہے۔ امام علیہ السلام اس دعا میں غالیوں کے عقیدہ سے بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں جو کائنات کی خلقت اور بندگانِ خدا کو روزی دینے کے افعال کو آئمہ علیہم السلام سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دعا واضح کرتی ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگ ائمہ معصومین علیہم السلام سے خارق العادۃ افعال کے ظہور کو دیکھ کر غلط اور ناروا قسم کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے دیتے ہیں۔ لہٰذا امام علیہ السلام اس طرح کے تصورات باطل سے برأت و دوری کے لیے درج ذیل دعا فرماتے ہیں:

> ''پروردگار! میں ایسے لوگوں سے بیزاری چاہتا ہوں جو ہمارے حق میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہم نے نہیں کہی ہیں۔ پروردگار! خلقتِ کائنات اور بندوں کا رزق تیرا ہی کام ہے اور ہم تیری عبادت کرتے اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔''
>
> ''پروردگار! تو ہمارا، ہمارے آباء اور ہماری اولاد کا خالق ہے۔ بارِالٰہا ربوبیت اور الوہیت تجھے ہی زیبا ہیں۔ ہم ایسے لوگوں سے برأت و دوری چاہتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے پروردگار، خالق اور رازق ہیں۔ بارِالٰہا! ہم نے یہ باتیں انھیں نہیں بتلائی ہیں۔ ان کی باتوں کا ہم سے مواخذہ نہ فرما۔''[1]

امام علیہ السلام خالق کائنات کے ساتھ اس راز و نیاز میں ان باطل تصورات کے بارے میں اظہارِ خیال فرماتے ہیں جن میں یہ سمجھا گیا ہے کہ کائنات کی سرپرستی و قیومیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، بندوں کو روزی دینے والے، دنیا اور قیامت میں ان کو مارنے اور زندہ کرنے والے ہیں۔ حالانکہ صاحب ولایت وہ انسان کامل ہوتا ہے جو ایک طرح کا تسلط تکوینی اس عالم پر رکھتا ہے۔ یہ تسلط ایسا نہیں ہوتا کہ ہم یہ کہنے لگیں کہ صاحب ولایت زمین و آسمان کا خالق، انسانوں اور جنات کو وجود دینے والا، خلائق کو زندگی اور موت دینے والا یا نظام عالم کا مدبر اور اسے چلانے والا ہوتا ہے۔ یہاں ہم چند ناگریز نکات کا ذکر کریں گے جو اس طرح ہیں:

الف) اس میں کوئی شک نہیں کہ نظام عالم علت و معلول کے ایک سلسلہ کی بنیاد پر قائم ہے اور ہر علت و سبب کی بساط اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ناقد

---

[1] بحارالانوار، ج ۲۵، ص ۲۴۳

اور مشیت کے تحت ہے۔ کسی کلی کا چٹکنا، کسی جاندار کا بار آور ہونا، برف و بارش کا برسنا وغیرہ ایک سلسلۂ علل و اسباب کا ماحصل ہوتا ہے اور یہ سب آخر کار ذات باری تعالیٰ پر جا کر منتہی ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک نظام کے زیر سایہ ہو رہا ہے جس کی بنیاد پر یہ عالم پیدا کیا گیا ہے۔ ہر لمحہ لاکھوں مخلوقات صفحہ وجود پر ظاہر ہوی رہتی ہیں جو سب مادی و طبیعی علل و اسباب کے ایک سلسلہ اور ایک غیر مرئی رشتہ اسباب کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ غیر مرئی رشتہ اسباب اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق عالم طبیعی کے پردہ میں تدبیر عالم کے سلسلہ میں کارفرما ہے۔

قرآن مجید ان مرئی اور غیر مرئی اسباب و علل کے بارے میں فرماتا ہے: (النازعات:۵) ''(ان فرشتوں کی قسم) جو نظام خلقت کے امور کی تدبیر میں مشغول ہیں۔'' یہ مدبرین اللہ تعالیٰ کے حکم سے تدبیر و گردش کائنات میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ آیہ مبارکہ صراحت کے ساتھ بتلاتی ہے کہ نظام آفرینش نظام علت و معلول ہے۔

لٰہذا وہ غالی جماعت جو ذات رسولؐ اور ذوات ائمہ علیہم السلام کو مدبر عالم، رازق اور خلائق کو زندہ کرنے والا جانتے ہیں شدید قسم کی غلطی و خطا کے مرتکب ہوتے ہیں اور انھوں نے ایک انتہائی نظریہ باطل کو اپنے ذہن میں جگہ دے رکھی ہے۔ ان کی فکر و نظریات صرف اس اعتبار سے خطاء و غلطی نہیں کہلاتے کہ یہ نظریات شرک و دوگانگی کے مظہر ہیں، کیونکہ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں کہا گیا ہے کہ عالم آفرینش اسباب و مسببات پر قائم ہے، نہ ہی یہ کہ توحید باری تعالیٰ نظریۂ ذات و افعال کے اعتبار سے یہ معنی نہیں رکھتی کہ ہم علت معلول کے نظام کو باطل قرار دے دیں اور یہ کہنے لگیں کہ عالم وجود میں آنیوالی ہر شے ذات پروردگار سے براہِ راست متعلق ہے، بلکہ اس نظریہ و فکر کے بے معنی ہونے کا سبب یہ ہے کہ جو حضرات (اولیاء اللہ) ان سب باتوں کے سبب نہیں ہیں ان کو سبب جان لیا جائے۔ یہ لوگ غیر علت کو علت کی منزل میں قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان حضرات کو تاثیر واقعات میں یہ لوگ با اختیار سمجھتے ہیں۔ اس طرح یہ نہ صرف غلو کرتے ہی بلکہ شرک کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔

کوئی انسان کبھی بھی ایک انسان کامل کی حیثیت میں کسی فیض بخش واسطہ کی جگہ نہیں لے سکتا، بلکہ وہ خود ان وسیلوں اور واسطوں کے ذریعہ فیض کو حاصل کرتا ہے۔ سورج کی شعائیں، برف و بارش، کلیوں کا کھلنا، سب باتیں انبیاء و ائمہ معصومین اولیائے الٰہی کی حیات مقدسہ کی امانتدار ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے فرشتہ ان کے پاس وحی لے کر آتا ہے، ان کی ارواح بھی ملک الموت ہی قبض کرتا ہے [1] اور ازل ہی سے ان کی زندگی کی حفاظت، ان کے تکمیل ملکات اور فضائل اخلاقی کے لیے محافظ اور نگہبان مقرر

---

[1] اس بارے میں قرآن مجید سورۂ انعام کی آیت ۶۱ میں اس طرح فرماتا ہے: ''وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا''۔ یعنی ہم تم پر نگہبان مقرر فرماتے ہیں یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے مامورین تمہاری روح قبض کر لیتے ہیں۔

کیے جاتے ہیں۔[1]

اس سے ثابت ہوا کہ تمام افرادِ بشر حتی کہ انسان ہائے کامل کی وہ جماعت بھی جو ایک طرح سے صاحبان ولایت ہیں اور انسان و کائنات پر اختیار رکھتے ہیں، نظام عالم سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور کسی مادی و معنوی وسیلہ کے فیوض کی خود جگہ نہیں لیتے۔ لیکن یہ سب کچھ اس امر میں ہرگز مانع نہیں کہ یہ حضرات کبھی کبھی صالح کلی کے ایک سلسلہ کے تحت، ہوا و ہوس سے دور ہو کر، عالم میں کرامات و تصرفات کے باعث بنیں اور اشارۂ غیبی کے زیر سایہ عالم تخلیق میں تصرفات کریں۔

ب) قلوب و ارواح اور انسان و کائنات پر انسان کامل کے تصرف کی حدود و وسعت ہم پر پوری طرح واضح نہیں۔ ہم بالکل نہیں جانتے کہ یہ حضرات کہاں تک دنیا پر حکمران ہیں۔ ہم چونکہ ان تمام مراحل سے دور ہیں لہٰذا ہم ان کی قوت و تسلط کا دقیق اندازہ ہرگز نہیں لگا سکتے۔ تاہم وحی سے کلیۃً یہ خبر حاصل ہوتی ہے کہ یہ حضرات علم کتاب کے حامل اور فیض الٰہی کے جاری کرنے والے ہیں اور ان کی یہ کیفیت سنت الٰہی کا حصہ ہے۔

ج) اس قوت و تسلط کے مالک حضرات کئی علل و اسباب کے زیر اثر، جن میں سے ایک بندگی و تسلیم محض ہے، اس مقام بلند پر پہنچے ہیں۔ یہ حضرات فطری طور پر اپنی گفتار و کردار میں ہر قسم کی ہوا و ہوس سے دور ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تصرفات پر ان کا اختیار امور معنوی و مصالح کلی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہوتا کہ ہم جو کچھ ان سے چاہیں، وہ اسے انجام دیں۔ ان کی کرامات ایک سلسلہ مصلحات (جن میں زیادہ تر ارشاد و اصلاح کے پہلو ہوتے ہیں) کی خاطر انجام پاتی ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہوتا کہ اولیائے خدا ہمیشہ معجزات و کرامات دکھاتے رہیں۔ بلکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے حکم سے خاص مواقع پر اعجاز و کرامت کے مظہر بنتے ہیں اور آیاتِ قرآن مجید اس سلسلہ میں بے شمار واقعات پر شاہد ہیں۔

---

[1] امیر المومنین نہج البلاغۃ میں اپنے خطبہ ۱۸۷ (خطبہ قاصعہ) میں فرماتے ہیں: "ولقد قرن الله به من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملئكة يسلك به طريق المكارم و محاسن اخلاق العالم" جس دن سے کہ پیغمبر اکرمؐ کی دودھ بڑھائی ہوئی ایک فرشتہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات پر مامور ہوا کہ آنحضرتؐ کو بزرگی کی راہ پر چلائے اور نیک اخلاق میں رہبری کرے۔

عصمت ائمہ بروئے قرآن

قرآن میں امام کے مفہوم سے وافیت اور اس الہامی کتاب میں عصمت امام کے دلائل قرآن مجید اور علم کلام کے بہت قیمتی اور اہم مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم ان دلائل کو اس مقالہ میں تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے۔

علم کلام کی کتب کی رو سے امام اس شخص کو کہتے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد جملہ امور کو اپنے ہاتھ میں لے کر تمام ذمہ داریوں کو نبھا سکے۔

اس سلسلہ میں علماء کے درمیان دنظریات ہیں جو بالکل متضاد ہیں۔ ایک جماعت علماء امام کے لیے عصمت اور گناہ سے پاک ہونے کی بنیادی شرط تسلیم کرتی ہے، جبکہ دوسری جماعت اس سلسلہ میں معاملہ فہمی اور کاروبار حکومت چلانے کی قابلیت کے علاوہ کسی شرط کو ضروری نہیں جانتی۔

عصمت امام کے متعلق اساس اختلاف

عصمت آئمہ کے سلسلہ میں یہ دو متضاد نظریات امام کے بارے میں دو بنیادی متضاد تصورات اور مفہوم امامت میں اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئے ہی۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی اس تضاد کا باعث ہے کہ ''خلافت پیغمبر'' سے کیا مراد ہے؟ کیا جانشینی رسول نبوت کی طرح ایک خدائی مقام ومنصب ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ امام صاحب وحی اور بانی شریعت نہیں ہوتا، یا یہ کہ امامت ایک منصب عرفی ہے اور وزارت کی مانند ہے جو لوگوں کی طرف سے یا کسی اور مقام سے جانشین رسول کو دیا جاتا ہے؟

اول الذکر نظریہ کے مطابق امام ایک ملکوتی انسان ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم وتربیت حاصل کر کے انسان کامل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لہٰذا طبعاً ایسے انسان میں عصمت اور گناہ سے بعد اس کے مقام وحیثیت کے لیے لازمی ہے اور اس کی حیثیت واقعی کی مظہر ہونی چاہیے۔

اس کے برعکس موخر الذکر نظریہ کے مطابق امام لوگوں کی طرف سے ایک منتخب انسان ہوگا یا کسی مجلس واجتماع کی طرف سے مقرر کردہ ہوگا جو بعض علل وصلاحیتوں کی وجہ سے مسائل حیات میں لوگوں کی رہبری، امن وامان برقرار رکھنے، عدل کے اجراء اور جملہ اداروں کی سالمیت کے لیے منتخب ہوا ہو۔ ایسے شخص کے لیے سیاست ومعاملہ فہمی کی قابلیت سب سے بڑی شرط ہوتی ہے۔ باقی رہا خلوت وجلوت میں گناہ سے پرہیز، تو یہ کوئی لازمی شرط نہیں۔

امامت وخلافت کے معنی میں ان دو متضاد نظریات کی بناء پر عصمت امام کے مسئلہ میں شدید اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ ایک جماعت امام میں عصمت کو لازمی قرار دیتی ہے جبکہ دوسری اس کے لازم ہونے کی قائل نہیں۔

اصولی طور پر امامت کے مسئلہ میں بہت سے اختلافات باعث حقیقت امامت کے بارے میں دو متضاد نظریات کی موجودگی

ہے۔ جو شخص عہدۂ امامت کو نبوت و رسالت کی طرح ایک مقام من جانب اللہ اور منصب معنوی تسلیم کرتا ہے وہ امام میں ایسی شراط کے وجود کا قائل ہے کہ اس کا مقابل گروہ، جو امامت کو منصب ریاست جمہوری یا وزیر اعظم کے عہد کی طرح ایک منصب عرفی جانتا ہے، اول الذکر جماعت کے عقیدۂ امامت کے دسویں حصہ تک بھی حیثیت امام کو نہ صرف نہیں مانتا بلکہ امامت کے لیے ایسی شرائط کی موجودگی ان کے لیے تعجب انگیز امر ہے۔

اس بیان کے مطابق آپ تعجب نہیں کریں گے کہ باقلانی امام کے بارے میں کہتا ہے کہ خلیفہ میں درج ذیل شرائط معتبر ہیں:

۱: قریشی ہو

۲: ایک قاضی جتنا علم و آگہی رکھتا ہو

۳: جنگی طریق کار، دفاع کی تدابیر، سرحدوں کی حفاظت، مرکز کی سالمیت، ظالم سے انتقام کے طریقوں سے بخوبی آگاہ ہو۔ [1]

اس کے بعد اضافہ کرتا ہے:

"لا يتخلع الامام بفسقه وظلمه بغصب الاموال و ضرب الابشار و تناول النفوس المحرمة و تضييع الحقوق و تعطيل الحدود. ولا يجب الخروج عليه، بل يجب وعظه و تخويفه و ترك طاعته فى شىء مما يدعوا اليه من معاصى الله۔"

''امام مالوں کے غصب کرنے، چہروں پر طمانچہ مارنے، محترم نفوس کو قتل کرنے، حقوق کے ضائع کرنے، حدود کو معطل چھوڑنے سے اپنے مقام و اہمیت سے خود بخود معزول نہیں ہوتا، بلکہ امت پر لازم ہے کہ وہ امام کو نصیحت کرے، اسے ڈرائے اور گناہ کے موارد میں اس کا حکم نہ مانے۔''

تفتازانی شرح مقاصد میں کہتا ہے:

---

[1] "ان يكون قرشيا من صميم، ان يكون فى العلم بمنزلة من يصلح ان يكون قاضيا من قضاة المسلمين، ان يكون ذا بصرية بأمر الحرب و تدبير الجيوش و السرايا و سد الشغور وحماية البيضة وحفظ الامامة و الانتقام من ظالمها والاخذ لمظلومها۔" (التمہید ص:۱۸)

یہ کتاب عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ کے متکلم قاضی ابوبکر محمد بن طیب کی تالیف ہے، جس کی وفات ۴۰۳ھ میں پینسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ کتاب ریحانۃ الادب ج۱ ص ۲۲۲ تا ۲۲۳ کی طرف رجوع کریں۔

"اذا مات الامام و تتصدی للامامة من یستجمع شرائطها من غیر بیعة واستخلاف و قهر الناس بشوکته انعقدت الخلافة له. و کذا اذا کان فاسقا او جاهلا علی الاظهر الا انه یعصی فیما فعل و یجب طاعة الامام مال یخالف حکم الشرع سواء کان عادلاً اوفاسقا". [1]

''جب ایک امام مر جائے اور دوسرا قہر و غلبہ سے خلافت حاصل کرے تو وہ خلیفہ اسلام ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر فاسق خلیفہ ہو جائے یا احکام اسلام سے جاہل ہو تو اس کے غیر شرعی حکم کی اطاعت لازم نہیں، خواہ وہ عادل ہو یا فاسق۔''

بعض اوقات ایسے لوگ جو بہتر عقل و ادراک رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ امام کو عادل ہونا چاہیے، تاکہ ظلم کا مرتکب نہ ہو، [2] اصول و فروع میں مجتہد ہو، یہ لوگ امام کے لیے نہ تو عصمت کو ضروری جانتے ہیں نہ ہی اس کے لیے تمام مسائل دین کا جاننا لازمی قرار دیتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام کو اصول و فروع دین میں مجتہد ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ بھیکرتے ہیں کہ ایک جماعت اس شرط کو ضروری خیال نہیں کرتی۔

ان تمام اختلافات کے باوجود جو اس مکتب کے مصنفین پیش کرتے ہیں، ان میں بعض حضرات امام کے لیے عدالت کی شرط ضروری جانتے ہیں جبکہ بعض دیگر حضرات اس شرط کو لازمی قرار نہیں دیتے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ امام کا علم ایک قاضی کے علم جتنا ضروری ہے جبکہ کئی حضرات کے خیال میں امام کو اصول و فروع میں مجتہد ہونا چاہیے۔ ان تمام مختلف نظریات کے باوجود ایک مشترک مطلب سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام اسی معاشرہ سے آنے والا ایک فرد ہونا چاہیے جو علم و آگہی اور عدالت و استقامت میں بے شک امت ہی کی سطح پر ہو۔ بہرحال امام کے لیے منصوص من اللہ ہونا لازمی نہیں۔ اس اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ امت میں سے منتخب ہونے والے شخص سے عالم تر اور پاکیزہ تر شخص بھی موجود ہو تاہم جب افراد امت کسی شخص کو مقام امامت کے لیے منتخب کرلیں تو سب اس کی اطاعت لازم ہے اگرچہ اس کی اطاعت ایسے افعال و افکار میں ضروری نہیں جن میں گناہ یا غلط کاری کا پہلو نکلتا ہو، بلکہ ایسے کاموں اس کی اطاعت حرام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس مکتب فکر کے حامل لوگ بہت سے معاویہ، یزید، مروان ہشام عبدالملک، مہدی عباسی، ہارون عباسی کو خلیفہ پیغمبر جانتے تھے جن کے ہاتھ کہنیوں تک ملت کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو ہر روز خون انسانی سے گویا نہاتے تھے، ان کو ''امیر المومنین''

---

[1] شرح مقاصد الطالبین فی علم اصول عقائد الدین، مطبوعہ استنبول ۱۳۰۵ھ، تالیف مسعود بن عمر بن عبداللہ خراسانی جو ۷۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۷۹۱ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب متن و شرح کی شکل میں ہے اور دونوں اسی مولف کی ہیں۔

[2] ''المواقف'' تالیف قاضی عضدالدین عبدالرحمن با احمد ایجی، متوفی ۷۵۶ھ مطبعۃ السعادۃ مصر مطبوعہ ۱۳۴۹ھ ہمراہ شرح سید شریف جرجانی۔

کہہ کر سلام کرتے اور ان کے حکم و رائے کو نافذ العمل قرار دیتے تھے۔

دورِ حاضر میں بھی بعض ممالک جو اصطلاح کے اعتبار سے اسلامی کہے جاتے ہیں اور اپنے لیے حکومت اسلامی کے تکلفات کو محفوظ سمجھتے ہیں، ان کے خطیب نمازِ جمعہ میں اپنے حاکموں کے لیے امیر المسلمین یا امیر المومنین کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، خواہ وہ ہزاروں غلط کاریوں اور انفرادی و اجتماعی برائیوں کے مصدر ہوں اور ایسے اشخاص کی پیروی کے لیے درج ذیل آیہ مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

(نساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول اور ان کی اطاعت کرو جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔''

ہمارے خیال میں مندرجہ بالا بحث جو ہم نے اس جماعت کے علم کلام کی اسانید کی بنیاد پر پیش کی ہے، اس مکتب فکر کی اصلیت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ تاہم اپنے قارئین کرام کے اطمینان کی خاطر اور اپنی گفتگو کی حمایت میں ہم ان مصنفین کے چند ایک مزید عقاید نقل کرتے ہیں۔

اسفرائنی شافعی امامت کے تحقق اور ثبوت کے لیے قہر و غلبہ یعنی اصطلاح کے مطابق سفید یا سرخ انقلاب کو جائز جانتا اور کہتا ہے:

"بالقهر والا ستيلا ولو كان فاسقا اوجاهلا"۔ [1]

''اطاعت و تسلط کے ساتھ مسلط ہونے والا شخص خواہ فاسق اور احکام و حدود اسلام سے جاہل ہی کیوں نہ ہو، اس کی امامت متحقق ہے۔''

''الوقاية في فقة الحنفية'' کا مولف ایک مسئلہ پیش کرتا ہے جو اس کی نظر میں مقام امامت کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"انه لا يحد الامام حد الشرب لانه نائب الله"۔ [2]

''اگر امام شراب پی لے تو شراب خوری کی حد اس پر جاری نہیں ہوگی کیونکہ وہ نمائندہ خدا ہے۔''

شارح ''العقاید النسفیہ'' اپنے اس دعویٰ کے متعلق کہ امام کا گناہ یا اس کی آلودگی اس کے معزول یا برطرف ہونے کا موجب نہیں ہوسکتی، اس طرح استدلال کرتا ہے:

---

[1] دلائل الصدق، ج ۲، ص ۱۲

[2] دلائل الصدق، ج ۲، ص ۱۲

"لا ینعزل الامام بالفسق والجور لانه قد ظهر الفسق والجور فی الائمة ولامراء بعد الخلفاء والسلف کانوا ینقادون بهم"۔ [1]

''امام گناہ وظلم سے آلودگی کے باوجود مقام امامت سے معزول و برطرف نہیں ہوتا کیونکہ ائمہ و امرائے اسلام سے، جو خلفاء کے بعد دنیا میں آئے، گناہ ظاہر ہوتے رہے لیکن تمام امت مسلمہ ان کی اطاعت کرتی رہی۔''

اس قسم کے مکتب فکر کا نتیجہ واقعہ کربلا، مدینہ منورہ کے حادثہ، حرہ اور حجاج وسفاح جیسے خونخوار لوگوں کا امت کے جان و مال پر تسلط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ جو لوگ ان کے حکم سے جنگ کرتے اور تلوار چلاتے تھے اپنے آپ کو مجاہد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

مکتب تشیع میں مقام امامت

مکتب تشیع میں امامت کا مقام بالکل مختلف ہے۔ اس مکتب فکر کے نزدیک امامت ایک منصب و مقام من جانب خدا ہے، جس کے دعویدار اور مسئول کو اللہ تعالیٰ مشخص فرماتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہنا ہوگا کہ جس طرح نبوت ایک مقام و منصب خداوندی ہے، نبی یا پیغمبر کا تعین ذاتِ پروردگار کی جانب سے ہونا چاہیے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی شخص لوگوں کے انتخاب سے مقام نبوت تک پہنچ جائے، بالکل اسی طرح امامت بھی مقام و منصب خداوندی ہے اور اس مقام تک کوئی شخص عوام کے انتخاب یا بذریعہ انتخاب اہل حل وعقد، یا مجلس شوریٰ کے ذریعہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

ایک پیغمبر کے مقابلہ میں عوام الناس دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کو مومن اور کافر کہا جاتا ہے۔ عوام الناس جمہوری حکومتوں کی طرح ہرگز یہ اختیار نہیں رکھتے کہ کسی شخص کو عہدۂ پیغمبری کے لیے منتخب کر لیں یا اسے مسترد کر دیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس مقصد کے لیے انتخاب، اتفاق رائے، اکثریت عوام یا شوریٰ کے مباحث بے معنی ہیں۔ اس کے برعکس اس مسئلہ میں شناخت وعدم شناخت، ایمان و انکار اور تصدیق و تکذیب کے مراحل سامنے آتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ایک مکمل اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ ''مسیلمہ کذاب'' کو متفقہ طور پر نبوت کے لیے منتخب کر لیں اور اس عہدہ کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ووٹ بھی حاصل نہ کر پائیں، پھر بھی بہترین جمہوری اصولوں اور قابل ترین آزاد فکر رکھنے والوں کی یہ تمام مساعی انتخاب ہرگز کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔ اس سلسلہ میں وراثت، انتصاب (عوامی طرزِ عمل سے) انتخاب، غلبہ، امیدواروں کی کامیابی وغیرہ وغیرہ جیسے سب مسائل بے معنی قرار پاتے ہیں۔

بعینہ یہی اصول منصب امامت کے لیے بھی کارفرما ہیں۔ امامت، بلکہ صحیح تر الفاظ میں قوام امامت امام کے وجود کی اصلیت ہوتی ہے۔

[1] دلائل الصدق، ج ۲، ص ۱۲

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے نبوت پیغمبر کے وجود کی ایک حقیقت ہوتی ہے یا جیسے فصاحت کسی فصیح البیان کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انہی خصوصیات کی مدد سے نبیو نابغہ میں امتیاز کرنا چاہیے۔ بعض اوقات لوگ موضوعات کی شناخت کا ملکہ رکھتے ہیں یعنی مثال کے طور پر الماس کو قیمتی پتھروں سے شناخت کر لیتے ہیں یا ایک منقلب شدہ الماس و بلور والماس میں امتیاز کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات لوگوں میں اس قسم کی تشخیص ممکن نہیں ہوی۔ ان حالات میں چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طریقہ سے لوگوں سے اپنے آپ کو متعارف کروائیں۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہ رسم و رواج، شرف دنیوی، بے معنی انتخابات، بے بنیاد فضائل یا داخلی و خارجی ذرائع سے رسمی افضیلت کی مدد سے کوئی شخص اس مقام کو حاصل کر سکے۔

ہم اس حقیقت کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ معلوم ہو سکے کہ مقام امامت انتخاب اور چناؤ سے کس طرح برتر و بالاتر ہے۔

اصولی طور پر کسی مقام بلند کے حصول کے دو طریقے ہوتے ہیں:

ایک وہ مقام و منصب ہے جو کسی عامل خارجی کے ذریعہ تحقق پاتا ہے، مثلاً کار تفویض جو انتخاب اور عوام کی رائے سے انجام پاتا ہے یا جیسے کسی مقام بلند و برتر کے لیے کسی شخص کو مقرر کرنے کا طریقہ وضع کیا جاتا ہے۔

دوسرا مقام وہ ہے جہاں ہرگز افراد کا انتخاب اور مقام برتر و بلند تر پر تعین بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھیں کہ ایک شخصیت فصیح و بلیغ پارسا و نیک، شاعر، مصنف، موجد و محقق وغیرہ کے مقامات و منازل انتخابی یا انتصابی قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ایک ورزش کرنے والے پہلوان کو بذریعہ انتخاب متعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں کسی کا امیدوار ہونا کوئی معنی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انتصاب و انتخاب میں کامیاب یا ناکام نابغہ، نابغہ ہی رہے گا اور مصنف مصنف ہی قرار پائے گا اگرچہ کوئی دوسرا شخص اس کی فصاحت و تصنیف کی قابلیت کی تائید کرے یا نہ کرے۔

اس کی دوسری مثال اس طرح سمجھیں کہ ابن سینا حصولِ علم کے لیے فلسفہ سفر و گردش کا ماہر ہے۔ شہاب الدین سہروردی فلسفہ اشراق کا استاد ہے۔ سیبویہ عربی ادب کا عظیم ماہر ہے۔ علامہ حلی فقہ شیعہ کے استاد ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مقامات و مناصب ان سب ماہرین کی ذات کا حصہ ہوتے ہیں۔ تصویب اور انتخاب سے یہ مقامات حاصل نہیں ہوتے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں یہ سب منازل و مقامات حقیقی و واقعی ہیں، اعتباری اور جعلی نہیں۔

جب مکتب تشیع میں یہ کہا جاتا ہے کہ امام منصوص من اللہ ہونا چاہیے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ ایسا شخص جس میں رہبری کے شرائط جمع ہوں وہ لوگوں سے متعارف ہو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتصاب لوگوں کی تشخیص کا وسیلہ ہوتا ہے نہ کہ کسی شخص کا خلافت پر متمکن ہونا کیونکہ اس مقام کا مالک حقیقت میں اپنے تعین کے موقع تک کسی طرح پریشان نہیں ہوتا، بلکہ حق صاحب حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتا ہے۔ صرف پردۂ جہالت نے اس کے اصلی رخ کو چھپایا ہوا ہوتا ہے اور وہ بھی وحی الٰہی کے ذریعہ ہی برطرف ہوتا ہے۔

اصولی طور پر نصب یا انتصاب وغیرہ جیسے الفاظ طاغوتی و فسطائی نظاموں میں ایسے موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں جن کا تعلق جو رو استبداد، خودسری، سلب حریت و آزادی یا دوسروں کے حقوق کو غصب و سلب کرنے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اعتقادی مسائل کے بارے میں ایسے الفاظ کا استعمال ان کے متضاد معانی رکھنے کی حیثیت سے غیر صحیح معانی کے لیے جگہ فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اس حصہ بحث کی وضاحت

کرتے ہیں تا کہ اس امر کی صراحت ہو جائے کہ ہمیں مختلف قسم کے انتصاب سے سابقہ پڑتا ہے۔

غیر مستحق افراد کا انتصاب مذکورہ نظاموں میں مجلس شوریٰ وسینٹ کی کرسیوں کے حصول کی خاطر مستحق اور شائستہ افراد کی محرومیت کا باعث بن جاتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کا انتصاب مستحق وشائستہ فرد کے تعارف کے لیے صحیح راستہ دکھانے کے معنی میں ہوتا ہے، جوامت کے تمام مادی ومعنوی حالات وضروریات میں رہبری کا ذمہ دار ہوتے ہوئے کاروانِ انسانی کو منزل کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے انتصاب کا وجود نہ ہوتا، یعنی مستحق ولائق افراد کا انتصاب ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب سے معین ہونے کا طریق کار موجود نہ ہوتا، تو تکمیل دین کبھی نہ ہو پاتی۔ وفات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو خلاء پیدا ہوا، اس کی طرف غور کرنے سے اس بات کی دلیل واضح ہو جاتی ہے۔

آخر میں ہم یہ بات روشن کیے دیتے ہیں کہ علماء اہل سنت میں ابن خلدون اپنے مقدمہ میں دونوں مکاتب فکر کی حقیقت واصلیت کو ایک مختصر سی عبارت میں بیان کرتا ہے۔ابن خلدون اہل سنت حضرات کے نظریہ امامت کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے:

"الامامة: المصالح العامة التی تفوض الی نظر الامة و یتعین القائم لها بتعیینهم"

''(اہل سنت کے نظریہ کے مطابق) امامت ان عمومی مصالح میں سے ایک ہے جوامت کے ساتھ تعلق رکھت ہیں۔لہٰذا جس کو بھی (امت) متعین کرے وہی ان کا پیشوا ہوگا۔''

"الامامة لدی الشیعة: رکن الدین و قاعدة الاسلام ولا یجوز لنبی اغفاله ولا تفویضه الی الامة بل یجب علیه تعیین الامام لهم ویکون معصوما من الکبائر و الصغائر۔" [1]

''اہل تشیع کے لیے امامت دین کا ستون اور اسلام کا رکن ہے۔پیغمبرؐ کے لیے اس سے غفلت برتنا جائز نہیں ہے، یا یہ کہ اس عہدہ کو امت کے سپرد کر دے۔ بلکہ لازم ہے کہ امام کا تعین کرے جو ہر قسم کے گناہانِ کبیرہ وصغیرہ سے معصوم ومحفوظ ہو۔''

زیادہ واضح الفاظ میں یہ جاننے کہ بعد رسول امامت وپیشوائی کا مطلب ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے جن کا

[1] مقدمہ ابن خلدون، مطبوعہ المکتبة التجاریہ، مصر، ص ۱۹۶

تعلق مقام رسالت سے ہوتا ہے اور امام ان تمام فرائض کی بجا آوری کا ذمہ دار ہوتا ہے جن کی ذمہ داری رسول اور پیغمبر پر ہوتی ہے۔[۱] رسول و امام کی حیثیت میں صرف یہی فرق ہوتا ہے کہ پیغمبر بانی دین ہوتا ہے، حامل وحی الٰہی اور ولی کتاب ہوتا ہے۔ ان صفات کے علاوہ تمام دیگر مواقع کی خاطر امام پیغمبر کا نمائندہ صحیح، اصول و فروع دین کو واضح اور بیان کرنے والا، دین کا تحریف کے خلاف محافظ و نگہبان، دینی و دنیوی تمام امور کا مرجع اور مقام نبوت سے متعلق جملہ فرائض کی ادائیگی میں پیغمبر کا جانشین کامل ہوتا ہے۔

اس نظریہ وفکر کے تحت کہ امامت فرائض رسالت کو برقرار رکھنے کا عہدہ ہے امام، نبوت و نزول وحی کی منزل کو چھوڑ کر، پیغمبر کی مکمل تصویر یا عکس ہوتا ہے، امام کے لیے ضروری ہے کہ مذکورہ شرائط کے علاوہ دو اور شرائط کا بھی حامل ہو جن کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱: امت میں سب سے بڑا عالم یعنی اعلم ہو۔ اسلام کے اصول دین اور فروع دین کی نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہو۔ اس نے یہ علم عام افراد سے حاصل نہ کیا ہو تا کہ وہ اصول و فروع اسلام سے متعلق تمام امور کا واضح کرنے والا ہو اور تمام علمی و معنوی ضروریات امت کو پورا کر سکے حتی کہ اس کی موجودگی میں امت کسی اور فرد یا مقام کی اپنی تمام ضروریات و مصالح کی خاطر محتاج نہ ہونے پائے۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ دیں کہ امام کے لیے لازم ہے کہ وہ معارف اور اصول، نیز جملہ فروع و احکام اسلام کے بارے میں وسیع ترین اطلاع و آگہی کا حامل ہو کیونکہ اس قدر وسیع علم کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اسلامی معاشرہ میں وفاتِ رسول سے جو خلاء معرض وجود میں آیا ہے، وہ پر ہو سکے۔

۲: گناہ سے معصوم ہو اور خطا سے پاک و منزہ، کیونکہ منزل عصمت پر فائز ہوئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی گفتار و رفتار سے عوام الناس کے اعتماد کو حاصل کر پائے۔ اس کو عوام الناس کے لیے نمونہ ہونا چاہیے کیونکہ عصمت کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کے قلوب و ارواح میں نفوذ حاصل کر سکے۔ لہٰذا ان دو امور یعنی لوگوں کے اعتماد کے حصول اور ان کے افکار و سوچ میں نفوذ کی خاطر لازم ہے کہ امام ہر قسم کی عمداً وسہواً لغزشوں سے ہر طرح مصئون و محفوظ ہو۔[۲]

---

[۱] زیادہ دقیق نظر سے دیکھا جائے تو امامت کے معنی پیغمبر کے بعد خود امامت پیغمبر کو قائم و برقرار رکھنا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے نبوت و رسالت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن آنحضرتؐ کا عہدۂ امامت آپؐ کے بعد آنے والے آئمہ علیہم السلام کے ذریعہ جاری رہا۔ اگر کبھی یہ کہا جائے کہ امامت فرائض رسالت کو قائم و جاری رکھنے کا ادارہ ہے تو اس کے معنی بعد رسولؐ ایک قسم کی سہولت کا قیام ہے حقیقت یہ ہے کہ امامت امام وفات رسول اکرمؐ کے بعد آنحضرتؐ کے مقام امامت کو برقرار اور جاری رکھنے کی ایک صورت ہے کیونکہ جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا رسول اکرمؐ نبوت و رسالت کے علاوہ اس منزل امامت کے بھی حامل تھے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کو مرحمت ہوئی تھی۔

[۲] یاد رکھنا چاہیے کہ امام کو نئے اور جدید حوادث کے ظہور سے متعلق احکام کا جاننے والا اور واضح کرنے والا ہونا چاہیے۔ وہ آیات قرآنی وغیرہ کا مفسر ہو اور ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کا مالک ہو جن کے پیغمبرؐ حامل تھے۔ لہٰذا وہ تمام دلائل عقلیہ جو عصمت پیغمبر ان پر وارد ہوتے ہیں، ان کو امام پر بھی منطبق ہونا لازم ہے۔ (اس پر غور فرمایئے گا)

جس طرح مکتب تشیع میں امام ہونے کی شرائط بڑھ جاتی ہیں، یعنی امام کے لیے جس طرح قابلیت کے علاوہ معاملہ فہمی و عدل و داد گستری کی صفات کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح دو اور شرائط کا اضافہ ہوتا ہے جن کو 'علم وسیع' اور 'عصمت' کے نام دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس مکتب فکر کے لحاظ سے اجتماعی عدالت کے قیام، امن و امان کی برقراری، اسلام کی توسیع اور ایسے ہی دیگر امور کے علاوہ امام کا درجِ ذیل دو امور پر بھی تصرف ہونا لازم ہے۔

ا: وہ قرآن کے اصول و فروع کو مکمل طور پر بیان کرے اور ہر قسم کی علمی، فکری اور سیاسی ضروریات کو پورا کرے جو اسلامی معاشرہ میں رونما ہوں۔

۲: دین کو ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رکھے تا کہ معارف و احکام دین اصلی حالت میں لوگوں تک پہنچیں، بزرگوں سے آئندہ نسلوں تک صحیح صحیح منتقل ہوں، حدیث اور تاریخ کے سوداگر و تاجر اور خارجی دشمن دین کے حقائق سے کھیلنے نہ پائیں۔

عصمت امام کی ایک اور دلیل

مباحث سابقہ میں امامت و جانشینی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دو مکاتب فکر کے نزدیک اس مسئلہ کی ماہیت و اصلیت کو کسی قدر واضح کیا گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ مکتب تشیع کے نزدیک عصمت کی صفت مقام امام کے لیے کیوں لازم قرار دی گئی ہے جبکہ مکتب تسنن کے نزدیک ایسی کڑی شرط باعث استعجاب ہے۔

اصولی طور پر مکتب تشیع میں، جو امامت کو منزل نبوت و رسالت کے فرائض کی مکمل انجام دہی کے لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں، سوائے اس کے کہ منصب امامت میں تاسیس دین اور نزول وحی شامل نہیں، امام کے لیے لازم ہے کہ تمام فرائض نبی اکرمؐ کا متحمل ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بعد نبی امام خود نبی ہی کی طرح معصوم ہو کیونکہ اس کیفیت کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اپنے محولہ فرائض کو پورا کر سکے۔ اس کے برعکس مکتب تسنن کے علماء کے نزدیک جو مقام امامت کو ریاست جمہور اور وزیر اعظم کی منزل قرار دیتے ہیں، اسی قدر کافی ہے کہ امام کے لیے امورِ مملکت کو سنبھالنے کی عقل و سمجھ پر کفایت کر لی جائے، جبکہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ نبوت و سرالت کی منزل سے متعلق دیگر فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام دینے پر بھی قادر ہو۔

حضرات اہل سنت کی کتب ملل و نحل اور علم کلام کی کتابوں میں مکتب تشیع کی ان کی نظر میں جن کمزوریوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل تشیع حضرت علیؑ اور ان کے فرزندان علیہم السلام کی عصمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اہل سنت حضرات اس عقیدۂ شیعہ سے وحشت زدہ ہیں اور اس پر اتنے ہی متعجب ہیں جس قدر (مثلاً) اہل تشیع نظریۂ ''جبریہ'' سے متعجب ہیں۔

اہل تسنن کے تعجب کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات مسئلہ امامت کو اپنے دریچۂ فکر سے مشاہدہ کرتے ہیں، امامت کو ایک عام مقام خیال کرتے اور امام کو معمولی شخصیت کا حامل فرد جانتے ہیں۔ لہٰذا اس طرزِ فکر سے عصمت حضرت علی اور ان کے فرزندان علیہم السلام کا عقیدہ ان کے لیے سوائے اظہارِ تعجب کے اور کچھ فراہم نہیں کرتا۔ اس کے برعکس شیعہ اس بات پر ایمان کامل رکھتے ہیں کہ امام پیغمبر اکرمؐ کی طرح امت کی

طرف اللہ تعالیٰ کے فیض معنوی کے لیے واسطہ کا مقام رکھتا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں ان کے لیے کسی طرح کا کوئی مقام تعجب واقع نہیں ہوتا۔

اس بحث سے دو نتیجے نکلتے ہیں:

۱: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مقام امامت ایک مقام تنصیصی ہے۔ ایک عام انسان خواہ علم و دانش و بصیرت کے اعتبار سے کسی بھی مرتبہ پر ہو، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تربیت نہ ہوئی ہو اور اس نے علوم نبوی کو طریق غیب سے اخذ نہ کیا ہو، وفاتِ پیغمبرؐ سے پیدا شدہ خلاء کو نہ تو پر کر سکتا ہے اور نہ ہی مشکلات پر قابو پانے کی اس میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

۲: جب تک جانشین پیغمبرؐ غلطی و گناہ بلکہ خطا و اشتباہ سے مبراء اور امور متعلق بہ شریعت میں معصوم نہ ہوگا، وہ فرائض پیغمبرؐ اور ان کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے پر ہرگز قادر نہ ہوگا۔

لہٰذا اللہ کی طرف سے ملنے والی تربیت، وسیع علوم کا مالک ہونا، عامۃ الناس سے ماوراء مقام کا حامل ہونا، ہر قسم کے گناہ لغزش سے معصوم ہونا، نئے نئے پیدا ہونے والے حالات سے متعلق احکام بنیادی طور پر حل کرنے کی شرط، آیاتِ قرآن کے مقاصد کی تفسیر میں مہارت، شبہات و اشکالات کے جواب دینے کا ملکہ، دین میں ہر قسم کی تحریف کے خلاف محافظت، امام کی بنیادی صفات ہیں۔

اس سے قطع نظر جو تمام دلائل عقلی، جن کی عصمت پیغمبرؐ کے بارے میں وضاحت کی گئی، مثلاً بعثت کے مقاصد کا تحقق، لوگوں کے اعتماد کا حصول، وغیرہ سب ایک طرح پر، شیعی بصیرت کے مطابق، امام کے بارے میں بھی قرار پاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اس دلیل کو مختصر الفاظ میں پیش کریں تو کہنا ہوگا کہ امام کا معصوم ہونا اس مکتب فکر کے لیے لازم ہے جو امام کی منزل کو رسالت کے فرائض کا انجام دہندہ مانتے ہیں اور یہ انجام دہی فرائض امام کے معصوم ہونے کے سوا ممکن نہیں۔

اب ہم اس منزل پر ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی دلیل کو ایک اور زاویہ سے یا زیادہ تشریح کے ساتھ پیش کریں جو اس طرح ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے اسلامی معاشرہ میں ایک سلسلہ خلاء پیدا ہو گیا جن کا پر کرنا امام معصوم کے وجود کے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان خلاؤں کا سدباب، جن کی ابھی ہم تشریح کریں گے، اگر ضروری سمجھا جائے، تو حتمی طور پر لازم ہے کہ یہ سب ایک امام معصوم ہی کے وجود سے ممکن ہوں گے کیونکہ ایک عام انسان کے لیے اس قسم کے امکانات ناممکن ہیں۔

وہ خلاء جو رحلت رسولِ اکرمؐ سے پیدا ہوئے، ان کی تفصیل مختصراً یہ ہے: [1]

الف) نئے پیدا ہونے والے حوادث سے متعلق بیان احکام جو سابق میں کبھی بھی واقع نہیں ہوئے۔

ب) آیاتِ قرآن مجید کے مقاصد و اہداف کی تفسیر۔

---

[1] پیغمبر امت کے حاکم اور حکومت اسلامیہ کے رئیس کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرہ میں اس لیے خلاء کا وجود نظر نہیں آتا کہ دونوں نظریات (تنصیصی یا انتخابی) کے مطابق کرۂ ارض کے کاروبار رکنے نہیں پاتے کیونکہ کوئی نہ کوئی شخص زمام امور اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اسی لیے اس خلاء کی طرف متن میں اشارہ نہیں ہوا۔

ج) شبہات واشکالات کی جواب دہی۔

د) ہر قسم کی تحریف کے خلاف آئین اسلام کا تحفظ۔

یہ وہ فرائض تھے جن کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانہ میں قیام فرمایا اور اپنی موجودگی سے مذکورہ خلاؤں کا ایسے طریقوں سے سد باب فرمایا جن کی ہم بالترتیب مختصراً وضاحت کرتے ہیں۔

الف) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر قسم کے نئے رونما ہونے والے حادثہ سے متعلق احکام کو بیان فرماتے تھے۔ یہ احتجاج وضرورت آنحضرتؐ کے بعد بھی موجود تھے۔ امت اسلامیہ شدت کے ساتھ کسی ایسی شخصیت کا احتیاج رکھتی تھی جو ایسے حوادث کے متعلق احکام صادر کرنے کے قابل ہو جو نئے نئے رونما ہو رہے تھے، جو زمانہ رسالتمآبؐ میں ظاہر نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی جن کی سابق میں کوئی مثال تھی۔ ایسے بہت سے مسائل میں امت اسلامیہ لاچار ہو کر کسی نہ کسی کے دامن عاطف میں پناہ تلاش کرتی، اپنے ظنی و خیالی دلائل کے کسی سلسلہ پر قناعت کرتی اور اصطلاح کے مطابق متعلقہ مسئلہ کے کچھ نہ کچھ اسباب پیدا کرتی تھی۔

ب) جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات طیبہ کے دوران بعض آیات قرآن مجید کی وضاحت اور بعض کے مختلف اطلاقات کی تشریح فرماتے تھے اور یہ ضرورت آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد ختم نہیں ہوئی تھی۔ نتیجہ کے طور پر مسلمان بعض آیات کی تفسیر میں اختلافات کا شکار ہوگئے، یہاں تک کہ وضو، چور پر حد کے تعین اور دیگر فرائض سے متعلق آیات میں شدید اختلافات پیدا ہوئے۔

ج) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام جو مدینہ میں رہتی تھیں، یا جن کی وہاں آمد و رفت تھی، کے پیدا کردہ شبہات کا خود جواب دیا کرتے تھے۔ اس بات پر وہ آیات مبارکہ شاہد ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت اور اس قسم کی باتوں کے ابطال کو پیش کرتی ہیں۔[1] یہ احتیاج آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد اپنے مقام پر باقی تھی کیونکہ شبہات کا ایک سیلاب احبارِ یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کی طرف سے مدینہ کا رخ کر رہا تھا۔ خلفاء کی تاریخ زندگی، بہت سے صحابہ کرام کی شبہات کے حمل کرنے میں بے بسی، وہ شبہات جو مخالفین کی طرف سے پیدا کیے جاتے تھے، اس احتیاج کی موجودگی پر گواہ ہیں۔

د) محرفین کی تحریف اور جعلی احادیث بنانے والوں سے دین اسلام کا تحفظ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے آسانی کے ساتھ نہیں گزر سکتے۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی کسی حد تک تحریف اور جعل حدیث کا کام وجود رکھتا تھا جو آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد خوب پھیل گیا۔ ان تحریفات کو جب آنحضرتؐ کی جانب لوٹاتے تھے تو یہ بے کار و بے اثر ہو جاتی تھیں۔ لیکن آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کسی مرجع معصوم کی عدم موجودگی (یا بہتر الفاظ میں کسی فرد معصوم کی طرف رجوع نہ کرنے سے) جس کی طرف رجوع کرنے سے صحیح و غیر صحیح میں امتیاز کیا جا سکتا، معاشرہ میں بڑی بڑی مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی احادیث مختلف موضوعات پر احادیث پیغمبر میں شامل کر دی گئیں، جس کے باعث اسلام کے شروع کے ایام میں ہی تاریخ حدیث کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔

---

[1] سورۂ آل عمران ۵۹

اس سے قطع نظر مسئلہ تحریف صرف حدیث کے موضوع کے ساتھ ہی خصوصیت نہیں رکھتا۔ رحلت رسول خداؐ کے بعد مختلف فرقوں کا پیدا ہونا کہ تاریخ ملل ونحل جس کی شاہد ہے، جس سے اصول وفروع اسلام میں تحریف کی شہادت ملتی ہے، پھر آنحضرتؐ کی وفات کو زیادہ عرصہ گزرنے نہ پایا تھا کہ فرقہ سازی اور گروہ بندی کی فروع واصول میں بنیاد رکھ دی گئی اور مسلمان بہتر یا اس سے بھی زیادہ فرقوں میں تقسیم ہوگئے، جن میں صرف ایک برحق اور باقی سب باطل پر ہیں، یہ سب حالات ایک معصوم رہبر کے وجود کے متقاضی تھے۔

ان تمام اشکالات، شبہات اور مشکلات کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود ذیجود کی موجودگی میں وضاحت ہوتی رہتی تھی۔ لیکن آپؐ کی رحلت کے بعد ان سب مشکلات کا باقی رہ جانا لازمی تھا، سوائے اس کے کہ آپؐ کا خلیفہ یا جانشین خود آپ ہی کی طرح ان علوم کے فیوض کا مالک اور صاحب کمال ہو۔ اس کیفیت کے بغیر امت اسلامیہ کا اس قسم کے فیوض سے محروم رہنا لازمی سمجھا جائے گا، نیز یہ بھی یقینی امر ہوگا کہ حضرت کا جانشین واقعی آپ کا جانشین نہیں۔

ان تمام نقائص کا اس امام کے ہاتھوں دور ہونا ہرگز ممکن نہیں جسے لوگوں نے منتخب کیا ہو۔ لازمی ہے کہ ان نقائص کو وہ امام ہی دور کرسکتا ہے جو آنحضرتؐ کی مانند من جانب اللہ تربیت یافتہ ہو، علوم سے بہرہ مند اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی منزل عصمت ومصونیت پر فائز ہو۔ اس کے بغیر یہ تمام نقائص اپنی پوری قوت کے ساتھ باقی رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے شخص کا تعین آنحضرتؐ کی طرح نص پروردگار اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تعارف کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ذات پروردگار کے لیے ضروری ہونا چاہیے کہ اس قسم کے شخص کو امت کی خاطر پہلے ہی سے مناسب تربیت اور خارق العادہ افعال کی تعلیم عطا فرمائے اور پھر مناسب موقع پر اپنے نبی کے تعارف کی طرح اس کا تعارف بھی کروائے۔

یہ تمام دلائل، جنھیں ہم نے یہاں اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے اور جن پر مفصل تبصرہ ہماری کتاب ''پیشوائی از نظر اسلام'' میں، جو مسئلہ امامت پر لکھی گئی ہے، ہوچکا ہے، امام کے منصوص ہونے کے علاوہ اس کے مقام عصمت کو بھی واضح کرتے ہیں۔ ہم عصمت انبیاء کی بحث میں دلائل مبنی برعقل تفصیل کے ساتھ پیش کرچکے ہیں، لہٰذا اس مقام پر اختصار کے پیش نظر ان دلائل پر گفتگو نہیں کرتے جو عصمت امام کے موضوع پر بھی صادق آتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اگر جملہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت یا بالخصوص عصمت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید کی آیات گواہی دیتی ہیں تو امام کی عصمت کے لیے بھی مکمل صورت میں آیات قرآن دلالت کرتی ہیں۔

اس موضوع پر ہم درج ذیل صرف دو آیات قرآن کی تشریح پیش کرتے ہیں۔

۱: حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے متعلق آیہ مبارکہ۔

۲: تطہیر اہل بیت سے متعلق آیہ مبارکہ

سردست ہم ایسی دیگر آیات سے صرف نظر کرتے ہیں جن سے عصمت ائمہؑ پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

عصمت امام بروئے آیہ ابتلاء

قرآن میں قابل تحقیق مفاہیم شائستہ میں سے ایک مفہوم امام کا تجزیہ ہے۔ نبی، رسول، صدیقین، شہداء اور صالحین، جیسے الفاظ کی

طرح لفظ 'امام' بھی دقیق تفسیر و تحقیق کا مستحق ہے۔

قرآن مجید نے امام کے علاوہ ان تمام الفاظ کو ایک ہی آیہ مبارکہ میں جمع فرما دیا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (نساء: ۶۹)

''جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اللہ نے نعمت مرحمت فرمائی ہے۔ یعنی (وہ) انبیائ، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور وہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔''

حیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں ہر ایک کے تجزیہ و تشریح کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید نے اس آیہ مبارکہ میں چار مفاہیم کا تذکرہ فرمایا ہے جبکہ دوسری آیات میں موضوع امام و آئمہ پر گفتگو فرمائی ہے۔ تاہم امام کے بارے میں جو واضح ترین آیہ مبارکہ وارد ہوئی ہے، وہ درج ذیل ہے

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ (بقرۃ: ۱۲۴)

''اور جب ابراہیمؑ کے پروردگار نے اسے بعض باتوں سے آزمایا، خدا (یا ابراہیمؑ) نے انھیں آخر تک پہنچایا (اور بخوبی آزمائش میں پورے اترے) تو (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا ''میں نے تمھیں لوگوں کا امام قرار دیا۔'' (حضرت ابراہیمؑ نے) عرض کیا: ''میری ذریت (اولاد) میں بھی امام مقرر فرما'' تو ارشاد ہوا، میرا یہ عہد ظالموں تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

لفظ امام، جس کا اس آیت اور دیگر آیات مبارکہ میں ذکر ہے، وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل امور کی تشریح کا مرہون ہے۔

الف) 'کلمات' سے کیا مراد ہے؟

ب) اس موقع پر بالخصوص اور دوسرے مواقع پر بالعموم ابتلاء یا آزمائش سے کیا مراد و مقصود ہے؟

ج) حضرت ابراہیمؑ کس طرح امتحان میں بخوبی کامیاب ہوئے؟ (فاتمهن)

د) ''اماما'' سے کیا مراد ہے اور دوسرے مقام پر ''عھدی'' کے کیا معنی ہیں؟

ھ) امامت عہد الٰہی کس طرح قرار پاتی ہے؟

و) ''ظالم'' سے جو منزل امامت سے محروم ہے، کیا مراد ہے؟

ز) آیہ مبارکہ کس طرح امام کے لیے عصمت کے لازم ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

یہ اور ایسی ہی کئی مثالیں ایک سلسلہ مباحث سے تعلق رکھتی ہیں جو علاوہ اس کے کہ قرآن کے مفہوم امام سے پردہ اٹھاتی ہیں، بذاتِ خود قرآن مجید کی اہم اور مفید بحثیں ہیں جو آئندہ سطور میں بالترتیب زیر بحث آئیں گی۔

الف) کلمات سے کیا مراد ہے؟

عربی زبان کا لفظ 'کلمۃ' خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع کلمات ہے۔ مثلاً

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ (بقرہ: ۳۷)

''آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات دریافت کیے اور اللہ تعالیٰ نے بھی بہ نظر رحمت جواب مرحمت فرمایا۔''

بعض اوقات یہ لفظ (کلمہ) عنایت کی رو سے (بطورِ مجاز) خارجی امور کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''کلمۃ اللہ'' اور کائنات ''کلمات'' شمار ہوئے ہیں۔ ☆ لیکن اس مقام پر کلمات سے مراد اوامر ونواہی اور دساتیر واحکام کا ایک سلسلہ ہے جن کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام موردِ آزمائش قرار پائے۔ اصولی طور پر بزرگوں کے درمیان آزمائش کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ کسی شخص کے خلوص وصداقت کو آزمانے کے لیے کچھ احکام صادر ہوتے ہیں جن کی اطاعت شخص متعلقہ کے مقام اخلاص کو واضح کرتی ہے۔

لہٰذا 'کلمات' سے مراد چند اوامر ونواہی قرار پائے جن کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو امتحان کی کٹھالی میں ڈالا گیا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس سے مراد محنت اور مشقت کا وہ سلسلہ ہو جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عمر بھر گھیرے رکھا۔ تاہم یاد رکھنا ہوگا کہ ''کلمہ'' یا ''کلمات'' کا محنت ومشقت پر اطلاق ایک طرح کا مجاز ہو سکتا ہے جس کی صحیح شدہ صورت یہ ہوگی کہ مشقت والے کاموں کا بذریعہ کلام اظہار ہوتا ہے اور وہ تکلیف وزحمت کی شکل میں انجام پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے شدائد کو ''کلمات'' کہہ کر پکارا جاتا ہے اور اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو چند باتوں اور کلمات سے ہم نے آزمایا، جن میں اسے مخلص اور آزاد پایا۔

اب دیکھنا ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کن تکالیف واحکام کے ذریعہ معرض امتحان میں ڈالے گئے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں جن کا ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں:

۱: 'کلمات' سے مراد 'امامت' ہی ہے جس کا ذکر **واذا بتلی ابراهیم ربه بکلمات** کے بعد اس آیہ مبارکہ میں آتا ہے۔ اس کا مطلب تکالیف شاقہ کے علاوہ اس مقام پر اور کچھ نہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ یہاں 'امامت' ہی مراد ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید ''واذا بتلی ابراهیم ربه بکلمات'' کے جملہ کے بعد فرماتا ہے۔

''قال انی جاعلك للناس اماما'' یہاں لفظ فقال یا وقال بالکل استعمال نہیں ہوا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مذکورہ جملہ کلمات کے مقصود کو بیان کر رہا ہے اور اصطلاح کے مطابق اس کا عطف تفسیری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو کلمات سے آزمایا۔ وہ کلمات اس بات کا ذریعہ بنے کہ انھیں انسانوں کا امام قرار دیا گیا۔ اس مقام کی اہمیت بذاتِ خود آزمائش سے قرار پاتی ہے جو ہمیشہ رنج و زحمت اور مشقت و پریشانی پر مشتمل ہوئی ہے، بلکہ اکثر اوقات ان تکالیف کے حامل کو اس کی قتل گاہ پر لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔[1]

آیہ مبارکہ کے معانی میں یہ احتمال نہیں کمزور اور ضعیف ہے۔ آیہ مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند کلمات سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور وہ حضرت بموجب شہادت جملہ فاتمھن بخوبی امتحان میں کامیاب ہوئے اور اس کے بعد انھیں منزل امامت پر فائز کیا گیا۔ ان کلمات سے اگر خود مقام امامت ہی مراد ہو تو پھر جملہ فاتمھن کو، جس کے معنی امتحان میں کامیاب ہونا ہے، جملہ **قال انی جاعلک للناس اماما** کے بعد آنا چاہئے، نہ کہ اس سے قبل۔

آیہ مبارکہ کا خلاصہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معرض آزمائش میں ڈالا اور وہ امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مقام امامت کے افتخار سے سرفراز فرمایا، خواہ ہم یہ کہیں کہ آزمائش سابقہ اس مقام کے حصول کے لیے مؤثر تھی یا نہیں۔[2]

لیکن عطائے مقام امامت یقینا آزمائش کے بعد ہوا۔ لہٰذا وہ کلمات جن کے ذریعہ امتحان ہوا تھا یقینا عطائے منصب امامت کے علاوہ ہوں گے جو بعد میں انھیں مرحمت ہوا۔

:۲ اس سے مراد دس احکام ہیں جو سنن ابراہیمؑ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دس احکام میں سے پانچ کا تعلق انسان کے سر اور چہرہ سے ہے اور باقی پانچ جسم کے باقی حصوں سے متعلق ہیں۔ ان احکام کی تفصیل یہ ہے:

:۱ کلی کرنا

:۲ ناک میں پانی ڈالنا

:۳ سر کے بال کٹوانا

:۴ مونچھیں کٹوانا

:۵ مسواک کرنا

:۶ ختنہ

:۷ زیر ناف بال مونڈنا

---

[1] مفاتیح الغیب رازی، ج ۱، ص ۴۹۰

[2] شیخ عبدہ کو اصرار ہے کہ آزمائش مقام امامت کی عطاء کے لیے لازمی نہ تھی۔ ہم آئندہ اس بارے میں بحث کریں گے۔ اس سے زیادہ کمزور بات یہ ہے کہ "فاتمھن" کا فاعل خداوند تعالیٰ ہے نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کیونکہ اس قسم کی تفسیر بالکل مفہوم آیت کے خلاف ہے۔

۸: زیر بغل بال منڈوانا

۹: ناخن کاٹنا

۱۰: پانی سے استنجا کرنا

یہ تفسیر سابقہ تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے اگر چہ اس کو ابن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ ہر روایت صحیح یا قطعی نہیں ہوتی۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ وہ کلمات جن کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام موردِ آزمائش قرار پائے۔ نہایت شدید و مشکل احکام کے ایک سلسلہ پر مشتمل تھے جو مقام امامت کے تعین کے لیے موزوں تھے۔ جبکہ مذکورہ سلسلۂ احکام تو اس قدر سادہ اور عام ہیں کہ متدین قسم کے حضرات ان سے آسانی کے ساتھ عہدہ برآء ہو سکتے ہیں۔

۳: اس سے مراد تیس یا چالیس احکام ہیں جو قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں نازل ہوئے ہیں اور ان آیات مبارکہ سے عبارت ہیں:

۱: "اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ......." (توبہ: ۱۱۲۔ دس صفات)

۲: "اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ...." (احزاب: ۳۵۔ دس صفات)

۳: "اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ......." (مومنون: ۲ تا ۹)

۴: "اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ" (معارج: ۲۳)

یہ تشریح بھی پہلی دو تشریحات کی طرح کمزور وضعیف ہے کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل یا شاہد ہمارے پاس نہیں جس سے معلوم ہو کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام ان تکالیف کے ذریعہ مورد آزمائش قرار پائے، نیز ان تمام آیات میں حضرت ابراہیمؑ کا کوئی ذکر بلکہ نام و نشان بھی موجود نہیں۔

اس قسم کی بے جا و بے معنی تفاسیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف عدم توجہی یا اس سے ناواقفیت کی مظہر ہیں۔ اگر یہ مفسرین قصص قرآن کے بیان کے سلسلہ میں تفسیر موضوعی کے طریق کار کو اختیار کرتے، جو کسی طرح بھی آیت کے بعد آیت کی تفسیر سے مختلف نہیں، تو ہرگز ایسے احتمالات سے اپنے قلوب کو متاثر نہ ہونے دیتے۔ بہر حال اس نظریہ کی حضرت ابن عباس کی طرف نسبت بالکل قابل تردید ہے۔

''کلمات'' کی صحیح تفسیر

قرآن مجید میں سورۂ صافات کی آیت تراسی (۸۳)................ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ شروع ہوتا ہے اور آیت ایک سو تیرہ (۱۱۳)................ پر ختم ہوتا ہے۔ ان آیات مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر گزرنے والے مختلف النوع واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، اگر چہ ان واقعات کی تفصیل دوسری سروہ ہائے قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ جن کی تفصیل مختصراً اس طرح ہے:

۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت پرستوں سے مبارزہ۔ جب آپ نے سمجھ لیا کہ اب بات منطق وعقل کی منازل سے گزر چکی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان کے مرکز فساد ہی کو تباہ کر دیا جائے اور انھیں عملی طور پر یہ بات سمجھانا چاہیے کہ یہ بت، ان کے خدائی نمائندے، کسی کام کے قابل نہیں ہیں۔ لہٰذا جس روز سب لوگ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام علالت کے عذر کے تحت شہر ہی میں رہ گئے تھے، آپ نے ان لوگوں کی غیر حاضری میں ان کے بتکدہ میں بڑے بت کے علاوہ سب بتوں کو توڑ پھوڑ دیا اور تیشہ بڑے بت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡيَمِيۡنِ۝۹۳ (صافات: ۹۳)

۲: وقت کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ فیصلہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ لہٰذا انھیں آگ کے ایک دریا میں پھینکا گیا جس سے پروردگار عالم نے انھیں نجات عطا فرمائی۔

فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ۝۹۷ (صافات: ۹۷)

۳: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مقام پیدائش، بابل کو رہنے کے قابل نہ پایا۔ انھوں نے مصمم ارادہ فرمالیا کہ اپنی زوجہ حضرت سارہ کے ہمراہ ان بت پرستوں کے شہر سے دور فلسطین میں جا کر رہنے لگیں اور اللہ تعالیٰ کی خاطر غریب الوطنی کی تکالیف برداشت کریں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ۝۹۹ (صافات: ۹۹)

''میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہی مجھے ہدایت فرمائے گا۔''

۴: حضرت ابراہیم علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتے ہیں کہ اپنی زوجہ (حضرت ہاجرہ) اور اپنے فرزند (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کو ایک بے آب وگیاہ مقام (مکہ) میں چھوڑ آئیں۔

۵: حضرت ابراہیمؑ کچھ عرصہ بعد مکہ تشریف لے گئے۔ جب آپ اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے ہمراہ مقام سعی پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ملا کہ اپنے صاحبزادے کو راہِ خدا میں ذبح کر دیں۔ انھوں نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مشورہ فرمایا۔ انہوں نے بھی راہ خدا میں ذبح ہونا قبول فرمایا۔ آخری لحمہ آواز آئی کہ آپ نے اپنے فرض کو احسن طریقہ سے انجام دیا۔

"یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ ......" (صافات: ۱۰۲)

سورۂ صافات میں ان پانچ واقعات کو بیان کرنے کے بعد جن میں سے ہر ایک اپنے دامن میں کوہ مصائب و آلام لیے ہوئے ہے اور جن سے عظیم انسانوں کے سوا کوئی شخص عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، قرآن مجید ہے:

اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ (صافات: ۱۰۶)

''یہی وہ ظاہر بہ ظاہرا ہم امتحان و ابتلا ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلقان چار واقعات اذکر کیا گیا ہے جن میں راہ خدا میں ذبح فرزند کا واقعہ خصوصیت کا حامل ہے جس کی خداوند عالم نے خود بلاء مبین بمعنی ''ابتلائے واضح'' کے الفاظ میں تعریف فرمائی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اذا بتلی ابراھیم کا جملہ ذبح اسماعیلؑ یا اس کے مشابہ کسی واقع کی ترجمانی کر رہا ہے جس کا اس سورۂ مبارکہ میں مفصل ذکر ہوا ہے۔ اگر ذبح فرزند پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمادگی کو لفظ کلمہ کی تفسیر شمار کیا جائے تو یقیناً باقی تین واقعات جو اپنے مقام پر عظمت و بزرگی کے اعتبار سے اس چوتھے واقعہ کے پیشرو قرار پاتے ہیں، ان کلمات کی شکل اختیاری کر سکتے ہیں جن کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا۔

ان آیات مبارکہ سے قطع نظر قرآن مجید کی اور سورتوں میں بھی ان واقعات میں سے بعض مفصل طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صابئین یعنی ستارہ پرستوں سے مبارزہ و مناظرہ سورۂ انعام، آیات ۷۵ تا ۸۳

۲: حضرت کے بت پرستوں کے ساتھ مبارزہ کا بیان، آپ کو کوہ آتش میں پھینک کر جلا ڈالنے کا ان لوگوں کا فیصلہ اور نتیجتاً آپ کی فلسطین کی طرف ہجرت۔ سورۂ انبیائ، آیات ۵۳ تا ۷۱

۳: حضرتؑ کا اپنے اہل خانہ کو مکہ کی سرزمین کی طرف منتقل فرمانا۔ سورۂ ابراہیمؑ آیات ۳۷ تا ۴۰

۴: کعبہ مکرمہ کی تعمیر نو کے لیے آپ کا مامور ہونا، جو طوفان حضرت نوح کے دوران تباہ ہو چکا تھا۔ سورۂ بقرہ آیات ۱۲۷، ۱۲۸

۵: آخر میں مناسک حج کی ادائیگی اور لوگوں کو ان کی تعلیم دینا۔ سورۂ حج، آیات ۲۶، ۲۷

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی 'ابتلا' و آزمائش انہی اہم ترین فرائض اور پر مشقت احکام کی بجا آوری کے ذریعہ ہوئی تھی۔ یہ وہ منازل ہیں جہاں تک اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں اور عشق الٰہی میں سرشار افراد کے علاوہ کوئی شخص پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ امور ہیں جن کی کامیاب انجام دہی انسان کے کمالاتِ باطنی کو آشکار کرتی ہے اور بالاتر منازل کے حصول کے لیے اس کی قابلیت کو واضح و روشن کرتی ہے۔

ب) ہدف آزمائش کیا تھا؟

تمام آیات قرآن مجید، جن میں لفظ 'ابتلا' یا اس کے ہم معنی الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان سے متعلق ایک مشترک سوال اٹھتا ہے۔[1] وہ سوال یہ ہے:

جو شخص اصلیت سے بے خبر ہو اس کو کسی کی آزمائش یا امتحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ کو جو ہر شے کی، خلقت سے قبل اور اس کے بعد بھی، اصلیت سے کما حقہ، واقف ہے کسی امتحان و آزمائش کی کیا ضرورت ہے؟ زیر بحث مسئلہ میں چونکہ پروردگار عالم، بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی لیاقت و قابلیت سے مکمل طور پر واقف تھا، لہٰذا حضرت کے امتحان کے لیے بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس سوال کا جواب واضح ہے جو یہ ہے کہ امتحان دو میں سے ایک سبب کی بناء پر لیا جاتا ہے۔ ایک وجہ تو متعلقہ شخص کی اس قابلیت و لیاقت سے آگاہی ہے جو اس کو حاصل ہے۔ دوسری وجہ یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ شخص اپنی باطنی لیاقتوں اور وجدان کو کس حد تک بروئے کار لاسکتا ہے۔ اگر منزل امتحان درمیان میں نہ رکھی جائے تو وجدان و قابلیت ایک مادۂ خام کی مانند انسان کی روح و نفس ناطقہ میں پوشیدہ و خوابیدہ رہ جائیں گی۔ لہٰذا امتحان ہی وہ کیفیت و ضرورت ہے جس کی مدد سے انسان کی قابلیتوں کو عملی طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے تاکہ وہ اس ذریعہ سے منزل کمال تک رسائی حاصل کریں۔ دوسرے لفظوں میں بندوں کے امتحان و آزمائش سے باری تعالیٰ کا مقصود اپنے بندوں کی استعدادوں کی تربیت اور پرورش ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہوسکتی ہے کہ جس دن انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے وہ اپنے اندر تعجب خیز استعدادوں اور امکانات کا ایک ذخیرہ لے کر آتا ہے۔ تمام کمالات انسانی اور فاضل اخلاقی استعداد فطری کی شکل میں اس کے وجودِ باطنی میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی سرشت ان کمالات کا مجموعہ اور ان ہی سے خمیر شدہ ہوتی ہے۔ یہ استعدادیں انسان کے اندر زیر زمین ذخائر کی طرح ہوتی ہیں جو مخصوص وسائل کے بغیر ظاہر نہیں ہو پاتے نہ ہی قوت و استعداد کے مراحل سے گزر کر مرحلہ فعالیت تک پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کی یہ استعدادیں مرحلہ ظہور و شہود میں نہ آئیں گی ہرگز تکامل و ارتقاء اور وجودِ خارجی نہ پاسکیں گی اور ان کے نتیجہ میں اجر و ثواب مرتب نہ ہوگا۔

اس قسم کی آزمائشوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام صفات عالیہ جو انسان کے مرکز وجود میں ودیعت کی گئی ہیں ان کی پرورش ہو اور خود انسان کی تربیت انجام پائے۔ اگر یہ تکالیف اور آزمائشیں نہ ہوں تو انسان کے مرکز وجود میں پائے جانیوالی قابلیت و لیاقت کبھی بھی سامنے نہ آپائیں اور کوئی شخص کسی طرح جزا و تقدیر اور انعام کا مستحق قرار نہ پائے۔

اس حقیقت کو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ایک مختصر اور پر معنی جملہ میں واضح فرمایا ہے۔

---

[1] مثال کے طور پر ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ'' وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ اور لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ سورۂ ہائے بقرہ، محمد، ہود، آیات ۱۵۵، ۳۱ اور ۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

آپ فرماتے ہیں:

''کبھی نہ کہو کہ خداوندا! میں تجھ سے آزمائش و امتحان کے سلسلہ میں پناہ مانگتا ہوں کیونکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کی آزمائش نہ ہو۔ بلکہ دعا کے وقت اس طرح عرض کرو: خدایا! میں گمراہ کرنے والی آزمائشوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں، یعنی ان آزمائشوں سے جن سے میں عہدہ برآنہ ہوسکوں اوران کے ذریعہ اپنے آپ کو کامل نہ کرسکوں۔''

اس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام اس کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ کا مقصود امتحان و آزمائش سے اپنے لیے اطلاع و آگہی کا حصول نہیں کیونکہ کوئی چیز تمام کائنات میں اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں بلکہ:

"لیتبین الساخط الرزقه و الراضی بقسمه و ان کان سبحانه اعلم بهم من انفسهم ولکن لتظهر الافعال التی بها یستحق الثواب والعقاب". [1]

''مقصود یہ ہے کہ رضا وخوشنودی یا غیظ وغضب جیسی مخفی صفات جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئی ہیں، ظاہر ہوں اور یہ صفات باطنی فعل وعمل کی صورت میں ظاہر ہوں۔ تاکہ ثواب وعقاب کا استحقاق پیدا ہو اور جزا وسزا کی صورت میں سامنے آئے۔''

اس گفتگو سے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام امتحان کا مقصد و ہدف اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ امتحان کے نتیجہ میں صفات مخفی اور استعداد ہائے باطنی فعل خارجی کے طور پر سامنے آجائیں اور لوگ فعل وعمل خارجی کی صورت میں ان صفات مخفی کی تجسیم کے زیر اثر مستحق جزاء وسزا بن پائیں۔ اگر ایسا نہ ہوسکے گا تو لوگ بغیر عمل خارجی ان صفات مخفی کی بنا پر نہ تو جزا کے مستحق ہوسکیں گے اور نہ سزا کے مورد قرار پاسکیں گے۔ لہٰذا انسان کسی طرح بھی حقیقتاً منزل تکامل کی طرف گامزن نہ ہوسکے گا۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب خداوند عالم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دے کر آزمائش فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ جاننا نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمان خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، بلکہ پروردگارِ عالم کا مقصود یہ ہے کہ اسکے احکام بجالانیک کے لیے جو روح فرمانبرداری وتسلیم اس نے وجود حضرت ابراہیمؑ میں ودیعت فرمائی تھی، اس کی پرورش کر کے مرحلہ فعالیت تک پہنچ پائے اور اس طرف حضرت ابراہیمؑ اپنے کمال منزل کی طرف قدم بڑھائیں۔ (یہ مقام غور وخوض ہے)

اسی لیے خلاق عالم مشکلات ومصائب کے ذریعہ اپنے بندوں کی پزمائش فرماتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ عبدہ، کلمات قصار، شمارہ ۹۳، مطبوعہ بیروت

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾ (بقرہ: ۱۵۵)

''اور تمھیں آزماتے ہیں تھوڑے سے خوف اور بھوک سے اور اموال، جانوں اور ثمرات کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔''

مشکلات اور دشواریاں بھٹی کی مانند ہوتی ہیں جو لوہے میں سختی اور مضبوطی پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی حوادث و مشکلات کی بھٹی میں قوت و استقامت حاصل کرتا ہے اور اسطرح اس بات پر قادر ہو جاتا ہے کہ راہِ زندگی کی رکاوٹوں کو شکست دے کر اپنے لیے مقام سعادت حاصل کر لے۔

یہ بھی اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں کہ ہمارے اس کہنے کے کہ اپنے بندوں کے امتحان سے خداوند تعالیٰ کو ان کے مرکز وجود میں موجود صفات عالیہ کی تربیت و پرورش مقصود ہے، یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ تمام انسان جو محل امتحان میں قرار پاتے ہیں سب کے سب لازمی طور پر اس ہدف تک پہنچنے پر مجبور ہیں اور یہ صفات عالیہ ان کے وجود میں نشو ونما پانے لگتی ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امتحان انسان کی زندگی میں تربیت و پرورش کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔ پس وہ جماعت افراد جو سعادت کی خواہشمند ہوتی ہے اس کیفیت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہے اور اس راہ میں خصوصی مہارت حاصل کرتی ہے۔ تاہم لوگوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی باطنی صفات زشت کو سامنے لے آتے ہیں۔ انکی یہ صفات بداعمال زشت کی صورت میں تجسیم حاصل کرتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق اس امتحان میں مردود و ناکام قرار پاتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ کے مقرر کردہ امتحانوں کے رموز میں یہ ایک راز شامل ہے۔

ج) حضرت ابراہیمؑ امتحان سے کیسے عہدہ برآ ہوئے؟ (فاتمھن)

آزمائش کی تصریح کے بعد یعنی کلمات امتحان حضرت ابراہیمؑ کے بعد آیہ مبارکہ میں فاتمھن ارشاد ہوتا ہے، یعنی ان کلمات کو آخر تک پہنچایا۔

'اتمام' نقص کی ضدہ۔ جب کوئی چیز اپنے حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اسے 'اتمام' کہتے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ (مائدہ: ۳)

''میں نے تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا۔''

یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ جس شخص کا امتحان لیا گیا وہ ہر موقع پر موضوع میں بہترین قابلیت کا اظہار کر کے کامیاب ہوا، کسی طرح کی کمزوری کسی عنوان کے اعتبار سے اس میں نہ پائی گئی، اس نے طاغوتی قوتوں کے بتوں کو توڑنے میں کسی کی پروانہ کی، نہ ہی آگ کے شعلوں

میں پھینکے جانے سے خوفزدہ ہوا، نہ غربت وتنہائی اس کے فرائض میں آڑے آئی، تعمیر خانہ کعبہ اور اپنے لخت جگر کو ایک اجاڑ مقام یعنی لق ودق صحرا (وادیٔ غیر ذی زرعہ) میں چھوڑتے ہوئے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف ومصیبت نظر نہ آئی، بلکہ ان تمام سنگین صورتوں میں وہ عشق خدا اور رضائے خدا میں نہ صرف سرشار رہا بلکہ غیر خدا سے بیزاری پر جما رہا۔ یہاں تک کہ رضائے پروردگار کی خاطر اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالنا بھی اس نے گوارا کیا۔ اسی کو قرآن فرماتا ہے "فاتمھن": یعنی ان تمام آزمائشوں کو خود حضرت ابراہیمؑ نے آخر تک پہنچایا، یا یوں سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب امتحانات کو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ منزل آخر تک پہنچایا۔"

حضرت ابراہیمؑ کے لیے قرآن مجید جن اوصاف ومنازل کا ذکر فرماتا ہے ان سے آنحضرتؐ کی عظمت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک ساٹھ سے زیادہ مرتبہ ان کا ذکر کرتا اور ارشاد فرماتا ہے:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾ (نساء: ١٢٥)

"اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست قرار دیا۔"

اگر خداوند عالم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حلیم، اواہ، منیب، صدیق، نبی اور دیگر صفات سے توصیف فرماتا ہے تو یہ سب ان کمالات کی بناء پر ہے جو وہ حضرت زندگی کے نشیب وفراز میں حاصل فرما چکے تھے اور سونے کی طرح، جس کو مٹی کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن بنایا جاتا ہے، رضا جوئی، خداوند تعالیٰ میں منزل کمال تک پہنچ چکے تھے۔[1]

عربی زبان میں لفظ "خلت" جس سے خلیل مشتق ہے، کہ معنی اپنے مکمل وجود میں محبت پروردگار کو مستقل کرنے کے ہیں۔ اس سلسلہ میں راغب کہتا ہے:

قد تخللت مسلك الروح منی
وبه سمی الخليل خليلا

"محبت روح کی طرح وجود انسان میں سرایت کرتی ہے اور اسی محبت کی بناء پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل کا نام دیا گیا۔"

د) "اِمَامًا" سے کیا مراد ہے؟

اس موضوع کی وضاحت وتشریح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ 'امام' کے معنی لغت کے اعتبار سے معلوم کریں اور پھر قرآن مجید میں اس لفظ کے موارد استعمال میں تحقیق کریں۔

ابن فارس کہتا ہے:

---

[1] ہود: ۷۳ تا ۷۵، مریم: ۴۱

"الامام: كل من اقتدى به و قدم فى الامورو النبى (صلى الله عليه وآله وسلم) امام الائمه و الخليفة امام الرعية والقران امام المسلمين." [1]

''امام وہ ہے جس کی سب اقتداء کریں، جس کو سب امور میں مقدم رکھا جائے، پیغمبر اکرمؐ اماموں کے امام ہیں، خلیفہ رعایا کا امام اور قرآن تمام مسلمانوں کا امام ہے۔''

ابن منظور لسان العرب میں کہتا ہے:

"الامام ما ائتم به من رئيس وغيره وفى التنزيل فقاتلوا ائمة الكفر اى قاتلوا روساء الكفر و قادتهم، الذين ضعفاء هم تبع لهم۔"

''امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے جیسے سربراہ کی اقتداء کی جاتی ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ ائمہ کفر سے جنگ کرو۔ان سے مراد سرداران کفر یں جن کے ہاتھ میں عنان اختیار ہوتی ہے جس سے وہ کمزور افراد کو اپنے تابع رکھتے ہیں۔''

پھر کہتا ہے:

"امام كل شىء قيمه والمصلح له و القران امام المسلمين......" [2]

''ہر شے کا امام اس سے متعلق جملہ امور کا قائم کرنے والا اور ان سے متعلق سب کاموں کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے اور قرآن مسلمانوں کا امام ہے۔''

فیروز آبادی نے بھی قاموس میں لسان العرب کی اسی عبارت کو بعینہٖ نقل کیا ہے، اس میں کسی بات کا اضافہ نہیں کیا، مصادیق امام کی وضاحت کی ہے اور قرآن، پیغمبر اکرمؐ، خلیفہ اور سردارِ لشکر کو امام کے معانی (صحیح تر یہ کہ اس لفظ کے جملہ مفاہیم کے مصداق) قرار دیا ہے۔

پھر کہتا ہے:

"وما يتعلمه الغلام كل يوم و ما امتثل عليه المثال والدليل ....

---

[1] مقائیس اللغۃ، ج۱ص۲۸

[2] لسان العرب، ج۱۲ص۲۴، مادۂ امم تا آخر عبارت مقائیس

وخشیۃ یسوء علیہا البناأ"

"وہ سبق جو ایک نوجوان ہر روز پڑھتا ہے، وہ نقوش وصور جن کی مثال وہ بناتا ہے، دلیل ورہنما اور لکڑی کا وہ پیمانہ جس سے بڑھئی لکڑی کو اوٗ معمار عمارت کی بنیاد کو درست کرتے ہیں۔"

یہ تمام جملے تقریباً ایک ہی معنی کی نشان دہی کرتے ہیں جو یہ ہے کہ وہ شے کہ جسے انسان لازمی طور پر اپنا رہبر ومقتدائی، رہنما و نمونہ کامل، سردار اور پیشوا قرار دے، وہ شے انسان ہو یا کوئی اور چیز، اس کو امام کہتے ہیں، حتی کہ وہ مثال جو استاد بطور نمونہ بیان کرتا ہے یا کسی طالب علم کو مشق کرنے کے لیے کچھ لکھ کر دیتا ہے، یا وہ پیمانہ وشاقول جو بڑھئی اور معمار کے ہاتھ میں ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ، امام کہلاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ مثال یا وہ خط، یا وہ رسی ولکڑی، جو رہبر ونمونہ بنتی ہے یا وہ رہبری وپیشوائی کرتی ہے، چاہیے تو یہ کہ کام کرنے والا اس کی مطابقت اختیار کرے۔

اسی کے پیش نظر 'فراہی' کتاب نصاب میں کہتا ہے۔

"امام دان رژہ بنا، وراز داں بنا"

(امام اس لکڑی یا شاقول کو سمجھ جس سے معمار دیوار کو سیدھا رکھتا ہے اور معار جس کے رموز سے واقف ہے)۔

یہاں تک لفظ 'امام' کے لغوی معنی کی وضاحت ہوئی۔ اب ہم قرآن مجید میں اس لفظ کے موارد معلوم کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں "امام" کے موارد استعمال

لفظ 'امام' قرآن مجید میں اپنے بعض مشتقات کے ساتھ بارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ ان میں سات بار بطور مفرد اور پانچ مرتبہ بصورت جمع آیا ہے۔ اس لفظ کو جن چیزوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ہم اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۱: انسان: وہ شخص جو کسی جماعت کی رہنمائی کو اپنے ذمہ لے۔ مثلاً

اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (بقرۃ: ۱۲۴)

"ہم نے تمھیں انسانوں کا پیشوا قرار دیا۔"

یہ پیشوائی کبھی تو پیروی کرنے والے کے فائدہ پر ختم ہوتی ہے، جیسا کہ آیہ مبارکہ، درج بالا سے ظاہر ہے اور کبھی اس کے ضرر پر منتج ہوتی ہے اور اسے دونوں جہانوں میں گرفتار بلا کر دیتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۱﴾

(قصص: ۴۱)

''ہم نے انھیں بھی پیشوا قرار دیا جو اپنی امت کو آگ کی طرف بلاتے ہیں اور (قیامت کے دن) کی کوئی مدد نہ ہوگی۔''

دونوں قسم کے اماموں کی پیشوائی، وہ امام حق ہو یا امام باطل، اس دنیا سے مخصوص نہیں بلکہ دونوں قسم کے امام دونوں جہانوں میں پیشوائی کے ذمہ دار ہیں، جیسا کہ پوری وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے:

تَفۡضِيۡلًا ۝ يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمۡ‌ۚ (اسراء: ۷۱)

''ایک دن آنے والا ہے جب ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ہمراہ پکاریں گے۔''

خصوصیت کے ساتھ امامت فرعون کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ‌ؕ (هود: ۹۸)

''قیامت کے دن وہ اپنی قوم کی پیشوائی کرے گا اور انھیں آتش جہنم میں لے جائے گا۔''

۲: کتاب

وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰۤى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً‌ ؕ (هود: ۱۷)

''اور قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت کے طور پر نازل کی گئی۔''

۳: طریق وراہ

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ‌ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ۝ (حجر: ۷۹)

''ہم نے قوم لوطؑ اور اصحاب الایکہ سے انتقام لیا۔ ان کے رہنے کے ویران مساکن سر راہ آشکار ہیں۔''

اس آیہ مبارکہ میں طریق وراہ کی 'امام' کے طور پر صراحت کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسافر ایک راستہ اختیار کرتا ہے، اس پر چلتا رہتا ہے۔ راستہ جس طرف جاتا ہے مسافر بھی اسی طرف چلتا رہتا ہے اور اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

۴: لوح محفوظ

ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ﴿۱۲﴾ (یس: ۱۲)

''ہم نے ہر چیز کو واضح امام میں احصاء کر دیا ہے''

چونکہ لوح محفوظ کا بطور کتاب ذکر کیا جاتا ہے یہ قسم مندرجہ بالا دوسری قسم میں شامل ہو سکتی ہے۔ چونکہ حقیقت لوح محفوظ ہمارے علم میں نہیں اس لیے ہم اس کا علیحدہ طور پر ذکر کر رہے ہیں۔ اگر اس آیہ مبارکہ کی تفسیر امام معصوم سے کی جائے تو پھر یہ آیہ مبارکہ قسم اول میں شمار ہوگی۔ [۱]

لفظ 'امام' کے لغوی معنی پر غور کرنے کے بعد اب دیکھنا ہوگا کہ آیہ مبارکہ میں ''جعل امامت'' سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف آراء و نظریات ہیں جن کو ہم یکے بعد دیگرے واضح کر دیں گے۔

اس سلسلہ میں اہم ترین بات امامت و پیشوائی کی ماہیت کو کھول کر بیان کرنا ہے۔ بہت سے مفسرین پر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں جس قدر توقف ضروری تھا وہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ حضرات بڑی تیزی کے ساتھ یہاں سے گزر گئے ہیں۔ اب ہم ان نظریات کو بیان کرتے ہیں جو مختلف تفاسیر میں وارد ہوئے ہیں۔

امامت 'بمعنی نبوت'

یہاں ''امامت'' سے دراصل مقام ''نبوت'' مراد ہے۔ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں [۲] اور شیخ عبدہ نے 'المنار [۳] کی نقل میں اس نظریہ کو اختیار کیا ہے۔ موخر الذکر کا مزید موقف ہے کہ اس بات پر کوئی شاہد دستیاب نہیں کہ یہ آزمائش نبوت سے پہلے کی گئی تھی۔

اولاً آیہ مبارکہ سے ظاہر ہے کہ جس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام افتخار امامت سے سرفراز ہوئے وہ صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ آپ نے انی جاعلك للناس اماما کا جملہ سننے کے بعد خواہش کی کہ یہ نعمت معنوی ان کی ذریت میں بھی باقی رہے۔ یہ سوال اس شخص کی طرف سے خلاف عقل ہوگا جو اولاد ہی نہ رکھتا ہو۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں صاحبِ اولاد نہ تھے۔ اس سوال سے ان کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ صاحب اولاد ہوں گے یا نہیں۔ اور اگر صاحب اولاد ہو گئے تو کیا منصب امامت ان کی اولاد میں قرار پائے گا بھی یا نہیں۔ [۴]

---

[۱] جیسا کہ کئی ایک روایات میں یہ معنی اہل بیتؑ سے منقول ہیں۔ (مترجم)

[۲] فخر رازی کہتا ہے: "المراد من الامامة هنا هو النبوة و هذا التكليف يتضمن مشاقا عظيما۔" مفاتیح الغیب: ج۱، ص ۴۹۰

[۳] عبدہ کہتا ہے: "الامامة هنا عبارة عن الرسالة و هي لا تنال بكسب الكاسب وليس في الكلام دليل على ان الابتلاء كان قبل النبوة"

[۴] مجمع البیان، ج۱ ص ۲۰۱ پر چند افراد سے نقل ہوا

ایسی تفسیر ظاہر آیت کے خلاف ہے کیونکہ سوال سے ظاہر ہے کہ درحقیقت یہ سوال اس لیے کیا گیا تھا کہ منصب امامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں باقی رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی درخواست صاحب اولاد نہ ہونے کی صورت میں ہرگز صحیح نہیں۔ قرآن مجید میں اور کہیں بھی جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کی بات کی ہے، وہاں کہیں حضرت کی فرض ذریت مراد نہیں بلکہ تمام مواقع میں اس کی واقعی و موجود ذریت سے تفسیر کی گئی ہے۔[1]

ثانیاً حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنی صراحت کے مطابق بڑھاپے میں صاحب اولاد ہوئے تھے، جیسا کہ قرآن میں آپ فرماتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ؀ (ابراهیم: ۳۹)

''سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے۔ بیشک وہ دعا کا سننے والا ہے۔''

ایک اور صحیح آیت شہادت دیتی ہے کہ قبل اس کے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب اولاد ہوتے آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی نازل ہوتی تھی جو نبوت کی نشانی ہے۔ یہ وحی ان کو تمام امور کی انجام دہی پر مکلف کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں جب آپ مقام نبوت و رسالت پر فائز تھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بشارت ہوئی کہ آپ کو عنقریب ایک فرزند حلیم و بردبار اور علیم و دانا عطا ہوگا۔ ایسی بشارت متین مواقع پر آپ کو دی گئی اور ان تینوں موقعوں پر آپ نبی بھی تھے اور رسول بھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں آپ پر وحی نازل ہوئی جبکہ حضرت اسحٰقؑ کی بابت آپ سے مجسم طور پر اللہ تعالیٰ کے فرشتگان نے گفتگو کی۔

خداوند عالم نے ایک موقع پر آپ کے فرزند موعود کی 'حلیم' کے لفظ سے توصیف فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ؀ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؀ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ؀ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ..........'' (صافات: ۹۹ تا ۱۰۲)

''آگ میں پھینکے جانے کے بعد اور جب انھوں نے اس سے نجات پائی تو اس (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے کہا، میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ عنقریب مجھے ہدایت فرمائے گا (میں بابل کو ہجرۃ فلسطین کے ارادہ سے چھوڑتا ہوں) تو ہم نے انھیں ایک فرزند بردبار (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کی بشارت دی، اور جس وقت وہ فرزند مقام سعی پر پہنچا............''

اس مقام پر فرزند 'حلیم' سے اور فلما بلغ معه السعی کی شہادت سے حضرت اسمعیلؑ ہی مراد ہیں۔ یہ آیہ مبارکہ اس امر پر گواہ ہے

[1] سورۂ بقرہ: ۱۲۸۔ سورۂ ابراہیم: ۳۷، ۴۰

کہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ نامی فرزند کے پدرِ بزرگوار ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے خطاب سے نوازے جاتے تھے۔ اس نزول وحی پر آیہ مبارکہ فبشرنا بغلام حلیم گواہ ہے۔

اس سے بھی قطع نظر اس آیہ مبارکہ یعنی بشرنا بغلام حلیم سے پہلے آنے والی آیات اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس بشارت سے پہلے ہی آپ نبی تھے۔ نیز بت پرستوں سے مناظرہ، آگ میں پھینکے جانے اور اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے اس سے نجات پانے کے تمام حوادث کے دوران صاحب اولاد ہونے سے پہلے آپ نبی تھے۔

خداوند عالم اس آیہ مبارکہ میں آپ کو فرزند حلیم کی اور دو موقعوں پر فرزند علیم کی خبر دیتا ہے۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ﴿۵۴﴾ (حجر: ۵۳، ۵۴)

''جب فرشتوں کو مامور کیا گیا کہ قوم لوط پر پتھروں کی بارش کریں تو وہ (فرشتے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ حضرت ان فرشتوں سے ڈر گئے۔ فرشتوں نے عرض کیا: آپ مت ڈریں ہم تو آپ کو ایک فرزند علیم کی بشارت دیتے ہیں۔ فرمایا کیا تم مجھے یہ خوشخبری دیتے ہو درآنحالیکہ مجھے ضعیفی نے آلیا ہے۔ تو تم مجھے کیسی بشارت دیتے ہو؟''

''غلام علیم'' سے مراد حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ اس کی دلیل یہ کہ سورۂ ہود میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے ورود کے واقعہ کے بعد اس بیٹے کا نام بھی ظاہر کیا گیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴿۷۱﴾ (هود: ۷۰، ۷۱)

''بہرحال انہوں (فرشتوں) نے کہا آپ ڈریں نہیں۔ ہم قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ان (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی زوجہ جو وہاں کھڑی ہوئی تھیں، ہنس پڑیں (اپنا منہ پیٹ لیا) تو ہم نے انھیں حضرت اسحٰقؑ اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی بشارت دی۔''

یہی واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۃ الزاریات کی آیات ۲۴ تا ۳۷ میں مذکور ہوا ہے۔ وہاں بھی اس مورد بشارت فرزند کی لفظ 'علیم' سے توصیف کی گئی ہے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ اس طرح سمجھ لیں۔ ذریت حضرت ابراہیمؑ سے متعلق تمام آیات قرآن مجید میں تحقیق ومطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مدت مدید سے منصب نبوت پر فائز تھے جبکہ وہ صاحب فرزند نہ ہوئے تھے اور صاحب اولاد بہت بعد میں ہوئے۔ جب آپ

نے بابل کو چھوڑ کر فلسطین کا عزم فرمایا تو آپ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بشارت دی گئی۔ اس کی طویل مدت کے بعد جب غربت و مسافرت آپ کو درپیش تھی، قوم لوط کی بے شرمانہ حرکات اپنے اوج پر تھیں تو ملائکہ قوم لوط کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں آپ کے پاس آئے اور اس قوم پر آنیوالی بربادی و ہلاکت سے آپ کو مطلع فرمایا تو ساتھ ہی آپ کو خوشخبری سنائی کہ آپ ایک فرزند علیم کے پدر بزرگوار ہونے والے ہیں۔ [۱]

اس طویل بحث میں غور کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ آیہ مبارکہ میں لفظ 'امام' کی تفسیر نبی سے اور امامت کی تفسیر نبوت و رسالت سے کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قرآن میں ذکر کردہ واقع سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ حضرت قطعی طور پر نبی و رسول ہوتے ہوئے بڑھاپے اور ضعیفی کی فوق العادۃ منزل پر پہنچے تو ان سے فرمایا گیا کہ ہم تمہیں انسانوں کا امام بناتے ہیں، تو اس صورت میں نبوت و رسالت کے الفاظ سے کس طرح آپ کی توصیف ہوسکتی ہے؟ یاد رہے کہ لفظ 'اماما' جو اس آیہ مبارکہ میں وارد ہوا ہے، زیر بحث ہے، دوسری آیات میں نہیں کیونکہ چند ایک موارد میں لفظ 'امام' پیشوا کے معنی میں لفظ 'نبی' سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ ان مقامات پر پیشوا سے مراد پیشوا بطور پیغمبر ہے جس کی تفصیل ہم بعد میں پیش کریں گے۔

امام، گفتار و کردار میں پیشوا و نمونہ [۲]

''نبوت'' کی اصل تحمل وحی ہے اور رسالت کی حقیقت اس فرض کو ادا کرنا ہے، جس کو بطورِ نبی قبول کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھ لیں کہ جو شخص وحی الٰہی کو قبول کرتا ہے اسے نبی کہتے ہیں اور اگر اس حاصل شدہ وحی کو خارجی دنیا کے سامنے پیش کردیا جائے تو یہ عمل رسالت الٰہی کہلائے گا اور اس کے فاعل کو رسول کہتے ہیں۔

انبیاءؑ، و رسل عقلی و قرآنی دلائل قطعی کے مطابق وحی کے حصول اور اس کے مطابق عمل کرنے میں ہر طرح خطاء و لغزش سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ گفتار و کردار میں بھی ہر طریقہ سے ہر قسم کی غلطی و گناہ سے معصوم شمار کیے جاتے ہیں۔

تمام مراحل حیات میں ان کی عصمت و حفاظت از خطاء، ان کی روحانی و نفسانی عظمت جس کی آئینہ دار ہے، اس امر میں مانع نہیں کہ ان کے حین حیات ایسے واقعات سامنے آجائیں جو ترک اولیٰ کی حدود میں شمار ہوں یا بہ الفاظ دیگر نقص نسبی، یعنی جو ان کے عظمت مقام سے متناسب نہ ہوں۔ پھر وہ اپنی لغزش کے معرف بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے مغفرت و بخشش کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ قرآن اس سلسلہ میں بعض مواقع کا ذکر فرماتا ہے جن میں سے بعض ہم پیش کرتے ہیں۔

۱: حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] حضرت اسماعیلؑ کے متعلق بشارت صرف سورۂ صفات آیت ۱۰۱ میں ہے جبکہ حضرت اسحق کے بارے میں تین سورتوں میں بشارت وارد ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ حجر: ۵۳۔ ہود: ۷۱ اور والذاریات: ۲۴

[۲] اس نظریہ کو بعض معاصر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰهٰ: ۱۱۵)

''ہم نے پہلے ہی آدم سے عہد لے لیا تھا جس کو اس نے بھلا دیا اور ہم نے اس میں استقامت نہ پائی۔''

حضرت آدم علیہ السلام کی عدم استقامت اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم ارشادی کو نظر انداز کیا جس کے نتیجہ میں وہ رنج و زحمت میں مبتلا ہوئے، اگرچہ وہ کسی قسم کی غلطی یا گناہ کے مرتکب نہ ہوئے۔

۲: حضرت یونس علیہ السلام کو ایک ترک اولیٰ کی پاداش میں مچھلی کے شکم میں جانا پڑا۔ پھر وہ اپنے اس عمل پر نادم و پشیمان ہوئے حتیٰ کہ مچھلی کے شکم میں ندا دیتے رہے۔

اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ (انبیاء: ۸۷)

''بے شک میں ہی ظالموں سے ہوں۔''

۳: حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے ایک اسرائیلی کے ایک مشرک قبطی سے جھگڑے میں اس قبطی کو مار ڈالا، پھر اپنے عمل پر نادم ہوئے اور عرض کی:

هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۵﴾ (قصص: ۱۵)

''یہ کارِ شیطان ہے جو ظاہر بظاہر گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔''

اس طرح یہ ایک مشرک کا قتل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دربدری کا سبب بنا۔ اگر حضرت موسیٰ اس کو قتل نہ کرتے تو وہ شخص بھی فرعون کے ہمراہ دریا میں غرق ہو جاتا۔

انبیاء علیہم السلام کی یہ جماعت غلطی اور گناہ سے مکمل عصمت اور حفاظت کے باوجود اس مقام بلند پر فائز نہیں کہ لوگوں کے لیے رفتار و کردار میں حجت مطلق قرار پائیں، لوگ انھیں امام، پیشوا، قدوہ، مقتدیٰ اور نمونہ کے طور پر اختیار کریں اور انھیں معمار کی دیوار کو سیدھا کرنے والی رسی کی طرح قرار دیں، ہرچند کہ وہ ترک اولیٰ کی سطح پر ہوں۔ البتہ جب یہ حج پروردگار امامت اور اقتداء کی منزل پر سرفراز ہو جائیں تو پھر یہ حضرات حجت مطلقہ کی حیثیت کے مالک ہوں گے اور اس کے بعد ان کے حجت مطلقہ قرار پانے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اس حجت مطلقہ ہونیکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ہر اعتبار سے پیشواء و نمونہ عمل بن جاتے ہیں۔

اسی حجت کا تقاضا ہے کہ قرآن مجید سلسلہ انبیاء میں بعض آئمہ کا اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور ہادی تعارف کرواتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ (انبیاء: ۷۳)

''انھیں ہم نے پیشوا قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کی طرف اچھے کام کرنے کی وحی کی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ہدایت مطلقہ اور دعوتِ وسیع کا مصدر ہوتا ہے۔ اس کی ہدایت صرف اس کی گفتگو یا قول کی حدود میں ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ فعل و عمل کے اعتبار سے ایک کامل ہادی و رہنما اور پیشوا و نمونہ عمل اور سرتا پا خیر و نیکی کا مجسمہ ہوتا ہے۔

چونکہ بخشش کا مقام انسان کی قدر و قیمت سے متناسب ہے، انبیاء علیہم السلام کو مقام امامت تک پہنچنے سے پہلے بہت سخت و شدید مسائل کے ذریعہ میدانِ آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ اطسرح ایک نبی منصب امامت کے لیے اپنی لیاقت و اہلیت کو ثابت کرتا ہے، جس طرح خداوند عالم حضرت ابراہیم کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (البقرہ: ۱۲۴)

''اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے حوادثِ بزرگ کے ذریعہ آزمایا۔''

ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

''ان الله تبارك و تعالیٰ اتخذ ابراهيم عبدا قبل ان يتخذه نبيا، و ان الله التخذه نبيا قبل ان يتخذه رسولا، وان الله التخذه رسولا قبل ان يتخذه خليلا، و ان الله التخذه خليلا قبل ان يجعله اماما، فلما جمع له الاشياء قال انی جاعلك للناس اماما۔''[1]

''بتحقیق اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا بندہ قرار دیا قبل اس کے کہ انھیں نبی بناتا۔ انھیں رسول قرار دینے سے پہلے نبی بنایا، ان کو اپنا خلیل قرار دینے سے پہلے رسول بنایا، پھر منزل امامت پر فائز کرنے سے پہلے ان کو اپنا خلیل مقرر فرمایا۔ پھر جب یہ تمام کمالات ان میں جمع ہو گئے تو فرمایا میں تمھیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔''

اس حدیث مبارکہ کی رو سے درجہ خلت رسالت کے بعد اور مقام امامت سے پہلے قرار پاتا ہے۔ پھر 'خلت' اس کے سوا کچھ نہیں کہ قلب انسان صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالی رہے، مملکت وجود سے غیر اللہ کا تعلق ختم ہو جائے اور انسان سرتا پا اپنے خالق کے قبضہ و اختیار میں قرار پالے۔

لہٰذا امام اللہ تعالیٰ کا وہ بندہ ہوتا ہے جو منزل عروج میں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سلسلہ میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے پورے وجود پر اس کے خالق کے علاوہ کسی کی حکمرانی نہیں ہوی، اس کا تعلق ماسوی اللہ سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے، اس کی اس قابلیت و استعداد

---

[1] اصول کافی، ج ۱، باب طبقات الانبیا ص ۱۷۵، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

اور صلاحیت کی موجودگی میں اس کی گفتار و رفتار اور سکوت تمام حوادثِ حیات کے مقابلہ میں حجت ہو جاتے ہیں، وہ انسان کی شکل میں ایسا نمونہ کامل بن کر سامنے آتا ہے کہ تمام انسانوں کا رہنما اور تمام نوع بشر کے لیے نمونہ پیشوا قرار پاتا ہے۔

ہر نبی و رسول گرفتار و عمل میں درجہ عصمت پر فائز ہونے کے باوجود کبھی اس مقام کمال تک نہیں پہنچتا کہ اس کی رفتار و عمل مراحل زندگی میں مکمل طور پر سو فیصد یا منزل امامت تک پہنچنے سے قبل اسوۂ و نمونہ قرار پائیں اور اس کی زندگی ہر مرحلہ میں حجت مطلقہ قرار پائے سوائے اس کے کہ جب تک وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح منصب امامت پر سرفراز نہ ہو جائے۔

جو بات ان معانی کی زیادہ سے زیادہ تائید کرتی ہے وہ یہ ہے کہ 'امام' کے معنی پیشوا و رہبر کے ہیں پھر ایک شخص کے امام اور دوسرے کے ماموم ہونے کے لیے لازم ہے کہ امام ہر مرحلہ زندگی میں نمونہ اور پیشوا قرار پائے اور مشہور مقولہ **انما سمعی الامام اماما لان یوتم به**[1] یعنی امام کو اس اعتبار سے امام کہتے ہیں کہ اس کی پیروی کی جائے" درآنحالیکہ بعض انبیاء علیہم السلام کا طرز زندگی تمام نوع انسانی کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا، نہ ہی وہ اپنی منزل پر انسانوں کے امام شمار ہو سکتے ہیں۔

ہم سب خوب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تمام عمر میں شادی نہ کی۔ ان کے سامنے کچھ ایسی مصلحتیں تھیں کہ انھوں نے اس سنت الٰہی کو اختیار نہ فرمایا۔ اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت ہوتی ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی اس بارے میں مجبور رہے[2] یعنی عملی طور پر انہوں نے بھی عورت کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہیں فرمایا درآنحالیکہ عام لوگوں کی زندگی کا معیار اور ان کا مقام تقویٰ و عفت ان دونوں روحانی شخصیات کے معیار سے بالکل مختلف ہے کیونکہ دیگر عام افراد کے لیے سلسلہ ازدواج قطعی طور پر لازمی ہے تو کیا ان حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں پیغمبرانِ عظیم الشان جو ہر قسم کی غلطی اور گناہ سے معصوم ہیں، جنہوں نے بعض مصالح یا حالات کی دورنگی کے پیش نظر شادی نہیں کی، ہر اعتبار سے، حتیٰ کہ رفتار و عمل کے لحاظ سے امام و پیشوا قرار پا سکتے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ 'امامت' ان حضرات کے لیے ہے جو آزمائشوں کے ایک سلسلہ سے گزر کر منزل کمال تک پہنچیں تا کہ ہر شعبہ میں پیشوا کہلا سکیں اور لوگوں کے لیے لازم ہو جائے کہ اقوال و اعمال کے تمام مراحل میں ان کی پیروی کریں۔

غیر یقینی و غیر مستقل نظریہ

پہلی بات یہ ہے کہ غلطی و گناہ سے محفوظ ہونا بنظر قول و عمل اس کے امر کے لیے کافی ہے کہ کوئی شخص عوام الناس کے لیے پیشوا و نمونہ قرار پائے۔ ترک اولیٰ کا ارتکاب ایسے شخص کے پیشوا قرار پانے میں ہرگز کسی نقصان کا باعث نہیں بنتا۔ بہت ہی شاذ و نادر حالات میں مثلاً

---

[1] عبدہ کی نہج البلاغۃ کے مطابق حضرت امیر المومنین اپنے خط ۴۵ میں امام کے متعلق فرماتے ہیں **الا و ان لکل ماموم اماما یقتدی به ویستضی بنور علمه** یعنی ہر ماموم کا ایک امام ہوتا ہے جس کی وہ اقتداء کرتا ہے اور اس کے نورِ دانش سے روشنی پاتا ہے۔

[2] وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ (آل عمران:۳۹)

حضرت آدم علیہ السلام کے اس دارِ تکلیف میں آنے سے پہلے کا ترک اولیٰ ان کے اس دنیا میں نمونہ ہونے کے منافی نہیں۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عمل بھی ان کے اعلان نبوت سے قبل کا ہے۔

دوسرے جو کچھ اس نظریہ میں بیان کیا گیا ہے وہ خصوصیات امام کا ایک حصہ تو ہوسکتا ہے، اس کی تمام خصوصیات کا بیان نہیں۔ بلکہ امام کے لیے ایک اور سلسلہ شرف ہے جس کو آخر میں بیان کیا جائے گا۔

تیسرے اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نمونہ بننے کے کئی مراتب ہیں جن کا کمال ان حضرات سے متعلق ہے جو منزل امامت پر فائز ہوں، تاہم اس قسم کی تخصیص کے لیے دلیل وشاہد کی لازمی ضرورت ہے۔

علامہ طباطبائی کا نظریہ

امام وہ عظیم ہستی ہے جو باطنی طور پر پیشوائی و رہبری کرتا ہے۔ وہ کاروانِ انسانیت کا ایسا قافلہ سالار ہوتا ہے جو باطنی راستوں سے پروردگار عالم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اس بات کی وضاحت اس طرح ہے کہ انسان کی صحیح معنی میں خوش بختی و بدبختی کا واحد وسیلہ اس کے نیک یا بداعمال ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان اعمال کو معیاری طرزِ فکر کے مطابق امر ونہی و تحسین و تقبیح کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ انہی اعمال کے نتیجہ میں ایک فردِ فرمانبردار کے لیے جاوید وخوشگوار زندگی کی خوشخبری، جبکہ ایک سرکش و باغی شخص کے لیے جاوید و تلخ زندگی کی خبر دی گئی ہے۔لیکن یہ تو ایک ظاہری بات ہے جبکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔مقام ربوبیت اس سے بلندتر ہے کہ ناظم بشریت کے طور پر وجود اختیار کر کے ایک فرمانبردار شخص کو اس کی زندگی سے باہر کوئی انعام اور سرکش کو حقیقت سے بعید کسی سزا کا سزاوار قرار دے۔ بلکہ مقام ربوبیت تو مقام خلقت وآفرینش ہے اور سعادت یا شقاوت کی زندگی ہمارے نیک یا بداعمال کی پیداوار ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت حکیمانہ سے روابط واقعی کے مطابق سلسلہ وار ظاہر ہوتی رہتی ہے۔لہٰذا ہمارے اعمال نیک و بد کا اس زندگی اور ابدی زندگی کے درمیان ایک حقیقی رابطہ برقرار رہتا ہے کیونکہ ہماری آئندہ کی زندگی میں خوشی و ناخوشی ہمارے اعمال پر منتج ہوگی۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ لیں کہ اعمال نیک و بد میں سے ہر عمل باطن انسان میں ایک واقعیت پیدا کرتا ہے، آئندہ کی زندگی جس کی مرہون منت ہوتی ہے۔اگر آپ چاہیں تو ہم اپنے اعمال کے آئندہ زندگی پر اثرات کو ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔

انسان کی آئندہ زندگی میں اس کی موجودہ زندگی کے اعمال کے اثرات کی مثال ایک بچہ کی مثال ہے جو اپنے ہمدرد مربی کی باتوں سے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے، روحانی ملکات کا ایک سلسلہ حاصل کر لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ عرصہ حیات میں سعادت کے ساتھ رہتا ہے اگرچہ وہ اپنے مقام پر اس کیفیت سے آگاہ ہو یا نہ ہو۔ یا اس کی مثال ایک مریض اور طبیب کے تعلق کی مثال ہے کہ مریض لاشعوری طور پر طبیب کی ہدایات پر عمل کر کے صحت وتندرستی حاصل کرتا ہے۔

اسی طرح حیات مادی کے اندر ایک اور حیات یعنی حیات معنوی و باطنی کا وجود پایا جاتا ہے جو انسان کے اعمال سے وجود پاتی ہے۔

انسان کے اعمال ہی سے یہ حیاتِ باطنی ترقی پاتی ہے اور سرائے آخرت میں خوش بختی یا بد بختی انہی اعمال کے نتائج سے وابستہ ہے۔

قرآن مجید اس حقیقت کی ہماری حیات اخروی کی کامیابی ہمارے اعمال نیک کی پیداوار ہے، بڑی وضاحت کے ساتھ تائید کرتا ہے۔قرآن نیک اور ایماندار لوگوں کے لیے اس حیات دنیوی سے بلندتر ایک اور حیات وروح کو ثابت کرتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

(نحل: ۹۷)

''ہر شخص مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ مومن ہو، عمل صالح بجالائے تو اس کو ہم پاکیزہ اور عمدہ زندگی کے ساتھ اٹھائیں گے۔''

امام وہ رہبر و رہنما ہوتا ہے کہ نہ صرف اعمالِ ظاہری کے مراحل میں ہماری ہدایت کرتا ہے بلکہ حیات معنوی میں بھی ہماری رہبری کا ذمہ دار ہے اور حقائق اعمال اس کی رہبری سے سامنے آتے ہیں۔

قرآن مجید جب بھی کسی موقع پر امام کے بارے میں بات کرتا ہے تو ان کی ہدایت کو بلا فاصلہ واضح فرماتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (انبیاء: ۷۳)

''ہم نے انھیں ایسے آئمہ اور رہنما قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے نیک کاموں کی انجام دہی کے لیے انھیں وحی کی۔''

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (سجدہ: ۲۴)

''ہم نے ان میں سے بعض کو امام قرار دیا تاکہ وہ ہمارے امر کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت کریں، کیونکہ انھوں نے صبر کیا۔''

یہ مبارک آیات بتلاتی ہیں کہ امام ظاہری ارشاد و ہدایت کے علاوہ ایک قسم کی معنوی ہدایت وجذبہ کا حامل بھی ہوتا ہے، جو بنیادی طور پر عالم امر و تجرد سے تعلق رکھتی ہے، جس کے ذریعہ امام اپنی حقیقت و نورانیت و باطنیت کی مدد سے شائستہ قلوب رکھنے والے لوگوں میں تاثیر و تصرف پیدا کرتا ہے اور ان کو مرتبہ کمال و غایت ایجاد کی طرف جذب کرتا ہے۔

استاد علامہ طباطبائی تفسیر المیز ان میں فرماتے ہیں:

''نبوت، مطاع ہونے، خلافت، وصایت، دین و دنیا کے امور میں سرداری جیسے الفاظ سے لفظ 'امامت' کی تفسیر کرنا عام سے الفاظ کا استعمال ہے۔اس تفسیر کی اساس یہ ہے کہ لفظ 'امامت' بہت عرصہ سے کثرت استعمال کے باعث اپنے اصلی معنی کھو بیٹھا ہے اور اس کے جدید معنی

سامنے آ گئے ہیں۔ اس بات کو اس طرح سمجھئے کہ مطاع ہونا نبوت کے لوازمات سے ہے۔ لفظ مطاع کا اس امامت سے کوئی واسطہ نہیں جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منزل نبوت کے بعد فائز کیا گیا۔ 'نیابت'، 'وصایت' اور 'ریاست' کے الفاظ بھی سب کے سب لفظ 'مطاع' ہی کی حقیقت کے حامل ہیں جو ایک مصدر مشترک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

ان حالات میں لفظ امامت کی 'مطاع ہونے' یا کسی ''اجتماعی کیفیت'' سے کس طرح تفسیر کر سکتے ہیں جبکہ اس کے معنی ایسے رہنما ہونے کے ہیں کہ دوسرے لوگ اپنے اقوال و افعال کی امام کے قول و عمل سے مطابقت پیدا کریں۔ اس کے علاوہ اس لفظ کے اور کوئی معنی نہیں۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء و رسل کی ہدایت سے راستہ دکھانے کے علاوہ اور کوئی چیز مراد نہیں جبکہ ہدایت امام سے مراد ایصال الی المطلوب یعنی مقصد تک پہنچانا ہے یعنی امام وہ ہستی ہے جو تاثیر باطنی اور نفوذ روحانی کے لحاظ سے جس کا اثر وجود قلب انسان کو منور کرتا ہے، بنی نوع انسان کی ہدایت کرتا ہے۔ اس حیثیت میں امام کا مقام سورج کی مانند ہے جو اپنے نور سے زراعت کی پرورش کرتا ہے اور مستعد و آمادہ قلوب کو کلی طور پر منقلب کر دیتا ہے۔

امام قوت روحانی کی مدد سے مستعد و آمادہ افراد کو ظلمت و گمراہی سے نکال کر نور میں وارد کرتا ہے۔ یہ منزل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان جیسے ہی دیگر حضرات کو ایک سلسلۂ امتحانات میں کامیاب ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے جس سے وہ اس قسم کی روح و نفس ناطقہ کے حامل ہو جاتے ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق امام فیض کا جاری کرنے والا بلکہ لوگوں کے لیے فیض و ہدایت پہنچانے کا سبب شمار ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح فیوض مادی اپنے لیے اسباب و مقام اجرائے مادی رکھتے ہیں، اسی طرح فیوض معنوی بھی، جن سے آیہ مبارکہ میں ہدایت تکوینی مراد ہے، کے لیے امام بذات خود اس قسم کے علل و اسباب کا حامل ہوتا ہے۔ اس قسم کی ہدایت فرد مقابل کی لیاقت و قابلیت کی بنا پر اس کی خواہش و اختیار کے بغیر بھی صورت پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہدایت کے اہل ہوتے ہیں وہ خود بخود ہدایت امام میں جذب ہو کر اس کے دائرہ ہدایت تکوینی میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انبیاء علیہم السلام اس لحاظ سے کہ ہدایت تشریعی کے حامل ہوتے ہیں، ابلاغ رسالت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے بیان سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں، اس لیے وہ 'نبی' کہلاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں سے بعض ہدایت تکوینی کے حامل ہوتے ہوئے، لوگوں کو ان کے قلوب و ارواح پر متصرف ہو کر کمال و سعادت تک لے جانے کا سبب بنتے اور انھیں مرکز ہدایت تکوینی تک لے جاتے ہیں، اس لیے انھیں امام کہتے ہیں۔

---

[1] المیزان، جلد ۱، ص ۲۷۴

اس نظریہ کا درجۂ استقلال

اس امر میں کوئی جائے کلام نہیں کہ چند ایک شخصیات بلند مقام ہدایت تشریعی کے ساتھ ساتھ ہدایت تکوینی کی حامل بھی ہوسکتی ہیں، اگر چہ اس کے ثبوت کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔ لیکن کسی ایسے شخص کو امام قرار دینا جو اس قسم کی ہدایت تکوینی کا حامل ہو کوئی واضح شاہد نہیں رکھتا، کیونکہ:

اولاً: یہ درست ہے کہ قرآن مجید جملہ **و جعلنا هم ائمة** کے بعد **یهدون بامرنا** فرماتا ہے۔ یہ جملہ ان (ائمہ) کی مدح و ثناء کا ناظر ہے اور اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ حضرات ان فرائض ہدایت کو جو ان کے ذمہ لگائے گئے ہیں احسن طریقہ سے انجام دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس سلسلہ میں معمولی سی کوتاہی بھی نہیں کرتے۔ ان کی اس صلاحیت کے ثبوت میں قرآن مجید سورۂ انبیاء میں فرماتا ہے:

وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ (انبیاء: ۷۳)

''وہ ہمارے خاضع و فرمانبردار ہیں۔''

پھر یہ آیہ سجدہ کے ذیل میں فرماتا ہے:

وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ (سجدہ: ۲۴)

''وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں۔''

ایسا نہیں کہ وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے فرمان تکوینی (بامرنا) کے زیر اثر تزکیہ و تصفیہ قلوب کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیہ مبارکہ ان کی توصیف و ستائش فرما رہی ہے، مسئلہ امامت کی تعریف نہیں کر رہی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی احادیث ہمارے اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ حضرت نے آیہ مبارکہ **و جعلنا هم ائمة یهدون بامرنا** کے بعد فرمایا:

"لا بأمر الناس يقدمون امر الله قبل امرهم، وحكم الله قبل حكمهم". [1]

''وہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے ہدایت کرتے ہیں نہ کہ لوگوں کے کہنے سے۔ وہ اللہ کے حکم کو لوگوں کے کہنے پر مقدم رکھتے ہیں۔''

---

[1] بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۱۵۶

اس کے بعد صادق آل محمد علیہ السلام ان اماموں کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں جو لوگوں کو آتش جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ لوگ اول الذکر جماعت آئمہ کے برعکس لوگوں کے ارادوں ک ارادۂ خدا پر اور ان کے میلانات کو کتاب خدا پر مقدم شمار کرتے ہیں۔

یہ روایت اور اس قسم کی دیگر روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ جملہ ائمة یهدون بامرنا ائمہ علیہم السلام کی عصمت کی اساس پر ثناو تعریف کا مظہر ہے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی عوض نہیں رکھتے۔ ایسا نہیں کہ امامت کی اصلیت وواقعیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس امر تکوینی سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہوں جس کے تحت اس نے عالم کو خلق فرمایا۔

ثانیا: امام کی ان الفاظ میں تعریف کہ وہ معاشرہ کا سرپرست یا مطاع ولازم الاتباع ہو یا ایسا پیشوا ونمونہ ہو کہ ماموم کا قول وعمل امام کے قول وعمل کے عین مطابق سمجھا جائے۔ کوئی کمتر معنی کی حامل نہیں جو بعد میں اس لفظ سے کسی طرح متعارض پائی جائے۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"والامامة نظاما للامة"

''امامت معاشرہ کی تنظیم کے لیے لازمی ہے۔''[1]

ثالثاً: یہ کہنا کہ ہر نبی مقام امامت پر ترقی پانے سے قبل مطاع ہوتا تھا اور مطاع ہونا نبوت کے لوازمات سے ہے، کسی حد تک درست نہیں۔ ہم آئندہ بحث میں وضاحت کریں گے کہ ہر نبی وپیغمبر صرف پیغمبر کی حیثیت سے مطاع نہ تھا بلکہ صفت مطاع اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ منزل امامت کا حامل ہو جائے۔ اس سلسلہ کی وضاحت کو آپ ہماری آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اگر کوئی شخص آیہ مبارکہ وما ارسلنا من رسول الالیطاع باذن الل٥ سے استدلال کرتے ہوئے ایک رسول کے لیے اطاعت کلی شمار کرے تو جاننا چاہیے کہ یہاں اطاعت خدا مراد ہے، نہ کہ اطاعت رسول جس پر "باذن الله" کے الفاظ شاہد ہیں جن کی توضیح بعد میں آتی ہے۔

''امام'' یا ''اماماً'' سے مراد ومقصود

یہاں ہمیں ایک خاص سوال کا ذکر نا گزیر معلوم ہو رہا ہے جس کی تشریح بعض دلائل کے استقلال کی وضاحت کرتی ہے۔ وہ سوال یہ ہے:

کیا مقصود بحث قرآن میں لفظ 'امام' کے معنی کی تفسیر ہے یا خصوصیت کے ساتھ آیہ مبارکہ انی جاعلك للناس اماما میں لفظ اماماً کی تشریح وتوضیح مقصود ہے؟

---

[1] نہج البلاغۃ، فیض الاسلام، کلمات قصار، ۲۴۴۔ عبدہ کے نسخہ میں ''والامامة کے بجائے کلمہ والامانة آیا ہے جو یقینا غلط ہے۔ افسوس ہے کہ صبحی صالح نے بھی اس کلمہ کو لکھنے میں غلطی کی ہے اور اسے والامانة کی شکل میں پیش کیا ہے۔

سوال میں دونوں لفظوں کی موجودگی سے یہ مراد نہیں کہ لفظ 'امام' قرآن میں دو معنی یا دو مختلف موضوعات کا حامل ہے۔ اس قسم کا احتمال قطعاً نا قابل قبول ہے۔ لفظ امام کے ایک سے زیادہ معنی ہرگز نہیں اور وہ ہیں مقتداء و پیشوا۔ لیکن اس وحدت معنی کے باوجود لفظ مقتداء کا قوام مختلف اور متعدد معنی پیش کرتا ہے۔ مثلاً امام جماعت، بچوں کا استاد، نبی، رسول، حاکم اور معاشرہ کا سرپرست، سب اپنے اپنے مقام پر امام و پیشوا کہلاتے ہیں اور اسی کلمہ کے معنی کے تحت قرار پاتے ہیں۔ تاہم ان تمام شعبہ جات میں پیشوا کا خمیر و احساس اپنے اپنے مقام پر اس طرح واقع ہوتا ہے کہ ایک مقام دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

ان حالات میں ہمارے لیے ضروری نہیں کہ لفظ 'امام' کے مفہوم کا مطلقاً قرآن کی تصریحات کے مطابق تعین کریں کیونکہ اہل لغت حضرات نے اس لفظ کی توجیہات و توضیحات کو مکمل طور پر روشن کر دیا ہے جن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہم امامت کی اصلیت کو ان آیات قرآن مجید سے اخذ کریں جو اس عہدہ کے لیے بعض خاص افراد کا ذکر کرتی ہیں، ان آیات کی مدد سے ہم واضح طور پر بیان کریں کہ ان حضرات کی پیشوائی و امامت کی اصل و معیار کیا ہے۔

اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا مقام اصل ان کی نبوت یا رسالت کے سبب سے تھا کیونکہ وہ حضرت **انی جاعلک للناس اماماً** کے خطاب سے سالہا سال قبل منزل نبوت پر فائز تھے، جو منزل ایک حد تک پیشوائی کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا طبعی طور پر مقام امامت کا اضافہ کسی اور منزل کی بناء پر ہونا چاہیے۔ تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ جیسا کہ حضرت اسحٰق و یعقوب علیہما السلام ہیں، ان کے لیے یہ مسئلہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ان کے لیے پیشوائی و امامت کا معیار ان کی نبوت ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں عطا ہوئی تھی۔

اس بات کی وضاحت اس طرح ہے کہ یہ حضرات مندرجہ ذیل دو آیات میں عہدۂ امامت سے متصف ہوئے ہیں:

وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ ؕ وَیَعۡقُوۡبَ نَافِلَةً ؕ وَکُلًّا جَعَلۡنَا صٰلِحِیۡنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا (انبیاء: ۷۲، ۷۳)

''ہم نے ابراہیم کو اسحاق و یعقوب عطا فرمائے اور ہر ایک کو صالحین میں سے قرار دیا، انھیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں''

حضرات اسحٰق و یعقوب علیہما السلام بلا شک و شبہ، اس آیہ مبارکہ کی تصریح کے مطابق امام ہیں، لیکن ان کی پیشوائی کے معیار کی اساس ان کی نبوت و رسالت کی منزل ہی ہے۔ دونوں حضرات اپنے اسی منصب کی روشنی میں اقتداء و پیشوائی فرماتے تھے اور لوگوں کو ہدایت کرتے تھے۔ ان کی یہ امامت سرحد نبوت کی پیشوائی اور یہ ہدایت سوائے ہدایت تشریعی کے اور کوئی چیز نہ تھی جو تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھی۔ لہٰذا ان دونوں حضرات کی امامت کا معیار ان کی نبوت و رسالت کے علاوہ اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ دونوں حضرات کی حیات طیبہ بھی اس مفہوم پر شاہد ہے یعنی چونکہ دونوں صاحبان نبی تھے لہٰذا امام و پیشوا بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اور ایسی صورت نظر نہیں آتی جس کے تحت ان کا منصب

ہدایت، ہدایت تشریعی کے علاوہ کچھ اور ہو، جس کے تمام ابنیاء علیہم السلام حامل تھے۔

پس ان معنی کے اعتبار سے تمام انبیاء علیہم السلام امام و پیشوا ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فرائض میں ان کی اقتداء کریں اور جو خطوط ہدایت وہ قائم فرمائیں ان سے تجاوز نہ کریں۔

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۭ

(سجدہ: ۲۳، ۲۴)

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ نزول کتاب کے سلسلہ میں ان پر شک و تردد نہ کرو۔ ہم نے انھیں بنی اسرائیل کے لیے منبع ہدایت قرار دیا اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے پیشوا قرار دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، اس صبر کی بنا پر جو انہوں نے دکھایا تھا۔''

اس آیہ مبارکہ میں منھم کی ضمیر جو 'ان میں سے بعض'' کے معنی میں ہے بنی اسرائیل کی طرف لوٹتی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کو (بنی اسرائیل کے انبیاء کی ایک جماعت) امام و پیشوا قرار دیا۔

یہ جماعت آیہ مبارکہ جس کا ذکر کر رہی ہے، ابنیاء بنی اسرائیل ہی ہیں اور حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ان کی واضح مثال ہیں جن کی امامت کا دارومدار ان کی نبوت پر ہے۔

علامہ طباطبائی اور بعض دیگر مفسرین نے جو یہ تصور قائم کیا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کی امامت کا انحصار ان کی نبوت کے علاوہ کسی اور خصوصیت پر ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے خیال میں ''منھم ''کی ضمیر مرجع انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ پھر چونکہ آیت مبارکہ میں 'من' تبعیض (جدا کرنے) کے معنی میں ہے، لہٰذا فطری طور پر اس سے یہ مراد قرار پاتی ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے بعض کو ہم نے امام قرار دیا۔ اس صورت سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کی امامت کا دارومدار ان کی نبوت کے علاوہ کسی اور چیز پر ہے کیونکہ اگر ان کی امامت منحصر بر نبوت ہوتی تو پھر یہ مقام ان تمام ابنیاء کو حاصل ہوتا اور پھر تبعض کی کوئی وجہ اس سلسلہ میں نہ تھی۔ لیکن آیہ مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرجع ضمیر اس کا نزدیک ترین کلمہ یعنی 'بنی اسرائیل' ہے۔ پس آیہ مبارکہ سے مقصود یہ ہے کہ ہم نے تمام ابنیائے بنی اسرائیل سے بعض کو امام و پیشوا قرار دیا اور انکی یہ پیشوائی ان کے مدارج نبوت کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ 'امام' قرآن میں پیشوا کے معنی رکھتا ہے۔ یہ پیشوائی اپنے لیے مختلف مدارج رکھتی ہے، یعنی دو مذکورہ آیات مبارکہ کی طرح کبھی نبوت اور کبھی رسالت کی نشاندہی کرتی ہے اور کبھی آیہ للناس اماماً کی طرح اس کا مصداق مختلف ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ امامت ابراہیم کا مقام نبوت کے علاوہ کیا ہوگا؟ چونکہ سابقہ مذکورہ نظریات کئی اشکالات سامنے لاتے ہیں لہٰذا ہم چوتھا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

''امام'' سرچشمہ ہدایت

امام وہ بلند وارفع مقام انسان ہوتا ہے جو ہدایت کا عظیم سرچشمہ اور اپنے زمانہ کے انبیاء اور ہادیوں کی جماعت کا وہ مرکزی نقطہ ہوتا ہے جو سب کے سب اس کی نظروں کے نیچے فعالیت، کارکردگی، سعی اور تلاش کے کام سرانجام دیتے ہیں۔

یہ ملکوتی انسان کمال کے اعتبار سے اس مقام پر فائز ہوتا ہے کہ سب لوگوں، حتیٰ کہ اپنے معاصر انبیاء و جملہ ہادیان کے درمیان ایسی درخشاں حیثیت کا مالک ہوتا ہے کہ سب اس کو اپنا مقتداء و پیشوا جانتے اور اپنے لیے اسوہ ونمونہ قرار دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اس معنی میں مکمل طور پر مشہور وتسلیم شدہ ہے کیونکہ جو معارف آپ لے کر آئے، جن احکام وسنن کی آپ نے اشاعت فرمائی، جس رفتار وگفتار کے آپ مالک تھے، آئندہ آنے والی شریعتوں میں روح کی مانند پھونک دیئے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے لوگوں کے امام تھے، حتیٰ کہ حضرت لوط علیہ السلام جیسے پیغمبر [1] بھی ان کے ماتحت اور ان کی ہدایات کے زیر سایہ سعی وتبلیغ فرماتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی امامت ان کے بعد بھی جاری وموجود تھی، یہاں تک کہ تمام انبیائے بنی اسرائیل اپنی تمام عظمتوں اور تصرفات کے باوجود، جو انھیں حاصل تھے، اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیرو مانتے اور ان کی اقتداء کرتے تھے۔

اہل کتاب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا اور یہود و انصاریٰ نے الگ الگ ان کو اپنے میں سے سمجھا، تو قرآن ان کے اختلاف کو قطع کرنے کے بارے میں دو مطالب کا ذکر کرتا ہے:

۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان اس سے بالاتر ہے کہ وہ دونوں گروہوں میں سے کسی سے تعلق رکھیں۔

۲: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے زیادہ ماننے والے لوگ وہ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی اور یہ حضرات ان کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے انبیائے گرامی اور باوفا مومنین تھے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ (آل عمران: ۶۷)

''ابراہیم کے ساتھ لوگوں میں سب سے زیادہ شائستہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سابقہ امم میں سے ان کی پیروی کی (اور اس امت سے) وہ پیغمبر اور باایمان افراد ہیں اور خداوند عالم مومنین کا سرپرست ہے۔''

آیہ مبارکہ تین جماعتوں کو دوسروں کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ زیادہ سزاوار قرار دیتی ہے، جو یہ ہیں:

---

[1] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام انبیاء ومرسلین کے طبقات کے سلسلہ میں فرماتے ہیں ''وعليه امام مثل ما كان ابراهيم على لوط''۔ پھر حضرت یونس کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وعليه امام''۔ کافی ج۱، ص ۱۷۵، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱: وہ جماعت جس نے امم سابقہ (یہود ونصاریٰ) سے ان کی پیروی کی۔

۲: پیغمبر اکرمؐ کی ذاتِ اقدس۔

۳: باایمان افراد۔

پہلی جماعت کو حضرت کی پیروی کی خاطر اہمیت حاصل ہے اور باقی دوسروں کو ان کے مکتب تبلیغ کی حفاظت اور ان کے اصول سے وفاداری کے باعث۔

یہ آیہ مبارکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت اور ان کی امامت کی بقاء، حتی کہ حضرت موسیٰ بن عمران جیسے نبی کے ظہور کے بعد تک کو پیش کرتی ہے۔ یہ عظیم الشان پیغمبر خدا، باوجود یکہ خود امام تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کے بھی اپنی ذات میں نمائندہ تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیاء کے لیے لازم تھا کہ ان کے آئین وشریعت اور قول وعمل کی پیروی کریں۔ تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت، ان کی روح شریعت وسنن اور احکام بعد میں آنے والی شریعتوں میں روح رواں کی طرح حکم فرما تھے، یعنی مسئلہ للناس اماماً اب بھی اپنی تجلی کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خورشید اسلام کے طلوع ہونے کے بعد بھی امامت حضرت ابراہیم اسی طرح قائم ودائم تھی جس کا گواہ اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جس کے ذریعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آئین ابراہیمی کی پیروی کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾ (نحل: ۱۲۳)

''پھر ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ ابراہیم کے دین کی پیروی کریں جو مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

ایک اور آیت میں آئین اسلام کو اس اعتبار سے کہ یہ سہل وآسان ہے اور اس میں کسی قسم کی شدت وتکلیف نہیں پائی جاتی، دین ابراہیمی کا حصہ بتلایا گیا ہے اور یاد دلایا گیا ہے کہ اسی نے تم کو مسلمان کا نام دیا، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیۡكُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ

(حج: ۷۸)

''اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہترین طریقہ سے حق جہاد ادا کرو۔ اس نے تمھیں چن لیا اور دین میں تم پر کوئی مشقت وسختی قرار نہیں دی۔ یہ دین تمہارے جد ابراہیم کا دین ہے اور انھوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔''

ان آیات اور بعض دوسری آیات سے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں، واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام للناس

اماماً کے حکم کے تحت امام برحق تھے اور لوائے امامت کے حامل بھی تھے۔آپ کے قول وعمل تمام ابنیاء کے لیے، جو ان کے سامنے، یا ان کی وفات کے بعد مختلف مقامات عالم میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے، نمونہ و رہنما تھے۔لہٰذا حضرات اسحاق، یعقوب، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام جیسے انبیائے کرام کے بعد بھی حضرت ابراہیم کی امامت کامل طور پر باقی تھی اور آپ کے سنن واحکام آئینی حیثیت رکھتے تھے۔

امامت اسحقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ

ہم نے استاد علامہ طباطبائی کے نظریات کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ حضرات اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کی امامت ان کی نبوت کی روشنی میں کارفرما تھی۔قرآن مجید کے ارشاد وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیا: ۷۳) سے حدود نبوت میں ان حضرات کی رہنمائی مراد ہے۔ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے معلوم ہو کہ ان کی پیشوائی ان کے عہدۂ نبوت کے علاوہ بھی کوئی مقام رکھتی تھی۔یہ شرف صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کو حاصل تھا کہ آپ کی امامت کا دائرہ نبوت کے باہر تک بھی وسیع تھا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ حضرت انی جاعلك للناس اماما سے طویل مدت قبل نبی اور رسول کے عہدوں پر فائز تھے جبکہ اس قسم کا کوئی اعزاز حضرات اسحق اور یعقوب کے لیے یا تو وجود نہیں رکھتا یا کم از کم سامنے نہیں آتا۔

انبیائے بنی اسرائیل میں سے صرف واحد نبی جسے امام کا نام دیا جاسکتا ہے وہ حضرت موسیٰ بن عمران ہیں، انبیائے بنی اسرائیل جن کے سایہ میں اور جن کی شریعت کے تحت اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے حتیٰ کہ قرآن مجید نہ صرف انھیں بلکہ ان کی کتاب کو بھی امام کا نام دیتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ (هود: ۱۷)

امامت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت، اس اعتبار سے کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کا دین خاتم الادیان، آپ کی کتاب آخری کتاب الہامی ہے، نیز آپ کے خلفاء اور جانشینوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ آپ کی نبوت و رسالت کے نور و روشنی میں اپنے فرائض سرانجام دیں، مکمل طور پر (ہر خطرہ وانحراف سے) محفوظ ہوجاتی ہے۔[1]

استواریٔ نظریہ کی بنیاد

سابقہ چار نظریات میں یہ نظریہ استواری کے زیادہ قریب ہے، تاہم اس میں دو قسم کے خدشات دکھائی دیتے ہیں:

---

[1] اس نظریہ کے مطابق انبیاء میں صرف تین حضرات کی امامت، قرآن کی نظر میں، محفوظ ہے اور وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور محمد حبیب اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم ہیں۔

۱: ’’اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہدایت کرنے والی ایک جماعت کے امام ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے افراد نبی یا رسول کی حیثیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موجودگی میں یا ان کے بعد کار ہدایت میں سعی فرماتے رہے، جبکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے للناس اماما یعنی ’’سب انسانوں کے امام‘‘۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی ایک فرد یا افراد کے امام نہ تھے جو ان کے دائرہ امامت میں موجود تھے۔ یہ آیہ مبارکہ بظاہر اس نظریہ کے ساتھ ہم آہنگ نظر نہیں آتی جو امامت کو بعض مخصوص ہادیوں سے نسبت دیتا ہے سوائے اس کے کہ انبیاء علیہم السلام کا ذکر کسی عام فرد کے طور پر کیا جائے نہ کہ اس طرح کہ ان کی امامت صرف انھی سے مخصوص قرار دی جائے۔‘‘

۲: ’’اس نظریہ کو صحیح اور مستقل گردانے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اہل تشیع کے ائمہ معصوم اس معنی میں امام نہ رہیں گے، کیونکہ وہ خود صاحبان شریعت نہ تھے کہ ہدایت کے سرچشمہ ہوتے، درآنحالیکہ آئمہ معصومین نے اس آیہ مبارکہ کے ذریعہ اپنی امامت کی حقانیت اور دوسرے لوگوں کی امامت کے عدم استقلال پر استدلال فرمایا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کے بارے میں اہلبیت عظام کی روایات میں تحقیق کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام نے آیت میں آنے والے لفظ 'امام' کی اس طرح تفسیر فرمائی ہے جو خلافت ووصایت اور جانشینی رسول پر بالکل منطبق ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس آیت میں امامت بطور سرچشمہ ہدایت قرار دی جائے یا اس کے مشابہ ایسی ہی کوئی تفسیر کی جائے تو ایسی روایات ہرگز ان معنی کے مطابق نہیں ٹھہریں گی۔‘‘

اب ہم اس منزل پر آ گئے کہ پانچویں نظریہ کو، جو اس سلسلہ میں آخری نظریہ ہے، واضح کریں۔ ممکن ہے اس نظریہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے شکوک واشتباہ کے پردے ہٹ جائیں اور حقیقت اپنے روشن چہرہ کو ظاہر کر دے۔

امام بطور پیشوائے مفترض الطاعت

قرآن میں لفظ 'امام' کے حقیقی معنی کے تجزیہ کے لیے نبی اور رسول کے معانی کا سمجھنا لازمی ہے جب تک ان دونوں کلمات کے معانی و حدود معلوم نہ کر لیے جائیں ہرگز امامت کی حدود کا اندازہ ممکن نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہم سابقہ بحث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں مفصل طور پر بتایا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبوت ورسالت کے مراحل طے کرنے کے بعد اس قابل قرار دیے گئے کہ منصب امامت پر فائز ہوں۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبوت ورسالت ہی آخری نقطہ کمال اور سب سے بڑا منصب خداوندی نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں مقام، یعنی نبوت ورسالت، ایک ملکوتی انسان کے لیے منصب آخر قرار پائیں تو پھر انسان کامل کے لیے ان سے اوپر اور کوئی منزل باقی نہیں رہے گی۔ لہٰذا ہم سب سے پہلے ان الفاظ اور ان کے محل استعمال کی تشریح کرتے ہیں اور اس کے بعد مسئلہ امامت کی وضاحت کریں گے۔

لفظ 'نبی' کا مادہ ’’نباء‘‘ ہے۔ اس کے معنی بہت بڑی اور عظیم خبر کے لیے جاتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی کسی بہت بڑی خبر کا حامل شخص

ہوں گے یا یہ کہ کوئی ایسا شخص جو کسی بڑی خبر کو پہنچانے والا ہو۔[1]

لفظ ''نبی'' قرآن مجید میں ایسے انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے وحی کو مختلف طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ حقیقت لفظ نبی، جس کو متبادل طور پر ''پیغمبر'' بھی کہتے ہیں، اس سے کسی طرح مختلف نہیں۔ 'نبی' کے بارے میں جتنی بھی خصوصیات لغت تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، سب کی سب اس کے مفہوم سے خارج ہیں اور یہ لفظ ان خصوصیات پر بالکل دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اس لفظ کی خصوصیات کو خارجی قرائن ہی سے معلوم کرنا چاہیے۔

شیخ طوسیؒ فرماتے ہیں:

انہ مؤد من اللہ بلا واسطة من البشر

''نبی ایسا خبر دینے والا فرد ہوتا ہے جو کسی بشری وساطت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیتا ہے۔''[2]

'نبی' کے معنی 'نبا' کا وصول کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دینے والا مخبر ہیں، لیکن لفظ 'رسول' کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رسالت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو، بشر کی جانب سے نہیں[3]۔ یعنی اس کی رسالت حدودِ نبوت کے اندر قرار پاتی ہے۔ اس کے معنی ایسے پیغام کا حامل ہونا ہوگا جو کسی امر کی تبلیغ یا کسی عمل کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیڑا اٹھا چکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ دونوں مفاہیم، یعنی نبوت و رسالت، ہر ایک خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ خصوصیات پیغمبر کی نشاندہی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی گئی ہوں۔ ایسے افراد اس لحاظ سے کہ حاملاتِ خبرِ الٰہی اور وحی الٰہی کے وصول کرنے والے ہوتے ہیں، 'نبی' کہلاتے ہیں۔ نیز اس لحاظ سے کہ ابلاغ وحی کے فرائض اپنے ذمہ رکھتے ہیں، ان کو 'رسول' کہا جاتا ہے۔

ان دونوں الفاظ کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ لغت و تفسیر کی کتب میں ان دونوں الفاظ کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان کے حقیقی معنی سے کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں رکھتیں۔

اس نقطہ نظر سے 'نبی' اور رسول ڈرانے یا امید دلانے کے سوا اور کوئی فرض اپنے ذمہ نہیں رکھتے۔ وہ تبلیغ و رہنمائی بھی نہیں کرتے۔ نہ ان کا کوئی امر ہے نہ نہی۔ نہ وہ کوئی آئین دیتے ہیں نہ حکم۔ اس معاملہ میں ان کی حیثیت وحی کے بیان کرنے والے اور امر و نہی کے اعلان کرنے

---

[1] لفظ نبی اگر صیغہ لازم میں ہو تو اس کے پہلے معنی ہوں گے اور اگر متعدی ہو تو دوسرے معنی ہوں گے۔ اگرچہ بظاہر دوسرے معنی ہی سمجھ میں آتے ہیں جو ایک طرح سے رسول کے معنی کے متناسب ہیں۔

[2] الرسائل العشر: ص ۱۱۱۔ شیخ کی عبارت وضاحت کرتی ہے کہ انھوں نے لفظ 'نبی' کو متعدی قرار دیا ہے۔ نیز 'نبی' کے لفظ کے مفہوم میں بشر کی وساطت کی نفی کی گئی ہے، فرشتہ یا ملک کی وساطت کی نہیں۔

[3] مثلاً "فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ" (یوسف: ۵۰) اس سے وہ شخص مراد ہے جو عزیز مصر کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ اس موقعہ پر قرآن نے 'رسول' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

والے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ قرآن مجید پیغمبرانِ مرسل کے بارہ میں بطور کلیہ فرماتا ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (بقرہ: ۲۱۳)

''اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو معبوث فرمایا جو بشارت دینے والے اور (عذابِ خدا) سے ڈرانے والے ہیں۔''

نیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

فَذَكِّرْ ۣ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ (غاشیہ: ۲۱، ۲۲)

''یاددہانی کرائیں کیونکہ آپ یاد کرانے والے ہیں اور آپ ان پر تسلط نہیں رکھتے۔''

ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (مائدہ: ۹۲)

''اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر پر سوائے واضح تبلیغ کے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔''

مذکورہ مطالب کے علاوہ انبیاء اپنی طرف سے کوئی مقام امرونہی نہیں رکھتے۔ یہ آیات ایک اور مطلب کی وضاحت بھی کرتی ہیں جو یہ ہے کہ انبیاء کے فرائض کی حقیقت صرف ارشاد وہدایت ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام جب تک نبوت ورسالت کی حدود میں رہتے ہوئے سعی وتلاش کر رہے ہوتے ہیں، ایسے ہدایت کرنے والے ہوتے ہیں کہ ہمیشہ خطرہ کے مقامات، منازل ممنوع ومشروع اور مجاز کا اعلان کرتے رہتے ہیں، سعادت وخوش نصیبی کے راستے دکھلاتے رہتے ہیں لیکن ذاتی طور پر خود اپنی طرف سے یہ حضرات کوئی انفرادی رائے ونظریہ کے مالک نہیں ہوتے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے کلام کے الفاظ، وحی الٰہی کا اعلان (احادیث) اور کلام خدا کی ترجمانی ہوتے ہیں۔

ہدایت کے اس سلسلہ میں امروحکم کرنے والی صرف ایک ہی ہستی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے، انبیاء وپیغمبران اس کی طرف سے مامور اوران کے علاوہ امم ہوتی ہیں جو ان کے مطیع وفرمانبردار ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے گنہ گار اور نافرمان اور بس۔ جہاں تک پیغمبر کا تعلق ہے، ان کے لیے نہ اطاعت ہے اور نہ انحراف۔ اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۸۰)

''جس نے پیغمبرؐ کی اطاعت کی، گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

کیونکہ اللہ تعالیٰ حکم دینے والا اور پیغمبرؐ اللہ تعالیٰ کی بات وصول کرنے والا یا اس کے کلام کا ترجمان ہوتا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء: ۶۴)

''اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اس کے معنی یہ نہیں کہ پیغمبر خود اپنے مقام پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعصیان سے الگ کوئی مستقل اطاعت وعصیان رکھتا ہے۔ بلکہ 'باذنِ اللہ' کا جملہ واضح کر رہا ہے کہ رسول ذاتی طور پر ''مطاع واقعی'' نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ مطاع مطلق ہے اور اس کی اطاعت خود اسی کے حکم و فرمان سے ہے۔

ہم اس حقیقت کو ایک علمی اصطلاح میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں کہنا ہوگا کہ اطاعت خدا موضوعیت اور اطاعت رسول طریقیت کی حامل ہے۔ لہٰذا ہم اطاعت رسول اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ اس کی اطاعت بعینہٖ خداوند تعالیٰ کی اطاعت ہے، نہ اس کے علاوہ کوئی چیز ہے اور نہ اس سے الگ۔

اب ہم ان دونوں الفاظ کے معانی حقیقی سے واقف ہو چکے۔ اب ہم بتائیں گے کہ اس جماعت انبیاء کے لیے کوئی اور مقام معنوی کیا ہے۔

جب ایسا نبی اور رسول اپنی زندگی میں امتحانات وآزمائشات کے ایک سلسلۂ گرداب سے گزرے جس سے وہ اپنے کمالات باطنی کو مرحلہ فعالیت تک پہنچا دے، عشق خدا میں ایسا عاشق ہو جائے کہ اس کے قلب سے صدا بلند ہونے لگے۔ وہ آواز قلب عاشق میں سما جائے تو پھر اس کے دل پر خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہوگی۔ خداوند عالم اس کو سر پرست معاشرہ کا منصب عطا فرماتا ہے تاکہ تبلیغ رسالت کے فرائض اور امید وخوف کی خبر دینے کے علاوہ وہ ایسا پیشوا ہو جائے جو ذاتی طور پر امر ونہی اور تکلیف وذمہ داری اور دستور کا حامل ہوتے ہوئے معاشرہ انسانی کو صحیح تدبر کے ساتھ اس کے حد کمال تک پہنچائے۔

کوئی انسان (خواہ وہ درجۂ کمال کی انتہا پر فائز ہو) کسی دوسرے شخص پر حکومت کا حق نہیں رکھتا۔ بلکہ ولایت وحاکمیت تو صرف اس ذات خالق کے لیے ہے جس نے اسے خلقت وآفرینش مرحمت فرمائی۔ تاہم اس کے باوجود اللہ تعالیٰ چند مصالح کی بنا پر اپنی ولایت مطلقہ پر اعتماد کرتے ہوئے کسی ایسے انسان کامل کو جس نے زندگی کے نشیب وفراز میں بہت کامیاب امتحان دیا ہے، ولایت بخش دیتا ہے اور اسے امام وپیشوا، ولی وسر پرست اور معاشرہ کے لیے اس کو ایسا اہم قرار دیتا ہے جس کی اطاعت کی جائے اور جس کو صاحب فرمان قرار دیا جائے۔ ایسا شخص، انسان کامل، اپنے کام کی اہمیت کے پیش نظر امر ونہی اور تکلیف ودستور کا حامل ہوتا ہے اور یہی وہ شخص ہوتا ہے جو مستقل طور پر واجب الاطاعت قرار پاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مقام نبوت ورسالت سے الگ ایک منزل ہے۔ یہ منزل اخذ وحی اور تبلیغ احکام خدا میں منحصر ہے۔ یہ شخص اگر منزل امامت پر متمکن ہوگا تو ایک اور مقام تک ترقی پانے کے بعد ارتقائے معاشرہ کی مدیریت اور اپنی امت کی تنظیم کا عہدہ دار ہوگا۔

امامت کے بغیر نبوت ورسالت کے سلسلہ میں اطاعت رسول عین اطاعت خدا ہوگی، اس میں دو قسم کی اطاعت کا کوئی وجود نہیں۔

لیکن جب کوئی انسان مقام امامت پر فائز ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت سے نصب ہو کر امر ونہی کا حامل ہوگا اور مستقل حق اطاعت پیدا

کر سکے گا۔اس تفسیر کے لیے ہم قرآن مجید سے شواہد پیش کرتے ہیں۔

قرآن سے گواہ

یہودیوں نے مشرکین کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے روکنے کے لیے کہا کہ بت پرستی اس آئین سے بہتر ہے جس کی طرف آنحضرتؐ تمھیں دعوت دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی بات کو قرآن مجید میں اس طرح نقل فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

(نساء: ۵۱)

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے کہ وہ بت پرستوں کو کہتے ہیں کہ وہ (بت پرست) ان لوگوں سے جو (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہیں، زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

قرآن کریم اپنے جواب میں اس قسم کے ظالمانہ فیصلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:''اس فعل کی اصل رشک وحسد پر ہے'' کیونکہ آنحضرتؐ کی نبوت آل اسحق سے نبوت کے آلِ اسماعیل کی طرف منتقل ہونے کا نتیجہ ہے۔یہودی جو حضرت یعقوب علیہ السلام سے، جو حضرت اسحق علیہ السلام کے صاحبزادے تھے، نسبت رکھتے ہیں، اس انتقال نبوت پر حسد کرتے ہیں۔لہٰذا ان کی بے شرمی کی انتہا ہے کہ وہ بت پرستی کو اسی حسد کی وجہ سے دین توحید پر ترجیح دیتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (نساء: ۵۴)

''کیا وہ لوگ اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے (امت اسلامیہ کے پیغمبرؐ پر تجلی فرمائی اور) اپنے لطف سے لوگوں پر کرم فرمایا ہے، حسد کرتے ہیں؟ ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت اور ملک عظیم مرحمت فرمایا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'الناس' کہ جن سے یہودیوں نے حسد کیا ذاتِ حضرتِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے اور اس میں ان لوگوں سے حسد کا پہلو بھی شامل ہے جو آنحضرتؐ کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ال ابراہیم سے خداوند تعالیٰ کی مراد وہ حضرات ہیں جن کو اس نے کتاب وحکمت اور ملک عطا فرمایا ہے، وہ نسل حضرات اسماعیل اور اسحق سے فرزندان ابراہیم کی ایک جماعت ہیں، سب کے سب نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝٣٣ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٣٤ (آل عمران: ۳۳، ۳۴)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت نوح اور آل ابراہیم اور آلِ عمران کو عالمین سے چن لیا، ایسی ذریت واولاد جن میں سے بعض دوسرے بعض سے ہیں اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔''

اس آیت میں 'آل عمران' کا جو سب کے سب اولاد ابراہیم واقع ہوئے ہیں اور ایک معنی کے اعتبار سے آل ابراہیم میں شامل ہیں (جن کا اس سے پہلی آیت میں ذکر ہوا) آلِ ابراہیم پر عطف آ رہا ہے جو ایسا ہے جیسے خاص کا عطف عام پر ہوتا ہے۔ اس تخصیص کا سبب ذیل میں درج شدہ دو میں سے ایک ہوسکتا ہے۔

۱: خاندانِ آل عمران کی زیادہ تر عظمت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا مستقل طور پر ذکر ہوا۔

۲: یہ سمجھنا بھی مقصود ہوسکتا ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سے صرف آلِ عمران ہی منتخب شدہ ہیں، ساری اولادِ اسحٰق منتخب شدہ نہیں۔

پہلا خیال موخر الذکر سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر انتخاب کا معیار نبوت اور کتاب وحکمت کو قرار دیا جائے تو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سے ایک اور جماعت بھی، یعنی حضرات موسیٰ، ہارون، داؤد اور سلیمان علیہم السلام بھی ان مراتب کے حامل ہیں۔ اس صورت میں یہ اصطفاء (انتخاب) آل عمران سے مخصوص نہ ہوگا بلکہ اولادِ اسماعیل علیہ السلام میں ایک واحد گھرانہ ان فضائل کا مالک نظر آتا ہے اور وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے معصوم فرزندانِ عالی مقام ہیں۔

بہرحال آیہ مبارکہ بتلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت کے علاوہ، جو نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے، ملک عظیم مرحمت فرمایا۔ یہ ملک عظیم اس امامت کے علاوہ اور کوئی شے نہیں جس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے درخواست کی تھی اور ان کی دعا ان کے فرزندانِ صالح کے لیے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی تھی۔ اس 'ملک عظیم' سے لوگوں کی گردنوں پر سوار ہونا، معاشرہ پر اس قسم کا تسلط کہ تلوار کھینچ کر جبارین وظالمین کی طرح لوگوں کا خون بہانا ہرگز مراد نہیں، بلکہ اس سے مراد تنظیم امور اور حفظ نظام کے لیے ولایت الٰہی کا عطا ہونا ہے۔ یہ ملک عظیم نبوت ورسالت کے علاوہ شے ہے، اگرچہ عملی طور پر نبوت ورسالت کی تجلی ودائرہ اختیار سے باہر نہیں۔

دورِ حاضر میں کیفیت یہ ہے کہ بسا اوقات لفظ 'ملک' و 'ملک' (لام کی زیر کے ساتھ) کا مفہوم ذہن میں آنے سے انسان کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام ادوارِ تاریخ میں انسان نے ملک اور ملک کو بالعموم خوں ریزی اور غارت گری، تکبر اور استصغاف کے تصور سے الگ نہیں پایا۔ اس کے برعکس اگر حکومت کا سلسلہ، تدبیر ملک اور امامت کا نظام صالح اور برگزیدہ لوگوں کے ہاتھ میں ہو، امورِ امت پر وہ لوگ متصرف ہوں جو اللہ تعالیٰ کی ولایت سے سرفراز ہوں، تو اس صورت میں انسانی معاشرہ مختلف وضع وکیفیت پر استوار ہوگا۔

روایات اسلامی میں ''ملك عظيم'' کی تفسیر بطور اطاعت لازمی ومفروض کی گئی ہے۔ اس سے متعلق بعض روایات ہم ذیل میں

پیش کرتے ہیں:

کلینیؒ سند صحیح کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ 'کتاب سے نبوت'، حکمت سے قضا و عدل اور ملک سے اطاعت لازم مراد ہے۔[1]

حسین مختار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اتینا هم ملکا عظیما سے اطاعة المفروضة یعنی طاعت لازم مراد ہے۔[2]

علیٰ ہذا القیاس جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ اپنی کتاب الدر المنثور میں زبیر بن بکار کی کتاب 'موفقیات' سے نقل کرتے ہیں کہ معاویہ نے ابن عباسؓ سے کہا: ''بنی ہاشم اپنے آپ کو اسی طرح خلافت کے لائق سمجھتے ہیں جس طرح وہ اپنے آپ کو نبوت کے بھی قابل سمجھتے رہے ہیں۔لیکن یہ دونوں عہدے ایک ہی خاندان میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

ابن عباسؓ نے اپنے مفصل جواب میں کہا: ''یہ جو تو کہتا ہے کہ یہ دونوں مناصب ایک ہی خاندان میں جمع نہیں ہو سکتے تو پھر تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا کہتا ہے، جس نے فرمایا: ''فقد اتینا ال ابراهیم الکتاب والحکمة واتیناهم ملکا عظیما'' یعنی کتاب نبوت کی رازدان اور حکمت کا طریق عمل ہے۔اسی طرح ملک خلافت و سرداری ہے۔ہم بھی اولادِ ابراہیم ہیں۔اللہ تعالیٰ کا حکم ہمارے اور دوسروں (اولادِ اسحق) کے لیے یکساں ہے۔''[3]

اسی طرح برید عجلی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ ان حضرت نے فرمایا:

''الملك العظیم: ان جعل فیهم ائمة من اطاعهم اطاع الله و من عصاهم عصى الله''۔[4]

''ملک عظیم سے مقصود یہ ہے کہ ان (انسانوں) کے درمیان ایک پیشوا ہوتا ہے۔جو شخص اس کی اطاعت کرتا ہے تو گویا اس نے خدائے تعالیٰ کی اطاعت کی۔جو شخص اس کی مخالفت کرے تو گویا اس نے خدائے تعالیٰ کی مخالفت کی۔''

ان تمام روایات و آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امامت سے مراد سرپرستی اور ایسی اطاعت کما حقہ ہے جو پروردگارِ عالم نے حضرت

---

[1] کافی، باب ''ان الائمة ولاة الامر''، ص ۲۰۶، حدیث ۲

[2] کافی ج ۱، باب فرض طاعت، ص ۱۸۶، حدیث ۴، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

[3] الدر المنثور، ج ۲، ص ۱۷۳

[4] کافی، ج ۱، باب ان الائمة ولاة الامر ص ۲۰۶، حدیث ۵، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

ابراہیم علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے بعد مرحمت فرمائی تھی۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی تھی کہ اس فیض یعنی امامت کو ان کی ذریت میں باقی رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حد تک اس درخواست کو شرف قبولیت بخش دیا کہ یہ منصب امامت ان کی عادل و معصوم اولاد میں باقی رکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اولاد حضرت ابراہیم کو کتاب و حکمت کے علاوہ، جن کا تعلق رموز نبوت و رسالت سے ہے، ملک عظیم عطا فرمایا اور اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو عملی جامہ پہنایا۔ لہٰذا اگر ہم آیہ مبارکہ انی جاعلك للناس اماما قال و من ذریتی کو دوسری آیت مقدسہ فقد اتینا ال ابراهیم الکتاب و الحکمة و اتیناهم ملکا عظیما کے برابر رکھ کر دیکھیں تو آیہ موخر الذکر کی مدد سے یہ آیہ اول الذکر کے ابہام دور ہو جاتے ہیں۔

''ملک عظیم'' بزبانِ قرآن

سابقہ بحث میں متذکرہ آیہ مبارکہ بڑی وضاحت سے ثابت کرتی ہے کہ پروردگارِ عالم نے آل ابراہیمؑ کو نبوت و رسالت کے علاوہ ملک عظیم بھی عنایت فرمایا۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ملک سے معاشرہ کی سرپرستی اور ہر پہلو سے رہبری مراد ہے۔ بہت سے قرائن اس بات پر شاہد ہیں جن کو اب ہم بیان کرتے ہیں۔

جو آیات انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں وہ ان انبیاء کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتی ہیں:

۱: ایک جماعت صرف نبوت و رسالت کی حامل تھی اور اس کے علاوہ انھیں اور کوئی منزلت حاصل نہ تھی۔ غالباً حضرات ایوب، ادریس، یونس، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام جیسے انبیاء اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

۲: دوسری جماعت جس کے افراد ان دونوں مقامات یعنی نبوت و رسالت کے علاوہ ایک تیسری منزل پر بھی فائز تھے، جس کا نام 'ملک' ہے۔ ہم ان حضرات انبیاء میں سے بعض کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

(i) حضرت یوسف علیہ السلام شکر گزاری کے طور پر بارگاہ پروردگار میں عرض کرتے ہیں:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

(یوسف: ۱۰۱)

''پروردگار! تو نے مجھے ملک عنایت فرمایا اور تعبیر خواب کی تعلیم دی۔''

تعبیر خواب کی تعلیم ایک حد تک حضرت کی نبوت کی طرف اشارہ ہے، جبکہ اقتدار و قوت سے آپ کی امامت و حکومت مراد ہے۔

(ii) قرآن مجید حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (بقرۃ: ۲۵۱)

''اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت و حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ چاہا انہیں اس کی تعلیم دی۔''

پھر اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾ (ص: ۲۰)

''اور ہم نے انھیں مضبوط حکومت عطا فرمائی اور حکمت وعادلانہ فیصلہ کرنے کی تعلیم مرحمت فرمائی۔''

(iii) حضرت سلیمان علیہ السلام خداوند تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں:

وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ (ص: ۳۵)

''خداوند! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جس کا میرے بعد اور کوئی اہل نہ ہو۔ بے شک تو بہت عطا کرنے والا ہے۔''

خداوند عالم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور بعد والی آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وسیع طرزِ حکومت کا بیان کیا گیا ہے۔

(iv) حضرت طالوت کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور پھر جالوت سے ان کی جنگ کے حالات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد نبوت بنی اسرائیل کے ایک بزرگ کو ملی جن کا نام 'اشموئیل' تھا جبکہ امامت وحکومت حضرت طالوت کو عطا ہوئی۔

اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک حاکم مقرر کیا جائے تا کہ وہ اس کی ماتحتی میں اس کے حکم سے راہ خدا میں جہاد کریں۔ آخر کار ان کے پیغمبر نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ (بقرہ: ۲۴۷)

''اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہاری سرداری کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ انھوں (بنی اسرائیل) نے کہا: وہ (طالوت) کس طرح ہمارا حاکم ہوسکتا ہے؟ ہم خود (سرداری کے لیے) اس سے زیادہ اہل ہیں۔ اس کے پاس تو زیادہ مال ودولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تم پر منتخب فرمایا ہے اور تم سے زیادہ علم اور قوتِ جسمانی اس کو مرحمت فرمائی ہے۔ خداوند تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان وسیع ہے اور وہ (لیاقت افراد) سے بخوبی آگاہ ہے۔"

اس آیہ مبارکہ سے حسب ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

الف) ممکن ہے بعض مصالح اس بات کے متقاضی ہوں کہ نبوت حکومت و اقتدار اور قرآنی اصطلاح میں 'امامت' سے بالکل الگ کوئی چیز ہے۔ یعنی ایک ہی دور میں نبوۃ ایک شخص کے پاس رہے اور ان میں کا ہر شخص اپنے اپنے منصب کے بارے میں جو اسے عطا ہا ہے، لیاقت و قابلیت واقعی رکھتا ہو۔ ممکن ہے کہ ان دونوں مناصب کے درمیان فرق فرائض کے پیش نظر بنی اسرائیل کے افراد نے یہ اعتراض اپنے نبی پر نہ کیا ہو کہ آپ بطورِ پیغمبر اس کام کے طالوت کی نسبت زیادہ اہل ہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے اعتراض کیا بھی تو یہ کہ ہم سرداری کے اس کی نسبت زیادہ قابل ہیں۔ ان کے اس اعتراض کا مطلب دین کی سیاست سے علیحدگی نہیں جو استعمار و سامراج کا طریق کار ہے کیونکہ اس موقعہ پر اقتدار اور سیاست ایک نبی یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کے ماتحت کارفرما تھے جو اللہ تعالیٰ کی وحی کا مرکز تھا، نہ کہ اس سے الگ ہو کر۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اس کا نام تقسیم مسئولیت رکھ دیں۔

ب) طالوت کو جو مقام حاصل ہوا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھا۔ یعنی یہ مقام انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا "لہٰذا جو حکومت حضرت طالوت نے قائم کی وہ حکومت الٰہی تھی۔

ج) حضرت طالوت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والا مقام و منصب صرف فوج کی سربراہی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ بنی اسرائیل کے سردار و فرماں روا تھے جیسا کہ آیت میں لفظ 'ملکا' اس پر شاہد ہے۔ اگرچہ طالوت کے اس اقتدار و فرماں روائی سے اس وقت جہاد راہ خدا میں بنی اسرائیل کی رہبری مراد تھی، تاہم ان کا منصب الٰہی انھیں کئی اور کاموں کی بھی اجازت دیتا تھا جو سب کے سب فرائض حکومت سے متعلق تھے۔ اس بات کی شہادت آیہ مبارکہ کے آخری الفاظ دیتے ہیں، جہاں ارشاد ہوتا ہے: "و اللہ یوتی ملکه من یشآئ۔"

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید حضرت طالوت کو ایک حامل ملک یا ملِک (لام کی زیر کے ساتھ) کہ جو اس زمانہ کی حکمرانی و سربراہی تھی، کے ساتھ تعبیر فرماتا ہے۔ لفظ 'ملک' کی قرآنی تحقیق اس حقیقت کو مسلم کرتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت ایک اور مقام پر قرآن کریم فرعون کی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی برتری کے اظہار کے بارے میں فرماتا ہے:

اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (زخرف: ۵۱)

"کیا مصر پر میری حکومت نہیں اور یہ چشمے کیا میرے محل کے نیچے جاری نہیں ہیں۔"

د) کسی معاشرہ پر حکومت کرنے کی قابلیت کے لیے اہم ترین شرائط وسعت علم و دانش اور قوت جسمانی کا ہونا ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں صحت و قوت جسمانی کا ہونا ایک بنیادی شرط تھا جبکہ حکمرانوں کے لیے ضروری ہے تھا کہ وہ فوج کے ہمراہ نقل و حرکت کریں اور فوجی فرائض میں بذاتِ خود سعی و حرکت کریں۔

ھ) آخر کار قرآن مجید پھر ان نعمتوں کے ذکر کی طرف پلٹتا ہے جو بنی اسرائیل کی وسعت کے ساتھ عطا فرمائی گئی تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا

(مائدہ: ۲۰)

''ان نعمات کو یاد کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمھیں عطا فرمائی ہیں، جبکہ اس نے تمہارے درمیان سے انبیاء قرار دیئے اور تم میں سے روئے زمین کے بادشاہ مقرر فرمائے۔''

اس آیہ مبارکہ میں ملوک انبیاء کے بالمقابل قرار پائے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں ابنیاء کے علاوہ ایسے برسر اقتدار بادشاہ بھی ہوئے جنھوں نے اقتدار حکومت اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل کیا تھا۔ نیز یہ جو فرماتا ہے کہ تمھیں بادشاہ بنایا جبکہ ان میں سے بعض بادشاہ ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی قبیلہ کا کوئی فرد کسی عظیم مقام کے لیے منتخب ہو جائے تو اس بلند مقام کی پورے قبیلہ کی جانب نسبت دی جاتی ہے اور اس ایک شخص کی عظمت پورے قبیلہ کی عظمت سمجھی جاتی ہے۔

خلاصہ بحث

ان آیات پر غور کرنے سے جو بنی اسرائیل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو سب کے سب ذریت ابراہیم شمار ہوتے ہیں، ایک بات بڑی وضاحت سے ثابت ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کے بعد افتخار امامت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یہ عطیہ الٰہی ان کی اولاد میں بھی جاری رہے۔ خداوند عالم نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور واضح فرما دیا کہ ذریت ابراہیم علیہ السلام سے ظالمین اس مقام بلند تک رسائی نہ پائیں گے۔ یہ تو معاملہ کی ایک صورت ہوئی۔

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ذریت ابراہیم میں سے بعض حضرات مثلاً حضرت یوسف، داؤد اور سلیما علیہم السلام نبوت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکومت و اقتدار اور معاشرہ کی رہنمائی کے لیے بھی منتخب ہوئے۔ یہ بھی مسئلہ کی ایک صورت ہے۔

ان دونوں صورتوں پر غور کرنے سے کیا یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ امامت و پیشوائی سے حکومت و اقتدار مراد ہے جو خداوند تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمایا اور یہ حضرات مقام نبوت پر فائز ہونے کے علاوہ منزل امامت کے حامل بھی تھے جس سے انہوں نے معاشرہ کی بطریق احسن قیادت فرمائی اور اس راہ میں سعی و کوشش کی؟

اگر ہم امامت کے معنی کو انہی مطالب میں منحصر قرار نہ دیں تو یہ بات مسلم ہوگی کہ معاشرہ کے ہر پہلو کی قیادت و سرپرستی اللہ تعالیٰ کے احکام کی سرپرستی اور امامت کے دینی و دنیوی امور کی تنظیم امامت کے مفہوم کے ارکان میں سے ایک ہے۔ ان مطالب کی تکمیل کے لیے چند ایک سوالات کا جواب دینا ضروری ہوگا۔

۱: کیا قیادت وسرداری بحکم خدا تھی؟

اس سوال کا جواب مثبت ہے۔ سابقہ آیات مبارکہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف) وہ آیات جو واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ اس جماعت کی امامت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر و منصوب و متشرع تھی۔ مثلاً:

(i) اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (بقرہ:۱۲۴)

(ii) اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ:۲۴۷)

(iii) وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (مائدہ:۲۰)

یہ تینوں آیات واضح طور پر اس بات کی دلیل پیش کرتی ہیں کہ اس جماعت کی سرداری بحکم خداوند تعالیٰ تھی اور تشریع الٰہی نے تحقیق خارجی بھی قبول فرمایا۔

ب) وہ آیات مبارکہ جو خارجی طور پر ان کی سرداری کی خبر دیتی ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

(i) اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ﴿۵۴﴾ (نسا:۵۴)

(ii) وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ:۲۵۱)

(iii) رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ (یوسف:۱۰۱)

یہ درست ہے کہ یہ آیات اس جماعت کی حکومت کے وجودِ خارجی کی خبر دیتی ہیں لیکن آیات کی پہلی قسم کے قرینہ سے یہ کہنا ہوگا کہ یہ امر تکوینی پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر تھا۔ لہٰذا متعلقہ حضرات اس مقام حکمرانی پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے منصوب ہیں۔

۲: کیا ہر پیغمبر امام ہے یا ہر امام پیغمبر ہے؟

سوال یہ ہے کہ کیا ہر وہ شخص جو منزل نبوت پر فائز ہوا حتمی طور پر اس کو امام بھی ہونا چاہیے، یا اس کے برعکس جس کسی کو بھی منصب امامت عطا ہوا، اس کو لازمی و حتمی طور پر نبی بھی ہونا چاہیے؟

ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور سابقہ ذکر کردہ آیات جواب کی منفی کی علت کو واضح کرتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مدت مدید سے نبی تھے لیکن منصب امامت پر ہرگز فائز نہ تھے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء کرام ہیں جو کبھی مقام امامت تک نہ پہنچ سکے۔ دوسری طرف حضرت طالوت کے ہمعصر نبی پیغمبر تو تھے جبکہ وہ خود امام نہ تھے۔ امامت طالوت کو عطا ہوئی تھی یعنی طالوت امام تھے لیکن نبی نہ تھے۔

اس کیفیت پر غور کرنے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام و نبی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں ہوتے۔ یعنی اصطلاحی طور پر ضروری نہیں کہ ہر نبی امام ہو اور ہر امام نبی ہو۔ تاہم بعض اوقات ایک ہی شخص دونوں مناصب کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً حضرات ابراہیم، یوسف، داؤد، سلیمان علیہم السلام۔

کبھی کبھی اس بات کے لیے کہ ہر نبی امام نہیں ہوتا، آیہ مبارکہ **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا** (سجدہ: ۲۴) سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔لیکن یہ استدلال کافی نہیں۔ہم اس بارے میں اپنا نظریہ ہدیہ قارئین کر چکے ہیں جس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

۳: کیا امامت کے ساتھ نبوت کا ہونا ضروری ہے؟

یہ سوال پہلے سوال سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

سوال اول کا نقطہ محوری یہ ہے کہ نبوت و امامت کے درمیان وجود امام کس حد تک لازم و ضروری ہے اور اصطلاح کے مطابق اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ یہ دونوں مناصب یعنی نبوت و امامت کس حد تک ایک دوسرے سے منسلک رہ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرے سوال کا محور امام کے دائرہ فعالیت کا تعین ہے۔کیا امام کو دائرہ نبوت سے باہر بھی تلاش کیا جا سکتا ہے؟ یا کیا ایسا ہونا لازم ہے کہ امام کے دائرہ اختیار و فعالیت کے اندر ہی نبوت واقع ہو، جس سے امام اپنے لیے مکمل اور اصول کے مطابق احکام حاصل کرے اور پھر ان کے مطابق عمل پیرا ہو۔

اس کو ہم اس طرح واضح کریں گے کہ حکومت و سرداری بذات خود کوئی ہدف و مقصد نہیں ہیں۔ بلکہ حکومت و سرداری قوانین باری تعالیٰ کی اساس پر امورِ امت کی تنظیم کا وسیلہ ہیں۔اس سلسلہ میں حصول مقصد کے لیے امام ہی وہ شخصیت ہوتی ہے جو ولایت الٰہی کے زیر سایہ معاشرہ و امت کی سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، انتظامی اور تربیتی اقدار کو خداوند تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ اصولوں کی بنیاد پر منظم کرتا ہے۔اس طرح امام دونوں جہانوں میں امت کے لیے سعادت و خوش نصیبی کو مکمل کرتا ہے۔یہ سب فرائض اور ان کی انجام دہی میں سعی و کاوش، مذکورہ فوائد کے حصول کے لیے، اللہ تعالیٰ کے منشور سے آگاہی کے بغیر ممکن نہیں۔اس نظریہ کے اعتبار سے لازم آتا ہے کہ امامت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قوانین اور مقررات کا عکس دکھانے والا آئینہ ہونا چاہیے جس کا نام نبوت ہے تا کہ وہ امام کے تمام اعمال کا مآخذ و معیار قرار پائے۔اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ یا تو امام خود حضرات ابراہیم و داؤد و سلیمان علیہم السلام کی طرح نبی یا رسول ہو، یا پھر امام کے ہمراہ کوئی نبی یا پیغمبر ہو جس طرح طالوت اپنے زمانہ کے نبی کے ساتھ تھے۔

ہم آئندہ مباحث میں بتائیں گے کہ ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود نبی بھی تھے اور امام بھی لیکن حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام صرف امام تھے اور حضرت رسول خدا کے ہمراہ رہتے تھے۔جملہ اصول و مقررات اسلام جو آنحضرتؐ کی وساطت سے نازل ہوتے تھے، وہ امیر المومنین علیہ السلام کے افعال و اعمال کے لیے ماخذ و معیار قرار پاتے تھے۔

امامت کے لیے ضرورتِ امتحان

نبوت اخذ وحی کو کہتے ہیں اور رسالت اس کی تبلیغ کو۔اس کے علاوہ امامت و حکمرانی او معاشرہ کی تمام حدود کی سرپرستی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصول و تعالیم کی بناء پر قائم ہوتی ہے۔اس میں کوئی شک نہی کہ ان مقامات میں ہر ایک لیاقت و شائستگی کے ایک معیار کا مرہونِ منت

ہے اور عطاء الٰہی ہمیشہ معیارِ صلاحیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر نبوت ورسالت کے حصول کے لیے بعض شرائط کی موجودگی لازمی ہے تو امامت کے حصول کے لیے شرائط شدید تر ہوں گی۔ اس نظریہ واصول کا فلسفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ انسان موقع اول یعنی نبوت و رسالت میں اللہ تعالیٰ کے احکام واصول کے وصول کرنے اور انھیں لوگوں کے سامنے بیان کرنے کا ذمہ دار ہے، جبکہ دوسری منزل یعنی عہدۂ امامت پر فائز ہونے پر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو عملی تحقیق بخشنے کا ذمہ دار ہوتا ہے تا کہ وہ انسانی معاشرہ کی صحیح قیادت ورہبری کے ذریعہ رہنمائی کرے اور معاشرہ اس کی مدد سے دونوں جہانوں کی سعادت حاصل کرے۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ لیجیے کہ انبیاء ورسل کا دائرہ کار، اس اعتبار سے کہ وہ رسالت ونبوت کے حامل ہوتے ہیں، صرف احکام کے بیان کرنے اور تعارف کروانے پر مشتمل ہے، لیکن جب وہ مقام امامت پر منصوب ہوتے ہیں تو پھر اہم تر ذمہ داری ان پر آجاتی ہے۔ یہ ذمہ داری جاہل انسانوں کی تربیت اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں احتیاجہائے انسانی کی تکمیل سے متعلق ہوتی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا صبر وبردباری، استقامت وشکیبائی کے بغیر ممکن نہیں، نہ ہی یہ ممکن ہے کہ خلت الٰہی اور اللہ کے راستہ میں چلنے کے بغیر اس ذمہ داری کو پورا کرنا ممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائشی داستانوں کے ایک سلسلہ کے بعد، جن میں انھوں نے خدا کی راہ میں اپنی استقامت، خودداری، خلت اور شکیبائی کا ثبوت پیش کیا، اس مقام بلند پر فائز ہوئے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امامت سے متعلق فرائض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا عشق خدا اور رضائے الٰہی میں فنا کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ امامت کا ہمیشہ دم گھٹنے والی مشکلات، مصائب گونا گوں، رجحانات ومیلانات کے خلاف جنگ اور جلنے اور پھر آثارِ حیات پیدا کرنے جیسی منازل سے سابقہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرتبہ امامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی عمر کے آخری مراحل میں عطا ہوا۔

اس بیان اور تفصیلی گفتگو سے 'المنار' کی لفظ ''فاتمھن'' کے بارے میں بحث کی ناپختگی واضح ہوجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے کلمات کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمانے کے بعد فرمایا: قال انی جاعلك للناس اماماً۔ چونکہ یہ جملہ بغیر 'فائ'' تفریع کے لایا گیا ہے اور اس میں فقال نہیں کہا گیا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مقام امامت کا عطا ہونا سابق کے کسی امتحان سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا، بلکہ یہ عنایت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم ہی سے صورت پذیر ہوئی۔ [1]

شیخ عبدہ کے قلم سے اس قسم کی تفسیر معارف الٰہی کے سلسلہ میں ایک طرح کے پہلے سے کیے ہوئے فیصلہ کی معلول کہی جا سکتی ہے۔ اس آیت کو اگر آپ کسی عربی دان کے حوالے کر دیں تو وہ بڑی وضاحت اور بے تکلفی کے ساتھ کہے گا کہ انعام سے قبل امتحان اور اس امتحان میں بطریق احسن کامیابی (فاتمھن) اس بات کا سبب بنی کہ خلاق عالم نے انھیں ایسا مقام وحیثیت مرحمت فرمائی اور حضرت ابراہیم کی یہ قابلیت ان کے اس مقام ارفع پر فائز ہونے کا سبب بنی۔

---

[1] المنار، ج ا، ص ۴۵۵

عبدہٗ کی اس قسم کی تفسیر کا باعث یہ ہے کہ اس نے اپنی تفسیر میں امامت سے نبوت مراد لی ہے اور پھر نبوت بھی کوئی اکتسابی کیفیت نہیں رکھتی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اولاً امامت نبوت سے الگ ایک چیز ہے اور ثانیاً یہ درست ہے کہ نبوت اکتسابی نہیں ہوتی۔ جب تک کسی شخص میں صلاحیتوں اور کمالات کا ایک سلسلۂ مخصوص نہ پایا جاتا ہو وہ ہرگز منصب نبوت تک نہیں پہنچ سکتا اور وہ کمالات وصلاحیات جو فیض نبوت کا محور بنتی ہیں، صرف اس صورت میں انسان میں پیدا ہوتی ہیں جب وہ حوادث کی بھٹیوں اور بلاؤں کے گرداب میں مستقل رہے، حتیٰ کہ استقلال صلابت اس شخص میں ایک ذاتی ملکہ کی صورت اختیار کر لے۔

آخری سوال

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ امامت اپنے ان معانی، یعنی ہر طرح سے معاشرہ وامت کے جملہ امور کی تنظیم، کے طور پر حضرت ابراہیم کی حیات مقدسہ میں تحقیق پذیر نہیں ہوتی کیونکہ وہ حضرت ہرگز تشکیل حکومت کے موقع اور عملی طور پر منزل حکمرانی تک نہ پہنچ سکے۔

جواب

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ ہمیں حاصل نہیں ہوتے اور نہ ہی کتب تاریخ اس سلسلہ میں قابل اعتماد ہیں، اس لیے اس سوال کا جواب معیارِ تحقیق پر دینا ممکن نہیں۔ جو کچھ اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے وہ اسی قدر ہے کہ امامت کے امت کی پیشوائی اور امورِ امت کی تنظیم کے اعتبار سے، بہت وسیع معانی ہیں جن کی تفصیل ہر زمانہ میں ضروریات امت کے تناسب سے متحقق ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ حیات میں انسانی معاشرہ کی تنظیم سادگی اور عامیانہ معیار کی متقاضی تھی۔ لہٰذا ان حضرت کی امامت فطری طور پر ایک بسیط لیکن کم رنگ کیفیت میں متحقق ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہی حقیقت واحد یعنی دوسرے انبیاء کی امامت بہتر نتائج کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی۔

ہم اس حقیقت کو خود اپنی زندگی میں حکومتوں، سیاستوں، تدابیر وتنظیم امور کے سلسلہ میں وضاحت کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں۔ آج سے سو سال پہلے امورِ مملکت کی تدابیر اور تنظیم موجودہ دور کے حجم مسائل اور ان کے تنوع کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ ممکن ہے امامت حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت سے اسی اعتبار و معیار میں تفاوت رکھتی ہو۔

امامت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام رسالت ونبوت کے علاوہ، جس کا منصب معارف واصول واحکام وفروع کو بیان کرنا ہے، ایک بلندترین وارفع مقام کے حامل بھی تھے جس کو امامت کہتے ہیں۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اماماً للناس تھے، آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی اس مقام اعلیٰ پر فائز تھے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے مقام نبوت کے اعتبار سے ان مسائل کو واضح اور بیان کرتے ہیں جن کو وہ مرکز وحی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حضرات کوئی مقام اطاعت نہیں رکھتے، نہ ہی کوئی حکم جاری کرتے ہیں اور نہ ہی معاشرہ کی سرپرستی انکے ذمہ ہے۔ لیکن اس اعتبار سے کہ ان دونوں مناصب کے علاوہ ایک پیشوا، ومقتداء کا مقام ہے، جو ''مفترض الطاعۃ'' ہوتا ہے۔ اس کے تمام احکام کو رہنمائی اور سرپرستی کے اصول کے تحت اختیار کرنا چاہیے اور اس کے ترسیم کردہ خطوط سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ اس بارے میں، اطاعت طریقی سے قطع نظر (اطاعت پیغمبر درحقیقت اطاعت خدا ہے) آنحضرتؐ مستقل وموضوعی اطاعت کے سزاوار بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ مقام عطا کر کے آنحضرتؐ کو امر ونہی کا حق بھی مرحمت فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں آیات قرآن موجود ہیں جو آنحضرتؐ کے مقام وحیثیت امامت کو بیان کرتی ہیں۔ یہ آیات اس طرح ہیں:

پیغمبر اسلام کی اولویت مطلقہ

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ (احزاب: ٦)

''پیغمبر صاحبانِ ایمان کے نفوس پر خود ان سے اولیٰ ہے۔''

اس آیہ مبارکہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبانِ ایمان پر اولویت بصورتِ جامع بیان ہو رہی ہے۔ بتلایا جا رہا ہے کہ ان تمام اختیارات میں جو انسان اپنی ذات پر رکھتا ہے، پیغمبر خود اس سے ان میں بلند تر اور زیادہ اختیارات کے مالک ہیں۔ اگر انفرادی یا اجتماعی طور پر انسان کو خود اپنے لیے کچھ اختیارات حاصل ہیں تو نبی اکرمؐ ان اختیارات میں اس سے بلند تر وبہتر صاحب اختیار ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ انفرادی واجتماعی مسائل میں یا مسائل حکومت وقضاوت میں نبی ہر انسان ورکن معاشرہ سے خود اس کی اپنی نسبت زیادہ بااختیار ہے، یعنی نبی کی خواہش کسی فرد معاشرہ کے ارادہ وخواہش پر مقدم ہوتی ہے۔ یہ برتری اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہوتی ہے جو اس نے اپنے نبی کو عنایت کی ہوتی ہے۔ اس برتری سے کوئی شخص اس فرد سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتا جو اجتماعی سعادت کی راہ پر گامزن ہو۔ دوسری طرف نبی اس برتری اور عظیم بزرگی کو اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔

پس یہ آیہ مبارکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت کے دلائل میں سے ایک ہے، جس کے معنی امت کو منظم کرنے اور اجتماعی امور کے لیے تدابیر وضع کرنا ہیں۔ اس برتری کا عملی پہلو ان امور کے مفاد میں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ اس میں آنحضرتؐ کا کوئی ذاتی وشخصی فائدہ ہو۔ اس سے طبیعی طور پر اجتماعی سعادت مقصود ہے اور اس مقام کا حامل اور اس کو بروئے کار لانے والا اسلام کے حاکم علی الاطلاق کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اوامر و نواہی پیغمبر واجب ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر: ۷)

''جس بات کا پیغمبر حکم کریں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں، اس سے رک جاؤ۔''[1]

یہ صحیح ہے کہ ''اتا'' کے معنی عطا کرنا اور دینا ہیں، جیسا کہ آیہ مبارکہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (بقرہ: ۱۷۷) کے بھی یہی معنی ہیں (مال کو دوست رکھنے کے باوجود دے دیتا ہے۔)

لیکن آیہ مبارکہ میں جملہ ''ومانھکم عنه'' اس بات پر گواہ ہے کہ اس جملہ سے عطا کرنا یا دینا مراد نہیں بلکہ اس سے مراد امر و فرمان ہے۔ اگر اس سے عطا کرنا یا دینا مراد ہوتا تو ضروری تھا کہ ومانھکم کے بجائے ''وما منعکم عنه'' ارشاد ہوتا یعنی جس سے وہ تمھیں محروم رکھے۔ مختصر یہ کہ آیہ مبارکہ پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 'اتکم' سے کوئی چیز دینا مراد نہیں بلکہ حکم و فرمان دینا مقصود ہے۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ آیہ مبارکہ کا تعلق تقسیم غنائم سے ہے اور خداوند عالم اس آیت کے ذریعہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تقسیم پر راضی رہیں، یعنی جو کچھ وہ دیں اس کو لے لیں اور جو کچھ وہ نہ دیں اس سے دور رہیں۔

اس قسم کا احتمال بعید از حقیقت ہے کیونکہ اس تمام سورہ میں غنائم کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی کہ یہ کہا جائے کہ آیہ مبارکہ کا اطلاق تقسیم غنائم پر ہے، جس میں مسلمانوں سے یہ مقصود ہو کہ وہ آنحضرتؐ کی تقسیم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اس کے برعکس مذکورہ آیات میں موضوع بحث ''فی'' و ''انفال'' ہے، جن کا اختیار خدا اور اس کے رسولؐ کو حاصل ہے۔ انفال ہرگز ہرگز غنیمت کی طرح نہیں جس میں خمس الگ کر دینے کے بعد صرف مسلمانوں کا مال باقی رہ جاتا ہے اور رسول کریمؐ اس کی عادلانہ تقسیم کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جیسا کہ سابق میں کہا گیا 'فی و انفال خدا اور اس کے رسولؐ کی ملکیت ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ (انفال: ۱)

سورۂ حشر کی آیات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم اس سورۂ مبارکہ کے آغاز سے ساتویں آیت تک (وما اتکم) چار مطالب کو ''ما'' موصولہ کی شکل میں بیان فرما رہا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

الف: مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ (حشر: ۵)

''جو کچھ کھجور کے درختوں سے تم نے کاٹا۔''

---

[1] اس عنوان میں اتکم کے معنی واضح ہو جائیں گے۔

ب: وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ (حشر: ۶)

''اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ تک بغیر (تمہاری) مشقت کے پہنچایا ہے۔''

ج: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى (حشر: ۷)

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بستیوں کے لوگوں سے زحمت کے بغیر پہنچایا ہے۔''

د: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر: ۷)

''جو کچھ رسولؐ تمہیں عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں اس سے رک جاؤ۔''

واضح ہے کہ جملہ چہارم جملہ اول کی طرح مستقل معانی کا حامل ہے اور غنائم کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ آیہ مبارکہ میں اس بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ پھر جو کچھ دوسری اور تیسری آیات میں آیا ہے اس کا تعلق مسئلہ فی سے ہے جس کا عام مسلمانوں یا فوجیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا مکمل اختیار ذاتِ رسولؐ کے ساتھ ہے۔ اس طرح خداوند عالم تین مواقع کا ذکر کرنے کے بعد یاددہانی کرواتا ہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ احکام رسولؐ کی مکمل پابندی کریں اور ان کے اوامر ونواہی کا پورا پورا احترام کریں۔ اسی قسم کے تاکیدی احکام اس شخص کے بارے میں متعین ہیں جو منزل ولایت وحکومت پر فائز ہو کیونکہ وہ اس اہلیت سے جدا نہیں ہوتا۔

یہاں ایک سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر مراد صرف امر وفرمانِ دنیا ہی ہے تو پھر قرآن اس کے لیے لفظ 'اتا' کو کیوں استعمال کرتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر قرآن امر پیغمبر کو ایک قسم کی 'عطا' سے تعبیر کرتا اور اسے اتکم کے لفظ سے بیان کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ یہ اوامر واحکام بہترین چیزیں ہیں جو رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے اختیار میں چھوڑ رہے ہیں۔

اسلامی احادیث متذکرہ آیہ مبارکہ کو رسول اکرمؐ کی منزل حکمرانی سے متعلق جانتی ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق اس بارے میں فرماتے ہیں:

ثم فوض اليه امر الدين والامة ليسوس عباده فقال عزوجل ما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا، و ان رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلم) كان مسددا موفقا مويدا بروح القدس لايزل ولا يخطى فى شىء مما يسوس به الخلق۔[1]

[1] کافی ج۱، کتاب الحجۃ، باب التفویض الی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ)، ص ۲۶۶، حدیث ۴، مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ

''اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ آپؐ کے سپرد کی تا کہ آپ بندوں کی تدابیر امور اپنے ذمہ لیں اور ان کی تربیت و اصلاح کریں۔ پیغمبر اکرم وح القدس کی جانب سے ایک مستقیم، موفق اور موید انسان ہیں جو لغزش نہیں کرتے اور لوگوں کی جن باتوں میں تربیت کرتے ہیں، ان میں غلطی نہیں کرتے۔''

اطاعت پیغمبرؐ کا وجوب

قرآن مجید میں بیس سے زیادہ مواقع پر اطاعت پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ اطاعت رسول سے کیا مراد ہے؟

اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ آنحضرتؐ معارف و اصول کی وضاحت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بیان کرنے والے ہیں تو پھر ان کی حیثیت ایک واسطہ اور رابطہ سے زیادہ نہیں بنتی۔ ان کے پاس کسی امر و نہی کے وجود کی گنجائش نہیں ہو سکتی جس کے لیے اللہ تعالیٰ حکم دے اور اس کی اطاعت ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیات خاص قسم کی وسعت اپنے دامن میں رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسولؐ کو بھی مستقل فرض قرار دیتی ہیں۔ اس طرح یہ ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ اگر رسولؐ کی ذمہ داری صرف بشارت و نذارت (خوشخبری دینا اور ڈرانا) میں ہی منحصر قرار پائے تو پھر وہ صرف خداوند تعالیٰ کے فرامین کے بیان کرنے والے ہی سمجھے جائیں گے۔ اس صورت میں ایک اطاعت سے زیادہ کوئی چیز سامنے نہیں آتی اور وہ اطاعت پروردگار کے علاوہ کوئی چیز نہ ہوگی، درآنحالیکہ قرآن مجید میں خداوند عالم اپنی اطاعت کے علاوہ، اپنے اذن و فرمان کے ذریعہ، آنحضرتؐ کی اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ قرآن اطاعت رسول اکرمؐ کو لازمی قرار دیتے ہوئے بیس سے زیادہ مواقع پر تصریح کرتا ہے اور ہم ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

۱: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (نساء: ۶۹)

''جو شخص اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے وہ ان لوگوں کے ہمراہ ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے نعمات سے نوازا ہے۔''

۲: قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ (آل عمران: ۳۲)

''کہہ دیجئے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔''

۳: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء: ۵۹)

''اطاعت کرو اللہ کی، رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں صاحبانِ امر ہیں۔''

۴: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰ (نساء: ۸۰)

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور اگر کوئی روگردانی کرے تو ہم نے آپؐ کو ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا۔''

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

''فقرن طاعته بطاعته و معصيته بمعصيته وكان ذالك دليلا على ما فوض اليه و شاهدا على من اتبعه و عصاه وبين ذالك فی غير موضع من الكتاب العظيم''۔[1]

''(اللہ تعالیٰ نے) ان (رسول اللہؐ) کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور ان کی مخالف کو اپنی مخالفت شمار فرمایا ہے۔ یہ بات اس چیز پر گواہ ہے جو پیغمبر اکرمؐ کو عطا ہوئی۔ یہ ان لوگوں پر شاہد ہے جو اس کی پیروی کرتے ہیں یا مخالفت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کو اپنی عظیم کتاب میں کئی مواقع پر بیان فرمایا ہے۔''

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ان تمام آیات میں غور کرنے کے بعد، جن کا ایک مختصر حصہ ہم نے یہاں نقل کیا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اطاعت پیغمبرؐ اسلام کا حکم اس غرض سے نہیں کہ آپ اطاعت باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رہبری و رہنمائی فرمائیں، بلکہ یہ حکم اس لیے ہے کہ آنحضرتؐ اس قسم کی اطاعت کے علاوہ امر و نہی اور اطاعت و عصیاں کے حامل بھی ہیں، اگرچہ یہ دونوں چیزیں اس منصب و مقام کے لحاظ سے ہیں جو خداوند عالم نے انھیں مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے برعکس حضرت رسول اکرمؐ اگر خود اطاعت مستقل کے حامل نہ ہوتے تو یہ سب عنایات اور ایک ہی جملہ ''اطیعوا الله و اطیعوا الرسول'' میں لفظ ''اطیعوا'' کا تکرار مناسب نہ تھا، بالخصوص جبکہ آیہ مبارکہ دو اطاعتوں کا حکم دینے کے بعد (خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت) اطاعت اولی الامر کی صراحت کر رہی ہے۔ یہ ان کی اطاعت پر تاکید ہے جو عالم اسلام کے تمام امور اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہیں کہ یہ اطاعت مولوی ہے اور قطعاً اطاعت ارشادی کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت صورت پذیر نہیں ہوتی۔

ائمہ معصومین کی اصطلاح میں

امامت کا مقام

احادیث و روایات جو ائمہ معصومین علیہم السلام کی زبان ہائے مبارک سے وارد ہوئی ہیں ان معنی کی گواہ ہیں جن کی شرح کی ہم نے کوشش کی ہے۔

---

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۴۳۱

امام ہشتم حضرت علی بن موسیٰ رضا امامت کی اس طرح تعریف فرماتے ہیں:

"ان الامامة زمام الدين و نظام المسلمين و صلاح الدنيا و عز المومنين"۔ [۱]

''امام ادارۂ امورِ دین کا مرکز، معاشرۂ اسلامی کے نظم وضبط کا محور، دنیا کے لیے صلاح و درستی اور مومنین کے لیے عزت ہوتا ہے۔''

"الامام يحلل حلال الله و يحرم حرامه و يقيم حدود الله و يذب عن دين الله و يدعوا الى سبيل الله بالحكمة والموعظة الحسنة والحجة البالغة... عالم بالسياسة مستحق للرئاسة"۔ [۲]

''امام حلال خدا کو حلال اور حرام خدا کو حرام قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے قوانین کو جاری کرتا ہے، اللہ کے دین کا دفاع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف آنے کے لیے دلیل و برہان، نیک نصائح اور حجتہائے نافذہ کے ذریعے دعوت دیتا ہے...... پھر وہ سیاست عالم سے واقف اور اس قابل ہوتا ہے کہ انسانوں کی سرپرستی کرے۔''

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"اتقوا الحكمة فان الحكومة انما هى للامام العالم بالقضآء العادل فى المسلمين"۔ [۳]

''حکمرانی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ ایسے امام سے تعلق رکھتی ہے جو اصول قضاوت سے آگاہ ہوتا ہے اور مسلمانوں کے مال میں عادلانہ فیصلہ کرتا ہے۔''

حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] کافی، ج ۱، کتاب الحجۃ، باب ''نادر جامع فضل الامام۔ ص ۲۰۰، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

[۲] تحف العقول۔ ص ۴۴۰ مطبوعہ انتشاراتِ جامعہ مدرسین۔ اس سلسلہ میں کافی کتاب الحجۃ، ص ۲۰۰ (تھوڑے اختلاف کے ساتھ) رجوع فرمائیں۔ مثلاً باب مایجب من حق الامام وغیرہ

[۳] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، کتاب القضاۃ ابواب صفات قاضی باب ۱، ص ۷، حدیث ۳

"والامامة نظاما للامة والطاعة تعظيما للامامة"

''امامت امورِ امت کے نظم ونسق کے لیے ہے اور پیروی امام مقام امامت کے احترام کے لیے ہے۔''

ھ) امامت عہد الٰہی کس طرح ہے؟

عربی زبان میں لفظ 'عہد' کسی چیز سے حفاظت اور نگہبانی کے معنی میں آتا ہے۔ یہ لفظ اسی نسبت سے وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی اہم امر کی حفاظت لازم آتی ہو۔ مثلاً یہ لفظ ان فرمانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو والیان اور حکمرانوں کو بھیجے جاتے ہیں یا جب کسی سے عہد و پیمان باندھا جاتا ہے۔ عرب جب اپنے معاملات میں ایک دوسرے کو تحریری سند دیتے ہیں تو اس سند کو عھدہ کہتے ہیں کیونکہ ان کی شرائط کی حفاظت اور ان کے مطابق عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ [1]

قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کی دو قسمیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا عہد بندوں سے اور بندوں کا عہد خداوند عالم سے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ (بقرہ: ۴۰)

''میرے ساتھ عہد کو پورا کرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ عہد کو پورا کروں۔''

'عہد الٰہی' سے مراد وہ اہم ولازمی احکام ہیں جن کی حفاظت اور نگہبانی ایک خاص قسم کی اہمیت کی حامل ہے۔ مثلاً فرماتا ہے:

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ (یس: ۶۰)

''اے اولاد آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہیں کرو گے۔''

پھر ارشاد فرماتا ہے:

وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ (بقرہ: ۱۲۵)

''ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک کر دیں۔''

ظاہر ہے کہ زیر بحث آیت میں ''میرے عہد'' سے امامت و پیشوائی ہی مراد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی اور جب اس کے لیے حضرت ابراہیم نے درخواست کی کہ یہ امامت ان کی اولاد میں بھی جاری رکھی جائے تو جواب ملا تھا:

لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ (بقرہ: ۱۲۴)

''میرا یہ عہد ظالموں کے لیے نہیں ہے۔''

---

[1] مقاییس اللغۃ، ج ۱، ص ۱۶۸

پس ایک میثاق الٰہی ہے جو امام کے قبضہ واختیار میں ہوتا ہے۔لوگوں کو چاہیے کہ اس میثاق کے مالک کے احترام کی خاطر اس کی اطاعت وپیروی کو صمیم قلب سے اختیار کریں اور اس میں پوری سعی وکوشش کو عمل میں لائیں۔

امامت ایک تحفۂ آسمانی ہے جو امت کے نظام اور اس کی سعادت کی روش میں ترقی وپیش رفت کے لیے لازم وضروری ہے۔لہٰذا اس کیفیت کو ایسے افراد کے قبضہ واختیار میں ہونا چاہیے جو درحقیقت اس کے لائق ہوں اور جو اس عہدہ سے رضائے پروردگار کے سوا اور کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھائیں۔

(و): ظالم سے کیا مراد ہے؟

عربی زبان میں ہر تجاوز کرنے والے کو ظالم کہتے ہیں۔وہ شخص ظالم کہلاتا ہے جو قانونی یا شرعی حدود کو پھلانگ جائے۔ابن فارس کہتا ہے: ''ظلم کے معنی حد سے گزرنا اور کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے ہٹانا ہے۔گناہ کو اسی لیے ظلم کہا جاتا ہے کہ گناہ حقوق الٰہی کی حدود سے نکلنا اور ان خطوط وحدود سے انحراف کرنا ہے۔جن کو خدائے بزرگ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ بندوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ 'شرک' کو جو بغاوت وتجاوز حدود کا منبع ہے، ظلم عظیم کا نام دیا جاتا ہے۔حضرت لقمان اپنی نصائح میں فرماتے ہیں:

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳ (لقمان: ۱۳)

''اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک قرار نہ دے۔یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔''

جب حضرت ابراہیم نے درخواست کی کہ اس فیض الٰہی (امامت) کو ان کی اولاد میں بھی جاری رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے درخواست کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد، یہ گراں بہا وثیقہ، جس کی ہر لحاظ سے حفاظت ونگہبانی لازمی ہے، ظالموں حدود سے تجاوز اور قانون شکنی کرنے والوں کے لیے نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ امام وہ واجب الاطاعت شخص ہوتا ہے جس کے ہاتھوں میں عوام الناس کے امور کی باگ ڈور ہوتی ہے اور وہ ان پر حکمران ہوتا ہے۔ایسا شخص اگر گناہ سے مبرا نہ ہو اور اس کا نفس گناہ سے روکنے والی کیفیت کا حامل نہ ہو تو وہ فطرتاً خیانت وتجاوز کا مرتکب ہوگا، گناہ وخطا کا حکم دے گا اور ظالموں کا آلہ کار بن جائے گا۔ان حالات میں ایسے شخص کو کس طرح واجب الاطاعت اور اس کے حکم کو لازم الاجراء تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

بعض مناصب ومقامات ایسی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ فطری طور پر اپنے لیے خود ہی شرائط کار کا تعین کرتے ہیں۔یہاں زیر بحث منصب 'امامت' ہے۔یہ وہ منصب ہے جس کی طرف ارتقاء کا مقصد ناموس الٰہی اور حقوق عوام کا تحفظ کرنا ہے۔لہٰذا لازم ہے کہ اس قسم کے اہم منصب کا حامل، جس کو اس قدر اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہو، عادل وداد گستر ہو، اعمال ہوا وہوس سے پاک ومنزہ ہو، خودغرضی ونفسانی امراض سے دور ہو۔ان صفات کا مالک ہونے پر ہی وہ شخص واجب الاطاعت ہوگا اور اس کے احکام لازم الاجراء ہوں گے۔

ظلم مانع امامت ہے

یہ آیہ مبارکہ بڑی وضاحت کے ساتھ ہر قسم کے ظلم وتجاوز وغلط کاری وگناہ کو منزل امامت کے فیوض کے مانع قرار دیتی ہے، یہ تمام باتیں گناہ قلبی یعنی شرک کی صورت میں ہوں یا خارجی گناہ وعصیان کی شکل میں ہوں، گناہانِ صغیرہ ہوں یا کبیرہ ہوں۔ایسا انسان جو خدا ترسی سے نا آشنا ہو اور حدود سے تجاوز کرنے سے اپنے آپ کو نہ روکے، وہ ہرگز امامت وپیشوائی کرنے، اسوۂ ونمونہ بننے اور قیادت وحکمرانی کا اہل نہیں ہوتا۔

اس بات کا شاہد کہ آیہ مبارکہ 'ظلم' کے مفہوم کے بارے میں وسعت وعمومیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور ہر قسم کے گناہ و عصیاں اور ظلم وتجاوز پر حاوی ہے، لفظ ''الظالمین' ہے، جو جمع کی شکل میں الف اور لام کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہ استغراق کی صورت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ آیہ مبارکہ تمام ظلم کرنے والوں کا ذکر کر رہی ہے۔[1]

اس بنیادی اصول کے پیش نظر آیہ مبارکہ گویا علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ ظالم مطلق طور پر ہر صورت میں مقام امامت حاصل نہیں کر سکتا خواہ وہ اپنے کردار ظلم وتجاوز پر باقی ہو یا اسے چھوڑ کر توبہ کر چکا ہو۔اس کی پوری زندگی میں کسی قسم کا ارتکاب ظلم اس کے لیے اس مقام ومنزل تک پہنچنے میں مانع ہے۔ظلم سے توبہ کر لینا یا ارتکاب ظلم سے رک جانا، اس سلسلہ میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے کسی حصہ اور شعبہ میں ارتکاب ظلم کا اثر یہ ہے کہ ظلم کرنے والا اس لیاقت وقابلیت کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتا ہے جو منصب امامت کے لیے ضروری ہوتی ہے

دوسرے لفظوں میں ظالموں کی دو قسمیں ہیں:

۱: وہ لوگ جو اپنے ظلم وستم پر باقی رہتے ہیں۔

۲: وہ لوگ جو ظلم وتجاوز سے دست بردار ہو کر توبہ کر لیتے ہیں اور ندامت اختیار کرتے ہیں۔

آیہ مبارکہ ان دونوں اقسام کو منزل امامت سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے کیونکہ لفظ 'ظالمین' جمع کے صیغہ میں الف اور لام کے ساتھ وارد ہوا ہے۔لہٰذا یہ ہر قسم کے ظالم کو، استغراق کی شکل میں، اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔یعنی اس میں دونوں متذکرہ اقسام کے ظالم شامل ہیں اور دونوں منزل امامت تک ترقی نہیں کر سکتے۔ بالفاظ دیگر آیہ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ ''جو شخص زندگی بھر میں کبھی بھی ظالم گردانا گیا ہو، خواہ کچھ عرصہ کے لیے یا ہمیشہ کے لیے، کسی مقررہ مدت کے لیے، وہ ہمیشہ کے ل یے اس عظیم منصب کے قابل نہیں رہتا۔''

ایک سوال کا جواب

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ہر حکم کا دارومدار اس کے موضوع کی بقاء پر ہوتا ہے یعنی جب تک موضوع قائم ومتحقق رہتا ہے حکم بھی

---

[1] اصطلاح کے مطابق جمع محلی الف اور لام کے ساتھ (الظلمین) استغراق کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ظالم افراد میں استغراق انواع ظلم میں بھی استغراق کو ظاہر کرتا ہے۔دونوں استغراقوں کے درمیان علیحدگی صحیح نہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تمام علماء اگر محترم سمجھے جائیں تو ہر قسم کا علم بھی محترم شمار ہوگا۔

موجود رہتا ہے اور اگر موضوع ہی ختم ہو جائے تو حکم بھی خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَا تَرْكَنُوٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (هود: ۱۱۳)

''ظالموں پر تکیہ نہ کرو۔''

مزید فرماتا ہے:

مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ط (توبه: ۹۱)

''نیکوکاروں کے لیے راستہ نہیں ہے۔''

اس سے مراد یہ ہوگا کہ جب تک کوئی شخص ظالم ہے یا نیکوکار، اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں احکام ان پر عائد رہیں گے۔ لیکن جب یہ موضوع ہی ختم ہو جائیں یعنی ظالم ظلم چھوڑ کر عادل بن جائے یا نیکوکار بدکار ہو جائے تو پھر اول الذکر پر تکیہ کرنا یا موخر الذکر پر دباؤ ڈالنا کسی قسم کے اشکال کا باعث نہ ہوگا۔

زیر بحث آیت میں بھی معاملہ یہی ہے یعنی جب تک کوئی شخص ظالم ہے وہ امامت سے دور رہے گا لیکن جب وہ توبہ کرے اور عادلوں کے زمرہ میں آجائے تو پھر متذکرہ ''لا ینال' کا حکم اس پر عائد نہ ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ 'جصاص' کی کتاب 'احکام القرآن' کی طرف رجوع فرمائیں۔ وہ اپنی اس کتاب کی جلد ا ص ۸۸ پر لکھتا ہے کہ خلفاء کی امامت اس آیت مبارکہ سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ یہ درست ہے کہ خلفاء زمانہ جاہلیت میں مشرک تھے اور ایک معنی میں ''ظالم'' تھے۔ لہٰذا وہ اس زمانہ میں لا ینال عهدی الظلمین کے حکم میں شامل تھے، لیکن مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد جب ان کا موضوع کفر ہی باقی نہیں رہا اور ان کا شرک توحید میں بدل گیا تو پھر لازم ہو گیا کہ اب یہ آیہ مبارکہ ان کے امام ہونے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

ہم جناب 'حصاص' کے پورے احترام کو سامنے رکھتے ہیں جنھوں نے ایک قیمتی کتاب ''احکام القرآن'' تالیف فرمائی ہے جس میں انہوں نے کئی ایک آیات قرآن مجید کی شرح و تفسیر فرمائی ہے اور بعد کے مولفین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے لیکن ہم عرض کریں گے کہ وہ دو مثالیں پیش کر کے مکمل طور پر مغالطہ کا شکار ہوئے ہیں۔ انہوں نے ظاہر ہے، کسی کلیہ وضابطہ کو پیش کرنے کے بجائے مثال کا سہارا لیا ہے اور اس مثال کو قانون سمجھ لیا ہے۔ ہم اس بارے میں پہلے قاعدۂ کلیہ بیان کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق آیہ مبارکہ کی اس کلیہ پر تطبیق پیش کریں گے۔

موضوعات احکام کی دو قسمیں

ا: احکام کی اقسام میں پہلی قسم ان احکام کی ہے جن کا دارومدار موضوع کی حالت اور صفت پر ہوتا ہے۔ حکم اس حالت کے واقع ہونے سے واقع ہوتا ہے اور اس حالت کے ختم ہونے پر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ بیان کردہ دو مثالوں کی طرح ہم بھی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً حکم ہوتا ہے:

(۱) ال خمر حرام ''شراب حرام ہے۔''

(۲) فی الغنم السائمۃ زکاۃ ''جنگل میں چرنے والی بکریوں پر زکوۃ ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شراب اگر سرکہ میں بدل جائے اور جنگل میں چرنے والا جانور مالک کے ملک سے کھانے لگے تو شراب پاک ہوجائے گی اور وہ جانور زکات کی کٹوتی سے آزاد ہوجائیں گے۔

۲: دوسری قسم ان احکام کی ہے جن کا دار و مدار موضوع کی حالت اور وصف کے حدوث پر ہے۔ یعنی موضوع میں ایک حالت کا واقع ہونا، خواہ ایک لمحہ کے لیے ہو یا ایک زمانہ تک باقی رہے۔ اس حکم کی زندگی بھر تک بقاء کا سبب رہتا ہے، اگرچہ وہ حالت مستقل طور پر موضوع میں باقی نہ رہے۔ اس سلسلہ میں سرقہ و زنا جیسے جرائم کی سزا کے اثرات مکلف میں دائمی طور پر رہتے ہیں جبکہ ان سے متعلق احکام کی بقاء کا دارومدار حالت جرم سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

اگر حاکم شرع کے روبرو کسی شخص کے خلاف چوری یا زنا کا جرم ثابت ہوجائے تو اس پر ہاتھ کاٹنے یا کوڑے لگانے کی حد لازمی طور پر جاری ہوگی، اگرچہ وہ توبہ بھی کرلے اور نیک ہوجائے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو حج کی استطاعت حاصل ہوجائے اور وہ بغیر کسی جواز کے فریضہ حج کو نظر انداز کردے، پھر اس کی استطاعت حج جاتی رہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ جس طرح ممکن ہو فریضہ حج بجالائے۔ اس مسئلہ میں حکم کا دارومدار طول زمانہ میں اس حالت استطاعت کے باقی رہنے پر نہیں بلکہ اس شخص پر ادائیگی فریضہ حج واجب رہے گی اگرچہ شرط وجوب ایک لمحہ کے لیے ہی کیوں نہ وارد ہوئی ہو۔ یہ وجوب ہر حالت میں برقرار رہے گا اگرچہ وہ حالت جن میں یہ فریضہ واجب ہوا تھا، باقی نہ بھی رہیں۔

اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو ایسے حالات کے لیے قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں:

۱: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا (مائدہ: ۳۸)

''اور چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔''

۲: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور: ۲)

''زانی عورت اور زانی مرد، ہر ایک کو ایک سو کوڑے مارو۔''

۳: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: ۹۷)

''ہر استطاعت رکھنے والے پر حج بیت اللہ واجب ہے۔''

۴: وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ (نساء: ۲۳)

''اور تمہاری بیویوں کی مائیں'' (تم پر حرام ہیں)

ایسے تمام مسائل میں کسی حالت کا پیدا ہو جانا، خواہ وہ ایک لمحہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو، حکم کے باقی رہنے کا موجب ہوتا ہے ہر چند کہ مستقبل میں وہ حالت بدل ہی چکی ہو۔ بلکہ آخری صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ وہ عورت جو کسی شخص کی بیوی کی ماں ہو، اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام قرار پائے گی اگر چہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق ہی کیوں نہ دے دی ہو۔

اس قسم کے مسائل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جصاص نے جس چیز کی ضابطہ کلیہ کے طور پر تلقین کی ہے وہ کوئی ضابطہ کلیہ نہیں بنتا۔

جاننا چاہیے کہ مسائل احکام کے سلسلہ میں دو صورتیں رکھتے ہیں:

۱: کبھی کسی مسئلہ میں حکم کا دارو مدار مسئلہ کے طول بقاء پر ہوتا ہے اور اصطلاح کے مطابق مسئلہ کے پیدا ہونے سے اس کے باقی رہنے تک حکم شرع موثر رہتا ہے۔

۲: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ کا وجود تھوڑی دیر بعد ختم ہو جاتا ہے اور طویل عرصہ تک مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس پر حکم شرع باقی رہتا ہے اگر چہ حالات کی تبدیلی و تغیر کے باعث مسئلہ ختم ہو چکا ہو۔ یعنی اصطلاح کے مطابق حالت مسئلہ حدوث کے اعتبار سے موثر تھی اور اس کا باقی رہنا ہرگز لازم نہ تھا۔

اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ آیہ زیر بحث یعنی 'لاینال عھدی الظلمین' مسائل کی ان دونوں قسموں میں سے کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر مسئلہ کی پہلی قسم کے مطابق دیکھا جائے تو یہ طے پائے گا کہ ظالم جب تک ظالم ہے امام و پیشوا ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن توبہ کر لینے اور راہِ راست اختیار کر لینے کے بعد اس کی امامت میں کسی قسم کا اشکال یا شبہ نہ ہوا۔ اس کے برعکس دوسری صورت میں کسی شخص کا عمر کے کسی حصہ میں بھی متصف بہ ظلم قرار پانا، اگر چہ مختصر ترین وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، وہ اس ظلم سے تائب و ظاہر بھی ہو چکا ہو، اس کے لوگوں کے امام اور پیشوا ہونے میں مانع ہوگا۔ اصطلاحی طور پر ظلم کی حالت کا حدوث ایسے شخص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کی امامت و پیشوائی کا نااہل قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں دو طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ آیت زیر بحث کا موضوع ان امور میں سے ہے کہ اگر وہ امر کسی شخص کی تمام عمر میں ایک بار ہی کیوں نہ واقع ہوا ہو، اس کے منزل امامت سے محروم ہو جانے کے لیے کافی ہے۔ یہ دونوں طریق ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) صاحبانِ وحی اور مبلغین آسمانی کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کی رہنمائی کے سایہ میں طریق سعادت اختیار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صاحبان وحی اور مبلغین آسمانی کے عرصہ حیات میں کوئی ایسا کمزور یا ضعیف پہلو نہیں پایا جاتا جو عوام الناس کے لیے نفرت کا باعث بنے اور نہ ہی کوئی ایسا موقعہ ممکن ہے جب ان کی صدق گفتاری معیارِ یقین پر پوری نہ اترتے ہوئے تسلیم نہ کی جائے۔ اس بات میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ لوگوں کے لیے کسی ایسے شخص کی پیروی کرنا بہت دشوار و گراں ہے جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ فساد و گناہ و غلط کاریوں اور نافرمانی میں ملوث رہ کر گزارا ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو ان کا پیشوا و رہنما کہلانے لگے۔

توبہ و ندامت اور راہ راست پر واپس آنا الگ بات ہے اور تبلیغ و دعوت دین کے راستہ میں انسان کی گزشتہ زندگی سے متعلق تاثیر واقعات ایک اور بات ہے۔

پہلے نظریہ کے مطابق کسی شخص کا اعمال زشت سے تائب ہو جانا زیبا اور قابل تعریف شمار ہوگا باوجود یکہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے سابقہ گناہوں کے اثرات لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہوں۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی مشیت حکیمانہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس منصب کے لیے ایسے افراد کو منتخب فرمائے جن کے صفحۂ زندگی پر کوئی داغ یا نقطۂ ضعیف نہ پایا جاتا ہو اور ایسے لوگوں کو اس منصب پر فائز ہونے سے قطعاً محروم رکھا جائے جو اپنی عمر کے کسی حصہ میں انحراف یا اعمال بد کے مرتکب ہوئے ہوں۔

(۲) دوسرا نظریہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواست پر غور کرنے کا اس جہت سے تقاضا کرتا ہے کہ مندرجہ ذیل صورتوں میں کون سی ایسا صورت ہوسکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی (لاینال عهدی) کا باعث بنتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو تصوراتی لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: وہ جماعت جس کے صفحہ زندگی پر کسی قسم کا کوئی داغ یا نقطۂ ضعیف نہ پایا جاتا ہے۔

۲: وہ جماعت جس کا دفتر حیات نصب امامت کے دن تک بالکل سیاہ ہو۔

۳: جو لوگ ابتدائے زندگی میں ظالم رہے ہوں لیکن نصب امامت کے دور میں توبہ کر کے گناہوں سے آلودگی سے پاک ہو چکے ہوں۔

۴: مندرجہ بالا حالت سوم کے برعکس ابتدائے عمر میں نیک و پاک رہے ہوں اور نصب امامت کے زمانہ میں ظالمین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائیں۔

ذہن بیدار اور عقل پائیدار کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جیسی شخصیت کا مالک انسان متذکرہ بالا صورتوں میں دوسری اور چوتھی نوعیت رکھنے والے اپنی ذریت کے افراد کے لیے امامت و پیشوائی کے بلند و ارفع مقام کا خواہش مند ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی بلند مقام شخصیت تو ایک طرف ایک عام آدمی بھی ایسے افراد کے لیے اتنے مقدس مقام کی درخواست نہیں کر سکتا۔

ان حالات میں فطرت و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوال پر متذکرہ بالا صورتوں میں پہلی اور تیسری صورت کو قابل غور سمجھا جائے۔ یہ بات بالکل واضح و روشن ہے کہ آیہ مبارکہ ظالم کے لیے منصب امامت کی قابلیت و شائستگی کی قطعی طور پر نفی کر رہی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو ابتدائے عمر میں ظالم و خطار کار رہے ہوں، اگرچہ نصب امامت کے زمانہ میں تائب و پرہیزگار ہو چکے ہوں، ہرگز اس مقام کے لیے اہل قرار نہیں دیئے جائیں گے۔ پس اس صورت کے نظر انداز ہو جانے کے بعد صرف ایک ہی ایسی کیفیت باقی رہ جاتی ہے جس کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواست کو مقام قابلیت حاصل ہو سکے اور وہ جماعت اول کی کیفیت ہے، یعنی وہ حضرات جن کی تمام زندگی میں خطا و انحراف کا کوئی داغ ان کے دامن پاک پر نہ لگا ہو۔

یہ دونوں دلائل اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ظلم کسی انسان سے اگرچہ ایک لمحہ، ایک آن، ایک دن یا دو دن ہی کے لیے کیوں نہ سرزد ہوا ہو مقام امامت تک ترقی پانے میں مانع ہے۔ یہ کیفیت ظلم اپنے وقوع کی حیثیت سے امامت سے محروم ہو جانے کے لیے کافی ہے، ضروری نہیں کہ یہ ظلم باقی رہے۔

دلیل عصمت امام بروئے آیہ مذکور

مباحث سابقہ، جو آیہ مبارکہ کے بارے میں پیش کی گئی ہیں، عصمت امام کے لزوم کو واضح کر رہی ہیں، جن کی تفصیل مختصراً اس طرح ہے:

الف: امام عوام الناس کے لیے پیشوا و نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ ایک غیر معصوم شخص کو کبھی بھی رہنما و نمونہ عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سمجھیں کہ امت پر لازم ہے کہ اپنے قول و عمل کو امام کے قول و عمل کے مطابق بنائیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص گناہ اور غلط کاری سے محفوظ نہ ہو کس طرح اس معنی میں رہنما اور نمونہ شمار ہو سکتا ہے۔

ب: امام وہ شخص ہوتا ہے جو 'مطاع' تسلیم کیا جائے، یعنی غیر مشروط طور پر بغیر کسی چون و چرا اس کی اطاعت واجب و لازم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی اطاعت غیر مشروط طور پر واجب ہو وہ سوائے معصوم ہستی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ج: آیہ مبارکہ پوری صراحت کے ساتھ اس منصب کے حصول کے لیے ظالمین کی نا قابلیت اور نا اہلیت کا اعلان فرما رہی ہے۔ ہم اپنی سابقہ بحث میں مکمل طور پر وضاحت کر چکے ہیں کہ منصب امامت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا صرف ایک جماعت کے لیے قبول ہوئی ہے۔ یہ جماعت ہے جن کے دامن پاک پر پورے عرصہ حیات میں کسی طرح کا کوئی دھبہ ہرگز نہیں لگ سکا، جبکہ دوسری جماعتوں سے تعلق رکھنے والے حضرات نصب امامت کے وقت، خواہ طاہر و تائب ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں شامل ہوں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امامت کی نفی صادر ہو چکی ہے۔

اس مفصل بحث سے دو باتیں بالکل واضح ہو گئیں۔

۱: منصب امامت بروئے قرآن

۲: عصمت امام کے لزوم پر آیہ مبارکہ دلیل قاطع ہے۔

چند اہم نکات

۱: مقام ''امام'' احادیث کی روشنی میں

اب تک قرآن مجید کی نظر میں امام پر تحقیق کی گئی۔ تاہم بحث کے لیے ایک میدان ہنوز خالی ہے اور وہ یہ کہ 'امام' سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں کیا مراد لیا گیا ہے اور ان کے اہلبیت کے نزدیک مقام 'امام' کیا ہے؟ اس موضوع پر اس پہلو سے غور کرنا اس لیے ضروری ہے کہ لفظ امام آنحضرتؐ کے ارشادات میں اور کثرت کے ساتھ آپ کے خلفاء اور جانشینوں کی گفتگو میں وارد ہوا ہے۔

حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من مات ولم یعرف امام زمانه مات میتة جاهلیة۔[1]

''جو شخص مر جائے اور اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانتا ہو تو وہ جہالت کی موت مرا۔''

نیز کتاب کافی کے جزو کتاب الحجة میں ہر کتاب سے زیادہ یہ لفظ وارد ہوا ہے۔[2]

یہ ایک قرآنی بحث ہے اور وہ بھی ایک موضوع کی شکل میں۔ لہٰذا موضوع کے اس جزو کی بحث ہم کسی اور وقت پر ملتوی کرتے ہیں۔

منصب امامت کے لیے ''ابتلا'' لازم نہیں

اس مقام پر ہم ایک نکتہ کی وضاحت ناگزیر جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان لائق و شائستہ حضرات کے لیے، منصب امامت جن کے لیے سزاوار ہے، امتحان، آزمائش، شداید و مصائب میں مبتلا ہونا اور ان تمام کیفیات میں ان کی استقامت و بردباری، پھر اس کے نتیجہ میں ان کے کمالات کا سامنے آنا، فیض امامت سے سرفراز ہونے کے لیے ایک مقدمہ ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بات ہرگز نہیں کہی جا سکتی کہ آزمائش ہائے سابقہ فیض امامت کے حصول کے لیے لازمی صورت ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ اور موارد بھی اس فیضان کے لیے ضروری ہوں جو حضرت ابراہیم کی آزمائش کی جگہ لے سکیں۔

ہم نے اپنی بحث ''کیا عصمت افتخار وہبی ہے یا نہیں'' میں کسی قدر ان عوامل پر گفتگو کی ہے جو فیضانِ عصمت کے حصول کی بنیاد تصور کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے تکرار کی ضرورت نہیں۔ تاہم ایک مختلف پہلو ہے ہر نوع کمال کے فیضان کے بارے میں، عام اس سے کہ وہ عصمت ہو یا امامت، اعجاز ہو یا کرامت، ہم مناسب اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) وراثت

علم الحیات کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فضائل و کمالات انسانی کے حصول کے لیے روحانی استعداد و اہلیت، حتیٰ کہ بعض شخصی صفات و کمالات، وراثت کے راستہ نسل بہ نسل ہوتی رہتی ہے۔ جن خاندانوں میں انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے رہے عموماً پاک و صحیح النسب خاندان ہوئے ہیں، جن میں امتدادِ زمانہ کے باوجود روحانی کمالات و فاضلات واضح طور پر جمع ہوتے رہے اور اصول وراثت کے تحت ان خاندانوں میں نسل بہ نسل منتقل ہوئے۔ تاریخ بہت سے موقعوں پر اس بنیادی واقعیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے بارے میں تاریخ وضاحت کرتی ہے کہ آنحضرتؐ نے عرب خاندانوں میں بہترین خاندان (قریش) اور قریش کے درمیان بھی شریف ترین قبیلہ ''بنی ہاشم'' میں پیدا ہونے کا شرف پایا۔ یہ خاندان اپنی صفات راستی و درستی، شجاعت، مہمان نوازی،

---

[1] اس حدیث کے مدارک بحار الانوار، ج ۲۳، صفحات ۷۶ تا ۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (تھوڑے فرق کے ساتھ)

[2] کافی، ج ۱، ص ۱۶۸، ۵۵۴ (تھوڑے فرق کے ساتھ)

غیرت، عدل، پاکیزگی اور امانت میں مشہور تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہ حضرات عرب قبائل میں ایک خاص قسم کے احترام کے مالک تھے۔ آنحضرتؐ کے آباء، جہاں تک تاریخ ان کے اسمائے گرامی کا پتہ دیتی ہے عموماً صاف گو، شریف اور باایمان حضرات تھے۔

یہی وجہ ہے کہ 'وراثت' انبیاء علیہم السلام کے کمالاتِ روحانی کی دریافت کے سلسلہ میں ایک خاص قسم کی استعداد و آمادگی کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ استعدادِ وراثت ایک طرح کی بنیادی منزل تھی جو بلند مرتبہ روحانی تربیت جیسے عوامل کے ساتھ مل کر ان افرادِ محترم کے وجود میں فضائل ارفع کو بارآور کرتی تھی۔

(ب) انتقال فضائل وکمالات روحانی بذریعہ تربیت

انبیاء علیہم السلام میں کمالات روحانی کے پیدا ہونے کا دوسرا عامل وہی تھا جس کو ہم تربیت کا نام دیتے ہیں۔ وہ فضائل وکمالات جن کے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ خاندانِ انبیاء میں پائے جاتے تھے۔ وہ لازماً تربیت کے ذریعہ ان میں منتقل ہوتے اور اسی ترتیب سے ان وراثتی نقوش واستعدادہائے روحانی کی تکمیل کے ساتھ ان کو روحانی کمالات تک پہنچاتی تھی۔ وہ ان خاندانوں میں کامل الایمان، امین، ہوشمند، شجاع اور باکمال افراد کو جنم دیتی تھی۔

(ج) ناشناختہ اسباب کا ایک سلسلہ

نفسیات وحیاتیات کے علوم کے ماہرین روحانی شخصیت کے علل واسباب کی تحقیق میں وراثت وتربیت کے علاوہ ایک غیر معلوم سلسلۂ اسباب پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ علل واسباب، ان کے خیال میں، نطفہ کے ذرات میں ایک خاص قسم کی تاثیر منتقل کرنے کا باعث ہوتے ہیں جن کو تشکیل دینے والے عوامل وراثت کہلاتے ہیں۔ یہ ذرات بہت سے وفق العادۃ روحانی حالات وتصرفات کے موجب بنتے ہیں۔ بعض ماہرین نفسیات وحیاتیات اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ کیفیت ان تحرکات کی وجہ سے ہے جو نطفہ میں رونما ہوتے ہیں جن کا نتیجہ فوق العادۃ حالات ہوتے ہیں جو ان افراد باکمال میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ حالات انھیں خاص قسم کے روحانی امتیازات بخشتے ہیں۔

(د) اللہ تعالیٰ کی عنایت خصوصی

ان تین عوامل کے علاوہ ایک اور اہم ترین عامل بھی وجود رکھتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے حق میں ایک مخصوص فیض وعنایت پروردگار کا مقام رکھتا ہے۔ سابقہ ذکر کردہ عوامل ایسی شائستگی وآمادگی کا باعث بنتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص قسم کے فیض وتوجہ کو ان افراد کے شامل حال بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ان فیوض کے زیر سایہ ان میں موجود اقدار اور توانائیاں مزید طاقتور اور موثر ہو جاتی ہے۔

یہ چاروں عوامل، نیز کچھ اور عوامل، جن کے بارے میں ہم قوی احتمال رکھتے ہیں کہ ہماری نظروں سے مخفی و پنہاں ہیں، بہت سے کمالات معنوی کے لیے زمین کی ہموار کرتے ہیں۔ مثلاً

۱: گناہ سے دوری

۲: اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبوت و رسالت کا عطا ہونا۔

۳: لوگوں پر امامت اور ان کی پیشوائی۔

۴: مبارزہ و احتجاج کے مقابلہ میں اعجاز و کرامت پر قدرت۔

۵: غیب کے امور سے آگہی کی قدرت۔

ان کے علاوہ وہ تمام کمالات جو اولیاءِ حق اور اساتذہ وحی الٰہی کو حاصل تھے۔

یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہیے کہ کسی جماعت میں فیض امامت کا عامل صرف امتحان و ابتلاء ہی ہے۔ کیونکہ اس طرح ہمیں حضرت جواد علیہ السلام جیسے بزرگواروں کے بارے میں سوالات سے دو چار ہونا پڑے گا جو صرف نو سال کی عمر میں افتخارِ امامت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے برعکس امتحان تو ان اہم عوامل میں سے ایک ہے جو کسی شخص کو ایسے مقام بلند وارفع تک پہنچنے کے لیے تیار کرتا ہے۔

آیہ تطہیر: یکے از دلائل عصمت اہلبیت

قرآن مجید سے واقفیت رکھنے والے حضرات آیہ تطہیر سے کامل آشنائی رکھتے ہیں۔ عام طور پر ایسے لوگوں کو بھی جو قرآن مجید سے زیادہ آشنا نہیں آیہ تطہیر یاد ہوتی ہے۔ متن آیہ مبارکہ یہ ہے:

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِیَّةِ الۡاُوۡلٰی وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیۡنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِیۡرًا ﴿۳۳﴾ (احزاب: ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اپنے آپ کو جاہلیت کے سابقہ دور کی طرح ظاہر نہ کرو۔ نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ تو بس یہ چاہتا ہے کہ نجاست کو تم اہلبیت سے خصوصیت کے ساتھ دور رکھے اور تمہیں مکمل طور پر پاک و پاکیزہ فرمائے۔''

علمائے اہل تشیع نے تدوین حدیث و تفسیر کے روز اول ہی سے عصمت اہل بیت عظام کے بارے میں آیہ تطہیر سے استدلال کیا ہے اور اس آیہ مبارکہ کو عصمت اہل بیت کے دلائل سے ایک جانا ہے۔ اب سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آیہ مبارکہ میں اہلبیت سے کیا مراد ہے اور یہ کس طرح ان کی عصمت پر دلالت کرتی ہے؟ ہم ان دو سوالوں اور آیہ مبارکہ سے متعلق دیگر مطالب پر بتدریج بحث کریں گے۔

عصمت اہل بیت علیہم السلام بروئے آیہ تطہیر درج ذیل امور کے اثبات پر مبنی ہے:

۱: ''رجس'' سے ہر قسم کا گناہ اور انحراف مراد ہے۔ عام اس سے کہ وہ شرک ہو یا اس کے علاوہ کسی قسم کا گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ۔

۲: جملہ ''انما یزد''میں ارادہ سے مراد ارادۂ تکوینی ہے نہ کہ ارادۂ تشریعی۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود ''ازالہ رجس'' فرمارہا ہے، یہ نہیں کہ اہل بیت سے ایسا کروانا چاہتا ہے یا ان سے مطالبہ کررہا ہے۔

۳: مفہوم اہلبیت کی حدود اور نزول آیہ مبارکہ کے وقت اہلبیت کے مصادیق کی تعیین۔

متذکرہ باالا امور کے اثبات وتشریح سے اہلبیت عظام کی عصمت مطلقہ اس آیہ مبارکہ سے مکمل طور پر ثابت ہوجائے گی۔ ہم ان امور کا تجزیہ اوران پر بحث سطور ذیل میں پیش کرتے ہیں:

ا: مراد از ''رجس''

آیہ مبارکہ کے بحث طلب مسائل میں سے ایک ''رجس'' کے معانی کی وضاحت ہے۔ عظیم عربی ماہر زبان 'ابن فارس' کی دانست میں ''رجس'' کے معنی ''قذر'' (یعنی کثافت وآلودگی) کے ہیں۔[۱] یہ لفظ قرآن پاک میں آٹھ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔ رجس میں وہ تمام موضوعات شامل ہیں جن کا تعلق مردار، خون، خنزیر کے گوشت، شراب، قمار بازی، بت پرستی، ازلام (قمار کی ایک قسم یعنی لاٹری اور) کفر وغیرہ سے ہے۔[۲] یہ سب رجس کی تعریف میں آتے ہیں۔ تمام متعلقہ آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ لفظ رجس پلیدگی وآلودگی یا کثافت وقذارت کے معنی کا حامل ہے، خواہ یہ سب کیفیات محسوس وآشکار صورت میں ہوں، جیسا کہ خون، مردار، لحم خنزیر وغیرہ، یا کسی معنوی اور غیر محسوس شکل میں ہوں مثلاً بت پرستی وقمار بازی وغیرہ۔ کفار بھی جو بظاہر صاف ستھرے اور نظیف ہوں، لیکن ان مفاسد کے باعث جو بت پرستی، قمار بازی اور عقائد کفر میں پائے جاتے ہیں، سب 'رجس' کے موضوع میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیہ زیر بحث میں کثافت ظاہری ہی مراد نہیں بلکہ نجاست معنوی بھی اس میں شامل ہیں جو کفار وگنہگار لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ نجاست معنوی گناہ ونافرمانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس قسم کی کثافات ونجاسات سے انسان کی پاکیزگی عصمت اور گناہ سے پاکیزگی کے ساتھ لازم وملزوم ہوتی ہے۔

اس بات پر ''ویطهر کم تطهیرا''کا جملہ شاہد ہے جو اس سے پہلے کے جملہ ''لیذهب عنکم الرجس'' پر تاکید کے طور پر وارد ہوا ہے۔ ایسا ہی جملہ قرآن مجید میں گناہ سے پاکیزگی اور انحراف سے تحفظ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصۡطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ۝۴۲

(آل عمران: ۴۲)

---

[۱] المقاییس، ج ۲، ص ۴۹

[۲] المعجم المفهرس، ''مادہ رجس'' کی طرف رجوع فرمائیں

''(اے مریم) اللہ نے تمھیں چن لیا ہے، پاک و پاکیزہ کر دیا ہے اور تمھیں دنیا کی دیگر تمام عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

یہ تطہیر (طہارت) تمام روحانی نجاسات اور معنوی کثافات کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں، جو عصمت کے لیے لازم وملزوم ہے۔

تاہم جاننا چاہیے کہ تطہیر کے مراتب اور درجات ہیں اور ان سب کے سب کی موجودگی سے عصمت لازم نہیں آتی، جیسا کہ قرآن مجید مسجد قبا اور اس میں نماز پڑھنے والوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ۝۱۰۸ (توبہ: ۱۰۸)

''وہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک وطاہر لوگوں کو دوست رکھتا ہے''

لیکن چونکہ آیہ مبارکہ میں نجاست مطلق صورت میں 'الف اور لام' جنس کے ساتھ (الرجس) وارد ہوئی ہے اور 'لیذھب' کے مضمون کے مطابق 'الرجس' کی طبیعت کی اس سے نفی ہوئی ہے اور پھر جملہ 'ویطھر کم تطھیرا' اس پر تاکید کو ظاہر کرتا ہے، لہٰذا اس سے یقیناً وقطعاً ہر قسم کی پلیدی اور نجاست کی نفی مراد ہوگی۔ اس قسم کی نفی قرآن کی تعبیر (اذہاب الرجس) کے مطابق عصمت کے لیے لازم قرار پائے گی۔ لیکن اس نفی سے مراد اگر رجس کی کوئی ایک حالت ہو مثلاً گناہ کبیرہ، تو پھر رجس کی نفی جنس کی نفی کی شکل میں اور اس کی تاکید یطھر کم کے جملہ کے ساتھ مناسب نہ تھی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ درج ذیل دو دلیلوں کی موجودگی میں نجاست مطلق اور معنوی آلودگی، عام اس سے کہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، اہل بیت کے لیے اس کی نفی کی گئی ہے:

۱: 'رجس' و پلیدی کی جنس وطبیعت اہل بیت سے سلب ہو چکی ہے اور جنس کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام مراتب وافراد سے لازماً نفی ہو جائے۔

۲: ہر طرح کی نجاست کی نفی ویطھر کم تطھیرا کے جملہ سے مؤکد ہو جاتی ہے۔ اس سے اگر تمام مراحل کی نفی مراد نہ ہو تو چند مراحل کی نفی پر تاکید کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین کا نظریہ جو کہتے ہیں کہ ''الرجس'' سے مراد شرک ہے یا گناہ کبیرہ، بے اساس ہے اور ظاہری طور پر مفہوم آیت کے خلاف ہے کیونکہ رجس کے معنی نہ تو بت پرستی ہے اور نہ ہی گناہ کبیرہ بلکہ اس لفظ کے وسیع معانی ہیں جن کی مطلقاً اہلبیت کے لیے نفی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی شے کی غیر مشروط نفی مطلق لازمی طور پر اس کے تمام مراتب کی نفی قرار پاتی ہے، نہ کہ کسی خاص مرتبہ کی۔ مثلاً ''لا رجل فی الدار'' ''یعنی کوئی مرد گھر میں نہیں ہے۔'' یا ''لا خیر فی الحیاۃ'' ''کوئی خیر وبھلائی زندگی میں موجود نہیں رکھتی۔''

۲: ارادۂ خدا تکوینی ہے نہ کہ تشریعی

خداوند عالم کے ارادۂ تکوینی وتشریعی کی وضاحت کے لیے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کا تعلق اس کے اپنے فعل سے ہو، مثلاً آسمانوں اور زمین کی تخلیق، تو اس کو ارادۂ تکوینی کا نام دیا جاتا ہے اور درج ذیل آیہ مبارکہ کسی حد تک اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ۝۸۲ (یٰس: ۸۲)

''اس کا فرمان اس کے علاوہ نہیں کہ جب وہ کسی شے کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔''

اس کے برعکس اگر ارادۂ خداوند عالم کسی اور کے فعل سے متعلق ہو، ہم اس کی تشریح بعد میں پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ چاہے کہ لوگ اس کے حکم کے مطابق فرائض انجام دیں، مثلاً وہ حکم دے کہ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو وغیرہ، تو اس قسم کا ارادہ تشریعی کہلاتا ہے۔ اس قسم کے احکام کے بارے میں جب انسان ان فرائض کا مکلف ہو جائے، تو وہ ان کی انجام دہی یا انحراف میں ہر طرح آزاد وخود مختار ہوگا۔ تاہم یہ دونوں ارادے اللہ تعالیٰ کے خصائص میں شمار نہیں ہوتے بلکہ ہر انسان بھی، اپنے مقام پر، ارادۂ تکوینی کا حامل ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی منصب ومقام حاصل ہو تو فطرتاً اس کو ارادہ ''قانونی'' بھی حاصل ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک فوجی افسر کو لیجیے۔ اس کو مورچہ میں بیٹھ کر اپنے ارادہ واختیار سے گولہ باری کرنا ہوگی۔ یہ اس کا ارادۂ تکوینی ہوگا۔ لیکن جب وہ اسی کام کے لیے کسی کو حکم دے گا اور کسی دوسرے سے اپنے حکم کے تحت گولہ باری کروائے گا تو یہ اس کا ارادۂ تشریعی ہوگا۔

ارادۂ تکوینی کے قرائن

۱: آیہ مبارکہ جس ارادہ کا ذکر کرتی ہے وہ ارادۂ تکوینی ہے، ارادۂ تشریعی نہیں کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ خود اپنے فعل سے متعلق ہے، جس کو ''اذھاب رجس'' اور تطہیر کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ارادہ کسی اور کے کسی فعل سے تعلق نہیں رکھتا اور یہ ارادہ ارادۂ تکوینی کے علاوہ نہیں ہوتا۔

۲: اللہ تعالیٰ کا ارادۂ تشریعی، جہاں تک لوگوں کے تکلیف وضرورت شرعی کے اعتبار سے پاک و پاکیزہ ہونے کا تعلق ہے، کسی خاص جماعت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا تعلق تمام انسانوں کی، تکلیف شرعی کی صورت میں، طہارت سے ہے۔ انبیاء ورسل کی بعثت کا ہدف بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی لیے خداوند عالم وجوب وضو کے بعد اس کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ (مائدہ: ۶)

''لیکن وہ (اللہ تعالیٰ) چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے اور تمھارے حق میں اپنی نعمت کو مکمل کردے۔''

اس کے برعکس اس آیہ مبارکہ (آیہ تطہیر) میں ایک جماعت خاص کی طہارت کے بارے میں پروردگار عالم کے ارادہ کا ذکر ہے اور اس جماعت کو اہل بیت کا نام دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ تشریعی ہے اور خداوند عالم تکالیف و فرائض شرعی کے مطابق اس جماعت کی طہارت کا خواہاں ہے کیونکہ آیہ مبارکہ اس صورت حال کی حامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ اس جماعت کی طہارت و پاکیزگی کو اپنے ارادۂ تشریعی سے علیحدہ، ارادۂ تکوینی کے طریقہ سے ایک ظاہر و باہر صورت میں قرار دینے کا ارادہ کر رہا ہے۔

۳: آیہ مبارکہ کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ پروردگار عالم اہل بیت عظام کے لیے ایک عنایت خاص رکھتا ہے۔ یعنی ان حضرات کی طہارت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ عام بنی نوع انسان کی طہارت و تقویٰ کے ارادہ کی مانند نہیں بلکہ اس سے مختلف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا ارادہ تمام انسانوں کے مکلف بہ طہارت ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور اہل بیت بھی اس ارادہ میں شامل ہیں، لیکن اہل بیت کے لیے ایک اور ارادۂ خداوند تعالیٰ بھی وجود رکھتا ہے جس کا تعلق صرف ان حضرات ہی سے ہے۔ یہ موخر الذکر ارادۂ باری تعالیٰ اس نوعیت سے مختلف ہے جس کے تمام انسان مکمل اور بالعموم مکلف ہیں۔ مندرجہ ذیل امور اس ارادۂ پروردگارِ عالم کی نشاندہی کرتے ہیں جو صرف اسی جماعت اہلبیت سے متعلق ہے اور یہ ارادہ اس کلی ارادۂ باری تعالیٰ سے ماوراء اور الگ ہے جو تمام مکلفین کے بارے میں وجود رکھتا ہے:

الف) اللہ تعالیٰ نے اپنی گفتگو کو کلمہ حصر (انما) سے شروع فرمایا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ ارادہ صرف اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور ان سے تجاوز نہیں کرتا۔

ب) ارادہ کی اس نوعیت کو لفظ اہلبیت کے ساتھ مشخص کیا گیا ہے اور اعراب کے لحاظ سے اس لفظ کا منصوب ہونا حرف ندا یا جملہ 'اخصکم' کی تقدیر کی بناء پر ہے یعنی ''تمھیں کو کہنا ہے، کسی اور کو نہیں۔''

ج) ارادہ کے متعلقین کو ''لیذھب عنکم الرجس'' کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ایک اور جملہ یعنی 'ویطھرکم' کو اس پر بطور تاکید نازل کیا گیا ہے۔

د) پھر تاکید کی منزل میں اصل فعل یطھرکم کو ہی کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کے بعد تطھیرا کو مفعول مطلق کی شکل میں، جو تاکید جدید ہے، لایا گیا ہے۔

ھ) مفعول مطلق (تطھیراً) کو بصورت 'نکرہ' استعمال کیا گیا ہے جو اس تطہیر کی عظمت کا مظہر ہے۔ ''ای یطھرك تطھیراً عظیما عجیبا۔ یعنی ان کے پاک کرنے کی نوعیت سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی طہارت کے معیار کا ادراک ان کے لیے ممکن ہے۔

و) اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ آیہ مبارکہ، اپنے سیاق اوران پانچ قرائن کی موجودگی میں، اہلبیت کی مدوستائش کی منزل کی مظہر ہے۔ اگراس آیت میں ارادہ سے مرادصرف ارادۂ تشریعی لیا جائے، جودوسرے انسانوں کے بارے میں بھی حکم فرما ہو، تو پھر کسی حالت میں بھی اس آیہ مبارکہ سے اہلبیت عظام کی ستائش مرادنہیں ہوگی، جبکہ عربی زبان سے آگاہ ہرشخص اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس آیت کا مفادوہدف اہلبیت کی مدح وستائش ہے۔ ایسے تمام اشخاص اس آیہ مبارکہ کا مصداق فضیلت اہلبیت کو جانتے ہیں اورتمام محدثین ومورخین اور مفسرین بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

عنایت پروردگار عالم کی یہ قسم ظاہر کرتی ہے کہ یہ اس کلی ارادۂ خالق سے مختلف ہے جس کا تعلق بالعموم تمام انسانوں سے ہے۔ لہٰذا فطری طور پر دونوں ارادوں میں فرق کی بناء پر موخرالذکر ارادۂ تکوینی ہی قرار پائے گا، جس کو اس مقصد سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس کی تشریح بعد میں کریں گے۔

آخر میں ہم بتلانا چاہتے ہیں کہ آیہ مبارکہ میں دو مقامات 'حصر' پائے جاتے ہیں، خ جواس طرح سے ہیں:

۱: لفظ انما کلمات حصر سے ہے جس کا ہماری زبان میں عام طور پر ''ایسا ہے اوراس کے علاوہ نہیں ہے'' ترجمہ کیا جاتا ہے۔

۲: لفظ 'اهل البيت' خطاب عنكم کے بعد آیا ہے اوراس کی نصب تقدیر فعل یا حرف ندا کی وجہ سے ہے۔ مثلاً 'اخص اهل البيت'' اور ''يااهل البيت''۔

ان دونوں حضرات سے مراد یہ ہے کہ فیضان عصمت کے مورد نظر صرف اورصرف 'اہل البیت' ہیں اوران کے غیر ان میں شامل نہیں ہوسکتے۔

دونوں ارادہ کی خصوصیات

ان دونوں ارادہ ہائے باری تعالٰی کی ایک دوسرے سے شناخت وعلیحدگی کو سمجھنے کے لیے ہم دو قاعدوں سے مدد حاصل کر سکتے ہیں:

الف) ارادۂ تکوینی میں لازم ہے کہ اس کا تعلق خود فعل مرید سے ہو جبکہ ارادۂ تشریعی کا تعلق کسی اور کے فعل سے ہوتا ہے۔ تاہم اس کلیہ کی تعریف اس شکل میں کسی قدر درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ دلائل فلسفہ کے مطابق کسی مرید کا ارادہ ہمیشہ ایسی چیز سے تعلق رکھتا ہے جس کا انجام دنیا مرید کے اختیار میں ہو جبکہ کسی دوسرے کا فعل مرید کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں وہ کس طرح ایسی بات کا ارادہ کر سکتا ہے۔ وضع قانون اور پھر اس کی اشاعت کے لیے بھی ہمیشہ مقنن کا ارادہ اس کے اپنے فعل سے متعلق ہوتا ہے، کسی اور کے فعل سے نہیں اوراس معاملہ میں اس کا فعل اس کے اپنے مقصد وخواہش کا مظہر ہوتا ہے جس کو وہ ضابطہ تحریر میں لاتا ہے اور کہتا ہے ''ایسا کرو۔'' اس بناء پر اس کلیہ کی اصلاح کے لیے یہ کہنا چاہیے کہ ارادۂ تشریعی کا نتیجہ مرید کے علاوہ کسی اور شخص سے فعل کا صادر ہونا ہے نہ کہ ارادہ کا تعلق کسی دوسرے کے فعل سے ہو۔

ب) ارادۂ تکوینی میں لازم ہے کہ مرید خود خدا ہو یا بندہ، ارادہ سے اس کے نتیجہ کا اختلاف اور علیحدگی ممکن نہیں۔ اگر ہم اس اصول کو ضابطہ

کلی کے طور پر تمام مردیوں (ارادہ کرنے والوں) میں قبول نہ بھی کریں تب بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں 'ارادہ'، 'تحقق'، 'خواہش' اور 'ہوجانا' سب باتیں لازم وملزوم ہیں یعنی خداوند تعالیٰ کی خواہش کسی شے کے ہوجانے کی دلیل ہے کیونکہ وہ ایسا فاعل ہے جس کی قدرت وطاقت میں نقص کا وجود ممکن نہیں اور نہ ہی اس کے ارادہ میں کوئی شے مانع ومحال ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ایسی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی شے کو وجود میں لانے کا ارادہ فرمائے اور وہ شے تحقق پذیر نہ ہو پائے۔

ان حالات میں آیہ مبارکہ کے موارد کے بارے میں کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلبیت عظام کے لیے عصمت کو پسند فرمایا ہے اور اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ بھی پہنایا ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی آلودگی سے تحفظ ایک حقیقت کی شکل میں ان کی روح ونفس میں متحقق ہوگیا ہے اس سلسلہ میں کچھ سوالات سامنے آتے ہیں جن کو ہم بالترتیب واضح کرتے ہیں۔

الف) ارادۂ تکوینی وآزادیٔ معصوم

سطورِ بالا میں ذکر کردہ قرائن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آیہ مبارکہ میں ارادہ باری تعالیٰ ارادۂ تکوینی ہے۔ یعنی مشیت باری تعالیٰ اس معاملہ میں تجسیم سے ہم آہنگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں خداوند عالم نے چاہا کہ اہل بیت زیورِ عصمت سے آراستہ ہوں اور اسکی اس خواہش نے عملی جامہ بھی پہن لیا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ عصمت اہلبیت کے بارے میں تحقق پذیر ہوگیا ہے اور وہ مقصد ارادہ سے اختلاف کی ممانعت کے اصول کے تحت حتمی طور پر گناہ سے محفوظ ومعصوم ہیں تو اس صورت میں حاصل ہونے والی عصمت حتمی وقطعی ان کے اختیار وحریت کے منافی قرار پائے گی کہ وہ ترک گناہ اور انجام واجبات پر مجبور قرار پائیں گے۔ یعنی اس طرح وہ کسی قسم کی غلط کاری، گناہ، نافرمانی اور تجاوز کے ارتکاب پر قادر ہی نہ ہوں گے، درآنحالیکہ عصمت کا مفہوم، جو ہم سمجھے ہیں، یہ ہے کہ معصوم حامل عصمت ہونے کے باوجود گناہ کے ارتکاب پر بھی قادر ہوتا ہے اگرچہ اس کو سمجھتے ہوئے انجام نہیں دیتا۔ پس اگر عصمت اہلبیت اللہ تعالیٰ کے ارادہ تکوینی کا نتیجہ ہے تو پھر مقصد ارادہ سے اختلاف کی ممانعت کے اصول کے مطابق ان کا معصوم ہونا لازم ہوگا۔ لیکن اس قسم کی لازمی عصمت معصوم کے اختیار اور آزادی کے ساتھ سازگار نہیں۔

دوسرے لفظوں میں یا تو معصوم کے اختیار وآزادی کا تحفظ ہونا چاہیے، اس کو میدانِ عمل میں اس طرح آزاد وخود مختار چھوڑا جائے کہ وہ کسی کام کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو عملی جامہ پہنا سکے، یا اس صورت حال سے دستبردار ہوکر اس کو جبراً ولازماً معصوم خیال کیا جائیکہ وہ اپنی خواہش کے برعکس معصوم ومنزہ ہو۔ اس صورت میں معصوم کی حریت وخود مختاری کے تحفظ کے سلسلہ میں ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ اس معاملہ میں ارادۂ خدا کو تشریعی جانیں اور عصمت اہل بیت کو اللہ تعالیٰ کے ارادۂ تکوینی کی حدود سے خارج تسلیم کریں۔

جواب

یہ اعتراض، یا بہ الفاظ دیگر یہ سوا، اہلبیت عظام کی عصمت سے متعلق آیہ مبارکہ اور اس سے استدلال کے سلسلہ میں بہت پرانے اشکالات میں سے ایک ہے۔ علماء شیعہ نے اپنی تفسیر اور متعلقہ رسالہ جات میں مختلف زاویوں سے اس کا جواب دیا ہے۔ ہم نے بھی آغاز بحث میں ''عصمت کے وہبی ہونے کے اثبات'' کے بعد ''عصمت وہبی کے باعث اثبات ہونے کے بارے میں گفتگو ہدیہ قارئین کی ہے جس میں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ تاہم چونکہ یہ سوال بہت سے قارئین کے ذہنوں کے مختلف گوشوں میں پرورش پاتا رہتا ہے اس لیے ہم اس سوال کو از سرنو بحث و تحقیق کا مورد قرار دیتے ہیں۔

عصمت کے معنی اور اس کی واقعیت کے موضوع پر غور کرنے سے ہوسکتا ہے کہ ہماری اس مشکل کے حل کے لیے کوئی راہ نکل آئے۔ عصمت کے لیے تین قسم کی واقعیت یا بہتر الفاظ میں ایک واقعیت کے تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب واقعیات یا ایک واقعیت کے تین پہلو درج ذیل تجزیہ سے عبارت ہیں:

۱: عصمت: تقویٰ اور خوف خدا کا درجہ اعلیٰ۔

۲: عصمت: انحراف وعصیاں کے انجام کے بارے میں علم تخلف ناپذیر۔

۳: عصمت: کمال و جمال حق سے عشق اور لگاؤ۔

یہ ہیں واقعی کیفیات عصمت یا عصمت کی واقعیت کی مختلف صورتیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کا ارادۂ تکوینی یہ ہو جائے کہ کسی شخص یا کسی جماعت کو نعمت عصمت عطا فرمائے تو یہ کام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ باری تعالیٰ ان کو تقویٰ کا درجۂ اعلیٰ یا نتیجہ گناہ کا علم قطعی، یا حق تعالیٰ کے جمال وجلال کا عشق نہ بخشے اور انھیں موروثی یا اکتسابی لیاقت وشائستگی کی بناء پر اس قسم کی نعمت کے حصول کے لیے تیار نہ فرمائے۔ اب دیکھنا ہوگا کہ کیا اس قسم کی نعمت کی عطا، حتمی وقطعی صورت میں، نعمت پانے والے کی قدرت واختیار وآزادی کے سلب ہو جانے کا باعث بن جاتی ہے یا وہ اس قسم کی نعمت کے حصول کے باوجود دونوں میں سے کوئی کام کرنے کے لیے خودمختار اور آزاد رہتا ہے؟

یہ درست ہے کہ ارادۂ تکوینی مقصود سے الگ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے لیے عصمت ارادۂ پروردگار میں قرار پا لے تو وہ حتماً وقطعاً ولازماً معصوم ہوگا، اس کے روح اور نفس میں وجود عصمت ظاہر ہوگا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی کیفیت ارادہ ومشیت باری تعالیٰ کے بعد بھی متحقق نہ ہو۔ لیکن یہ عصمت وہبی اور یہ نعمت لازمی ایسی چیز نہیں ہوتی کہ وہ حامل عصمت سے اختیار کو سلب کر دے، میدانِ عمل میں اسے بے بس کر دے کیونکہ اس ارادۂ تکوینی کا نتیجہ پھر یہ نکلے گا کہ انسان عطاء الٰہی کے سایہ میں حتماً تقویٰ کے درجہ اعلیٰ پر فائز ہو کر گناہ کے اثرات اور نتائج کا راسخ و غیر مغلوب علم وادراک حاصل کرے، یا حق تعالیٰ کی عظمت اور جمال ولال کا شوق وعشق سوزاں پیدا کرلے۔ پھر بھی اتنے ملکات وکمالات کا حتمی اور قطعی طور پر انبیاء وائمہ علیہم السلام کی روح ونفس میں وجود پانا انکی حریت کے لب ہونے، آزادی ہونے کی نفی اور اختیار کے ختم ہونے کا موجب نہیں بنتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حضرات اس قسم کی نعمات کے حصول سے، جو انکے اختیار سے باہر ہے، انحراف وعصیان پر بھی قادر ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملکات اور کمالات نفسانی ترک گناہ ونفی عصیاں کی علت تامہ نہیں بنتے۔ بلکہ یہ سب کامل طور پر اس بات کے مقتضی ہو جاتے ہیں کہ اس علت کے آخری اجزاء تک خود معصومین علیہم السلام سے مربوط ہو جائیں۔

ماضی میں شیخ مفید مرحوم نے عصمت کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی شخص کو عصمت کی نعمت کا مرحمت فرمانا ایسا ہی ہے جیسے دریا میں غرق ہونے والے کسی شخص کو یا جو شخص کنویں میں گر گیا ہو رسی پکڑائی جائے جس کو پکڑ کر وہ باہر آسکے۔ وہ شخص اس رسی کو چھوڑ سکتا ہے اور غرق ہوسکتا ہے یا کنوئیں کے اندر رہ سکتا ہے۔ شیخ مفید علیہ الرحمۃ کے مطابق رسی پکڑانا دریا میں غرق ہونے یا کنوئیں سے باہر آنے کو لازم قرار نہیں دیتا بلکہ لازم تو یہ ہے کہ گرفتارِ بلا شخص غرقابی یا کنوئیں میں ڈوبنے کی بجائے خود حرکت کر کے رسی کو چنگل مارے اور اپنی جان کی خاطر اس سے استفادہ کرے۔

ہم بھی اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

عطائے عصمت تینوں معانی میں کسی ایک کے ساتھ بھی ترک گناہ کا سبب نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ایک اور جزو کی بھی ضرورت لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ معصوم خود اس کو وجود دے اور وہ اس کا اپنا ارادہ ومشیت ہوگی کہ اپنی سعادت کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت سے فائدہ اٹھائے تاکہ وہ پاک و پاکیزہ طریق کار پر آجائے اور پھر اسی حالت پر باقی رہے۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ وہ عصمت کا حامل ہو اور اللہ تعالیٰ کا چاہنا اس امر کے ہوجانے کے مترادف ہے۔ یعنی مشیت خدا کسی امر کی واقعیت سے الگ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس معاملہ میں مشیت خداوند عالم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ فرد متعلقہ اس قسم کے ملکہ اور کمال کا حامل ہوجائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ تو کسی انسان کے لیے اس کیفیت کے تحقق کو پسند فرمائے اور پھر وہ انسان اس کیفیت کا حامل نہ ہو پائے۔ تاہم لازمی طور پر اس کیفیت کا حامل ہونا ''مقتضی'' کے اس امر کے اہل ہونے اور عصمت کی علت تامہ کے ایک جزو کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ اب فردِ معصوم پر لازم آتا ہے کہ عصمت کے باقی اجزاء وعلت کی تکمیل کرے تاکہ عملی طور پر اس کا گناہ سے تحفظ اور انحراف سے پاکیزگی، جو عصمت کا فطری ولازمی نتیجہ ہیں تحقق پذیر ہوں۔ لہٰذا مقتضی کے معنی ترک گناہ کی بنیاد رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک معصوم فرد اس آزادی وخود مختاری کی موجودگی میں جو اس کو حاصل ہیں، اس اساس وبنیاد سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کو اختیار ہے کہ اس کیفیت کو بے کار و بے اثر بھی کر سکے۔

اس سلسلہ میں اشکال وشبہ یا اس سوال پر اصرار کرنے کی اصل یہ ہے کہ ایک تصور پیدا ہوگیا ہے کہ عصمت وہبی سے مراد گناہ و انحراف کا ترک کرنا ہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پھر ان حالات میں ترک گناہ اپنے مقام پر لازمی وحتمی قرار پائے گا۔ لیکن اس میں ایک نقطہ سے غفلت برتی گئی ہے جو یہ ہے کہ مرکز عصمت اور اس نعمت کی عطا کی منزل انسان کی روح اور اس کا نفس ناطقہ ہیں حالانکہ انجام یا ترک گناہ کا مرکز انسان کے اعمالِ خارجی سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ دونوں حالتیں ایک جیسی کیسے ہوسکتی ہیں۔

وہ چیز جو ایک معصوم کو لازمی صورت میں دی جاتی ہے وہ عصمت اور مخصوص حالت نفسانی ہے لیکن جو چیز انسان کے دائرہ اختیار و آزادی میں قرار پاتی ہے وہ اس کے اعمال خارجی اور قول وعمل ہیں۔ ان دو کیفیات میں ایک کا لازمی ہونا دوسری کے اختیاری ہونے کے منافی

نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ عصمت ترک گناہ اور فرد کی نسبت اپنے معلول کے ساتھ علت تامہ کی حیثیت نہیں رکھتی کہ ایک کا جبری و لازمی ہونا دوسری کیفیت کے جبری و لازمی ہونے کا سبب بنے بلکہ یہ کیفیت انسان میں پاکیزگی کی ایک ایسی بنیاد کو قائم کرتی ہے کہ انسان اس کے زیر اثر مکمل آزادی و خود مختاری کے ساتھ گناہ و انحراف کے خلاف کامیاب و کامران ہو جاتا ہے، تاہم اس کیفیت کا عملی طور پر عکس بھی واقع ہو سکتا ہے اگرچہ ایسا حقیقتاً ہوتا نہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ارادہ اور مقصود میں علیحدگی کا نہ ہونا، مشیت اور واقعیت میں تلازم قطعی انبیاء و آئمہ علیہم السلام کی عصمت کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ بزرگوار ہستیاں چاہیں یا نہ چاہیں اللہ تعالیٰ کے فیضان اور معنوی نعمت عظیم کے حامل ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان منازل کے حصول کے باوجود ان کے ہاتھ کسی فعل کی انجام دہی یا ترک کے لیے بالکل آزاد ہیں۔ یعنی نہ تو وہ معصوم رہنے کے لیے مجبور ہیں اور نہ ہی وہ ترک گناہ اور انجام واجبات پر مجبور ہیں۔ یہ بات ملکہ عصمت کے مقتضی ہونے پر غور کرنے کے سلسلہ میں ذیل کی دو مثالوں سے مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

(۱) کوئی سمجھدار اور صاحب عقل انسان تیار نہیں ہوتا کہ تھوڑی سی قیمت (چند ٹکوں) کے عوض اپنی عزت و آبرو کو خطرہ میں ڈالے۔ وہ اس عمل میں معصوم ہوگا، درآنحالیکہ وہ اس عمل میں عاجز و ناتواں نہیں ہوگا۔ ایسے کام کا انجام نہ دینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ایسا کر نہ سکتا تھا۔

(۲) خداوند عالم افعال قبیح و زشت کی انجام دہی پر قادر ہے لیکن وہ ہرگز کسی حالت میں ایسا نہیں کرتا۔ ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔

اسی طرح ایک معصوم اپنی تمام عمر میں گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا، نہ ہی کسی تجاوز کو انجام دیتا ہے۔ معصوم کا ایسا ارتکاب کرنا یا کسی ایسے فعل شنیع کو انجام نہ دینا اس بات کا گواہ نہیں کہ معصوم ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ [۱]

ب) کیا عصمت کا یہ پہلو باعث افتخار نہیں؟

یہاں ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے جو یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ عصمت لازمی و جبری کا تقاضا لازمی طور پر ترک گناہ کے لیے بھی جبر و لزوم کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ نیز یہ ہے کہ عصمت ایک مسئلہ ہے جبکہ ترک گناہ اس سے مختلف مسئلہ ہے۔ اگرچہ موخر الذکر مسئلہ ایک طرح پر اول الذکر کا نتیجہ شمار ہوتا ہے پھر بھی عصمت وہبی و تفضلی، جس کا فیضان اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوتا ہے اور اس کو انسان خود اپنی محنت سے حاصل نہیں کرتا، قابل تعریف بات نہیں رہتی، کیونکہ وہ کمال ہی قابل تعریف قرار دیا جاتا ہے جس کو انسان اپنے اختیار کے کمال سے حاصل کرے، نہ کہ وہ جو انسان کی خواہش کے بغیر عالم غیب سے اسے مل جائے۔

---

[۱] اس سوال کا ایک اور جواب بھی دیا گیا ہے اور ہم نے بھی کتاب 'قطاب الدوائر' پر اپنے حواشی کے صفحہ ۶۱، ۶۳ پر اس کا جواب دیا ہے۔ لیکن جو کچھ یہاں معرض تحریر میں آیا ہے زیادہ وضاحت کا حامل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال کوئی نیا نہیں بلکہ تمام غیبی فیوض میں جاری و ساری ہے۔ اس کا جواب ہم ''عصمت کے وہبی ہونے'' کے عنوان کے تحت دے چکے ہیں۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہماری پہلی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فیضانِ عصمت کسی سابق اہلیت کا محتاج نہیں جس سے کسی کی لیاقت و قابلیت ظاہر ہوتی ہو۔ ان کمالات کی بعض بنیادی چیزیں وراثت سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض اکتسابی ہیں جن کو معصومین خود اپنے عرصہ حیات میں حاصل کرتے ہیں

ج) کیا یہ آیہ مبارکہ فعلیت تطہیر پر گواہ نہیں؟

آیہ مبارکہ اس صورت میں اہل بیت رسالت کی عصمت کی دلیل شمار کی جا سکتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس معاملہ عصمت میں عمل میں آ چکا اور عملی جامہ پہن چکا ہو۔ اس معنی کا ظاہر کرنا اس صورت میں صحیح ہے جب لفظ 'یریں' کے بجائے 'اراد' استعمال کیا جائے جو کسی ارادہ کی فعلیت و تحقق کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہاں آیہ مبارکہ میں لفظ 'یریں' وارد ہوا ہے جو مستقبل کا صیغہ ہے۔ یہ صورت اس سے زیادہ کوئی بات ظاہر نہیں کرتی کہ خداوند عالم مستقبل میں ایسا ارادہ کرے گا۔ لہٰذا اس قسم کی تعبیر صرف امکان عصمت کو تو ظاہر کرتی ہے، اس کے واقع ہونے کو نہیں۔[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات خاندان رسالت سے بے مہری اور الفت و محبت کے فقدان کے سوا اور کوئی منشاء نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہی آیت یا یہی الفاظ کچھ دیگر افراد یا مواقع کے لیے وارد ہوتے تو کبھی بھی اس قسم کی اشکال تراشیوں یا شبہات کا باعث نہ بنتے۔ دلیل کے طور پر ہم چند ایک آیات مبارکہ پیش کرتے ہیں جن میں یہی لفظ 'یرید' آیا ہے اور جہاں کسی شخص کے ذہن میں اس قسم کا اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

خداوند عالم شراب و قمار کی مذمت کے بعد فرماتا ہے:

۱: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (مائدہ: ۹۱)

''یہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کہ شیطان شراب اور قمار بازی کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت و بغض پیدا کرنا چاہتا ہے۔''

قرآن مجید نکاح و ازدواج کے بارے میں ایک مفصل بحث اور اس سے متعلق ایک سلسلہ احکام بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

۲: يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ (نساء: ۲۶)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے احکام کو بیان فرمائے۔''

---

[1] صراط المستقیم ج ۱، ص ۱۸۴، مولفہ زین الدین بیاضی، متوفی ۸۷۷ (مخالفین سے نقل ہوا)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

۳: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ (نساء: ۲۷)

''خداوند عالم چاہتا ہے کہ رحمت کے ساتھ تمہاری طرف رجوع فرمائے۔''

۴: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (نساء: ۲۸)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے بوجھ کو ہلکا فرمائے۔''

اسی طرح جہاد سے تخلف کرنے والی ایک جماعت کے بارے میں، جو مدینہ میں رہ گئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر رکاب انھوں نے جہاد میں شرکت نہ کی، ارشاد ہوتا ہے:

۵: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ (فتح: ۱۵)

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل ڈالیں۔''

کیا کسی عرب کے رہنے والے یا کسی زبان عربی کے عالم کے ذہن میں اس قسم کا خیال کبھی پیدا ہوتا ہے یا سب کے سب اس ارادہ کے عمل و تحقق کو سمجھ کر کہتے ہیں کہ ان تمام مواقع میں فعل 'مضارع بمعنی حال' استعمال ہوا ہے، نہ کہ بمعنی استقبال؟

اس سے قطع نظر اگر اس سے امکان ارادہ کا بیان کرنا ہی مقصود ہوتا تو اس صورت میں آیہ مبارکہ مدح و ستائش اہلبیت عظام میں نہ ہوتی کیونکہ ایسا امکان تو ہر شخص کے بارے میں وجود رکھتا ہے۔

د) وجودِ رجس کا اختتام

''لیذھب عنکم الرجس'' کا جملہ ظاہر کرتا ہے کہ اہلبیت عظام میں رجس بمعنی گناہ وجود رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے پیش نظر ان سے دور ہو چکا اور اب وہ پاک و پاکیزہ ہو چکے ہیں۔ اس قسم کی کوئی تفسیر عقیدۂ تشیع سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ شیعہ ان حضرات کو از مہد تا لحد تمام مدت عمر میں ہر طرح معصوم مانتے ہیں۔

اس اشکال کا جواب بھی بالکل واضح ہے کیونکہ 'اذھاب رجس' کے لیے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی میں رجس و نجاست حتمی طور پر موجود ہو اور پھر بعد میں کسی وقت وہ رجس اور نجاست دور کر دی جائے، بلکہ اس بات کی صداقت کے لیے اس قدر کافی ہے کہ کسی شخص میں قدر گناہ تو موجود ہو لیکن وہ اس کیفیت کو کبھی کام میں نہ لائے۔

اس کی وضاحت اس طرح جانیے کہ ہر انسان جسم و روح، مادہ و معنی، نفس و عقل اور میلانات پست و ارفع لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان میں ہر ایک کیفیت اپنی اپنی خواہش و تقاضا رکھتی ہے۔ انسان کی شخصیت کا نصف حصہ لامتناہی خواہشات اور نفسانی میلانات سے تشکیل پاتا ہے جن کو اگر قابو میں نہ رکھا جائے تو انسان گناہ و انحراف کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اور اس کا انجام رجس میں آلودگی ہوتا ہے چونکہ یہ رجحان تمام

انسانوں میں، معصوم ہوں یا غیر معصوم، موجود ہوتا ہے، عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان رجحانات کو ختم کرے اور اس حد تک ختم کرے کہ معصوم کی زندگی میں اس قسم کے رجحانات کا کوئی اثر باقی نظر نہ آئے۔ مزید وضاحت کے لیے ذیل کی مثال سے مدد لی جاسکتی ہے:

ایک بچہ اپنے ماں باپ سے صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، صحیح ماحول میں پرورش پا کر ایک قوی و طاقتور نوجوان کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہم ایسے بچہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی بیماری و بدنصیبی کو اس کی زندگی سے دور فرما دیا ہے کیونکہ روزِ اول ہی سے کسی قسم کی بدنصیبی یا بیماری کا کوئی سبب اس کی زندگی میں نہ پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ تصور ایک بدنصیب و علیل بچہ یا نوجوان کے بارے میں صحیح ہوگا کیونکہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بیماری اور علالت کے رجحان سب بچوں اور نوجوانوں میں شروع ہی سے موجود ہوں گے۔

اس قسم کے اشکال و شبہات اہل بیت عظام کے بارے میں کوئی وجود نہیں رکھتے، سوائے اس کے کہ پہلے ہی سے ان اشکالات کو ذہن میں جاگزیں کرلیا جائے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم آیہ مبارکہ کی تفسیر کے سلسلہ میں اہم ترین مسئلہ کو بیان کرنے، مفہوم ''اہلبیت'' کی حد بندی کرنے اور پھر ان کے مصادیق کے پیش کرنے سے ابتداء کریں۔

۳: مفہوم ''اہل البیت'' کی حدود

آیہ مبارکہ کی تفسیر و تجزیہ میں اہم ترین مسئلہ مفہوم اہلبیت کی حدود کو سمجھنا ہے۔ اس کے بعد ان کا تعین جو آیت کے نزول کے دن اس کے مصداق تھے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں مفسرین، محدثین یا اس آیہ مبارکہ کی تفسیر لکھنے والے اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں اور انکے قلم میں لغزش پیدا ہوئی ہے۔ چونکہ انھی مقامات پر سب سے زیادہ شبہات پیدا ہوئے ہیں اس لیے ہم سب سے پہلے لفظ اہل البیت کے مفہوم و حدود پر غور کریں گے اور اس کے بعد اس لفظ کے مصادیق کا تعین کریں گے جو آیہ مبارکہ کے نزول کے وقت وہاں موجود تھے۔

لفظ اہل البیت قرآن مجید میں مرکب شکل میں دو موقعوں پر آیا ہے، ایک تو اسی آیہ مبارکہ میں اور دوسرے سورہ ہود آیت ۷۳ میں جہاں فرشتگان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو کہتے ہیں:

''رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ''

''اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکات ہوں تم اہل بیت پر۔''

یہ لفظ دو کلموں یعنی اہل اور البیت سے مرکب ہے۔ ان دونوں کلمات کا مطلب واضح اور ظاہر ہے۔ اس لیے عربی لغت مرتب کرنے والوں کے اقوال بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر ان دونوں کلمات کی ترکیب سے ان کی وضاحت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

لفظ اھل کی اصل اگرچہ عربی ہے تاہم اس کے ہماری زبان میں استعمال اور مدت مدید سے اس سے مانوس ہونے کی وجہ سے یہ ہماری زبان کے کلمات و الفاظ کا ہم ردیف بن چکا ہے۔ چونکہ ہماری زبان میں اس کے لیے کسی متبادل لفظ کا استعمال مفید نہ ہوتا، پھر وہ اس سے زیادہ واضح بھی نہ ہوتا، لہٰذا بصورتِ مضاف اس کے تمام محل استعمال اس کے مفاد واقعی کی خبر دے سکتے ہیں۔

عرب لفظ "اھل" کا اس طرح استعمال کرتے ہیں:

اَهْلُ الْاَمْرِ	حکمران	
اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ	(مائدہ:۴۷)	پیروانِ انجیل
اَهْلُ الْكِتٰبِ	(آل عمران:۶۴)	کتب آسمانی کے پیرو
اَهْلُ الْاِسْلَامِ	دین اسلام کے پیرو	
اَهْلُ الرَّجُلِ	کسی کے ساتھ کسی قسم کا نسبی وحسبی رشتہ رکھنے والے	
اَهْلُ الْبَيْتِ	وہ افراد جو کسی گھر میں مشترک صورت میں رہتے ہوں	
اَهْلُ الْمَآءِ	پانی میں رہنے والی مخلوق	

تأھل عربی زبان میں ازدواج کے معنی میں آتا ہے، جو 'تغرب' (کنوارا) کا الٹ ہے۔

بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں لفظ 'آل' لفظ 'اھل' کے دوش بدوش استعمال ہوتا ہے۔ اہل لغت کے مطابق دونوں کی اصل اہل ہی ہے۔ اس کی 'ھ' ہمزہ میں تبدیل ہو کر 'أأل' بنی اور دوسرا ہمزہ الف میں تبدیل ہوا جس سے لفظ آل کی شکل سامنے آئی۔[۱]

حضرت عبد المطلب نے مکہ مکرمہ پر ابرہہ کے حملہ کے دوران کعبہ کے دروازہ کے حلقہ کو ہاتھ میں پکڑا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ صلیبیوں کے حملہ کو حرم کی سرزمین سے دفع فرمائے۔ آپ نے عرض کی:

"وانصر علی ال الصلیب ...... وعابدیه الیوم الك"۔[۲]

''اہل صلیب کے خلاف ہماری مدد فرما............اس کی عبادت کرنے والے تیری آل اور اہل ہیں۔''

اس کلمہ کے محل استعمال میں غور کرنے سے اس کے مطلب کی حدود کی مندرجہ ذیل تشریح کی جاسکتی ہے۔

ہر انسان جو کسی موضوع (مضاف الیہ) کی نسبت کسی قسم کا انتساب یا خصوصیت اور الفت وانس رکھتا ہو تو اس کو اس شے کا اہل کہتے ہیں۔ اس بنا پر 'ابن منظور' لسان العرب میں کہتا ہے: "اھل الرجل اخص الناس به" 'کسی شخص کے ساتھ خصوصی رشتہ رکھنے والے لوگ اس کے اہل کہلاتے ہیں'۔

دوسرے لفظوں میں جب 'اھل الرجل' کہا جائے تو اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کسی سے وابستہ ہوں اور اس کے متبعین اور متعلقین میں شمار ہوتے ہیں۔

اس تشریح کے پیش نظر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ لفظ وسیع معانی کا حامل ہے اور اس لفظ میں جس طرح کسی شخص کی اولاد شامل ہے

---

[۱] لسان العرب، ج ۱۱ ص ۲۸-۳۰

[۲] تاج العروس، 'مادہ اہل'

اسی طرح اس کی بیوی یا بیویاں بھی شامل ہیں۔ امام مسلم اپنی 'صحیح' میں حضرت زیدؓ بن ارقم صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان 'خم' کے مقام پر خطبہ دیا اور اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید اپنے اہل بیت سے تمسک کرنے کا حکم دیا۔

جب زیدؓ بن ارقم آنحضرتؐ سے اپنی اس روایت کو ختم کر چکے تو ''حصین'' نامی ایک شخص نے ان سے دریافت کیا: ''اہلبیت پیغمبر کون ہیں؟ کیا آنحضرتؐ کی ازواج اہلبیت سے نہیں ہیں؟''

زید نے کہا: ''خدا کی قسم! نہیں۔ بیوی ایک عرصہ تک مرد کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ پھر مرد اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ اپنے باپ اور دیگر رشتہ داروں کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔'' [۱]

ظاہر ہے کہ یہ تشریح اہلبیت عظام کے مقام بلند و ارفع کی شاہد ہے۔ اگر اس حقیقت سے صرف نظر بھی کر لیں تب بھی انسان کی ازواج صرف اس وقت تک اس میں شامل ہو سکتی ہیں جب تک وہ اپنے شوہر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک رہتی ہیں۔ اس کے بعد نہیں۔

ہمیں اس بدزبان و بداندیش مولف پر حیرت ہے جس نے اس معاملہ کو معکوس اور اس کے الٹ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''لفظ اہلبیت صرف کسی شخص کی بیوی کے لیے بولا جاتا ہے، البتہ صرف مجازی طور پر اولاد اور رشتہ داروں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔'' [۲]

یہ شخص اس بات کو اہل لغت کے کلمات کے نتیجہ کے طور پر بیان کرتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ اہل لغت کے کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے)۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ یہ جملے نقل کرتے ہیں:

''وللنبی ازواجه و بناته یعنی آنحضرتؐ کے اہل بیت آپؐ کی ازواج اور دختران پر مشتمل ہیں۔''

شارح قاموس سے نقل کرتا ہے:

''والاهل للرجل زوجه و یدخل فی اولاده یعنی ایک مرد کی 'اھل' اس کی زوجہ ہوتی ہے اور اس کی اولاد بھی 'اھل' میں داخل ہے۔''

لسان العرب سے نقل کرتا ہے:

''اهل الرجل اخص الناس به ی عنی کسی شخص کے مخصوص و مقرب افراد اس کی 'اھل' ہوتے ہیں۔''

مجمع البحرین میں کہتا ہے:

''اهل الرجل اله وهم اشیاعه و اتباعه یعنی کسی شخص کے اھل اس کے متوسلین اور متعلقین ہوتے ہیں۔''

پھر اقرب الموارد میں کہتا ہے:

''اهل الرجل عشیره و اقربا یعنی کسی شخص کے اھل اس کے عزیز و اقربا ہوتے ہیں۔''

---

[۱] صحیح مسلم، ج ۷، باب فضائل علی، ص ۱۲۲، جامع الاصول، ج ۱، ص ۱۰۳

[۲] الشیعه و اهل البیت، ص ۱۶

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ نہ کہیں کہ اہل بیت صرف وہ افراد ہوتے ہیں جو کسی شخص کے ساتھ ایک محکم واستوار رشتہ میں منسلک ہوں تو یقیناً اس کا الٹ بھی نہیں کہہ سکتے (یعنی اس لفظ میں پہلے ازواج اور پھر اولاد............وہ بھی بصورتِ مجاز...........شامل ہیں)۔ لہٰذا اگر بعض اہل لغت نے "اھل الرجل" کو زوجہ کے معنی دیئے ہیں تو اس سے مثال ونمونہ مراد ہے ورنہ اس کے برعکس جو بھی گھر کے مالک سے کسی قسم کا رشتہ یا تعلق رکھتا ہے وہ اس کے اہلبیت میں قرار پائے گا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی اولاد یقیناً اس کے اہل بیت میں شمار ہوتی ہے۔اب سوال ازواج کا باقی رہ جاتا ہے۔لغت وقرآن کے نظریہ سے اس لفظ میں ازواج بھی شامل ہوسکتی ہیں جس پر درج ذیل آیات شاہد ہیں:

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ﴿۳۳﴾ (عنکبوت: ۳۳)

"ہم تمھیں اور تمہارے اہل خانہ کو نجات دیں گے سوائے تمہاری بیوی کے جو ہلاک ہونے والوں میں ہے۔"

لفظ 'اھلک' سے 'امراتک' کا استثناء اس بات کی واضح علامت ہے کہ بیوی بھی اس میں شامل ہے اور کوئی دلیل نہیں کہ اس استثناء کو ہم استثنائے منقطع خیال کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے مصر آتے ہوئے راستہ میں دور سے آگ نظر آتی ہے اور فرماتے ہیں:

قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ (قصص: ۲۹)

"اپنے گھر والوں سے کہا یہاں ٹھہرو! میں اس جگہ سے جہاں آگ روشن ہے، کوئی خبر لے کر آتا ہوں۔"

سورۃ 'الذاریات' کی چھبیسویں آیت بھی اسی مضمون کی ہے جس میں حضرت ابراہیم کے بارے میں فرماتا ہے:

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ﴿۲۶﴾ (الذاریات: ۲۶)

"(حضرت ابراہیم) اپنے اہل خانہ کی طرف گئے اور (اپنے مہمانوں کے لیے) ایک موٹا تازہ بچھڑا لے آئے۔"

یہ اور ایسی ہی دوسری آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ ایک شخص کی بیوی بھی اس کے اہل خانہ کا ویسا ہی حصہ ہے جیسا کہ اس کی اولاد اس کے اہل خانہ میں شمار ہوتی ہے۔

مصداق کے لحاظ سے تحدید اہلبیت

یہاں تک تو ہم لفظ 'اہلبیت' کو بہ لحاظ مفہوم لفظی واضح کر سکے۔اب ہم آیت کے روزِ نزول کے مصادیق کو بیان کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خود آیہ مبارکہ میں یا اس کے باہر اس کے وسیع مفہوم کی مخصوص افراد کے ساتھ تخصیص پر کوئی دلیل نہ پائی

جائے تو پھر ضروری ہوگا کہ ان تمام افراد کو جو اس مفہوم کے دائرے میں آئے ہیں، اس میں شامل کریں اور کہیں کہ اس سے مراد وہ تمام افراد ہیں جو کسی قسم کا بھی نسبی یا حسبی رشتہ آنحضرتؐ سے رکھتے ہیں یا جو کسی اعتبار سے بھی آنحضرتؐ کے خانہ اقدس کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔ تاہم اگر قرائن قاطع بعض معین افراد کی تخصیص کی گواہی دیں اور خود آیہ مبارکہ یا پیغمبر اکرمؐ کے ارشادات اس جماعت کے تعین کے شواہد پر دلالت کریں تو پھر اس صورت میں ان حضرات سے ہرگز تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

مصادیق کے محدود ہونے کے قرائن

داخلی اور خارجی دونوں طرح کے قرائن واضح طور پر گواہی دیتے ہیں کہ اہل بیتؑ سے مراد ایک بالکل معدود جماعت ہے جس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات اور آپ کے دیگر متعلقین ہرگز شامل نہیں ہیں۔ ہم ان تمام قرائن کو بالترتیب بیان کرتے ہیں تاکہ مطلب اصلی کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

الف) بیت سے مقصود کیا ہے؟

سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ 'البیت' کے الف اور لام کس قسم کے ہیں؟ کیا یہ 'الف ولام' جنس کا ہے، یا استغراق کا، یا عہد کا؟ ظاہر ہے کہ بے شک احتمال اول بالکل رد کر دینے کے قابل ہے کیونکہ اس صورت میں 'الف ولام' اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی طبیعی خصوصیت بیان کرنا مقصود ہو۔ مثلاً "الرجل خیر من المرئة" (مرد عورت سے بہتر ہوتا ہے) یا "الجرادة خیر من تمرہ" (ٹڈی دل کھجور کے دانہ سے بہتر ہے۔) اب آیہ مبارکہ کا مطلب جنس بیت یعنی گھر سے متعلق افراد کی طبائع کے حکم کو بیان کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح احتمال دوم بھی مراد نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مناسب یہ تھا کہ آغاز آیت "وقرن فی بیوتکن" کی طرح یہاں بھی مفرد کی جگہ جمع کا صیغہ لایا جاتا اور 'اہل البیوت' کہا جاتا۔ ان حالات میں احتمال سوم ہی صحیح ہے اور کہنا پڑے گا کہ متکلم و مخاطب کے درمیان معہود گھر ہی متکلم کا مورد نظر ہے اور یہ معہود گھر حضرت علی علیہ السلام اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کے علاوہ کوئی گھر نہیں جس کا آیہ مبارکہ میں ذکر ہو رہا ہے اور اسی پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ اس حقیقت میں وہ خارجیوں 'عکرمہ و مقاتل' کے سوا اور کسی محدث و مفسر نے شک نہیں کیا، نہ ہی اس بات کی تردید کی ہے کہ اس آیت سے مراد صرف یہی مقدس گھر ہے۔ ان کے اختلافات دوسرے افراد کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ چونکہ آیہ مبارکہ کے پیش نظر صرف ایک خانہ معہود کے علاوہ دوسرا کوئی گھر نہیں، اس لیے فطری طور پر یہ خانہ علی علیہ السلام ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دوسرے افراد کو اس میں شامل کرنے سے الف ولام کے متعلق یہ 'عہد' ہونے پر ابطال لازم آئے گا۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ آیہ مبارکہ صرف ایک بیت معہود اور مشخص کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور ایسا گھر سوائے بیت امام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو وسعت دینے کا ہر احتمال مسلمانوں کے اتفاق مخالفت یا 'البیت' کے معہود ہونے کی نفی کو مستلزم ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس سے صرف ام المومنین حضرت عائشہؓ یا ام المومنین حضرت حفصہؓ کا گھر مراد ہے تو پھر اس صورت میں بیت فاطمہ سلام اللہ علیہا آیت کی حدود

سے خارج ہو جائے گا، جو مسلمانوں کے متفقہ اعتقاد کے خلاف ہے۔ اگر کہیں کہ دونوں گھر اس میں شامل ہیں تو یہ بات الف و لام کے بطور عہد استعمال ہونے کو باطل کر دے گی۔

تاہم ان روایات کے پیش نظر جن کے مطابق کہا جاتا ہے کہ آیہ مبارکہ ام المومنین جناب ام سلمہ کے گھر میں اتری، کہا جا سکتا ہے کہ 'البیت' سے مراد حضرت ام سلمہ کا گھر ہے جس میں مخصوص افراد کے سروں پر کسا ڈالے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ آیہ مبارکہ اس گھر میں موجود افراد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر آنحضرتؐ جناب ام سلمہ کو مستثنیٰ نہ کرتے تو وہ بھی آیہ مبارکہ کے مصادیق میں یقیناً شامل ہوتیں۔

ب) ''البیت'' سے بنیاد اور عمارت مراد نہیں

سابقہ دلیل کی بنیاد اس بات پر تھی کہ 'البیت' سے اینٹ اور مٹی کا گھر مراد ہے، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر 'البیت' سے اینٹ اور مٹی کا گھر امراد نہیں ہے بلکہ اس سے بیت نبوۃ، مرکز وحی اور محل نزول نورِ الٰہی مراد ہے۔

بیت بمعنی اینٹ اور مٹی سے بنا ہوا گھر اور 'اھل بمعنی وہ لوگ جو بعض حالات میں وہاں اکٹھے رہتے ہیں، اس آیہ مبارکہ کی ابتداء سے ظاہر ہے، یعنی وہ گھر جہاں قرآن مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے گھروں کے اندر زندگی بسر کریں اور سابق کے دورِ جاہلیت کی عورتوں کی طرح مجمع عام میں ظاہر نہ ہوں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى (احزاب: ۳۳)

''اور اپنے گھروں کے اندر رہو اور سابقہ دورِ جاہلیت کی طرح باہر نہ نکلو۔''

اس آیہ مبارکہ کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حجروں میں ہر وہ حجرہ بیت کہلائے گا جس میں کوئی بی بی رہائش پذیر تھی۔ اس بارے میں حکم ہو رہا ہے کہ ہر بی بی اس میں ہی رہے اور غیر مناسب طریقہ سے گھر سے باہر نہ نکلے۔ ظاہر ہے کہ اس آیہ میں 'بیوت' یا گھروں کے مسائلہ کو پیش نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس آیہ مجیدہ 'بیت''، یعنی ایک ہی گھر اور ان لوگوں کا ذکر کرتی ہے جو کسی بھی نوعیت سے اس گھر میں رہتے یا اس گھر سے کسی نسبت سے رابطہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں یہ کہنا لازم آئے گا کہ 'البیت' سے مراد ایک بیت معنوی و غیر مادی ہے جس کو ہم 'بیت النبوت' یا 'بیت الوحی' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح 'معقول' کو 'محسوس' پر قیاس کرتے ہوئے ''نبوت و وحی'' جیسے امورِ معنوی کے لیے ہم بیت، گھر، مسکن اور محل و مقام جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اس کو 'بیت النبوۃ' کہتے ہیں۔

اس مفروضہ کی بناء پر یہ لفظ اپنے اندر صرف ایسے اشخاص کو شامل کرتا ہے جو طہارت و پاکیزگی کے اعتبار سے اور علم و دانش کے اعلیٰ معیار سے ایسی منزل پر ہوں کہ حقیقتاً ان کو اس بیت کا اہل اور اس خاندان کے افراد قرار دیا جا سکے۔ اس قسم کے انتساب میں صرف رشتہ مادی ہی پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ اس سے رشتہ معنوی بھی ظاہر ہوتا ہے جس سے اتنے اشخاص ہی مراد ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جا سکے۔

اس بحث کے پیش نظر آیہ مبارکہ (اہل البیت) میں 'البیت' کی طرف 'اہل' کی اضافت اسی طرح ہے جس طرح یہی اضافت 'الکتاب'

اور 'الانجیل' کے ساتھ قرآن کریم میں وارد ہوتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو کتاب یا بالخصوص انجیل کے ساتھ کسی قسم کا تعلق ورشتہ رکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ (آل عمران: ٦٤)

''کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ہم اس کلمہ کے گرد جمع ہو جائیں جو ہمارے درمیان مشترک ہے۔''

علیٰ ہذا القیاس:

وَلۡیَحۡکُمۡ اَہۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فِیۡہِ ؕ (مائدہ: ٤٧)

''اہل انجیل اس کے مطابق حکم کریں جو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔''

یعنی اہل انجیل وہ لوگ ہیں جو کتاب انجیل کے ساتھ کسی قسم کی نسبت رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ 'البیت' سے مراد بیت نبوت، محل وحی اور مرکز تنزیل ہے۔ لہٰذا 'اھل' سے مراد صرف وہ افراد ہیں جو فکری و روحانی طور پر بیت نبوت اور خانہ وحی کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا اس لحاظ سے رابطہ و تعلق رکھتے ہیں کہ وہ ان امور کا مرکز ہے۔ اس سے ہرگز وہ شخص مراد نہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی مادی و نسبی و حسبی رشتہ اور تعلق رکھتا ہو خواہ وہ فکری و روحانی اعتبار سے ان کا بالکل مخالف ہو اور نہایت پست معیار پر ہو۔

علامہ زمخشری سورۂ ہود کی آیت تہتر (٧٣) کی تفسیر میں اسی نکتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی اس بحث کو سورۂ مبارکہ احزاب میں بھی یاد رکھتے تو ان کی فکر درست تر اور بہتر ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتگانِ خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی زوجہ جناب سارہ کو خبر دیتے ہیں کہ وہ جلد ہی اسحٰق نامی فرزند سے حاملہ ہوں گی۔ جناب سارہ فرماتی ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ مجھ جیسی بوڑھی خاتون ایک بوڑھے شوہر سے صاحب اولاد ہو جائے؟ اس پر فرشتے جواب دیتے ہیں:

اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۷۳﴾ (ھود: ٧٣)

''کیا آپ خداوند تعالیٰ کے حکم و فرمان پر تعجب کرتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکات آپ اہلبیت پر ہیں۔ وہ یقینا حمید و مجید ہے۔''

صاحب کشاف اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ حضرت سارہ آیات الٰہی کے خانہ نزول، مرکز اعجاز اور امور خارق عادت میں رہتی تھیں۔ لہٰذا مناسب تو یہ تھا کہ ت عجب و حیرت کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتیں۔ پھر فرشتگان خدا **رحمت اللہ و برکاتہ علیکم اھل البیت** کے جملہ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے معجزات و کرامات کے ذریعہ آپ لوگوں کو معزز قرار دیا ہے اور اپنی

نعمات کی تم پر ارزانی کی ہے۔لہٰذا تمھیں تعجب نہ کرنا چاہیے۔[1]

لہٰذا ان تمام مواقع میں بیت سے محل نبوت، مرکز وحی اور مقام رسالت کی طرف اشارہ ہے اور اس قسم کے مکین کو ایسا ہونا چاہیے جو ہر لحاظ سے صاحب نبوت سے متناسب اور ہم آہنگ ہوں۔صرف نسبی وحسبی انتساب روحانی وفکری ہم آہنگی کے بغیر ہرگز کافی نہیں۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ ایک تفصیلی مذاکرہ میں جو حضرت ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام اور قتادہ بن دماعہ بصری کے درمیان واقع ہوا، خود قتادہ نے اپنی طبع عربی سے درک کیا کہ آیہ مبارکہ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ (نور: ۳۶) میں بیوت کے لفظ سے پتھر اور مٹی کے گھر مراد نہیں ہیں۔ابوحمزہ ثمالی کا بیان ہے کہ امام علیہ السلام نے قتادہ سے فرمایا:

"ويحلك اتدری این انت، انت بین یدی بیوت اذن الله ان ترفع ... فانت ثم و نحن اولئك"

''کیا تو جانتا ہے کہ تو کہاں ہے؟ تو ایسے گھروں کے سامنے ہے جن کو خداوند عالم نے رفعت پیدا کرنے کا اذن عطا فرمایا ہے۔اے قتادہ! تو وہاں ہے اور ہم انھی مکانوں اور گھروں کے اندر ہیں۔''

اس کے بعد قتادہ امام علیہ السلام کی تصدیق کے لیے کھڑا ہو گیا اور آپ کی تائید میں اس نے کہا:

"صدقت والله جعلنی الله فداك و الله ماهی بیوت حجارة ولاطین"

''آپ نے سچ فرمایا۔اللہ تعالیٰ مجھے آپ کا صدقہ قرار دے۔یہ گھر پتھر و مٹی کے گھر نہیں ہیں۔''

یعنی ان سے مراد وہ حضرات ہیں جو بیت نبوت اور شجرۂ رسالت سے نسبت رکھتے ہیں۔[2]

یہ مطلب نزول آیہ مبارکہ کے وقت اگر قطعی ویقینی نہ بھی سمجھا گیا ہوتا ہم مرورِ زمانہ سے لفظ 'اھل البیت' بیت نبوت کے معنی میں تعین پیدا کر چکا ہے اور اب تک یہی کیفیت برقرار ہے کہ اس لفظ کے اس سے مختلف معنی کسی طرح ذہن میں نہیں آتے۔

ج) مذکر ضمائر کا استعمال

قرآن مجید سورۂ مبارکہ احزاب میں اٹائیسویں آیت سے چونتیسویں آیت تک ازواج رسول کے بارے میں بحث وگفتگو پیش کرتا

---

[1] کشاف، ج۲،ص۱۷: ان هذه و امثالها مما یکرمکم به رب العزة و یخصکم بالانعام به یا اهل بیت النبوه فلیست بمکان تعجب۔

[2] فروع کافی، ج۶ص۲۵۶، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ

ہے۔ان تمام آیات مجیدہ میں عربی زبان کے قواعد کے مطابق ازواج مطہرات کے لیے مونث ضمیریں استعمال کی گئیں ہیں۔ان آیات میں بیس سے زیادہ مونث ضمیریں آئی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُنَّ فَتَعَالَيْنَ، اُمَتِّعْكُنَّ، اُسَرِّحْكُنَّ، تُرِدْنَ، لَسْتُنَّ اِتَّقَيْتُنَّ، فَلَا تَخْضَعْنَ، قُلْنَ، قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ، تَبَرَّجْنَ اٰتِيْنَ، اَطِعْنَ، وَاذْكُرْنَ ......"

لیکن جونہی آیہ زیر بحث آتی ہے جو تینتیسویں (۳۳) آیت کا حصہ ہے تو یکا یک گفتگو کا لہجہ و انداز بدل جاتا ہے، مخاطب تبدیل ہو جاتا ہے اور مذکر ضمیروں کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے: "عنکم الرجس" اور "یطھر کم"۔ان حالات میں غور کرنا پڑے گا کہ اس تبدیلی سے کیا مراد ہے؟

یہ تبدیلی اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتی کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے علاوہ کسی اور جماعت کے لیے نازل ہوئی ہے، اگرچہ ازواج عالیات سے متعلق آیات کے سیاق میں واقع ہے۔سوچنا ہوگا کہ اس مداخلت کا راز کیا ہے۔کیا وجہ ہے کہ ازواج رسولؐ سے متعلق گفتگو میں اچانک محل خطاب بدل جاتا ہے اور ان سے مختلف لوگوں سے متعلق بات درمیان میں آ جاتی ہے۔پھر اس کے بعد دوسری مرتبہ ازواج عالیات کے بارے میں بات ہونے لگتی ہے؟ ہم فی الحال اس بارے میں بحث نہیں کرتے اور اس کو آئندہ پر اٹھار کھتے ہیں۔

جو لوگ اس آیت کے ازواج رسولؐ سے متعلق ہونے پر مصر ہیں، ضمائر کے مذکر ہونے کی توجیہہ میں بعض ایسے تکلفات سے دو چار ہیں جن کے نقل کرنے میں وقت صرف کرنا چنداں سود مند نہیں۔

د) ارادۂ تکوینی کا مسئلہ

ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ آیہ مبارکہ میں وارد شدہ ارادہ تکوینی ہے، تشریعی نہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ ایسا ارادہ ہے جس کے مطلوبین قطعی طور پر متحقق ہیں۔یہ ایسا ارادہ نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے یا اس کے مطلوبین کے بارے میں کہا جائے کہ ان کا متحقق ہونا ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو پائے۔یعنی یہ ارادہ آسمانوں اور زمین کی خلقت سے متعلق ارادہ کی مانند ہے جس میں ارادہ اپنی مراد سے ہرگز علیحدہ نہیں ہوتا۔یہ ارادہ مکلفین سے ایمان اور تقویٰ یا نماز و روزہ کی ادائیگی کے ارادہ کی طرح نہیں جو کہیں موثر ہوتا ہے اور کہیں موثر نہیں ہوتا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اس آیہ مبارکہ میں مراد، جس کا تعلق روحانی نجاستوں، معنوی آلودگیوں اور گناہ و تجاوز سے پاکیزگی سے ہے، قطعی طور پر متحقق ہے۔یعنی آیہ مبارکہ میں مذکورہ "اہل البیت" ہر قسم کے گناہ سے محفوظ اور تجاوز و انحراف سے پاک و منزہ ہیں۔پس اس مفہوم کے مصادیق کو بہت ہی محدود اور معدود ہونا لازم ہے۔یعنی یہ بالکل نہیں کہا جا سکتا کہ جو لوگ کسی طرح بھی کسی قسم کا نسبی و حسبی رشتہ بیت نبوت سے رکھتے ہوں۔اس آیہ مبارکہ کے مفاد میں شامل ہوں گے۔علاوہ ازیں کسی شخص نے بھی (اہل بیت عصمت کے علاوہ) کسی اور کے لیے عصمت کا دعویٰ نہیں کیا۔

تعارف ''اہل البیت'' بزبانِ رسول اکرمؐ

آیہ مبارکہ کے متن میں ایسے قرائن موجود ہیں جو'اہل البیت' کے مصادیق سے پردہ اٹھاتے ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ صرف مختصر تعداد میں ہی اس کے مصداق ہوسکتے ہیں اگر آیہ مجیدہ ان کے اسمائے گرامی اور دیگر مشخصات پر انگلی نہیں رکھتی۔لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصادیق کے تعین کے لیے احادیث اسلامی اور ارشاداتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے اور اس مشکل کو اس طریقہ سے حل کر کے ان حضرات کو اچھی طرح پہچان لیا جائے۔

خوش قسمتی سے اس سلسلہ میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں جن سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے۔ان روایات کو دو عظیم مفسرین و محدثین نے اپنی کتب تفسیر میں نقل کیا ہے۔تمام روایات کا ان کے اسناد و متون کے ساتھ درج کرنا گفتگو میں بہت زیادہ طوالت کا باعث ہوگا۔اس لیے ہم صرف اسی قدر کہتے ہیں کہ طبری نے اپنی تفسیر کی جلد ۲،صفحہ ۵-۷ میں سترہ احادیث اور جلال الدین سیوطیؒ نے 'الدر المنثور' ج ۵،ص ۱۹۸،۱۹۹ میں چودہ احادیث نقل کی ہیں۔ان سب احادیث کی اسناد صحابہ کرام اور تابعین تک پہنچتی ہیں۔ان احادیث کا ایک حصہ احادیث صحیح میں شمار ہوتا ہے۔ان احادیث کے طرائق کی کثرت کے پیش نظر اسناد روایات کی تحقیق کی ضرورت نہیں،خصوصاً جبکہ صدیوں سے تفسیر و حدیث اور تاریخ کے نامور علماء نے ان احادیث کو قبول کیا ہے اور انھیں بطور دلائل استعمال کیا ہے۔مذکورہ کتب میں ان احادیث کی طرف رجوع کرنے سے، جو آیہ مبارکہ کے موارد کے طور پر پیش کی گئی ہیں،ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ گنے چنے حضرات جو خداوند عالم کے ارادۂ تکوینی کے زیر حکم گناہ و انحراف سے محفوظ ہیں،پنجتن پاک پر مشتمل ہیں،یعنی خود جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،حضرت امیر المومنین علیہ السلام، جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا سیدۃ النساء العالمین، دو فرزندان رسولؐ حضرات حسن مجتبیٰ اور حسین سید الشہداء،سلام اللہ علیہم اجمعین۔ ان احادیث کے برعکس بھی دو حدیثیں منقول ہوئی ہیں جو بعد میں مورد تحقیق و بحث قرار پائیں گی۔

ان احادیث میں سے چند ایک کے متن نقل کرنے سے پہلے ہم صحابہ کرام اور تابعین میں سے بعض شخصیات کے اسمائے گرامی یہاں پیش کرتے ہیں جنھوں نے ان احادیث کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے:

محمد ابن جری طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تفسیر میں سترہ احادیث کو ان حضرات سے روایت کیا ہے جن میں سے چھ احادیث کی اسناد حضرت ام المومنین ام سلمہ سلام اللہ علیہا تک پہنچتی ہیں:[1]

۱:ابوسعید خذریؓ ۲:انس بن مالکؓ

۳:ابواسحق ۴:واثلۃ الاسقع

۵:ابوہریرۃؓ ۶:ابوالحمراء

---

[1] تفسیر طبری، ج ۲۲،ص ۵-۷

۷: سعد بن ابی وقاصؓ　　۸: علی بن الحسین

۹: عائشہ صدیقہ، رضوان اللہ علیہم

جلال الدین سیوطی نے الدر المنثور [1] میں اپنی چودہ احادیث کو مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ جناب عبداللہ ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ان تمام روایات کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آیہ مبارکہ کے مفہوم کو انھوں نے انہی پنجتن پاک میں منحصر کیا ہے۔ان حالات میں کیا یہ مناسب اور ممکن ہوسکتا ہے کہ آیہ مبارکہ کی تفسیر میں ان تمام روایات کو نظر انداز کر کے بے توجہی سے ان کے پاس سے گزر جائیں؟ اگر ان روایات کا عشرِ عشیر بھی کسی اور کے بارے میں وارد ہوا ہوتا تو ہم ان سب کو پیش کرتے اور بلحاظ مصادیق آیت کے ابہام کو دور کرتے۔ پھر اگر ہم روایات کے اس سلسلہ میں روایات کے اس سلسلہ کو بھی شامل کر دیں جن کو علماءِ شیعہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم اور پاک دامن فرزندوں سے روایت کیا ہے تو یہ مسئلہ 'بداہت' کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اس میں شک وشبہ کا مطلب فرزندانِ رسول اکرمؐ کے فضائل کی مخالفت وخصومت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔

شیعہ محدثین نے بیشمار احادیث اس آیہ مبارکہ کی شانِ نزول میں درج کی ہیں جو سب پنجتن پاک سے متعلق ہیں۔ ہم مختصراً ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سید ہاشم بحرانی، متوفی ۱۱۰۷ھ نے کتاب غایۃ المرام صفحات ۲۸۷ تا ۲۹۲ پر اہل تسنن کی کتب سے اکتالیس اور چونتیس احادیث شیعہ کتب سے نقل کی ہیں۔اسی طرح کتاب تفسیر برہان، جلد ۳، صفحات ۳۰۹ تا ۳۲۵ پر پنیسٹھ احادیث کی روایت کی ہے۔

شیخ عبد علی عروسی نے تفسیر نور الثقلین، جلد ۴، صفحات ۲۷۰ تا ۲۷۷ پر پچیس احادیث نقل کی ہیں۔

ان احادیث کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 'اھل البیت' کے مصادیق کی حدود کو متعین کرنے کے لیے دو قسم کے عمل اختیار فرمائے جن میں ہر ایک اپنے مقام پر اہم اور جاذب نظر ہے:

۱: آنحضرتؐ نے کساء، عباء یا چادر پنجتن پاک کے سروں پر ڈالی۔ حضرت ام سلمہ کو، جو کساء میں داخل ہونے کا قصد رکھتی تھیں، اس کے اندر آنے سے روکا اور یہ جملہ فرمایا: ''خدایا! یہی ہیں میرے اہل بیت۔ پروردگار! ان سے ہر قسم کی نجاست کو دور فرما۔''

۲: آٹھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ تک صبح کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جاتے ہوئے آنحضرتؐ دروازہ سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا کو کھٹکھٹاتے، ان سب کو نماز کے لیے بلاتے اور اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرماتے۔

اس طرح جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دو طریقوں سے اس آیہ مبارکہ کے مصادیق کو واضح کرتے رہے۔ اب ہم اختصار کے ساتھ چند ایک احادیث کا ترجمہ اور بعض کا متن پیش کرتے ہیں:

۱: ابو سعید خدری فرماتے ہیں:

---

[1] الدر المنثور، ج ۵، ص ۱۹۸، ۱۹۹

"قال رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) نزلت هذه الایة فی و فی علی وفاطمة و حسن و حسین۔"

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت میرے، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔''

۲: ام المومنین جناب ام سلمہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں: ''یہ آیہ مبارکہ میرے گھر میں نازل ہوئی۔ اس روز جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا آنحضرتؐ کے لیے کھانا لائیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جاؤ! اپنے عم زاد علی اور اپنے دونوں بیٹوں کو بلا لاؤ۔ جناب سیدہ طاہرہ اس طرح آنحضرتؐ کے حضور تشریف لائیں کہ اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھیں اور حضرت علی علیہ السلام ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

''آنحضرتؐ نے حسنین کو اپنی آغوش میں بٹھا لیا۔ حضرت علی آنحضرتؐ کے دائیں جانب، سیدہ بائیں طرف تشریف فرما ہوئیں اور پانچوں حضرات اس کھانے کو تناول فرمانے میں مصروف ہوگئے جو رسول اکرمؐ کی دختر نیک اختر پکا کر آنحضرتؐ کے حضور لائی تھیں۔ اچانک وحی الٰہی نازل ہوئی اور آیہ تطہیر کا نزول ہوا۔ اس وقت آنحضرتؐ نے اس چادر کو، جسے رات کو اوڑھا کرتے تھے، اوپر اٹھایا اور ان سب حضرات کو چادر کے نیچے لے لیا، اپنے دست مبارک کو چادر سے باہر نکالا، آسمان کی طرف اشارہ کیا اور تین بار یہ الفاظ ادا فرمائے:

"اللهم ان هولاء اهل بیتی وخاصتی فاذهب عنهم الرجس و طهرهم تطهیراً"

''خداوندا! بے شک صرف یہی میرے اہل بیت ہیں اور میرے خواص ہیں۔ پس ان سے ہر قسم کے رجس اور نجاست کو دور فرما دے اور انھیں حد یقین تک پاک و طاہر بنا دے۔''

''میں نے یہ جملہ سنتے ہی چاہا کہ اس چادر کے نیچے آجاؤں اور اس فضیلت میں شامل ہو جاؤں۔ پس میں نے چادر کا ایک کونہ اٹھایا تاکہ ان میں ضم ہو جاؤں۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس کو میرے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ میں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں آپؐ کے اہلبیت کا حصہ نہیں ہوں؟''

آنحضرتؐ نے بغیر اس کے کہ میری بات کی تصدیق فرمائیں، ارشاد فرمایا:

"انك علی خیر انك من ازواج النبی"

''تو بے شک ایک اچھی خاتون ہے اور ازواج پیغمبرؐ سے ہے۔''

حدیث شریفہ کا یہ مضمون جو کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے، اس بات پر کاملاً شاہد ہے کہ یہ آیہ مجیدہ خصوصیت کے ساتھ ان پانچ

حضرات کے لیے ہے اور ان پنجتن کے علاوہ اس فضیلت میں کوئی شخص شامل نہیں حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی بہترین اور پاکیزہ ترین زوجہ بھی اس فضیلت میں شرکت نہیں رکھتیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روایت کے مطابق چالیس روز تک، دوسری روایت کے مطابق آٹھ ماہ تک اور تیسری روایت میں نو ماہ تک، جب نمازِ صبح کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے تو حضرت علی علیہ السلام کے خانہ اقدس پر آتے اور فرماتے "الصلاۃ الصلاۃ، انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا۔"

یہی حدیث ابوسعید خدری اور ابی الحمراء سے بھی منقول ہے اور ان کی روایت کے متن "الدر المنثور" میں موجود ہیں۔

سید علوی حداد مولف کتاب "القول الفصل فیما لبنی ھاشم و قریش من الفضل" ج۹،ص۸۴ پر لکھتے ہیں:

"حضرت ام سلمہ سلام اللہ علیہا کی حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں، ترمذی نے جامع میں، احمد نے مسند میں، نسائی وطبرانی نے معجم کبیر میں، ابن جریر وابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ایک پوری جماعت نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اصحاب رسولؐ حضرات علی وحسنین، عبداللہ ابن جعفرؓ، ابن عباسؓ، ام سلمہؓ، عائشہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، انس بن مالکؓ، ابوسعید خدری، ابن مسعود، معقل ابن یسار، واثلہ بن الاسقع، عمر ابن ابی سلمہ اور ابوالحمراء جیسے پندرہ حضرات نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔"

ان تمام روایات کی موجودگی میں بھی کیا آیہ مجیدہ کے لیے کوئی مفہوم یا تفسیر تلاش کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ لاہور (پاکستان) کے ماہنامہ "ترجمان الحدیث" کے مدیر احسان الٰہی ظہیر پر حیرت ہے کہ اپنے آپ کو احادیث رسولؐ کا ترجمان اور ماہر جانتا ہے، لیکن انتہائی گستاخی اور بے شرمی سے اس نے ان تمام احادیث کو جو خصوصیت کے ساتھ اس جماعت معصومین کی طہارت کی نشان دہی کرتی ہیں، نظر انداز کر کے اپنی کتاب "الشیعة واهل البیت" میں عکرمہ خارجی کی روایت پر اعتماد کیا ہے اور کہتا ہے کہ اس آیت سے مراد ازواج رسولؐ ہیں۔ پھر کہتا ہے کہ آپ کی اولاد بھی مجازاً اس میں داخل ہے۔ ہم دیگر نظریات پر بحث کے دوران اس بارہ میں بھی بحث کریں گے اور اس کا تجزیہ پیش کریں گے۔

علمائے اسلام اور آیہ مبارکہ تطہیر

آیہ مبارکہ کے بارے میں علمائے اہل سنت کے بعض اقوال کا نقل کرنا بھی، خواہ وہ کتب تفسیر میں ہوں یا کتب حدیث میں، ہمارے امکان سے باہر ہے، چہ جائیکہ ان سب کو پیش کیا جائے۔ جو حضرات ان اقوال ومباحث سے آگاہ ہونا چاہتے ہوں ان سے التماس ہے کہ وہ درج ذیل آیات کی تفسیر کے لیے کتب تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں:

۱: آیہ مبارکہ مباہلہ:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ...... (آل عمران: ۶۱)

ترمذی اپنی صحیح میں لکھتے ہیں کہ جب یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی:

دَعَا رَسُوْلُ اللهِ عَلِيًّا وَّ فَاطِمَةَ وَحَسَنًا وَّحُسَيْنًا فَقَالَ اَللّٰهُمَّ هٰٓؤُلَآءِ اَهْلِيْ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کو طلب کیا اور فرمایا: "خداوندا! بس یہی میرے اہل بیت ہیں۔"

۲: آیہ مودت:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (شوری: ۲۳)

۳: آیت زیر بحث یعنی "انما یرید الله لیذهب..."

مندرجہ بالا آیات سے متعلق بہت سی کتب تفاسیر میں آیہ تطہیر کے پنجتن پاک کی شان میں نازل ہونے کے ارشارات ملتے ہیں۔

۴: علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار، جلد ۳۵، صفحات ۲۰۶ تا ۲۲۶ میں اس آیہ مبارکہ کے پنجتن پاک کی شان میں نازل ہونے کے ثبوت میں چونتیس (۳۴) محدثین ومفسرین کے اقوال نقل فرمائے ہیں۔

۵: کتاب "احقاق الحق" جلد ۲ ص ۵۰۲ تا ۵۴۴ کے قابل قدر حواشی میں اس آیہ مبارکہ کے پنجتن پاک کی شان میں نزول کے بارے میں بہتر (۷۲) کتب حدیث وتفسیر سے روایات نقل کی گئی ہیں جن میں بہت سی کتابوں کے متن بھی درج کیے گئے ہیں۔ کتب متعلقہ کی مختلف جلدوں، صفحات اور محل طبع کتاب کی طرف رجوع کرنے سے آیہ مبارکہ کا خصوصیت کے ساتھ ان پانچ بزرگ ہستیوں کی شان میں نازل ہونا امر بدیہی کے طور پر ثابت ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں اس حقیقت میں کسی قسم کے شک وشبہ اور تردید کو خاندان رسالت کی ولایت سے ایک طرح کا انحراف سمجھنا چاہیے۔ چونکہ مذکورہ مصادر سب کی دسترس میں ہیں، لہٰذا ہم قارئین کرام کو ان کتب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے آیہ مبارکہ سے متعلق دیگر نظریات کی تشریح سے قبل ایک اہم سوال کے جواب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مشکل سیاق آیات

مفہوم ومصداق کے اعتبار سے اہلبیت کے افراد کے تعین کے بعد اہم ترین بات سیاق آیات کے سوال کا جواب ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ آیت زیر بحث ازواج رسولؐ سے متعلق آیات کے ضمن میں وارد ہوئی ہے اور تمام مصاحف میں آیت تینتیس کا حصہ شمار ہوتی ہے جس کا تعلق ازواج مطہرات سے ہے۔ اس صورت میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت اپنے سیاق وسباق سے کٹی ہوئی ہے اور اس کا تعلق کسی اور جماعت سے ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک سیاق کی وحدت حصول مراد کے لیے لازمی امر ہے۔ ہم بھی ہمیشہ متکلم کی گفتگو کے قبل وبعد کے

مطالب سے اس کے مقصد کی تعیین کرتے ہیں۔لیکن وحدت سیاق اس جگہ مقصود متکلم پر گواہ ہوتی ہے جہاں کوئی زیادہ قوی اور زیادہ طاقتور دلیل اس کے خلاف موجود نہ ہو۔زیر بحث آیت میں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے۔احادیث متواتر بلکہ ان سے بالاتر روایات شہادت دیتی ہیں کہ آیہ 'تطہیر' ایک مستقل آیت کی صورت میں نازل ہوئی تھی اور تنتیسویں آیت کے ذیل میں رکھی گئی جبکہ یہ ہرگز موخرالذکر آیت کی تکمیل کنندہ نہیں ہے۔اس آیت کے مستقل ہونے کی تین دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل

بے شمار احادیث، قطع نظر اس سے کہ آیہ مبارکہ پنجتن پاک کی شان میں ہے یا کسی اور کی شان میں، اس آیت کے مستقل ہونے کی دلیل میں ملتی ہیں۔یہ احادیث اس آیت کو ازواج مطہرات سے متعلق آیات کے ضمن میں قرار نہیں دیتیں۔یہ احادیث بتلاتی ہیں کہ آیہ مبارکہ انما یرید اللہ... ام المومنین حضرت ام سلمہ سلام اللہ علیہا کے خانہ اقدس میں اس وقت، جب جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے کھانا پکایا...... نازل ہوئی۔یا یہ کہتی ہیں کہ آیہ مبارکہ حضرات رسولؐ و علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، یا یہ کہ مدت مدید تک آنحضرتؐ خانہ زہرا پر دروازہ کھٹکھٹا کر اس آیت کی تلاوت فرماتے رہے............

ان تمام احادیث میں آیہ مبارکہ کے مستقل آیت ہونے اور آیات متعلق بہ ازواج مطہرات سے الگ ہونے کی صراحت کی گئی ہے۔کسی حدیث میں بھی اس قسم کی تصریح نہیں کی گئی، نہ ہی کوئی اشارہ تک کیا گیا ہے کہ یہ آیت ازواج رسولؐ سے متعلق آیات کے ضمن ہی میں ہے۔'عکرمہ' اور 'عروہ' جیسے غیر معتبر افراد بھی جو اس آیت کے ازواج رسولؐ کی شان میں نازل ہونے کے داعی ہیں، اس آیت کو علیحدہ اور مستقل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آیت ازواج رسولؐ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے۔

بہ الفاظ دیگر آیہ مبارکہ کو پنجتن پاک کی شان میں قرار دیں یا ازواج مطہرات کی شان میں سمجھیں مفسرین و محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ آیہ مبارکہ انما یرید اللہ مستقل آیت کی شکل میں دیگر آیات سے بالکل علیحدہ نازل ہوئی ہے، خواہ یہ خاندانِ علی سے متعلق ہو یا ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔

آیہ مبارکہ کے طرز نزول میں اس اتفاق نظر کی موجودگی میں نہ تو وحدت سیاق سے استدلال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے قرینہ بر مقصود قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ احادیث میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل آیت کے طور پر نازل ہوئی ہے اور حکم پیغمبرؐ سے موجودہ مقام پر رکھی گئی ہے۔قرآن مجید کی تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، یعنی ایسی بہت سی آیات ہیں جو مستقل طور پر نازل ہوئیں اور جناب رسالتمآب

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے کسی سورۂ مبارکہ کی معین شدہ آیات کا حصہ قرار پائیں۔[۱]

ہمارے یہ کہنے پر کہ آیہ تطہیر قرآن پاک کی ایک مستقل آیت ہے حالانکہ یہ آیات متعلق بہ ازواج رسولؐ کے دوران وارد ہوئی ہے، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ علامہ طبرسیؒ بھی مجمع البیان میں کہتے ہیں کہ فصحائے عرب میں رسم تھی کہ ابھی وہ کسی موضوع سے فارغ نہ ہو پاتے تھے کہ کسی اور موضوع کو زیر بحث لے آتے تھے اور پھر دوبارہ موضوع اول کی طرف پلٹ جاتے تھے۔[۲]

قرآن مجید میں اس بات کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہم ان میں ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں داستانِ حضرت یوسف علیہ السلام میں جب عزیز مصر کی بیوی کی خیانت بے نقاب ہوئی اور اس کا شوہر حقیقت سے آگاہ ہوا تو اس نے اپنی بیوی کی طرف رخ کر کے کہا:

قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ۝۲۸ (یوسف:۲۸)

''اس نے کہا یہ تم عورتوں کا مکر ہے اور بے شک تمہارا مکر عظیم ہے۔''

يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ٚ وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ ۝۲۹ (یوسف:۲۹)

''اے یوسف! اس سے درگزر کرو اور تو (اے زلیخا) اس گناہ کے لیے استغفار کر جو تو نے کیا ہے کیونکہ تو خطا کاروں سے تھی۔''

دونوں آیات میں محور سخن و خطاب عزیز مصر کی زوجہ تھی لیکن اس سے دورانِ خطاب حضرت یوسف کی بات درمیان میں آ گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی عزیز مصر کی زوجہ سے درگزر کریں۔ دراصل **یوسف اعرض عن ھذا** جملہ معترضہ ہے جو عزیز مصر کی زوجہ سے متکرر اور متوجہ خطابات کے درمیان کسی مناسبت سے وارد ہوا ہے۔ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی اس واقعہ کے کرداروں میں سے ایک ہیں، ان سے گفتگو کرنے دوسری آیات کی مناسبت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ ایسے مواقع میں اہم بات یہ ہے کہ آیہ معترضہ یا جملہ معترضہ کا سیاق و سباق کے مطالب سے مناسبت رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

سورۂ احزاب کی آیات ۲۸ تا ۳۳ کا مجموعی مطالعہ بتلاتا ہے کہ خداوند عالم ازواج رسولؐ کو تیز و تند لب و لہجہ میں خطاب فرماتا ہے اور

---

[۱] علامہ جلال الدین سیوطی کتاب الاتقان، ج۱، ص۱۷۶، اٹھارویں فصل میں، جہاں جمع و ترتیب قرآن کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، ابن الحصار سے نقل کرتے ہیں، ''ترتیب السور ووضع الایات مواضعھا انما کان بالوحی کان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) یقول صغوا ایة کذا فی موضع کذا۔'' یعنی سورتوں کی ترتیب اور ہر آیت کا اپنے مقام پر قرار پانا وحی الٰہی کے ذریعہ انجام پاتا تھا اور آنحضرتؐ فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو۔

[۲] مجمع البیان، ج۸، ص۳۵۷

چاہتا ہے کہ انھیں ان کی بھاری ذمہ داریوں اور عظیم واجبات سے آگاہ فرمائے جو ان کی طرف سے غفلت کا شکار ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم بعض آیات قرآن پاک کے ابتدائی الفاظ پیش کرتے ہیں:

۱: يَآَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ....

''اے رسولؐ اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی (زرق برق) زندگی کو پسند کرتی ہو تو میں تمھیں ہدیہ دے کر اچھے طریقہ سے رخصت کر دیتا ہوں۔''

۲: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ....

''اے نبی کی بیبیو! تم میں سے جو کوئی گناہِ واضح کا ارتکاب کرے گی تو اس کے لیے عذاب دگنا ہوگا۔''

۳: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ....

''اے نبی کی بیبیو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔''

۴: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ....

''اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلے کے زمانہ جاہلیت کی طرح لوگوں کے درمیان اپنے آپ کو ظاہر نہ کرو۔''

ان تنبیہہ آمیز احکام میں پروردگارِ عالم عصمت اہلبیت اور طہارتِ خاندان رسالت کو واضح فرما رہا ہے تاکہ اس طرح ازواج پیغمبر اسوۂ پیغمبرؐ کی پیروی کریں...... اللہ تعالیٰ ان کو بتلاتا ہے کہ تم ازواج پیغمبرؐ ایسے خاندان کے ہمراہ زندگی بسر کر رہی ہو جو سراپا تقویٰ و طہارت اور عصمت و گناہ سے ہر طرح محفوظ ہیں اور ان کی ہمسائیگی کے لیے مناسب و شائستہ یہ ہے کہ تم بھی طہارت و تقویٰ کے درجۂ بلند پر فائز ہو جاؤ۔ اس پاک جماعت کے ساتھ تمہارا انتساب فرائض و ذمہ داری کا مظہر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تم فرمان خداوند تعالیٰ ''لستن کاحد من النسآء'' کے مطابق عام اور معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو کیونکہ تم ازواج رسولؐ ہو اور تمہاری نسبت معصوم پاک خانوادہ سے قائم ہوگئی ہے۔

اس بحث میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات سے متعلق آیات مبارکہ کے درمیان عصمت اہل بیت کا بیان کا ملا فصاحت و بلاغت کے معیار کے مطابق ہے۔

دوسری دلیل

یہ آیہ مبارکہ کسی طرح بھی ازواجِ رسولؐ سے متعلق نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان سے متعلق آیات ان کے لیے منزل تہدید کی مظہر ہیں جبکہ

آیت تطہیر کا لہجہ تعریف و ستائش کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ دونوں انداز کو ایک ہی موضوع میں ضم کرنا انتہائی درجہ کی بدذوقی کی دلیل ہے۔ لہٰذا نہایت مستحسن اور خوبصورت کیفیت ہوگی کہ ہم یہ کہیں کہ آیہ تطہیر مستقل صورت میں نازل ہوئی اور کسی خاص مناسبت کی غرض سے ازواج مطہرات سے متعلق آیات کے درمیان رکھی گئی ہے۔

تیسری دلیل

اس آیہ مبارکہ کے مستقل آیت کے طور پر نازل ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر آیہ تطہیر کو تینتیسویں آیت کے درمیان سے ہٹا لیا جائے پھر بھی اس کا مطلب بعد والی آیت سے مکمل طور پر محفوظ رہتا ہے اور دونوں آیات کے مضمون و مطالب میں کسی قسم کا سقم واقع نہیں ہوتا۔

خداوند عالم تینتیسویں آیت میں اس طرح فرماتا ہے:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ

نیز چونتیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

اب اگر پہلی آیت سے آیہ تطہیر کو ہٹا دیا جائے اور چونتیسویں آیت کو اس کے ساتھ ضم کر دیں تو دونوں آیات کے مطالب پر کسی طرح کی معمولی سی زد بھی نہیں پڑتی۔ یہاں تک کہ اگر دونوں آیات کو جمع کر کے ایک آیت تصور کر لیں یا دونوں کو الگ الگ رہنے دیں، ان کے مطالب و موضوع میں کوئی فرق نہیں پڑتا اگرچہ آیات میں فاصلہ رکھنے کے لیے احتمال اول متعین ہے کیونکہ "و اطعن اللہ و رسولہ" کا جملہ آیت کا آخر اور اصطلاحاً آیت کا فاصل نہیں بن سکتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی الٰہی اس شکل میں کیوں نازل ہوئی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صدر اسلام کے بہت سے مسلمان حضرت علی علیہ السلام اور ان کے خاندان کے سلسلہ میں مکمل طور پر حساس تھے۔ کوئی قبیلہ یا آبادی ایسی نہ تھی جس کا کوئی نہ کوئی فرد حضرت کے ہاتھوں کسی نہ کسی غزوۂ اسلامی میں قتل نہ ہوا ہو۔ لہٰذا ان میں بہت سے لوگ حضرت سے بہت دل آزردہ اور دکھی تھے۔ اس قسم کے بغض و کینہ نے رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سر اٹھایا اور کئی جماعتوں نے کسی نہ کسی طرح حضرت علی علیہ السلام اور ان کے خاندان سے انتقام لیا۔

اسی حساسیت کے پیش نظر آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس خاندان کی طہارت اور عصمت سے متعلق آیہ مبارکہ کو ازواجِ رسولؐ سے متعلق آیات کے درمیان رکھا تا کہ یہ زیادہ واضح نہ ہونے پائے۔ پھر اس بنا پر کہ آیت کے مطالب میں اشتباہ و غلط فہمی جگہ نہ پائے۔ حدیث

وسنت کے ذریعہ مفاد آیت کی وضاحت فرمادی اور آیت کے مقصد حقیقی کو بے نقاب فرمادیا۔

یہ حقیقت اس طرح درست ثابت ہو جاتی ہے کہ جیسے عقلمند و پختہ کار اشخاص بہت زیادہ قیمتی اور گرانبہا اشیاء کو اپنے گھر میں ایسی چیزوں کے درمیان رکھ دیتے ہیں جو غیروں کی توجہ کا مرکز نہیں بنتیں جبکہ خود گھر والے اس بات سے ہر طرح واقف ہوتے ہیں:

یہی حقیقت سورۂ مائدہ کی آیت ۳ سے ظاہر ہوئی ہے جو اس طرح ہے:

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ

یہ آیت گوشت کے احکام سے متعلق آیات کے درمیان واقع ہے جو تین حصوں میں تشکیل پاتی ہیں:

۱: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ....

۲: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ....

۳: فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ ....

ظاہر ہے کہ دوسرا حصہ پہلے اور تیسرے حصہ سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر اس کو درمیان سے ہٹا بھی دیا جائے تو آیت کے مطالب میں کوئی سقم واقع نہیں ہوتا۔ اس حصہ کو گوشت سے متعلق احکام کے درمیان صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سے مصالح سیاسی اور حساسیت پیدا نہ ہونے پائے۔ ہم نے اس کی تفصیلات اپنی کتاب ''تفسیر صحیح آیات مشکلہ قرآن'' میں پیش کی ہیں۔

دیگر نظریات

یہاں تک آیت مجیدہ کے مصادیق واقعی کی وضاحت کی گئی جس سے ہر انصاف پسند و بے غرض وغیر متعصب شخص پر واضح ہو گیا کہ آیہ مبارکہ کا مقصود ایک خاص جماعت کی عصمت پر نص الٰہی کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جن کے اسمائے گرامی اور خصوصیات کردار احادیث نبوی میں وارد ہوئے ہیں۔ نیز یہ کہ روزِ اول ہی سے صحابہ کرام، تابعین اور علمائے اسلام کے اذہان میں اس آیہ مبارکہ کی تفسیر کے بارے میں ان معانی کے علاوہ اور کوئی چیز جاگزیں نہیں ہوئی۔ لیکن اس طویل مدت کے دوران صرف چند ایسے افراد (جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں) جنہوں نے اس مسلمہ تفسیر کے خلاف ایسے نظریات پیش کیے ہیں جن میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کو معرض بحث و تحقیق میں ڈالا جائے۔ تاہم تکمیل بحث کی خاطر ہم ان تمام نظریات پر تنقید کریں گے جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱: آیہ مبارکہ میں 'بیت' سے مراد صرف 'بیت اللہ الحرام' ہے اور اس کے اہل سے مراد شہر مکہ کے باشندے ہیں، بالخصوص ان میں سے جو

متقی و پرہیزگار ہوں۔

۲: آیہ مبارکہ میں 'بیت' سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد ہے۔ اھل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے گھر مسجد کے اطراف میں بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔

۳: اہل بیت سے وہ حضرات مراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور وہ لوگ حضرت علی علیہ السلام، عقیل، جعفر اور عباس کی اولاد پر مشتمل ہیں۔

۴: اہل بیت سے صرف ازواج مطہرات رسول مراد ہیں۔

۵: اہل بیت سے مراد آنحضرت کی ازواج و اولاد اور حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی اس اصطلاح میں شمولیت کا سبب یہ ہے کہ وہ خانہ رسولؐ میں بہت زیادہ آمد و رفت اور میل جول رکھتے تھے۔[1]

ان پانچوں نظریات میں چوتھے اور پانچویں کے علاوہ سب ایک طرح پر تفسیر بالرائے کا مقام رکھتے ہیں، جن کے بارے میں قرآن وحدیث سے کسی طرح کی کوئی شہادت میسر نہیں ہم ان نظریات پر الگ الگ اپنی تنقید و مباحث پیش کرتے ہیں۔

نظریات اول و دوم

ان دونوں نظریات کی کمزوری کے لیے اسی قدر کہنا کافی ہے کہ لفظ ''اھل البیت'' اس آیت کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ سے کہتے ہیں:

قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ

(ھود: ۷۳)

''کیا تم اللہ تعالیٰ کے امر میں تعجب کرتی ہو؟ اس کی رحمت اور برکات میں تم اہل بیت پر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ گرامی کی بہن فرعون کے دربار میں گئی اور ان سے کہا:

هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَهۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَهٗ لَکُمۡ (قصص: ۱۲)

''کیا میں اس خاندان کی طرف تمہاری رہبری کروں جو موسیٰ کی پرورش کی ذمہ داری اٹھالیں۔''

اس طرح یہ لفظ اچھی طرح مانوس اور جانا پہچانا ہے اور اس کی تفسیر میں اہلیان مکہ یا مسجد نبوی کے ہمسایوں کو مراد لینا بالکل بے بنیاد بات ہے، بالخصوص جبکہ اس آیت کے سیاق و سباق میں محورِ کلام حضرت رسول اکرمؐ اور ان کی ازواج مطہرات ہیں۔ اس اعتبار سے آیہ مبارکہ

---

[1] تفسیر طبری، ج ۲، ص ۵-۷، الدر المنثور، ج ۵، ص ۹۸، ۱۹۹، مفاتیح الغیب مطبوعہ آسانہ، ج ۶، ص ۶۱۵، کشاف، ج ۲، ص ۵۳۸، مجمع البیان، ج ۴

کے مصداق خانہ کعبہ کے مجاوروں یا مسجدی نبوی کے ہمسایوں کو قرار دینا قطعی طور پر بے معنی ہے۔

نظریہ سوم

یہ نظریہ پہلے دو نظریات سے کسی طرح مختلف نہیں۔ اہل بیت سے ان اشخاص کو مراد لینا جن پر صدقہ حرام ہے، مکمل طور پر بے بنیاد ہے، بالخصوص ان لوگوں کو مراد لینا جو نزول قرآن کے زمانہ میں مدینہ منورہ سے دور اور باہر رہتے تھے۔ یہ حضرات خانہ رسولؐ سے کسی طرح کا رابطہ نہیں رکھتے تھے کہ کسی طرح اہل بیت پیغمبر میں ان کا شمار ہوسکتا، یہ گھر خواہ اینٹ اور مٹی کا ہو یا اس کے دوسرے معنی ہوں جن کی سابق میں وضاحت ہوچکی ہے۔

علاوہ ازیں صدقہ صرف حضرت ابوطالب کے تین صاحبزادوں اور حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب کی اولاد پر ہی حرام نہیں بلکہ شیعہ نقطہ نظر سے صدقہ تمام بنی ہاشم پر حرام ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت ہاشم کی نسل صرف حضرت عبدالمطلب سے چلی۔ اس صورت میں حضرت عبدالمطلب کی تمام اولاد یعنی حارث وابولہب وغیرہ سب پر صدقہ حرام ہوجاتا ہے۔

امام شافعیؒ کے خیال میں صدقہ حضرت عبدمناف کی تمام اولاد پر حرام ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عبدالمطلب، برادر ہاشم کی اولاد بھی اسی صف میں شامل ہے۔ بہرصورت فقہ اسلام کی تاریخ میں اس امر پر مبنی کوئی قول نہیں کہ صدقہ خصوصیت کے ساتھ حضرات ابوطالب اور عباس کی اولاد پر حرام ہے۔[1]

یہاں ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ نظریہ صحیح مسلم میں بزرگ صحابی زید بن ارقمؓ سے نقل ہوا ہے۔ جب لوگوں نے آپ کو مجبور کیا کہ پیغمبر اکرمؐ کی کوئی حدیث بیان فرمائیں تو انھوں نے فرمایا: ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز 'خم' نامی چشمہ کے کنارے پر کھڑے ہوئے جو مکہ و مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ آنحضرت نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا فرمائی اور فرمایا: ''اے لوگو! میں ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ نمائندہ پروردگار عالم آجائے اور میں اس کی آواز پر لبیک کہہ دوں۔ میں تمہارے درمیان دو نفیس چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ان میں ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس کو لے لو اور مضبوطی سے پکڑ لو۔'' پھر کتاب خدا سے تمسک کرنے کی آنحضرتؐ نے ترغیب فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا ''دوسرے میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔'' اس جملہ کو آنحضرتؐ نے تین بار دہرایا۔

راوی کہتا ہے: ''میں نے زیدؓ سے پوچھا کہ آنحضرتؐ کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات آپؐ کے اہل بیت میں شامل نہیں؟''

زیدؓ نے کہا: ''کیوں۔ اس آیت میں اہل بیت سے وہ لوگ مراد ہیں جن پر آنحضرتؐ کے بعد صدقہ حرام ہے اور وہ حضرت علی وعقیل، جعفر وعباس کی اولادیں ہیں۔ صدقہ ان سب پر حرام ہے۔''

---

[1] خلاف شیخ طوسی، ج ۲، کتاب الوقوف والصدقات، ج ۱ ص ۲۲۷ اور کتاب قسمہ الصدقات، ج ۲ ص ۳۵۳، مسالہ ۲۶

ایک اور روایت میں وارد ہوتا ہے کہ جب راوی نے زیدؓ بن ارقم سے پوچھا کہ کیا ازواج رسول اہل بیت رسولؐ میں شامل ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: ''نہیں! کیونکہ عورت ایک مدت تک اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ پھر مرد اسے طلاق دے دیتا ہے اور وہ اپنے باپ اور دیگر رشتہ داروں کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کے اہلبیت آپؐ کے وہ اصلی رشتہ دار ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔''[1]

ہم پہلے بھی اس نظریہ کی وضاحت میں کسی قدر لکھ چکے ہیں اور پھر یاد دلاتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقم کی گفتگو بہ لحاظ لغت مصادیق اہل بیت کی بلند ترین ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہے، جبکہ اس نظریہ کے مطابق لفظ اہل بیت وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔

بہر حال یہ نظریہ کسی طرح یقینی و پختہ نہیں، بالخصوص جب آیہ مبارکہ کے مطالب اہل بیت عظام کی عصمت اور گناہ سے تحفظ کے ناظر ہیں، جبکہ ان چار گھرانوں کے تمام افراد ہرگز گناہ سے محفوظ و معصوم نہ تھے بلکہ ان میں سے بعض تو عادل اور منصف بھی نہ تھے۔

نظریہ چہارم

یہ نظریہ ان وضاحتوں کے پیش نظر جو ہم نے نظریہ اول کے سلسلہ میں پیش کی ہیں مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ آیہ مبارکہ کے سیاق و سباق پر معمولی سا غور کرنے سے اس نظریہ کا بے بنیاد ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔

اول یہ کہ تمام آیات میں ازواج مطہرات کے لیے 'ازواجک' اور 'نساء النبی' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر 'اھل البیت' کے لفظ سے بیویاں یا اصطلاح کے مطابق ازواجِ رسول مراد ہوں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ صرف ایک مرتبہ پہلے الفاظ کو چھوڑ کر لفظ 'اھل البیت' کا سہارا لیا گیا؟

دوسرے یہ کہ آیہ تطہیر کی زبان اور لہجہ اہل بیت کی مدح و تعریف اور ان کے مقام بلند و ارفع کی خبر دیتا ہے جبکہ اس کے سیاق و سباق کی ملحقہ آیات کا لہجہ، جو ازواجِ رسولؐ کا ذکر کرتی ہیں، ملامت و مذمت کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں کو ایک ہی جماعت سے متعلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تیسرے یہ کہ اگر اہلبیت سے خصوصی طور پر ازواجِ رسول مراد ہوں تو پھر ضمائر کے استعمال میں کیوں تبدیلی واقع ہوئی اور دو موقعوں پر مونث کے بجائے مذکر کی ضمیریں کیوں لائی گئی ہیں؟

چوتھے آیہ مبارکہ سے ارکانِ اہل بیت کی عصمت اور گناہ سے تحفظ مراد ہے۔ یہ حقیقت نظریہ اول کی بحث میں غور کرنے سے بالکل روشن ہو جاتی ہے جبکہ تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ازواجِ مطہرات رسولؐ گناہ و خطا سے محفوظ و معصوم نہیں ہیں۔

یہ چاروں دلائل ان روایات و احادیث کی موجودگی میں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، نیز یہ کہ پیغمبر اکرمؐ کا حضرت ام المومنین ام سلمہ سلام اللہ علیہا کو کساء کے اندر داخل ہونے سے روک دینا، اس بات پر واضح گواہ ہے کہ ازواجِ مطہرات خصوصی طور پر آیت مبارکہ کے مفاد

---

[1] صحیح مسلم، ج ۷، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل علی علیہ السلام، ص ۱۲۲، ۱۲۳، مطبوعہ محمد علی صبیح

میں شامل نہیں ہیں۔ باقی رہا عمومی طور پر اور دوسرے حضرات کے ساتھ ان کا آیہ مبارکہ کے مصادیق میں شامل ہونا نظریہ پنجم سے تعلق رکھتا ہے جس کے بارے میں ہم بعد میں بحث کریں گے۔

اس نظریہ کے راویان کا تجزیہ

آیہ مبارکہ کی ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تخصیص کی روایت عکرمہ، عروہ بن زبیر اور مقاتل بن سلیمان جیسے لوگوں کے علاوہ اور کسی نے نقل نہیں کی۔ عکرمہ بازار میں پکار پکار کر کہتا تھا: ''وہ بات درست نہیں جو اس آیت کے بارے میں لوگ سوچتے ہیں، بلکہ یہ آیت ازواجِ پیغمبرؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔''[1]

کبھی کبھی تو وہ اس پر بھی اکتفا نہ کرتا بلکہ کہتا تھا: ''جو شخص چاہے میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کو تیار ہوں کہ یہ آیت صرف ازواجِ رسول کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔''[2]

دیگر آیات کو چھوڑ کر صرف اس ایک آیت کے لیے عکرمہ کا اصرار اور خاص طور پر مباہلہ کے لیے اس کی آمادگی شکوک وتردد کو دعوت دیتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت دوسری آیات سے کس طرح مختلف ہے کہ وہ اس کے متعلق اس حد تک شہرت کا اظہار کرتا ہے اور بازار میں خوارج کی طرح نعرے لگاتا ہے اور کہتا ہے: ''اے لوگو! آیت کا محل نزول ایسا نہیں، ایسا ہے، جس کے لیے میں مباہلہ کرنے کو موجود ہوں۔

عکرمہ کی سوانح عمری کی طرف توجہ دینے سے اس طرح شور مچانے کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے کیونکہ علماء رجال اس کی اس طرح توصیف کرتے ہیں:

عکرمہ، ابن عباس کا غلام تھا اور اپنے علم و دانش کی نسبت ان کی طرف دیتا تھا۔ اس کا ۱۰۵ھ، ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں انتقال ہوا۔ صرف چند لوگوں نے اس کی روایات کو قبول کیا ہے جبکہ ایک جماعت کثیر نے اس سے نقل روایت کی کیونکہ وہ خوارج سے تھا اور فرقہ اُباضیہ سے تعلق رکھتا تھا۔

یحییٰ بن بکیر کہتا ہے: ''مصر گیا جبکہ وہ مراکش کا عزم رکھتا تھا۔ مغرب کے تمام خوارج نے اس سے اخذ حدیث کیا۔''

ابن المدینی کہتا ہے کہ وہ نجدہ حروری کی پیروی کرتا تھا۔

مصعب ابن زبیر کا بیان ہے کہ عکرمہ مکتب خوارج کا پیرو تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ ابن عباس بھی اسی طرح تھے۔

عطاء ابن رباح کہتا ہے کہ عکرمہ اُباضی تھا۔

احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ وہ جماعت صغریہ سے تھا جو خوارج کا ایک فرقہ تھا۔ زیادہ تر امیر لوگوں کے پاس جاتا اور ان سے انعام حاصل کرتا تھا۔

---

[1] اسباب النزول واحدی، ص ۲۰۴

[2] الدر المنثور، ج ۵، ص ۱۹۸

سلیمان بن معبد بیان کرتا ہے کہ عکرمہ اور کثیر ایک ہی دن مرے۔ لوگوں نے صرف موخر الذکر کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ عکرمہ کی نماز جنازہ صرف مدینہ کے سیاہ پوست حبشیوں نے پڑھی۔

عبداللہ بن حارث کہتا ہے کہ میں علی بن عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے عکرمہ کو گھاس کی کوٹھڑی کے دروازہ پر باندھ رکھا ہے۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میرے پدر بزرگوار پر جھوٹ باندھتا ہے۔

محمد بن سجرینی کہتا ہے کہ مجھے عکرمہ کا اہل بہشت سے ہونا برا نہیں لگتا لیکن وہ شخص کذاب تھا۔

ابن ابی ذنب کہتا ہے کہ میں نے عکرمہ کو دیکھا ہے لیکن وہ قابل اعتماد شخص نہ تھا۔

فضل سینانی ایک شخص سے روایت کرتا ہے کہ میں نے عکرمہ کو 'نرد' کے مقام پر چوسر کھیلتے دیکھا ہے۔

یزید بن ہارون، ایوب، یونس اور سلیمان تیمی، تین اشخاص سے روایت کرتا ہے کہ عکرمہ نے گانا سنا، پھر گانے والے کے بارے میں کہا: ''خدا اس کو قتل کرے۔ کیسا اچھا گاتا ہے۔''

احمد بن حنبل فرماتے ہیں: ''مالک نے اس سے صرف ایک حدیث نقل کی ہے۔''[۱]

اس قسم کے اقوال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ شخص خاندانِ علی سے منحرف تھا اور قابل وثوق نہ تھا۔ کیا اس قسم کے آدمی کی روایات کو قبول کیا جا سکتا ہے؟

دوسرا شخص جس سے اس نظریہ کی روایت کی گئی ہے، مقاتل ابن سلیمان بلخی ہے جو ضعیف ہونے میں عکرمہ سے کسی طرح کم نہیں۔

ابن حیان کہتا ہے کہ مقاتل قرآن کے اس حصہ کی تفسیر جس کا تعلق اہل کتاب سے ہے یہود و نصاریٰ کے علماء سے حاصل کرتا تھا۔ خداوند تعالیٰ کو مخلوقات سے تشبیہ دیتا تھا اور حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔

خارجہ بن مصعب کا بیان ہے کہ میں یہودی کے خون کو حلال نہیں سمجھتا لیکن مقاتل پر میرا بس چلے تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔

ابن ابی حاتم کہتا ہے کہ اس کی حدیث اس کے راست گو نہ ہونے پر گواہ ہے۔

ابن مبارک کہتا ہے کہ اس کی تفسیر اچھی ہے بشرطیکہ وہ سچا ہو۔

وکیع کہتا ہے کہ وہ بہت جھوٹا تھا۔

نسائی کہتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا تھا۔

جرجانی کہتا ہے کہ وہ گستاخ دجال تھا۔[۲]

یہ سب اقوال مقاتل بن سلیمان کی عدم وثاقت پر شاہد ہیں۔ کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس کی بات پر اعتماد کیا جائے؟

---

[۱] میزان الاعتدال فی نقد الرجال ذہبی، ج ۳، ص ۹۳۔۹۷

[۲] میزان الاعتدال، ج ۴، ص ۱۷۳۔۱۷۵

ابن خلکان ''مقاتل'' کے حالات میں ابراہیم حزبی سے نقل کرتا ہے کہ مقاتل ابن سلیمان حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مقابلہ کے طور پر دعویٰ کرتا تھا کہ عرش کے نیچے سے زمین تک جو چاہو مجھ سے پوچھ لو۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ حج کے موقع پر حضرت آدم علیہ السلام کا سر کس نے مونڈا تھا۔ وہ یہ سن کر مبہوت رہ گیا۔[1]

ان تمام اقوال کے پیش نظر مقاتل کی روایات سے ہرگز استدلال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تمام تفاسیر اہل تشیع واہل تسنن ان دونوں افراد اور ضحاک جیسے ان کے ہم قماش لوگوں کے اقوال سے بھری پڑی ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی بیان کردہ احادیث نے امت اسلامیہ کو سالہا سال تک قرآن مجید سے استفادہ کرنے سے باز رکھا ہے۔

تیسرا شخص جس سے مذکورہ نظریہ روایت ہوا ہے، عروہ بن زبیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص اپنے بھائی عبداللہ ابن زبیر کی طرح حضرت علی علیہ السلام کے خاندان کے دشمنوں سے تھا۔

مورخ مسعودی لکھتا ہے:

> ''حماد بن سلمہ راوی ہے کہ عروہ بن زبیر اپنے بھائی عبداللہ کی حمایت کرتا تھا جب اس نے شعب میں بنی ہاشم کو جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کی تھیں اور کہتا تھا کہ اس فعل کا مقصد ڈرانا اور رعب ڈالنا تھا، جلانا نہیں تا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کر لیں، جس طرح سقیفہ کے واقعہ کے بعد بنی ہاشم کو ڈرانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔''

ابن ابی الحدید قمطراز ہے کہ اسکافی کہتا ہے کہ زہری نے عروہ بن زبیر سے نقل کیا کہ حضرت ام المومنین عائشہؓ نے اس سے کہا ہے کہ میں ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور حاضر تھی کہ اچانک حضرت عباسؓ اور حضرت علی تشریف لائے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ یہ دونوں میری سنت کے مخالف مریں گے۔

معمر کہتا ہے کہ زہری کے پاس عروہ سے مروی دو حدیثیں حضرت علی کے بارے میں تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ عروہ بنی ہاشم پر تہمت لگاتا ہے۔

عروہ کے بارے میں اخبار وروایات حد تواتر تک پہنچتی ہیں کہ جب اس کی محفل میں حضرت علی علیہ السلام کا نام آتا تو اس پر کپکپی طاری ہو جاتی اور وہ حضرت پر سب وشتم کرتا اور اپنے ہاتھ ایک دوسرے پر مارتا تھا۔[2]

یہ وہ راوی ہیں کہ جو آیہ مبارکہ کی شانِ نزول کو ازواجِ مطہرات کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے برعکس وہ عظیم شخصیات ہیں جن کا آغازِ بحث میں ہم نے تعارف کروایا ہے۔ جو آیہ مبارکہ کے نزول کو حضرت علی اور ان کی پاک اولاد کے بارے میں بیان فرماتے

---

[1] وفیات الاعیان، ج ۴، ص ۳۴۱۔ یہی بات ذہبی نے بھی میزان الاعتدال میں نقل کی ہے۔

[2] شرح حدیدی، ج ۴، ص ۶۹

ہیں۔ظاہر ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں کون سی جماعت اتباع و پیروی کے لائق ہوسکتی ہے؟

اس سلسلہ میں ہمیں یاد پڑتا ہے کہ یہ نظریہ کسی جگہ ابن عباس سے نقل ہوا ہے جبکہ اس کے برعکس نظریہ کی بھی انہی سے روایت کی گئی ہے۔علامہ سیوطیؒ کی الدرالمنثور کے مطابق ابن عباسؓ سے دو افراد نے اس نظریہ کی روایت کی ہے جن کی کیفیت کچھ اس طرح ہے:

۱: عکرمہ، جس کے بارے میں وضاحت ہو چکی ہے۔

۲: سعید بن جبیر جس کی سند ہمارے پاس نہیں ہے کہ ہم دیگر راویانِ حدیث کی طرح اس کی تحقیق کرسکیں۔

علاوہ ازیں اس قسم کی خبر واحد، تمام روایات متواترہ کی موجودگی میں مکمل طور پر بیقدر و قیمت ہے اور کوئی صاحب عقل ایک مبہم روایت کی خاطر ان تمام مصدقہ روایات کو ترک نہیں کرسکتا۔

نظریہ پنجم

پانچواں نظریہ مشہور نظریہ چہارم کے ساتھ مرکب ہے۔درحقیقت اس کو پیش کرنے والوں نے چاہا ہے کہ دونوں جماعتوں کے افراد کو راضی رکھیں اور دونوں کے پیش کردہ دلائل پر عمل کریں۔ایک طرف تو داخلی و خارجی قرائن آیہ مبارکہ کے نزول کو پنجتن پاک کی شان میں قطعی و یقینی قرار دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف سیاق آیات سے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات بھی اس آیہ مبارکہ کے مصادیق میں شامل ہیں۔

اس بناء پر انھوں نے خیال کیا ہے کہ آیہ مبارکہ سے وہ تمام افراد مقصود ہیں جو پیغمبر اکرمؐ سے کسی قسم کا حسبی و نسبی رشتہ رکھتے تھے۔لہٰذا طبیعی طور پر اس آیہ مبارکہ میں ازواج النبی، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور ان کی اولاد گرامی سب شامل ہیں۔

اس نظریہ کے طرفدار بعض ایسی بندشوں اور مشکلات میں گرفتار ہیں جن سے وہ نکلنے پر کسی طرح قادر نہیں ہیں۔ہم ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

اول یہ کہ 'البیت' کے الف اور لام جنس یا استغراق کے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ الف اور لام عہد کے ہیں اور ایک مشخص گھر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مخاطب اور متکلم دونوں کے ذہن میں تشخیص پا چکا ہے۔لہٰذا اگر اس گھر سے اینٹ، گارے اور پتھر کا گھر مراد ہو تو وہی گھر خانہ معہود ہوگا۔یہ خانہ معہود دختر رسولؐ کے خانہ اقدس کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں ہوسکتا، کیونکہ جیسا کہ ہم نے سابق میں ذکر کیا ہے آیہ مبارکہ کے محیط میں یہ گھر قطعی اور حتمی طور پر شامل ہے اور شک و شبہ تو دوسرے گھروں کے لیے ہو رہا ہے۔پس چونکہ الف اور لام عہد کے لیے آئے ہیں لہٰذا فطری طور پر اس میں صرف ایک گھر شامل ہوگا جس کا نام خانہ زہرا ہے اور بس۔لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس سے ان حضرات کا خانہ معنوی مراد ہے جو صاحب نبوت و رسالتؐ کی طرف منسوب ہیں۔

جاننا چاہیے کہ یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں جب عربوں نے لفظ بیت کو ایک امر معنوی کے طور پر، نہ کہ اینٹ و پتھر کے گھر کے لیے، استعمال کیا ہو۔اس کی مثال لفظ ''بیوتات العرب'' ہے جس کو عرب کے باشندے انساب و قبائل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر ہم لفظ ''بیت'' کے وسیع معانی کے قائل نہیں ہوسکتے، نہ ہی اس لفظ کو 'اہل بیت الرجل' کے وسیع معنی دے سکتے

ہیں۔اس کے برعکس یہ کہنا چاہئے کہ یہاں وہ افراد مراد ہیں جو اس گھر کے ساتھ ایک قسم کا مضبوط رشتہ و پیوند رکھتے ہیں اور بیت نبوت و رسالت ایک طرح سے ان پر سایہ فگن ہے۔ یہ حضرات بیت معنوی سے غذا پاتے ہیں اور اسی نعمت کے سایہ اور روشنی میں قرار پائے ہوئے ہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کی موجودگی میں یہ حضرات نبی و پیغمبر تو نہیں ہو سکتے لیکن کئی جہات سے ان کو)انحضرتؐ کے مشابہ ہونا چاہیے کہ یہ اس درجہ کمال پر فائز ہوں۔ازواج پیغمبر کے بارے میں بہر حال یہ بات مسلم و یقینی ہے کہ وہ اس درجہ کمال کی حامل نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے گھر کی جزو ورکن ہیں۔

دوسرے یہ کہ مفاد آیت اللہ تعالیٰ کے ارادہ تکوینی کی بناء پر اہل بیت عظام کی عصمت کو ظاہر کرتا ہے جبکہ ازواجِ مطہرات باتفاق امت مسلمہ معصوم نہیں ہیں۔

تیسرے یہ کہ اگر سیاق آیت کی بناء پر امہات المومنین کو اس میں شامل کیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ پھر آیت میں مذکر ضمیریں کیوں لائی گئی ہیں اور ”عنکن“ و ”یطھرکن“ کے بجائے ”عنکم“ و ”یطھرکم“ کیوں استعمال ہوئے ہیں جبکہ ان نظریہ کے مطابق ازواج نبیؐ خطاب کا محور ہیں؟

اگر مذکر ضمائر کا استعمال تغلیب کی خاطر ہو تو اس نکتہ پر توجہ کرنا ہوگی کہ محورِ تغلیب ایک طرف کے افراد کا دوسری طرف سے زیادہ ہونا ہے جبکہ یہاں تعداد امہات المومنین طرف مقابل (علی وحسین) سے زیادہ ہے۔البتہ کم تعداد لوگوں کی شرافت کی فزونی کی بناء پر کلام عرب میں عنصر تغلیب ان کی طرف پایا جاتا ہے۔اس صورت میں بھی ہمارا ہی نظریہ پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اس قسم کی تفسیر نصوص نبوی اور روایات متواترہ کے خلاف ہونے کے حکم میں قرار پاتی ہے۔لہٰذا یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ ان تمام متواتر روایات کو صرف وحدتِ سیاق کی خاطر رد کر دیا جائے۔

پروردگارِ عالم نے قرآن کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا اور آنحضرتؐ کو قرآن کی تلاوت اور اس کی تفسیر و بیان پر مامور فرمایا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

(نحل: ۴۴)

”ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل فرمایا ہے کہ آپ اس بات کو جو لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے بیان کریں۔شاید وہ اس میں غور وفکر کریں۔“

اب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری صرف تلاوت قرآن ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور فرض بھی آپ پر عاید ہوتا ہے اور وہ مفاد و مضمون آیات کا بیان وتوضیح ہے۔ چنانچہ جہاں بھی بیان و وضاحت آیات کی ضرورت ہوئی آنحضرتؐ نے مختلف طریقوں سے ان کی وضاحت وتفسیر فرمائی۔

اگر اس نظریہ کے حامی حضرات شیعہ روایات کی طرف توجہ کرنا نہیں چاہتے تو کم از کم اہل تسنن کی روایات ہی کی طرف توجہ فرمائیں جو کتب صحاح میں موجود ہیں اور احادیث اسلامی سے اس حد تک بے مہری نہ برتیں۔

ترمذی اپنی صحیح میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے نقل کرتے ہیں کہ مباہلہ کے موقع پر آنحضرتؐ نے حضرات علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کو طلب فرمایا اور کہا: "اللھم ھولاء اھلی" یعنی "خداوند! صرف یہی میرے اہلبیت ہیں۔" نیز وہ اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن، حسین، علی اور فاطمہ علیہم السلام کو ایک چادر کے نیچے چھپا کر فرمایا:

"اللھم ھولاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرا قالت ام سلمة و انا معھم یا نبی اللہ قال انت علی مکانك و انت علی خیر۔" [۱]

"خداوند! صرف یہی میرے اہل بیت ہیں۔ خدایا! نجاست کو ان سے دور فرما اور حد طہارت تک پاکیزہ فرما۔ ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟" (آنحضرت نے) فرمایا: "تم اپنے مقام پر رہو (کساء میں مت داخل ہو) تم بہت اچھی بیوی ہو۔"

مسلم اپنی صحیح میں تحریر فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک منقش سیاہ چادر دوش مبارک پر ڈال رکھی تھی کہ حسن علیہ السلام تشریف لائے۔ آنحضرتؐ نے انھیں چادر کے اندر لے لیا۔ پھر ترتیب وار حضرات حسین، فاطمہ اور علی علیہم السلام تشریف لائے۔ آنحضرتؐ نے ان سب حضرات کے سروں پر اپنی چادر ڈال دی اور فرمایا:

"انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا"۔ [۲]

یہ وہ روایات ہیں جو کتب صحاح میں درج ہیں۔ اگر ان کے علاوہ ان روایات کو بھی شامل کر لیں جو علامہ طبریؒ نے اپنی تفسیر اور علامہ سیوطی نے در المنثور میں نقل کی ہیں تو تعداد و مفہوم حد تواتر سے آگے نکل جاتا ہے۔ پھر ان روایات کی کسی قسم کی مخالفت بھی نص کے مقابلہ میں اجتہاد اور تفسیر بالرائے قرار پائے گی۔

خلاصہ بحث

'ابتلا' اور 'تطہیر' کی آیات آئمہ علیہم السلام کی "گناہ" و "نافرمانی" سے قطعی عصمت کو ثابت کرتی ہیں۔ باقی رہا آئمہ کا خطا اور سہو و

---

[۱] جامع الاصول، ج ۱۰، ص ۱۰۱-۱۰۲

[۲] جامع الاوصل، ج ۱۰، ص ۱۰۱-۱۰۲

نسیان سے محفوظ و پاک ہونا تو یہ بحث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خاتم النبین کی عصمت وحفاظت از گناہ نیز گناہ وخطا اور سہو ونسیان، اس کتاب کی چھٹی جلد میں پیش کی جائے گی۔

والسلام

''قم۔جعفر سبحانی''

اس جلد کا ترجمہ بروز جمعرات چھ بج کر چالیس منٹ بعد از عصر بتاریخ ۲۹ ر ذیعقدہ ۱۴۰۸ھ، مطابق ۱۴ ر جولائی ۱۹۸۸ء برمکان سیٹھ نوازش علی، ۸۱، ای، ماڈل ٹاؤن لاہور، بدست حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم اختتام پذیر ہوا۔

الحمدللہ اولا و اخرا وصلی اللہ علی محمد والہ وسلم سرمدا ابدا

14-7-1988

سید صفدر حسین نجفی

تفسیر موضوعی

جلد ششم

قرآن کا دائمی منشور

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور - 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انبیاء علیہم السّلام سے میثاق مؤکد

انبیائے سابق اور پیغمبر سلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان

شریعت ہائے آسمانی جو انبیائے الٰہی کے ذریعے نوع بشر کی ہدایت کے ذریعے نازل کی گئیں اصول و مقاصد کے اعتبار سے بالکل یکساں تھیں۔دستور قدرت رہا ہے کہ ہر پیغمبر صادق اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی خبر دیتا ہے اور ہر بعد میں آنے والا پیغمبر اپنے پیش رو کی تصدیق کرتا ہے۔ان کی تعلیمات میں صرف فروعات میں تھوڑا بہت اختلاف ہی ممکن ہوسکتا تھا جس کا سبب حالات حاضرہ کا مختلف ہونا ہوا کرتا تھا۔قرآن مجید کی آیات مبارکہ کئی ایک مقامات پر اس صورت حال کی شاہد ہیں۔قرآن مجید نہایت پختگی کے ساتھ فرماتا ہے:''

اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۗ

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے''(آل عمران۔۱۹)

علیٰ ہذا قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا تعارف ایک مسلمان کی حیثیت سے کرواتا ہے۔ان کو یہودیت و نصرانیت سے بالکل منزہ قرار دیتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞

''ابراہیم ہرگز یہودی یا نصرانی نہ تھے۔وہ موحد مسلمان تھے اور مشرکین سے نہ تھے''

(آل عمران۔٦٧)

یہ اور اس قسم کی خبریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے ادیان کی حقیقت کے یکساں ہونے کی دلیل ہیں۔یعنی یہ سب ادیان اصول واساس کے اعتبار سے ایک ہیں،کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے صرف فروعات سے تعلق رکھتا ہے۔

شرائع آسمانی میں بعض فروعی اختلافات کے بیان کے لئے قرآن مجید نہایت زیبا اور خوشنما تشبیہات سے کام لیتا ہے۔مثال کے طور پر ایک بہت بڑے دریا کے ساحل پر مختلف قبائل اپنی اپنی رسوم کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔سب کے سب ایک ہی ذخیرہ آب سے سیراب ہوتے ہیں جب کہ ہر ایک کا گھاٹ الگ الگ ہوتا ہے جہاں وہ الگ راستہ وارد ہوتا ہے اور اس آسمانی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔یہی کیفیت انبیاء علیہم السلام کی ہے جو سب کے سب ایک ہی عالم وحی سے غذا پاتے ہیں اور ایک ہی مقصد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔منبع فیض الٰہی

سب کے لئے ایک ہی ہے جب کہ ان کا مقام اجراء ہر امت میں مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

''ہم نے ہر ایک کے لیے راستہ اور گھاٹ قرار دیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک امت ہی قرار دیتا''(مائدہ۔۴۸)۔

یہ سب مختلف راستے شرائع آسمانی ہی ہیں جن سب کا ہدف ومقصد بالکل ایک ہی ہے۔

''انبیاء علیہم السلام سے اخذ پیمان''

اس وحدت طریق کی خاطر جو ادیان آسمانی کا طرۂ امتیاز ہے۔ خداوند متعال نے جملہ انبیاء علیہم السلام سے ایک طرح کا تاکیدی عہد لیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیہ مبارکہ جس کی ترجمانی کر رہی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾

''یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے انبیاء (اور ان کے پیروان) سے پختہ عہد لیا کہ جب ہم کتاب و حکمت تمہیں عطا کر چکے، پھر تمہارے پاس ایک رسول آیا جو اس چیز کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے تو یقینا اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: کیا تم نے اس بات کا اقرار کیا اور اس پر عہد کیا؟ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس تاکیدی عہد پر گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں''۔(آل عمران۔۸۱)۔

اس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے:۔

اول: ہر پیغمبر سے بغیر استثناء عہد لیا گیا کہ اپنے بعد آنے والے پیغمبر یا پیغمبروں پر ایمان لائیں۔''لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ''

دوم: نہ صرف ایمان لائیں بلکہ اس کی مدد کریں اور اس کی رسالت کی تبلیغ میں استعانت کریں۔''لَتَنْصُرُنَّهٗ''

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ ہر پیغمبر صاحب کتاب کا تقرر پیغمبر سابق کے دنیا سے چلے جانے کے بعد صورت پذیر ہوتا تھا اس لیے استعانت سے مراد، فطری طور پر، پیغمبر سابق کے پیروان کی بعد میں آنے والی نبوت کی اشاعت کے سلسلہ میں مدد کرنا ہے، نہ کہ ذاتی طور پر پیغمبر

سابق کی مدد کرنا۔

سوم: اس صورت میں لازم ہے کہ بعد میں آنے والے پیغمبر پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں کیونکہ وہ بھی ان کا تصدیق کنندہ ہے، تا کہ سب کی دعوت میں ہم آہنگی ہو اور اللہ تعالیٰ کا فیض مسلسل، بغیر کسی وقفہ کے معاشرہ میں جاری رہے۔

چہارم: اس کام کا مقصد یہ ہے کہ بعد میں آنے والے پیغمبر کی حقانیت واضح طور پر ثابت ہو جائے اور مکتب وحی سے تعلیم پانے والے باہم ایک دوسرے کی استعانت کریں۔

آیہ مبارکہ اس مسئلہ کو کاملاً عمومی طور پر واضح کرتی ہے لیکن آیہ مبارکہ کا مصداق واضح ذات گرامی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہے۔ آیہ مبارکہ مجیدہ ظاہر کرتی ہے کہ پروردگار عالم نے تمام انبیاء علیہم السلام، یا صاحبان کتاب و شریعت رسولوں سے جو آنحضرت پہلے مبعوث ہوئے تھے، ایک پختہ عہد لیا تھا کہ وہ آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان لائیں گے اور اپنی اپنی امتوں کو آنحضرتؐ کی امداد و نصرت کے لیے تاکیدی حکم دیں گے۔ یہی ذکر ہم سابق میں کر چکے ہیں کہ آیہ مبارکہ ایک وسیع و مکمل اصل پر گفتگو کر رہی ہے جس سے پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دوسرے انبیاء علیہم السلام سے میثاق تاکیدی کے مصداق ہونے کو متیقن و واضح کر رہی ہے۔

علامہ فخر الدین رازی روایت کرتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی بَعَثَ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ مِنْ بَعْدِهٖ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِلَّا اَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ لَئِنْ مُحَمَّدٌ وَّهُوَ لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ وَلَيَنْصُرَنَّهٗ"[1]

"خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السّلام اور ان کے بعد کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ سب سے عہد لیا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان پر ایمان لائیں گے اور ان کی نصرت کریں گے"

محدث بحرانی مرحوم تفسیر برہان میں اس سلسلہ میں متعدد روایات نقل کر کے واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پختہ عہد نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے انبیاء سے لیا تھا بلکہ آپ کے "وصی" کے لیے بھی ویسا ہی پختہ عہد لیا وہ فرماتے ہیں:۔

"وَلَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا وَّرَسُوْلًا اِلَّا وَاَخَذَ عَلَيْهِ الْمِيْثَاقَ لِمُحَمَّدٍ بِالنُّبُوَّةِ وَلِعَلِيٍّ بِالْاِمَامَةِ"[2]

"خداوند عالم نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہ فرمایا مگر یہ کہ اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور حضرت علی

---

[1] مفاتیح الغیب، ج ۲، ص ۵۰۷، مطبوعہ مصر

[2] تفسیر برہان، ج ۱، ص ۲۹۴، ۲۹۵

علیہ السلام کی امامت پر ایمان لانے کا پختہ عہد لیا''۔

یہ روایات اس سے مانع نہیں ہیں کہ آیہ مبارکہ ایک اصل کلی کو بیان کر رہی ہو اور یہ احادیث واضح و روشن مصادیق خداوندی کو بیان کرتی ہوں۔

آخر میں ہم یاد دلاتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے عہد خداوند عالم کے ذریعہ سے اور ان کی امتوں سے ان کے انبیاء کے ذریعہ صورت پذیر ہوا تاکہ اس طریقہ سے یہ دعوتیں ہم آہنگ رہیں اور انبیاء کی نبوت کا ثبوت واضح و آسان ہو جائے۔

اسی موضوع پر ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴿۷﴾

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے انبیاء سے عہد لیا، تم سے اور نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ بن مریم سے ہم نے پختہ عہد و پیمان لیا'' (احزاب)

اس آیہ مجیدہ میں پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کو موضوع بنایا گیا اور فرماتا ہے: ''مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ''۔ پھر پانچ عظیم انبیاء کا نام لیا گیا ہے جن میں ایک خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اس شرافت و عظمت کے پیش نظر جو آپ کو حاصل ہے آپ کا ذکر مبارک سب سے پہلے ہو رہا ہے۔

آیہ مبارکہ کا لب و لہجہ اس بات کا مظہر ہے کہ یہ پیمان عظیم، بہت بڑا اور پختہ تھا جس کو تمام انبیاء سے لیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ پیمان تھا کیا؟ اس موضوع پر نازل شدہ آیات پر توجہ دینے اور غور کرنے سے اس ابہام کو دور کیا جا سکتا ہے۔

گمان غالب ہے کہ اس آیہ مجیدہ میں جس عہد و پیمان کا ذکر ہے وہ وہی عہد ہو سکتا ہے جو سابقہ آیہ مبارکہ میں ''لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ'' اور ''لَتَنْصُرُنَّهٗ'' کے جملوں سے مطلوب ہے۔ یعنی تمام انبیاء علیہم السلام سے پختہ عہد و پیمان لیا گیا کہ پیغمبر آخر پر، جو ان کی شریعت کی تصدیق کرے گا، ایمان لائیں اور اس کی تصدیق کریں۔ اس صورت میں آیہ مبارکہ اس بات پر شاہد ہے کہ سابقہ نبی یا انبیاء سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس قسم کا عہد و پیمان لیا گیا لیکن آیت میں دو اور احتمال بھی موجود ہیں، جو یہ ہیں:

۱)۔ عہد لیا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو توحید کی دعوت دیں اور شرک سے روکیں۔

۲)۔ عہد لیا گیا کہ جو وحی ان پر ہوا اس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کے احکام و آئین کو محقق کریں۔

مؤخر الذکر احتمال کی بناء پر ہو سکتا ہے کہ آیہ کریمہ مکمل طور پر کتب عہدین (انجیل مقدس کے عہد قدیم و جدید) اور دیگر صحف آسمانی سے مربوط ہو جس کے بارے میں ہم آگے چل کر بحث کریں گے اور واضح کریں گے کہ وحی الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پیغمبر سابق کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو پیش کرے اور اس طریقہ سے ان پر ایمان لانے کی راہ ہموار کرے۔

کتب آسمانی میں پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پیش گوئیاں

انبیائے صادق کی جھوٹے دعویداروں سے شناخت کا ذریعہ صف معجزہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ معجزہ تو اس شناخت کے طریقوں میں سے ایک ہے۔اس شناخت وامتیاز کے دواور طریقے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر کردہ نبی کا صدق ثابت ہوجاتا ہے۔ یہ طریقے درج ذیل ہیں:۔

(ا)۔قرائن وشواہد کا جمع ہونا۔

(ب)۔کتاب اللہ کے بیان کے مطابق اخذِ میثاق

(ا)۔جمع قرائن وشواہد

مدعی نبوت کے طرز زندگی، اس کی دعوت کے مشمولات اور مختلف قرائن وشواہد وہ عناصر ہیں جو صدق وکذب کے اعتبار سے اس کی وضع وکیفیت کو واضح کرتے ہیں۔ متکلمین اسلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوائے نبوت کے ثبوت کے لیے بہت کم اس طریق کو اختیار کیا اگرچہ طلوع اسلام کے آغاز میں صرف قیصر روم یہی وہ شخص تھا جس نے یہ طریق اختیار کیا۔اس نے حجاز کے تجار سے مذاکرات کر کے قرائن کو جمع کیا اور آنحضرتؐ کے دعویٰ کو صادق تسلیم کیا لیکن اپنے دور کے پادریوں کے خوف سے، نیز اپنے مقام ومنزلت کے پیش نظر آنحضرتؐ کے متعلق اپنے عقیدہ کے اظہار سے رکا رہا۔[1]

علم کلام کی تاریخ میں اس موضوع پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور جو افراد ان حقائق سے مستفید ہوئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔مثلاً

۱)۔مسلمان اہل قلم نجف علی تبریزی مرحوم کتاب ''میزان الموازین فی امر الدین'' کے مؤلف ہیں۔وہ استنبول میں رہتے تھے۔ان کی علم کلام پر یہ کتاب ۱۲۸۸ھ میں چھپی۔اس فاضل مؤلف نے کتاب ہذا کے صفحات ۲۳۱ تا ۲۳۴ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صحت سے متعلق قرائن کو جمع کیا ہے۔

۲)۔مصری مصنف سید محمد رشید رضا نے جو ''المنار'' کے مؤلف بھی ہیں۔اپنی کتاب ''الوحی المحمدی'' میں اسی طریقہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کتاب کو اسی موضوع کی بناء پر تشکیل دیا ہے۔ چنانچہ اس نئے طریقہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے اس کتاب نے اپنے زمانہ میں خاص شہرت حاصل کی اور زمانہ کے اساتذہ اور اہل قلم نے انہیں قدردانی اور تعریف کے خطوط تحریر کیے۔ چونکہ بحث کا یہ حصہ حوادث زمانہ کے اعتبار سے نزول قرآن کے زمانہ سے متأخر ہے۔لہٰذا قرآن کے لحاظ سے ہم مجبور ہیں کہ اس طریق سے صرف نظر کر کے ایک تیسرے راستہ کی وضاحت کریں جو

---

[1] طبری نے اپنی تاریخ، جلد ۲، ص ۲۹ پر اس کی تشریح کی ہے۔

ہمارے موضوع گفتگو کو تشکیل دیتا ہے۔

(ب)۔اخذ میثاق بروئے بیان کتاب

ہم پہلے یہ بحث پیش کر چکے ہیں کہ پروردگار عالم نے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے عہد لیا ہے کہ پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائیں اور ان کی استعانت کریں۔اللہ تعالیٰ نے عہد و میثاق کی ان حدود و اساس پر ہی اکتفا نہیں فرمایا۔بلکہ اہل کتاب سے پختہ و مؤکد پیمان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں اور اس کی کسی چیز کو مخفی نہ رکھیں۔چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ﴿۱۸۷﴾

''اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ وہ حتماً اس کو (کتاب کو) لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور اسے ان سے چھپائیں گے نہیں،لیکن انہوں نے اسے (عہد کو) پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا،تو انہوں نے کیا ہی برا مال خریدا'' (آل عمران۔۱۸۷)

قرآن مجید کی آیات مبارکہ متعدد مقامات پر بیان کرتی ہیں کہ یہود اور راہبان نصاریٰ اس عہد مؤکد کے برعکس حقائق کو اپنی اقوام سے چھپاتے تھے اور ان کے پیروکار مکمل ناواقفیت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ہم اس سلسلہ میں صرف ایک آیہ مبارکہ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۱۷۴﴾

''وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو اللہ نے کتاب میں نازل فرمایا ہے اور اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں،حقیقت میں اپنے شکموں کو آگ سے بھرتے ہیں۔خداوند تعالیٰ روز قیامت ان سے بات تک نہ کرے گا،نہ انہیں پاک و پاکیزہ فرمائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔[1]

[1] اس بارے میں اور آیات بھی ہیں۔سورہ بقرہ،آیت ۷۹ اور سورہ آل عمران،آیت ۷۱۔۷۷ کی طرف رجوع فرمائیں

(بقرہ۔۱۷۴)

علمائے اہل کتاب صاحبان اقتدار و ثروت کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدل ڈالتے تھے، حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال قرار دیتے اور باطل پر حق کا لبادہ چڑھا دیتے تھے۔ نیز اس عمل کے دوران ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے متعلق بشارت کو مخفی اور چھپائے رکھیں اور دوسرے لوگوں کو ان سے مطلع نہ کریں۔

اہل کتاب کے حقائق کو چھپانے کے اس عمل کے بارے میں آیات قرآنی ایک مستقل موضوع کی صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ تاہم یہ تمام آیات سب سے زیادہ بشارتوں کے مخفی رکھنے سے متعلق ہیں جو عہدین، یعنی توریت و انجیل، میں حضور خاتم النبیین کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ اخبار و بشارات اس قدر روشن و واضح ہیں کہ ان میں تھوڑا سا غور کرنے سے بھی ان بشارتوں کی حامل ہستی کو اچھی طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے (جس پر کتاب نازل ہوئی ہے) اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں یہاں تک کہ ان کی ایک جماعت تو جان بوجھ کر حق کو چھپاتی ہے''۔ (بقرہ۔۱۴۶)

''يَعْرِفُوْنَهٗ'' کے جملہ کی ضمیر کے بارے میں دو احتمال ہیں:

۱)۔ یہ ضمیر کتاب کی طرف، جو ''اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ'' کے جملہ میں وارد ہوئی ہے، لوٹتی ہے۔

۲)۔ یہ ضمیر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہے۔

لیکن جیسا کہ بعد والے جملے میں فرماتا ہے: ''كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ'' تو اس سے آنحضرتؐ کو ان کے بیٹوں سے تشبیہ دینا مراد ہے نہ کہ کتاب کو ان کے لیے ثابت کرنا، کیونکہ ایسا کہنا صحیح تر ہوگا کہ میں فلاں شخص کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح اپنے بیٹے کو۔ لیکن یہ کہنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ کوئی شخص اس کتاب کو اس طرح پہچانتا ہے جیسے اپنے بیٹے کو۔ لہٰذا کہنا پڑے گا کہ ''یعرفونہ'' کے جملہ میں مرجع ضمیر صرف آنحضرتؐ ہی ہیں اور سیاق آیات سے بھی مکمل طور پر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

آیہ مبارکہ بتلاتی ہے کہ عہدین یعنی توریت و انجیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی و روحانی خصوصیات کو اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا تھا کہ جستجو کرنے والے کے لیے شک و تردید کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ ان علامات اور مشخصات کی طرف متوجہ ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ پیدائش اور بزرگان خاندانی کے اعتبار سے اور دین و آئین کی تفاصیل و مقاصد کے پیش نظر بھی، آنحضرتؐ کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے عبداللہؓ ابن سلام سے، جو احبارِ یہود سے تھے اور بعد میں ایمان لے آئے تھے، فرمایا: ''کیا تم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی کتابوں کے ذریعے بھی پہچانتے ہو؟'' عبداللہؓ بن سلام نے جواب دیا: ''یقیناً پہچان سکتا ہوں۔ خدا کی قسم اگر ہم آنحضرتؐ کو تمہارے درمیان دیکھیں تو ہم انہیں ان صفات کے ذریعہ جو پروردگار عالم نے ہماری خاطر بیان فرمائی ہیں، اسی طرح پہچان لیں گے جس طرح ہم میں سے ہر شخص کسی نوجوانوں میں سے اپنے بیٹے کو پہچان سکتا ہے۔ قسم ہے اس خدا کی جس کی یہ سلام کا بیٹا قسم کھاتا ہے کہ میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے بیٹے کی نسبت زیادہ واقف ہوں''۔[1]

---

[1] تفسیر قمی، ص ۲۸۱

عہدین (توریت عظیم وانجیل مقدس) میں پیغمبرؐ اسلام کی علامات

خداوند عالم نے پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کو صحیح طور پر واضح کرنے کے لیے توریت وانجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات وخصوصیات کو بیان فرمایا ہے۔ آپؐ کی نبوت ورسالت کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس طرح اہل کتاب کے لیے انکار کی تمام راہوں کو مسدود فرما دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷

''وہ لوگ جو (خدا کے علاوہ) کسی سے سبق نہ لیتے ہوئے رسول وپیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، اس پیغمبر کی پیروی جس کو (جس کی نبوت کو) تورات وانجیل میں مذکور پاتے ہیں، وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا اور برائیوں سے منع فرماتا ہے، پاک وپاکیزہ اشیاء کو ان کے لیے حلال اور نجاستوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ بارہائے سنگین (تکالیف وزحمات شاقہ) اور ان پر موجود قیود کو ان سے اٹھاتا ہے۔ جو لوگ اس (پیغمبر) پر ایمان لائے ہیں، جنہوں نے اس کی تعظیم وتکریم کی ہے، اس کی استقامت کی ہے اور اس نور کی پیروی کی ہے جو اس (پیغمبر) کی بعثت کے ہمراہ نازل ہوا ہے، وہی سب فلاح پانے والے ہیں''۔ (اعراف۔۱۵۷)

کون سی گفتگو ''يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ'' کے جملہ سے زیادہ ناطق وواضح ہوسکتی ہے؟

یہ آیت وضاحت کرتی ہے کہ نہ صرف آنحضرت کی خصوصیات عہدین میں درج ہیں بلکہ آنحضرتؐ کے لائحہ عمل کی مشخصات بھی ان میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی لیے اس آیت میں خداوند عالم آنحضرتؐ کے لائحہ عمل کی طرف بھی اشارہ فرماتا ہے تاکہ حقائق کے متلاشی حضرات اس آیت مبارکہ میں غور کرتے ہوئے عہدین کی طرف رجوع کریں اور ان دونوں کے تطابق سے آنحضرتؐ کی دعوت عالیہ کی حقانیت پر ایمان لائیں۔

انجیل مقدس میں پیغمبر اسلامؐ کے اسم گرامی کا بیان

قرآن مجید واضح طور پر بیان فرماتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد ''احمد'' نامی پیغمبر کی بعثت کی خبر دی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تورات نامی کتاب کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد ایک رسول کے آنے کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام ''احمد'' ہوگا۔ لیکن جب وہ (احمد) واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف تشریف لائے تو ان لوگوں نے کہا کہ اس کے دلائل تو ظاہر بظاہر جادو ہیں''۔ (صف۔ ۶)

محققین اسلام نے پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق قرآن میں وارد شدہ تمام بشارتوں کے سلسلہ میں کتب و رسائل تحریر کیے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اس آیہ مبارکہ کے بارے میں اناجیل میں کونسی انجیل میں اسم مبارک ''احمد'' وارد ہوا ہے، مفصل بحثیں کی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی کتاب ''احمد موعود انجیل'' میں اسی آیہ مبارکہ کے بارے میں بحث کی ہے اور انجیل یوحنا کے ان مواضع کو روشن کیا ہے جہاں آنحضرتؐ کا اسم مبارک ''احمد'' وارد ہے۔ اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔ [1]

توحید کی شرک پر فتح کا مژدہ

اہل کتاب نہ صرف یہ کہ خصوصیات پیغمبر خاتم ﷺ سے واقف تھے بلکہ مشرکین اور بت پرستوں سے بحث کے دوران ہمیشہ کہتے تھے کہ عنقریب اسی سرزمین پر ایک عربی و قریشی شخصیت مبعوث ہونے والی ہے جو شرک و بت پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گی اور دین توحید، جو اہل کتاب کا دین و مسلک ہے۔ بت پرستی پر، جو تم مشرکوں کا دین ہے، غالب آ جائے گا۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب وہ پیغمبر موعود مبعوث ہوئے تو انہیں اہل کتاب نے کئی ایسی وجوہات کی بناء پر جن کا تعلق ان کی انا، ذاتی منفعت اور خاندانی تعصّبات سے تھا، ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور ان کے پیش کردہ دین کو قبول نہ کیا۔ قرآن مجید اس حقیقت کو

---

[1] انجیل یوحنا، فصل ۱۴، ۱۵ اور ۱۶

ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶

''جب وہ کتاب (قرآن) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان (اہل کتاب) کے لیے آئی جو اس شریعت و کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو ان کے پاس تھی اور پہلے سے ہی (اسی کتاب اور اس کے لانے والے کا ذریعہ) جس کے ذریعہ وہ مشرکین کے خلاف کامیابی کی خوشخبری دیتے تھے، جبکہ وہ کتاب جس کی علامات سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے، آئی تو وہ اس سے انکار کرنے لگے، خدا کی لعنت ہو کافروں پر''۔(بقرہ۔۸۹)

جب معاذ بن جبل اور بشیر بن براء نے مدینہ منورہ کے باشندگان یہود کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ برسرِ مجادلہ پایا تو ان سے کہا: ''شرم کرو! تم یہودی ہی وہ لوگ تھے جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے ذریعے اپنے آپ کو کامیابی کی نوید دیتے تھے، تم اس زمانہ میں جب ہم لوگ مشرک و بت پرست تھے، ہمارے سامنے ان کی تعریف و توصیف بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں''۔ اس پر سلام بن مسلم یہودی نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا: ''جس کو ہم پہچانتے ہیں وہ ابھی نہیں آیا، یہ وہ شخص نہیں جس کے بارے میں ہم تمہیں بتلاتے تھے''۔ متذکرہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی۔[1]

حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور نبوت خاتم النبیینؐ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کی مدد سے کعبہ کی ویرانی اور اس نقصان کی وجہ سے جو طوفان نوح میں پہنچا تھا، کعبہ کی تعمیر نو فرمائی اور پھر اپنی اولاد کو وہاں مسکن قرار دیا۔ اس دوران انہوں نے اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز فرمایا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۲۹

''خداوندا! ان کے درمیان ایسا رسول مبعوث فرما جو تیری آیات کی تلاوت کرے، ان کو کتاب و حکمت

---

[1] مجمع البیان، ج ۱، ص ۱۵۸

کی تعلیم دے اور انہیں پاک و پاکیزہ کرے۔ بے شک تو صاحب قدرت وحکیم ہے''۔(بقرہ۔۱۲۹)

یہ تمام خصوصیات، جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اسی دعا میں اپنے مورد نظر رسول کے بارے میں اظہار فرمایا ہے، سوائے پیغمبر خاتم ﷺ کے اور کسی پر صادق نہیں آتیں۔ قرآن کریم کئی مقامات پر آنحضرتؐ کی انہیں صفات سے توصیف فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۱۶۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان فرمایا جب اس نے انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر آیات خدا کی تلاوت کرتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے''۔(آل عمران۔۱۶۴)

آیات قرآن مجید کا یہ حصہ [۱] عہدین کے بارے میں خوشخبری، بشارتوں اور آپ کی مخصوص صفات کی موجودگی پر شاہد ہے، باوجود یہ کہ کتب عہدین میں متعدد بار تحریف کی جا چکی ہے، یہاں تک کہ توریت ایک بار مفقود ہو چکنے کے بعد صرف حافظہ کی مدد سے دوبارہ معرض تحریر میں آئی ہے۔ بہ ایں ہمہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے ان بشارات کا ایک حصہ محفوظ رہا ہے۔ اب بھی دنیا کے مسلمان انہی کتب کا سہارا لے کر کتابیں تحریر کی ہیں جن میں سے اہم تین کتب کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱)۔''اظہار الحق''مؤلفہ شیخ رحمت اللہ ہندی، حقیقت میں نہایت مفید و مستند کتاب ہے۔

۲)۔''انیس الکلام''مؤلفہ فخر الاسلام

۳)۔''الھدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ''مؤلفہ علامہ بلاغی، متوفی ۱۳۵۲ھ۔

[۱] ورہ بقرہ، آیت ۱۵۱ اور سورہ جمعہ آیت ۲ کی طرف رجوع فرمائیں

حیات طیبہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ ولادت تا بعثت

۲۔ بعثت تا ہجرت

۳۔ ہجرت تا رحلت

مقدمہ:۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعات زندگی کو تین اہم اور بنیادی حصوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱)۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ بچپن سے بعثت تک۔

۲)۔آپؐ کی زندگی بعثت سے ہجرت تک۔

۳)۔آپؐ کا دور حیات ہجرت سے رحلت تک۔

قرآن مجید ان تینوں ادوار میں ہر ایک پر ایک خاص طریقہ سے تبصرہ فرماتا ہے۔لیکن ان تینوں زمانوں کی تشریح سے قبل ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب باشندوں کے طرز زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ اس طریقہ سے اسلامی تعلیمات کی قدر و قیمت کو ظاہر کیا جاسکے جو نور کی مانند اس عالم ظلمت میں ضوفشاں ہوئیں۔

آسمانی تعلیمات سے عاری قوم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی قوم میں مبعوث برسالت ہوئے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے قطعی بے بہرہ تھی۔اس قوم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد سے کوئی پیغمبر نہ آیا تھا۔قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

”یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے رحمت تھی کہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا،شاید وہ ہدایت پائیں“۔(قصص۔۴۶)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خدا پر جھوٹ باندھا گیا ہے،بلکہ یہ کتاب برحق ہے جو آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجی گئی ہے تاکہ آپ اس کے ذریعہ اس جماعت کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا،شاید کہ یہ ہدایت پاجائیں“(سجدہ ۳)

پھر تیسری آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۝۶

''تا کہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کو آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جب کہ وہ غافل و بے خبر ہیں''۔ (یس۔۶)

یہ آیات اس حقیقت کی کردیتی ہیں کہ جس قوم میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے وہ ایسی قوم تھی جن میں کبھی کوئی پیغمبر خبر مبعوث نہ ہوا تھا۔ یہ قوم قریش اور ان کے قریبی حلقوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔ اس سے ہرگز ''عرب عدنانی'' مراد نہیں، چہ جائیکہ ''عرب قحطانی'' مراد ہوں کیونکہ زمانہ سابق میں عربی بولنے والی اقوام میں حضرت ہود و صالح و شعیب علیہم السلام جیسے انبیاء مبعوث ہوتے رہے، پھر اس کے بعد کے زمانہ میں ''محالد بن سنان'' اور ''حنظلہ''[1]۔ نامی افراد نبی و ہادی کے طور پر آئے اس طرح ہم تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ عربی زبان بولنے والوں میں کبھی کوئی ڈرانے والا مبعوث نہیں ہوا، بلکہ ہماری مراد دراصل قریش اور ان کے قریبی قبائل ہیں جن کی ہدایت کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوء پیغمبر نہ آیا تھا، یہی زمانہ فترت اس بات کا سبب بنا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قوم شرائع آسمانی کے بالکل بے بہرہ رہی اور صرف معدودے چند لوگ جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اور جنہیں ''حنیف'' کہتے ہیں، دین ابراہیم کی پیروی کرتے تھے۔

قرآن پاک تعلیمات انبیاء سے بے بہرہ اس معاشرہ کی وضع و کیفیت کو اس طرح واضح فرماتا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَھْتَدُوْنَ۝۱۰۳

''سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور متفرق نہ ہو جاؤ، تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمات ہیں انہیں یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے قلوب میں الفت مرحمت فرمائی اور اس کی نعمت کے سائے میں بھائی بھائی ہو گئے۔ تم نار جہنم کے کنارے پر تھے، تو تمہیں اس سے نجات دی گئی۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنی آیات کھول کر بیان فرماتا ہے کہ شاید تم ہدایت پا جاؤ''۔ (آل عمران۔ ۱۰۳)

---

[1] چند روایات میں ان دو افراد کے نام وارد ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں، المیزان، ج۱۶، ص۲۵۷ اور بلوغ الارب، ج۲ ص۲۷۸

یہ آیہ مبارکہ عربوں کی زندگی کی ایک حد تک وحشت ناک کیفیت کی تصویر کشی کرتی ہے جس کی ہم کسی قدر وضاحت کرتے ہیں۔

اول: ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ'' کا جملہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کی کیفیت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا کوئی شخص کنوئیں میں گرا ہوا ہو اور اس مضبوط رسی کو پکڑ کر نجات پالے جس کو اوپر سے کنوئیں کے اندر لٹکایا گیا ہو۔ یہ قوم بھی جہالت و نادانی کے گہرے کنوئیں میں ڈوبی ہوئی تھی اور قرآن و ایمان کی مضبوط رسی کو پکڑ کر انہوں نے ایسی بدبختی کی زندگی سے نجات پائی۔

دوم: ''وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا'' کا جملہ ترجمانی کرتا ہے کہ ان لوگوں کی زندگی اس شخص کی مانند تھی جو آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑا ہو جو مسلسل نیچے کی طرف کھسک کر رہا ہو اور زیادہ دیر گزرنے سے پہلے وہ شخص اس آتشیں گڑھے میں جا پڑے۔ ممکن ہے کہ اس پر از آتش گڑھے سے، جس کے کنارے پر قوم عرب کھڑی ہوئی تھی، جہنم کے علاوہ ان کے قبائلی نزاعات اور لڑائیاں مراد ہوں جو ان کو تباہ و برباد کر رہی تھیں اور جن کی آگ سالہا سال سے ان کے درمیان بھڑک رہی تھی۔ لیکن اسلام کے سایہ کے نیچے عداوت کی جگہ اخوت نے لے لی اور دشمنی کی جگہ بھائی چارہ قائم ہو گیا اور سب کے سب آیہ مبارکہ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' کے مطابق ایک دوسرے کے برابر اور بھائی بھائی بن گئے۔

متذکرہ بالا آیہ مجیدہ اس ماحول کی کیفیت کو، جس میں پیغمبر اسلام ﷺ مبعوث برسالت ہوئے تھے، اختصار کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے دو راستے ہیں جن میں سے صرف ایک راستہ ہمارے لیے روشن و واضح ہوتا ہے:

۱)۔ دوسری ایسی آیات کا مطالعہ اور ان سے متعلق جو عربوں کی زندگی اور ان کی عادات، اخلاق، افعال اور اعمال کی تشریح کرتی ہیں۔

۲)۔ سیرت و تاریخ کی کتب کی طرف مراجعت، خصوصاً وہ کتب جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی اور عادات و اخلاق کے متعلق تحریر ہوئی ہیں کیونکہ مسلمان مؤرخین نے عربوں کی عادات و تہذیب کو شرح و بسط سے لکھا ہے۔ مصنفان قدیم میں ابن قتیبہ کا نام آتا ہے جس کو بلا اختلاف تاریخ عرب کا ماہر استاد تسلیم کیا گیا ہے علیٰ ہذا القاس متاخرین میں استاد سید محمود شکری آلوسی بغدادی مؤلف کتاب ''**بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب**'' (تین جلدوں میں) اور استاد ڈاکٹر جواد، مؤلف کتاب ''**تاریخ العرب**'' (دس جلدوں میں) کے نام لیے جا سکتے ہیں جو اس زمانہ کے تاریخ عرب کے محقق ہیں۔

چونکہ ہماری بحث صرف آیات قرآن مجید پر مبنی ہے اس لیے ہم صرف طریق اول ہی کو اختیار کرنے پر اکتفار کرتے ہیں۔ اس لیے ہم ان آیات پاک ہی کو پیش کرتے ہیں جو اس موضوع پر نازل ہوئی ہیں جہاں تک ان آیات مجیدہ میں وارد ہے شدہ موضوعات کا تعلق ہے، ہم ان کی خصوصیات اور جزئیات کی تشریح و تفسیر کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھیں گے۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی خصوصیات زندگی

بزبانِ قرآن مجید

مذکورہ عنوان کے تحت جاہلیت کے عربوں کی خصوصیات کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن کی علیحدہ علیحدہ تشریح پیش کی جائے گی:

(ا)۔شرک در عبادت

(ب)۔انکار معاد

(ج)۔حکومت خرافات

(د)۔فسادِ اخلاق

(ھ)۔اولاد کو زندہ در گور کرنا

(و)۔فرشتوں کے بارے میں اعتقاد

(ز)۔حیوانات سے مستفید ہونے کی کیفیت

(ح)۔تقسیم بذریعہ ازلام

(ط)۔ماہ ہائے حرام میں التواء

(ی)۔فوائد کا ظالمانہ حصول

ہم ان موضوعات کی الگ الگ تشریح اور وضاحت کرتے ہیں:

(ا)۔شرک در عبادت

زمانہ جاہلیت کے عرب قرآن کی رو سے بعض مسائل میں موحد شمار کیے جا سکتے ہیں۔ مجوسیت کی ثنویت اور مسیحیت کی تثلیث کے برعکس وہ خدائے واحد و یکتا پر اعتقاد رکھتے تھے جو اس کائنات کا مالک و مدبر ہے۔ وہ توحید ذاتی کے بارے میں، یعنی خدا ایک ہے اور اس کی کوئی نہ نظیر ہے اور نہ ثانی اور خلاق عالم کی توحید و تدبیر، یعنی اس حقیقت میں کہ کائنات کا خالق اور اسے چلانے والا صرف خدائے وحدہٗ لاشریک ہے، کسی قسم کا شک یا تردد نہ رکھتے تھے۔ اس دوران اگر معدودے چند افراد نے، جو اس قدر کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اگر ان

عقائد سے تجاوز کیا اور اس طرح شرک سے دو چار ہو گئے تو مقیاسِ افکارِ عمومی قرار نہیں دیا جا سکتا[1]

زمانہ جاہلیت کے عربوں کا شرک غالباً مسئلہ عبادت ہی میں منحصر تھا۔ وہ اس سلسلہ میں پست ترین مقام تک گر چکے تھے۔ ان کے خلاف قرآن مبارزہ شرک کی اسی نوع کے متعلق تھا۔ اس موضوع پر علماء نے طویل مباحث انجام دی ہیں، اس لیے ہم ان کی وضاحت وصراحت کو یہاں ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم اس سے قبل ''دائمی منشور'' کی دوسری جلد میں توحید وشرک کی انواع پر مفصل ترین بحث کر چکے ہیں اور اب اس کے تکرار کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ہماری کتاب کی جلد دوم کی طرف رجوع فرمائیں۔

(ب)۔ انکارِ معاد

مشرکین عرب جب حیات جدید اور اپنے اعمال وافعال کے ہمراہ دوسری زندگی میں پہنچنے کے بارے میں سنتے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، اس سے انہیں بہت دکھ ہوتا۔ یہ ردّعمل قطعی طور پر ایک فطری امر تھا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جب کسی جماعت کو، جو حساب وکتاب کے تصور کے بغیر زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی ہو، کہا جائے کہ تمہارا تمام کردار زیر سوال آئے گا، تمہاری تمام اچھائیاں اور بداعمالیاں خواہ چھوٹے سے ذرہ کے برابر ہوں، ان کی پاداش وجزا ہوگی۔ تو فطری طور پر وہ خوف سے لرزہ براندام ہوں گے اور اپنے ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لئے ایسا کہنے والے کے وجدان کو جنون ودیوانگی قرار دیں گے اور اس کو خداوند عالم پر جھوٹ بولنے اور اتہام لگانے والا سمجھیں گے۔ آیات جن میں مشرکین عرب کے معاد کے خلاف عقیدہ کا ذکر ہوا ہے، بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے تھوڑی سی آیات کو نقل کرنا بھی بوجہ طوالت ممکن نہیں۔ اس لیے ہم ایک آیت پیش کرنے پر ہی سردست اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾

''کافروں نے کہا کیا ہم نے ایسے شخص کی طرف تمہاری رہبری کریں جو کہتا ہے کہ اس کے بعد کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو دوبارہ نئی زندگی حاصل کرو گے، کیا اس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے یا اسے

---

[1] قرآن مجید نے ان افکار کے وجود کو پیش کیا ہے جن کے بارے میں طبیعت وزمانہ وگردشِ افلاک کی طرف نسبت دی جاتی تھی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ (جاثیہ) انہوں نے کہا کہ اس دنیا کی زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں ہے جس میں ہم مر جائیں گے اور دوبارہ زندہ ہوں گے اور زمانہ کے علاوہ کوئی چیز ہمیں ختم نہیں کرتی۔ وہ اپنی بات کا علم نہیں رکھتے بلکہ صرف گمان سے کام لیتے ہیں

جنون ہو گیا ہے؟ (نہیں) بلکہ جو آخرت کے گھر پر ایمان نہیں رکھتے وہ انتہا سے زیادہ عذاب و گمراہی میں مبتلا ہیں"۔ (سبا۔ ۷، ۸)

(ج)۔ حکومتِ خرافات

تعلیمات آسمانی کی بنیادی تصوراتی قیود کو توڑنے اور افسانوی پردوں کے ہٹانے پر ہے۔ یہ قیود بند ہا مشرکین کے ماحول زندگی میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کے مشخصات میں ایسی خرافات اور غلط پنداروں کے خلاف مبارزہ کو شامل قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط

''بار ہائے سنگین و (پندار و افسانوں کی) قیود کو جو ان کے ہاتھ پاؤں ح کو جکڑے ہوئے ہیں اٹھا دیتا ہے''۔ (اعراف۔ ۱۵۷)

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی تصورات و افسانہ پرستی سے مملو تھی جس کا نمونہ چار قسم کے پالتو جانوروں سے استفادہ کرنے کو حرام جاننا اور اس کو ممنوع قرار دینا تھا۔ لیکن قرآن مجید اس بدعت پر تنقید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٣﴾

''خدا تعالیٰ نے کسی قسم کا ''بحیرہ''، ''سائبہ''، ''وصیلہ'' اور ''حام'' قرار نہیں دیا جو لوگ کافر ہو گئے ہیں انہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور ان میں اکثر عقل نہیں رکھتے''۔ (مائدہ۔ ۱۰۳)

یہ چاروں الفاظ، جن کی ہم ابھی وضاحت کریں گے، چار قسم کے حیوانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے نہ صرف گوشت سے فائدہ اٹھانا ممنوع تھا بلکہ ان کا دودھ پینا، اون اتارنا اور ان پر سوار ہونا بھی ممنوع شمار ہوتا ہے چاروں قسموں کے یہ جانور بالکل آزاد پھرتے تھے، کسی کو ان سے تعرض کا حق نہ تھا، ان جانوروں کی تفصیل یہ ہے:

بحیرۃ:۔ وہ مادہ جانور جو پانچ مرتبہ بچہ دے اور اس کا آخری بچہ مادہ ہو، بعض لوگ کہتے تھے کہ پانچوں بچے نر ہو۔ اس کا مالک اس کے کان میں بڑا سا سوراخ کر دیتا تھا اور یہ علامت دے کر اسے آزاد چھوڑ دیتا تھا۔

سائبہ:۔ اونٹنی جو بارہ بچوں کو جنم دے چکی ہو اسی طرح مطلقاً آزاد ہوتی تھی۔ وہ کسی بھی چراگاہ میں چلی جاتی یا کسی گھاٹ اور چشمہ سے پانی پی لیتی تھی کسی کو اس سے مزاحمت کا حق نہ تھا۔ صرف مہمان کے لیے کبھی کبھی اس کا دودھ دوہ لیتے تھے۔

وصیلہ:۔ وہ بڑی جو سات بچوں کو جنم دے چکی ہو یا دو مرتبہ اس نے جڑواں بچے دیے ہوں۔

حام: وہ نر جانور جس کو مادہ سے بچہ لینے کے لیے استعمال کرتے تھے، جب اس سے دس بار استفادہ کر چکتے اور ہر مرتبہ اس کے نطفہ سے بچہ پیدا ہوتا تو پھر کوئی اس پر سوار ہونے کا حق نہ رکھتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے حیوانات سے استفادہ کرنے کی ممانعت کا مقصد ان جانوروں کی قدردانی تھا کیونکہ اس کو برکات کا سبب مانا جاتا تھا۔ لیکن یہ قدردانی بسا اوقات ان جانوروں کی بدبختی وجان کا ہی کا موجب بن جاتی تھی کیونکہ جب اس قسم کے جانوروں سے استفادہ کرنے کی ممانعت کا اعلان ہوجاتا تو کوئی ان جانوروں کے لیے پانی و چارہ کا فکر نہ کرتا جس کے نتیجہ میں یہ بے چارے جانور ہمیشہ کے لئے ایک خاص قسم کو محرومیت کا شکار ہوجاتے اسی طرح یہ قدردانی جانوروں کے لئے کامل طور پر ضرررساں ہوجاتی، اس کے علاوہ یہ عمل اتلاف مال اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کے معطل ہونے کا سبب بھی بن جاتا۔

آیہ مبارکہ ''وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے جانوروں کی حرمت وامتناع کو خداوند تعالیٰ سے منسوب کرتے تھے اور انہیں تعلیمات خداوندی کا حصہ قرار دیتے تھے۔

(د)۔ فسادِ اخلاق

فسادِ اخلاق کے وسائل وذرائع کے سلسلہ میں قرآن مجید دو اہم ترین موضوعات کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ یہ دونوں قمار اور شراب ہیں جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں مکمل طور پر رائج تھے۔ قمار کو ''میسر'' کا نام دیتے تھے جو ''یسر'' سے آسانی کے معنی میں لیا گیا ہے۔ قمار کو ''میسر'' کا نام دینے کی علت وسبب یہ تھا کہ قمار بازی کرنے والے اس طریقہ سے بڑی آسانی کے ساتھ لوگوں کا مال اپنی جیب میں ڈال سکتے تھے۔

شراب کے یہ لوگ اس قدر عادی تھے کہ بعض لوگ صرف اس لیے اسلام کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے کہ اسلام میں شراب کی ممانعت تھی۔ زمانہ جاہلیت کا مشہور عرب شاعر صرف اسی لیے اسلام نہ لایا حالانکہ آنحضرتؐ سے ملاقات کا مقصد لے کر وہ روانہ ہوا اور صعوبات سفر کو برداشت بھی کیا، جب کہ اس ملاقات سے اس کی مراد صرف توحید پرستی کو قبول کرنا تھا۔[1]

قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

''وہ آپ سے شراب وقمار کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ ان دونوں کا گناہ بہت بڑا

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ا

گناہ ہے۔ان میں لوگوں کے لیے منفعت بھی ہے لیکن ان کا گناہ منفعت سے (کہیں) زیادہ ہے''۔(بقرہ۔۲۱۹)

قرآن مجید نے مختلف پیام واحکام کے ذریعہ چار مراحل میں شراب خواری کو جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی میں گہری جڑ پکڑ چکی تھی، جڑ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔اس کی تفصیل تفسیر احکام فقہ کی کتب میں پائی جاتی ہے۔[1]

زمانہ جاہلیت کے عربوں کا اخلاقی معاشرہ صرف شراب وقمار ہی کی وجہ سے انحطاط پذیر نہ تھا بلکہ فحش اعمال مختلف صورتوں میں ان کے درمیان مکمل طور پر رائج تھے۔اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ کلمہ ''فحشاء'' قرآن مجید میں تیرہ مرتبہ زنا، لواطت اور دیگر قبیح ورسوا کن امور کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ان تمام باتوں کے لیے ہم سورۂ ''نساء'' کی آیات ۱۵، ۱۶ اور سورۂ ''نور'' کی آیات ۲، ۳ کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔

(ھ)۔اولاد کو زندہ در گور کرنا

بنی نوع انسان کی تاریخ میں زمانہ جاہلیت کی عرب قوم نے پہلی بار ایک ایسا رسوا کن وغیر مہذب عمل شروع کیا جو ان کی شدید قسم کی قساوت قلبی کا مظہر ہے۔یہ لوگ قومی سطح پر سوچنے لگے کہ قحط رونما ہونے کی صورت میں اولاد کے نان ونفقہ اور ان کی زندگی کے دیگر اخراجات پورا کرنا ممکن نہ ہوگا۔علیٰ ہذا القیاس بیٹیوں کے بارے میں یہ خوف ہوتا تھا کہ بیٹی کہیں کسی وقت ننگ و عار کا باعث نہ ہو جائے۔ان تصوراتی خدشات کے پیش نظر انہوں نے یہ وحشیانہ رسم اختیار کر لی کہ اولاد کو، بالخصوص لڑکیوں کو، زمین میں زندہ دفن کر دیتے۔قرآن مجید میں پہلی مرتبہ اس موضوع پر ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ‌ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ﴿۳۱﴾

''اور اپنی اولاد کو بھوک کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں اور انہیں بھی روزی دیں گے۔ان (معصوم) افراد کا قتل بہت بڑا گناہ ہے''۔(اسراء، ۳۱)

فرزدق کا دادا، جس کا نام صعصۃ بن ناجیہ تھا، پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لے آیا۔اس نے اپنے افعال نیک کو، جو وہ اسلام سے پہلے انجام دے چکا تھا، شمار کرنا شروع کیا۔اس نے کہا کہ میں نے تین اونٹ، جن میں دو مادہ تھیں اور ایک نر تھا، دے کر دو سو ایسی لڑکیوں کو نجات دلوائی جن کے مار ڈالنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔پھر اس نے آنحضرتؐ سے پوچھا: ''کیا اس عمل کا مجھے کوئی اجر

---

[1] فروغِ ابدیت، ج ۲

ملے گا؟'' آنحضرتؐ نے فرمایا: ''لك اجره اذ من الله بالاسلام '''' تیرے اس کام کا یہی اجر کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا اور تیری اسلام کی طرف ہدایت فرمائی''۔

فرزدق اس بات کو اپنے افتخارات میں سے ایک جانتا ہے کہ اس کا دادا وہ اکیلا شخص ہے جس نے لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچا لیا۔ وہ اس بارے میں کہتا ہے:

وَمِنَّا الَّذِیْ مَنَعَ الْوَآئِدَاتِ
وَاَحْیَا الْوَئِیْدَ فَلَمْ یُؤَادِ

''اور وہ شخص ہم میں سے ہے جس نے لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچا لیا اور جن کی موت کا حکم دیا جا چکا تھا، انہیں زندہ دفن نہ ہونے دیا''[1]

ذیل کی دو آیات مبارکہ میں اشارہ ہو رہا ہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب لڑکی کے وجود سے متنفر تھے:

۱)۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی ولادت کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے غصہ کو پی جاتا ہے''۔ (نحل۔۵۸)

۲)۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''خبر کی برائی سے اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ کیا اسے اس ذلت وخواری سے روکے رکھے یا مٹی میں چھپا دے (دفن کر دے) وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں''۔ (نحل۔۵۹)

(و)۔ فرشتوں کے بارے میں اعتقاد

دورِ جاہلیت کے عرب صرف ایک تصوراتی نظریہ کی بناء پر فرشتوں کو مؤنث جانتے تھے اور انہیں خدائے تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةَ اِنَاثًا

---

[1] بلوغ الارب، ج ۳، ص ۴۶

وَّهُمۡ شٰهِدُوۡنَ۝۱۵۰ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ۝۱۵۱ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ۝۱۵۲ اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ۝۱۵۳ مَا لَكُمۡ ۟ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ۝۱۵۴

''کیا تمہارے پروردگار کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے ہیں؟ کیا انہوں نے دیکھا ہے کہ ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا ہے؟ آگاہ رہو کہ وہ جہالت کی بناء پر کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں اولاد ہوئی ہے۔ البتہ وہ جھوٹ بکتے ہیں۔ خدا نے بیٹیوں کو بیٹوں پر کیسے انتخاب کیا، وہ کیسا جاہلانہ فیصلہ کرتے ہیں''۔ (صافات)

(ز)۔ حیوانات سے مستفید ہونے کی کیفیت

دورِ جاہلیت کے عرب متذکرہ بالا چار اقسام کے جانوروں کے گوشت، دودھ اور ان کے استعمال کو تو ممنوع قرار دیتے تھے لیکن اس کے برعکس مردار، خون، خنزیر اور ان جانوروں کے گوشت وغیرہ سے جن کو شکنجہ میں کس کر یا تکلیف دے کر مار ڈالا جاتا تھا، بہرہ مند ہونے کو نہ صرف جائز سمجھتے تھے بلکہ شاید اسے ایک قسم کی عبادت شمار کرتے تھے۔ درج ذیل آیہ مبارکہ ان اقسام کے گوشت کا ذکر کرتی ہے جن کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے اور جو سب زمانہ جاہلیت میں حلال تصور کیے جاتے تھے۔ اسی سے اس قوم کے مقام تمدّن و انسانیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِكُمۡ فِسۡقٌ ؕ

(سورہ مائدہ آیات نمبر ۳)

متذکرہ بالا آیہ مبارکہ مندرجہ ذیل چیزوں کو حرام قرار دیتی ہے:۔

۱)۔ مردار کا گوشت

۲)۔ خون

۳)۔ خنزیر کا گوشت

۴)۔ وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو

۵)۔وہ جانور جس کو گلا دبا کر مارا گیا ہو۔

۶)۔وہ جانور جس کو لاٹھیوں سے مارا گیا ہو۔

۷)۔وہ جانور جو بلندی سے گر کر مر جائے۔

۸)۔وہ جانور جو کسی اور جانور کے سینگ لگنے سے مر جائے۔

۹)۔وہ جانور جس کو درندہ نے کاٹ کھایا ہو مگر یہ کہ مرنے سے قبل اسے ذبح کرلیا جائے۔

۱۰)۔وہ جانور جو بتوں کے سامنے ذبح ہو۔

قرآن مجید اس قسم کے جانوروں کے گوشت کھانے سے منع فرماتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے گوشت کا استعمال جاہلیت کے عربوں میں مکمل طور پر رائج تھا اور یہ لوگ جانور کو ذبح کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے استعمال کرتے تھے:

(ا)۔جانور کو دولکڑیوں یا درخت کی دوشاخوں کے درمیان اس طرح دباتے کہ وہ مرجاتا۔پھر اس کے بعد گوشت کو استعمال کرتے۔اس طریقہ کو ''اَلْمُنْخَنِقَةُ'' کہتے ہیں۔

(ب)۔جانور کو اس قدر مارتے کہ وہ مرجاتا اس کو''اَلْمَوْقُوْذَةُ'' کہتے ہیں۔

(ج)۔جانور کو بلندی سے گراتے کہ وہ مرجاتا۔اس کو''اَلْمُتَرَدِّيَةُ'' کہتے ہیں۔

(د)۔دو جانوروں کو آپس میں لڑاتے ۔وہ دونوں ایک دوسرے کو اتنے سینگ مارتے کہ کوئی ایک یا دونوں مرجاتے۔اس کو ''اَلنَّطِيْحَةُ'' کہتے ہیں۔

(ح)۔تقسیم بذریعہ''ازلام''

دورِجاہلیت کے عربوں کے درمیان گوشت کی تقسیم بذریعہ''ازلام''ایک قسم کی قماز بازی کے طور پر مروج تھی۔''ازلام''''زلم'' کی جمع ہے(بروزن شرف)۔تیروں کی لکڑیوں کو کہتے ہیں جن کے ذریعے گوشت کی تقسیم انجام پاتی تھی۔اس کی کیفیت ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

دس آدمی مل کر ایک اونٹ خریدتے اور اسے ذبح کرتے تھے۔پھر تیر کی دس لکڑیاں لیتے۔ان لکڑیوں میں سات پر حصوں کی مختلف مقدار ایک سے سات تک لکھتے اور باقی تین پر کچھ نہ لکھتے۔ان لکڑیوں کو ایک تھیلی میں ڈال دیتے جو اس کام کے لیے مخصوص ہوتی۔پھر اس کے بعد ان لکڑیوں کو ایک ایک کر کے ان دس افراد کے نام باری باری نکالتے۔ان لوگوں میں سات کو تیر پر لکھے ہوئے حصہ کی مقدار برابر حصہ ملتا جس کے لیے ان کو کچھ دینا نہ پڑتا۔لیکن وہ تین شخص جن کے ناموں پر بغیر تحریر خالی تیر رہ جاتے،ان میں سے ہر ایک جانور کی قیمت کا ایک تہائی ادا کرتا درآنحالیکہ اس کو گوشت میں کوئی حصہ نہ ملتا۔

قرآن مجید متذکرہ بالا آیہ مبارکہ کے ذریعے گوشت کی اس قسم کی تقسیم کی ممانعت فرماتا ہے۔اور اس تقسیم کو''وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ''ایک قسم کی قماز بازی قرار دیتا ہے جس میں فسادِ قمار شامل ہے۔

(ط)۔ ماہ ہائے حرام میں التوا

زمین کے گرد چاند کی ایک مکمل گردش کو ایک مہینہ کہتے ہیں۔ یہ عمل ایک سال میں بارہ مرتبہ انجام پاتا ہے ان بارہ مہینوں میں چار مہینوں کو ''اشھر الحرم'' کہتے ہیں۔۔ان میں تین مہینے یکے بعد دیگرے ذیقعد، ذی الحجہ، اور محرم ہیں اور چوتھا مہینہ رجب کا ہے جو ان سے الگ ہے۔ان چار مہینوں میں جنگ کے حرام جاننے کا رواج زمانہ جاہلیت کے عربوں کے درمیان رائج تھا۔شاید یہ رسم ایک خوشگوار اور پرانی سنت کے طور پر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے ان تک پہنچی تھی۔

متولیان کعبہ اور سرداران عرب کبھی دولت لے کر یا اپنی ہوا و ہوس کے پیش نظر کبھی کبھی ان حرام مہینوں کو بھی مؤخر کر دیتے تھے ۔قرآن اس کو ''نسیئ'' کے لفظ سے یاد کرتا ہے، جہاں فرماتا ہے:

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

''حرام مہینوں کو مؤخر کرنا کفر میں زیادتی ہے۔اس طرح کافر اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ایک سال اسے حلال اور دوسرے سال اسے حرام کر دیتے تھے تاکہ ان مہینوں کی تعداد ان کے مطابق ہو جائے جن مہینوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔اور اسی طرح چار کا عدد مکمل ہو جائے۔اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال شمار کرنے لگتے ہیں۔ان کے قبیح افعال ان کی نظروں میں زیبا معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کبھی قوم کفار کی ہدایت نہیں فرماتا''۔(توبہ۔۳۷)

''نسیئ'' کی کیفیت اور حرام مہینوں کی تاخیر یا ایک دوسرے سے تبدل، کتب تاریخ و تفسیر میں مذکور ہوئے ہیں۔اس عمل کی ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ جو جماعت تین لگاتار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت کے حلال ہونے کا اعلان کر دیں اور اس کے بجائے ماہ صفر کو ماہ حرام قرار دے دیں تاکہ اس طرح چار مہینوں کی تعداد مکمل ہو جائے۔متذکرہ بالا آیہ مجیدہ میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے، جس کے الفاظ ''لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ'' ہیں ''تاکہ حرام مہینوں کی تعداد کے مطابق ان کا اعلام کر دیں''۔یہ لوگ اگر کسی ایک سال میں ماہ حرام کو مؤخر کر دیتے تو دوسرے سال اسی مہینہ کے ماہِ حرام ہونے کا اعلان کرتے جیسا کہ ''وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا'' کے جملہ میں فرمایا گیا ہے۔

(ی)۔ فوائد کا ظالمانہ حصول

''استعمار'' اور ''استثمار'' عربی زبان کے مقدس ترین الفاظ سے ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان الفاظ نے مرور زمانہ سے اپنے

واقعی معنی کھو کر اپنی اضداد کے معانی کو اپنے دامن میں لے لیا ہے۔"استعمار"،"عمران" سے ہے جس کے معنی آبادی کا تلاش کرنا ہے اور "استثمار"،"ثمر" سے ہے جس کے معنی ہیں کسی ایک واحد طبیعی کے لحاظ سے پھل مہیا کرنا اور کسی ایک صفت سے بہرہ مند ہونا ہے۔پہلی اصطلاح کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا

"اس نے تمہیں خاک سے پیدا کیا اور پھر اس کی آبادی کو تم سے طلب کیا"۔(ہود۔٦١)

دوسری اصطلاح کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝١٤١

"جب وہ پھل دار ہو جائے تو اس کا پھل کھاؤ اور اس کا حق کاٹنے کے وقت ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو ۔بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا"۔(انعام۔١٤١)

لیکن بدقسمتی سے آج کل دونوں الفاظ بہت برے معنی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔"استعمار" کا لفظ غلامی، نوکری اور مستکبر کے مستضعف کے مال پر تسلط پانے یا اسے لوٹ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح لفظ "استثمار" ظالمانہ سودمندی اور کسی کمزور سے بغیر کسی حد و حساب کے فائدہ حاصل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔بہر حال اسی اصل کا روشن مصداق سودخوری ہے۔سودخور خداداد ثروت و دولت کو ایک طرف اور جملہ نقصانات اقتصادی کو دوسری طرف کر دیتے ہیں کیونکہ سودخور کا سرمایہ شب و روز غریب لوگوں کی کمائی کو نگلتا رہتا ہے۔قرض دار کو خواہ فائدہ ہوتا ہو یا نقصان۔سودخوری کا نظام جاہلیت کے زمانہ کے عربوں کی اقتصادیات کی عمارت کے لیے ستون کا کام دیتا تھا۔قرآن مجید دورِ جاہلیت کے عربوں کے رسوم و رواج کے اس اقتصادی نظام کے خلاف زبردست مبارزہ کرتا ہے۔ہم اس سلسلہ میں ایک آیہ مبارکہ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٢٧٨ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝٢٧٩

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ مطالبات (سود ربا) میں سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر ایمان رکھتے ہو۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسولؐ سے اعلان جنگ کر دو۔لیکن اگر توبہ کر لو تو تمہارے سرمائے تمہاری ہی ملکیت ہوں گے۔(اس صورت میں) نہ ظلم کرو اور نہ موردِ ظلم

قرار پاؤ''۔(بقرہ۔۲۷۸،۲۷۹)

عجیب بات یہ ہے کہ یہ قوم (عرب جاہلیت) ربا یعنی سودخوری کے جواز کے لیے ایک خاص منطق پیش کرتے تھے۔ یہ لوگ کہتے تھے: ''اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا'' (سورۂ بقرہ۔۲۷۵) یعنی بیع اور ربا ایک ہی جیسی چیزیں ہیں۔ اگر خرید وفروخت حلال ہے تو دولت کے معاوضہ میں منفعت حاصل کرنا بھی حلال ہے۔ قرآن مجید ان کی اس منطق کی تردید میں فرماتا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ

''یعنی ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے''۔(بقرہ۔۲۵۷)

اس کی وجہ یہ ہے کہ خرید وفروخت میں طرفین یکساں صورت میں ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں اور نفع ونقصان کے احتمالات دونوں افراد پر یکساں عمل پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سودخوری کے نظام میں سودخوار کبھی بھی نقصان سے دوچار نہیں ہوتا اور نقصان کا عنصر ہمیشہ فریق مخالف پر غالب آتا ہے یہی وہ غیر معتدل طریق کار ہے جس کے باعث سودخواری کے ادارہ جات ہمیشہ اپنی دولت وثروت میں افزائش کی طرف راجع رہتے ہیں، جب کہ فریق ثانی ہمیشہ ہمیشہ زحمت میں مبتلا ہو کر اپنا نان ونفقہ بہم پہنچاتے اور زندگی گزاتے ہیں۔ دور جاہلیت کے عربوں کے طرز زندگی کا قرآن کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت

آنحضرتؐ کی واضح صفات وروحانیت: آپ کی حیات معنوی وشجاعت کا تجزیہ پیش کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم مکمل طور پر قرآن حکیم کے فرمودات سے مدد لیں گے یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ہر حصہ ایک مستقل فصل کی صورت میں مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے گا:

۱)۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی.................. ولادت سے بعثت تک۔

۲)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی.................. بعثت سے ہجرت تک۔

۳)۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی.................. ہجرت سے رحلت تک۔

اس کے بعد ہم حصہ اول سے آنحضرتؐ کی حیاتِ مقدسہ کی ابتداء کرتے ہیں۔

حصہ اوّل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی حیات طیبہ
ولادت مبارک سے روز بعثت تک

میلادنور اور بعثت سے پہلے کے واقعات

جناب سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۷ ربیع الاول بروز جمعہ، طلوع آفتاب عالم تاب کے وقت اس جہان فانی میں وارد ہو کر چشم مبارک کھولی۔ یہی وہ سال تھا جب ابرہہ اپنی ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ پھر اپنے سن مبارک کے چالیسویں سال ماہ رجب المرجب کی ستائیس تاریخ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منزل نبوت ورسالت پر فائز ہونے کا اعلان فرمایا اور عالمین کی ذمہ داری کا افتخار حاصل کیا۔[1]

آنحضرتؐ کی حیات مقدس کے اس دور (ولادت تا بعثت) کی خصوصیات کتب حدیث وتاریخ میں مرقوم ہیں لیکن یہ ایک ایسا انبوہ منقولات وروایات ہے جس میں صحیح واقعات کا ضعیف سے جدا کرنا ہرگز آسان نہیں، اور ایسا کرنا ضابطہ ''نقدِ تاریخ'' اور اصول ''حدیث شناسی'' کے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے قرآن مجید بھی آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کے اس دور کے بارے میں کہیں کہیں مختصر ومبہم اشارے فرماتا ہے جو بے شمار حوادث میں مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق پرانتے تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ حوادث ہیں جو آنحضرتؐ کی منزل نبوت ورسالت کی کیفیت ووضع کی وضاحت اور آپؐ کے دعویٰ کی صحت پر شاہد ہوسکتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید سورۂ ''والضحیٰ'' میں اس دورِ حیات کے چند حوادث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﴿٦﴾ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ﴿٧﴾ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ﴿٨﴾

''کیا تجھے یتیم پاکر پناہ نہ دی گئی؟ اور تجھے ناواقف پاکر منزل تک پہنچا دیا؟ اور تجھے تہی دامن کر بے نیاز وغنی نہیں کیا گیا''۔ (والضحیٰ)

ان آیات مبارکہ میں جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے زمانہ سے متعلق تین موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جو اس طرح ہیں:۔

۱)۔ بچپن ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یتیمی۔

۲)۔ گمراہی (لاعلمی) کے بعد لباس ہدایت سے آراستگی۔

۳)۔ تہی دستی کے بعد نیازی۔

ان تینوں ادوار کی وضاحت سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

---

[1] علمائے شیعہ کے نزدیک یہی نظریہ ہے جس کا ذکر ہوا۔ البتہ علمائے اہل تسنن آنحضر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت اور بعثت کے متعلق مختلف نظریہ رکھتے ہیں جس کو کتاب ''فروغ ابدیت'' میں بیان کیا گیا ہے۔

(ا)۔ ''اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی''

عربی زبان میں ''یتیم'' اس کو کہتے ہیں جو شفقت پدری سے محروم ہو یعنی اس کا باپ دنیا سے وفات پا چکا ہو۔ اسی طرح ''لطیم'' وہ ہوتا ہے جس کے ماں اور باپ دونوں اس دنیا سے انتقال کر چکے ہوں۔

پیغمبر اکرم ﷺ ہنوز شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کے پدر بزرگوار حضرت عبداللہ اس دارِفانی سے کوچ فرما گئے۔ حضرت عبداللہ قریش کے کاروان تجارت کے ہمراہ مکہ مکرمہ کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستہ میں یثرب کے مقام پر بیمار ہو کر وہاں اپنے اعزا کے درمیان صاحب فراش ہو گئے۔ قافلہ والوں نے آپ کی بیماری کی اطلاع مکہ میں پہنچائی جہاں آپ کے والد بزرگوار حضرت عبدالمطلبؑ نے اپنے سب سے بڑے فرزند حضرت حارث کو مامور فرمایا کہ وہ یثرب جائیں اور حضرت عبداللہ کو اپنے ساتھ مکہ لے آئیں۔ حضرت حارث جب یثرب پہنچے تو انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بھائی حضرت عبداللہ قافلہ کی یثرب سے روانگی کے ایک ماہ بعد اس بیماری میں فوت ہو چکے ہیں۔ [۱]

آنحضرتؐ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ کی قبر مبارک مسجد نبوی میں ایجادِ مصلی سے قبل ایک حجرہ میں محفوظ تھی لیکن دشمنان آثارِ رسالت (سعودیوں) نے ایجادِ مصلی کے بھانے اس حجرہ کو ختم کر کے حضرت کے مرقدِ مبارک کا نام ونشان مٹا دیا۔ اس طرح حضرت عبداللہ کا مدفن اس مصلی کا ایک حصہ بن گیا۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

''اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی''

''کیا تمہیں یتیم نہ پایا اور تم نے پناہ نہ حاصل کی''۔

کبھی کبھی آیہ مبارکہ میں لفظ ''یتیم'' کی تفسیر بطور ''وحید وتنہا'' بھی کی گئی ہے۔ یعنی زبان عربی میں گوہر گراں بہا و بے مثال ونایاب کو بھی ''الدّرۃ الیتیمۃ'' کہتے ہیں۔ [۲] تاہم پہلی تفسیر 'فَاٰوٰی'' کے جملہ کے ساتھ بہتر مطابقت رکھتی ہے۔

بچپن کے زمانہ میں یتیمی اور اس قسم کی تہی دستی، جس کی طرف آیہ مبارکہ میں اشارہ کیا گیا ہے، ہمیشہ سختی اور شدید حالات کے ساتھ توأم ہوا کرتی ہے۔ یہی وہ شدید حالات ہوتے ہیں جن سے ایک باحوصلہ وشجاع شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ کائنات کے عظیم انسانوں کی شخصیت ہمیشہ ان مصائب ومشکلات وشدائد سے، جو ان کی پیدائش اور آغاز زندگی کے دوران پیش آتے ہیں، بنتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ایسے بندہ کی شخصیت کے لیے جس کو ابوجہلوں اور ابولہبوں کا مقابلہ کرنا، ایسی تربیت لازم ہے جس کو مصائب وشدائد نے پختہ کیا ہو تاکہ وہ تبلیغ ودعوت کے نشیب وفراز میں مکمل طور پر اپنے آپ پر قابو رکھے۔ ہر طرح بربادا ور اختیار کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑ بیٹھے۔

حضرت امام ہشتم، امام علی رضا علیہ السلام اس بارے میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ حضرت سے جب سوال کیا گیا کہ

---

[۱] تاریخ طبری، ج ۲ ص ۷۔۸، سیرت حلبی، ج ۱، ص ۵۹

[۲] تفسیر قمی، ص ۷۲۹

حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یتیم ہونے کا راز کیا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"لِئَلَّا يَجِبُ عَلَيْهِ حَقٌّ لِمَخْلُوقٍ"

"تاکہ کسی مخلوق کی اطاعت کا حق آپؐ کی گردن پر نہ ہو"۔[1] (کیونکہ باپ بیٹے کی گردن پر حق اطاعت رکھتا ہے۔)

(ب)۔"وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى"

ضلالت کے معنی گمراہی اور ہدایت کے معنی رہنمائی ہیں۔اب دیکھنا ہوگا کہ یہ کس قسم کی ضلالت ہے جو عصمت کے منافی نہیں۔مفسرین کرام نے اس بارے میں بہت سے مختلف نظریات پیش کیے ہیں جو شاید آیہ مبارکہ کے ساتھ بظاہر کسی قسم کی مطابقت نہیں رکھتے۔اس کے لیے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ اس بحث کا محور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن اور آپؐ کے آغاز زندگی کے واقعات ہیں۔لہٰذا کہنا پڑے گا کہ آیت مبارکہ میں "ضلالت" آنحضرت کی روح ونفسِ ناطقہ کی "حالت نفسانی" اور "صفت وجودی" سے متعلق نہیں کیونکہ اس قسم کی کیفیات سن وسال کے بڑھنے اور دورِ بلوغت میں وارد ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔یہی وہ دور ہوتا ہے جب انسان مخفی ہدایات الٰہی یعنی "عقل" اور ظاہر ہدایات یعنی "تبلیغ انبیاءؑ" سے بہرہ مند ہوتا ہے۔یہی وہ منزل ہے جہاں خاص قسم کی تیرگی وتاریکی قلب وذہن انسانی کو محصور کرتی ہے۔جس سے انسان ایک منحرف وگمراہ ہستی کا وجود حاصل کرتا ہے۔

اب چونکہ ان آیات مجیدہ میں محور بحث آنحضرتؐ کے بچپن اور ابتدائے زندگی کے دور کی وضع وکیفیت ہیں لہٰذا طبعاً وفطرتاً لفظ ضلالت کی مندرجہ بالا تفسیر یہاں درست نہیں ہوسکتی۔بلکہ اس طرح کہنا چاہیے کہ یہاں اس واقعیت واصلیت کا بیان کرنا مقصود ہے جو کسی پیغمبر بلکہ ہر انسان پر سن وسال کے اس دور میں واقع ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ذات میں فاقدِ ہدایت ہے۔پس اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی انسان کے شامل حال نہ ہوتو تمام انسان گمراہی میں باقی رہ جائیں۔بہ الفاظ دیگر ہر انسان کا اس کلیہ کے تحت کہ اپنی حدِ ذات میں اس کا ہر نوعِ کمال کے فقدان کا شکار ہونا "ممکن" ہے، جو کچھ بھی وہ رکھتا ہے، یا بعد میں حاصل کرتا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں کا مرہون منت ہے۔اسی لیے ہر صاحب وجود کی زبان پر جاری ہے کہ "اَللّٰهُمَّ مَا بِنَا مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنْكَ" یعنی "پروردگار! ہر نعمت، روحانی ہو یا جسمانی تیری ہی جانب سے ہے"۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اس نقطہ نظر سے کہ آپؐ امکانی وظاہری طور پر انسان ہی ہیں، ہر قسم کا کمال، جس میں کمال ہدایت اور نعمت رہنمائی بھی شامل ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہے، یعنی آپ اپنی ذات سے، ہدایت منجانب اللہ تعالیٰ سے قطع نظر، جو ہمیشہ اور ہر وقت

---

[1] عیون الاخبار رضا، ص ۲۱۰۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے: "لِئَلَّا يَكُونَ لِاَحَدٍ عَلَيْهِ طَاعَةٌ" (کسی کی اطاعت ان پر فرض نہ ہو) معانی الاخبار، ص ۲۰، علل الشرائع ص ۵۵

آپ کے شامل حال رہتی ہے (بطور انسان ظاہری، مترجم) ''ضال''یعنی فاقدِ ہدایت ہی سمجھے جائیں گے؟ تاہم ابتدائے زندگی ہی سے الطاف الٰہی کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام فطری وتشریعی ہدایات آنحضرتؐ کے نصیب حال میں رہیں۔

اس بحث کی روشنی میں ایک اور آیہ مبارکہ کے معانی کی بھی صراحت ہوجاتی ہے جس کا مخالفین عصمت انبیاء سہارا لیتے ہیں۔ آیہ مبارکہ یہ ہے:

كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ

''تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب وایمان کیا ہے''۔ (شوریٰ۔ ۵۲)

انشاءاللہ اس آیہ مبارکہ کی وضاحت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کی بحث میں پیش کی جائے گی۔

(ج)۔ ''وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى''

لغت عرب میں ''عائل'' فقیر و تہی دست کو کہتے ہیں۔ تاریخ شاہد کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آغاز جوانی میں تہی دست تھے۔ حضرت ابو طالب جو سردار قریش تھے۔ اپنی سخاوت و سیادت و بزرگی و استقامت و علوِ طبع میں مشہور تھے۔ جب انہوں نے اپنے بھتیجے کی مالی دشواریوں کا ملاحظہ کیا تو انہیں مشورہ دیا کہ خدیجہ بنت خویلد ایک مرد امین کی تلاش میں ہیں جو ان کی تجارت کے کاروبار کو سنبھال کر ان کا مال تجارت شام میں جا کر فروخت کرے۔ کیا ہی اچھا ہوا گر آنحضرتؐ حضرت خدیجہ سے ملاقات کریں اور ان کے کاروبار تجارت کو سنبھالنے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کریں۔

حضرت خدیجہؑ نے پہلی ملاقات ہی میں آنحضرتؐ کو اپنے کاروبار کی انجام دہی کے لیے منتخب کیا انہوں نے آنحضرتؐ کے ساتھ شراکت کی شکل میں معاہدہ کیا اور طرفین کے درمیان طے پایا کہ تجارت کے منافع میں آنحضرتؐ حصہ دار ہوں گے۔ اس معاہدہ کے مطابق آنحضرتؐ ایک تجارتی قافلہ کے ہمراہ عازمِ شام ہوئے۔ واپسی پر آنحضرت نے منافع کا اپنا حصہ حضرت خدیجہ سے لیا اور تمام رقم اپنے چچا حضرت ابو طالبؑ کی خدمت میں پیش کردی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کی عظمت، افراد قبیلہ کی شہرت، بطور امین قریش آنحضرتؐ کی اقدار امانت وراست بازی، آنحضرتؐ کی کرامات جن کو حضرت خدیجہؑ کے غلام نے سفر شام کے دوران مشاہدہ کیا اور پھر حضرت خدیجہ سے بیان کیا۔ یہ سب باتیں آنحضرتؐ، امین قریش نے فقر وغربت وتہی دستی سے نجات پائی اور آیہ مجیدہ ''وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى'' کا مصداق قرار پائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبل بعثت حیات اقدس سے متعلق تین تاریخی شعبے یہاں اختتام کو پہنچتے ہیں۔

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

قرآن مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام طور پر ''النبی'' و ''الرسول'' کے القاب کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ تاہم کبھی کبھی آپؐ کے لیے ''عبدہ''

(بندۂ خدا) کا لفظ استعمال کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ﴿۱۰﴾

''پس اس نے اپنے بندہ پر وحی فرمائی جو بھی وحی فرمانا چاہی''۔ (نجم۔۱۰)

اس کے علاوہ سورۂ ہائے مبارکہ آل عمران، احزاب، محمدؐ اور فتح میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محمد کے مبارک نام سے خطاب فرمایا۔ سورۂ صف میں آپ کو ''احمد'' کے نام سے یاد فرمایا اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیگر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز فرمایا جو قرآن مجید میں مختلف اسمائے گرامی کے حامل قرار پاتے ہیں۔ [1]

اب ہم ان اسمائے مبارکہ کی حامل آیات مجیدۂ قرآن پاک سے پیش کرتے ہیں:

۱) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ

''اور نہیں محمدؐ مگر ایک رسول جن سے پہلے بھی رسول ہوئے ہیں''۔ (آل عمران۔۱۴۴)

۲) مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ

''محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ وہ اللہ کے رسول اور انبیاء کے خاتم ہیں۔ (احزاب۔۴۰)

۳) وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ

''محمدؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں (ایک دوسرے پر) مہربان ہیں''۔ (محمد۔۲)

۴) مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ

''محمدؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں (ایک دوسرے پر) مہربان ہیں۔ (فتح۔۲۹)

۵) وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ

''اور میں خوشخبری دینے والا ہوں اپنے بعد ایک پیغمبر کے آنے کی، جس کا نام احمدؐ ہے''۔ (صف۔۶)

[1] مثلاً حضرت یعقوبؑ جن کا دوسرا نام اسرائیل ہے، یا یونس علیہ السلام جن کا ایک نام ذوالنون ہے، یا حضرت عیسیٰؑ جن کو مسیح نام بھی دیا گیا، اسی طرح یوشع جن کا ایک اور نام ذوالکفل بھی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عبدالمطلبؑ کے گھر نئے پیدا ہونے والے بچہ نے اپنی ولادت کے ساتویں روز ''محمدؐ'' نام پایا جب کہ ان کی والدہ گرامی نے ان کا نام ''احمدؐ'' رکھا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم بزرگوار حضرت ابوطالب اپنے اشعار میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالمطلب نے الہامِ غیب سے آنحضرتؐ کا اسم مبارک ''محمدؐ'' رکھا۔ حضرت ابوطالب کا شعر ہے:

فَشَقَّ لَهٗ مِنْ اِسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ

فَذُو االْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّ هٰذَا مُحَمَّدٌ[1]

''خداوند عالم نے حضرت عبداللہ کے فرزند کی عزت و تکریم کی خاطر اس کا نام اپنے نام سے نکالا ۔صاحب عرش کا نام محمود ہے اور اس کا نام محمدؐ''۔

کتب تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں میں یہ نام یعنی ''محمدؐ'' رواج رکھتا تھا۔ مؤرخین نے سولہ (۱۶) بچوں کے نام لکھے ہیں لیکن آنحضرتؐ سے پہلے کسی بچہ کا نام ''احمدؐ'' نہیں رکھا گیا۔ آنحضرتؐ وہ پہلے شخص ہیں جو اس نام سے موسوم ہوئے۔[2]

ایک بے بنیاد شبہ

علمائے نصاریٰ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے روشن و واضح دلائل کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے۔ لہٰذا یہ لوگ ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ بے ہودہ اور کمزور و لایعنی شبہات اپنے دل سے وضع کریں اور اس طرح مسلمان نوجوانوں کے عقائد میں ضعف پیدا کریں۔ یہ لوگ مدعی ہیں کہ جس پیغمبر کے آنے کی انجیل یوحنا میں پیش گوئی کی گئی ہے اس کا نام ''احمدؐ'' ہے، یعنی انجیل ''احمدؐ'' نامی پیغمبر کی آمد کا پتہ دیتی ہے جب کہ مسلمانوں کے پیغمبر کا نام ''محمدؐ'' ہے۔

یہ شبہ اس قدر بے بنیاد و ضعیف ہے کہ دیگر شبہات کے ساتھ ذکر کیے جانے کے قابل بھی نہیں کیونکہ وہی قرآن مجید جو آنحضرتؐ کا اسم گرامی ''محمدؐ'' بتلاتا ہے، اسی قرآن میں آپؐ کا نام ''احمدؐ'' بھی مذکور ہوا ہے۔ لہٰذا مسلمان جو آنحضرت کا اسم گرامی ''محمدؐ'' قرار دیتے ہیں، وہی آنحضرت کو ''احمدؐ'' بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابوطالب نے اپنے بہت سے اشعار میں آنحضرت کو ''احمدؐ'' ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

لَقَدْ اَكْرَمَ اللّٰهُ النَّبِيَّ مُحَمَّدًا

فَاَكْرَمَ خَلْقِ اللّٰهِ فِي النَّاسِ اَحْمَدُ

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمدؐ کو محترم کر دیا۔ لوگوں کے درمیان سب سے مکرم مخلوق خدا ''احمدؐ'' ہی ہیں''۔

---

[1] سیرت حلبی

[2] تاریخ الخمیس دیار بکری، ج ۱ ص ۲۵۴۔ الاصابہ، جلد ۴ ص ۱۱۵

حضرت ابو طالب ہی صرف وہ شخص نہیں ہیں جنہوں نے اپنے متعدد قصائد میں آنحضرتؐ کو "احمد" کے نام سے یاد فرمایا ہے بلکہ ان کے علاوہ حضرت امیر المؤمنین، زمانہ رسولؐ کے شاعر حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ، ورقہ بن نوفل، حمزہ ابن عبد المطلب، حضرت صفیہؓ زوجہ رسولؐ اور دوسرے بہت سے حضرات نے اپنے قصائد و اشعار میں آنحضرتؐ کو احمد ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس طرح اس لایعنی شبہ کا دروازہ شبہ ایجاد کرنے والوں پر بند ہو جاتا ہے۔[1]

اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے درمیان "احمد" کے نام سے اسی طرح معروف نہ ہوتے جس طرح "محمد" کے نام سے تھے تو ہرگز اس وحی کو ان لوگوں کے ساتھ پوری قاطعیت و وثوق کے ساتھ تلاوت نہ فرما سکتے، جو اس طرح پر ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریمؑ نے بنی اسرائیل سے کہا: میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اس کتاب کی تصدیق کرتا ہوں جو تمہارے پاس ہے اور جس کا نام تورات ہے۔ اور اپنے بعد اس پیغمبر کی بعثت کی بشارت دیتا ہوں جس کا نام "احمد" ہے۔ لیکن جب وہ پیغمبر (ان خصوصیات کے ساتھ) ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ کھلم کھلا جادو ہے"۔ (صف۔ ۶)

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اسمائے گرامی میں "یٰس" اور "طٰہٰ" بھی ہیں۔ چونکہ ان دونوں الفاظ کے بعد آنحضرتؐ ہی کو خطاب فرمایا گیا ہے لہٰذا اس بات کی صحت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"يٰسۗ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝"۔ (یٰس۔ ۱ تا ۳)

علیٰ ہذا القیاس: "طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝"

اس کے باوجود کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ قرآن مجید کے حروف مقطعات سے ہیں۔

[1] ان قصائد و اشعار کی تحقیق کیلئے کتاب مفاہیم القرآن، ج ۳ ص ۵۵۰ تا ۵۵۵ کی طرف رجوع فرمائیں

پیغمبر اُمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''جنہوں نے کسی کے سامنے زانوئے اَدب تہہ نہیں کیا''

لفظ ''امی'' مختلف شکلوں یعنی ''امی'' ''امیوں'' اور ''امیین'' کے طور پر چھ بار قرآن مجید میں وارد ہوا ہے[1]۔ ان تمام مقامات پر اس سے ایک سے زیادہ کوئی چیز مراد نہیں۔ اس سے مراد وہ ایک انسان یا کئی ایسے انسان ہیں جو شکم مادر سے جیسے متولد ہوں، ویسے ہی دنیا میں باقی رہیں ان لوگوں کے اسی کیفیت پر باقی رہنے سے مراد یہ ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہ ہونے پائے۔ عربی زبان میں ایسی نا قابل تبدیل وضع کو ''اُمّية'' اور اس کے حامل شخص کو ''امی'' کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں، اگرچہ واقعیت سے دور سہی، ایسے شخص کو ''ان پڑھ'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ مطلب اس لفظ کے مفہوم واقعی سے دور ہے اور کسی حد تک اہانت آمیز سمجھا جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے استعمال سے اجتناب کیا جائے اور لفظ ''امی'' کی تفسیر اور ترجمہ آیات میں ''جس نے سبق کسی سے نہ پڑھا ہو'' کے الفاظ کو انتخاب کرنا چاہیے۔

قرآن مجید دو مقامات پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لفظ ''امی'' سے تعریف فرماتا ہے اور بتلاتا ہے کہ آنحضرتؐ بعثت سے پہلے نزول آیات قرآن کے وقت تک ''امی'' رہے ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''وہ جو اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ''امی'' کی پیروی کرتے ہیں، جس کی نبوت کی صفات اور نشانیاں تورات وانجیل میں ہیں، جو ان کے پاس ہیں۔ وہ (رسول) انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ پاک چیزیں ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتا ہے۔ بارسنگین (تکالیف

---

[1] سورہ ہائے مبارکہ اعراف، آیہ ہائے ۱۵۷، ۱۵۸، بقرہ آیہ ۷۸، آل عمران، آیہ ہائے ۲۰، ۷۵، جمعہ آیہ ۲ کی طرف رجوع فرمائیں

شاقہ)اوران زنجیروں کواٹھادیتاہے،وہ لوگ جواس پرایمان لائے ہیں،(جنہوں نے)اس کی عزت وتوقیر کی ہے،اس کی مددکی ہےاور جونوراس کے ساتھ نازل ہواہےاس کی پیروی کی ہے،وہ رستگارہیں اورفلاح پانے والے ہیں"۔(اعراف۔۱۵۷)

خداوند عالم اس آیہ مبارکہ میں پیغمبراکرم ﷺ کی دس صفات کے ساتھ [1]،جوآپ کی نبوت کے دلائل اورآپ کے دعویٰ کی صداقت پر بہت بڑی گواہی کوتشکیل دیتی ہیں،توصیف فرماتاہے یاددلایاگیاہے کہ آنحضرتؐمفصلہ ذیل صفات سے متصف تھے:

۱)۔رسول

۲)۔نبی

۳)۔امی

۴)۔تورات وانجیل میں مذکورآنحضرتؐ کی علامات

۵)۔نیکی کاحکم دینے والے

۶)۔بدی سے روکنے والے

۷)۔پاکیزہ اشیاءکوحلال شمارکرنے والے

۸)۔نجاسات کوحرام قراردینے والے

۹)۔بارسنگین (تکالیف شاقہ)کوہٹادینے والے

۱۰)۔زنجیروں کو توڑنے والے

پہلی دوصفات کےعلاوہ یہ سب اوصاف آنحضرتؐ کی نبوت کی صحت کے دلائل شمارہوتے ہیں۔آیات قرآنی میں کسی ایک آیات میں آنحضرتؐ کی حقانیت کے بارے میں اس قدراوصاف مجموعی طور پروارد نہیں ہوئے۔گویایہ آیت،اپنے مقام پراس امرکی مظہر ہے کہ تمام دنیاکو آپؐ کے دعویٰ کے براہین سے آگاہ کرکے یہ بتلائے کہ آپؐ کی نبوت کے دلائل یہ ہیں:

'(ا)۔آنحضرتؐ ایک فردامی ہیں جنہوں نے کسی سے درس نہیں لیا۔اس کے باوجود ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس کے مقابلہ کاتمام عالم انسانی کو یارانہیں۔کوئی شخص آپ کی کتاب اوراس کی تعلیمات کی عظمت میں شک نہیں رکھتا۔نہ ہی اس کی تردید کرسکتاہے۔تمام محاسبات عقلیہ کی رو سے یہ امرمحال ہے کہ ایک ایساانسان جس نے کسی سے درس نہ لیاہواورجس نے جہالت ونادانی کے ماحول میں پرورش پائی ہو،خوداپنی طرف سے بغیر کسی امدادغیبی کے اس طرح کی تعلیمات کا خالق بن جائے اورایسی عظیم کتاب پیش کرسکے۔

---

[1] رازی اپنی تفسیر مفاتیح الغیب ،ج۴،ص۳۰۹پرآیہ مبارکہ میں ذکرکردہ صفات کونوتک پہنچاتاہے، حالانکہ اگرہم"اصر"و"اغلال" کودومختلف چیزیں شمارکریں توان صفات کی تعداددس تک پہنچ جاتی ہے۔

(ب)۔ آنحضرتؐ کی صفات وخصوصیات ونبوت کا ذکر تورات وانجیل میں موجود ہے جو کتابیں اب بھی اپنے پیروان کے پاس ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے لانے والے حضرات نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو پیش کیا ہے۔

یہی کیفیت دیگر صفات کی ہے جو آیہ مبارکہ میں وارد ہوئی ہیں اور جن میں سے ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی دلیل بن سکتی ہے۔ ان سب صفات کی تشریح وتفصیل ہمارے احاطہ بحث سے خارج ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَکَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

''کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں، وہ خدا آسمانوں اور زمین پر جس کی حکمرانی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ اس (خدا) کے بھیجے ہوئے پیغمبر ''امی'' پر، جو خدا اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پا جاؤ''۔ (اعراف۔۱۵۸)

لغت عربی میں ''امی'' کا مفہوم

ابن فارس زبان عربی کا ماہر اور رمز شناس ہے۔ وہ کتاب ''مقاییس'' میں لکھتا ہے کہ لفظ ''اُمّ'' لغت میں ایک سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ یہ لفظ اصل وبنیاد ہے جس کے دیگر معانی سب کے سب، کسی نہ کسی طرح اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس موقع پر ابن فارس خلیل احمد فراہی سے نقل کرتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں دوسری اشیاء گرد وپیش سے آ کر شامل ہو جائیں اسے ''اُمّ'' کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے دماغ کو ''ام الرأس'' اطراف کی بستیوں کے مرکز کو ''اُم القریٰ''، سورۂ فاتحۃ الکتاب کو ''امّ القرآن'' لوح محفوظ کو ''امّ الکتاب''، اور کہکشاں کو ''امّ النجوم'' کہتے ہیں مزید کہتا ہے کہ ''امی'' وہ ہوتا ہے جو بعینہٖ اسی حالت وطبیعت پر برقرار ہے جس میں اس نے اپنی ماں سے جنم لیا ہے۔ لہٰذا ''ماں'' کو ''ام'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کی اصل شمار کی جاتی ہے۔ لہٰذا پڑھنے لکھنے سے ناواقف شخص کو اس لیے ''امی'' کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی پہلی وضع وکیفیت پر مستقل ہوتا ہے گویا یہ کیفیت اس نے اپنی ماں سے حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عوارض وراثت کو عوام کی زبان میں ''مادری'' کہا جاتا ہے۔

بناء برایں تمام محقق مفسرین لفظ ''امی'' کی تفسیر جملہ ''لا یکتب ولا یقرء'' (نہ لکھتا ہے اور نہ پڑھتا ہے) سے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں محققین اہل لغت کے علاوہ صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی استناد کرتے ہیں کہ جس میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے اسی طرح ارشاد

فرمایا: ''انّا امیۃ لا نکتب'' ''ہم جماعت امی ہیں جو لکھتے نہیں[۱]۔ اس حدیث میں ''لا نکتب'' کا جملہ کلمہ ''امیہ'' کی تفسیر کرتا ہے جو ''امّہ'' کی صفت ہے۔

مندرجہ ذیل آیہ مبارکہ اس بات کی واضح شاہد ہے کہ ''امی'' سے مراد وہ شخص ہے جس نے کسی سے درس نہ لیا ہو:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾

''ان (یہودیوں) کی ایک جماعت امی ہے جو کتاب (توریت) سے چند ایک آرزوؤں [۲] کے سوا کچھ نہیں جانتے، بلکہ ان کا صرف گمان ہے (کہ وہ جانتے ہیں)''۔ (بقرہ۔۷۸)

جملہ ''لَا يَعْلَمُونَ'' جو ''امیوں'' کے بعد وارد ہوا ہے، اپنے ماقبل کے جملہ کی تفسیر کرتا ہے۔ یعنی یہودیوں کی ایک جماعت ان پڑھ ہے جو تورات کی اصلیت اور اس کے مندرجات و تفصیل پر آگاہ نہیں۔ یہ لوگ اصلی تورات کو اس کے محرف حصہ سے امتیاز نہیں کر سکتے۔ اسی لیے آنے والی آیت مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

''وائے ہے ان لوگوں پر جو کتاب (تورات محرف) کو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر (اس کو خدا کی طرف نسبت دے کر کہتے ہیں) کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالیں، وائے ہے ان پر اس چیز کے لیے جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور وائے ہے ان پر اس چیز (عذاب) کے لیے جو وہ کرتے ہیں''۔ (بقرہ۔۷۹)

ان دونوں آیات مبارکہ کے مطالعہ سے کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا ہے کہ آیت میں ''امی'' کے لفظ سے وہ شخص مراد ہے جو لکھنے اور پڑھنے پر قادر نہ ہو۔ قرآن مجید امت یہود کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱)۔ وہ جماعت جس نے کوئی درس نہیں لیا اور تورات سے کچھ نہیں جانتی۔

۲)۔ وہ جماعت جو خواندہ ہے لیکن اپنے علم سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے اور محرف تورات کی کثرت سے نشر و اشاعت کرتے ہیں تاکہ اس طرح

---

[۱] صحیح بخاری، ج ۱ ص ۳۲۷

[۲] آرزو سے مراد کمزور قسم کی اُمیدیں ہیں جو یہودی اپنے بارے میں رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ ایک برگزیدہ امت ہیں وغیرہ۔

دولت کمائیں۔

ظاہر ہے کہ اگر پہلی جماعت لکھنے پڑھنے کی اہل ہوتی تو دوسری جماعت کی تحریف سے دھوکہ نہ کھاتی اور صحیح کا غلط سے امتیاز کر سکتی۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''امی'' کے بارے میں جو دو شاذ و غیر معروف نظریات ہیں ان کی ہم وضاحت کریں۔

(ا)۔ کیا لفظ ''امی'' اُم القریٰ سے منسوب ہے؟

بعض تفاسیر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ''ام القریٰ'' شہر مکہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور عرب کے رہنے والے ہر اس شے کو جو مکہ سے منسوب ہو ''امی'' کہتے ہیں۔ پس جہاں کہیں حضرت رسول اکرم ﷺ کی اس لفظ ''امی'' سے توصیف ہوگی اس سے مراد لیا جائے گا کہ آنحضرتؐ ''ام القریٰ'' کے رہنے والے ہیں یہ اسی طرح ہے کہ آپ ''مکی'' ہیں جیسے کوئی مدنی، مصری وغیرہ ہو۔ یہ خیال تین لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہے:

اول: ''ام القریٰ'' مکہ کے ناموں سے کوئی نام نہیں۔ یہ لفظ ایک مفہوم کلی رکھتا ہے جس کا اطلاق مکہ اور مکہ کے علاوہ دیگر مقامات پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ ہم نے آغاز میں ہی ''مقاییس'' سے نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے مراکز اور موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں تحصیل و ضلع کے صدر مقامات کو ''ام القریٰ'' کہتے ہیں۔ اسی طرح مکہ کو اس کی مرکزیت کی بناء پر ''ام القریٰ'' کہا گیا ہے۔ مکہ آبادیوں کا ایسا مرکز تھا کہ اس کے اطراف میں کئی سو کلومیٹر فاصلے تک کے قبائل اپنی احتیاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مکہ کا ہی رخ کرتے تھے۔ قرآن مجید نے بھی اس لفظ کو ایک مفہوم کلی کے طور پر، نہ کہ ''مکہ'' کے مخصوص نام کی شکل میں استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا

''آپ کے پروردگار کے لیے مناسب نہیں کہ آبادیوں کو نیست و نابود کرے قبل اس کے کہ ان کے ''ام القریٰ'' مرکزی مقام) میں اپنا پیغمبر مقرر فرمائے''۔ (قصص۔۵۹)

آیہ مبارکہ اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کو وسیع الفاظ میں پیش کر رہی ہے، لہٰذا کسی طرح بھی طبعاً وفطرتاً اس خاص آیہ مبارکہ میں ''ام القریٰ'' سے مراد ''مکہ'' نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ازمنہ ہائے ماضیہ میں امم ہائے سابقہ کی ہلاکت ہمیشہ اس وقت ہی ہوتی رہی ہے جب اتمام حجت کر لیا جاتا تھا اور ہلاکت سے قبل ان کی آبادیوں کے مرکز میں نبی و رسول مبعوث ہو چکے ہوتے تھے۔

دوم: ادبی قواعد کے مطابق وہ مرکب الفاظ جو ''ابن''، ''اب'' اور ''ام'' جیسے سابقوں سے بنتے ہیں نسبت دیتے وقت ان کا پہلا لفظ حذف ہو جاتا ہے اور یائے نسبتی دوسرے لفظ میں داخل ہو جاتی ہے مثلاً ''ابن زبیر'' میں زبیری، ''ابی بکر'' میں بکری اور ''ام القریٰ'' میں قروی بن جاتا ہے۔ اگر یائے نسبتی لفظ مرکب کے پہلے جزو میں وارد ہو تو کاملاً اشتباہ ہونے لگتا ہے اور پھر منسوب الیہ کا پتہ نہیں چلتا۔[1]

---

[1] شرح ابن عقیل، ج ۲، ص ۳۹۱

سوم: اگر لفظ ''امی'' سے ''مکی'' ہی مراد لیا جائے تو اس لفظ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سابق میں بیان کردہ دس صفات کے درمیان، جو آپؐ کی نبوت کے براہین کا درجہ رکھتی ہیں، لانا بالکل غیر متناسب ہوگا، کیونکہ آپ کا مکی یا مدنی ہونا آپ کے دعوائے حقانیت میں شامل نہیں، اس موقع پر مؤثر ترین چیز یہی ہوسکتی ہے کہ آنحضرتؐ ''امی'' ہیں یعنی آپ نے کسی کے سامنے زانوائے ادب تہہ نہیں کیا جب کہ آپ کی تعلیمات اور آپ کی پیش کردہ کتاب مبارک تمدن بشری میں مقام رابطہ کی منزل رکھتی ہیں اور عقلائے عالم آپ کے پیش کردہ آئین مستقل کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف ایک اور آیہ مبارکہ میں اس طرح اشارہ کرتا ہے:

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

''وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں پیغمبر انہی میں سے بھیجا جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، انہیں پلیدگیوں سے پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ پہلے وہ واضح گمراہی میں تھے''۔ (جمعہ۔ ۲)

''فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ'' کا جملہ بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پڑھ قوم میں ایک فرد، جو انہیں میں سے تھا، اور جو انہی کی طرح (بظاہر) ''امی'' تھا مبعوث کیا لیکن ''امی'' ہونے کے باوجود اپنی تعلیمات سے معجزہ کر دکھایا، بقول حافظ شیرازی:

ستاره ای بدر خشید و ماه مجلس شد
دل رمیدئه مارا انیس و مونس شد
نگار من که به مکتب نه رفت و خط ننوشت
به غمزه مساله آموز صد مدرس شد

(ایک ستارہ چمکا اور ماہ مجلس بن گیا، ہمارے وحشت زدہ دل کا انیس و مونس ہوگیا۔ میرا محبوب جو نہ تو کبھی مدرسہ گیا اور نہ کبھی اس نے خط لکھا، ایک کرشمہ سے ہی صدہا استادوں کا استاد ہوگیا)۔

پس اگر بعض روایات میں لفظ ''امی'' معنی کے لحاظ سے ''ام القریٰ'' سے منسوب ہوا بھی ہے تو اس امر کو سند و مقام دلالت میں مطالعہ و تحقیق کے میدان میں محدود قرار دینا چاہیے۔[1]

[1] اس قسم کی روایت کی دلالت و سند کتاب مفاہیم القرآن، ج ۴، ص ۳۳ محدود تحقیق قرار پاتی ہے۔

(ب)۔ ''امی'' سامی متن میں موجود نہیں

قرآن مجید کی بعض آیات میں لفظ ''امی'' اہل کتاب کے مقابل قرار پاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝۲۰

''وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے اور اس طرح ''امیوں'' سے کہہ دیجئے کہ کیا تم اسلام لائے ہو! اگر وہ اسلام لا چکے ہیں تو وہ ہدایت یافتہ ہوگئے ہیں اور اگر وہ روگردانی کریں تو تمہارے لیے تو صرف پیغام پہنچانا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں بینا ہے''۔ (آل عمران۔ ۲۰)

اس آیت میں اصول ''تقابل'' کے مطابق یہ کہنا چاہیے کہ ''امی'' سے مراد وہ شخص ہے جو قدیم سامی متون سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ نیز وہ شخص یہود و نصاریٰ کے مذاہب کا پیرو بھی نہ ہو، یعنی جن کا آیہ مبارکہ میں بطور ''اہل الکتاب'' ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ''امیون'' اگر قبل اسلام کے اعراب کے لیے استعمال ہوا ہے، جو تورات و انجیل کے پیرو نہ تھے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ متون مقدس سامی کے بارے میں قطعی ناواقف تھے، اس بات کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ بعض آیات میں لفظ ''امی'' تورات سے ناواقف کے معنی میں بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

''اہل کتاب کی ایک جماعت میں ایسے ان پڑھ لوگ ہیں جو کتاب میں سے سوائے (فضولی و خیالی) آرزوؤں کے اور کچھ نہیں جانتے''۔ (بقرہ۔ ۷۸)

جواب

اس قسم کی تفسیر نص کے مقابلہ میں اجتہاد سے زیادہ نہیں اور وہ آیات جن کو شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے ان کے مقاصد کی گواہی نہیں دیتیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان کی لغت کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ ''امی'' کے معنی ہیں وہ شخص جس نے کسی سے سبق نہ پڑھا ہو اور جو پڑھنے اور لکھنے کی قدرت ہی نہ رکھتا ہو اس صورت میں ان وسیع معانی کو خصوصیت کے ساتھ کسی ایسے شخص سے متعلق کرنا جو متون سامی سے ناواقف ہو، قطعاً بے معنی و بلا وجہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہوگا کہ ''امی'' اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنے پڑھنے سے قطعی طور پر کسی طرح کا کوئی تعلق و آگاہی نہ رکھتا ہو۔ یعنی اگر کوئی شخص لوگوں کے درمیان سینکڑوں مروجہ زبانوں سے کسی ایک زبان میں بھی لکھ سکے یا اسے پڑھ سکے، تو اسے ''امی''

نہیں کہہ سکیں گے۔

اب اگر پہلی آیہ مبارکہ میں لفظ ''امی'' اہل کتاب کے مقابلہ میں آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں رہنے والے یہود و نصاریٰ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے برعکس عام طور پر لکھنے پڑھنے کے قابل تھے کم از کم وہ لوگ اپنی مذہبی کتب سے ضرور واقفیت رکھتے تھے جب کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بالکل ان پڑھ تھے حتیٰ کہ اپنی مادری زبان سے بھی واقف نہ تھے۔لہٰذا لفظ ''امی'' سے صرف متون سامی ہی سے ناواقفیت مراد نہیں پس اگر یہ لفظ اقوام روم و ایران کے مقابلہ میں قرار پائے، جو بہت پڑھے لکھے لوگ تھے، تو اس کا مفہوم نہیں بدلتا، یہ لفظ بھی ان پڑھ ہی کے معنی کا حامل ہوگا، یہ نہ ہوگا کہ اس لفظ سے ایران و روم کی زبانوں سے ناواقفیت مراد لی جائے۔

اس تشریح سے دوسری آیہ مبارکہ کا مفہوم بھی واضح ہوجاتا ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے، امی اور غیر امی، یعنی کتاب سے ناآشنا اور کتاب سے آشنا، جیسا کہ ارشاد ہورہا ہے:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ

''ان میں کچھ امی ہیں جو کتاب میں سے چند ایک آرزوؤں کے علاوہ کچھ نہیں جانتے''۔(بقرہ۔۷۸)

یہ صحیح ہے کہ یہ آیہ مبارکہ میں لفظ ''امی'' سے وہ شخص مراد ہے جو سامی زبانوں سے ناواقف ہو۔لیکن یہ معنی صرف اس لیے نہیں قرار پاتے کہ یہ لفظ ''امی'' کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور اس کے معنی کا حصہ بلکہ اصول تقابل کے تحت اس سے ایک ایسی قید کا مفہوم سامنے آتا ہے جو دیگر موارد میں نہیں پائی جاتی۔لہٰذا اس لفظ کو صرف اسی مفہوم کا حامل نہیں سمجھا جاسکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لفظ ''امی'' کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ شخص جس نے مطلقاً کسی سے درس نہ لیا ہو۔لہٰذا یہ لفظ اگر کبھی کسی ایسی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہو جو خاص زبانوں یعنی ''عہدین'' (تورات و انجیل) سے ناواقف ہوں تو اس کی مندرجہ ذیل دو میں سے ایک وجہ ہوسکتی ہے:

۱)۔ان متون (زبانوں) سے ناواقفیت اس دور میں لکھنے پڑھنے سے ناواقفیت کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔

۲)۔یہ خصوصیت اصول تقابل سے سامنے آتی ہے۔لہٰذا اس مفہوم کو ''امی'' کے معنی میں شامل نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ ''امی'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اہل کتاب کے ماحول میں عہدین کی زبان میں اور اعراب جاہلیت میں زبان عربی میں لکھنے اور پڑھنے سے ناواقف ہو۔علیٰ ہذا القیاس دیگر زبانوں میں بھی اس کا یہی حال ہو۔

آنحضرتؐ نہ پڑھتے تھے اور نہ ہی لکھتے تھے

زمانہ جاہلیت کے عربوں کا ان پڑھ ''امی'' معاشرہ پیغمبر اکرم ﷺ کے عظیم معجزہ یعنی قرآن مجید کو دیکھ کر حیرت زدہ مبہوت رہ گیا، انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان میں سے ایک شخص پر اللہ کی جانب سے ایسی باعظمت کتاب کی وحی ہوگی جو افراد معاشرہ کے لیے خوف و

امید کرے گی، جیسا کہ قرآن مجید ان کے متعلق فرماتا ہے:

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ(یونس۔۲)

''کیا یہ بات لوگوں کے باعث تعجب ہے کہ انہی میں سے ایک (شخص) کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرائے اور باایمان افراد کو خوش خبری دے کہ ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایک اچھا ماضی اور نیک منزلت ہے''۔(یونس۔۲)

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی کوشش یہ تھی کہ قرآن کی، جو صدیوں اور زمانوں تک زندہ رہنے والا معجزہ ہے، اس طرح توجہ کریں کہ اس کا عالم غیب اور تعلیمات الٰہی سے کس طرح کا ارتباط ظاہر نہ ہو، اس سلسلہ میں ان کی تشریحات اپنے مقام پر آئیں گی۔ قرآن مجید کے بارے میں ایک خیال خام مندرجہ ذیل آیات مبارکہ میں بیان ہوتا ہے:

(ا)وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴

کفار کی جماعت نے کہا کہ یہ (قرآن) جھوٹ وافتراء کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اس نے خدا پر باندھا ہے اور ایک جماعت نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے''۔(فرقان۔۴)

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بے بنیاد و ناروایات کی ہے

(ب)وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵

انہوں نے کہا (قرآن) سابقہ لوگوں کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس نے لکھے ہیں (یا اس کے لیے لوگوں نے لکھے ہیں) اور یہ داستانیں صبح وشام اس کے ذہن پر اترتی ہیں''۔(فرقان۔۵)

ان آیات میں لوگوں کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دو قسم کی تہمتیں لگائی گئی ہیں:

۱)۔ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں بلکہ ایک افتراء ہے جو اللہ پر باندھا گیا ہے اور اس نے اس کے بعض حصوں کو منظم ومرتب کرنے میں دوسرے سے مدد لی ہے: (اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ)

۲)۔ اس کتاب کو گزشتہ لوگوں کی کتابوں سے لکھا گیا ہے اور اس کے مطالب صبح وشام اس کے ذہن پر اترتے ہیں''۔

متذکرہ آیات مبارکہ اور ان سے مشابہ ایسی ہی دیگر آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ کے بعض مشرکین اس کوشش میں مصروف تھے کہ قرآن مجید کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نتیجہ فکر ثابت کریں اور دوسرے لوگوں کو سمجھائیں کہ آنحضرتؐ نے ایک جماعت (جو جن و پری اور کاہنوں پر

مشتمل ہے) کی مدد سے قرآن مجید کو تالیف کیا ہے یا لوگ قرآن کو ایسا مجموعہ سمجھیں جسے آنحضرتؐ نے عہدین وغیرہ سے مرتب و منظم کیا ہے۔قرآن مجیداس تمام تصور کی تکذیب کرتا ہے اور مختصراً فرماتا ہے:

قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِیۡ یَعۡلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّهٗ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۶﴾

''کہہ دیجئے کہ قرآن اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے آگاہ ہے، وہ بخشنے والا مہربان ہے''۔(فرقان۔۶)

لیکن سورۂ عنکبوت میں تفصیل کے ساتھ اس خیال کا رد پیش کیا گیا ہے اور دوٹوک لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے:

''اے پیغمبر نزول وحی کے زمانہ تک نہ تو آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی کچھ لکھتے تھے لہٰذا کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب (قرآن) آپ کا نتیجہ فکر ہے، یا آپ نے اسے سابقہ کتب سے نقل کیا ہے''۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا کُنۡتَ تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنۡ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیۡنِکَ اِذًا لَّارۡتَابَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۴۸﴾

''تم (بچپن سے نزول وحی کے زمانہ تک) نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے (کیونکہ تم پڑھنے لکھنے کے قابل نہ تھے)۔ان حالات میں باطل پر چلنے والے کتاب میں شک کرتے تھے (اور اسے آپ کے فکر کا نتیجہ یا سابقہ لوگو کی کتب سے تالیف کردہ سمجھنے لگتے)''۔(عنکبوت۔۴۸)

اگر پیغمبر اکرم ﷺ اپنے بچپن کے زمانہ میں کتابوں سے تعلق رکھے ہوتے اور علم و دانش حاصل کرنے والے بچوں کی طرح مشق کیا کرتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ نزول قرآن کے بعد ایسے لوگوں کے درمیان باآواز بلند اپنا دعویٰ (ناخواندگی) پیش کرسکتے جو آپ کی تمام خصوصیات زندگی سے پوری طرح آگاہ تھے، کیا پھر آپ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ اے لوگو! تم سب جانتے ہو کہ میں نے اپنی بعثت سے قبل نہ تو کبھی کوئی کتاب پڑھی اور نہ ایک سطر اپنے ہاتھ سے لکھی تھی، تو پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ میں نے آیات قرآن کے مضامین و دیگر لوگوں کی کتب سے حاصل کرلیا ہے؟ عربی زبان می اگر کوئی کہے:''ماجاء نی من احدٍ'' اور لفظ ''من'' کو استعمال کرے جو زائد ہے، تو اس سے شمول نفی کی تاکید مراد ہوگی، یعنی ہرگز کوئی شخص نہیں آیا۔جملہ مذکور اور جملہ ''ما جاء نی احدٌ'' میں یہ فرق ہے کہ مؤخرالذکر میں یہ احتمال ممکن ہے کہ یا چند افراد آئے ہوں لیکن متکلم نے چشم پوشی کے تحت ان کی آمد کو درخور اعتنا نہ جانا ہو۔عرب اس احتمال کی نفی کی غرض سے لفظ ''احد'' سے پہلے لفظ ''منِ'' لاتے ہیں تاکہ اس سے واقعی و حقیقی نفی سامنے آجائے۔

اتفاق یہ ہے کہ آیہ مذکورہ یہی نوعیت رکھتی ہے۔ اسی لیے اس میں ہر قسم کے احتمال کو رفع کرنے کی غرض سے لفظ ''مِنْ'' لایا گیا ہے۔ تاکہ نفی استغراق واقعی کی شکل اختیار کرے یعنی آپ ہرگز کسی قسم کی کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی کچھ لکھتے تھے''۔

خلاصہ یہ کہ زبان عربی کے قواعد میں ایک یہ ہے کہ ''نکرہ'' سیاق نفی میں عموم و وسعت کا موجب ہوتا ہے جیسا کہ ''ما جاء نی احد'' یا ''ما کنت تتلوا من کتاب'' خصوصاً اگر لفظ ''من'' کے ہمراہ ہو۔

قرآن اس موقعہ پر نہ صرف اس خیال کو رد کرتا ہے بلکہ ایک اور آیہ مبارکہ میں پیغمبر اکرم ﷺ کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنی زندگی کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور کہیں: ''لوگو! میں نے تمہارے درمیان ایک عمر گزاری ہے۔ میری زندگی کی کیفیت تمہارے سامنے روشن ہے۔ پھر کس طرح کہتے ہو کہ میں اس قرآن کو بدل ڈالوں''۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾

''کہہ دیجئے! اگر اللہ چاہتا تو میں تم پر آیات کی تلاوت نہ کرتا اور تمہیں ان سے آگاہ نہ کرتا میں نے اس سے قبل مدت تک تمہارے درمیان زندگی بسر کی ہے، کیا تم (عقل و فکر) نہیں رکھتے؟''۔ (یونس۔۱۶)

یعنی اگر تمہارے خیال میں قرآن مجید میری فکر کا نتیجہ ہے اور میں نے ہی خود پڑھ اور لکھ کر اور علماء و دانشمندوں کے ساتھ ارتباط کر کے اس قسم کی عظیم کتاب تالیف کی ہے، جس کو اب تمہارے کہنے سے مجھے بدل دینا چاہیے، تو کس قدر اچھا ہوگا کہ تم میری سابقہ زندگی پر نظر کرو اور دیکھو کہ اگر میں اتنی قابلیت کا حامل ہوتا تو چاہیے تھا کہ اپنے اعلان نبوت سے پہلے کے دور میں ہی اس کتاب کے بہت سے مطالب بیان کیے ہوتے، نیز محافل میں اس کے نمونے پیش کر دیے ہوتے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں چالیس سال تمہارے درمیان زندگی بسر کر چکا ہوں لیکن تم نے مجھ سے کوئی ایسی شے مشاہدہ نہیں کی، پس پھر تم صحیح طور پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اجتماعی مسائل کی بناء پر اپنی بعثت سے قبل پڑھنے لکھنے کی کیفیت سے قطعی طور پر ناواقف تھے، نہ ہی آنحضرتؐ نے کسی کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا تھا اور نہ ہی طریقہ غیب سے آپؐ نے کسی طرح پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر آپ ان دونوں کی کیفیات سے بہ طریقہ غیب آشنا ہوئے ہوتے تو قرآن مجید ہرگز آپ کی تعریف لفظ ''امی'' سے نہ کرتا کیونکہ اس صورت میں، اگرچہ غیب کی جانب سے ہی سہی، آنحضرتؐ ﷺ سے روز اول کی نسبت ایک قسم کا تغیر ضرور ظاہر ہوتا، درآنحالیکہ قرآن مجید اس بات پر مصر ہے کہ آپؐ ''امی'' ہیں اور اسی حالت پر باقی ہیں، باقی رہا بعثت کے بعد لکھنے پڑھنے سے آنحضرتؐ کی واقفیت کا معاملہ تو یہ ایک بالکل الگ مسئلہ ہے۔ جس کا تذکرہ بعثت کے بعد حوادث کے بیان میں ایک مستقل عنوان کے طور پر آئے گا۔

تاویل ناروا

ایک مسلمان مؤلف نے [1] علمائے مشرق کی واقفیت علوم کے زیر اثر مؤقف اختیار کر کے اپنے رسالے میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس مؤقف کے پیش نظر اس نے آیہ مبارکہ کی غلط تاویل کرنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے اس مؤلف کے دلائل و تاویل آیت پیش کرتے ہیں:

''قرآن مجید میں لفظ 'کتاب' ہر قسم کی کتاب و تحریر کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ لفظ تورات و انجیل جیسے مقدس نوشتوں کے لیے آیا ہے جو عربی زبان میں، جو آنحضرتؐ کی زبان تھی، سمجھی نہیں جاتی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ آنحضرتؐ اپنے اظہارات ان مقدس کتب سے نقل فرماتے ہیں۔ پس مندرجہ بالا آیہ مبارکہ نازل ہوئی کہ آنحضرتؐ ان مقدس کتب کی زبانوں سے، جو قرآن مجید سے قبل نازل ہوئیں واقف نہ تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آنحضرتؐ عربی زبان میں بھی، جو آپ کی مادری زبان تھی، (اور قرآن بھی جس زبان میں نازل ہوا تھا) پڑھ لکھ نہ سکتے تھے''۔

اس غلط تاویل کا جواب

مؤلف متذکرہ بالا کا مذکورہ تصرف و تاویل کسی طریقہ سے غلط ہے۔

(ا)۔ آیہ مبارکہ میں لفظ ''کتاب'' بصورت نکرہ ''الف ولام'' کے بغیر آیا ہے اور نکرہ ''ما کنت تتلوا'' کے نفی کے جملہ کے بعد آیا ہے، یہ صورت، ان قواعد کے مطابق جو ہم نے نقل کیے ہیں، جنس کتاب کی نفی کے لیے ہے، عام اس سے کہ کتاب عربی، عبرانی، فارسی، سریانی زبان میں ہو۔ یہ نفی کتاب کی کسی خاص قسم (مقدس کتب، جیسا کہ تاویل کرنے والے مؤلف نے خیال کیا ہے) کے لیے نہیں۔ اس قاعدہ میں کسی طرح کی استثناء نہیں پائی جاتی۔ قرآن مجید میں متذکرہ جملہ جیسے جملے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ

''جس کو اللہ ذلیل کر دے اس کو کوئی شخص باعزت نہیں بنا سکتا''۔ (حج۔ ۱۸)

اس بات کے لیے کہ آیہ مبارکہ میں ''کتاب'' سے مراد جنس کتاب ہے، خواہ وہ عربی زبان میں ہو یا عبرانی زبان میں، ہماری دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے والی آیت میں، جہاں توریت و انجیل کے بارے میں بات ہو رہی ہے لفظ ''کتاب'' الف اور لام' کے ساتھ استعمال ہوا ہے جو اس لفظ کی معروفیت اور خاص کیفیت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ڈاکٹر عبداللطیف ہندی نے اس موضوع پر انگریزی زبان میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا اردو فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے مولف نے ایک مستقل رسالہ ''در مکتب وحی' نامی لکھ کر اس بات کو رد کیا ہے۔ قارئین مزید تفصیل کے لئے اس رسالہ کی طرف رجوع فرمائیں

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ﴿۴۷﴾

''اور اسی طرح ہم نے تم پر کتاب نازل فرمائی ،پس وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب (تورات و انجیل) دی ہے اس پر ایمان لاتے ہیں ،اور کفار کی جماعت کے علاوہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکارنہیں کرتا''۔(عنکبوت۔۴۷)

لیکن اگر زیر بحث آیہ مبارکہ میں لفظ''کتاب'' بہ طورنکرہ الف اور لام کے بغیر استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

''وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ''۔(عنکبوت۔۴۸)

لہٰذا اگر زیر نظر آیہ مجیدہ میں''کتاب'' سے مراد عہدین کی کتب ہی ہوتیں تو لازم تھا کہ حسب سابق لفظ''کتاب'' کو بطور معرفہ الف اور لام کے ہمراہ استعمال کیا جاتا اور اس طرح ارشاد ہوتا:''وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهِ الْكِتَابُ''

(ب)۔ یہ دعویٰ کہ قرآن میں کتاب سے مراد ہر قسم کی کتاب وتحریر نہیں، بلکہ اس سے تورات وانجیل جیسے تمام مذہبی ومقدس نوشتہ جات مراد ہیں ،صحیح وواضح نہیں۔لہٰذا اب ہم یہاں وہ آیات مجیدہ پیش کرتے ہیں جن میں لفظ کتاب سے کتب عہدین مراد نہیں، بلکہ ان میں یہ لفظ کتب مقدسہ کے علاوہ دیگر مصادیق میں استعمال ہوا ہے۔ہم نمونہ کے طور پر ان موارد میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

۱)۔کتاب یعنی قرآن مجید:

''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ''۔(بقرہ۔۲)

۲)۔کتاب یعنی فرض، جو ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا اور جب فرمایا:

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

''حرام ہے کہ تم شوہر دار عورتوں کو اختیار کرلو سوائے ان مشرک عورتوں کے جو تمہاری قید میں آ گئی ہوں ۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب اور تمہارے لیے مکتوب یہی ہے''۔(نساء۔۲۴)

۳)۔''کتاب'' ہستی اور رمز تکوین کے معنی میں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴿۳۸﴾

''زمین پر چلنے پھرنے والے ہوا میں پرواز کرنے واے پرندگان ،سب تمہاری طرح امتیں ہیں۔ہم نے عالم آفرینش میں کسی کو ترک نہیں کیا۔پھر وہ سب اپنے پروردگار کی جانب لوٹ جائیں

گئے''۔(الانعام۔۳۸)

۴)۔کتاب یعنی لوح محفوظ:

قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ‌ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى ۞۵۲

''حوادث ماضی کا علم میرے پروردگار کے پاس موجود ہے وہ نہ تو گم کرتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے''۔(طٰہٰ۔۵۲)

۵)۔کتاب بمعنی نامہ اعمال:

مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا‌ ۚ

''کیا ہو گیا ہے کہ یہ نامہ اعمال چھوٹے بڑے اعمال کو شمار کیے ہوئے ہیں''۔(کہف۔۴۹)۔

اسی طرح سورۂ مومنون آیت نمبر ۶۲، سباء آیت نمبر ۳۰ اور زمر آیت ۲۹ ہیں۔

۶)۔کتاب یعنی کسی کے نام خط:

اُلۡقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيۡمٌ ۞۲۹

''یہ خط میرے پاس آیا ہے''۔(نمل۔۲۹)

ان موارد اور ایسے ہی دیگر مواقع سے (وہ آیات مبارکہ جن میں لفظ کتاب وارد ہوا ہے) واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ ان مختلف مصادیق میں استعمال ہوا ہے جو کتب عہدین کے علاوہ ہیں۔پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی کافی زیادہ آیات کی موجودگی میں کس طرح مؤلف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' انجیل و تورات اور اسی قسم کی کتب کے معنی میں ہے۔

(ج)۔اگر آیہ مبارکہ مجیدہ اس معنی میں ہو کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے انجیل و تورات ایسی مقدس کتب نہیں پڑھی تھیں، تب بھی مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں یہ احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ آنحضرتؐ چونکہ عربی کتب کے پڑھنے لکھنے سے تعلق رکھتے تھے، چند ایک یہود و نصاریٰ کی مدد سے، جو اپنی کتابوں کی زبانوں سے واقف تھے، آپ نے مطالب قرآن کو وہاں سے حاصل کر کے عربی زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے اور پھر آنحضرتؐ انہیں زبانی پڑھا کرتے تھے۔یہ احتمال سورۂ فرقان میں مشرکین سے اس طرح نقل ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡكُ اۨفۡتَـرٰٮهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ‌ ۛۚ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّزُوۡرًا ۛۚ ۞۴

''کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن جھوٹ ہے جو خدا پر باندھا گیا ہے اور ایک دوسری جماعت نے اس سلسلہ میں اس کی مدد کی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے یہ کہہ کر ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے''۔

قرآن مجید اس احتمال کو رفع کرنے کے لیے زیر بحث آیہ مجیدہ میں فرماتا ہے:

''تم ہرگز پڑھنے لکھنے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، تم نے نہ تو کبھی کوئی کتاب پڑھی اور نہ ہی کبھی (لکھنے کے لیے) قلم سے کاغذ پر لکھا، کیونکہ اگر ایسا کرتے تو معترض لوگ تمہارے آئین کی تردید کرنے لگتے''۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اگر آپ اس آیہ مبارکہ کو عرب یا عربی زبان جاننے والے کے سامنے رکھ دیں تو وہ کہے گا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ پڑھنے اور لکھنے سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھتے تھے اس کے برعکس اگر کتاب سے مراد کتب مقدس ہی ہوں تو پھر اس صورت میں ''وَلَا تخطه'' کا جملہ زائد ہو جائے گا۔ واضح ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مندرجہ بالا کتابوں کو پڑھنے کے قابل تھے تو ظاہر ہے کہ ان کے لکھنے پر بھی قادر ہوں گے۔ لہٰذا ضروری نہ تھا کہ فرماتا ''۔۔۔لا تخطه'' (غور فرمائیں کہ ''تخطه'' کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹتی ہے)۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے اس جملہ کا لانا مفید و سودمند ہوگا کیونکہ اس صورت میں آیہ مبارکہ کا مفاد سادہ و عام کلام ہوگا، جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں شخص پڑھنے اور لکھنے سے بالکل کوئی واسطہ نہیں رکھتا یعنی پڑھنے لکھنے سے قطعاً واقف نہیں۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں دو مراحل ہیں ایک تو یہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھتے لکھتے نہ تھے اور دوسرا یہ کہ پڑھنے لکھنے پر قادر نہ تھے یہ اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ آنحضرتؐ کسی سے لڑتے نہ تھے، نہ ہی کسی میدان میں آپؐ نے خود جنگ کی اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنحضرتؐ جدال کرنے پر قادر نہ تھے میں سمجھتا ہوں کہ جملہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام دیگر کمالات کے مانند پڑھنا لکھنا بھی بغیر کسب کے وہبی طور پر جانتے تھے۔ مصالح کا تقاضا تھا کہ آنحضرتؐ لکھیں پڑھیں نہیں ایسا نہیں کہ آنحضرتؐ اس پر قادر نہ تھے چونکہ یہ نقص ہوگا۔ (مترجم)

حصہ دوم

حیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بعثت سے ہجرت تک

وحی کا نزول یا تاریکی میں فروغ نور

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی اور ان کے عادات واخلاق سے، جہاں تک قرآن کا تعلق ہے (تاریخ کی نظر سے نہیں) ہم کسی حد تک آگاہ ہوئے۔ ان آداب ورسوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو نزول وحی کے ماحول پر حکم فرما تھے، قطعی طور پر کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی تعلیمات معارف وعقائد اور سنن واحکام کے درمیان اس ماحول کے ماحصل نہ تھے اور یہ کہ آپ کا استاد ومعلم کوئی اور نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے یہ سبق کسی انسان سے نہیں سیکھے تھے کیونکہ آپ ایسے فرد تھے کہ جس نے کبھی کوئی درس حاصل نہ کیا ہو، آپؐ نے حصول علم کی خاطر کسی شخص کے سامنے ساز نوائے ادب تہہ نہیں کیا تھا اس سے قطع نظر اس ماحول میں اس قسم کا کوئی استاد یا اساتید ہی نہ تھے جو ایسے معاف واحکام وتعلیمات کسی کو سکھلا سکتے۔ حد یہ ہے کہ مکہ کی حدود میں خط لکھنے یا پڑھنے والوں کی تعداد سترہ (۱۷) اشخاص سے زیادہ نہ تھی، پھر ان کی استعداد بھی صرف اسی قدر تھی کہ خط لکھ لیتے تھے یا خط پڑھ لیتے تھے۔ ان حالات میں اس معیار کی معلومات وعلوم کا ان سے سوگنا توانائی رکھتے ہوئے بھی ایسے لوگوں کو منبع قرار دینا، جو اس تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ زمانہ کے لوگوں کو تعجب وحیران کردے، ممکن نہیں۔

غار حرا میں نزول وحی کا مقام اول

شہر مکہ کے اطراف کو پہاڑوں کے ایک سلسلہ نے، جو نسبتاً بلند ہیں، گھیرا ہوا ہے، اس کے شمال میں ایک غار ہے جو غار حرا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ غار ہر طرف سے سیاہ پتھریلی چٹانوں سے گھرا ہوا ہے جن میں آثار حیات کسی طرح نہیں پائے جاتے، غار قد انسانی کے برابر اونچا ہے۔ اس کا ایک حصہ سورج کی روشنی سے روشن ہوتا ہے جب کہ اس کا پچھلا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔

اس زمانہ میں مکہ کی آبادی میں سے کوئی بھی اس غار کی طرف متوجہ نہ تھا سوائے، عزیز قریش (رسول اکرم ﷺ) کے جو ہر سال ماہ رجب میں اس مقام پر عبادت کیا کرتے تھے ایک سال جب آپؐ اپنے پروردگار کی عبادت میں مصروف تھے، فرشتہ وحی نازل ہوا اور اس نے مندرجہ ذیل آیات مجیدہ کے ذریعے آپ سے خطاب کیا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵

''پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے موجودات کو خلق فرمایا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار گرامی ومکرم ہے، پروردگار جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔ (سورۂ علق۔ ۱ تا ۵)

یہ آیات (کامل کو نقص سے تشبیہ دینے کی نظر سے) جمہوری صدروں کی پہلی تقریروں کی مانند ہیں جن میں صدر جمہوریت اپنے عرصہ

اقتدار سے متعلق اپنے نصب العین کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سیاسی ذہنوں اور مفکرین کے اعتبار سے اس قسم کا خطاب ایک خاص قدر و قیمت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ وحی الٰہی سے ہدایت پا کر اپنے نصب العین کے اہم ترین مطالب ان آیات مبارکہ میں بیان فرماتے ہیں اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کے آئین کی بنیاد پڑھنے لکھنے کو تشکیل دیتی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ علم و دانش کی ترویج کے لیے پڑھنے لکھنے کی کوشش کو رواج دیں گے، پس انسان کو جان لینا چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں رکھتا، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ لطف الٰہی کا مرہون منت ہے جس کے ذریعے قلم اور تمام مقدمات تعلیم انسان کے اختیار میں رکھے گئے ہیں۔

دعوت کے تین مراحل

قرآن مجید کی بہت سی آیات مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت تین مراحل میں انجام پائی اور ہر مرحلہ اپنے بعد کے تحقق کی بنیاد بنا۔

(ا)۔ خصوصی اور مخفی دعوتیں

پیغمبر اکرم ﷺ ایک جماعت کو خصوصی ملاقاتوں کے ذریعے ایک مرکزی جماعت کی شکل میں اپنی دعوت سے متاثر فرمانے کے قابل ہوئے، اس سلسلہ میں تاریخ ایک جماعت کے نام پیش کرتی ہے: ابن ہشام تنہا اپنی کتاب سیرت میں پچاس سے زیادہ ایسے اشخاص کے نام پیش کرتے ہیں جو مخفی ملاقاتوں کے نتیجہ میں دین و آئین توحید پر جمع ہو گئے تھے، جن میں اہم ترین حضرات خدیجہ الکبریٰ، علیؑ، زید بن حارثہ، عثمانؓ و قدامؓ و عبداللہ۔۔۔ ابنائے مظعون کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں اور شاید آیہ مبارکہ "وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝" (واقعہ۔۱۰۔۱۱) اسی جماعت کی نشان دہی فرماتی ہے۔

(ب)۔ رشتہ داروں کو دعوت

آئین توحید کی ایک مرکزی جماعت کی تشکیل کے بعد وقت آن پہنچا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آنحضرتؐ اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو دین توحید کی دعوت دیں۔ دین کی طرف دعوت دینے کا طبیعی تقاضا بھی تھا کہ دعوت عام پر رشتہ داروں اور اقارب کی طرف دعوت مقدم قرار پائے کیونکہ کسی مصلح کے اعزا و اقارب کا اس دعوت کا طرف جھکاؤ اور رجحان، جو انسان کے اندرونی اسرار و رموز سے آگاہ ہوتے ہیں، دعوت کے خلوص و پاکیزگی کی علامت ہوتا ہے اس لیے کہ اگر وہ دعویدار اصطلاح کوئی غیر صالح فرد ہو تو اپنے اقربا کا اعتماد حاصل نہ کر سکے گا۔ آپؐ کی زوجہ محترمہ جناب خدیجہ الکبریٰ کا ایمان لے آنا بذات خود آپؐ کی دعوت کے خلوص و پاکیزگی کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا بھی اپنے اصول کو مخفی رکھنے والا ہو، اپنے اقرباء بالخصوص اپنی رفیقہ حیات سے انہیں پوشیدہ نہیں رکھ سکتا، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کا اقدام اپنے اقربا سے کیا تا کہ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اس طبقہ اقربا کا رجحان آپؐ کی صداقت کی علامت اور

پاکیزگی کا شاہد قرار پائے۔

علاوہ ازیں جاننا چاہیے کہ کوئی دعوت دین و جماعت، کبھی بھی کسی فدا کار و جانباز جماعت کے وجود سے نیاز نہیں ہوسکتی۔ اس مقصد کے لیے بہترین لوگ جو اس دعوت کو اپنا فرض جان سکتے ہیں وہ ہمیشہ داعی کے اعزاء واقرباء ہی ہوتے ہیں، یہی وہ افراد ہوتے ہیں جو داعی کے شریک ہو کر ایمان کے سایہ میں رشتہ داروں کی محبت کے زیر اثر دشمنوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط و مستحکم واستوار قلعہ کا کام دیتے ہیں قرآن پاک رشتہ داروں کو دعوت ایمان دینے کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ (شعراء)

یہاں تک بالکل درست ہے کہ اس دعوت میں، جو خود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانہ اقدس میں انجام پائی تھی، سوائے حضرت علی علیہ السلام کے کسی نے ایمان کا اظہار نہ کیا لیکن یہی وہ دعوت تھی جو آنحضرتؐ کے اقربا کے بتدریج ایمان لے آنے کا سبب بنی اور جس کے نتیجہ میں تمام بنی ہاشم، سوائے ابولہب کے آہستہ آہستہ ایمان لے آئے جو بعد میں سب کے سب آنحضرتؐ کے آئین اسلام کے مدافعین کے طور پر نظر آتے ہیں۔

(ج)۔ دعوت عام

دعوت ہائے مخفی اور اقرباء کو تبلیغ کے بعد جو ان اقرباء کے ایمان لانے پر منتج ہوئیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہوئے کہ دعوت خصوصی کے دارۂ کار سے نکل کر تبلیغ عمومی شروع فرمائیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾

''جس بات پر آپ مامور ہیں اس کو ظاہر کردیں اور مشرکین سے روگردانی کرلیں، ہم استہزاء کرنے والوں کے شر سے آپ کی کفایت کریں گے''۔ (حجر۔ ۹۴۔ ۹۵)

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو تمام دنیا کی ہدایت اور اپنی دعوت توحید کو وسعت دینے پر مامور فرمایا آنحضرتؐ کے کاندھوں پر نہایت سنگین و عظیم ذمہ داری کا بوجھ آن پڑا اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے متذکرہ آیہ مبارکہ میں فرمایا تھا وہ متحقق ہوا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾

''ہم عنقریب قول ثقیل پر تم پر القاء کریں گے''۔ (مزمل۔ ۵)

مفسرین نے ''قول ثقیل'' کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔بعض لوگوں نے اس سے قرآن مجید پر عمل کرنا، یا اس کی حدود و فرائض کو بجالانا مراد لیا ہے، بعض مفسرین نے اس کو نزول وحی قرآن تصور کیا ہے[1]۔لیکن یہ امر کسی طرح بعید از قیاس نہیں ہوسکتا کہ ''قول ثقیل'' سے وسیع معنی مراد ہوں جس میں امت کے رہبری کی عظیم ذمہ داری بھی شامل ہو، جیسا کہ سورۂ مزمل کی آیت ۱۰ میں فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾

''اور جو کچھ وہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کریں اور ان سے دوری اختیار کریں''۔(مزمل۔۱۰)

دعوت توحید کا یہ مرحلہ ایک خاص قسم کی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ یکہ وتنہا ایک چھوٹی سی جماعت کی مدد سے، جو پہلے دو مراحل میں آپ کے دین پر ایمان لائی تھی دنیائے عرب کی نجات پر مامور ہوئے تھے جو شرک و دوگانہ پرستی میں غرق تھے۔قرآن مجید رسول اکرم ﷺ کے ارادہ کی تقویت کی خاطر ایک بار پھر آپ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿۵﴾

''اے اپنے اوپر کپڑے کو لپیٹنے والے، اٹھو! لوگوں کو ڈراؤ، اپنے رب کی تکبیر کہو، اپنے لباس کو پاک رکھو اور پلیدی سے دوری اختیار کرو''۔(مدثر۔۵)

بہت سے مفسرین ان آیات مجیدہ کو غار حرا میں پیغمبر اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر نزول وحی سے مربوط جانتے ہیں اور اس سلسلہ میں شان نزول بھی نقل کرتے ہیں، یہی کیفیت سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات کے بارے میں بھی بیان کی جاتی ہیں۔لیکن جیسا کہ ہم نے قبل از یں نقل کیا سورۂ مزمل میں آنحضرتؐ کو کفار کی قبیح باتوں کے مقابلہ میں صبر و بردباری سے کام لینے اور انہیں چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔اسی طرح اس سورۂ میں بھی ارشاد ہوتا ہے:''ولربك فاصبر ''یعنی'' اپنے پروردگار کی خاطر صبر کرو''۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات دعوت عام کے آغاز سے متعلق ہیں جو کفار کی طرف سے بری باتوں اور ان کے تکلیف وآزار پہنچانے کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہیں۔اس طرح یہ گمان بعید ہوگا کہ یہ آیات آغاز وحی کے مرحلہ سے تعلق رکھتی ہوں کیونکہ اس وقت نہ تو تبلیغ شروع ہوئی تھی اور نہ ہی تکذیب سامنے آئی تھی اور نہ ہی کسی طرح اعتراض کی کوئی شکل پیدا ہوئی تھی۔

جلال الدین رومی نے سورۂ مزمل کے مضامین کو ایک طرح شعر کے قالب میں ڈھالا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سورۂ مذکورہ کی آیات مبارکہ کو آنحضرتؐ کی دعوت عمومی سے متعلق جانتے ہیں وہ کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر طبری، ج۲۹ص۸۰

خواند "مزمل "نبی را زین سبب

که بروں از گلیم اے بوالحرب

سرمکش اندر گلیم و ود مپوشس

که جہاں جمعی است سرگرداں توہوش

ہیں مشو پنہاں زننگ مدعی

که توداری نوروحی شعشعی

باش کشتیاں دراین حرصفا

که تونوح ثانی اے مصطفےٰ

خیزو بنگر کاروان اره زده

غول کشتیاں این بحر آمده

وقت خلوت نیست اندر جمع آ

اے هدی چوں کو ه قاف و توہما

ترجمہ:

پیغمبر اکرم ﷺ کو اس لیے "مزمل" کہا گیا ہے کہ آپ گلیم سے باہر آئیں کہ جنگجو ہیں۔ سر کو گلیم کے اندر نہ رکھ اور منہ نہ چھپا کیونکہ عالم تمام پریشان ہے اور آپ اس کی ہوش و عقل ہیں۔ اپنے دعویٰ کے خوف سے پنہاں نہ ہوں کیونکہ آپ کے پاس وحی کا چمکنے والا نور ہے اس بحر صفا میں ملاح ہو جا کیونکہ اے مصطفیٰ! تو نوح ثانی ہے۔ اٹھیں اور دیکھیں کہ راہ چلنے والے قافلے کو سمندر میں طوفان نے گھیر رکھا ہے۔ یہ خلوت کا وقت نہیں ہے اے کوہ قاف کی مانند عین ہدایت برائے جمعیت، گویا تو اس میں ہما ہے۔

شک و تردید سے پیراستگی

بعض تفاسیر اور سیرت کی کتابوں میں آغاز وحی کے بارے میں کچھ داستانیں وارد ہوئی ہیں جنہیں کسی اعتبار سے صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ ان بے بنیاد داستانوں کا سب سے بڑا ناقل محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ ۹) ہے۔ یہ شخص اپنی تفسیر میں اپنے آپ کو صحیح بات نقل کرنے

کا پابند نہیں سمجھتا۔ یہ ہر قسم کی منقولات کو اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے اور چونکہ ہر بات سند کے ساتھ لکھتا ہے اس لیے محقق اسناد کی طرف رجوع ،مضامین میں غور وفکر اور حدیث میں ضوابط تنقید کے ذریعے خود تاریخ صحیح کو غلط سے امتیاز کر سکتا ہے۔

طبری لکھتا ہے: نزول وحی کے پہلے مرحلہ میں، یا اس سے اگلے روز، پیغمبر اکرم ﷺ نے اس خیال سے کہ وہ کاہن (غیب کی خبر دینے والے) ہو گئے ہیں، پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنے آپ کو پہاڑ سے نیچے گرا دیں۔ لیکن جبرائیل نے ''اَنَا جِبۡرَائِیۡلُ وَاَنۡتَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ'' کہہ کر آپ کو اطمینان دلایا اور عمل سے روک دیا۔

یہ بات کسی طرح اس سے مطابقت نہیں رکھتی جو قرآن نے آنحضرتؐ کے بارے میں فرمایا ہے یا جو کچھ تاریخ آپؐ کے متعلق بتلاتی ہے۔ لیکن بحث چونکہ صرف قرآن مجید سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ہم پہلے حصہ کی وضاحت کرتے ہیں اور بحث کے آخر میں اس کی طرف اشارہ کریں گے جو تاریخ نے پیش کیا ہے۔

قرآن مجید کی آیات مبارکہ بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ پوری محنت و وثوق کے ساتھ لوگوں کو اپنے مکتب فکر کی دعوت دیتے تھے، جیسا کہ فرماتا ہے:

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ‌ؔ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ‌ؕ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ۝۱۰۸

''کہہ دیجئے! یہ میرا راستہ ہے اور جو کوئی بصیرت و بینائی کے ساتھ میری پیروی کرے تو میں تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہوں ،اللہ تعالیٰ پاک و منزہ ہے اور میں مشرکین سے نہیں ہوں''۔(یوسف۔۱۰۸)

جملہ ''اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ'' سے زیادہ واضح و ناطق اور کون سا جملہ ہو سکتا ہے؟ آنحضرت اپنے تمام دور دعوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر مامور تھے کہ اپنے آپ کو وحی الٰہی کا پیرو سمجھیں لہٰذا آنحضرتؐ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وحی الٰہی میں کوئی نئی بات کہیں یا اسے بدل دیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ‌ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ‌ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوۡنَ۝۵۰

''میں سوائے وحی الٰہی کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا ،کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟ آخر تم غور کیوں نہیں کرتے''۔(انعام۔۵۰)

کہانت کا تصور اور یہ کہ نزول وحی کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا چاہتے تھے مہذب طور پر جنون کی طرف

نسبت دینا ہے اور آنحضرتؐ کے مخالفین روز اول ہی سے آپ پر یہ اتہام لگاتے آ رہے تھے کمال یہ ہے کہ اب ہم وہی بات ایک اور شکل میں آنحضرتؐ کے دوستوں کی زبانی بھی سن رہے ہیں جب کہ بڑی عجیب بات یہ ہے کہ قرآن مجید تہمت جنون کے مسئلہ کو فرشتہ وحی کے نزول کے ساتھ ساتھ ذکر فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

''یقینا قرآن ایک بزرگ و کریم بھیجئے ہوئے (فرشتہ وحی) کی گفتگو ہے جو عظیم قوت کا حامل اور صاحب عرش (اللہ تعالیٰ) کے نزدیک ایک مقام رکھتا ہے۔ وہ (فرشتوں) کا مطیع کرنے والا ہے اور فرد امین ہے۔ تمہارا صاحب (ساتھی) دیوانہ نہیں ہے اس نے یقینا جبرائیل کو افق فراخ ونمایاں میں دیکھا ہے۔ وہ وحی کے پہنچانے میں بخیل نہیں ہے۔ اس کا (لایا ہوا) راندۂ درگاہ شیطان کا کلام نہیں ہے۔ تم کہاں بہکے جا رہے ہو۔ قرآن ہدایت کے سوا کچھ نہیں ان کے لیے جو راہ مستقیم پر چلنا چاہیں''۔ (تکویر۔ ۱۹ تا ۲۸)

سورۂ نجم کی ابتدائی آیات امر رسالت، اخذ وحی اور رویت فرشتہ وحی کے عنوانوں کی قطعی کیفیت کو بیان کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قرآن مجید فرماتا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ ''ہرگز دل نے نگاہ کی تکذیب نہیں کی'' (نجم۔ ۱۱) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ اور ''نگاہ بھی حق سے منحرف نہیں ہوئی اور نہ راہ خطا پر چلی''۔ (نجم۔ ۱۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ولید بن مغیرہ، ابوجہل اور عتبہ کے ساتھ مذاکرات آپ کی تاریخ حیات کے صفحات کا حصہ ہیں اور امر رسالت، وحی الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آپ کی ذمہ داریوں کے بارے میں آپ کی کیفیت قطعی کے آئینہ دار ہیں۔

آنحضرتؐ سے متعلق داستانیں اور افسانے نقل کرنے والوں نے نبوت و رسالت کو بھی عام قسم کا منصب ہی سمجھا ہے جو کبھی کبھی ایسے عام لوگوں کو بھی عطا ہو جاتا ہے جن میں اس صلاحیت کا فقدان پایا جاتا ہو، درآنحالیکہ مقام نبوت تک ترقی کرنا شائستگی و کمالات نفسانی ایک طویل سلسلہ کی تحصیل و اضافہ اقدار کا مرہون منت ہے جس کے ذریعے وحی کے حصول کا عامل شخص ایک مقام اعلیٰ و بزرگ پر فائز ہو کر عقل و احساس

سے خارج ایک خاص قسم کے ایک شعور کا متحمل ہونے پر آمادہ ہو سکے جس میں وحی اور حاملان وحی (فرشتہ وحی) کی رویت شامل ہیں۔اس کیفیت وصورت میں کوئی وجہ نہیں کہ ان مراحل کو طے کرنے کے بعد متحمل وحی شخص خود اپنی نبوت ورسالت میں شک یا اس کی تردید کو جگہ دے اور ایک عاقل انسان کی شان سے خارج اعمال کا ارتکاب کرے۔

انقطاع وحی

انقطاع وحی کا مسئلہ تاریخ افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے، جس کا رسول اکرم ﷺ کو حامل قرار دیا گیا۔آیہ مبارکہ "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى" "یعنی تیرے رب نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی تجھے دشمن جانا ہے" کو افسانہ کے مخترعین نے اپنی گفتگو کے حق میں گواہ بنایا ہے۔اس افسانہ کا موجب بھی ابن جریر طبری ہے جو اپنی تفسیر میں اس طرح نقل کرتا ہے:

"غار حرا کے واقعہ اور سورۂ علق کی آیات کے نزول کے بعد وحی آسمانی منقطع ہوگئی۔حضرت خدیجہ الکبریٰ نے آنحضرتؐ سے کہا: میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہے بلکہ آپ سے اللہ کو دشمنی ہوگئی ہے،اس موقع پر وحی آسمانی ان الفاظ میں نازل ہوئی: "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى"۔

داستان کے اس حصے میں بھی پیغمبر اکرم ﷺ کو اپنی رسالت کے صحیح ہونے کے بارے میں مبتلائے شک وتردید جانا گیا ہے اور آپ کی زوجہ محترمہ پر غلط توجیہ کا اتہام لگایا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ افسانہ کے دونوں حصوں کو گھڑنے والے نہ تو پیغمبر شناس تھے اور نہ ہی آنحضرتؐ سے متعلق فیصلہ ہائے قرآن سے آگاہ تھے۔

یہ تاریخی داستان اپنی اصل و بنیاد ہی سے باطل اور غلط ہے۔ہم درج ذیل دلائل سے اس داستان کی غیر معقولیت کو ثابت کیے دیتے ہیں:۔

ا)۔خداوند عالم کی حکیمانہ مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ وحی الٰہی رفتہ رفتہ بتدریج نازل ہوا کرے۔اس بات کی بعض ضروریات و وجوہات جو اپنے مقام پر بیان ہوں گی۔قرآن مجید بھی اس حقیقت کا ذکر فرماتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ

"اور ہم نے قرآن کو بتدریج نازل فرمایا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے آرام وسکون سے پڑھیں"۔(اسراء۔۱۰۶)

اور ایک اور آیہ مجیدہ میں نزول تدریجی کی ایک وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

''اور کافروں نے کہا کہ قرآن ایک ہی بار کیوں نازل نہیں ہوتا؟ ہم نے تو اس کو اس لیے اس طرح نازل فرمایا ہے کہ آپ کے قلب کو پختہ کریں''۔(فرقان۔۳۲)

لہٰذا واقعہ دراصل یہی ہے کہ جو کچھ ہوا وہ نزول وحی کا بتدریج واقع ہونا تھا نہ کہ سلسلہ وحی کا منقطع ہونا درحقیقت اس کیفیت کا راوی دونوں صورتوں میں امتیاز نہیں کرسکا۔

یہ بات اس حقیقت سے بھی پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہمیں جاننا چاہیے کہ وحی کے نزول دوسلسلوں کے درمیان وقفہ چار دنوں سے کم اور چالیس دن سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ فاصلہ اس زمانہ میں جب کہ ابھی کوئی خاص حادثہ رونما نہیں ہوا تھا۔ بالکل ایک امر فطری وطبیعی تھا۔تفاسیر سے پتہ چلتا ہے کہ دو مواقع وحی کے درمیان اس قسم کی مدت انقطاع ۴ دن،۱۶ دن،۱۵ دن،۱۹ دن،۲۵ دن، یا زیادہ سے زیادہ ۴۰ دن واقع ہوئی ہے۔اس صورت میں اس بات کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ شکوک ایک تیزاب کی مانند آنحضرتؐ کی روح مبارک کو تحلیل کردیں اور آنحضرتؐ کی وفادار زوجہ محترمہ بھی دشمنی خدا کا اتہام لگائے۔

۲)۔ جناب خدیجہ الکبریٰ بے حد وفادار خواتیں سے تھیں۔انہوں نے اپنی جان وشخصیت، دولت وثروت اور صحت وسلامی کو اسلام کے لیے وقف فرمادیا تھا۔انہوں نے اس سلسلہ میں سب کچھ قربان کردیا تھا۔آغاز بعثت سے انقطاع وحی کے اصطلاحی مسئلہ کے رونما ہونے تک آنحضرتؐ جناب خدیجہ الکبریٰ کے ساتھ اپنے ازدواج کی پندرہ بہاریں گزار چکے تھے۔اس تمام عرصہ میں ان معظّمہ نے آپ کی طرف سے پاکیزگی کے سوائے کوئی چیز مشاہدہ نہیں کی تھی۔اس صورت میں یہ بات کیا صحیح سمجھی جائے گی کہ وہ بے سبب اپنے عظیم شوہر پر الزام لگائیں اور کہیں ''اللہ کو آپ سے دشمنی ہوگئی ہے''۔اور پھر ان معظّمہ کی تردید کے لیے وحی نازل ہو کہ ایسا نہیں ہے۔اللہ آپ کو دشمن نہیں رکھتا یعنی ''مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى''۔

۳)۔''دروغگو را حافظہ نباشد'' یعنی جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا۔یہ ایک مشہور مقولہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں اس واقعے کے گھڑنے والے کا حافظہ مفقود تھا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے جناب خدیجہ الکبریٰ کی طرف دو بالکل متضاد اور ناقابل جمع باتیں منسوب کی ہیں اور وہ اس طرح کہ اس روایت یا ان روایات کے ناقل پہلے تو جناب خدیجہ الکبریٰ کا تعارف آنحضرتؐ کو تسلی وسکون بخشنے والی بی بی کے طور پر کرواتے ہیں یعنی یہ لوگ بتلاتے ہیں کہ کوہ حرا پر نزول وحی کے بعد آنحضرتؐ پہاڑ سے نیچے تشریف لائے اور خانہ اقدس میں جناب خدیجہ الکبریٰ کے پاس آئے۔آپ سوچتے تھے کہ جو کچھ دیکھا وہ غلط ہے یا آپ کاہن ہوگئے ہیں۔جناب خدیجہؑ نے آپ کے صفحہ دل سے اس شک کو دھوڈالا اور عرض کیا: ''آپ یتیم نواز ہیں ،اپنے اقربا کے ساتھ نیکی وبھلائی کرتے ہیں''۔حضرت خدیجہ نے اس طرح آپ کو شعلہ ہائے شکوک سے نجات دی۔پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا کہ آپ کو کمبل اوڑھادیں۔[1]

لیکن وہی خدیجہ صرف چار یا زیادہ سے زیادہ چالیس روز بعد اپنے آپ ایک مدعی کا قیافہ قائم کرتے ہوئے اپنے سراپا اخلاص و

---

[1] طبقات ابن سعد،ج ا ص ۲۷۹

طہارت شوہر کو اللہ تعالیٰ سے قطع رابطہ کا الزام دینے لگتی ہیں حالانکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق نیک اور کردار پاک ان کی نظر میں مجسم و کامل تھا، اور وہ وحی نازل کرنے والے پروردگار عالم کو منصف و عادل بھی جانتی تھیں۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ جناب خدیجہؓ آنحضرتؐ کے خلاف ایسا سوءظن پیدا کرتیں، اللہ تعالیٰ کے رشتہ وحی کو منقطع خیال کرتیں اور آپ کو دشمن خدا ہونے کا اتہام لگاتیں؟

۴)۔ آیہ شریفہ "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى" اس سے زیادہ کچھ نہیں بتلاتی کہ کسی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتہام لگایا کہ خداوند عالم نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور انہیں دشمن رکھتا ہے۔ یہ بات کہنے والا کون تھا؟ اس نے کیوں اور کب ایسا کہا، بالکل کسی کو معلوم نہیں۔

۵)۔ انقطاع وحی کے علل و اسباب کے بارے میں مفسرین کے درمیان اس قدر شدید اختلافات ہیں کہ ان میں سے کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا مثلاً:

(ا)۔ یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درج ذیل تین موضوعات پر سوالات کیے:

۱)۔ روح

۲)۔ اصحاب کہف

۳)۔ اور ذوالقرنین

آنحضرتؐ نے انشاءاللہ کہے بغیر فرمایا کہ وہ کل ان کے سوالات کے جواب دیں گے۔

اس موقع پر وحی منقطع ہوگئی۔ تاخیر جواب سے مشرکین خوش ہو کر کہنے لگے کہ خدا اب آپؐ کا دشمن ہو گیا ہے۔ لہٰذا سوۂ مبارکہ "والضحیٰ" نازل ہوئی جس نے مشرکین کے اس خیال کو باطل کر دیا۔[1]

اگر اس شان نزول کو درست سمجھا جائے تو انقطاع وحی کا تصور بعثت کے ساتویں سال سے متعلق ہوگا نہ کہ آغاز وحی سے۔ بلکہ اقرباء کو دعوت ایمان دینے یا دعوت عام کے بھی بعد قرار پائے گا۔

(ب)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چارپائی کے نیچے ایک مردہ کتے کا بچہ پڑا ہوا تھا اور کسی نے اسے نہ دیکھا۔ جب گھر میں جھاڑو دی گئی تو اسے باہر پھینکا گیا۔ پھر جبریل امین نازل ہوئے۔ آنحضرتؐ نے وحی میں تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی، جبریل امین نے عرض کیا: "ہم اس گھر میں نہیں آتے جس میں کتا ہو"۔[2]

اس قصہ کا متن خود اس کے جھوٹے ہونے پر شاہد ہے کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ کتے کا بچہ مر جائے ایک عرصہ گزر جائے اور وہ متعفن نہ ہو۔ پھر جھاڑو دیتے وقت چارپائی کے نیچے اس کا پتہ چلے۔ اس کے علاوہ ہرگز ضروری نہیں کہ وحی کسی خاص مقام پر نازل ہو جب کہ آنحضرتؐ اپنے بیت اقدس سے باہر بھی آتے جاتے تھے۔

---

[1] روح المعانی، ج ۳۰، ص ۱۵۷۔ سیرت حلبی، ج ۱، ص ۳۴۹۔ ۳۵۰

[2] تفسیر قرطبی، ج ۱۰، ص ۸۲

(ج)۔توقف وحی کا سبب یہ تھا کہ مسلمان اپنے ناخن اور مونچھوں کو نہیں تراشتے تھے [۱]۔اس صورت میں انقطاع وحی کی تاریخ دعوت عام کے بعد قرار پائے گی جب آنحضرت ؐ مسلمانوں کے ہمراہ اٹھتے بیٹھتے تھے پھر ایک جماعت کا ناخن وغیرہ نہ کٹوانا کس طرح امین قریش پر نزول وحی سے مانع قرار دیا جا سکتا ہے۔اس بارے میں اور وجوہات بھی بیان کی گئی ہیں جو عجیب وغریب بیانات کے علاوہ اس بات پر متفق نہیں کہ انقطاع وحی کا وقت آغاز نزول سے مطابقت رکھتا ہو۔[۲]

اس سلسلہ میں ایک اجرت یافتہ مؤلف نے، جو گزشتہ حکومت طاغوتی (شاہ ایران کی حکومت) کے زمانہ میں اس حکومت کے استحکام میں حد درجہ کوشاں تھا، ایک تصوراتی سلسلہ قائم کرتے ہوئے انقطاع وحی کو وحی نفسی کی دلیل جانا ہے اور ادعا کیا ہے کہ سورۂ علق کی آیات کا وحی ربانی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ آیات مجیدہ غار حرا میں آنحضرتؐ کے طویل فکر کے نتیجہ میں اپنے مفاہیم ومعانی کو روشن کرتی ہیں۔ان آیات کے نزول کے بعد آنحضرت ؐ کا مخزن تفکر خالی ہو گیا۔لہٰذا تجدید حرکت اور آواز کو سننے کے لیے کچھ وقت کا گزرنا لازم تھا یہ مؤلف اس بارے میں کہتا ہے:

''اس رویا اور تصور روشن (رویائے آغاز بعثت) کے بعد (آنحضرتؐ کی) روح کی پختگی کی تشنگی کم ہو گئی۔بے چینی و ہیجان کی کیفیت جاتی رہی روحانی شعلہ پر چند سال کی اس آرزو کے تحقق کے سبب سے ایک قسم کی ٹھنڈک وارد ہو گئی۔لہٰذا ضروری ہوا کہ سوچ بچار و تفکرات خالی مخزن قلب کو ایک بار پھر پر کریں اس میں حرکت پیدا ہو اور آنحضرتؐ دوبارہ اس آواز کو سن پائیں''۔

ہم اس وقت ''وحی نفسی'' کے نظریہ پر تنقید نہیں کر رہے۔اس نظریہ پر ایک مناسب موقعہ پر گفتگو ہو گی [۳]۔ہم یہاں صرف دو مطالب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس بے بنیاد افسانہ کو مکمل طور پر ختم کر دیتے ہیں:

(ا)۔اگر سورۂ علق کی چند آیات کا نزول سوچ وفکر و ہیجان میں کسی کا سبب بن سکتا ہے جس کے نتیجہ میں مخزن تفکرات کو دوبارہ پر کرنے کے لیے مرور زمانہ کی ضرورت ہے تو پھر لازم آئے گا کہ پورا قرآن پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے کے لیے کچھ صدیاں درکار ہوں کیونکہ اگر صرف پانچ آیات کے نزول کے بعد (معاذ اللہ) مخزن ذہن خلاق خالی ہو جائے اور دیگر آیات کی تخلیق تفکرات جدیدی کی محتاج ہو جائے تا کہ پیغمبر اکرم اپنے فکر میں مستغرق ہو کر اس قسم کے تفکرات پر دسترس پا سکیں تو ضروری ہو گا کہ چھ ہزار سے زیادہ آیات کے نزول کے لیے آپؐ صدیوں انتظار کرتے رہیں تا کہ رفتہ رفتہ بتدریج یہ مخزن مادی اس قسم کی تجلیات کو پیدا کر سکیں۔لہٰذا یہ بات ہرگز ہرگز ممکن نہ ہو گی کہ صرف تریسٹھ برس کی عمر کا عرصہ آنحضرتؐ کے ان تفکرات کے ایک معمولی سے حصہ کے لیے بھی کافی ہو جائے۔

(ب)۔یہ پیداوار تخیل اس شکل میں رنگ تحقیق اختیار کرتی ہے کہ سلسلہ تنزیل کے اعتبار سے سورۂ ''والضحیٰ'' پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے

---

[۱] تفسیر قرطبی، ج۱۰ص ۸۲

[۲] مجمع البیان، ج۱۰،ص ۵۰۵

[۳] کتاب، ''بسیت وسہ سالہ'' میں ہم نے اس کتاب پر مستقل تنقید کی ہے جو ''راز بزرگِ رسالت'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

والا دوسرا سورۂ سمجھا جائے حالانکہ سلسلہ تنزیل میں یہ دسواں سورۂ ہے، اس سے پہلے کی سورتوں کی ترتیب نزول حسب ذیل ہے: [۱]

۱)۔سورۂ علق

۲)۔سورۂ قلم

۳)۔سورۂ مزمل

۴)۔سورۂ مدثر

۵)۔سورۂ تبت

۶)۔سورۂ تکویر

۷)۔سورۂ انشراح

۸)۔سورۂ والعصر

۹)۔سورۂ والفجر

صرف یعقوبی ہی وہ شخص ہے جو سورۂ ''والضحیٰ'' کو آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی سورتوں میں تیسری سورت شمار کرتا ہے۔[۲] یہ روشن اور واضح اشکالات اس بات پر شاہد ہیں کہ اس اجرت یافتہ مؤلف کا یہ نظریہ پہلے فیصلہ شدہ امر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس مؤلف نے کتب تفسیر تاریخ وسیرت کی طرف رجوع کیے بغیر ایک مادی تخیل کی پیروی کرتے ہوئے اور انکار وحی کی خاطر اس قسم کے تخیلاتی تانے بانے کو اختیار کیا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ''انقطاع وحی'' کا افسانہ اپنی اس صورت میں جو کتب تفسیر میں پائی جاتی ہے، کوئی وجود نہیں رکھتا اور نزول تدریجی سے ہٹ کر وحی کے نزول کی کوئی اور صورت موجود نہیں۔

---

[۱] تاریخ القرآن، زنجانی

[۲] تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۳۳

دعوت عمومی کا ردعمل

اتہامات، اعتراضات، پیش نہادیں اور رکاوٹیں

کوئی دعوت اور اصطلاحی لائحہ عمل جو کسی بھی جماعت کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہر چند کہ وہ تہذیب وتمدن کے اعتبار سے کتنا ہی ترقی پذیر نظر آتا ہو، کبھی لوگوں کے منفی ردعمل سے محفوظ نہیں ہوتا۔ یہ توقع ہی رکھنا چاہیے کہ سب لوگ داعی اصلاح کی آواز کا مثبت جواب دیں گے اور گرم جوشی کے ساتھ اس لائحہ عمل کا استقبال کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخالفت، رکاوٹ، روڑے اٹکانا وغیرہ مختلف عوامل کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں جن میں اہم ترین شعبہ کسی ایسی جماعت کا تہذیبی وتمدنی مقام ہوتا ہے جن کے درمیان مصلح اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے اور اپنا اصلاحی لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

کوئی اصلاحی نصب العین ایسا نہیں جو فکری، علمی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی، بالخصوص مذہبی شعبہ جات میں سب کی توجہ کا مرکز بنے اور نہ ہی کوئی لائحہ عمل تخیلاتی یا واقعی منفعت کی ضمانت دے سکتا ہے ہر ماحول میں ہوشیار تخریب کار، لوٹ مار کرنے والے لالچ کے بندے ہوتے ہیں جو گوناگوں طریقوں سے معاشرہ کی کمزوری یا ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی وملی دولت وثروت پر غاصبانہ قبضہ جما لیتے ہیں، خیر اندیش مصلحین اور انسان دوست لوگوں کے اصلاحی منصوبوں میں روڑے اٹکاتے اور مختلف راہوں سے رکاوٹیں پیدا کر کے منصوبہ ہائے اصلاح کی تباہی اور ان کے داعیوں کی جان لینے پر کمر باندھ لیتے ہیں۔

زیادہ دور کی بات نہیں جان کینڈی جو اپنے مقام پر امریکہ کی طاقتور سیاست کا ایک اہم ترین مہرہ تھا، کبھی بھی دنیا پر استبداد کرنے والی طاقت امریکہ کے سیاسی اصولوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس نے چاہا کہ فطری تقاضوں کے مطابق نسلی امتیازات کو کسی حد تک کم کرے تو وہ خود اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا خون اس قدر شبہات کی نظر کر دیا گیا کہ تاریخ کے دامن میں ایسی بہت کم مثالیں پائی جاتی ہیں۔

جاننا چاہیے کہ صرف دولت جمع کرنے والوں کی مادی منفعت ہی وہ چیز نہیں جو مصلحین بشر کے منصوبوں کی تکمیل میں روڑے اٹکاتی اور سد راہ بنتی ہے بلکہ دیگر عوامل روحانی مثلاً قوت وطاقت کی چاہت، مقام ومنصب کے لالچ جیسی چیزیں بھی مصلحین کے منصوبوں کے لیے خطرات پیدا کرتی ہیں اور بڑے بڑے مانعین ان حضرات کے افکار کے مقابل لا کھڑی کرتی ہیں۔ سب سے بڑا تعصب بزرگان سابقہ کی راہ روش اور طریق کار کے خلاف ہوتا ہے یہ وہ طاقت ہوتی ہے جس سے تمام بکھری ہوئی قوتوں کو دفاع ملت وقوم کے نام پر مجتمع کیا جاتا ہے، مادی منفعت کے پرستار لوگ ناواقف عوم کو اصلاح طلب طریق کار کے خلاف ابھاتے رہتے ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت ایسے لوگوں کے درمیان شروع ہوئی جو تہذیب وعلم کے اعتبار سے مصالح ومفاسد میں پست ترین مقام

پر تھے۔ دوسری طرف مکہ کے فراعنہ مثلاً ابوجہل، ابوسفیان، ابولہب جیسے بے شمار لوگ اقتدار کے لالچ میں تھے اور اپنی سیادت وسرداری کو مصلح جدید کے نصب العین کے پیش نظر متزلزل اور بربادی کے قریب جانتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان کا تعصب بہت بڑھ چکا تھا اور دور جاہلیت کے عرب اس بات پر تیار نہ تھے کہ ایک قسم بھی بہتری کی طرف بڑھائیں۔

ان حالات میں یہ ایک طبیعی وفطری امر ہے کہ اس قسم کے معاشرتی ماحول میں دعوت اسلام کو شدید قسم کے منفی ردعمل کے بغیر آگے نہیں بڑھنا تھا۔ ظاہر ہے کہ تمدنی انحطاط، مصالح ومفاسد بہت زیادہ ناواقفیت مقام ومنصب کا لالچ اور اپنے سابقہ بزرگوں کی راہ وروش کے بارے میں تعصب، یہ سب وہ منفی عوامل ہیں جو رفتار اصلاح کو سست کرنے بلکہ بعض اوقات اس کو بالکل روک دینے کے لیے کافی تھے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت دین کا اس قسم کے سخت وحساس حالات میں آغاز ہوا۔ لہٰذا ایک چھوٹی سی اقلیت کے سوا قریش اور ان کے حلیف قبائل کی اکثریت اس دعوت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی جنہوں نے ہر زمانہ ووقت کے حالات کے مطابق اپنا لائحہ عمل بنایا اور آنحضرتؐ کی شدید مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے۔ چنانچہ مجموعی طور پر دعوت اسلام کے خلاف رکاوٹوں کے چار حصوں میں قرار دیا جاسکتا ہے:

۱)۔ اتہامات اور ناسزا باتیں

۲)۔ اعتراضات اور رکاوٹیں

۳)۔ پیش بندیاں اور درخواستیں

۴)۔ آزار اور مخالفتیں

ہم ان سب صورتوں کا باری باری ذکر کرتے ہیں:۔

(۱)۔ اتہامات اور ناسزا باتیں

مخالفین دعوت کا سب سے پہلا حربہ تہمت اور بری بھلی باتوں سے شروع ہوا۔ اس کا مقصد مدعو نبوت کی شخصیت کو ختم کرنا اور بگاڑنا تھا تاکہ آنحضرتؐ اپنی دعوت کی کوئی صورت پیدا نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مصلح کی پاکیزگی وطہارت ہی وہ امور ہوتے ہیں جو عوام الناس پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ ان کے قلوب واذہان کو اپنی طرف بے اختیار جذب کریں۔ لیکن جب اس وسیلہ جاذبیت ہی کو ختم کردیا جائے تو پھر مصلح جمعیت کے بغیر اپنے کار اصلاح کے لیے کوئی صورت وضع نہیں کرسکتا۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر قریش نے ہر چند آنحضرتؐ کو برا بھلا کہنا شروع کردیا اور آنحضرت پر ان باتوں کے اتہامات عائد کرنے لگے جن کا ابھی ذکر ہوگا، تاہم آپ پر کوئی ایسی تہمت جو آپ کی شخصیت کو گرا سکے یعنی غبن، چوری فحش بات، زنا، لالچ، ہوس اقتدار کسی انسان کے قتل اور اس قسم کی دیگر برائیاں ہرگز نہ لگا سکے۔ یہ حقیقت خود اپنے مقام پر اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ اس قدر پاک ومنزہ تھی کہ مزاج معاشرہ اس قسم کی تہمتوں کو آپ کے خلاف لا ہی نہیں سکتا تھا، بلکہ آپ کو ان پست وذلیل شیطانی امور سے بالاتر مانتا تھا اور نہ وہ دشمن آپ پر یہ اتہامات لگانے میں کوئی لحاظ نہ کرتا۔

یہی وجہ ہوئی کہ مخالفین دعوت نے اپنی دانش وبینش کو جمع کر کے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کیا جس سے آنحضرتؐ کو معنوی و روحانی امور میں ملزم قرار دیں تا کہ اگر ان امور کا اثبات آسان نہ ہوتو ان کی نفی کی صورت بھی آسانی سے پیدا نہ ہو سکے۔ان شیاطین نے اپنے پیش رو لوگوں سے سبق لیا اور آنحضرت ﷺ پر ایسے اتہامات عائد کیے جیسے انبیائے سابقہ پر لگائے جاتے تھے۔قرآن مجید میں اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

''پہلے لوگوں کے لیے کوئی پیغمبر نہیں آیا یہ کہ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ جادو گر ہے یا دیوانہ''۔(ذاریات۔۵۲)

یہ آیہ مبارکہ لوگوں کے ایک مسلسل طریق کار کو ظاہر کرتی ہے جو ان اقوام میں رائج تھا جس کو وہ اپنے انبیاء کے خلاف استعمال کرتے تھے اور وہ ان کی تکذیب کرتے تھے۔

مشرکین کی طرف سے آنحضرتؐ پر جو تہمتیں لگائی جاتی تھیں قرآن ان کی یہ تفصیل بیان کرتا ہے:

(ا)۔**کاہن:** وہ شخص جس کا جنات وغیرہ سے تعلق اور میل جول ہو، ان سے گزشتہ وآئندہ کے لوگوں کی خبریں حاصل کرے اور ان خبروں کو معاشرہ کے سامنے رکھے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

''یہ ہرگز کسی کاہن کی گفتگو نہیں، تم بہت کم جانتے ہو''۔(حاقہ۔۴۲)

(ب)۔**ساحر (جادوگر):** وہ شخص جس کا کام لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنا ہو، یہ بسا اوقات ایسے حیرت انگیز کام کرتا ہے جو حقیقت سے عاری ہوتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ شخص خلاف واقع باتوں کو واقع بنا کر پیش کرتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۴﴾

''(یہ لوگ) اس بات سے ڈرانے والا خود انہیں میں سے آیا ہے متعجب ہو گئے ہیں اور کفار نے کہا کہ وہ جادوگر جھوٹا ہے''۔(ص۔۴)

(ج)۔**مسحور:** وہ شخص ہوتا ہے جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو جس کے اثر سے اس کی عقل و خرد جادو کے زیر اثر آ گئی ہو۔یہ تہمت مجنون و دیوانہ ہونے کی ایک محترمانہ شکل ہے جس کا بیان بعد میں ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

''ظالم لوگوں نے کہا کہ تم ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو''۔(فرقان۔۸)

بالکل یہی تہمت ماضی میں اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام پر بھی لگائی گئی تھی۔قرآن مجید فرماتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ﴿۱۵۳﴾

''انہوں نے کہا کہ تجھ پر تو جادو کیا گیا ہے''۔(شعراء۔۱۵۳)

اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۵۸ میں یہی تہمت حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

(د)۔**مجنون (دیوانہ)**: یہ تہمت بھی ان بہت سی تہمتوں سے ہے جس کا اقوام ماضی کے درمیان اپنے انبیاء پر لگانے کا رواج تھا۔ان میں سے بعض تو صمیم قلب سے اس تہمت کو اپنے انبیاء پر لگاتے تھے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا۔قرآن مجید اس تہمت کا مشرکین کی زبان سے کئی مواقع پر ذکر کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ﴿۶﴾

''اور انہوں نے کہا وہ شخص جو (مدعی ہے کہ) ذکر (وحی) اس پر نازل ہوتا ہے دیوانہ ہے''۔(حجر۔۶)

چونکہ عرب معاشرہ اس تہمت پر دوسری تہمتوں کی نسبت زیادہ انحصار کرتا تھا۔لہٰذا قرآن مجید بھی اس کو اہمیت دیتا اور فرماتا ہے:

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴿۲۲﴾

''اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے''۔(تکویر۔۲۲)

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ﴿۲۹﴾

''اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو تم ہرگز نہ کاہن ہو نہ دیوانہ''۔(طور۔۲۹)

اصولاً اگر کوئی شخص یکہ و تنہا، خالی ہاتھ، افکار عمومی کے خلاف اٹھ کھڑا ہو تو کوتاہ فکر لوگوں کی نظر میں وہ ایسا فرد ہوگا جو عمومیت کے مطابق نہ ہو۔ان کے نزدیک ایسے شخص کو عقل و خرد کسی حادثہ کا شکار ہو چکی ہوگی۔لیکن حقیقت آشنا اور معاشرہ کے ہمدرد مخالفین کی اس خیالی منطق کو ٹھکرا کر اس تنہا شخص کے افکار کی تائید اور اصلاح معاشرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نتیجہ کے طور پر وہ لوگ خود ایک شمع کی طرح جلنے لگتے ہیں اور اپنے چاروں طرف روشنی پھیلاتے ہیں اور بعض اوقات ایسے مواقع میں قابل دید فتح و نصرت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

(ھ)۔''**مُعَلَّم**''(لام پر زبر اور تشدید کے ساتھ) یعنی وہ شخص جس کو پڑھایا گیا ہو، عرب قوم آنحضرتؐ کی تعلیمات اور آپ کے منطق کی پختگی کا اندازہ لگا چکی تھی۔دوسری طرف بعض لوگ اسباب کی بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے، یا تسلیم کرنا ہی نہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپؐ پر وحی ہوتی ہے۔اگر وہ اس بات کو تسلیم کر لیتے تو لازم آتا وہ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئیں اور آپؐ کی رسالت کو قبول کر لیں۔یہی وجہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص علم کی طرف چشم بینا رکھتا ہے اور اس کو یہ تعلیمات مہیا کی گئی ہیں۔قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴿۱۴﴾

''ان کی طرف واضح پیغام لانے والا آیا ہے۔پھر انہوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا کہ یہ تو

تعلیم دیا گیا دیوانہ ہے“۔ (دخان۔ ۱۳، ۱۴)۔

آپ کو کون تعلیم دینے والا ہے اور یہ تعلیمات آپ کو کس نے مہیا کی ہیں، یہ ان پر بالکل واضح نہیں ہے، ممکن ہے کہ اس سے ان لوگوں کی مراد یہ ہو کہ عالم غیب سے کسی مثلاً، جن وغیرہ نے آپ کو تعلیم دی ہے۔ اس بات کے لیے لفظ ”مجنون“ گواہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ان کا احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ آپ کو کوئی انسان تعلیم دیتا ہے۔ اس دوسرے احتمال پر ذیل آیت شاہد ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۰۳

”اور ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اسے تعلیم دی ہے۔ اس شخص کی زبان جس کے بارے میں وہ یہ خیال کرتے ہیں، غیر عربی ہے جبکہ یہ تو واضح عربی زبان ہے“۔ (نحل۔ ۱۰۳)

مفسرین لکھتے ہیں کہ مشرکین مکہ آنحضرتؐ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ یہ تعلیمات ایک رومی لوہار سے حاصل کرتے ہیں۔

(و)۔ کذاب (جھوٹا): قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴

”اس بات نے خود انہی میں سے ایک ڈرانے والا آیا ہے، انہیں متعجب کر دیا اور کفار کہنے لگے کہ یہ جادوگر بہت جھوٹا ہے“۔ (ص۔ ۴)

ان لوگوں کو تعجب اس بات پر تھا اور اس بات کو اپنی حیرت کی بنیاد سمجھتے تھے کہ آنحضرتؐ متعدد خداؤں کی طرف دعوت دینے کے بجائے واحد کی طرف دعوت دیتے تھے، جیسا کہ ذیل کی آیہ مبارکہ فرماتی ہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵

”کیا یہ بہت خداؤں کو ایک خدا کہتا ہے؟ یہ بڑی عجیب بات ہے“۔ (ص۔ ۵)

(ز)۔ مفتری (افتراء باندھنے والے): اس سے مراد ہے کہ مخالفین کہتے تھے کہ یہ کتاب اس کی اپنی ہے لیکن یہ اس کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱

”وہ کہتے ہیں کہ تو تو صرف افترا باندھتا ہے جب کہ ان میں سے اکثر ناواقف ہیں“۔ (نحل۔ ۱۰۱)

قرآن پاک کئی مقامات پر اس تہمت کی تردید فرماتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ مفتری ہے تو اٹھو اور ایسی صرف دس سوتیں بنالاؤ جن کے بارے میں تمہارا عقیدہ ہے کہ ان کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ

''اگر وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کہ (پیغمبر نے) خدا پر افتراء بندھا ہے تو کہہ دیجئے کہ ایسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ''۔(ہود۔۱۳)

وہ لوگ ان تہمتوں کے سلسلہ میں بھی متفق نہیں تھے بلکہ ان کی ہر جماعت اپنے طور پر الگ الگ تو جیہ کرتی تھی کبھی کہتے کہ یہ کتاب خود اس کی اپنی ہے اور اس کی تالیف میں ایک جماعت نے اس کی مدد کی ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴

''اور کافروں نے کہا کہ قرآن سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں جو خدا پر باندھا گیا ہے اور ایک جماعت نے اس کی تدوین میں اس کی مدد کی ہے ۔یقینا انہوں نے ظلم اور جھوٹ پر مبنی بات کی ہے''۔(فرقان۔۴)

کبھی کچھ اور لوگ کہتے کہ یہ آیات سب کی سب سابقین کے افسانے ہیں جن کو اس نے لکھ لیا ہے ۔اور صبح وشام ان کو لکھتا ہی رہتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵

''اور انہوں نے کہا یہ سابقہ لوگوں کے افسانے ہیں جنہیں اس نے لکھ لیا ہے اور اب صبح وشام انہیں لکھواتا ہے''۔(فرقان۔۵)

بہر حال یہ دونوں تہمتیں (کذاب ومفتری) بالکل ایک دوسرے کے قریب ہیں اگر چہ ان میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔

(ح)۔**مفتری ہے یا مجنون:** کبھی وہ لوگ تہمت لگانے میں احتیاط سے بھی کام لیتے تھے اور ریا کاری سے کہتے تھے کہ یہ شخص یا تو جان بوجھ کر خدا کی طرف ایسی نسبت دیتا ہے یا اس نسبت کو عمداً قرار نہیں دیتا بلکہ صرف جنون کی بناء پر ان مطالب کو بیان کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ

''کیا اس نے خدا پر جان بوجھ کر افتراء باندھا ہے یا اسے جنون ہو گیا ہے؟''۔(سباء۔۸)

(ط)۔**شاعر:** قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰

''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہے اور ہم اس کے لیے حوادث کے منتظر ہیں''۔ (طور۔ ۳۰)

اس تہمت کے بارے میں قرآن پاک ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۶۹

''ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور یہ بات اس کے لائق بھی نہیں اس کی تعلیمات سوائے نصیحت اور واضح روشن قرآن کے اور کچھ نہیں''۔ (یس۔ ۶۹)

(ی)۔ **اضغاث واحلام:** وہ بے ربط افکار جن کو صاحب فکر خود بھی نہ سمجھ سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ

''بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ افکار پریشان رکھتا ہے، اس نے خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے، بلکہ وہ تو شاعر ہے۔'' (انبیاء۔ ۵)

''اضغاث'' جمع ہے ''ضغث'' کی جس کے معنی لکڑیوں کا گٹھا یا ایک سبزی کی گانٹھ جو لکڑیوں کے اس گٹھے پر رکھی ہو'' احلام'' جمع ہے ''حلم'' کی جس کے معنی خواب ہیں۔ پس اس سے مراد ملے جلے پریشان خواب ہیں جو یکے بعد دیگر نظر آئیں۔ ایسے خوابوں کو پراگندہ و پریشان خواب کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ جملہ پیچیدہ و مشکل اور سخت قسم کے مفاہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے جنہیں لوگ سمجھ نہ پائیں۔

اصولی طور پر ''تکبر'' اور ''بینش صحیح'' مکمل طور پر متضاد امور ہیں کبھی جمع نہیں ہوتے۔ قریش اور ان کے اردگرد کے قبائل ایک دوسرے سے ملنے جلنے والے متکبر لوگ تھے۔ کسی انسان کی نبوت ان کے لیے ذہنی تکلیف کا باعث تھی۔ وہ اس بات کو قبول ہی نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی شخص ان پر بطور نبی مبعوث ہوسکتا ہے، اور پھر اس کیفیت سے جس کو آیہ مبارکہ كَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ ''لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہم نے انہیں میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی ہے'' (یونس۔ ۲) پیش کر رہی ہے۔ لہٰذا وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی نورانی تعلیمات کی اس طریقہ سے توجیہات کرنے میں بے بس اور مجبور تھے جو آنحضرتؐ کی ان لوگوں کے درمیان زندگی و شہرت سے مطابقت رکھتی ہوں۔ لہٰذا یہ راستہ لازماً ایسی تہمتوں ہی میں منحصر تھا جو انبیائے سابقہ کے لیے رواج رکھتی تھیں۔ اس قسم کے الزامات و اتہامات حس و لمس کی حدود سے باہر ہونے کے باعث اگر جلدی قابل قبول نہ تھے تو ایسے بھی نہ تھے کہ آسانی سے ان کا انکار کر دیا جائے۔ البتہ شک و تردید دو ذو معنی ہونے کے لیے یہ بہت اچھا ذریعہ شمار ہوتے تھے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر نا گزیر ہے۔ ہر شخص ایسا شخص ہے جو مسائل کی تحلیل و تجزیہ کرنے کو شعور رکھتا ہے ہو۔ وہ آنحضرتؐ پر لگائے گئے اتہامات میں آنحضرتؐ کو دیگر مسائل کی نسبت بہتر مکمل طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس قوم کے درمیان آنحضرتؐ کی زندگی کے حالات اس طرح واقع ہوئے تھے کہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ آپ کے دشمن مخالفت میں حد سے آگے بڑھ جائیں اور آنحضرت ﷺ پر امور ناموس و مال و جان میں خیانت کی تہمت لگائیں، ورنہ وہ کسی طرح اس سے پیچھے نہ ہٹتے اور اس قسم کے اتہامات ضرور لگاتے۔

اب ہم اس بحث کو ایک تاریخی واقعے کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔

سرداران قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے تا کہ رسول اکرم ﷺ کی دعوت اور آپ کے معجزۂ عظیم یعنی قرآن مجید کو، جو رفتہ رفتہ ، درجہ بدرجہ لوگوں کے قلوب میں اثر پیدا کر رہا تھا، زیر بحث لائیں تا کہ ایام حج کے دوران جب جزیرہ نمائے عرب کی تمام اطراف سے لوگوں کا سیلاب مکہ آئے تو اس میں سب ایک ہی موقف پر قائم رہیں اور پراگندہ گوئی سے پرہیز کریں۔ اس مجمع میں خالد بن ولید کا باپ ولید بن مغیرہ بھی موجود تھا جو حکیم عرب مانا جاتا تھا اس اجتماع میں مختلف نظریات پیش نظر کئے گئے کچھ لوگوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کا تعارف لفظ ''کاہن'' سے کرایا جائے۔ ولید نے اس کو پسند نہ کیا اور کہا کہ آیات قرآن کاہنوں کی باتوں جیسی نہیں ہیں (کاہنوں کی باتیں چھوٹے چھوٹے مسجع جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں) دوسرا بولا انہیں مجنون کہہ کر پکارا جائے۔ ولید نے اس کو بھی رد کر دیا اور کہا آپ میں مجنون کے آثار نظر ہی نہیں آتے۔ آخر کار وہ اس رائے پر جمع ہوئے کہ آپ کو ساحر یعنی جادوگر کا نام دیا جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنی گفتگو سے لوگوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیا ہے اور اہل مکہ میں، جن کی وحدت ضرب المثل ہے نفاق ڈال کر انہیں دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔[1]

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ولید نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اس کے سامنے قرآن مجید کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں، آنحضرتؐ نے سورۂ فصلت کی شروع کی آیات آیہ مبارکہ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ﴿۱۳﴾ ''اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تمہیں عاد و ثمود پر گرنے والی بجلی جیسی صاعقہ سے ڈراتا ہوں'' (حم سجدہ۔ ۱۳) تک پڑھیں، وہ ان آیات مجیدہ کو سن کر خوف سے لرزنے لگا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جا کر اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔ سرداران قریش اس کو دیکھنے گئے اور اس سے حقیقت قرآن کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آنحضرتؐ کا کلام سحر بیانی کے مترادف ہے۔ جو ہر شخص کو متاثر کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات شریفہ نازل ہوئیں:

ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِیۡنَ شُهُوۡدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدۡتُّ لَهٗ تَمۡهِیۡدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَیۡفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَیۡفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدۡبَرَ وَاسۡتَكۡبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ یُّؤۡثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ ﴿۲۵﴾

''مجھے اس کے ساتھ جسے میں نے تنہا پیدا کیا ہے اور میں نے اسے اولاد و وسعت مال عطا فرمایا ہے، چھوڑ دے تا کہ وہ قرآن کے بارے میں سوچ و بچار اور حساب و کتاب کرے، مردہ باد! اس

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۷۰

نے کس طرح محاسبہ کیا ہے، پھر مردہ باد! اس نے کس طرح اندازہ لگایا ہے۔ اس نے غور و فکر کیا تو غصہ میں آیا، ترشروئی کی اور منہ بنا کر کہا کہ یہ جادو کے سوا نہیں جو اثر کرتا ہے اور یہ قول بشر ہے"۔ [1] (مدثر۔ ۱۱ تا ۲۵)

۲)۔ اعتراضات اور رکاوٹیں

وہ آیات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتہامات کے پہلے حصہ میں وارد ہوئیں ان پر سطور بالا میں بحث پیش کی گئی ہے اب ہم ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بچگانہ بہانہ بازی سے زیادہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان اعتراضات میں کوئی بھی معیار منطق پر پورا نہیں اترتا بلکہ سب کے سب بچوں کے بہانوں کی مانند ہیں۔ ان میں ایسی چیزوں کے بہانے بنائے گئے ہیں کہ بہانہ کرنے والا خود بھی یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں مثلاً

(۱)۔ قرآن کسی دولت مند شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا؟

یہ قرآن تم پر کیوں نازل ہوا ہے، ولید بن مغیرہ جیسے کسی دولت مند پر کیوں نازل نہیں ہوا، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

"یہ قرآن دو شہروں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ [2]" (زخرف۔ ۳۱)۔

کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کو ایک عام شخص کے بجائے کسی بڑی شخصیت پر نازل ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہر شخص میں تحمل، وحی، فرشتہ کو دیکھنے اور لوگوں کی ہدایت و رہبری کی قابلیت نہیں ہوتی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ عربوں میں شخصیت کی بزرگی کا معیار امارت و دولت و چالاکی پر منحصر تھا۔ جس پر ولید بن مغیرہ جیسے لوگ کاملاً پورے اترتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو اس بات کے مستحق جانتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی شخصیت پر جو دولت دنیا سے خالی تھی۔ اعتراض کریں اور کہیں: یہ قرآن مکہ و طائف کے کسی دولت مند شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ لیکن اگر وہ سمجھتے ہوتے کہ نزول قرآن کے لیے مادی شخصیت کے علاوہ ایک اور قسم کی شخصیت لازم و ضروری ہے (اس عہدہ کے لیے ایسے شخص کا ہونا لازم ہے جس نے اپنی عمر کے پورے چالیس سال کوہ حرا پر گزار کر اپنے نفس و روح کو اس طرح صیقل کیا کہ وہ حق تعالیٰ کے نورانی معارف کا آئینہ بن گیا) تو ہرگز اس قسم کے اعتراضات کے لیے زبان نہ کھولتے بلکہ ان کی تصدیق و حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ا ص ۳۸۷

[2] اسی کے قریب قریب سورہ فرقان، آیہ ۸ میں وارد ہوا ہے۔

(ب)۔رسالت بشر کے لیے نہیں

زمانہ جاہلیت کے عرب تاریخ رسالت سے بے خبر تھے اور رسالت خداوندی کے لیے فرشتہ کو مخصوص جانتے تھے،ان کی عقل میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ کوئی بشر بھی مورد الطاف الٰہی قرار پا کر تعلیمات خداوندی کو حاصل کر کے دوسروں تک ان تعلیمات کو پہنچا سکتا ہے۔جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾

''کوئی چیز لوگوں کے ایمان لانے میں مانع نہ ہوئی جب ہدایت ان کی طرف آئی سوائے اس کے کہ وہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے کسی بشر کو رسالت کے لیے مبعوث کر دیا ہے؟''۔(اسراء۔۹۴)

درحقیقت معترض یا معترضین ہادی (رہبر) اور مہدی (رہبری حاصل کرنے والے) کے درمیان فرق کی اصل کو سمجھنے میں غفلت کرتے ہوئے یہ تصور کرتے تھے کہ فرشتہ ہی انسان کی رہبری سے عہدہ بر ہو سکتا ہے اور وہ بھی پست درجہ کے انسانوں کی جو کمال روحانی کے اعتبار سے ابھی لڑکپن کے دور سے گزر رہے ہوں۔قرآن مجید اس نظریہ کی تردید میں بعد والی آیت میں اس طرح فرماتا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾

''اگر زمین پر فرشتے (زندگی بسر کرتے) ہوتے اور آرام و سکون سے رہتے تو ہم ان کے رسول کے طور پر آسمان سے فرشتے ہی نازل کرتے''۔(اسراء۔۹۵)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رہبر اور پیرو کے درمیان نوع یکساں ہونا رہبری کی کامیابی کے لیے ایک بنیادی شرط ہے اس لیے کہ اولاً یہ کہ یہ یکسانیت نوع ایسے امکانات پیدا کرتی ہے کہ ایک رہبر اپنے پیروان کی ضروریات و خواہشات کا اچھی طرح اندازہ کر سکے۔ان کے درد دل و احساس سے آگاہ ہو اور ان کے لیے مناسب چارہ جوئی کرے۔اس صورت حال کے بغیر مغربی معالجین والا معاملہ بن جائے گا کہ جو کسی صحرا میں وہاں کی ماحولی اور موسمی بیماریوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر وہاں کے باشندوں کا طبی معائنہ و علاج کرنے لگتے ہیں جس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔

ثانیاً یہ کہ کسی معاشرہ کے رہبر کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک نمونہ ہو۔اس کی رفتار و گفتار کردار سعادت کا پیمانہ اور خوش بختی کی علامت ہوں اس طرح اس کے کردار کا اثر پیروان قلب و اذہان پر اس کی گفتگو کی نسبت بہت زیادہ ہوگا۔لیکن رہبر کا کردار اسی صورت میں پیروان کے لیے نمونہ بنے گا جب وہ ضروریات و احساسات و عواطف و خواہشات کے سلسلہ میں اپنے پیروان کے برابر سطح پر ہوتا کہ اس کا تقویٰ

و پرہیزگاری ان کے لیے باعث تقلید بنے۔ اس کے برعکس اگر رہبر میں فرشتوں کی طرح احساس ہیجانی کیفیات بنیادی طور پر اکھاڑنے والی خواہشات کا فقدان ہوگا تو پھر نہ تو اس کی عمل تبلیغ کوئی پیدا کر سکے گی اور نہ ہی اس کی زبانی تبلیغ مؤثر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیروان احتجاج کریں گے کہ وہ (رہبر) ان (پیروان) کے ان ہیجانات مخفی ضروریات سے واقف ہی نہیں تو وہ کس طرح انہیں صبر و تحمل کی ہدایت کر سکتا ہے کیونکہ ان حالات میں اگر وہ خود پیروان کی جگہ ہوتا تو وہی کچھ کرتا جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

لہٰذا رہبر وہی شخص ہو سکتا ہے جو ضروریات حیات کے اعتبار سے دیگر انسانوں کی مانند ہو لیکن اپنے نفس امارہ کو اپنے تقویٰ کی مدد سے قابو میں رکھے تا کہ عذاب قیامت سے محفوظ رہے، جیسا کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّمَا هِيَ نَفْسِيْ اَرُوْضُهَا بِالتَّقْوٰى لِتَاْتِيَ اٰمِنَةً يَوْمَ الْخَوْفِ الْاَكْبَرِ"۔ [1]

''میری ہمت وفکر یہ ہے کہ اپنے نفس کی پرہیزگاری کے ساتھ تربیت کر کے اسے قابو کروں تا کہ اس دن (روز قیامت) جس کا خوف بہت شدید ہے، آسودہ خاطر ہوں''

یہ تجزیہ دوسری آیت میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط

''وہ کہنے لگے یہ کیا بات ہے کہ یہ رسول کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا بھی ہے''۔ (فرقان۔۷)

اس قسم کے اعتراضات کا سبب اصول تربیت سے ناواقفیت ہے اور ان سے عذر تراشی، عناد اور مخالفت کے سوا اور کچھ نہیں۔

(ج)۔ دعوت بزرگوں کے طریق کار کے خلاف

سابقین کے طریق کار کی پیروی، جو آج کے مشینی معاشروں میں بھی قومی اور ملی اقدار کی شکل میں جلوہ گر ہے تمام اقوام عالم میں مختلف اشکال اور حدود تک پائی جاتی ہے۔ لیکن متمدن دنیا سے دور، صحراؤں اور ریگستانوں کے باشندگان کے درمیان اقدار سابقین پر بہت زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے۔ بادیہ نشین اور ترقی یافتہ اقوام سے دور رہنے والے افراد کسی قیمت پر بھی اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہوتے پس آنحضرتؐ پر ان لوگوں کے بہت سے اعتراضات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ اپنے لائحہ عمل سے ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کے طریق کار سے ہٹنے کی دعوت دیتے ہیں درآنحالیکہ ہمارے بزرگوں کا آئین ہمارے لیے ہر طرح کافی و وافی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا

[1] نہج البلاغہ، فیض الاسلام، خط ۴۵

وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۰۴﴾

''اور جب ان سے کہا جائے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو خداوند عالم نے نازل فرمائی اور اس کے پیغمبر کی طرف آؤ، تو وہ کہتے ہیں وہ آئین وطریقہ کار جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے ہمارے لیے کافی ہے، (کہہ دیجئے) ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے''۔ (مائدہ۔ ۱۰۴)

یہ اعتراض صرف دور جاہلیت کے عربوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ حضرت نوح اور دیگر انبیائے بزرگ بھی اس قسم کے اعتراضات سے دوچار ہو سکتے تھے۔

(د)۔متعدد خداؤں کے بجائے ایک خدا

ان لوگوں کی نظر ایک بہت بڑا مشکل مسئلہ متعدد خداؤں کی پرستش کو ایک خدا کی عبادت میں تبدیل کرنا تھا۔ مسئلہ میں پیچیدگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نے اپنے کاموں کا ایک حصہ، مثلاً مغفرت وشفاعت کو خود ان کے سپرد کیا ہوا ہے۔ لہٰذا بغیر کسی وسیلہ کے خدائے واحد کی پرستش کا کوئی فائدہ نہیں۔

بعض اوقات اس وجہ سے کہ خدائے واحد کا قوت احساس سے ادراک ممکن نہ تھا، وہ ایسے معبود کی پرستش کرتے تھے جس کو قوت احساس کے ذریعے پہچانا جا سکے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا تو کم از کم اس کی صورت محسوس ہی لکڑی، دھات اور پتھر سے تراش کر ایک مجسمہ کی شکل میں بنائی جائے۔

کوئی شک نہیں کہ لات وعزی وہبل اور دیگر بت لکڑی، پتھر اور دھات سے خیالی تصورات کے مطابق خدا کی شکلیں بنائی گئی تھیں جن کو اس دنیا کے ماوراء سمجھتے تھے اور چونکہ ان کی طرف دیکھتے نہ تھے اس لیے وہ اپنے تخلیقی تخیل سے ان کی شکلیں قرار دے لیتے اور اپنی تصوراتی کیفیت کی مناسبت سے ان کے مجسّمے تشکیل کرتے۔ لہٰذا جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو مخاطب کر کے فرمایا:

''يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ ،يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ اُدْعُوْكُمْ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَخَلْعِ الْاَنْدَادِ وَالْاَصْنَامِ وَاَدْعُوْكُمْ اِلٰى شَهَادَتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ''

یعنی ''اے جماعت قریش! اے عرب کے رہنے والو! میں تمہیں اللہ کی عبادت کرنے اور بتوں کی پرستش ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں''۔ تو انہوں نے بڑی حیرت سے کہا:

''نَدَعُ ثَلَاثَ مِأَةِ سِتِّيْنَ اِلٰهًا وَّنَعْبُدُ اِلٰهًا وَّاحِدًا''

یعنی ''کیا ہم تین سو ساٹھ بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرنے لگیں؟''[1]

قرآن مجید اس واقعے کو جسے سیرت نگاروں نے تفصیل سے تحریر کیا ہے، ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝۵

وہ اس بات پر تعجب کرنے لگے کہ ڈرانے والا تو خود انہی میں سے آیا ہے۔ کافروں نے کہا یہ (شخص) جادوگر، جھوٹا ہے کیا اس نے متعدد خداؤں کو ایک خدا قرار دے دیا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔

تاہم یہ اعتراضات صرف زمانہ جاہلیت کے عربوں ہی سے مخصوص نہ تھے بلکہ دیگر امتوں کے درمیان بھی پائے جاتے تھے ان اعتراضات کی بنیاد وہی تجزیہ ہے جو آغاز بحث میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

(ھ) حیاتِ نو

حیات بعد از موت ان مسائل سے ہے جس سے دور جاہلیت کے عرب بہت زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے اور اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے ان کے منطق کو قرآن پاک ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬

'کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے۔ (جب ہمارے اجزائے بدن اطراف زمین میں بکھر جائیں گے) تو کیا ہم نئے سرے سے خلق کیے جائیں گے۔

یہی اعتراض قرآن شریف کی دوسری سورتوں، مثلاً سباء آیہ ۷، اسراء آیہ ۴۹، ۹۸ میں بھی وارد ہوئے اس قسم کے اعتراض کی بنیاد، جہالت و نادانی سے قطع نظر، روز حساب کے خوف پر بھی تھی یعنی وہ دن جس دن ان کے تمام اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی۔

قرآن مجید میں کئی طریقہ سے اس کمزور و بے بنیاد منطق کی تردید کی گئی ہے ہم نے اپنی کتاب ''معادِ انسان و جہان'' میں اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۱۵۵ و مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱ ص ۴۹

(و) نبوت کے خلاف رقابت

وہ لوگ نبوت اور خدائی رہبری کے مفہوم کو سمجھ نہ پاتے تھے وہ اس کو بھی قبائلی رقابت کی سطح پر رکھتے تھے اور کہتے کہ ہم قبیلہ عبدمناف (پیغمبر اکرمؐ کا قبیلہ) کے ساتھ دوساتھ ساتھ بھاگنے والے گھوڑوں کی طرح دوش بدوش چلتے تھے قبیلہ عبدمناف نے ہم پر سبقت حاصل کرنے کیلئے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ ہم ہرگز ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ ہم پر بھی وحی نازل نہ ہو یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ دوسرے انبیاء پر وحی نازل کرے۔[1]

جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے

وَإِذَا جَآءَتۡهُمۡ ءَايَةٌ قَالُواْ لَن نُّؤۡمِنَ حَتَّىٰ نُؤۡتَىٰ مِثۡلَ مَآ أُوتِيَ رُسُلُ ٱللَّهِۘ

''اور جب بھی ان کے لیے آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ جو چیز خدا کے پیغمبروں کو دی گئی ہے ہمیں بھی وہی دی گئی ہے''۔ (انعام۔ ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ اس اعتراض کے بارے میں فرماتا ہے:

ٱللَّهُ أَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهُۥۗ سَيُصِيبُ ٱلَّذِينَ أَجۡرَمُواْ صَغَارٌ عِندَ ٱللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدُۢ بِمَا كَانُواْ يَمۡكُرُونَ ﴿١٢٤﴾

''اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے، عنقریب وہ لوگ جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حقارت میں گرفتار ہوں گے اور اپنی مکاریوں کے بدلہ میں عذاب شدید میں مبتلا ہوں گے''۔ (انعام۔ ۱۲۴)

اس جماعت کے لوگ رسالت الٰہی کے لوگ رسالت الٰہی کو ایک مقام اجتماعی تصور کرتے تھے، اس سے استفادہ کرنے کے لیے کسی قسم کی شرائط کو ضروری نہ جانتے تھے اور نہ ہی اس سلسلہ میں کسی تربیت گاہ پر اعتقاد رکھتے تھے بلکہ منصب نبوت کو بھی بچگانہ قبائلی رقابت کا ایک عامل خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی وہ مصر تھے کہ قبیلہ عبدمناف کی طرح ان کے قبیلہ میں بھی ایسا ہی منصب رسالت اور رسول ہونا چاہیے۔ اس قسم کے اعتراض کا جامع علمی جواب کلام الٰہی میں موجود ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''ٱللَّهُ يَجۡعَلُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهُۥ''

یعنی ''اللہ ہی جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے''۔

---

[1] مجمع البیان، ج۱

(ز)۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا معجزہ کیوں نہیں رکھتے؟

مشرکین عرب "احبار یہود" کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے کم وبیش واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عصا اور ید بیضا کے دو معجزات کے حامل تھے۔ عصاء موسیٰ نے جادوگروں کے مقابلہ میں ایک اژدھا کی صورت اختیار کر لی تھی اور ان کے جادو کو نگل گیا تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام معجزہ دکھانے کے موقع پر اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاتے اور جب باہر نکالتے تو ہاتھ روشن اور چمکتا ہوتا مشرکین عرب آنحضرتؐ پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا معجزہ کیوں نہیں پیش کرتے، قرآن مجید میں اس بارے میں فرمایا گیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ

"اس کو وہ چیزیں کیوں نہیں دی گئی جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی"۔ (قصص۔۴۸)۔[1]

قرآن مجید اس اعتراض کے جواب میں دو مطالب بیان فرماتا ہے۔ ایک یہ کہ اس قسم کے اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ محض بہانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے بھی حامل ہوتے پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مصر کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہ لاتے تھے بلکہ ان دونوں یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ لوگ جادوگری کی تہمت لگاتے تھے۔ حجاز کے زمانہ جاہلیت کے لوگوں مصر کے لوگ سے مختلف نہ تھے۔ وہ ایک ہی قماش کے لوگ تھے اور اصطلاح کے مطابق سر سے پاؤں تک ایک ہی نوعیت کے تھے۔ یہ بھی مصریوں کی طرح واقع بینی اور ہدایت پانے کی صلاحیت سے قطعی ناواقف تھے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۗ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

"انہوں نے کہا موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں جادوگر ہیں، دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں اور ہم دونوں سے انکاری

---

[1] یہی اعتراض سورہ انعام کی آیت ۳۷ میں بھی وارد ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ "یعنی انہوں نے کہا کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کیوں آیت نازل نہیں ہوئی؟ کہہ دیجئے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ یہ آیت ونشانی نازل فرمائے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

ہیں۔(ان کی نبوت قبول نہیں کرتے)''۔(قصص۔۴۸)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے بڑا معجزہ کونسا ہوسکتا ہے۔اگر تم (مشرکین عرب) اس کو قبول نہیں کرتے تو آؤ اس سے اور تورات سے بہتر معجزہ لے آؤ، ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۴۹

''کہہ دیجئے کہ (تم اور مصر کے لوگ جو اپنے اپنے پیغمبروں کے منکر ہو) اگر سچے ہو اٹھو اور دونوں (تورات و قرآن) سے زیادہ ہدایت والی کوئی کتاب لے آؤ کہ میں اس کی پیروی کروں''۔(قصص۔۴۹)

یہ لوگ معجزات کے مختلف ہونے کی علت سے واقف نہ تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ سب پیغمبر ایک ہی طرح کے معجزات کے حامل ہوتے ہیں۔یعنی جو معجزات حضرت موسیٰ اور مسیح علیہ السلام کو دیئے گئے تھے وہی پیغمبر اکرم ﷺ کو بھی عطا ہونا لازم تھے اور یا اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔(یعنی آنحضرتؐ کے معجزات کا انبیائے سابق کو حاصل ہونا چاہیے)۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر نبی کے معجزہ کو اس کے زمانہ کے کمال فن سے متناسب ہونا لازم ہے تاکہ اہل فن ماہرین کی عاجزی نبی کے مقابلہ میں ثابت ہوجائے،اللہ تعالیٰ کی قدرت لامتناہی کی علامت ونشانی ثابت ہو اور یہ تسلیم کیا جائے کہ ایسے بڑے اور خاص قسم کے امور میں ماہرین ومخصوصین فن عاجز وناتواں ہیں،جب کہ حدود سے باہر ہوں گے تو ماہرین زمانہ کا ان کے مقابلہ میں عاجز آنا اللہ تعالیٰ کی قدرت لامتناہی پر شاہد نہ ہوگا،کیونکہ پھر یہ لوگ یہ کہیں گے کہ جس چیز کے مقابلہ کی اللہ کے نبی نے دعوت دی ہے وہ لوگ اس کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے۔لہٰذا ایسے معاملہ میں ان کا عجز نبی کی صداقت کا کیسے شاہد ہوسکتا ہے۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر وجادو کا فن اور حضرت عیسیٰ السلام کے دور میں فن طبابت بہت ترقی پر تھے۔پس اللہ تعالیٰ کے ان دونوں پیغمبروں کے طریق کار نے معجزہ کا نام پایا کیونکہ ان دونوں حضرات کا عمل بہ نظر ظاہر اس زمانہ کے کمالات کے عین مطابق تھا اور ان کے مقابلہ میں ان فنون کے ماہرین کی عاجزی وناتوانی سے ثابت ہوگیا کہ ان دونوں حضرات کا عمل ان دونوں علوم کی حدود سے باہر تھا یعنی ان کا علم نہ تو سحر وجادو تھا اور نہ ہی طبابت،اگر ایسا نہ ہوتا تو زمانہ کے ماہرین فن اپنی دانش وبینش کو جمع کرتے اور انبیاء کے عمل کی نظیر لاسکتے تھے۔

اس تجزیہ کی بناء پر یہ توقع کرنا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا پیش کردہ معجزہ جزیرہ نمائے عرب کے ماحول سے،جہاں نہ سحر وجادو سے کوئی واقف تھا اور نہ ہی طبابت ومعالجہ کا کوئی ماہر تھا۔مختلف ہو اور مذکورہ دو عالی قدر پیغمبران باری تعالیٰ جیسا ہو ایک نہایت ہی غیر منطقی بات ہے۔

مذکرہ بالا کیفیات کے علاوہ آنحضرتؐ کی نبوت آخری نبوت ہے اور ان کی ذات گرامی خاتم انبیاء ہے۔لہٰذا لازم ہے کہ آپ کا معجزہ بھی آپ کی نبوت کی طرح دائمی اور مستقل ہو،زمانہ کا سفر اس معجزہ کی فرسودگی اور اختتام کا سبب نہ بنے۔اس قسم کی نبوت دائمی کے لیے وقتی

معجزات مثلاً شق القمر اور سنگریزوں کی تسبیح کے علاوہ ایک ابدی معجزہ کا وجود لازم ہے جو ہمیشہ ہمیشہ افق زمانہ پر درخشاں رہے۔ایسا دائمی معجزہ قرآن مجید کے علاوہ ہرگز ممکن نہیں جس میں کبھی کسی طرح کے زوال ونابودی کا کوئی امکان نہیں۔

(ح)۔آنحضرتؐ کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں؟

مشرکین عرب کا ایک اور احمقانہ اعتراض یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوا جو مراحل تبلیغ میں آپ کی مدد کرتا ،جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ط

''اورانہوں نے کہا کہ اس کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوا؟''۔(انعام۔۸)

یہ اعتراض بھی ان کے سابقہ اعتراضات اور بہانہ بازیوں ہی جیسا ہے کیونکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہدایت انسانی کے لیے کافی نہیں، بلکہ ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے علاوہ کسی اور جنس کا کوئی فرد اس کے ہمراہ موجود ہو جبکہ اصولی طور پر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ہدایت کے میدان میں ہم جنس اپنے ہم جنس پر بہت زیادہ اور مستقل تر اثر رکھتا ہے۔اس سے قطع نظر اگر نزول ملک اس کی اپنی اصلی صورت میں واقع ہو یعنی ملک صورت انسانی کی تمثیل نہ بنے ،تو اس صورت میں عالم غیب صورت شہود اختیار کر لے گا۔پھر اگر اس صورت میں بھی لوگ انکار وہٹ دھرمی سے کام لیں اور ایمان نہ لائیں تو عذاب خدا ان کو گھیر لے گا اور وہ سب کے سب نیست ونابود ہو جائیں گے کیونکہ شہود غیب کے ساتھ اتمام حجت کا آخری مرحلہ بھی ختم ہو جائے گا اور پھر منکرین کی سزا قطعی صورت اختیار کر لے گی،یہی وجہ ہے کہ پروردگار عالم اپنے لطف وکرم کی خاطر جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے،ایسا نہیں کرتا تا کہ اس کے بندوں کو تجدید نظر اور بار بار سوچنے کی فرصت ملتی رہے۔یہ کیفیت بذات خود اللہ تعالیٰ کے الطاف واکرام میں سے ایک ہے جس کی طرف ذیل کی آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ⑧

''اور اگر ہم فرشتہ نازل کر دیں (اور وہ ایمان نہ لائیں) تو بات اپنے انجام کو پہنچ جائے گی پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی''۔(انعام۔۸)

اس سلسلہ میں قرآن یہاں پر ایک اور جواب کی طرف اشارہ فرماتا ہے جس کی طرف سابق میں بھی اشارہ ہو چکا ہے وہ اس طرح کہ حاکم معاشرہ زبانی تعلیم سے قبل اپنے کردار کے ذریعہ بھی نمونہ پیش کر سکتا ہے۔یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب رہبر تصور واحساس میں اپنے پیروان سے یکسانیت رکھتا ہو کہ ان کے لیے عملی نمونہ قرار پا سکے۔لیکن رہبر اگر لوگوں کا ہم جنس وہم نوع نہ ہو بلکہ ان کی ضروریات وخواہشات مخفی کا حامل نہ ہو تو اس صورت میں اس کی رہنمائی عملی صورت میں محقق نہ ہو سکے گی۔نتیجہ یہ ہوگا کہ پیروان کو بہانہ مل جائے گا کہ ان کا رہبر ان کے راز ہائے دل سے واقف نہیں اور ان کی ضروریات وحاجات سے بے خبر ہے،پس پیروکاران کو ہدایت سے روگردانی کرنے کا موقعہ ہاتھ آجائے گا

قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ فرماتا ہے:

''وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا'' یعنی اگر پیغمبر یا اس کے ہمراہ آنے والے کو ہم فرشتہ قرار دیتے تو ضروری تھا کہ بعثت کے ہدف ومقصود کی حفاظت کے لیے صورتاً وسیرتاً اسے انسان ہی قرار دیتے تاکہ وہ رہبری کے فرائض اور ذمہ داری کو بہ صورت کامل انجام دے سکے۔

(۳)۔پیش بندیاں اور درخواستیں

یہاں تک ہم کسی حد تک نزول وحی کے زمانہ کے عربوں کے بچگانہ اعتراضات اور بے جا و بے بنیاد بیانات سے آشنا ہوئے۔قرآن پاک کی مدد سے ہم ایک دوسرے سلسلہ اعتراضات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں جن کو ہم پہلے واضح نہیں کر سکے۔اب ہم ان کی بعض پیش بندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی براہ راست مخالفت میں قائم کی تھیں۔

اصولی طور پر دو متخاصم اور جھگڑنے والوں میں سے ایک کے دلائل اس صورت میں متناسب اور منطقی شمار ہوتے ہیں جب وہ مد مقابل کے دعویٰ کی مکمل طور پر نفی نہ کرے اور اصلاح کے مطابق کسی حد تک اس کے حق کا قائل ہو،اس کے برعکس اگر ایک شخص کا دعویٰ دوسرے کے مقابلہ میں بالکل الٹ قرار پائے تو اس دعویٰ میں کسی طرح کوئی معقول صورت نہیں ہوتی۔

مخالفین رسالت کی تمام پیش بندیاں اسی طرح کی تھیں،وہ لوگ ہرگز یہ بات سوچنے ہی کے لیے تیار نہ تھے کہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی مقصد و ہدف کی خاطر مبعوث ہوئے ہیں۔اگر ایسا ہوتا تو کم از کم وہ کوئی ایسی بات ضرور کرتے جو آپ کے مقصد کے ساتھ کسی حد تک سازگار ہوتی۔ہم کفار کی پیش بندیوں سے چند ایک کی طرف یہاں اشارہ کرتے ہیں:

ا)۔ہمارے خداؤں کی پرستش کریں تاکہ۔۔۔

ان کی ایک شرط یہ تھی کہ وہ خدائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کرنے پر تیار ہیں۔بشرطیکہ آنحضرتؐ بھی ان خداؤں کی پرستش کریں۔خداوند عالم نے اس شرط کے خلاف سورۂ کافرون نازل فرمائی اور فرمایا:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكَٰفِرُونَ ۝١ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝٢ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۝٣

''کہہ دیجئے کہ اے کافرو! جس کی پرستش تم کرتے ہو میں اس کی پرستش نہیں کرتا اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں کرتا ہوں''۔سورۂ کافرون۔ا تا ۳)۔

مفسرین نے سورۂ اسراء میں آنے والی آیات مبارکہ کی بہت سی شان ہائے نزول نقل کی ہیں جن میں اکثر اس سورۂ کے مکی ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں۔ان کی صحیح شان نزول وہی ہے جو ابوحفص امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

''قریش نے رسول اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم ایک سال تک آپ کے خدا کی پرستش کریں گے بشرطیکہ آپ بھی ایک سال تک ہمارے خداؤں کی پرستش کریں''۔[1]

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾

''قریب تھا کہ وہ (اپنی پیش نہادوں سے) آپ کو اس چیز سے جو ہم نے آپ پر وحی کی ہے فریب دیں تاکہ آپ ہماری طرف اس چیز کے غیر کی نسبت دینے لگیں اور پھر وہ آپ کو اپنا دوست بنالیں''۔(اسراء۔ ۷۳)

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿٧٤﴾

''اور ہم آپ کو استقلال نہ بخشتے (ہم نے آپ کو مانع لغزش عصمت عطا نہ کی ہوتی) تو قریب تھا کہ آپ کسی قدر ان کی طرف مائل ہوجاتے''۔(اسراء۔ ۷۴)۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾

''اس صورت میں ہم آپ کو (مشرکین کے) دو برابر سزائیں دنیا کی زندگی میں اور دو ان کے برابر موت کے بعد چکھاتے۔ اس وقت آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ملتا''۔(اسراء۔ ۷۵)

ان آیات کے بارے میں ہم دو مطالب کا تذکرہ ناگزیر سمجھتے ہیں:

(ا)۔ اس قسم کی پیش بندی کا ایک سبب انبیاء علیہم السلام کے اہداف و مقاصد سے ناواقفیت کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ تمام انبیاء ایک ہدف مشترک کے لیے نوع انسان کے درمیان مبعوث کیے گئے جو توحید پرستی ہے۔ یہ ہدف اساسی طور پر تمام شرائع آسمانی کے ملحوظ خاطر تھا۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی و تغیر ممکن نہ تھا۔ یہی اصول ان کی شریعت کی اصل و احساس کو تشکیل دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

''اور ہر قوم کے درمیان ہم نے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت کی

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۲۳۹، نقل از تفسیر فرات، ص ۲۳۱

پرستش سے اجتناب کریں''۔ (نحل۔۳۶)

ایسا اصول جو تمام آسمانی شریعتوں کی روح کی تشکیل کرتا ہو، کبھی قابل مصالحت یا تغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا کس طرح اس قسم کی شرائط کو مطابق عقل تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

جادۂ توحید سے انحراف اس قدر قبیح و سنگین ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا انحراف بھی سزا کا مورد بنتا ہے اور قرآن اس کو ''ضعف الحیوۃ'' اور ''ضعف الممات'' سے تعبیر کرتا ہے۔

(ب)۔ سورۂ اسراء میں آنے والی آیات مجیدہ کفار کی شرائط کی طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھکاؤ پر گواہ نہیں ہیں چہ جائیکہ ان کو آنحضرت کی طرف سے لغزش سمجھا جائے، آیت ایک مشروط کیفیت کی بات کرتی ہے، کسی واقعیت کی نہیں۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کسی قدر ان کی خواہش کی طرف مائل ہو جائے۔ آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوۡلَآ أَن ثَبَّتۡنَٰكَ لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ إِلَيۡهِمۡ شَيۡـٔٗا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾

لیکن چونکہ نصرت خداوند تعالیٰ حاصل تھی اس لیے ان کی طرف آنحضرتؐ کے جھکاؤ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ تثبیت یا نصرت خدا سے قوت عصمت یا روح القدس کی امداد مراد ہے جو انبیاء علیہم السلام کو زندگی کے تمام مراحل میں ہر قسم کی لغزش سے محفوظ رکھتی ہے۔ آیہ مجیدہ ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنے کسی دوست سے کہے کہ اگر میں نے آپ کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ آپ گر جاتے، یعنی میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے نہ صرف یہ کہ آپ گرے نہیں، بلکہ گرنے کے قریب نہ ہوئے۔ آیہ مبارکہ سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فکری و عقلی اعتبار سے عمل و کردار میں ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو مشرکین کی (شرائط) کی طرف جھکاؤ آپ کے نفس کے قریب ہو جاتا لیکن اصلی ثبات قدم جس کا نام ''عصمت'' ہے اور ''روح القدس'' کی حفاظت نے اس قسم کے ہر میلان کی نفی کر دی ہے اور اصل میلان تو ایک طرف، اس کا شائبہ تک آپ کی روح میں نظر نہ آیا۔ [1]

انبیائے خدا سے، اس لحاظ سے کہ بشر ہیں، گناہ و غلطی و خطا و لغزش کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور آیہ مبارکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرکین کی طرف سے پیدا کیے جانے والے وسوسے اور فتنے (آپ ہمارے خداؤں کی پرستش کریں اور ہم آپ کے خدا کی) ان کے نفوس پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

لیکن ان کی عصمت اور اللہ کی طرف سے حفاظت کے لیے ہر قسم کے گناہ و لغزش کی نفی کرتی ہیں، نہ صرف یہ کہ عمداً اور سہواً بھی کسی قسم کی لغزش کا تصور ان کی طرف نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان تمام عرصہ حیات میں ان چیزوں کا شائبہ تک ان کے لیے معدوم ہے۔ متذکرہ آیات انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ان دونوں قسم کے تصورات کی شہادت دیتی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اس لحاظ سے کہ اے پیغمبر! آپ انسان و بشر ہیں، مشرکین کی طرف سے پیدا کیا جانے والا وسوسہ اس حد تک تھا کہ آپ کے نفس کے قریب آ سکتا تھا اور ایک سلسلہ محاسبات تھا جس میں

---

[1] جیسا کہ جملہ ''لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ إِلَيۡهِمۡ'' ''یعنی قریب تھا کہ آپ اس طرح جھکاؤ ظاہر کرتے'' سے ظاہر ہے۔

مشرکین کے آپ کے آئین کے قریب ہونے کا شائبہ بھی شامل تھا، آپ کے ذہن پر اثر انداز ہوسکتا، ان سب باتوں کے پیش نظر آپ ہر ہمیشہ ایک پردہ عصمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے جذبہ استقلال اور روح القدس سے آپ کی حفاظت، قائم رکھی گئی جن کی مدد سے ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا اور آپ اس کارزارِ فکر کی جنگ سے سرفراز ہو کر باہر نکلے۔

ہم نے کتاب ''راز بزرگ جنگ رسالت'' میں صفحہ ۳۰۷ تا ۳۷۶ پر متذکرہ آیات کے سلسلہ میں بحث کی ہے۔ہم عصمت پیغمبر کے بارے میں آنے والی آیات کے جملوں اور مفردات کا تجزیہ بھی پیش کریں گے۔

۱)۔قرآن میں تبدیلی

قرآن مجید میں بتوں اور عربوں کے جھوٹے خداؤں کی مذمت مشرکین کے غصہ کا باعث تھی لہٰذا انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ کوئی اور قرآن لے کر آئیں، جس میں ان کے خداؤں کی مذمت نہ ہو۔مشرکین کا یہ مطالبہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ لوگ نبوت کے مفہوم اور آنحضرتؐ کی ذمہ داریوں سے واقف نہ تھے۔پیغمبر ہمیشہ ایک مخفی قوت کا حامل ہوتا ہے جس کو ''وحی'' کہتے ہیں۔اس قوت کی مدد سے وہ ہر اس چیز کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو عالم غیب سے ان کے قلوب پر القاء ہوتی ہیں۔یعنی انبیاء کی ذمہ داری اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جو کچھ عالم بالا سے ان تک پہنچتا ہے اس کو کسی قسم کی کمی و زیادتی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ان تعلیمات خود ان کو اپنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتیں کہ ان میں وہ کسی طرح کا تصرف کرسکیں۔قرآن پاک اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ‌ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ‌ؕ

''جب ہماری روشن اور واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو جاری ملاقات (قیامت) کی امید نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی قرآن لے آؤ یا اس کو بدل ڈالو''۔(یونس۔۱۵)

اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

۱)قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ‌ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ‌ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾

''کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں اپنی جانب سے اس کو بدل دوں، میں سوائے اس کے جو میری طرف وحی ہوتی ہے، کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا، میں اپنے پروردگار کی معصیت کرنے میں بڑے

دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔ (یونس۔۱۵)

آیہ مبارکہ کے اس حصہ میں واقعیت نبوت، حقیقت وحی اور عامل وحی کے فرائض بیان ہورہے ہیں، نیز یہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرض اصلیت کے بیان کے علاوہ کچھ نہیں اور فرائض کے خلاف کوئی بات خواہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، قیامت کے دن مواخذہ سے نہیں بچے گی۔

۲)قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑯

''کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں ان آیات کی تمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور نہ ہی (ان باتوں سے) تمہیں آگاہ کرتا، میں اس سے قبل مدتوں تمہارے درمیان رہا ہوں، پھر تم کیوں غور نہیں کرتے؟''۔ (یونس۔۱٦)

اس تشریح سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ قرآن فکر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیداوار نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ یقینا آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے ایسی ہی کوئی بات سنتے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایسی تعلیمات ومعارف آنحضرتؐ کے ذہن میں موجود ہوتے اور اس تمام عرصہ میں نہ تو کوئی ایسی چیز آپ سے ظاہر ہوتی نہ ہی آپ کی زندگی میں اس کے کوئی آثار پائے جاتے۔ یعنی ''فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ'' کا جملہ ایک بنیادی اور کامل کیفیت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی راز دار اور حامل رموز ہو، کسی بہت بڑے راز کو ایک عمر تک پنہاں نہیں رکھ سکتا، پھر صرف ایک ہی نہیں سینکڑوں رموز کو مخفی رکھے۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ محافل ومجالس میں اور یار وانصار کے درمیان گفتگو جب لاشعور کے دروازے شعور کی طرف پوری طرح کھلنے لگتے ہیں تو ایک وقت آجاتا ہے جب ان راستوں کا روکنا ممکن نہیں ہوتا تو راز ہائے دروں سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور رموز ذہن مکمل طور پر ظاہر وواضح ہوجاتے ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَا اضمر احد شيئًا الاظهر في صفحات وجهه وفلتات لسانه"۔ [1]

''کوئی شخص کسی بات کو اپنے نہاں خانہ ذہن میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا مگر یہ کہ وہ شے اس کے چہرہ اور گفتگو سے ظاہر ہوجاتی ہے''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''میں نے تمہارے درمیان زندگی کے چالیس سال بسر کئے ہیں، اس تمام عرصہ میں، جو انسانی افکار وتصورات کے جوش وخروش کا زمانہ ہوتا ہے

[1] نہج البلاغہ، قصار الحکم، ش ۲٦

تم نے مجھ سے کوئی بات ان تعلیمات کے بارے میں نہیں سنی، پھر تم یہ کس طرح تصور کرتے ہو کہ یہ سب تعلیمات میری جانب سے ہیں اور میں نے ان کو اس طویل مدت میں تم سے مخفی و پوشیدہ رکھا ہے آخر تم لوگ عقل وفکر سے کام کیوں نہیں لیتے؟''۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ہم ناگزیر سمجھتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایسے مریض تھے جو طبیب سے اصرار کرتے تھے کہ دوائی کا نسخہ ان کی مرضی کے مطابق تحریر کرے خواہ وہ نسخہ ان کی مصلحت سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔لہٰذا طبیب اگر ایسے بے وقوف مریضوں کی درخواست تسلیم نہ کرے تو اس میں اس کا قصور نہیں۔ اسی طرح وہ لوگ اپنے معاشرہ کی اصلاح کے خواہش مند نہ تھے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اللہ کے نبی کو اپنی ہوا و ہوس کی طرف مائل کریں۔

۲)۔غیر معقول درخواستیں

ان لوگوں کی مخالفت اور دشمنی کی ایک علامت یہ تھی کہ وہ ایسی باتوں کی درخواست کرتے تھے اور اپنے ایمان کو ایسی چیزوں میں محمول کرتے تھے جو ذاتی طور پر محال اور ناممکن امور سے متعلق ہوتی تھیں، یا بعثت رسولؐ کے اہداف کے لیے سازگار نہ ہوتی تھیں، جس کا مقصد صرف لوگوں کی ہدایت و تربیت تھا، یا ان کا انجام پانا علامت نبوت اور لوگوں سے راستگوئی کے مترادف نہ تھا۔ یہ باتیں قریش کی آٹھ درخواستوں پر مشتمل ہیں جو درج ذیل آیات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر رسول اکرم ﷺ نے ان کی خواہشات کا مثبت جواب نہیں دیا تو غالباً یہ مندرجہ بالا وجوہات میں سے کسی کے تحت ہوگا۔ ہم ان تمام درخواستوں کو الگ الگ بیان کرتے ہیں تاکہ ان میں واقع اشکال کی نشان دہی آسان ہو جائے۔

''وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ: اور انہوں نے کہا ہم تم پر ایمان نہیں لاتے جب تک امور ذیل کو آپ انجام نہ دیں:

(ا)۔ "حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا"

''زمین سے ہمارے لیے ایک چشمہ جاری کردیں''۔

(ب)۔ "أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا"

''یا آپ کے لیے کھجور اور انگور کا باغ ہو اور آپ ان کے درمیان پانی کی نہریں جاری کردیں''۔

(ج)۔ "أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا"

''آپ آسمانوں یا آسمانوں کے پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے سروں پر گرائیں''۔

(د)۔ "أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ"

''یا خدا لا کر ہمیں دکھا دو''۔

(ہ)۔ "وَالْمَلَآئِكَةِ قَبِيلًا"

''ہمیں فرشتوں کو دکھلا دو''۔

(و)۔ "أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ"

''یا آپ کا گھر سونے کا ہو جائے''

(ز)۔ "أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ"

''یا آپ آسمان کی طرف پرواز کریں''

(ح)۔ "وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ"

''اور ہم آپ کے آسمان پر چڑھنے پر بھی کبھی ایمان نہ لائیں گے مگر یہ کہ آپ پر ایک ایسی کتاب نازل ہو جس کو ہم خود پڑھیں (اور اس میں آپ کی نبوت اور بعثت کے بارے میں لکھا ہوا ہو)''۔

قرآن مجید ان تمام مطالبات کا جواب ایک نہایت ہی نپے تلے مختصر جملہ میں دیتا ہے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴿٩٣﴾

''کہہ دیجئے کہ پاک و منزہ ہے میرا پروردگار، میں تو پیغام لانے والا ایک بشر سے زیادہ نہیں ہوں''۔(اسراء۔ ۹۳)

اس مختصر سے جملہ کی تشریح اور وضاحت اس بات کی مرہون منت ہے کہ ان لوگوں کے ایک ایک مطالبہ پر گفتگو کی جائے ان لوگوں کی دشمنی اور مخالفت ثابت واضح ہو جائے۔ ان پیش بندیوں اور مطالبوں سے ان کا مقصد عشق یا ایمان یا طلب حقیقت ہرگز نہ تھا۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی دعوت کے راستہ میں روڑے اٹکائیں اور اپنے ایمان نہ لانے کے لیے بہانے تراشیں، ورنہ حقیقت کا متلاشی شخص کبھی مصلح کو یہ نہیں کہتا کہ اگر تو سچا ہے تو ہمیں سولی پر لٹکا دے یا مشرکین کے مطالبہ کے مطابق ہمارے سروں پر آسمان سے پتھر گرا کر ہمیں نیست و نابود کر دے حالانکہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی جانب سے منحرف اور کج فکر لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے نہ کہ ان کو ختم کرنے کے لیے ،لہٰذا مشرکین کے لیے یہ مطالبات سوائے دشمنی کے سوا کوئی مقصد نہ رکھتے تھے۔

گروہ مشرکین کے عناد و دشمنی کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے ایک ایک مطالبہ پر مستقل طور پر بحث کریں اور ذیل میں تحقیق کے نتائج پیش کریں۔

(ا)۔ پہلا مطالبہ جو ''حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا'' کے جملہ میں بیان ہو رہا ہے دو احتمال اپنے اندر رکھتا ہے:

۱)۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہماری خاطر زمین کو پھاڑیں۔
۲)۔ زمین کو ہماری منفعت کی خاطر شگافتہ کر دیں اور اس میں چشمہ جاری کر دیں۔
اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ یا تو پیغمبر اکرم ﷺ دولت مند ہو جائیں یا یہ کہ وہ لوگ خود اس قسم کی نعمت سے مالا مال ہو جائیں۔ مشرکین کا پہلا مطالبہ نبوت اور صدق کی علامت نہیں جب کہ دوسرا مطالبہ بھی سنت الٰہی کے خلاف ہے سنت خداوند تعالیٰ یہ ہے کہ لوگ کام کر کے محنت کے ساتھ نعمات الٰہی سے بہرہ مند ہوں نہ کہ کسی طریقہ غیب سے (سوائے اس کے کہ ضرورت و مجبوری کے تحت ایسا ہو)۔
(ب)۔ دوسرا مطالبہ یعنی پیغمبر اکرم ﷺ کھجور اور انگور کے باغ کے مالک ہوں۔ یہ مطالبہ بھی مدعی نبوت کیی جانب کسی صدق گفتاری کی علامت نہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر ہر دولت مند شخص کو نبی ہونا چاہیے اور اس کی ہر بات صحیح و صادق ہو۔ یہ مطالبہ ایک فکر باطل کا نتیجہ ہے جو یہ ہے کہ نبوت اور وحی الٰہی کو کسی دولت مند شخص پر نازل ہونا چاہیے نہ کہ کسی فقیر وغریب پر، جیسا کہ اعتراضات کے حصہ میں ہم نے سطور بالا میں مشرکین کے اعتراضات کو یکجا نقل کیا ہے جو کہتے تھے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

''اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن دو بڑے شہروں (مکہ وطائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا''۔ (زخرف۔۳۱)

(ج)۔ تیسرا مطالبہ یہ کہ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے سروں پر گرا دے۔ یہ بھی مقصد رسالت کے خلاف بات ہے کیونکہ بعثت رسول کا مقصد لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی ہے نہ کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا، سوائے اس کے کہ جب ایسے لوگوں پر حجت تمام ہو جائے، عالم ''غیب'' بصورت ''شہود'' سامنے آجائے اور کسی قسم کا کوئی عذر اس قوم کے لیے باقی نہ رہے تو پھر ایسی صورت میں ایسی امت کی بربادی قطعی و یقینی ہو جاتی ہے۔
خداوند علام اس بناء پر کہ حق کی طرف واپس آنے کی راہ کھلی رہے، اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ معاملہ اس حد تک پہنچ جائے۔ اسی لیے لوگ جس قدر اس قسم کے معجزات پر اصرار کریں اللہ تعالیٰ ایسی درخواست ومطالبہ کو قبول نہیں فرماتا۔
(د)۔ چوتھا مطالبہ یہ ایک امر محال و ناممکن ہے۔ مشرکین عام نگاہوں سے رویت خدا کے خواہاں تھے۔ لفظ ''قَبِيْلًا'' اس امر پر گواہ ہے اور یہ ایک ایسا امر محال ہے جو کبھی انجام نہیں پا سکتا کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے ایسا ممکن ہوتا۔
(ھ)۔ پانچواں مطالبہ (فرشتوں کو ہمیں دکھلا دیں) عذاب الٰہی اور ان کے نیست و نابود ہونے کا باعث بن جاتا کیونکہ وہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے، رویت ملائکہ بصورت واقعی غیب کے شہود میں تبدل کے مترادف ہے۔ اس کے بعد مطالبہ کنندگان اور مناقشہ کرنے والوں کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنے دیتا اور اگر پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو ان کی نابودی مسلم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک اس بارے میں فرماتا ہے:

"وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ"۔ (انعام۔ ۸)

(و)۔ چھٹا مطالبہ نبوت کی صداقت کے سلسلہ میں دوسرے مطالبہ کی طرح ایک بچگانہ، غیر عاقلانہ مطالبہ ہے۔

(ز)۔ ساتواں مطالبہ بھی، اگر پورا ہو بھی سکتا، تو اس سے ان کا ایمان کا قبول کرنا لازم نہ تھا کیونکہ خود ان کی اپنی وضاحت کے پیش نظر آنحضرتؐ کا آسمان کی طرف پرواز کرنا آپؐ کی حقانیت کی نشانی نہیں تھا کیونک ان کا آٹھواں مطالبہ یہ بھی ان کے خیال میں پورا ہونا لازمی تھا اور ہو یہ کہ آسمان سے لوٹتے وقت ایک ایسی کتاب اپنے ہمراہ لائیں جس میں آپؐ کی رسالت کے متعلق تحریر ہو۔

اس قسم کے شدید شرائط اس بات کی علامت تھیں کہ مطالبہ کرنے والے حقیقت کی تلاش اور اس کو قبول کرنے والے نہ تھے، یعنی اگر بفرض محال آنحضرتؐ بحکم خدا یہ کام کر بھی دیتے پھر بھی یہ لوگ مختلف بہانے کر کے آپؐ کی رسالت کو کسی طرح قبول نہ کرتے بلکہ اپنے شرک پر قائم رہتے۔

عقلی اعتبار سے جو چیز آنحضرتؐ کے لیے لازم تھی وہ یہ تھی کہ حقیقت کے متلاشی عاقل لوگوں کے سامنے آپ اپنی صداقت وحقانیت کے کافی دلائل پیش فرماتے جو ایسے دلائل ہوتے کہ ان کے لیے کافی ہوتے ہوتے ہوئے انہیں مکتب ایمان کی جانب گامزن کر دیتے۔ کسی پیغمبر کے لیے ہرگز ضروری نہیں کہ مختلف لوگوں کے مختلف مطالبات قبول کرتے ہوئے اپنے عظیم کار رسالت کو چھوڑ کر انہیں ہر روز نیا معجزہ دکھلاتا رہے اور اس طرح ارشاد وہدایت کے کام کو چھوڑ کر لوگوں کی تفریح ودلچسپی کے سامان مہیا کرتا رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کی نبوت کہانت وریاضت سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

مختصر یہ کہ بعض کوتاہ نظروں کے ادعا کے برخلاف، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی معجزہ دکھانے کے سلسلہ میں اپنی کمزوری کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ قرآن مجید کے جملہ "قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" (اسراء۔ ۹۳) دو مطالب سامنے آتے ہیں:

۱)۔ "سُبْحَانَ رَبِّيْ" "پاک ومنزہ ہے تیرا پرورگار"۔ اس جملہ سے اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کے عجز وناتوانی اور رویت ومشاہدہ سے بلند قرار دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کے ممکن کام پر قادر تسلیم کیا گیا ہے۔

۲)۔ "هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا: میں پیغام لانے والے بشر سے زیادہ نہیں ہوں"۔ اس جملہ سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ میں تو اللہ کی جانب سے صرف مامور ہوں اور اس کے فرمان کی اطاعت کرتا ہوں۔ وہ (اللہ تعالیٰ) جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔ جب تک کسی کام کی انجام دہی میں اس کا ارادہ شامل نہ ہو کوئی کام نہیں کرتا۔

بالفاظ دیگر آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرنے کے بعد دو الفاظ (بشر ورسول) کا سہارا لیتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان خارق العادۃ کاموں کی مجھ سے انجام دہی چاہتے ہو تو جان لو کہ بحیثیت ایک بشر میں محدود قوت کا مالک ہوں اور اس طرح کے کاموں کی انجام دہی میری قوت بشری سے باہر ہے۔ علاوہ ازیں اگر ان کا مجھ سے بجالانا اس لیے چاہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول اور اس کا پیغام لانے والا ہوں تو اس صورت میں بھی میری حیثیت ایک مامور سے زیادہ نہیں، میں اس کی اطاعت کرتا ہوں اور جب تک اس کا اذن صادر

نہ ہو کوئی کام نہیں کرتا۔

قرآن مجید کی آیات مظہر ہیں کہ اس قماش کے لوگ نہ تو تحقیق کے درپے تھے اور نہ ہی ان میں ایمان لانے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ لہٰذا اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب مطالبات، بلکہ ان سے بھی بڑے مطالبات کو، عملی جامہ پہنا دیتے، پھر بھی وہ لوگ اپنے کفر و شرک پر سختی سے قائم رہتے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۤئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اگر ہم ان پر فرشتے نازل کر دیتے، مردے ان سے باتیں کرنے لگے اور تمام چیزیں ان کے لیے جمع کر دیتے (ہم ان کی تمام خواہشات پوری کر دیتے) پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ خداوند عالم ایسا چاہتا (اور قہر و غلبہ کے ساتھ انہیں ایمان کی طرف لے جاتا تو اس صورت میں ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی) اور ان میں اکثر جاہل اور بے وقوف ہیں''۔ (انعام۔۱۱۱)

ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ

''اگر قرآن کریم پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ دے، زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور مردوں کو زندہ کر دے، پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔ (رعد۔۳۱)

آخر میں ہم قارئین کی توجہ کو ایک نکتہ کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ آیہ مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ نفس نبی ہی معجزہ کا فاعل اور اس کا پیش کرنے والا ہے لیکن اس قدرت کے بروئے کار لانے کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے محتاج ہوتا ہے کیونکہ خداوند عالم کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا۔ یہ اصول ہر زمانہ میں اور تمام انبیاء کے بارے میں کارفرما رہا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

''اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی پیغمبر اذن خداوند تعالیٰ کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے''۔ (رعد۔۳۸)

اس وضاحت سے بہت سی آیات شریفہ کے معنی جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، سمجھ میں آجاتی ہیں۔ یہ ایسی آیات ہیں جو کئی منکرین اعجاز کے لیے سند قرار پاتی ہیں۔ جنہوں نے کہنا چاہا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی معجزہ سوائے قرآن مجید کے نہیں رکھتے تھے۔

ہم نے اس طرح کی آیات مبارکہ کے بارے میں اپنی کتاب ''راز بزرگ رسالت'' کے صفحات ۴۱۵ تا ۴۸۵ پر گفتگو کی ہے جو حضرات ان تمام آیات اور ان کے مقاصد سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کتاب کے انیسویں اور بیسویں باب کا مطالعہ فرمائیں۔

(۳)۔ آزار اور مخالفتیں

معاشرہ کے مصلحین اور غیر اندیش لوگوں کو تکلیف و اذیت پہنچانا ہمیشہ سے انحطاط پذیر معاشروں کا دستور رہا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اس کیفیت سے ہرگز مستثنیٰ نہیں۔ آنحضرتؐ اپنے تمام عرصہ تبلیغ میں خصوصاً بعثت سے ہجرت کے زمانہ کے دوران دور جاہلیت کے لوگوں کی طرف سے تکالیف اور کج فکر اشخاص کی جانب سے ہر قسم کی رکاوٹوں کے لیے تختۂ مشق بنے رہے۔ قرآن مجید آنحضرتؐ اور آپ کے اصحاب باوفا کو پہنچائے جانے والی مصیبتوں کا خصوصیت سے الگ الگ ذکر تو نہیں فرماتا لیکن اصولی طور پر ان کی نشاندہی کرتا ہے جس سے ان کے مصائب کی رفتار و معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید آنحضرتؐ کی تسلی و تشفی کی خاطر انبیائے سابقین کی مشکلات اور ان کی بردباری کا ذکر فرماتا ہے اور آنحضرتؐ کو جاہلوں کی طرف سے پہنچائے جانے والے مصائب میں صبر و شکیبائی کی نصیحت فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳۴

''آپ سے پہلے انبیاء کی بھی تکذیب کی گئی۔ انہوں نے (اپنی قوم کی) تکذیب واذیت پر صبر کیا۔ خداوند تعالیٰ کے کلمات تبدیل نہیں ہوتے، انبیاء و مرسلین کی خبریں آپ تک پہنچ چکی ہیں''۔ (انعام۔ ۳۴)

ایک اور آیہ مبارکہ میں انبیائے اولوالعزم کے صبر و حوصلہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اور آنحضرتؐ کو نصیحت کی گئی ہے کہ ان کی طرح مصائب و آلام پر صبر کریں۔ جیسا فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ

''آپ بھی انبیائے اولوالعزم کی طرح صبر کریں اور ان لوگوں کے لیے جلدی نہ کریں''۔ (احقاف۔ ۳۵)

تیسری آیہ مجیدہ میں پروردگار عالم ایک بار پھر آنحضرتؐ کو صبر کی نصیحت فرماتا ہے اور اشارتاً ہدایت کرتا ہے کہ مصائب و آلام پہنچانے والوں کی باز پرس کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۱۰۹

''اور جو وحی آپ کی طرف ہوتی ہے اس کی پیروی کریں اور صبر سے کام لیں حتیٰ کہ خداوند عالم فیصلہ فرمائے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔(یونس۔۱۰۹)

مختصر یہ کہ پروردگار عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اٹھارہ موقع پر صبر کی تلقین فرماتا ہے کبھی ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

''اور صبر کریں اور آپ کا صبر تو صرف اللہ کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے غم نہ کریں''۔(نحل۔۱۲۷)

پر ایک اور موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان تھوڑے سے مومنین سمیت جو آنحضرت کے ہمراہ تھے، دعوت صبر دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ

''اور آپ ان لوگوں کے ہمراہ، جو روز و شب اپنے اللہ کو پکارتے ہیں، صبر کریں''۔(کہف۔۲۸)

تیسری بار پھر نصیحت فرماتا ہے مبادا کہ آپ کے صبر کا جام لبریز ہو جائے اور حضرت یونس کی طرح بیتاب ہو جائیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ

''اپنے پروردگار کے حکم پر صبر کریں اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جائیں''۔(قلم۔۴۸)

چوتھی بار پھر حکم دیتا ہے کہ صابر رہیں اور جاہلوں کو چھوڑ دیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰

''ان کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورتی سے انہیں چھوڑ دیں''۔(مزمل۔۱۰)

ان تمام آیاتِ شریفہ سے مشرکین کی طرف سے مصائب وآلام اور ان کے زخم ہائے زبان کا اندازہ ہو جاتا ہے کتب حدیث وسیرت و تاریخ ان تمام مصائب کو جو آنحضرتؐ اور ان کے اصحاب کو پہنچائے گئے، تفصیل سے بیان کرتی ہے، قارئین سے التماس ہے کہ ان کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔

معراج پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
(مسجد الحرام سے سدرۃ المنتہیٰ تک)

انبیائے کرام اور خلا میں سفر

اللہ تعالیٰ کے انبیائے علیہم السلام وہ پہلے انسان ہیں، جنہوں نے دروازہ ہائے آسمان نوع بشر کے لیے کھولے اور عملی طور پر ثابت کیا کہ خلا میں سفر، یعنی دور حاضر کی اصطلاح میں تسخیر خلا (صرف اس کا ایک حصہ) بالکل ممکن ہے۔

اس سے پیشتر کہ روس کا خلانورد ''گاگرین'' یا امریکی خلانورد ''آرمسٹرانگ'' آسمان کی طرف روانہ کیا جاتا، اول الذکر خلا کے کچھ حصہ کا سفر کرتا اور موٴخر الذکر چاند کی سطح پر قدم رکھتا، انبیائے خدا نے جہان بالا کے کسی مقامات کی جانب سفر کیا ہے، جن کا تصور بھی اس زمانہ کا انسان نہیں کرسکتا تھا۔ قرآن مجید بڑی وضاحت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کے ہوا کے ذریعے سفر کرنے کا ذکر فرماتا ہے۔ نیز یہ کہ شدید اور طوفانی ہوائیں حضرت سلیمان کے زیر فرمان تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

''اور ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے مسخر کردیا، ہوا ان کے حکم سے اس سرزمین میں، جس کو ہم نے بابرکت قرار دیا ہے، چلتی تھی اور ہم ہر چیز سے آگاہ ہیں''۔ (انبیاء۔۸۱)

اس آیہ مبارکہ میں تند و تیز طوفانی ہواؤں کی تسخیر اور ان کے ذریعے سلیمان علیہ السلام کے اس سرزمین میں سفر، جسے خداوند عالم نے برکت سے نوازا تھا (شامات) کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ نرم و خوشگوار ہوا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ و اختیار میں تھی اور جس سمت اور مقام کی طرف آپ ارادہ فرماتے تھے، ہوا اسی سمت میں چلتی تھی، جیسا کہ فرماتا ہے:

۲) فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

''ہم نے ہوا کو اس (حضرت سلیمان علیہ السلام) کے اختیار میں قرار دیا، جو نرمی اور آہستگی سے جس طرف وہ چاہتے، حرکت کرتی تھی''۔ (ص، ۳۶)

ان دونوں آیات مکرمہ میں ہوا کے علاقہ اور کیفیت کے لحاظ سے ہرگز کوئی تضاد نہیں پایا جاتا کیونکہ دونوں میں مذکور مطالب کے

مطابق ہوا کی دونوں اقسام حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار میں تھیں، پہلی آیہ مبارکہ میں ہوائے تند و تیز کا ذکر حضرت سلیمان کے ایک فرد اہم ہونے کی حیثیت سے تھا۔علی ہذا القیاس اس خصوصیت کے ساتھ علاقہ ہائے شام کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ علاقہ جات حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیرنگین شمار ہوتے تھے۔

تیسری آیت میں خداوند عالم ہوا کی سرعت رفتار کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

۳)وَلِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ غُدُوُّهَا شَهۡرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهۡرٌ ۚ

''اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جس کی نصف دن کی مسافت ایک ماہ کی مسافت کے برابر تھی اور دوسرے نصف دن کی مسافت بھی اسی قدر (ایک ماہ کے برابر) تھی''۔(سبا۔ ۱۲)

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے دوش پر ایک دن میں اتنا سفر طے کرتے تھے جتنا اس زمانہ کے وسائل سفر کے ذریعے دو ماہ میں طے ہوتا تھا۔یعنی اگر اس زمانہ کے وسائل نقل و حمل کی مدد سے ایک دن میں آٹھ فرسخ سفر ممکن تھا اور اس طرح دو ماہ میں ۴۸۰ فرسخ (۶۰×۸=۴۸۰) سفر ہوسکتا تھا،تو حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی مدد سے یہی سفر ایک ہی دن میں طے کر لیتے تھے۔

بعض قبل از وقت فیصلہ کر لینے افراد جو انبیاء علیہم السلام کے معجزات و کرامات کے قائل نہیں،ان آیات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر ہوا کو زراعت،کھیتی باڑی،شہروں کی آبادی اور کشتی کی روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ یہ اس لیے کہتے ہیں کہ سرزمین شام زرعی علاقہ جات پر مشتمل ہے اور اس کا زیادہ علاقہ بحیرۂ روم کے کنارے پر واقع ہے۔اس قسم کی تفسیریں او رتشریحات مغرب زدہ لوگوں کی اعجاز و کرامت کے بارے میں بداعتقادی کے مظہر ہیں جو قطعی طور پر تفسیر بالرائے کے علاوہ اور کچھ نہیں ،اس کے دلائل اس طرح ہیں:

اولاً یہ کہ اگر اس سے کھیتی باری اور کشتی رانی میں مہارت مراد لی جائے تو اس کام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں کیونکہ ان کاموں میں سب لوگ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

ثانیاً اس صورت میں ''بِاَمۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ'' کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں گے کیونکہ ان تمام معاملات میں ہوا کی حرکت بالکل طبیعی ہے جو ایک فطرت الٰہی کے مطابق چلتی ہے۔خواہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے حکم ملے یا نہ ملے۔

ثالثاً سورۂ سباء میں ہوا کی رفتار کا تعین فرمایا گیا ہے نہ کہ کشتی کی رفتار کا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیات شریفہ ہوا کے ذریعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سفر کرنے کا ذکر کرتی ہیں۔باقی رہے اس قصہ کے دیگر پہلو یعنی یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یا آپ کے ساتھی کسی چیز پر بیٹھتے تھے یا اپنے آپ کو سردی وگرمی اور تندی ہوا سے محفوظ رکھتے تھے ۔ان سب باتوں کا ان آیات میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ان مراحل کو صرف اعجاز اور قوانین طبیعی پر غلبہ سمجھ کر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

عروجِ مسیح علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام ہی صرف وہ شخصیت نہ تھے جنہوں نے نوع بشر پر فضائی راستے کشادہ فرمائے بلکہ ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تصریح قرآن کے مطابق بنی اسرائیل کے ظالمین کے درمیان، جوان کی جان لینے کا مقصد رکھتے تھے۔ عالم بالا کی طرف اٹھا لیے گئے، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے:

وَّقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۞

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ انہوں نے انہیں قتل نہیں کیا اور نہ ہی انہیں سولی پر چڑھایا، بلکہ یہ معاملہ ان پر مشتبہ ہوگیا، جن لوگوں نے قتل مسیح کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے، وہ اپنے ظن وگمان کی پیروی کرتے ہیں جب کہ انہوں نے یقیناً ان کو (مسیح کو) قتل نہیں کیا''۔ (نساء۔ ۱۵۷)

بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۞

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا اور خداوند عالم توانا حکیم ہے''۔ (نساء۔ ۱۵۸)

ایک اور آیہ مبارکہ میں فرماتا ہے:

اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ

''اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ سے فرمایا تجھے پکڑلوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا''۔ (آل عمران۔ ۵۵)

یہاں ''توفی'' کا لفظ ''اخذ'' اور پکڑنے کے معنی میں ہے۔ جب یہ موت یا مرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کی صورت میں انسان کی روح گرفت میں لے لی جاتی ہے۔ یعنی قبض کر لی جاتی ہے، اور اس کا بے جان جسم سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔ موت اور مرنا دراصل لفظ ''توفی'' یا ''وفی'' میں پوشیدہ نہیں ہے، لہٰذا یہ الفاظ کبھی کبھی نیند کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ بِالَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ

''وہ وہی ہے جو تمہیں رات (نیند) کے وقت لے لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے آگاہ ہے''۔(انعام۔٦٠)

لہٰذا لفظ ''توفی'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت گواہی نہی دیتا بلکہ اس سے زیادہ نہیں بتلاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کی سازش سے نجات مرحمت فرمائی، آپ کو یہودیوں سے چھین لیا اور اپنی طرف اٹھالیا۔

دراصل لفظ ''رفع'' اگر دو مقامات پر ترفیع معنوی یعنی بلند ہونے کو ظاہر کرتا ہے تو یہ لفظ رفع حسی پر بھی شاہد ہے، جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کرۂ خاکی سے عالم بالا کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے عالم بالا میں ایک مقام کا انتخاب فرمایا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کی حقیقت آپ کے مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے سدرۃ المنتھیٰ تک سفر کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں، آیات قرآن مجید کے مطالعہ اور ان میں غور کرنے سے ذیل کے حقائق واضح ہوجاتے ہیں:

(ا)۔اس سفر ملکوتی کی مسافت کا اندازہ؛

(ب)۔اس سفر کا زمانہ اور اس کی حدود؛

(ج)۔کیفیت معراج، کیا معراج صرف روحانی تھی یا روحانی وجسمانی دونوں طرح تھی؛

(د)۔اس سفر کا ہدف ومقصد کیا تھا؛

(ھ)۔اس سفر ملکوتی میں آنحضرتؐ نے کون کون سی چیزوں کا مشاہدہ فرمایا؛

ان تمام مسائل کے جوابات آیات مجیدہ کے متون وترجمہ کے مطالعہ سے واضح ہوجاتے ہیں۔سورۂ اسراء کی بالکل پہلی آیت معراج رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ①

''پاک ومنزہ ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک، جن کی اطراف کو ہم نے برکت عطا فرمائی ہے لے گئی، تاکہ اس (بندہ) کو اپنی آیات دکھلائے وہ یقینا سننے والا بینا ہے''۔(اسراء۔١)

سورۂ نجم میں بھی آیہ ہائے ۵ تا ۱۸ کا ایک حصہ اس سفر معنوی والٰہی سے متعلق ہے جبکہ دوسرا حصہ آغاز بعثت میں نزول وحی کے واقعہ کا ذکر فرماتا ہے۔اس بات کی وضاحت کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش سے فرمایا کہ میں نے فرشتہ کو وحی لانے کے وقت اس کی اصل شکل میں

دیکھا ہے، تو قریش آپ سے مناقشہ پر تیار ہو گئے۔ قرآن مجید ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ یہ پہلی اور آخری بار نہیں کہ آنحضرتؐ نے جبرئیل کو دیکھا ہو، بلکہ آپ نے اسے ایک مرتبہ سدرۃ المنتھیٰ کے قریب بھی دیکھا ہے۔ اس طرح قرآن اس آیہ شریفہ میں دو واقعات کو نقل فرماتا ہے، ایک نزول وحی کے وقت فرشتہ کو دیکھنا اور دوسرے واقعہ معراج میں:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

''ایک طاقتور مخلوق (فرشتہ وحی) نے اسے تعلیم دی ہے وہ طاقتور معلم (نزول وحی کے وقت) افق بلند پر کھڑا ہوا اور اس (رسول اکرمؐ) کے لیے ظاہر ہوا، پھر قریب ہوا، اور زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوا، اور اس قدر قریب ہوا کہ دو تیروں یا کمان کے دوسروں بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، اس معلم نے اللہ کے بندہ کو جو وحی کرنا چاہیے تھی وحی فرمائی، لیکن جو کچھ اس نے دیکھا، اس کے دل نے تکذیب نہ کی، کیا تم اس معاملہ میں کہ جو کچھ اس نے دیکھا (جبرئیل) تم اس سے مناقشہ کے لیے اٹھ کھڑے ہو؟ اس (رسول اکرمؐ) اس کو ایک بار پھر بھی دیکھا، سدرۃ المنتھیٰ کے نزدیک جس کے پاس جنت الماویٰ ہے، جب سدرۃ المنتھیٰ کو ڈھانپ لیا، جس چیز نے ڈھانپ لیا، نگاہ منحرف نہ ہوئی (قوانین رویت سے) انحراف نہ کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کی بعض بزرگ آیات کو دیکھا''۔ (نجم۔۵ تا ۱۸)

متذکرہ بالا آیات جو دو مختلف حصوں میں نقل ہوئی ہیں اور مختلف واقعات کی جانب اشارہ کرتی ہیں ان دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں مرتبہ جبرئیل امین کو دیکھا۔

پہلے واقعہ کا تعلق نزول وحی کی ابتداء سے ہے جس میں آنحضرتؐ نے جبرئیل امین کو افق بالا میں کھڑا ہوا ملاحظہ فرمایا اور آنحضرتؐ نے نہ صرف اس فرشتہ کو ''سدرۃ المنتھیٰ'' کے قریب دیکھا بلکہ اپنے پروردگار کی آیات بزرگ کا بھی مشاہدہ فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝'' (نجم۔۱۸) آیات مبارکہ کا یہ حصہ کرۂ خاکی میں آنحضرتؐ کے سفر سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ اس دلیل سے کہ آنحضرتؐ نے جبرئیل کو سدرۃ المنتھیٰ کے قریب دیکھا اور سدرۃ المنتھیٰ کے قریب جنت الماویٰ واقع ہے، واقعی طور پر یہ آیات مجیدہ کرۂ خاکی سے باہر کے مقامات کا ذکر کرتی ہے۔

۱)۔مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کے اپنے سفر میں جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیت ''لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا'' میں ارشاد ہوتا ہے؛اور
۲)۔مسجد الاقصیٰ سے سدرۃ المنتھیٰ تک کہ اپنے سفر میں جہاں آپ نے اللہ تعالیٰ کی آیات عظیم کو دیکھا۔

اس واقعہ میں خصوصیت کے ساتھ جو بات توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید ان آیات خداوندی کو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک دیکھیں لفظ آیات سے یاد کرتا ہے جب کہ ان آیات الٰہی کا جو آنحضرتؐ نے اس پورے سفر میں مشاہدہ فرمائیں لفظ ''کبریٰ'' سے تعارف کرواتا ہے۔یہ فرق اس امر پر شاہد ہے کہ یہ دونوں قسم کی آیات ایک دوسری سے مختلف ہیں،یعنی وہ جو آنحضرتؐ نے پہلے سلسلہ میں اس کرۂ خاکی سے ماوریٰ عالم میں مشاہدہ فرمائیں،البتہ ان آیات قرآنی سے اس قسم کی کوئی بات واضح نہیں ہوتی کہ دوسرا سفر پہلے سفر کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا ہو یعنی سفر کے دونوں حصے ایک ہی موقعہ پر آگے پیچھے ظہور پذیر ہوئے ہوں پس ممکن ہے کہ دونوں سفر الگ الگ دو موقعوں پر کیے گئے ہوں،تاہم اگر صورت یہ ہو کہ آنحضرتؐ کو معراج جسمانی اور روحانی ایک مرتبہ سے زیادہ حاصل نہیں ہوا تو لازماً ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں ایک سفر دوسرے کے آگے پیچھے یعنی بیک وقت ہی سرانجام پائے اور یہ دونوں سفر ایک ہی شب میں واقع ہوئے۔[1]

ان وضاحتوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے متذکرہ بالا پانچ سوالات جوابات کو خود انہی آیات مبارکہ سے نکالا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ:

(ا)۔اس سفر آفاقی کی مسافت مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک اور وہاں سے سدرۃ المنتھیٰ تک ہے جس کے قریب ہی ''جَنَّةُ الْمَأْوٰى'' واقع ہے۔

(ب)۔اس سفر کا زمانہ،لفظ ''اَسْرٰی'' کے مطابق جو رات کے سفر کے لیے استعمال ہوتا ہے،صرف ایک رات ہی تھی لیکن یہ سفر رات کے کتنے حصہ میں مکمل ہوا،اس بارے میں آیات قرآن مجید ساکت ہیں۔

(ج)۔کیا یہ معراج رسول اکرمؐ اپنے تمام مراحل جسمانی اور روحانی یکجا تھا؟ کیفیت معراج رسول اکرمؐ کے بارے میں چار نظریات پائے جاتے ہیں:

۱)۔معراج پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تمام مراحل میں روحانی تھا یعنی آنحضرت نے روح کو جسم سے علیحدہ فرما کر یہ تمام عوالم طے فرمائے۔

۲)۔معراج پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانی تو تھا لیکن بصورت تجرد بدن نہ تھا بلکہ معراج بصورت خواب رونما ہوا تھا اور ان تمام عوالم کو آنحضرتؐ نے خواب کی صورت میں طے فرمایا؟

---

[1] پیغمبر اکرمؐ کے تعداد معراج آسمانی کے بارے میں مختلف روایت میں۔ایک روایت میں جو ابو بصیر نے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے،دوبار معراج کا واقع ہونا بتایا گیا ہے جب کہ بعض روایت میں اس سے زیادہ مرتبہ ذکر ہوا ہے۔اس کیلئے بحار الانوار ،ج ۱۸،ص ۳۰۲ اور سفینۃ البحار،ج ۲،ص ۱۷۴،مادہ ''عرج'' کی طرف رجوع فرمائیں لیکن آنحضرت کا معراج روحانی یقیناً کئی مرتبہ واقع ہوا ہے اس سلسلہ میں وسائل الشیعہ،ج ۷(باب تحریم صوم الوصال)ج ۴ ملاحظہ فرمائیں۔

۳)۔آنحضرت کا مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کا سفر جسمانی اور روحانی کیفیات کے ساتھ تھا اور وہاں سے آگے روحانی تھا، یہ نظریہ ابن شہر آشوب نے اختیار کیا ہے اور پھر اس کی نسبت علمائے امامیہ کی طرف دی ہے۔

۴)۔آنحضرت کا سفر تمام مراحل میں جسمانی اور روحانی تھا اور آپ ہر مقام پر جسم و روح دونوں کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

شیعہ علماء صرف اس چوتھے نظریہ کو قبول کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل قرائن اس نظریہ کی صحت پر شاہد ہیں:

(ا)۔آیہ مبارکہ میں لفظ ''عبد'' سے مراد بالکل وہی خارجی شخصیت ہے جو جسم و روح سے مرکب ہے اور قرآن مجید یہ لفظ خارجی کی کیفیت ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔مثلاً

۱)اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝

''کیا آپ نے دیکھا ہے اس شخص کو جو منع کرتا ہے بندہ کو جب وہ نماز پڑھے''۔(علق۔۹۔۱۰)

۲)وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ

''جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا تا کہ اس کو پکارے''۔(جن۔۱۹)

اسی طرح دیگر آیات ہیں۔البتہ صرف ایک آیت میں لفظ ''عبد'' وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں یہ لفظ مادہ اور جسم کے موجودات مجرد یعنی الگ الگ حصوں کے لیے بھی آیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''تمام لوگ آسمان و زمین میں موجود ہیں، بندہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہیں''۔(مریم۔۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بندگی صرف انسان خاکی ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ فرشتے اور جنات بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔اس آیہ کریمہ میں لفظ ''عبدًا'' کا وسیع معنی میں استعمال اس قرینہ کی بناء پر ہے جو آیت کی ابتداء میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ موضوع سخن کو عام صورت میں پیش کیا جائے، پس فرماتا ہے:

''اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یعنی ''کوئی موجود زندہ و عاقل آسمانوں اور زمین میں (ایسا) نہیں ہے''۔اگر یہ صورت نہ ہوتی تو لفظ ''عبدًا'' کا اطلاق ہرگز فرشتگان و جنات پر نہ ہوتا۔

(ب)۔سورۂ نجم میں شہود قلب اور رویت نگاہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

''مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى''

یعنی ''جس چیز کو آنکھ نے دیکھا، دل نے اس کی تکذیب نہ کی''۔[1]

---

[1] ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جملہ ما کذب الفؤاد ما راٰی سے مراد یہ ہے کہ ''لم یکذفواد محمد ما راٰہ بعینہ'' یعنی قلب محمدؐ نے اس چیز کی تکذیب نہ کی جس کو آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔

(ج)۔"مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی"

یعنی"آنکھ نے کوئی خطا نہ کی اور نہ ہی طغیان کیا"۔

ان تینوں آیات کریمہ پر تمام علمائے اسلام، ماسوائے معدودے چند جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کا یہ سفر ملکوتی اسی جسم عنصری کے ساتھ انجام پایا اور اس کے آغاز و انجام میں کسی طرح کا کوئی تفاوت واقع نہیں ہوا۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو کچھ کتاب"شرح مقاصد"[۱] میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معراج قطعی طور پر روحانی تھا، یا امیر معاویہ کی روایت کہ معراج رسول عالم خواب میں ہوا۔ سب کچھ متذکرہ آیات مبارکہ کے ظواہر کے خلاف ہے اور یہ عملی اقدار سے خالی ہے۔

ابن شہر آشوب اپنی کتاب مناقب میں رقمطراز ہیں کہ خوارج بنیادی طور پر معراج ہی سے انکار کرتے ہیں فرقہ جہمیہ کے لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا معراج روحانی تھا اور وہ بھی بصورت خواب، امامیہ، زیدیہ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ صرف مسجد الاقصیٰ تک معراج جسمانی اور روحانی تھا جب کہ ایک چوتھا گروہ کہتا کہ معراج کے تمام مراحل روحانی و جسمانی تھے اور آنحضرتؐ اپنے جسم و روح کے ساتھ مسجد الاقصیٰ سے عالم بالا کی جانب تشریف لے گئے تھے۔[۲]

ابن شہر آشوب پر تعجب ہے کہ وہ معراج سے متعلق ایسی تمام تفاصیل کو کس طرح فرقہ امامیہ سے منسوب کرتے ہیں درآنحالیکہ ان کے درمیان مشہور ہے کہ معراج کا تمام سفر ایک ہی انداز میں طے پایا۔

(د)۔سفر معراج کا مقصد و ہدف عالم ہستی اور عظمت پروردگار کی نشانیوں کا مشاہدہ تھا، یہ ہدف اور مقصد آیات متذکرہ میں بیان ہو چکا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

"لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيَاتِنَا"(اسراء۔۱) نیز ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ (نجم۔۱۸)

احادیث اسلامی میں معراج رسول کی ایک حد تک تشریح بیان کی گئی ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام علت معراج کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"اَنَّ اللّٰهَ لَا يُوْصَفُ بِمَكَانٍ وَّلَا يَجْرِيْ عَلَيْهِ زَمَانٌ وَلٰكِنَّهٗ عَزَّوَجَلَّ اَرَادَ اَنْ يُّشَرِّفَ بِهٖ مَلَآئِكَتَهٗ وَسُكَّانَ سَمَاوَاتِهٖ وَيُكَرِّمَهُمْ بِمُشَاهِدَوَيُرِيَهٗ مِنْ عَجَآ

---

[۱] شرح مقاصد، ج ۲، ص ۱۹۲۔ ۱۹۳ طبع اسلامبول

[۲] مناقب، ج ۱، ص ۱۳۵

ئِبِ عَظَمَتِہٖ مَا یُخْبَرُ بَعْدَ هُبُوْطِہٖ"[1]

''خداوند تعالیٰ ہرگز کوئی (خاص) مکان نہیں رکھتا، نہ ہی زمانہ اس پر حاکم ہے (وہ مکان و زمان کی قیود سے منزہ ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ملائکہ اور آسمان کے رہنے والوں کو آنحضرتؐ کے آسمان پر درود سے عزت و شرف بخشے، آنحضرتؐ کی زیارت سے انہیں محترم و مکرم قرار دے اور اپنی عظمت کے عجائبات کا آنحضرتؐ کو مشاہدہ کرائے تاکہ زمین پر واپس آکر آنحضرت ﷺ لوگوں کو ان عجائبات قدرت الٰہی سے آگاہ فرمائیں''۔

حضرت رسول کرم ﷺ نے اپنے معراج میں عظمت خداوند عالم کی آیات کا مشاہدہ فرمایا، لیکن تمام آیات کا نہیں بلکہ ''لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا'' میں لفظ ''مِنْ'' کی رعایت سے آیات خداوند تعالیٰ کے ایک حصہ کا مشاہدہ فرمایا۔

چند اہم نکات

یہاں ہمارے لیے چند اہم نکات کا ذکر کرنا لازم و ناگزیر ہے۔

۱)۔ سورۂ مبارکہ اسراء میں مسئلہ معراج کی ابتدائ ''سبحان الذی'' کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ خداوند عالم ہر نقص و عیب اور عجز و ناتوانی سے منزہ ہے۔ چونکہ مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کا سفر اس زمانہ کے حالات سفر کے پیش نظر صرف ایک رات ہی ممکن نہ تھا اس کے لیے کئی دنوں اور ہفتوں کی ضرورت تھی، اس لیے خداوند عالم نے اس قصہ کی ابتداء ہی لفظ ''سُبْحَانَ'' سے فرمائی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ اس سفر کے تحقق کے بارے میں ہر قسم کے پندار باطل کی نفی فرماتے ہوئے شک و تردید کے امراض کا پہلے سے ہی علاج فرمادے۔

۲)۔ لفظ ''اسری'' اگرچہ اس سفر آفاقی کے عرصہ وقت کو بیان کرتا ہے اور یہ کہ یہ سفر تمام کا تمام رات کو انجام پایا، تاہم لفظ ''لَيْلًا'' تاکید کے طور پر وارد ہورہا ہے تاکہ وقت کے بارے میں ہر قسم کے شک و ابہام کو ختم کردے، عربی زبان میں اس قسم کی تاکید اکثر پائی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ:

''سری لیلی و بث کیبا''، یعنی میری رات ختم ہوئی اور میں نے غم و اندوہ کے عالم میں رات ختم کی''۔

۳)۔ آیہ اسراء اور سورۂ نجم کی آیت میں لفظ ''عبدہ'' افتخار کے طور پر آیا ہے کیونکہ انسان کا کوئی مقام اس سے بلند تر نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی اور صادق ''بندہ'' ہو۔ حدیث میں وارد ہے کہ امام چہارم اور امام پنجم علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

"اِلٰهِيْ كَفَانِيْ فَخْرًا اَنْ تَكُوْنَ لِيْ رَبًّا وَّ كَفَانِيْ عِزًّا اَنْ اَكُوْنَ لَكَ عَبْدًا اَنْتَ

---

[1] تفسیر برہان، ج ۲، ص ۴۰۰

كَمَآ اُرِيْدُ فَاجْعَلْنِىْ كَمَا تُرِيْدُ"۔ [1]

''میرے لیے اعزاز وافتخار کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے اور میرے لیے یہ عزت کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں، تو ایسا ہی (خالق) ہے جیسا میں چاہتا ہوں، پس مجھے بھی ویسا ہی (بندہ) بنا دے جیسا کہ تو چاہتا ہے''۔

مشکل یہ ہے کہ مارکس اوراس کے ہم خیال لوگ پروردگار عالم کے مقابلہ میں انسان کے مقام عبودیت کو سمجھ نہیں پائے اور اس مقام کو ایک قسم کی اپنے نفس سے بیگانگی جانتے رہے۔ہم نے اس کتاب کی تیسری جلد میں اس بات کی وضاحت، روشن اور سیر حاصل تنقید کی ہے۔ [2]

۴)۔سورۂ اسراء کی آیہ مبارکہ کے آخر میں ''اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'' کے الفاظ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ نوازش (بندہ ہونا) مکمل طور پر اپنے مقام پر صحیح اور مناسب تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے گفتار و کردار سے واقفیت کی بناء پر آنحضرتؐ کو اس قدر مقام افتخار سے سرفراز فرمایا تھا، گویا لفظ سمیع آپ کی گفتار اور بصیر آپ کے کردار کی شہادت کے لیے عین مطابقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۵)۔بعض مغربی مؤلفین چند ایک مفسرین کی پیروی کرتے ہوئے جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر قلم اٹھایا ہے، سورۂ نجم میں وارد شدہ آیات میں موجود ضمائر کی تفسیر اور ان کے محل تطبیق کے بارے میں اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں انہوں نے اس سے رویت باری تعالیٰ مراد لی ہے حالانکہ دونوں مواقع عروج میں محور بحث جبرئیل امین کی ذات ہے۔اس تصور سے آیات مبارکہ میں غور دقیق کا فقدان ظاہر ہوتا ہے اور ان کے مطالب میں سطحی تفسیر کی گئی ہے، ہم اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ایک بار پھر کسی حد تک ان آیات شریفہ کی وضاحت کرتے ہیں جو اس طرح ہے:

''عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى'' یعنی ان کو (آنحضرتؐ) کو ایک طاقتور ہستی (جبرئیل امین) نے تعلیم دی''۔

''ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى'' یعنی یہ معلم عقل وخرد کا حامل ہے (وہ نزول وحی کے وقت) آسمان میں کھڑا ہوا تھا''۔

''وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى'' یعنی اس وقت جبکہ وہ معلم افق اعلیٰ پر قرار رکھتا تھا''۔

''ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى'' یعنی پھر وہ معلم آنحضرتؐ کے نزدیک ہوا اور آسمان میں معلق ہو گیا''۔

''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' یعنی وہ معلم آنحضرتؐ کے اس قدر قریب ہو گیا کہ اس کا فاصلہ آنحضرتؐ سے صرف دو کمانوں کے بارے رہ گیا (یا اس سے بھی کم)''۔

''فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى'' یعنی اس معلم نے اللہ تعالیٰ کے عبد (پیغمبر اکرمؐ) کی طرف وحی کی جو بھی وحی کرنا تھی''۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ سوائے دو ضمیروں (علمه،عبده'' کے جن میں پہلی پیغمبر اکرمؐ کی طرف اور دوسری اللہ تعالیٰ کی طرف

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید۔۲۰،ص ۲۵۵

[2] دائمی منشور، ج ۳،ص ۲۵۸ تا ۲۶۸

راجع ہے، دیگر تمام ضمائر کا مرجع وہی ''معلم قوی'' ہے جس نے آنحضرتؐ کو تعلیم دی اور آپ کی طرف وحی لایا، یہ احتمال کہ اس جملہ کی ضمیریں خصوصیت کے ساتھ خداوند تعالیٰ کی جانب لوٹتی ہیں اور جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندہ کو وحی فرمائی، جو کچھ بھی وحی فرمائی۔ اس بات کی دلیل نہیں کہ دوسری ضمیریں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کر رہی ہیں۔

ان مطالب میں غور کرنے سے آیات کی تفسیر کے بارے میں دو مسیح مؤلفین کی بے بضاعتی بالکل واضح ہوجاتی ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱)۔ جان ڈیون پورٹ (JOHN DAVEN PORTS) بعض مسائل پر بحث کے بعد ''دَنٰی فَتَدَلّٰی'' کے اس طرح معنی کرتا ہے کہ آخر کار آنحضرتؐ کو بارگاہ باری تعالیٰ میں تقرب کی اجازت مل گئی اور آنحضرتؐ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں عرش خدائے تعالیٰ سے آپ کا فاصلہ دو کمانوں سے زیادہ نہ رہا۔

اس مؤلف کے دو نکات کا تذکرہ لازم آتا ہے:

اولاً: سورۂ نجم کی آیات مبارکہ دو حصوں میں واقع ہیں جبکہ اس کے زیر نظر آیات نزول وحی کے آغاز سے تعلق رکھتی ہے۔ واقعہ معراج سے نہیں، جبکہ معراج رسولؐ کے متعلق ''وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ذ'' سے شروع ہوتی ہے۔

ثانیاً: ضمیر ''دَنٰی فَتَدَلّٰی'' فرشتہ وحی کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ رسول اکرم ﷺ کی طرف۔ اس سے مقصد یہ نکلا کہ جبرئیل امین آنحضرتؐ کے نزدیک ہوئے اور آسمان میں آپ کی نظروں کے سامنے ہوئے۔

۲)۔ کتاب ''محمدؐ پیامبرے کہ باید از نو شناخت'' کا مؤلف ص ۱۳۵ پر لکھتا ہے:

آخری آسمان پر پیغمبر اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے اس قدر قریب ہوئے کہ خداوند تعالیٰ کے قلم کی آواز سننے لگے اور سمجھے کہ خداوند تعالیٰ لوگوں کے حساب کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے قلم کی آواز سننے کے باوجود اسے دیکھتے نہیں تھے۔

یہ بحث بعد والی آیت کے مطالب کو بھی واضح کر دیتی ہے اور وہاں بھی محور بحث فرشتہ جبرئیل امین ہی قرار پاتا ہے اور جو فرشتہ وحی ہے۔ ہم وضاحت کی خاطر آیات کا متن اور ترجمہ دوبارہ پیش کرتے ہیں:

''اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى'': جو کچھ اس (رسول اکرمؐ) نے مشاہدہ کیا، کیا تم اس کے لیے اس سے جھگڑا کرتے ہو؟ (موصول میں ''ما'' سے مراد فرشتہ ہے جس کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آپؐ نے نزول وحی کے وقت اس کو دیکھا تھا)۔

''وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى'' کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ پیغمبر اکرمؐ نے فرشتہ کو ایک مرتبہ بھی دیکھا ہے۔ ''رَاٰهُ'' کی ضمیر سے فرشتہ وحی مراد ہے۔

''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' ''سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک''۔

''عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى'' ''اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے''

''اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى'' ''جس وقت سدرۃ کو ڈھانپ لیا جس چیز نے بھی ڈھانپ لیا''۔

''مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى'' ''اس کی نگاہ میں نہ تو لرزہ آیا نہ تو اس نے طغیان کیا، یعنی فرشتہ کو واقعی دیکھا اور یہ رویت ایک رویت واقعی تھی۔

''لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ '' اپنے پروردگار کی آیات بزرگ کو دیکھا'' ان آیات بزرگ میں ایک فرشتہ وحی بھی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ان آیات مبارکہ میں ، وہ نزول وحی سے متعلق ہوں ، یا اس حصہ سے متعلق رکھتی ہوں جو واقعہ معراج کے بارے میں ہے، فرشتہ وحی کا نظر آنا ہی مراد ہے۔ مشرکین اس حقیقت کی تکذیب کرتے تھے جبکہ قرآن مجید خاص قسم کی صلابت کے ساتھ اس امر کی تاکید کرتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے مرجع ضمائر میں غلطی کی اور تصور کرلیا کہ یہاں رویت باری تعالیٰ مراد ہے اور ان آیات کو رویت پروردگار پر شاہد قرار دے دیا ہے۔

آخر میں یہ کہنا لازم آتا ہے کہ قرآن مجید میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کے بیان کرنے کا مقصد آنحضرتؐ کی تکریم و تعظیم کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی قدرت لامحدود کی طرف اشارہ کرنا بھی ہے، یہ مقصد صرف اسی صورت میں تحقق پذیر ہوسکتا ہے جب واقعہ معراج کو اس طرح تسلیم کیا جائے جس طرح متذکرہ بالا سطور میں بیان کیا گیا یعنی معراج آنحضرتؐ یقینا جسمانی و روحانی دونوں کیفیات میں ہوا، خواب کی صورت ہرگز نہیں کیونکہ خواب کو خیال و پندار سے جدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ان تمام امور سے قطع نظر معراج کے اعلان کے بعد مشرکوں کی دشمنی میں مزید اضافہ ہوگیا اور انہوں نے اور زیادہ مشکلات پیدا کیں ۔ جہاں تک ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی روایت کا تعلق ہے، تو وہ اس زمانہ میں یا تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں یا پھر ابھی آنحضرتؐ کی حضوری کا انہوں نے شرف ہی نہ پایا تھا۔ لہٰذا وہ اس موضوع پر شہادت نہیں دے سکتیں۔ [1]

اس قسم کی سطحی اور دور از حقیقت تفاسیر مستشرقین کی کتب میں کافی زیادہ تعداد پائی جاتی ہیں۔

۲)۔ اس قسم کے اکثر اشکالات و شبہات جو حقیقت معراج رسولؐ کے بارے میں پائے جاتے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی وسعت قدرت سے واقفیت میں کمی اور لاعلمی کے مظہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا عظیم قدرت کاملہ میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ماضی یا حال کے مغرب زدہ لوگوں کے تمام اعتراضات ، جو علوم طبیعی کی بناء پر وہ لوگ پیش کرتے ہیں قدرت پروردگار عالم کے قوت بشری سے موازنہ کے علاوہ اور کچھ نہیں، خداوند عالم کس قدر خوبصورت انداز میں فرماتا ہے:

''وَمَا قَدَرُ اللهَ حَقَّ قَدْرِهٖ'' اللہ تعالیٰ کو جس طرح پہچاننا چاہیے تھا انہوں نے نہیں پہچانا''۔

یہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد دس سال کے عرصہ کے واقعات اختتام کو پہنچتے ہیں۔ اب صرف قریش کی واقعیت نبوت آنحضرتؐ کے بارے میں جستجو کا بیان باقی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی ناکامی کے بعد ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ یہودیوں کے علماء کے ذریعے نبوت کے مسئلہ میں تحقیق و جستجو کریں تاکہ کسی حد تک حقیقت سے آگاہ ہو پائیں، اس فکر کے سن و سال کی تشخیص ممکن نہیں۔ احتمال یہ ہے کہ قریش میں یہ فکر بعثت کے آٹھویں سے دسویں سال کے درمیان عرصہ میں پیدا ہوئی۔ لہٰذا اب ہم اس موضوع کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

---

[1] المواہب اللدنیہ، ج ۲، ص ۲

فیصلہ کے لیے علمائے یہود کی طرف رجوع

نور پروردگار کو بجھانے کے سلسلہ میں قریش مکی کی تمام مخالفت اور کاوش کسی نتیجہ پر نہ پہنچی۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے کہ نور توحید کی درخشانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آخر انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اصل حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں اور علمائے یہود کے ذریعہ جو اس ملک میں سب اہل کتاب مذاہب کے پیروکاروں سے سبقت رکھتے تھے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی اصلیت کو معلوم کریں۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے نضر بن حارث بن ابی معیط نامی اشخاص کو منتخب کر کے مامور کیا کہ مدینہ جائیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے سامنے پیش کریں کیونکہ قدر علم و آگہی یہود کو حاصل تھی۔ قریش اس کے حامل نہ تھے۔

ان دونوں نے مدینہ پہنچ کر مدعی نبوت کی صفات اور خصوصیت علمائے یہود کے سامنے رکھیں اور کہا کہ تم اہل تورات ہو۔ اس لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں کہ تمہیں اس حادثہ سے مطلع کریں اور اس مدعی نبوت کے بارے میں تمہارا نظریہ معلوم کریں۔

علمائے یہود نے ان کے بیان کے جواب میں متفقہ طور پر کہا کہ اس قسم کے مدعی نبوت کی صداقت کے امتحان و آزمائش کے لیے ضروری ہے کہ اس سے تین امور کے بارے میں سوال کیا جائے۔ اگر وہ تینوں سوالوں کے جواب دیدے تو وہ یقینا پیغمبر اور فرستادۂ خدا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ ان سوالات کے جواب میں اپنی عاجزی کا اظہار کرے تو جان لو کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویدار ہے۔ پھر اس کے خلاف تم ہر قسم کا اقدام کر سکتے ہو۔ اس سے پوچھو:

۱)۔ ان جوانوں کی زندگی کا کیا انجام ہوا جنہوں نے اپنے وطن اور ملک کو ترک کر دیا۔ پھر وہ کہاں جا پہنچے؟

۲)۔ وہ شخص کون تھا جس نے دنیا کے شرق و غرب کا دورہ کیا؟

۳)۔ روح کیا چیز ہے؟

وفد قریش علمائے یہود کے نظریات معلوم کرنے کے بعد مکہ واپس ہوا اور سرداران قریش کو نظریات یہود سے مطلع کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن یہ سوچ کر ایک پختہ و مستحکم دلیل کے ساتھ آ گئے۔ بارگاہ پیغمبر میں حاضر ہوئے اور تینوں سوالات آنحضرتؐ کے حضور پیش کیے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تینوں سوالات کے جواب سے تمہیں مطلع کرتا ہوں۔ چنانچہ وحی پروردگار نازل ہوئی۔ پہلے دو سوالوں کے جواب سورۂ کہف کی آیات مجیدہ ۹ تا ۲۸ اور ۸۳ تا ۹۸ میں موصول ہوئے جبکہ تیسرے سوال کا جواب سورۂ اسراء کی آیت ۸۵ کی شکل میں ملا۔

پہلے سوال کا جواب سورہ کہف میں مندرجہ ذیل آیت سے شروع ہوتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹

''کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری عجیب و غریب نشانیوں سے تھے''۔(کہف۔۹)

اس طرح دوسرے سوال کا جواب اسی سورۂ مبارکہ کی درج ذیل آیہ مبارکہ سے شروع ہوتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾

''آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ میں عنقریب ان کی زندگی کے بارے میں مطلع کروں گا''(کہف۔۸۳)

تیسرے سوال سورۂ اسراء میں اس طرح وارد ہوا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾

''آپ سے روح (روح الامین جبرئیل) کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ میرے پروردگار کی جانب سے مامور ہے اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے''۔[1] (اسراء۔۸۵)

کتب سیرت و تفسیر میں یہ بات مشہور ہے کہ علمائے یہود نے انہی تین سوالات کا سہارا لیا تھا۔ یہاں تک ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہود کی طرف سے صرف یہی سوالات پیش کئے گئے تھے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ کچھ سوالوں کا جواب سورۂ کہف میں اور کچھ کا سورۂ اسراء میں دیا گیا حالانکہ مناسب تو یہ تھا کہ سب سوالوں کا جواب ایک ہی سورہ میں پایا جاتا۔ اس کی کوئی مصلحت یقیناً ہے لیکن ہم اس مصلحت کی آگاہی کے متحمل نہیں ہیں۔

شیعہ روایات کہتی ہیں کہ ان کا سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت یوشع کے ہمراہ سفر سے تعلق رکھتا تھا جن کا قصہ اسی سورۂ کہف کی آیات ۶۰ تا ۸۲ کے ضمن میں وارد ہے اور اس قصہ سے متعلق سب سے پہلی آیہ مبارکہ شریفہ اس طرح ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

''اور جب موسیٰؑ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا کہ میں اپنا سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ ہم دو دریاؤں (خلیج عقبہ اور خلیج سوئز) کے ملنے کے مقام تک پہنچ جائیں گے اگرچہ اس میں بہت مدت صرف ہو جائے''۔(کہف۔۶۰)

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج۱،ص ۳۰۰

شیعہ روایات کے مطابق یہود نے ایک چوتھا سوال بھی پیش کیا تھا کہ اس مدعی نبوت سے وقت قیامت کے بارے میں سوال کریں جس کا علم صرف خداوند عالم ہی کو ہے۔ اگر نبوت کا دعویدار اور وقت قیامت سے واقف ہونے کا دعویٰ کرے تو سمجھ لو کہ وہ سچا نہیں ہے۔

بہر حال تینوں سوالوں کے واضح اور روشن قرآن نے جوابات سے دشمن کو عاجز کر دیا لیکن دشمن کی مخالفت ومخاصمت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی عداوت اسی طرح برقرار رہی حتیٰ کہ ہجرت کا واقعہ رونما ہوا۔ آنحضرتؐ مخالف قوتوں کے دائرہ کار سے باہر تشریف لے گئے اور آپ نے یثرب پہنچ کر اس قدر طاقت حاصل کی کہ جو آپ کی نصرت کرے۔

مکہ میں عیسائیوں کے وفود تحقیقی

باوجود یہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں اعلانیہ تبلیغ کے تمام ذرائع مکمل طور پر محدود تھے پھر بھی آپ کی دعوت کی امواج سرحد حجاز کو پار کر کے حجران اور حبشہ جیسے مقامات تک جا پہنچیں جو مسیحیت کا گہوارہ تھے۔ لہٰذا جب آنحضرتؐ مکہ میں زندگی بسر کر رہے تھے عیسائی آبادیوں (مثلاً نجران) کا ایک وفد برائے تحقیق مکہ میں وارد ہوا تا کہ وہ آنحضرتؐ کے دین اور آپ کی دعوت کے بارے میں تحقیق کریں۔

ارکان وفد مکہ اور مسجد الحرام میں جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہوں نے ملاقات کی جبکہ سرداران قریش بھی کعبہ کے اردگرد موجود تھے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ ارکان وفد کے مذاکرات اس قدر مؤثر ثابت ہوئے کہ قرآن کی کچھ آیات سننے کے بعد وہ لوگ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے، ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ لوگ سمجھ گئے کہ آنحضرتؐ وہی موعود انجیل ہستی ہیں جن کی انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دے رکھی ہے۔

ان لوگوں کا آنحضرتؐ پر ایمان لے آنا، اور وہ بھی پہلی ہی ملاقات میں، قریش مکہ کے لیے بہت رنج واندوہ کا باعث ہوا۔ پس ابو جہل نے، جو غیظ وغضب میں بیٹھا تھا، نصاریٰ کے وفد کی طرف رخ کر کے کہا:

''خدا تمہیں ناامید کرے، تم کتنے برے نمائندے ہو جن کو تمہارے سرداروں نے اس شخص کی وضع وکیفیت کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے بھیجا کہ واپس جا کر انہیں آگاہ کرو۔ لیکن خلاف توقع پہلی ہی ملاقات میں تم اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے اور اس کی تصدیق کر دی۔ تم کیسے بے عقل قسم کے نمائندے ہو؟''۔

وفد کے ارا کین فراعین مکہ کی طاقت وقوت سے ناواقف تھے۔ انہوں نے نہایت نرمی سے جواب دیا: ''ہم تم سے کوئی بحث وگفتگو نہیں کرتے، تم اپنے دین پر قائم رہو اور ہم اپنے دین پر قائم ہیں''۔ قرآن مجید ان لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝۵۴ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡسَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡلَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ۝۵۵

''وہ لوگ جنہیں ہم نے پہلے سے کتاب دے رکھی ہے قرآن مجید پر ایمان لے آئے، یہ دین اور کتاب برحق ہے اور پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ہم پہلے بھی مسلمان (فرمان باری تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے) تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے صبر و شکیبائی کے بدلہ میں دو گناہ اجر دیا جائے گا۔ یہ لوگ برائی کو نیکی کے ذریعے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں، جب کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پر سلام ہو، ہم جاہلوں کی پیروی نہیں کرتے''[۱]۔ (قصص۔۲۵ تا ۵۵)

آخر میں ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کی شان نزول ایک اور بھی ہے جو تقریباً اس سے ملتی جلتی ہے۔ ان آیات شریفہ کا لب ولہجہ بذات خود سورہ کے مکی ہونے کی خبر دیتا ہے اگرچہ بعض حضرات نے سورۂ ہذا کو مکی اور ان آیات کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس لیے ہم نے اس واقعہ کو حیات مبارکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے حصہ (بعثت تا ہجرت) میں پیش کیا ہے۔

[۱] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۹۱۔ ۳۹۲

حصہ سوم

حیات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

از ہجرت تا رحلت

پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت بطرف مدینہ“

انبیاء علیہم السلام کی ہجرت بالعموم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت بالخصوص مورد عنایت قرآن مجید تھی۔ قرآن مجید کئی آیات مبارکہ کے ذریعے آنحضرتؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بعثت کے بعد مکہ میں تیرہ سال کا عرصہ گزارنے کے بعد آخر کار مجبور ہوئے کہ اپنی جائے ولادت اور اولین محل نزول وحی کو مدینہ کے ارادہ سے ترک کریں جس کو اس زمانہ میں یثرب کہا جاتا تھا۔ اور سرزمین غربت میں قیام فرمائیں۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس ہجرت کا راز زبان وحی سے سنیں، اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

”اور اس وقت کو یاد کرو جب کفار نے چاہا کہ تمہیں قید، یا قتل کر دیں، یا مکہ سے باہر نکال دیں، وہ حیلہ کر رہے ہیں اور خدا ان کے حیلوں کو بے اثر کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تو بہترین چارہ جو ہے“۔ (انفال۔ ۳۰)

تاریخ کا بیان ہے کہ سرغنان شرک ”دارالندوہ“ میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان تین میں سے ایک راہ اختیار کریں:

۱)۔ قید کر دیں۔ (لِيُثْبِتُوْكَ)

۲)۔ قتل کر دیں۔ (يَقْتُلُوْكَ)

۳)۔ مشرک قبائل میں آپ کو جلا وطن کر دیں۔ (يُخْرِجُوْكَ)

آخر کار انہوں نے تہیہ کیا کہ مندرجہ بالا دوسرا اقدام کریں۔ یہ اس طرح کہ مختلف قبائل کے اشخاص مل کر یا کسی ایک قبیلہ کی مختلف شاخوں سے مسلح افراد منتخب کیے جائیں جو آنحضرتؐ کو ان کے اپنے گھر میں قتل کر ڈالیں، اس طرح چونکہ آنحضرتؐ کا خون مختلف قبائل کے ہاتھوں بہے گا لہٰذا فطرتاً کوئی خاص قبیلہ یا کسی قبیلہ کی شاخ آنحضرتؐ کے قتل کے لیے جوابدہ نہ ہوگی اور آپ کے خون میں یہ سب قبائل ملوث ہو جائیں گے۔ مشرکین کی مکاری کا یہ منصوبہ تھا۔ لیکن مشیت پروردگار عالم اس طرح قرار پائی تھی کہ حساس لمحات میں اپنے انبیائے کرام کی مدد فرمائے ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۷۱ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝۱۷۲

”اور ہمیشہ سے ہماری مشیت رہی ہے کہ اپنے فرستادہ بندوں کی نصرت فرمائیں اس طرح البتہ وہ

نصرت کیے گئے ہیں''۔ (صافات۔۱۷۱، ۱۷۲)

اس اصول کی بناء پر سرغنان شرک کے منصوبہ منحوس کی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بذریعہ وحی اطلاع فرمائی۔ پس آنحضرتؐ بھی ایک نہایت ہی صحیح حساب شدہ منصوبہ کے تحت خانہ اقدس سے باہر روانہ ہوئے، مکہ کے جنوب مشرق (مدینہ کے نقطہ مقابل) کی راہ اختیار فرمائی اور مشہور و معروف غار ثور میں پناہ لی۔ آنحضرتؐ مکمل تین شبانہ روز اس غار میں چھپے رہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی شخص آنحضرتؐ کی جائے پناہ سے واقف نہ تھا۔ اس عرصہ کے بعد ان وسائل و ذرائع کے ساتھ جو حضرت علی علیہ السلام نے آپ کے لیے مہیا کیے تھے آپ نے رات کے وقت مدینہ کا راستہ لیا۔ اس طرح رات سفر کرتے ہوئے اور دن کو استراحت فرمائے ہوئے آپ یثرب یعنی مدینہ پہنچے۔ قرآن مجید ہجرت کے اس حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۰

''اگر تم اس کی نصرت نہ کرو (تو خداوند تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا) جیسا کہ اللہ نے اس کی اس وقت مدد کی تھی جب کفار نے اس کو مکہ سے نکال دیا تھا اور وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ (سوائے ایک شخص کے اور کوئی اس کے ہمراہ نہ تھا) وہ اپنے ہم سفر کی دلداری کرتا تھا اور کہتا تھا کہ خوف نہ کھاؤ، اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اللہ تعالیٰ نے سکون اس پر نازل فرمایا اور اس کی ایسے لشکر سے مدد کی کہ جس کو تم نہیں دیکھ سکتے ۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے کفار کو نیچا دکھایا اپنی بات کو بلند فرمایا، کفار اپنے مقصد میں شکست کھا گئے اور دین خدا کامیاب ہوا۔ اللہ قوی و حکیم ہے''۔ (توبہ۔۴۰)

قرآن مجید ایک اور آیہ مبارکہ میں ہجرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور موقع پر فرماتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝۱۳

''کتنی ہی ایسی سرزمین تھیں جہاں کے لوگوں سے، جنہوں نے آپ کو نکالا، زیادہ قوی اور طاقتور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیست و نابود کر دیا اور ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا''۔ (محمدؐ۔۱۳)

مفسرین لکھتے ہیں کہ جناب رسالتمآب ﷺ کو نصف راہ میں جحفہ کے مقام پر آپ کی جائے ولادت یعنی مکہ کیا یاد ستانے لگی جس سے آپ کا دل اداس ہوا۔ کیسے ایسا نہ ہوتا جب کہ آنحضرتؐ مقدس ترین، سرزمین، خانہ توحید اور اپنی ایسی قوم ورشتہ داروں سے دوچار رہے تھے جنہوں نے تیرہ برس تک پروانہ وار آپ کا دفاع کیا تھا۔ ان حالات میں جس چیز نے آپ ﷺ کے قلب مبارک کو سکون بخشا وہ وحی پروردگار تھی جس نے آنحضرتؐ کی اپنی جائے ولادت کی طرف واپسی کو قطعی اور یقینی قرار دیا اور آپؐ کو ذیل کے خطاب سے مخاطب فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ

''وہ ہستی جس نے قرآن کے بیان و تبلیغ کو آپ پر فرض کیا ہے، آپ کو آپ کی جائے ولادت کی طرف ضرور پلٹائے گی''۔ (قصص۔۸۵)

پیغمبر اسلام ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت دین اسلام کی تاریخ میں ایک خاص ومؤثر مقام رکھتی ہے۔ اس ہجرت نے قطع نظر اس کے کہ آنحضرتؐ کی جان بچائی اور شریک کے خونخوار بھڑیوں کے چنگل سے آپؐ کو آزاد کیا، اس بات کا سبب پیدا کیا کہ آنحضرتؐ ایک مناسب و آمادہ اور شرائع و کتب آسمانی سے آشنا ماحول میں نزول اجلال فرما کر تبلیغ اسلام کریں۔ جہاں بے شمار پاک دل نوجوانوں (انصار) کی جماعتیں آپ کے گرد جمع ہوں اور آخر کار ایک مستقل قوت کے ساتھ مکتب اسلام کا دفاع کریں۔

یہ ہجرت اس بات کا سبب بنی کہ پیغمبر اکرم ﷺ جوانان یثرب کی مدد سے مبلغین اسلام تیار فرمائیں، قرآن مجید اور تعلیمات اسلام سکھانے کے بعد انہیں جزیرہ نمائے عرب کے اطراف وجوانب میں روانہ کریں اور دور دراز کے قبائل کی توجہ اسلام کی مبذول کریں۔

اس ہجرت کے نتیجہ میں جزیرہ نمائے عرب کے قلب و وسط میں ایک قوی وطاقت ور حکومت قائم ہوئی جو گلا گھونٹ دے اور اس علاقہ کے یہودیوں کو جو تبلیغ اسلام میں مزاحم ہوتے تھے، سبق سکھلائے۔

اس ہجرت ہی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ ایک مذہبی اور سیاسی مرکز بن گیا اور رسول اکرم ﷺ کی حیات مقدس کے آخری ایام میں دور دراز کے علاقوں سے بہت سے وفود مدینہ میں وارد ہونے لگے۔ اسلام کے بارے میں تحقیق کرنے اور اس کی معنویت اور قوت ظاہری سے متاثر ہونے لگی۔

ہجرت نبوی کی یہی اہمیت تھی کہ یہ واقعہ خود پیغمبر اکرم ﷺ ہی کے حکم سے اسلامی تاریخ وسن وسال کا مقام آغاز بنا اور آنحضرتؐ کے زمانہ حیات ہی میں پیش آنے والے واقعات وحوادث کو اسی معینہ تاریخ سے حساب میں لایا جانے لگا۔

دین وآئین اسلام کے لیے، جو ایک مستقل دین آخر اور تمام دیگر ادیان کا ناسخ تھا۔ لازم تھا کہ وہ سن وسال کے اعتبار سے اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہو اور زرتشتیوں یا مسیحیوں کی مروجہ تاریخ کی پیروی نہ کرے۔ لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ بہت سی حکومتوں نے جو، بظاہر اسلامی حکومتیں ہیں، تاریخ ہجری کو بھلا کر پس پشت ڈال رکھا ہے اور اپنی داخلی وخارجی تمام خط وکتابت میں مسیحی کلینڈر سے استفادہ کرتے ہیں ، یہ بھی بذات خود ایک طرح کی خود فراموشی ہے جو ملت اسلامی کو گھیرے ہوئے ہے۔ تاریخ ہجری کی اہمیت کے پیش نظر شائستہ ومناسب یہی ہے

کہ اس مسئلہ کی تاریخ واصل کو معلوم کیا جائے تا کہ واضح ہو جائے کہ ہجرت نبوی کس طرح خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے عالم اسلام کے لیے آغاز تاریخ قرار پاتی ہے۔

ہجرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے مسلمانان عالم کے کیلنڈر کی ابتداء ہوئی ہے:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے اختیار کے تحت تاریخ ہجری کی بنیاد رکھی۔ اس اعتبار سے تاریخ ہجری کے بجائے دیگر ہر قسم کے کلینڈر کا استعمال سنت پیغمبر اسلامؐ سے ایک قسم کی روگردانی شمار ہوگی۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں ایسی تاریخ کا وجود جو سال وماہ وہفتہ سے مشخص ہو، ضروریات زندگی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بغیر انسانی اجتماعی زندگی کے پہیہ کی حرکت رک جاتی ہے، یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس پر بحث بدیہیات پر بحث کے مترادف ہے۔ ماننا پڑے گا کہ سیاسی وفوجی وانتظامی معاہدات و پیمانات کی تنظیم، تجارتی قراردادوں کی تدوین، تاجرانہ اسناد وحوالہ جات کی تحویل، قرضوں کا حصول وادائیگی، داخلی وخارجی ودیگر قسم کے خطوط کا تبادلہ وغیرہ کسی طرح بھی تاریخ واضح ومقرر کے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی اس امر میں کسی قسم کی بحث وانکار ممکن ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کبار نے چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے بارے میں سوال کیا: ''کیا وجہ ہے کہ چاند شروع میں باریک ہوتا ہے۔ پھر بڑھتا بڑھتا موٹا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بدر (چودھویں شب کا پورا چاند) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ کم ہو کر اپنی صورت اول پر پلٹ آتا ہے؟ جواب میں وحی پروردگار نازل ہوئی، چاند کی اس کیفیت کے فلسفہ سے ایک شق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

قُلۡ هِيَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ وَالۡحَجِّ ؕ (بقرہ۔۱۸۹)

''چاند کا گھٹنا بڑھنا تشخیص وقت کی خاطر ہے''۔ تا کہ لوگ اس طرح مہینہ کی ابتداء درمیان اور آخر کا اندازہ لگا سکیں، مذہبی تکالیف وفرائض اپنے اجتماعات کے اوقات اس طریقہ سے معلوم کریں، تنخواہ پانے والے اپنے مشاہرات وصول کریں، قرض خواہ قرض داروں سے اپنی وصولی قرض کا حساب رکھیں اور عبادت گزار لوگ روزہ اور حج کے مہینوں میں فرائض مذہبی قائم کر پائیں۔

اس امر میں کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ ہر ملت کو اپنے لیے ایک تاریخ کو مقرر کرنا چاہیے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تاریخ کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنے دفاتر وخطوط کو کس تاریخ کے مطابق لکھا جانا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں کیسے واقعہ یا حادثہ کو تاریخ سن وسال کی ابتداء قرار دینا چاہیے کہ آئندہ آنے والے واقعات کے اوقات کو اس سے شمار کیا جائے؟

اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ اس سوال کا تعلق اس امر سے ہے کہ متعلقہ قوم کونسی قوم ہے؟ اگر وہ قوم اپنے ماضی میں کوئی درخشاں واقعات رکھتی ہے، کوئی بنیادی تہذیب وتمدن، مستقل دین شریعت، نمایاں علمی وسیاسی شخصیات، اہم اور قابل فخر حوادث کی حامل ہے، خودرو زراعت کی طرح زمین سے برآمد نہ ہوئی ہو، نوزائیدہ اقوام کی مانند بے اصل ونسب پیدا نہ ہوئی ہو، تو ایسی صورت میں اس قوم کا فرض ہے کہ کسی بزرگترین واہم ترین واقعہ کو جو ان کی اجتماعی اور مذہبی حیات کے دوران رونما ہوا ہو، اپنی تاریخ یعنی کلینڈر کی ابتداء قرار دے پھر ان کو

چاہیے کہ تمام حادثات و واقعات کو، وہ اس تاریخ سے قبل واقع ہوئے ہوں یا اس کے بعد رونما ہوں، انہیں اسی اہم تاریخ کے حساب پر جانچیں ۔اس طرح وہ قوم اپنی ملی وشخصی کیفیات کو استحکام دلائے گی اور اپنے آپ کو دیگر اقوام کے طفیلی بننے اور ان سے مانگنے سے محفوظ رکھے گی۔

اسلامی کیلنڈر کی ہجرت سے ابتداء کرنے کی غرض وغایت

مسلمانوں کی تاریخ میں نہ تو کوئی شخصیت پیغمبر اکرم ﷺ سے بڑی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا واقعہ ہے جو ہجرت کے واقعہ سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہو۔ہجرت پیغمبر اکرم ﷺ سے تاریخ بشریت میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں نے ایک گھٹن آلود ماحول سے آزاد اور مساعد حالات میں قدم رکھا۔مدینہ کے باشندوں نے مسلمانوں اور ان کے قائد کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی قوت و طاقت کو ان کے اختیار میں دے دیا۔زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس ہجرت کے نتیجہ میں اسلام نے اپنے لیے سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ پیدا کیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جزیرہ نمائے عرب میں اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سطح زمین پر ایک طاقتور حکومت ابھری اس سے ایک ایسے عظیم تمدن کی بنیاد رکھی گئی کہ چشم بشر نے جس کی کبھی مثل نہ دیکھی تھی۔لہٰذا اگر ہجرت نہ ہوتی تو اسلام مکہ کی حدود میں ہی دفن ہو کر رہ جاتا اور عالم بشریت اسلام کے عظیم فیض سے محروم رہ جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہجرت کے واقعہ سے اپنا کلینڈر کی ابتداء کی۔ہجرت کے روز سے آج تک چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور ملت اسلامیہ اپنی پر افتخار حیات کی چودہ صدیاں اپنے پیچھے گزار کر پندرھویں صدی کے دروازہ پر آن کھڑی ہے۔

واقعہ ہجرت کو اسلامی کیلنڈر کی ابتداء کس نے قرار دیا؟

مؤرخین میں مشہور ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مشورہ اور نصیحت کے تحت خلیفہ دوم نے ہجرت پیغمبر اکرم ﷺ سے اسلامی کلینڈر کی ابتداء کی [1]۔اور حکم دیا کہ خطوط پر اسی حساب سے تاریخ درج کی جائے اور دفاتر میں بھی اسی کے مطابق کلینڈر جاری کیا جائے۔لیکن یہ روایت اصلیت سے مختلف ہے۔آنحضرتؐ کے خطوط کو، جن کے بڑے حصے تاریخ و کتب حدیث میں محفوظ ہیں ان دیگر ذرائع روایت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے جو ان صفحات میں پیش کیے جا رہے ہیں، واضح ثابت ہو جاتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ وہ ہستی ہیں جنہوں نے واقعہ ہجرت سے اسلامی کلینڈر کا آغاز فرمایا اور آنحضرتؐ اپنے خطوط و مکاتیب کو، جو آپ سرداران قبائل، رؤسائے عرب اور بڑے بڑے اہم لوگوں کو لکھتے تھے، اسی طریقہ سے مؤرخ فرماتے تھے۔

ہم ان صفحات میں آنحضرتؐ کے چند ایک خطوط پر ڈالی گئی تاریخوں کے نمونے پیش کرتے ہیں نیز اسی سلسلہ میں کچھ اور دلائل سامنے لاتے ہیں، ان کے علاوہ ممکن ہے کچھ اور دلائل بھی ہوں جس سے ہم واقف نہ ہوں۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۴۵

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تاریخ وار خطوط کے چند نمونے

۱)۔سلمانؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کے بھائی ''ماہ بنداز'' اوران کے خاندان کے لیے کوئی اصلاحی وصیت تحریر فرمادیں ۔آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو بلایا اور وصیت مطلوبہ لکھوائی اورانہوں نے وصیت کولکھا۔تحریر کے آخر میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں:

''وَ کَتَبَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ بِاَمْرِ رَسُوْلِ اللهِ (ص) مِنْ رَّجَبَ سَنَةَ تِسْعٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ''[۱]

۲)۔مشہور مؤرخ بلاذری نے کتاب فتوح البلدان میں اس عہد نامہ کا متن پیش کیا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''مقنا'' کے یہودیوں کے ساتھ فرمایا تھا۔وہ لکھتا ہے:''اس عہد نامہ کا متن ایک مصر کے رہنے والے شخص نے پرانے سرخ رنگ کے چمڑے پر لکھا ہوا دیکھا۔اس نے یہ روایت مجھ سے کی اور پھر اس خط کو میرے سامنے پڑھا بھی''۔اس کے بعد بلاذری اس تحریر کے متن کونقل کرتا ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ آتے ہیں:''تمہارے لیے خود(آنحضرتؐ)اوراہل بیت رسول کے سوا کوئی امیر نہیں،''و کتب علی بن ابو طالب فی سنة تسع''[۲] (اس کو علی ابن ابی طالب نے(ہجرت کے)نویں سال میں تحریر کیا)،باجود یہ کہ قواعد کے لحاظ سے ابی طالب لکھا جانا چاہیے(نہ کہ ابوطالب)لیکن محققین ادب کہتے ہیں کہ قبیلہ قریش کے سب لوگ ہر حالت میں لفظ''اب''کو''داؤ''کے ساتھ۔ابو۔بولتے اور لکھتے تھے،ماہرین ادب میں ''اصمعی'' نے اس بات کی تصریح کی ہے۔

پروفیسر محمد حمید اللہ مؤلف کتاب''الوثائق السیاسیه'' لکھتا ہے:''میں ۱۳۵۸ھ میں مدینہ منورہ میں تحقیق وتدقیق میں مصروف تھا۔میں نے وہاں کچھ مکتوبات حضرت علی علیہ السلام کے خط میں لکھے ہوئے دیکھے جن سب کے آخر میں لکھا ہوا تھا:''انا علی بن ابو طالب''[۳]

۳)۔خالد بن ولید نے جو صلح نامے دمشق کے لوگوں کے لیے لکھوائے تھے،جن میں ان لوگوں کے خون مال اور گرجوں کو محترم شمار کیا گیا ہے،اس میں اس طرح آتا ہے: کتب سنة ثلاث عشرة ۱۳ھ میں لکھا گیا۔[۴]

سب جانتے ہیں کہ دمشق خلیفہ اول کی زندگی کے آخری ایام میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا۔لہٰذا جولوگ کہتے ہیں کہ تقویم ہجری خلیفہ دوم کے حکم اور امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے مشورہ سے مروج ہوئی اور پھر اس نے قانونی شکل اختیار کی،وہ اس واقعہ کا ۱۶ یا ۱۷ ہجری

---

[۱] کتاب اخبار اصفہان،مولفہ ابونعیم اصفہانی،ج ۱ ص ۵۲،۵۳

[۲] فتوح البلدان،ص ۷۲،مطبوعہ ۱۳۸۸ھ ق۔

[۳] مکاتیب الرسول،ص ۲۸۹

[۴] الاموال،ص ۲۹۷،طبع مصر

میں اندازہ لگاتے ہیں۔ درآنحالیکہ یہ تحریر فتح دمشق سے چار سال قبل لکھی گئی، اس پر ہجری تاریخ منضبط ہے۔

۴)۔ اس صلح نامہ پر جو حضرت علی علیہ السلام کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کے لیے لکھوایا تھا جو ۵ ھ میں لکھا گیا تھا، اس طرح آتا ہے:

''وَاَمَرَ عَلِيًّا اَنْ يَّكْتُبَ فِيْهِ: اَنَّهٗ كُتِبَ لِخَمْسٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ: علی کو حکم ملا کہ اس تحریر میں لکھا جائے: یہ صلح نامہ ہجرت کے پانچویں سال میں لکھا گیا''۔[1]

یہ جملہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ تقویم ہجری کے بانی خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور خود انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ صلح نامہ کے آخر میں سن ہجری تحریر کریں۔

۵)۔ صحیفہ سجادیہ کے شروع میں وارد ہوتا ہے کہ جبرئیل امین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کی تعبیر کے بارے میں کہا تھا کہ اسلام کی چکی آپ ؐ کی ہجرت سے لے کر دس سال تک گردش کرتی رہے گی اور پھر وہ رک جائے گی۔ اس کے بعد ایک بار پھر یہ چکی آپ ؐ کی ہجرت کے بعد پینتیسویں سال کے شروع میں گردش میں آئے گی اور پانچ سال مزید چلے گی جس کے بعد ضلالت کی چکیاں اپنے محور پر گھومنے لگیں گی۔[2]

۶)۔ محدثین اسلامی نے روایت کی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ام المؤمنین ام سلمہؓ سے فرمایا:

''میرا فرزند حسینؑ ہجرت کے ساٹھویں سال میں شہید کر دیا جائے گا''۔[3]

۷)۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ''اصحاب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خبر دی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری ہجرت کے سو برس گزرنے کے بعد تم میں سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں بند ہو جائیں گی''۔[4]

اس بات کے شواہد و قرائن کہ تقویم ہجری کی بنیاد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی رکھی تھی بے شمار ہیں جن سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں، ان قرائن میں سے ایک اور یہ ہے:

۸)۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بعض حضراتؓ کے زمانہ حیات میں حوادث اسلامی کی تاریخ کو آنحضرتؐ کی ہجرت کے وقت سے شمار کرتے تھے اور یہ کہنے کے بجائے کہ فلاں واقعہ فلاں سال میں رونما ہوا، یہ کہتے تھے کہ ہجرت کے اتنے ماہ بعد فلاں واقعہ ہوا، مثلاً

(ا)۔ ''مسجد الاقصیٰ سے کعبہ مکرمہ کی طرف قبلہ کی تحویل و تبدیلی شعبان کے مہینہ میں ہجرت نبوی کے سترھویں مہینہ واقع ہوئی''۔[5]

---

[1] التراتیب الاداریہ، ص ا، ص ۱۸۱، نقل از مشائخ سیوطی

[2] صحیفہ سجادیہ، ص ۱۵، سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۶۴۱

[3] مجمع الزوائد، ج ۹، ص ۱۹۰

[4] تاریخ الخمیس، ج ا، ص ۳۶۷

[5] تاریخ الخمیس، ج ا، ص ۳۶۹

(ب)۔''ماہ رمضان المبارک کے روزے ہجرت کے اٹھارہویں (۱۸) مہینہ میں واجب ہوئے''۔[1]

(ج)۔''عبداللہ ابن انیس، جو آنحضرتؐ کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک جماعت کا سردار تھا، کہتا ہے:

''میں آنحضرتؐ کی ہجرت کے چون (۵۴) ماہ بعد پیر کے دن محرم کی پانچ تاریخ کو مدینہ سے روانہ ہوا''۔

(د)۔غزوۂ''قرطا'' کے بارے میں ''محمد بن مسلمہ'' کہتا ہے: ''میں نے محرم کی دس تاریخ کو مدینہ چھوڑا۔انیس روز غیر حاضر رہ کر محرم کی آخر شب، ہجرت نبوی کے ماہ پچپن میں مدینہ واپس آیا''۔[2]

تاریخ مقرر کرنے کے اس قسم کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ ۵ ھ تک مسلمان تمام واقعات وحادثات کا شمار وقت آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد مہینوں سے کرتے تھے، حتیٰ کہ ہجرت کے پانچویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے سال ہجری نے مہینوں کی جگہ لے لی اور جیسا کہ ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں، حضرت علی علیہ السلام نے آنحضرتؐ کے حکم سے نجران کے عیسائیوں کے نام خط پر سال ہجری کی تاریخ ڈالی۔

۹)۔ان واقعات سے قطع نظر اسلامی محدثین، زہری سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وارد مدینہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے تعین تقویم کا حکم دیا اور ماہ ربیع سے، جس میں آپ کا ورود مسعود ہوا تھا، تاریخ کا تعین ہوا۔ ۴

۱۰)۔''حاکم'' ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ تقویم ہجری کا آغاز اسی سال سے ہوا جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں وارد ہوئے، اسی سال عبداللہؓ ابن زبیر پیدا ہوئے۔[3]

یہ تمام واقعات اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلام کے عظیم قائد نے روز اول ہی سے تقویم اسلامی کی ضرورت واضح فرمادی تھی اور آپ نے اپنی ہجرت کے حساب سے سال ہجری کی ابتداء مقرر فرمائی تھی۔اصل بات یہ ہے کہ ایک مدت تک سال شمار کرنے کے لیے بجائے مہینے شمار ہوتے تھے اور جب پانچواں سال شروع ہوا تو ہجرت کے سال نے مہینہ کی جگہ لے لی۔

ایک سوال

ممکن ہے کوئی شخص سوال کرے کہ اگر تقویم ہجری کی بنیاد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے رکھی تھی پھر اس روایت کا کیا مقام ہوا کہ جس کو بہت سے مؤرخین ومحدثین نے نقل کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے قرض سے متعلق سند خلیفہ دوم کے سامنے لے کر حاضر ہوا جس کی مدت ماہ شعبان میں ختم ہو رہی تھی۔خلیفہ نے پوچھا کہ اس سے کونسا ماہ شعبان مراد ہے، اسی سال کا یا گزشتہ سال کا یا آئندہ سال کا شعبان؟ انہوں نے اصحاب آنحضرتؐ کو جمع کیا اور کہا:

---

[1] مغازی واقدی، ج ۲، ص ۵۳۱

[2] تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۸۸

[3] مستدرک، حاکم

''اے لوگو! اپنے لیے تقویم مقرر کرو تا کہ اس کے ذریعے اپنے لین دین کی تاریخوں کا تعین کر سکو''۔

بعض اصحاب نے مشورہ دیا کہ تقویم کے تقرر کے لیے ایرانیوں کی پیروی کی جائے جو اپنے ہر بادشاہ کے مرنے کے بعد نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے اپنے واقعات کا تعین کرنے لگتے ہیں۔ بعض اور لوگوں نے کہا کہ رومیوں کی تاریخ مقرر کی جائے اور سکندر کی تاریخ کو آغاز تقویم شمار کیا جائے۔ ایک تیسری جماعت نے خیال ظاہر کیا کہ ولادت پیغمبر کو ابتدائے تقویم مقرر کیا جائے۔ چوتھی جماعت بولی کہ اس کی ابتداء بعثت رسولؐ سے کی جائے۔ ان میں کوئی نظریہ بھی خلیفہ کو پسند نہ آیا۔ اسی اثناء میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ''ہجرت نبوی کو ابتدائے تقویم قرار دیا جائے کیونکہ ہجرت ہی آنحضرتؐ کی ولادت کے مقابلہ میں آپ کی زیادہ نمود و شان و شوکت کا باعث بنی''۔

خلیفہ دوم نے اس نظریہ کو پسند کیا اور حکم دیا کہ ہجرت رسولؐ کو ابتدائے تقویم قرار دی جائے۔[۱]

یعقوبی رقمطراز ہے کہ یہ اعلان ہجرت کے سولہویں سال کیا گیا۔[۲]

جواب

سابق میں بیان کردہ واقعات کے مقابلہ میں، جن میں ثابت کیا گیا کہ تقویم اسلامی کی بنیاد کو دجناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حکم سے رکھی تھی، یہ روایت کسی طرح مستند قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس سے قطع نظر ممکن ہے کہ جو تقویم آنحضرتؐ نے مقرر فرمائی تھی طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے ضرورت تقویم کی کمی کے باعث متروک ہو گئی ہو اور اسے قانونی حیثیت حاصل نہ ہو سکی ہو، لیکن یہی تقویم خلیفہ دوم کے زمانہ حکومت میں ضروریات کے بڑھ جانے سے قانونی رواج پا گئی ہو۔ ایک اور توجیہہ بھی بیان کی جاتی ہے جس کو نظر انداز کر رہے ہیں، لیکن یہاں دو نکات کا بیان ہمارے لیے ناگزیر ہے:

۱)۔ واضح ہے کہ جو بھی مختلف مشورے تقرر تقویم کے لیے اصحاب پیغمبرؐ نے خلیفہ دوم کو دیئے، کسی میں بھی انہوں نے تقویم مسیحی کا ذکر نہیں کیا جو میلاد مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ میلاد مسیح چوتھی اسلامی صدی میں ایک سلسلہ حساب و کتاب کے بعد عیسائیوں کے درمیان رائج ہوئی، اس سے قبل عیسائیوں میں تقویم کا رواج ہی نہ تھا۔

۲)۔ دور حاضر میں اسلامی ممالک کو ہر زمانہ سے زیادہ وحدت و یگانگت کی ضرورت ہے۔ مظاہر وحدت اسلامی میں ایک تاریخ پر متفق ہونے کی کوشش ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اسلامی ممالک اپنے تمام امور کو تقویم ہجری کی بنیاد کے مطابق قرار دیں، عام اس سے کہ یہ تقویم شمسی حساب سے ہو یا قمری سے۔ اس طرح اسلامی ممالک اپنی وحدت و اتحاد کو استوار تر بنائیں۔ اس مقصد کے لیے ایک عظیم سیمینار کی ضرورت ہے جس میں تمام عظیم الشان شخصیات شریک ہوں، وحدت تقویم اسلامی پر غور کریں اور اپنے آپ کو تقویم میں مغرب کی پیروی سے نجات دلائیں۔

---

[۱] البدایۃ والنھایۃ، ج ۷، ص ۸۳، شرح نہج البلاغۃ حدیدی، ج ۱۲، ص ۷۴

[۲] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۴۵

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ بہت اسلامی اور عربی ممالک ہجری کو نظر انداز کر کے تقویم مسیحی، جو میلاد مسیح سے مربوط ہے کو اپنے امور کے لیے عملی طور پر ضروری جانتے ہیں یہاں تک کہ الازہر کی یونیورسٹی کے رئیس [1]۔ جو روحانیت کے اعتبار سے اہل تسنن کے رئیس قرار دیئے جاتے ہیں اپنے خطوط پر عیسائی تاریخ کو ڈالتے ہیں اور کسی طرح بھی اس کے ساتھ تاریخ ہجری کو جگہ نہیں دیتے۔

سازش طاغوت (سابقہ شاہ ایران)

ایران ایک ایسی اسلامی مملکت ہے جس نے بہت مشکل سے تقویم اسلامی کو محفوظ رکھا تھا اور وہاں اسی کو اپنے تمام امور میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ۵۶ ش میں طاغوت (سابقہ شاہ ایران کی) ایک سازش بے نقاب ہوئی جس سے یکا یک تقویم اسلامی کو تقویم شہنشاہی میں تبدیل کر دیا گیا اور تمام سرکاری اداروں میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب سے آئندہ تمام امور میں یہی بناوٹی تقویم استعمال ہوا کرے گی۔

وہ طاغوت (شاہ ایران) یہ سمجھتا تھا کہ تقویم اسلامی کے بدلہ میں تقویم شہنشاہی کو لا کر وہ اپنی حکومت اور ظلم و استبداد کے دور کو طویل اور مستحکم کر سکے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور رہبر امت آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ خمینی کی عظیم ہمت و رہبری سے یہ سازش دیگر بہت سی سازشوں کی طرح ناکام ہو گئی اور انجام کار دور شہنشاہی ملت اسلامیہ کے قیام کے بعد ختم ہو گیا جس کے نتیجہ میں اس دور استبداد کی جگہ نظام جمہوری اسلامی نے لے لی، اس طرح تقویم ہجری طاغوتی شہنشاہی تقویم کے بجائے قائم رہی۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ناگزیر ہے جو یہ ہے کہ تمام مذہبی و معاشرتی و سیاسی احتیاجات کے لیے ہمیں دونوں قسم کی یعنی قمری و شمسی، تقویم سے استفادہ کرنا چاہیے، سب سے پہلی اہمیت مراسم مذہبی و فرائض و سنن اسلامی کی ہے۔ دوسری بہت اہم چیز مسائل ملکی، تعطیلات عامہ اور غیر اسلامی ممالک کے ساتھ کاروبار و لین دین میں سہولت پیدا کرنا ہے۔ دوسری طرح کی تقویم ہجری اپنے دامن میں ایک تقدس رکھتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک تقدس کی حامل اور دوسری تقدس سے خالی ہو، تاریخ شمسی بھی تاریخ قمری کی طرف ایک قسم کی تاریخ تکوینی ہے جس کو گزرگاہ حیات سے حذف نہیں کیا جا سکتا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ تقویم کی ابتداء پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کی جائے۔ **حیات پیغمبر اسلامؐ کے حصہ دوم کا اختتام**

---

[1] شیخ محمود عبد الحلیم

عصمت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ اعتبار قرآن مجید

پیغمبر اسلامؐ کی عصمت

انبیائے ماسبق کی طرح رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطا وانحراف سے محفوظ رہنا بھی تین مراحل کا حامل ہے جو درج ذیل امور سے عبارت ہے:

۱)۔تبلیغ شریعت میں عمداً وسہواً خطا سے مصونیت مطلق

۲)۔امور عامہ میں خطا ولغزش سے مطلق دوری

۳)۔امور عامہ میں خطا ولغزش سے مطلق دوری

وہ تمام عقلی ونقلی دلائل جو ہم نے اپنی اس کتاب کی جلد پنجم میں دو مقامات پر عصمت انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کیے ہیں، وہ سب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مکمل طور پر صادق آتے ہیں، اوران کے تکرار کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔تاہم وہ امور اس بات کا سبب ہیں کہ دوبارہ مسئلہ عصمت کی طرف پلٹیں اور آنحضرتؐ کی عصمت کے مسئلہ کے لیے مستقل عنوان قائم کریں۔

(ا)۔ایسی آیات مبارکہ کا وجود جو خاص طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت ومصوٗنیت سے متعلق ہیں اوراس سلسلہ میں مقام دلائل پر استوار ہیں ؛اگر چہ ہم دو آیات سے زیادہ پیش نہیں کریں گے؛

(ب)۔سابقہ بحث عصمت کے مرحلۂ سوم، یعنی انبیاء علیہم السلام کے امور عامہ میں خطا ولغزش سے منزہ ہونے، بالخصوص ان امور میں جن کا تعلق تبلیغ و وضاحت شریعت کے علاوہ ہو، ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی۔لہٰذا لازم آتا ہے کہ ہم دوبارہ مسئلہ عصمت کی جانب لوٹیں اور دو آخری مراحل کو جن کا خصوصیت کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے محفوظ الخطا وعصیان ہونے سے تعلق ہے، نیز اسی میں جملہ انبیاء علیہم السلام کے خطا وعصیان سے محفوظ کا مسئلہ بھی شامل ہے۔معرض بحث قرار دیں،لیکن چونکہ عصمت انبیاء از گناہ کے بارے میں دلائل عقلیہ سابقہ بحث ہیں یعنی سہواً خطا ولغزش سے ان کے محفوظ ہونے کے بارے میں دلائل کی وضاحت آیات قرآنی کے سایہ میں پیش کریں گے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گناہ سے پاک ہونا

ان بہت سی آیات قرآنی کے علاوہ جو انبیاء علیہم السلام کے گناہ سے معصوم ہونے پر دلالت کرتی ہیں درج ذیل آیات مجیدہ سے بھی آنحضرتؐ کی عصمت از گناہ کے مسئلہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے:

۱)وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ

وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) اپنی پیش بندیوں سے آپ کو اس چیز سے جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی تھی، فریب دیں تا کہ آپ ہماری وحی کے علاوہ شے کی طرف ہمیں نسبت دیں اور پھر وہ آپ کو اپنا دوست قرار دیں''۔

۲) وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

اور اگر ہم آپ کو استقامت عطا نہ فرماتے تو قریب تھا کہ آپ کسی قدر ان کی جانب مائل ہو جاتے''۔

۳) اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

اس صورت میں ہم آپ کو (مشرکین کے) وہ برابر سزائیں دنیا کی زندگی اور (مشرکین کے) دو برابر سزائیں حیات آخرت میں چکھا دیتے۔ اس وقت ہمارے مقابلہ میں تم کوئی یار و مددگار نہ پاتے''۔ (اسراء۔ ۷۳ تا ۷۵)

مفسرین نے ان آیات مبارکہ کی مختلف شان ہائے نزول کا ذکر کیا ہے جن میں اکثر اس اعتبار سے صحیح و درست نہیں کہ یہ آیات مکی ہیں، ان کی شان نزول میں صرف وہ ہی درست ہے جو زمانہ نزول سے منطبق ہے اور وہ وہی ہے جس کو ابی حفص ''صائغ'' نے امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قریش نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ پابندی لگائی کہ وہ آنحضرتؐ کے خدا کی ایک سال تک پرستش کریں گے، بشرطیکہ ایک سال تک آنحضرتؐ بھی بتان قریش کی پرستش کریں۔

شان ہائے نزول کے اختلاف سے مفاد آیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم آیہ مبارکہ ''وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ'' میں زیادہ غور کریں اور آیات شریفہ کی دلالت کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل نکات کو سامنے رکھیں:

(ا)۔ بعض کوتاہ افراد نے چاہا ہے کہ اس آیہ شریفہ کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدم عصمت کا شاہد قرار دیں، حالانکہ محققین کی نظر میں یہ آنحضرتؐ کی عصمت کے دلائل نقلیہ میں سے ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باریک بین اور تحقیق عمیق کے خوگر حضرات نے ایک ایسے درخت سے جو مخالفین عصمت کی نظر میں تلخ ہے، میوۂ شیریں چننے اور مقاصدِ مخالفین کے برعکس مطالب نکالنے کی کوشش کی ہے۔

(ب)۔ ضروری ہے کہ ہم جملہ ''وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ'' میں ''کادوا'' کے فاعل کا تعین کرنے میں غور و خوض سے کام لیں، ضمیر متصل جس کو بیان کر رہی ہے۔ آیہ مبارکہ ظاہر طور پر نشان دہی کر رہی ہے کہ ''کادوا'' کی ضمیر سے مقصود مشرکین ہی ہیں اور ''لَيَفْتِنُوْنَكَ'' کے فاعل سے

بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، اس لحاظ سے مجموعی طور پر آیہ مجید کا مفاد یہ ہے کہ مشرکین کو فریب دینے کے قریب آ گئے جب کہ آنحضرتؐ کے ان لوگوں کے قریب آنے کی بات درمیان میں نہیں آئی۔

(ج)۔ آیہ شریفہ "وَلَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔـا قَلِيۡلًا" دو جملوں "ثَبَّتۡنٰكَ" اور "لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ" کے دو اجزا سے بن رہی ہے، اور لفظ "لَوۡ لَاۤ" عربی زبان میں ہماری زبان کے الفاظ "اگر نہ ہوتا" یا "اگر یوں نہ ہوتا" کے مترادف ہیں۔ اس صورت میں آیہ مبارکہ کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ "اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم آپ کو ثابت قدم رکھیں تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے"۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثبات قدم آپ کے ان لوگوں کے قریب ہونے کے مانع ہوا، اس طرح نہ صرف آپ کا میلان اور رجحان ان کی طرف نہ ہو پایا بلکہ آپ ان امور کے قریب بھی نہ ہوئے"۔

(د)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ثبات قدم عمل و کردار کے مراحل میں اثبات فکر و اندیشہ کے علاوہ اور کچھ نہیں، یعنی الطاف الہٰی اس طرح آنحضرتؐ کے شامل حال ہوا کہ بت پرستی کے بارے میں آپ مشرکین کی سازش اور ان کے قریب ہونے کا خیال تک نہ ہو تو آنحضرتؐ کے ذہن میں کبھی پیدا نہ ہوا، اور نہ ہی ظاہری طور پر کسی ایسے تخیل نے آپ کی طرف عملی جامہ اختیار کیا۔

ثبات قدم، اس معنی میں، انبیاء علیہم السلام کی عصمت و استقامت، جو روح القدس وغیرہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔

(ھ)۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ثبات قدم کسی ایک یا دو مواقع کے لیے ہی مخصوص نہیں، بلکہ ہمیشہ اور ہر وقت انبیاء علیہم السلام کے شامل حال رہتا ہے، کیونکہ وہی کیفیت جو اس موقع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے انبیائے کرم کے ثبات قسم کا سبب بنتی ہے، دیگر مواقع میں بھی موجود رہتی ہے، اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ ثبات قدم کے سلسلے میں اپنے نبی کی مدد فرمائے اور دیگر مراحل میں ان کو بے یار و مدگار ان کی حالت پر چھوڑ دے۔

(و)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثبات قدم حاصل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ انبیاء کرام سے ہر قسم کے اختیار و آزادی عمل کو سلب کر لیا جائے۔ ایسا بھی نہیں کہ ثبات قسم کے حصول کے بعد اس مخصوص عمل کے خلاف نبی کوئی کام کر ہی نہ سکے، بلکہ وہ پھر بھی اپنے عمل کے سلسلہ میں وہ میں سے ایک صورت خود انتخاب کر سکتا ہے، اس کیفیت کی تشریح کے لیے تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذًا لَّاَذَقۡنٰكَ ضِعۡفَ الۡحَيٰوةِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيۡرًا۝۷۵

"اس موقع پر (مشرکین سے) دوگنا عذاب اس دنیا میں اور دوسرے عالم میں بھی تمہیں چکھائیں گے اور اس موقع پر ہمارے مقابل تم کوئی یار و مددگار نہیں پاؤ گے"۔ (اسراء۔ ۷۵)

ان نکات میں غور و فکر سے واضح ہوا کہ صرف یہی نہیں کہ آیہ مجیدہ کا مقصد عدالت کے بارے میں جو عصمت انبیاء کا جزو لازم ہے

،کوئی تلخ حقیقت نہیں بلکہ یہ کیفیت اپنے مقام پر بہت شریں اور امید آور ہے، جو اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو اس کی اپنی حالت پر نہیں چھوڑ دیتا، لغزش و ہلاکت کے خلاف اس کو ثبات قدم اور استقلال مرحمت فرماتا ہے اور اس کو گناہ کے قریب و نزدیکی سے (حتیٰ کہ اس کے خود آگے بڑھنے سے) بھی محفوظ فرماتا ہے:

درحقیقت ''وَلَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ'' کا جملہ آیہ مبارکہ ''وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ وَرَحۡمَتُهٗ لَهَمَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّضِلُّوۡكَ ؕ'' (نساء۔ ۱۱۳) ہی کے مانند ہے سوائے اس کے کہ آیہ زیر بحث یعنی اول الذکر کا تعلق ہے، اس فرق سے صرف نظر کر کے دیکھا جائے تو طریق بیان اور طرز دلائل کے اعتبار سے دونوں آیات ہی یکساں ہیں۔ آئندہ آنے والی بحث میں ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محفوظ عن الخطا ہونے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس سلسلہ میں کافی وضاحت پیش کریں گے۔

خطا و اشتباہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برّیت

خطا و اشتباہ وغیرہ سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منزہ ہونا، زندگی کے امور سے متعلق ہو یا عمومی افکار و اعمال سے، ان مسائل میں سے ایک ہے جن کے بارے میں کلام میں کافی بحث اور گفتگو کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار اقوال نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ اس معاملہ میں عوام الناس کے اعتماد کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و کردار کو خطا و لغزش و اشتباہ سے محفوظ رکھنے کے لیے عقل و خرد کا مقام لازم اور شرط حتمی ہے۔

تبلیغ دین کے علاوہ دیگر امور میں خطا و اشتباہ کی دو صورتیں تصور میں آتی ہیں:

(ا)۔ فرائض مذہبی کی انجام دہی میں غلطی عام اس سے کہ وہ انفرادی ہو، مثلاً نماز کی رکعات میں اشتباہ؛ یا اجتماعی ہو جیسے کسی بے گناہ شخص کا قتل۔

(ب)۔ روزمرہ زندگی سے متعلق امور میں اشتباہ۔

عوام الناس کے اعتماد کے حصول، جو مقاصد انبیاء کی پیش رفت کے سلسلہ میں ایک اہم ترین عامل کی حیثیت رکھتا ہے، کا تقاضا یہ ہے کہ انبیائے کرام فرائض مذہبی بجالانے میں، عام اس سے کہ وہ فرائض انفرادی سطح پر ہوں یا اجتماعی، ہر قسم کے شک وشبہ سے محفوظ ہوں، کیونکہ اس کیفیت میں اشتباہ آہستہ آہستہ اس بات کا سبب بن جائے گا کہ لوگ ان کی تعلیمات و اقوال کو شک و تردید کی نظروں سے دیکھنے لگیں اور یہ سوچنے لگیں کہ ''جب پیغمبر ادائے فرض میں ہی اشتباہ و خطا کرتے ہوں تو کیا معلوم کہ وہ تعلیمات کے بیان میں شک و اشتباہ سے دوچار نہ ہوتے ہوں؟''۔

یہ اندیشہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ایک پیغمبر کارہائے عمومی اور فرائض روزمرہ میں بھی اشتباہ و غلطی سے محفوظ ہونا چاہیے کیونکہ ان موارد میں اشتباہ لوگوں کے اعتماد کو کم کرتا اور اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ وہ تعلیمات پیغمبر کو کسی اور نظر سے دیکھنے لگیں۔

اس بحث سے کسی طرح کی غلط فہمی پیدا نہ ہو، ہم یہ نہیں کہتے کہ امور زندگی میں شک وشبہ اور فرائض کی ادائیگی اور تعلیمات میں اشتباہ لازم و ملزوم ہیں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے مؤخر الذکر کیفیت یعنی ادائے فرائض و تعلیمات میں شک وشبہ

سے محفوظ ہو لیکن عمومی امور زندگی میں خطا ولغزش سے دوچار ہو۔ ان دونوں کیفیات میں فرق مکمل طور پر صحیح وقائم ہے۔ یہ فرق علماء کے لیے بالکل امکان پذیر ہے لیکن اس جگہ ہمارا روئے سخن دوسرے افراد کی طرف ہے، جو اس قسم کے مسائل میں فرق رکھتے ہوں، اس کے برعکس دونوں طرح کے مسائل میں ان کا عمل یکساں ہوتا ہے کیونکہ روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں شک وتردید یا خطا ولغزش کا وجود پیغمبر سے متعلق دیگر امور میں بھی شک واشتباہ کا موجب بن سکتا ہے۔

خداوند عالم مقاصد بعثت میں پیش رفت کی خاطر لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے انبیاء کامل طور پر معصومیت واستقامت سے مزین ہوں، تا کہ معلم وحی کے حضور عوام الناس کے سو فیصد اعتماد کا سبب بنیں اور اس طرح بعثت کے ہدف ومقصد کو ج، جو لوگوں کی تربیت اور رجان دین پر مشتمل ہے عملی جامہ پہنائیں، اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام ایک روایت میں ارشاد فرماتے ہیں:

"رُوحُ الْقُدُسِ تَحْمِلُ النُّبُوَّةَ وَرُوحُ الْقُدُسِ لَا يَنَامُ وَلَا يَغْفُلُ وَلَا يَلْهُوْ وَلَا يَسْهُوْ"

''روح القدس حامل نبوت ہے، وہ نہ سوتا ہے، نہ غفلت کرتا ہے اور نہ ہی شک وشبہ میں مبتلا ہوتا ہے''۔[1]

یہاں تک ہم انبیاء کے لیے خطا وسہو کے بارے میں فیصلہ عقل وخرد سے واقف ہوئے، اب ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں ہم منطق قرآن مجید سے بھی واقفیت حاصل کریں، فطری طور پر دونوں کی منطق یکساں ہونا لازم ہے اور دونوں کے درمیان کسی قسم کا چھوٹے سے چھوٹا اختلاف بھی موجود نہیں رکھتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لیے خطا ونسیان کے بارے میں منطق قرآن مجید

مندرجہ ذیل آیہ مجیدہ سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے محفوظ عن الخطا ونسیان ہونے کے سلسلہ میں استفادہ کی جا سکتا ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴿۱۱۳﴾

''اگر اللہ تعالیٰ کا کرم ورحمت آپ کے شامل حال نہ ہوتا تو ان (مشرکین) کی ایک جماعت ارادہ کر لیتی کہ آپ کو گمراہ کر دیں حالانکہ وہ سوائے خود اپنے کسی اور گمراہ نہیں کرتے اور وہ ہرگز (اس صورت

---

[1] نصایر الدرجات، ص ۴۳۱

کے سایہ ہیں) آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ آپ کو سکھا دیا ہے جو آپ نہیں جانتے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہے''۔ (نساء۔ ۱۱۳)

مفسرین نے اس آیہ مبارکہ کی شان نزول میں کافی اختلاف کیا ہے، ان اختلافات کا بیان طوالت بحث کا باعث ہوگا، ہم ان میں سے صرف ایک شان نزول کا بطور نمونہ ذکر کرتے ہیں:

پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی کی زرہ چوری ہوگئی، اس نے قبیلہ ''بنی ابیرق'' کے ایک شخص پر شک کیا، چور نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس زرہ کو ایک یہودی کے گھر میں پھینک دیا۔ پھر اس نے اپنے قبیلہ والوں سے خواہش کی کہ آنحضرتؐ کے حضور اس کی پاکیزگی اور صفائی کی گواہی دیں اور یہودی کے گھر میں زرہ کی موجودگی اس کی برأت کی شہادت دیں۔ اس طریقہ سے چور تو بری ہوگیا لیکن چوری کا الزام یہودی پر لگ گیا، خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو اصل واقعہ سے آگاہ فرمایا اور متذکرہ آیہ مبارکہ ایک اور آیت کے ساتھ جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے، نازل ہوئی۔

یہ شان نزول صحیح ہو یا نہ ہو، تمام شان نزول سے جو اس واقعہ کے سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں، یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (معاذ اللہ) از روئے خطا، خلاف واقع فیصلہ کردیا اور ایک جماعت واضح طور پر چاہتی تھی کہ آنحضرتؐ کو فریب دے کہ مقدمہ کے ظاہری حالات کو آنحضرتؐ کے خلاف استعمال کریں تاکہ آپ حقیقت کے برعکس مقدمہ کا فیصلہ کریں، لیکن خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو غلطی اور شک وشبہ سے محفوظ ومنزہ رکھا۔ یہ اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حقیقت کے بے نقاب فرمایا اور جس بات کا آنحضرتؐ کو علم نہ تھا، وہ آپ کو بتلادی، اس طرح اللہ کا آنحضرتؐ پر بہت بڑا کرم ہوا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ زیر بحث آیات مجیدہ کس طرح آنحضرتؐ کے محفوظ عن الخطا ہونے کی شاہد ہیں۔ آیہ زیر بحث میں تین جملوں پر توجہ کرنا لازم آتا ہے:

(ا)۔ ''وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ''؛

(ب)۔ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ''

(ج)۔ ''وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا''

جملہ اول آنحضرتؐ کی قوت فیصلہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعلق کتاب وسنت (حکمت) سے ہے، تشریع کے ان دو وسیع منابع سے واقفیت احکام الٰہی میں دسترس کامل کا سبب ہے، جس کا نتیجہ ایک نبی احکام الٰہی کے بیان میں کسی قسم کے شک وشبہ اور لغزش سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے ہے کہ انسان کو قیامت تک جن چیزوں کی احتیاج ممکن ہے، ان دونوں منابع حکمت میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ قوانین کلیہ کا علم موضوعات اور جزئیات میں، نیز یہ الفاظ دیگر اصطلاحی طور پر مختلف موارد میں ان کلیات کے اطلاق کی قابلیت اشتباہ سے محفوظ رہنے کا سبب نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ اشتباہ سے مکمل بچاؤ کے لیے کسی اور چیز کی احتیاج بھی لازم ہے۔

یاد رکھیں کہ آیہ مبارکہ کے بیان کردہ شان نزول کے مطابق جس موقع پر پیغمبر اکرمؐ واقعہ کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں اور جہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو لغزش قرار دیا ہے۔ آنحضرتؐ تمام احکام الٰہی سے کلی طور پر آگاہ تھے اس کے باوجود کلیات کا علم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لغزش سے محفوظ رہنے کا سبب نہیں بلکہ یہ علم ایک اضافی امر کے ساتھ مل کر آپ کے محفوظ عن الخطا ہونے کا موجب بنا، یہ مندر بالا جملہ (ب) میں وارد ہو رہا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

"وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ"

یعنی "جو چیز تم نہیں جانتے تھے، تمہیں اس نے سکھلائی"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا علم ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے تھے اور جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو عطا فرمایا؛ کیا یہ علم اللہ تعالیٰ کے احکام کلی پر محیط ہے جو کتاب وسنت میں موجود ہیں یا اس سے واقعیات خصوصیت، وقائع اور اجرائے احکام کا علم مراد ہے؟ کوئی شک نہیں کہ احتمال اول بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ احکام کلیات کے علم کے بارے میں گزشتہ جملہ میں وضاحت ہو چکی ہے جس کی تکرار و تاکید کی ضرورت نہیں، کسی شخص کو ایسا کوئی اشتباہ نہیں کہ پیغمبر خدا خود اپنی شریعت کے احکام سے ناواقف تھے، جس کی وجہ سے تاکید مزید کی ضرورت سمجھی جاتی۔

لہٰذا درحقیقت اس جملہ سے مراد وہ احتمال ہی ہے یعنی واقعیات کے چہرہ سے پردہ اٹھا دیا اور اسے آنحضرتؐ کو لغزش پر مائل کرنے کی سازش کا اجراء اور ایک بے گناہ پر تہمت لگانا قرار دیا، یہ وہی چیز ہے جو ایک اور روایت میں، جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی، جملہ "بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ" میں بیان ہو رہی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾ (نساء)

اس آیہ مبارکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کرنے کے لیے دو اصول بیان ہوئے ہیں:

۱)۔ "اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتَابَ" یعنی "ہم نے تم پر کتاب نازل فرمائی"۔

۲)۔ "بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ" یعنی "اس کے سبب سے جو آپ کو دکھایا گیا ہے"۔ یہاں عرب "باء" کلمہ بما سبیت کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے کتاب نازل فرمائی اس کتاب کے سایہ میں ان حقائق کی موجودگی میں، جو اللہ نے آپ کو دکھلائے ہیں، آپ صحیح فیصلہ کریں اور اس میں کبھی لغزش نہ کریں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم کتاب وسنت کے علاوہ ایک خاص علم وآگہی سے بھی مزین تھے جس کو گزشتہ دو آیات شریفہ میں کبھی "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" کے جملہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی "بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ" کے جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حفاظت عن الخطا کی یہ کیفیت کسی خاص موقع یا بالخصوص صرف قوت فیصلہ سے متعلق ہے، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر دیگر مواقع میں دروازۂ اشتباہ کھلا ہے، خداوند عالم زیر بحث آیہ مبارکہ میں ایک تیسرا جملہ اس طرح شامل کرتا ہے:

''وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا'' یعنی ''اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم آپ پر بہت ہی زیادہ ہے''۔

جہاں پروردگار علام کسی شے کو بزرگ شمار فرمائے، وہاں اصولی طور پر، ہمیں ان چیزوں کو الگ ماننا چاہیے جنہیں ہم بزرگ قرار دیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اس بات کی علامت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تمام عرصہ حیات میں قضاء وفیصلہ جات، معاشرت اور میل جول میں ہر قسم کی لغزش و غلطی سے محفوظ ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اس مصلحت کی بناء پر جو امر رسالت میں پوشیدہ ہے نیز اس اعتبار سے کہ ایک نبی امت کے لیے اسوہ نمونہ و قابل تقلید ہستی ہوتا ہے۔ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے عرصہ حیات میں ایسے کردار کا حامل ہو کہ اس کی امت اس کے بارے میں کسی طرح کے اشتباہ و لغزش کا احتمال نہ رکھے، تاکہ امت اس کے کردار و گفتار کی اطاعت میں کسی قسم کی پریشانی وذو معنویت سے دوچار نہ ہو۔

مخالفین عصمت کے دلائل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم عن الانحراف و گناہ یا محفوظ عن الخطا ہونے کے بارے میں ایک سلسلہ آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور اپنے دلائل سے سادہ لوح اذہان کو عصمت انبیاء کے متعلق پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ ان مطالب کی تکمیل کے لیے ان کے جملہ کو زیر بحث و تحقیق لانا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے ہم آیات قرآن مجید کو مورد بحث قرار دیں گے اور اس کے بعد چند ایک روایات کی وضاحت کریں گے۔

۱)۔ اگر آپ ان (مشرکین) کی ہوا وہوس (خواہشات) کی پیروی کریں۔۔۔۔

خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک جملہ شرطیہ میں خطاب فرماتا ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور اگر علم وآگہی حاصل نہ ہونے کے بعد آپ ان (اہل کتاب) کی ہوا وہوس کی پیروی کریں گے تو آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی حامی و یاور نہ ہوگا''۔ (بقرہ۔ ۱۲۰)

اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۴۵ میں یہی مضمون ایک بار پھر آیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ''مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ'' کے جملہ کی بجائے ''اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ'' کا جملہ آیا ہے۔ علی ہذا القیاس سورۂ ''رعد'' کی آیت ۳۷ کے بغیر کمی وبیشی کے آیہ اول کے مطابق سوائے اس کے کہ اس میں ''وَلَا نَصِیۡرًا'' کے بجائے کلمہ ''وَلَا وَاقٍ'' وارد ہوا ہے۔

یہ آیات مبارکہ اوران کی مشابہ آیات مجیدہ جن کا ہم ابھی ذکر کریں گے ایک شائبہ بھی نفی عصمت کے بارے میں ظاہر نہیں کرتیں کیونکہ یہ سب آیات جملہ شرطیہ کے طور پر وارد ہوئی ہیں اور اس قسم کے جملہ ہائے شرطیہ کبھی بھی تحقق شرط (ہوا وہوس کی پیروی) پر شاہد نہیں ہوتے بلکہ متعلقہ شخص کی مکمل پاکیزگی ثابت کرنے میں بھی معاون ہوتے ہیں۔

اس قسم کی گفتگو جو جملہ ہائے شرطیہ پر مشتمل ہو کبھی اس بات پر شاہد نہیں ہوتی کہ کبھی نہ کبھی یہ شرائط طرفین پر پوری اتریں گی، خداوند عالم اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

''اگر ہم چاہیں کہ جو کچھ آپ پر وحی کی ہے آپ سے واپس لے لیں تو آپ ہرگز اپنی طرف سے کوئی بچانے والا نہیں پائیں گے''۔(اسراء۔۸۲)،

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

''(اگر ہم ایسا نہ کریں) تو یہ آپ پر اور آپ کے پیروان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہے اور آپ پر تو اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل وکرم ہے۔(اسراء۔۸۷)

یہاں بھی خداوند عالم اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وحی کو چھین لینے اور اپنے مشیت کو جملہ شرطیہ میں ارشاد فرما رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی مشیت پر کبھی عملدر آمد نہیں ہوگا بلکہ خداوند عالم اپنے پیغمبر اکرمؐ کے وسیلہ سے اپنی شریعت کی تکمیل فرمائے گا۔

اس قسم کی آیات جن میں خداوند عالم اپنے پیغمبر جکو جملہ ہائے شرطیہ کی صورت میں تہدید وتوبیخ کرتا ہے متذکرہ بالا آیات سے بہت زیادہ ہیں، ہم یہاں دو اور آیات کا ذکر یں گے جن میں اسی قسم کے نکات کا ذکر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۵﴾

''اور ہم نے آپ پر اوران پر جو آپ سے پہلے تھے، وحی فرمائی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اچھے اعمال حبط ہو جائیں گے اور تم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے''۔(زمر۔۶۵)

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ﴿۴۷﴾

''اگر وہ ہماری طرف جھوٹ کی نسبت دے تو ہم پوری قوت کے ساتھ اس کی گرفت کریں گے پھر اس کی رگ حیات کاٹ دیں گے اور تم میں کوئی ہمیں اس بات سے منع نہیں کرے گا''۔ (حاقہ۔ ۴۴ تا ۴۷)

یہ تمام تنبیہات اور باتیں جو ''اگر'' کے ساتھ وارد ہو رہی ہیں تحقق طرفین کی دلیل نہیں ہوسکتیں جب تک کہ مسئلہ عصمت کی نفی کی حامل نہ ہوں۔ صرف ایک سوال جو یہاں باقی رہ جاتا ہے کہ اس قسم کے احکام شرطیہ جو کبھی عمل پذیر نہیں ہوتے، مقصد کیا تھا، اس بارے میں بہت سے مختلف نکات سے صرف دو نکات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

(ا)۔ یہ باتیں انبیاء کے ایسے طبائع انسانی کی ناظر ہیں جو ان کے لیے گناہ و انحراف کو بالکل ممکن بناتی ہیں، یعنی انبیاء علیہم السلام انسانی و بشری طبائع کے مالک نہیں ہوتے جن کی مدد سے ارتکاب لغزش اور سرزنش کے سزاوار ہیں۔ اگر عنایت الٰہی (عصمت) ان کے شامل حال نہ ہوتو ارتکاب گناہ ان سے بھی مکمل طور ممکن ہوگا۔ یہ صرف عنایت پروردگار ہی ہے کہ عطائے عصمت کی وجہ سے صدور گناہ ان حضرات کے لیے ''محال عادی'' کا مقام رکھتا ہے اور انہیں پاکیزگی و طہارت بخشتا ہے۔

آیات مبارکہ کا یہ حصہ انبیائے کرام کے جذبہ بشری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس حیثیت میں ان کا معصوم اور محفوظ عن الخطا ہونا ظاہر نہیں ہوتا، نیز اگر انبیاء علیہم السلام معصوم اور محفوظ عن الخطا وعصیان میں تو ایسا ان کی شخصیت کے دوسرے نصف حصہ کی وجہ سے ہے۔ جو ہمیشہ انہیں وجود پروردگار کے سامنے رکھتا ہے اور جس کی وجہ سے ان پر دروازہ انحراف کبھی نہیں رکھتا۔

(ب)۔ یہ تمام آیات مبارکہ تربیتی پہلو رکھتی ہیں اور ان کا مقصد دوسرے لوگوں کو تعلیم دینا ہے۔ یہ تعلیم پیغمبر اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے دی جارہی ہے۔ اس قسم کے خطابات تیز و تند نہ صرف یہ کہ جہالت کے تعصب و عناد و بے عقلی کی تحریک نہیں کرتے بلکہ جہلاء میں اس قسم کی تعلیمات کے قبول کرنے کی تحریک اور شوق پیدا کرتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جہاں بالخصوص اللہ کا نبی اپنی عظمت و بزرگی کے باوجود گناہ و انحراف کی صورت میں سرزنش اور اس کے نتائج کا مورد ٹھہر سکتا ہے تو ان جاہل لوگوں کا مقام تو اس سلسلہ میں بالکل واضح ہوجاتا ہے۔

تربیت صحیح کے طریقوں میں سے ایک دوسروں کے بارے میں گفتگو کو سمجھانا ہے، ایسے موقع پر عربی زبان میں کہتے ہیں: ''ایا اعنی واسمعی یا جارة''، یعنی ''میری مراد تم سے ہے اور اے پڑوسن تو بھی سنتی رہ''۔

جو لوگ اس نوعیت کے خطابات کو اپنے ٹیڑھے اور غلط فکر کے لیے سند قرار دیتے ہیں وہ قرآن مجید سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں اور صحیح اصول تربیت سے بھی بالکل ناواقف ہیں۔ اس اصول کے تحت ایسے لوگوں کا آنحضرتؐ کی عصمت کے متعلق ہر طرح کا غلط تصور مکمل طور پر شکست کھا جاتا ہے۔

اس اصول پر غور کرنے سے ان بہت سی آیات کا مقصد جن کو عصمت انبیاء کے منکر بطور سند استعمال کرتے ہیں واضح ہوجاتا ہے

۔اپنے مطالب کی تکمیل کے لیے ہم بعض آیات کو پیش کرتے ہیں:

۱)۔مسلمان ایک مدت تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔اس کے بعد مصلحت کے تحت حکم ہوا کہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔اس موقع پر تحویل قبلہ کے سلسلہ میں یہودیوں اور منافقین کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا کہ قرآن مجید اور احادیث جس کی تفصیل بتلاتے ہیں،قرآن مجید پورے وثوق کے ساتھ ان لوگوں کے جاہلانہ اعتراضات کا پوری علت و اسباب کے ساتھ جواب دیتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴿۱۴۷﴾

''حق تو آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے،پس کسی طرح کے شک کو اپنے دل میں نہ آنے دیں''۔(بقرہ۔۱۴۷)

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کو قطعی باطل قرار دیتا ہے اور حضرت مریم باکرہ سے ان کی ولادت کو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے خلقت کی مانند جانتا ہے۔ان دونوں میں کوئی بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا ہونے کی نسبت نہیں دیتا۔اس موقع پر خداوند عالم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴿۶۰﴾

''اللہ تعالیٰ کا فرمان حق ہے آپ اس بارے میں ہرگز اپنے دل میں شک و تردید کو راہ نہ دیں''۔(آل عمران۔۶۰)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہان غیب کے لیے صورت شہود میں بظاہر ہوا،جنہوں نے فرشتہ وحی کو دیکھا اور اس بات سنی،آیات پروردگار کا شب معراج مشاہدہ فرمایا،ہرگز شک و تردید کو اپنا طرف نہیں آنے دیتے۔ان آیات سے مراد دوسروں کو یاد دہانی کرانا ہے کہ وہ دوسروں کی فضول باتوں سے دھوکہ نہ کھائیں اور اپنے آپ کو شک میں مبتلا نہ کریں۔

۲)۔خداوند عالم اس شخص سے متعلق فیصلہ کے مسئلہ جس کی تفصیل خطا و لغزش سے عصمت رسول اکرمؐ کے دلائل میں گزر چکی ہے،اپنے نبی سے اس طرح خطاب فرماتا ہے:

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا﴿۱۰۷﴾

''جن لوگوں نے خود اپنے آپ کو خیانت کی،ان کا دفاع نہ کریں،خداوند تعالیٰ اس خیانت کرنے والوں اور گناہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا''۔(نساء۔۱۰۷)

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾

''ہم نے حق کے ساتھ آپ کی طرف کتاب نازل فرمائی تا کہ لوگوں کے درمیان آپ اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جو آپ کے پروردگار نے آپ کو دکھائی ہے آپ ہرگز خیانت کرنے والوں کے حامی نہ بنیں''۔(نساء۔۱۰۵)

اس قسم کے خطابات ایسی جماعتوں کی ہدایت کے لیے ہیں جو صاف گوئی کر برداشت نہیں کرتے، ان کا عندیہ یہ ہوتا ہے کہ تنقید اچھی چیز ہے لیکن دوسرے لوگوں پر۔لہٰذا اس قسم کے لوگوں کے ساتھ گفتگو کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں پر رکھ کر بات کی جائے۔ایسی بات خواہ کتنی تلخ اور زہریلی ہو، چونکہ دوسروں کے لیے ہوگی اس لیے اس کا ردعمل تیزی وتندی کی صورت میں نہیں ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چوری شدہ زرہ کے مسئلہ میں حالات ظاہری کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور تھے۔آنحضرتؐ نے اس میں نہ تو خائن کا دفاع فرمایا تھا اور نہ ہی اس کے طرفدار تھے۔ یہ بات قضایت کے اصول وضوابط سے ہے جو بعض اوقات واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتی اور نتیجۃً حق پامال ہو جاتا ہے۔پس اللہ تعالیٰ نے فوراً پیغمبر اکرمؐ کو اجرائے واقعہ کی خبر دی اور فرمایا ''بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ'' اس طرح آنحضرتؐ سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی۔لیکن ایک جماعت کی سزا کی خاطر، جنہوں نے جان بوجھ کر ایک خائن کے حق میں گواہی دی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ سے خطاب فرماتا ہے تا کہ وہ اپنے معاملہ کو سمجھ لیں۔

۳)۔خداوند عالم سورۂ اسراء میں حکیمانہ فرامین صادر فرماتا ہے جن کا ہم نے ''منشور جاوید'' کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے، یہ فرامین ایک ہی موضوع سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر ختم ہوتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ۞ ﴿۲۲﴾

''خدا کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دیں کہ اس سے آپ مذموم و بے مددگار ہو جائیں گے''۔(اسراء ۔۲۲)

اس منشور کے آخر میں فرماتا ہے:

وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰى فِىۡ جَهَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾

''خدا کے ساتھ دوسرا خدا قرار نہ دیں کہ لئیم اور راندۂ درگار ہو کر جہنم میں جا گریں''۔(اسراء۔۳۹)

اس قسم کے تمام خطابات اور فرامین کی تفصیل ایک ہی ہے اور سب کے سب ایک یا دو موقع کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱)۔ ہر قسم کی خلاف ورزی اور گناہ کا صدور ایک فرد معصوم سے بحیثیت انسان بالکل ممکن ومتوقع ہوتا ہے۔اس طرح کے خطابات اس خصوصیت

ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس حقیقت سے نہیں کہ وہ معصوم ہے اور گناہ سے منزہ ہے۔
۲)۔ یہ ظاہر مخاطب پیغمبر اکرمؐ ہیں لیکن مخاطب واقعی افراد امت ہیں اور یہ طرز سخن دنیا کی تمام امتوں میں رائج ہے۔
ان دونوں بیانات پر توجہ دینے اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ جو ان آیات مبارکہ کے ذیل میں ان صفحات میں پیش کر دی گئی ہیں ،مزید آیات کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۲)۔طلب معفرت کا مقصد کیا ہے؟

قرآن مجید کسی موقعوں پر رسول اکرم ﷺ کو ہدایت فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور طلب مغفرت کریں، بعض موقعوں پر تو اس پر لفظ ''ذنب'' کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾

''اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔(نساء۔۱۰۶)

وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

''اور اپنے گناہ کے لیے طلب مغفرت کریں اور صبح وعصر کے وقت اپنے رب کی حمد کے ساتھ تنزیہہ کریں''۔(مؤمن۔۵۵)

پھر سورۂ محمد (ﷺ) میں حکم فرماتا ہے کہ خود اپنے اور باایمان افراد کے لیے بخشش طلب کریں، ارشاد ہوتا ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾

''پس جان لیں کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں اور اپنے اور باایمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کے لیے طلب مغفرت کریں، اللہ تعالیٰ تمہارے افعال وحرکات وسکنات سے واقف ہے''۔(محمدؐ۔۱۹)

سورۂ نصر میں فرماتا ہے:

وَاسْتَغْفِرْهُ ؔؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

''اور اس (اللہ تعالیٰ) سے طلب مغفرت کریں بے شک وہ توبہ قبول فرماتا ہے''۔(نصر۔۳)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عصمت کے مقابلہ میں طلب مغفرت کا حکم کس طرح موافقت رکھتا ہے؟

جواب:

ان آیات کے مقصودات سے واقفیت، اس کے ساتھ ہی انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داریوں کے احساس، نیز یہ کہ بزرگ شخصیات کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہوتی ہیں، ان سب امور کے تحت ممکن ہے کہ بعض اوقات کوئی عمل عقل وخرد کے اعتبار سے کسی ماحول میں جرم و گناہ شمار ہوتا ہو جب کہ ممکن ہے وہی عمل کسی اور ماحول میں اس کیفیت کا حامل نہ ہو، یہ بات بالکل ممکن ہو سکتی ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف واجبات ومحرمات میں منحصر نہیں ہوتے، واجبات کے ساتھ مستحبات اور محرمات کے ساتھ مکروہات بھی ہوتے ہیں۔ واجب شرعی کا بجالانا لازم ہے۔ اس کا ترک موجب مواخذہ ہے اور اس پر عذاب وعتاب لازم آتا ہے۔ اسی طرح حرام شرعی کا ترک ضروری ہے اور اس پر عمل موجب عذاب ہے۔

جہاں تک مستحبات ومکروہات کا تعلق ہے باوجود یہ کہ ان کے ترک یا انجام دینے میں سزا ومواخذ کی وکوئی صورت نہیں، تاہم بعض اوقات حالات ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ عقل وخرد کے اعتبار سے وہ فرض لازم قرار پاتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عمل مستحب واجب ہو جائے اور فعل مکروہ شرعی طور پر حرام قرار پائے، کیونکہ خداوند تعالیٰ کے احکام وحدود ہر گز تبدیل نہیں ہوتے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ عقل وخرد ان حالات کی موجودگی میں منتخب عمل کی انجام دہی اور ترک مکروہ کو لازم وضروری قرار دیتے ہیں، اور اپنی فہم کے اعتبار سے انہیں ایک طرح واجب شمار کرتے ہیں، پھر اگر کوئی شخص ان حالات میں ندائے عقل پر کان نہ دھرے تو شرعی اصطلاح میں اسے ''ترک اولیٰ'' اور عقل کے اعتبار سے وہ ذنب و گناہ کہا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ مستحبات کا بجالانا اور مکروہات کا ترک کرنا عمل وکردار کے حسن وزیبائش کا درجہ رکھتا ہے اور ان کی مخالفت میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا، تاہم عقل بعض سلسلہ حالات کے پیش نظر امر وفرمان دینے والے کے مقام سے بہتر آگاہی وواقفیت ہوتے ہوئے عظیم تر ذمہ داریوں کے حامل افراد کی انجام دہی اور محرمات کے ترک کرنے کو لازم شمار کرتی ہے جب کہ ان دونوں کیفیات کے خلاف عمل کو ایسے حضرات معذرت اور طلب مغفرت کے لائق جانتے ہیں۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لیے کہ بسا اوقات ایک ماحول اور خاص حالات میں کوئی کام اچھا یا برا یا کم از کم بے عیب سمجھا جاتا ہے، جبکہ وہی کام مختلف حالات میں عیب اور قابل مذمت قرار پاتا ہے، ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

(ا)۔ کسی صحراء میں رہنے والے شخص کی زندگی کا ملاحظہ کریں جو آداب معاشرت میں صرف اہم وضروری اقدار سے ہی واقف ہے، ایسا شخص تمدن اور آبادی کی اکثریت سے دور رہنے کی وجہ سے آداب واقدار انسانی سے ناواقف رہ جاتا ہے۔ تہذیب وتمدن سے اس دوری کے باعث ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اقدار انسانی کی مکمل طور پر پابندی کرے۔ اس کے برعکس ایک شہر میں رہنے والے انسان کا جو آبادی کی گنجانی میں پلا بڑھا ہو، معاملہ مختلف ہوگا۔ اگر یہ شخص اپنے کردار وگفتار میں اقدار اخلاق کا لحاظ نہ کرے تو یقینا اس کی سرزنش کی جائے گی اور اسے مذمت وملامت کے قابل سمجھا جائے گا۔

علیٰ ہذا القیاس شہر کے ایک تعلیم یافتہ شخص کے ساتھ جو توقعات وابستہ ہوں وہ عام افراد سے نہیں ہوں گی، یہی کیفیت فرق چھوٹے

شہروں کے باشندوں کے باشندگان اور مقامات مرکزی یعنی بڑے شہروں کے ساکنان کے درمیان ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو کام عوام الناس انجام دیتے ہیں وہی اگر عوام سے مافوق و برتر انسان کریں تو وہ ان کی حیثیت کے لیے قبیح وزشت شمار ہوگا۔ لہٰذا انتظامیہ کے ماحول میں ایک لمحہ کی تاخیر، ایک سخت بات، ایک حرکت بیجا دائیں بائیں ایک نگاہ غیر محسوس، جرم گناہ شمار ہوگی، اس لیے انتظامیہ کے نظم وضبط کا تقاضا ہے کہ ایسی ذمہ داریوں اور اقدار سے شخص کماحقہ بطور پر ان پر عمل بجالائے۔

یہ وجہ ہے کہ جس کا مقام حسب قدر بلند ہوگا اور جس قدر اس کی ذمہ داریاں زیادہ وہوں گی، اسی قدر اس کے فرائض بلند تر اور اس کے خلاف الزامات کی نوعیت شدید تر ہوگی۔

(ب)۔ ایک عاشق دل بستہ کی کیفیت کا تصور کریں جو اپنے وجود کے ذرہ ذرہ سے اپنے محبوب سے وابستہ ہوتا ہو، ایسے شخص کی اپنے محبوب سے غفلت، خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ کسی وقت اس کی ضروری کاموں میں مصروفیت ہی اس غفلت کی وجہ بن جائے، تو یہ بات اس کے لیے جرم و گناہ شمار ہوگی کیونکہ کیفیت عشق استمرار توجہ کی متقاضی ہے جب کہ اس میں غفلت یا کسی اور کی طرف توجہ نہایت عشق میں کمی شمار ہوگی، اگر وہ عاشق ایسے عمل کا مرتکب ہوگا تلافی کے طور پر اس کے لیے راہ توبہ وندامت اختیار کرنا لازم آئے گا۔

لہٰذا کھانے پینے سے متعلق ضروری اشغال میں مصروفیت، ہر چند کے وہ ذاتی طور پر لازم اشکال سے مبرا ہو، جب محبوب سے علیحدگی اور اس کے غیر سے مصروفیت کا باعث بنیں گے تو وہ زبان عشق میں عصیان و گناہ شمار کیے جائیں گے! یہی وجہ ہے کہ خوگر عشق یا مصیبت زدہ لوگ اکل وشرب سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں اور اس قدر ان ضروریات کی بجا آوری پر اکتفا کرتے ہیں جو صرف زندہ رہنے کے لیے کافی ہو۔

ان دو مثالوں کے پیش نظر ''استغفار'' کا مقصد واضح ہوجاتا ہے اور مصداق ''ذنب'' جس کے معنی گناہ ہیں، کی حدود سمجھ میں آجاتی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ آیات عصمت کے تقاضوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے قوانین کی ہر قسم کی مخالفت سے مصئون ومحفوظ ہیں، آنحضرتؐ نہ تو کبھی واجبات کو ترک کرتے اور نہ ہی کبھی فعل حرام کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن آپ کے عرفانی واخلاقی فرائض منصبی صرف ان دو مطالب، یعنی واجبات پر عمل اور محرمات کے ترک، ہی کی بجا آوری میں ختم نہیں ہوتے۔ آپ کا مقام ربوبیت کا عرفان اور اس مقام کی معرفت کا تناسب تقاضا کرتے ہیں کہ آپ کے وجود میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس مقام سے علیحدگی کا تصور پیدا نہ ہو، آپ شائستہ تر مقام کو مقام شائستہ پر ترجیح دیں اور آپ مقام ربوبیت کے آداب واقدار کو ملاً بجالائیں۔ اگر کبھی ایسا ہوجائے کہ آپ عناصر بشری کے تقاضوں کے پیش نظر کسی موقع پر ان فرائض عرفانی سے موافقت نہ کر پائیں، شائستہ کو شائستہ تر پر مقدم سمجھ بیٹھیں، ایک لمحہ کے لیے بھی مقام ربوبیت سے الگ ہو کر کسی قسم کے تخلف کا تصور کریں تو منطق عرفان میں ایسا ایک شائبہ بھی جرم و گناہ کے طور پر محسوب ہوگا جس کے لیے استغفار وندامت لازم ہوگی، اگرچہ یہ عمل شرع کی منطق میں کتاب وسنت کے میزان میں جرم و گناہ نہ بھی قرار دیا جاسکتا ہو۔

اگرچہ ان آیات مبارکہ سے بعض کی شان نزول یا وہ قرائن جو ان کے نزول کے وقت وجود رکھتے تھے، دقت ومشکل کا باعث قرار پائیں، پھر بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں استغفار کی ضرورت کسی ایسی بات میں پیش آئے گی جس کا ایک نبی کے فوق العادہ عرفان و معرفت تقاضا کرتے ہوں، جس کے تحت ایک نبی ایسے کام کو ایسی صورت میں انجام دیتا ہو جو عمومی صورت سے مختلف ہو، یہی وہ چیز ہے جس کو

مفسرین کرام کی اصطلاح میں ''ترک اولیٰ'' کہا جاتا ہے۔

ان حالات میں اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان آیات مبارکہ کے مطابق طلب مغفرت پر مامور ہونے یا دیگر انبیائے کرام نے اپنے اپنے مقام پر طلب مغفرت کی اور حضرات نوح و ابراہیم و موسیٰ علیہ السلام جب کے سب نے لفظ ''اغفر'' کہا، تو وہ سب مواقع یہی معنی رکھتے ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام عرض کرتے ہیں:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا

''پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو بخش دے اور اس مؤمن کو بھی جو میرے گھر میں داخل ہو''۔(نوح۔۲۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کرتے ہیں :

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

''بارالہا! مجھے میرے والدین اور مؤمنین کو بخش دے جس دن حساب برپا ہوگا''۔(ابرہیم۔۴۱)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں: ''خداوندا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما''۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرض کرتے ہیں:

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

''ہم نے سنا اور اطاعت کی، خداوندا! ہم تیرے غفران کے خواہاں ہیں اور تیری ہی طرف ہماری باز گشت ہے''۔(بقرہ۔۲۸۵)

یہ جملہ درخواست ہائے مغفرت اسی نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کا بیان سطور بالا میں ہو چکا ہے۔ کوئی انسان اپنے کردار و ریاضت وسعی کے اعتبار سے جس قدر رضائے پرورگار کے حصول میں استوار اور بلند درجہ ہوگا تو میدان عمل میں اپنے افعال کو اس مقام کی مناسبت سے انجام دے گا، پھر بھی وہ اپنے عمل کو مقام ربوبیت کے قابل نہ جانتے ہوئے اپنے قصور و کوتاہی کا معترف ہوگا اور ہمیشہ کہتا رہے گا:

''مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ''

مسلم اپنی صحیح میں ''مزنی'' نامی ایک شخص سے روایت کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِی الْیَوْمِ مِاَۃَ مَرَّۃٍ" [1]

''میرے قلب پر پردوں کا ہجوم ہوتا ہے اور میں ہر روز سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں''۔

مفسرین حدیث نے اس کی توضیح میں متعدد لطائف کا ذکر کیا ہے جو واقعی خوبصورت وزیبا ہے [2]۔ صحیح مسلم کے مطابق روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ فَاِنِّیْ اَتُوْبُ اللّٰہِ مِاَۃَ مَرَّۃٍ"

''اے لوگو! اللہ کی طرف رجوع کرو اور میں تو ہر روز سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں''۔

ہم نے سابق کتاب ''پرسشها و پاسخها'' میں اس مطلب کو کسی حد تک واضح کیا ہے اور بعض سوالات کے جواب پیش کیے ہیں ، ہم ان مطالب کی وضاحت کے لیے یہاں ایک حد تک اس میں سے نقل کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا استغفار عصمت کے منافی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے جملہ آئمہ علیہم السلام گناہ سے معصوم ہیں اور ان سے کبھی کسی قسم کا گناہ صادر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود بعض دعاؤں میں ان حضرات سے ہم تک پہنچی ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے بظاہر اپنے گناہ کا اقرار فرمایا ہے، اور پروردگار عالم سے اپنے گناہوں کی بخشش کے خواستگار ہوئے ہیں، مثلاً مشہور ومعروف دعائے کمیل میں حضرت علی علیہ السلام بارگاہ پروردگار میں عرض کرتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تَھْتِكُ الْعِصَمُ ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیَ الذُّنُوْبَ الَّتِیْ تَحْبِسُ الدُّعَآءَ ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیَ کُلَّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُہٗ وَکُلَّ خَطِیْئَۃٍ اَخْطَأْتُھَا"

یعنی ''خداوندا! میرے وہ گناہ بخش دے جو ناموس میں بٹہ لگاتے ہیں ۔۔۔ پروردگار! میرے وہ سب گناہ بخش دے جو دعاؤں کو درجہ قبولیت تک پہنچنے سے روکتے ہیں ۔۔۔ بارالہا! میرے ان سب گناہوں کو بخش دے جو میں نے کیے ہوں اور اس گناہ کو بھی بخش دے جو مجھ سے سرزد ہو گیا ہو''۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان دعاؤں سے معصومین علیہم السلام کی مراد صرف لوگوں کو سکھلانا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے طرز تکلم اور طلب بخشش کا

---

[1] صحیح مسلم، ج۸، ص ۷۲، باب استحباب الاستغفار ولاستکثار منه لفظ لغان، صیغہ مجہول، از مادہ ''غین'' جس کے معنی ستر، پردہ اور بادل ہیں۔

[2] شفائے قاضی، کی طرف رجوع فرمائیں۔

طریقہ سیکھ لیں یا اس قسم کی دعاؤں میں کوئی اور مصلحت پوشیدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علماء و دانشمندان اسلام عرصہ دراز سے اس اعتراض کی طرف متوجہ تھے اور انہوں نے اس کے مختلف جوابات پیش کیے ہیں، ایسا نہیں کہ یہ گناہان مطلقہ و عامہ سمجھے جائیں، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ تمام اجتماعی، اخلاقی، علمی، تربیتی، اور دینی امور میں مختلف افراد سے مختلف قسم کی توقعات ہوتی ہیں جو یکساں نہیں ہوتیں۔ اس مقصد کی وضاحت کے لیے سینکڑوں مثالیں ہیں، ہم ان میں سے نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل مثال پر اکتفا کریں گے:۔

جب بھی کوئی جماعت کسی اجتماعی خدمت کے لیے آگے بڑھتی ہے اور اس خدمت کا پختہ ارادہ کرتی ہے مثلاً چاہتے ہیں کہ محتاج لوگوں کے لیے ہسپتال تعمیر کریں، اور اس کام میں ایک معمولی و عام کاریگر و مزدور جس کی آمدنی خود اس کے اپنے اخراجات کے لیے کافی نہیں، تھوڑی سی رقم سے اس کام میں مدد کرے تو بہت ہی قابل تعریف بات ہوگی، اب اگر ایک بہت ہی دولت مند اور مالدار شخص بھی اتنی ہی رقم سے امداد فراہم کرے تو نہ صرف جیہ کہ اس کا عمل قابل تعریف نہ ہوگا بلکہ نفرت و تکلیف و بیزاری جنم دے گا، یعنی وہی بات جو ایک شخص کے سلسلہ میں قابل تحسین سمجھی جائے گی ایک دوسرے شخص کے بارے میں ایک فعل ناپسندیدہ شمار ہوگی حالانکہ قانونی اعتبار سے مؤخر الذکر شخص کسی طرح کسی فعل حرام یا غلطی کا مرتکب نہیں ہوا۔

اس بات کی دلیل، جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے، یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کے امکانات و وسائل کی مناسبت سے توقعات وابستہ کی جاتی ہیں جن میں اس کی عقل، دانش، ایمان، اور آخر میں اس کی قوت و طاقت سب چیزیں شامل ہیں، لہٰذا کتنے ہی ایسے افعال ہیں جن کی انجام دہی ایک شخص کے لیے عین ادب، خدمت، محبت اور عبادت شمار ہوگی، جب کہ ایک اور شخص کے لیے وہی افعال عین بے ادبی، خیانت، خلاف استقامت اور عبادت و اطاعت میں کوتاہی کے مترادف تصور ہوں گی۔

اب ان حقائق پر غور کرتے ہوئے ہم انبیاء و آئمہ علیہم السلام کے افکار و عمل کی واقعیت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کے افعال و اعمال کا ان کی فوق العادہ حیثیت کے پیش نظر جائزہ لیتے ہیں۔

یہ حضرات براہ راست آغاز عالم ہستی سے منسلک ہوتے ہیں، ان کے قلوب کو بے اندازہ علم و دانش کی شعاعیں منور کرتی ہیں ، ان پر بہت سے حقائق واضح ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں سے مخفی ہوتے ہیں، ان کا علم و ایان و تقویٰ بلند ترین درجات کا حامل ہوتا ہے، مختصر یہ کہ یہ حضرات اس قدر اپنے خالق کے قریب ہوتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی طرف ان کی ایک لمحہ کی سلب توجہ ان کے لیے لغزش شمار ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی جائے تعجب نہیں کہ جو افعال عام لوگوں کے لیے مباح یا مکروہ شمار ہوں ان کے لیے انہی افعال و اعمال کو گناہ کا نام دے دیا جائے۔

آیات قرآن اور بزرگ دینی پیشواؤں کے اقوال میں جن گناہوں کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، سب اسی قسم کے ہیں، ایسے ہی وہ افعال ہیں جن کے لیے ان حضرات نے اپنے آپ کو مقام بخشش میں رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صاحبان کی معنوی حیثیت، ان کا علم و دانش و ایمان اس قدر بلند و ارفع ہے کہ عام و سادہ عمل میں معمولی سی غفلت ایسے لوگوں کے لیے جن کی خداوند عالم کی طرف توجہ ہونا لازمی ہے ان کے لیے ''گناہ'' کی طرح شمار ہوتی ہے، یہ حقیقت، مشہور و معروف جملہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ'' (عالم افراد کی

نیکیاں مقربین کی برائیاں شمار ہوتی ہیں) سے ظاہر ہے۔

شیعہ عالم عظیم، خواجہ نصیر الدین طوسی نے بھی اپنی کتاب میں اس مسئلہ کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے: ''جب کوئی کسی فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے یا کسی واجب امر کو ترک کرتا ہے تو وہ گناہگار ہوتا ہے، اس کو چاہیے کہ توبہ کرے، ایسے مواقع میں ارتکاب گناہ اور توبہ عام اور معمولی افراد سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن کچھ حضرات ایسے ہیں کہ جب وہ مستحب امور کو ترک کریں یا کوئی مکروہ عمل کریں تو ان کے لیے وہ بھی گناہ کے مترادف ہوتا ہے جس کے لیے ان پر لازم ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو قسم اول کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں''۔

لہٰذا جن گناہوں کا قرآن مجید اور روایات میں بعض انبیاء، مثلاً حضرت آدمؑ، موسیٰ، یونس علیہ السلام وغیرہم کے متعلق ذکر آتا ہے وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں، قسم اول یعنی ارتکاب فعل حرام یا ترک واجب جیسے گناہ نہیں ہوتے، علیٰ ہذا القیاس جب کوئی غیر خدا کی طرف التفات پیدا کرے اور امور دنیا میں مشغول ہو کر آن واحد کے لیے یعنی خداوند عالم کی طرف سے غافل نہ ہو جائے تو اہل حقیقت اس کو بھی ایک قسم کا گناہ ہی تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کو چاہیے کہ توبہ کرے اور خداوند تعالیٰ سے اپنے فعل کے لیے بخشش طلب کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے اپنی دعاؤں میں جن گناہوں کا اقرار کیا ہے اور جن کے لیے انہوں نے طلب بخشش کی ہے وہ اسی قسم کے ہیں، پہلی اور دوسری قسم کے نہیں۔[۱]

بے موقعہ نہ ہوگا کہ اپنے جواب کی تکمیل کے لیے ہم اس واقعہ کو نقل کریں جس کو شیعہ عالم بزرگ ''علی بن عیسیٰ اربلی'' مرحوم نے اپنی کتاب ''**کشف الغمہ فی معرفة الائمہ**'' میں حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی سوانح حیات کے سلسلے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ساتویں امام دعا سجدۂ شکر میں پڑھا کرتے تھے، اس دعا میں آپ نے کسی قسم کے گناہوں کا اقرار کر کے خداوند تعالیٰ سے بخشش کی درخواست کی ہے۔[۲]

ہم نے جب اس دعا کا مطالعہ کیا اور اس کے معنی پر غور کیا تو اپنے آپ سے کہا کہ ایسا بزرگ جس کی عصمت پر شیعہ ایمان وعقیدہ رکھتے ہیں، کس طرح ایسے کلمات والفاظ ادا کر رہا ہے جن میں کئی قسم کے گناہوں کا اقرار شامل ہے؟ ہم نے جتنا بھی غور کیا فکر کسی نتیجہ تک نہ پہنچ پائی، حتیٰ کہ ایک روز فرصت پا کر میں نے ایک جگہ جناب رضی الدین ابوالحسن بن علی موسیٰ بن طاؤس سے ملاقات کی اور ان سے اپنی مشکل کا حل دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا:

''موید الدین علقمی وزیر نے یہی سوال چند روز قبل مجھ سے کیا تھا، میں نے اس کو بتلایا تھا کہ اس قسم کی دعائیں عوام الناس کی تعلیم کی خاطر کی گئی ہیں''۔

میں نے اس جواب کے بعد کچھ اور غور کیا اور اپنے دل میں کہا: یہ دعا حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نصف شب کے وقت اپنے

---

[۱] اوصاف الاشراف، ص ۱۷

[۲] اصل دعا کیلئے کتاب کشف الغمہ، ص ۲۴۳ ملاحظہ فرمائیں۔

سجدوں میں پڑھا کرتے تھے۔اس وقت کوئی ایسا شخص آپ کے پاس نہ ہوتا تھا جس کی تعلیم آپ کو مقصود ہوتی ؟

اس بات کو کافی عرصہ گزر گیا،ایک روز موید الدین محمد بن علقمی وزیر نے یہی سوال مجھ سے کیا، میں نے وہی پہلے ذکر وہ جواب جو اعتراض مجھے تھا،اس سے بیان کیے،پھر میں نے مزید کہا کہ شاید اس دعا کو مقصد صحیح ذات باری تعالیٰ کے حضور اپنے عجز و بندگی کے بیان کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

تاہم اب طاؤس کے جواب سے میری مشکل حل نہ ہوئی اور یہ گرہ اسی طرح میرے دل میں موجود رہی حتیٰ کہ عظیم سید ابن طاؤس وفات پا گئے۔اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کی نوازش سے میری مشکل حل ہوگئی اور میرے سوال کا صحیح جواب مجھے مل گیا جو میں آپ کی خاطر لکھ رہا ہوں:

انبیائے کرام اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کے اوقات حیات ہر وقت ذکر باری تعالیٰ میں مشغول ہوتے ہیں،ان کے قلوب جہاں بالا سے وابستہ رہتے ہیں،جیا کہ معصوم علیہ السلام نے فرمایا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں اس حقیقت کے مطابق مصروف رہتے ہیں گویا اسے دیکھ رہے ہیں،اور اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے،وہ حضرات ہمیشہ حق تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی طرح اپنا رخ رکھتے ہیں،اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کیفیت سے الگ ہو کر ان کی توجہ کھانے پینے جیسے اعمال مباح کی طرف ہو جائے اور ان کو ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے الگ کر دے تو وہ اتنی سی غفلت کو بھی اپنے لیے گناہ وخطا شمار کرتے ہیں اور اس کے لیے حق تعالیٰ سے مغفرت و بخشش طلب فرماتے ہیں۔جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان:

''اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَاسْتَغْفِرُ اللهَ فِى الْيَوْمِ مِاَةَ مَرَّةٍ'' اور مشہور معروف جملہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ'' اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہیں جس کی ہم نے وضاحت کی ہے۔[1]

---

[1] کشف الغمہ، ج،۳،ص ۴۲،۴۴

(۳)۔اللہ تعالیٰ کی عفو و بخشش کس طرح سازگار عصمت ہے؟

سوال:

سورۂ توبہ کی آیت ۴۳ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ منافقین کی ایک جماعت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مختلف قسم کے عذر پیش کرتے ہوئے انہوں نے استدعا کی کہ انہیں غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی رعایت دیں۔آنحضرتؐ نے ان کے عذر کو بظاہر قبول فرما کر اجازت دے دی اس موقع پر وحی قرآن مجید کے ذریعے آنحضرتؐ سے اس طرح خطاب ہوا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۝۴۳

''اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرماتا ہے! آپ نے سچ کہنے والوں کو جھوٹ بولنے والوں سے آگ شناخت کرنے سے پہلے ان کو کیوں اجازت دے دی''۔(توبہ۔۴۳)

اس آیہ مبارک میں دو سوال وضاحت طلب ہیں:

(ا)۔''عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ'' کا جملہ جبکہ عصمت کے ہوتے ہوئے عفو مناسب نہیں؟

(ب)۔''لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ'' کا جملہ جو غصہ اور سرزنش کا لہجہ رکھتا ہے۔

جواب:

پہلے سوال کے بارے میں ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ''عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ'' کے جملہ کے معنی دو طرح کیے جا سکتے ہیں اور دونوں معنی قواعد عربی کے مطابق ہیں۔لیکن دیکھنا ہوگا کہ دونوں میں سے کون سے معنی قرینہ کے مطابق ہیں۔

۱)۔یہ جملہ خبریہ ہے اس کے معنی ماضی میں تحقق عفو کی خبر دینا ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا جیسا کہ ہم کہتے ہیں ''نَصَرَ زَيْدٌ عَمْرًا'' یعنی زید نے عمرو کی مدد کی''۔

۲)۔یہ جملہ خبر تو ہو لیکن خبر ماضی کے معنی میں نہ ہو، بلکہ معافی مانگنے اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنے کے معنی میں ہو یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے جس طرح ہم کہتے ہیں: ''اَيَّدَكَ اللّٰهُ'' خدا تمہاری مدد کرے''۔

معنی اول کے مطابق یہ جملہ خبریہ تو ہے اور اس کا مقصد تحقق مفاد گزارش ہے، اس صورت میں بعض لوگوں کی نظر میں یہ جملہ ارشارہ کرتا ہے کہ کہنے والے سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہے جس کے لیے عفو الٰہی کی ضرورت ہوئی۔

لیکن یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ کوئی انسان جس قدر طہارت و پاکیزگی کے بلند و برتر درجات پر فائز ہوگا اسی قدر تناسب و میزان کے اعتبار سے اپنے آپ کو عفو الٰہی سے بے نیاز نہ جانا جائے گا۔ مشہور اصول و مقولہ ہے کہ ''جو جس قدر غنی ہوگا اتنا ہی محتاج ہوگا'' اور جتنی کسی کی چھت بلند ہوگی، اتنی ہی زیادہ برف ہوگی''۔ اس طرح عرفان الٰہی اور مقربان بارگاہ حق جب اپنے مقام بلند اور اپنی ذمہ داریوں کا اللہ تعالیٰ کے مقام بزرگ سے موازنہ کرتے ہیں تو اپنے اعمال کی زبونی اور اپنے قصور کو سمجھتے ہوئے حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتے اور بے اختیار تضرع و زاری کرتے ہوئے کہہ اٹھتے ہیں: ''مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ'' یعنی ''ہم نے تیری عبادت اس طرح نہیں کی کہ جیسا عبادت کرنے کا حق ہے''۔ لہٰذا اگر ہم بندگان خدا کے معاصی کے لیے عفو پروردگار کی ضرورت ہے تو معصومین کے لیے ترک اولیٰ اور خاص حالات میں عارفوں کا چند مباح کاموں کو انجام دینا، عفو و بخشش سے بے نیاز نہیں ہوتا۔

دوسرے معنی کے مطابق بھی یہ جملہ بظاہر ہر جملہ خبریہ ہی ہے لیکن بباطن اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی عفو و رحمت کے لیے دعا و درخواست والتجا ہے یعنی خدا تجھے بخش دے یا تجھ پر رحمت نازل فرمائے۔ ایسی درخواست کسی عام شخص سے بھی صدور خطا و عصیان کی دلیل نہیں ہوتی چہ جائیکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایسا سوچا جائے، کیونکہ اس قسم کی التجا افراد متعلقہ کے تمام احترام و تکریم و توقیر و بزرگی کی مظہر ہوتی ہیں اور کسی حالت میں بھی ان سے صدور معصیت کی دلیل نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا اگر ہم کسی سے کہیں: ''غَفَرَ اللهُ لَكَ'' تو اس کا ہرگز کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ شخص متعلقہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور ابھی تک عاصی و گنہگار ہے کہ اس کے حق میں اس قسم کی دعائے بخشش کی جائے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیہ مبارکہ دونوں احتمالات میں سے کسی کے اعتبار سے بھی صدور گناہ و معصیت پر شاہد نہیں، بلکہ آیہ مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ دعائیہ و انشائیہ ہے اور وہ بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت و تکریم کے اظہار کی خاطر۔

دوسرے نظریہ کا جواب بھی بالکل واضح ہے، یہ درست ہے کہ آیہ مجیدہ اعتراض کا لہجہ رکھتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اعتراض کس چیز پر وارد ہو رہا ہے؟ یہ اعتراض ترک اولیٰ و افضل پر ہے نہ کہ کسی فعل حرام کے ارتکاب پر تمہارا شاہد وعلت ہے جو اس جملہ کے بعد وارد ہوئی ہے۔

اس کی تشریح و وضاحت یہ ہے کہ جس جماعت منافقین نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غزوۂ تبوک کے جہاد میں شرکت نہ کرنے کی اجازت چاہی اور آنحضرتؐ نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی، دو خصوصیات کی حامل ہے:

(ا)۔ وہ لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت مرحمت فرماتے یا نہ فرماتے۔ ہرگز جہاد میں شریک نہ ہوتے۔ ان کا شرکت نہ کرنے کے لیے اجازت طلب کرنا صرف ظاہرداری اور بہانہ سازی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ درج ذیل آیہ شریفہ ''وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِيْنَ'' کے جملہ کے علاوہ جو آیہ زیر بحث میں موجود ہے اس حقیقت کی گواہ ہے:

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ۝۴۶

''اور اگر وہ سچ کہتے تھے اور میدان جہاد کی طرف جانے کی وجہ رکھتے تھے تو اس کے لیے ذریعہ فراہم

کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو مکروہ جانا اور انہیں شرکت جہاد سے باز رکھا اور ان سے کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ہمراہ (بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کی طرح) بیٹھے رہیں"۔ (توبہ۔ ۴۶)

آیہ مبارکہ واضح طور پر فرما رہی ہے کہ وہ لوگ جہاد میں شرکت کرنے کا خیال ہی نہ رکھتے تھے بلکہ اس قسم کا کوئی ارادہ ہی نہ رکھتے تھے، پس ان حالات میں اس جماعت کا اجازت طلب کرنا سوائے ظاہرداری اراصطلاح کے مطابق ٹال مٹول سے زیادہ نہ تھا۔

(ب)۔ یہ جماعت منافقین اگر بالفرض جہاد میں شرکت کر بھی لیتے تو کوئی کام یا مسئلہ سلجھانے کے بجائے صرف اضطراب و پریشانی پھیلاتے ،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

"اگر وہ تمہارے ہمراہ باہر نکلتے تو سوائے شک وتردید پھیلانے کے اور کچھ نہ کرتے ،تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کو ہوا دیتے اور تمہارے درمیان کچھ منہ دیکھنے والے بھی ہیں جو ان کی باتوں کو قبول کر لیتے اور خداوند عالم ظالموں سے واقف ہے"۔ (توبہ۔ ۴۷)

لہٰذا ایسی جماعت کی اجازت طلبی کو قبول کر لینا جو یا تو شرکت جہاد کا قصد نہ رکھتے تھے یا شرکت کی صورت میں سوائے نقصان کے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی چیز مہیا نہ کرنا چاہتے تھے، کسی مصلحت کی تقویت کا باعث نہیں بنتا، لہٰذا صرف ایک چیز جو ان کی شرکت نہ کرنے کی اجازت دینے سے جاتی رہی وہ آنحضرتؐ کی ذاتی مصلحت تھی جو یہ تھی کہ اگر وہ ان کو پیچھے رہنے کی اجازت نہ دیتے اور وہ شرکت بھی نہ کرتے تو نتیجۃً ان کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی اور آنحضرتؐ اور مسلمان جلدتر ان لوگوں کی اصلیت سے واقف ہو جاتے، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

"آپ نے کیوں اجازت دے دی (بہتر تھا کہ اجازت نہ دیتے) تا کہ مومنین صادق کو جھوٹوں سے واضح طور پر پہچان لیتے"۔ (توبہ۔ ۴۳)

اس قسم کی کوئی مصلحت ان دو خصوصیات اور ان بہت سی قسموں کی موجودگی میں جو منافقین کھا رہے تھے، ترک اولیٰ کے علاوہ اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں ترک اولیٰ کی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی اور آیہ مبارکہ مجیدہ کسی اور مقصد کو پیش کر رہی ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لطف و مہربانی کا اظہار مقصود ہے، گویا آیہ شریفہ کہنا چاہتی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول! آپ نے کیوں اس حد تک نرمی و مہربانی کا اظہار فرمایا، انہیں حجاب و حیا و انکساری سے گھر جانے کی اجازت دے دی اور نتیجہ کے طور پر اپنے دشمنوں کی

ذلیل کیفیت کو اپنے اوپر ظاہر نہ ہونے دیا کہ دوست و دشمن کو الگ الگ پہچان لیتے؟

اس طرح کے تند و تیز اور پر غضب تخاطب سے جھوٹ بولنے والے منافقین کی اصلیت کو بیان کرنا مراد ہے۔ یہ خطاب عزیز ترین افراد پر بصورت عتاب، بے حساب شفقت کی بناء پر ہو رہا ہے جو اپنے دشمن کی رسوائی تک میں مانع آتے ہیں، ایسے خطاب کی لطافت کو وہ شخص ہی سمجھ سکتا ہے جو کسی بزرگ کے اس کے عزیز ترین شخص سے طرز کلام کو سمجھتا ہو۔

ہم یہاں ایک نکتہ کے بیان کو ضروری جانتے ہیں، یہ درست ہے کہ اس طرز عمل کے تحت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دشمن کو پہچاننے سے رہ گئے لیکن دو طریقے اور ایسے تھے جن سے آنحضرتؐ مومنین سے منافقوں اور سچ بولنے والوں سے جھوٹوں کو الگ کر سکتے تھے وہ طریقے یہ ہیں:

(ا)۔ طرز گفتگو:

منافق کا لب و لہجہ مومن خالص کے لب و لہجہ سے بالکل مخلف تھا، اس طرح آنحضرتؐ منافقین کو پہچان سکتے تھے، اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِىْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو ہم ان کو تمہیں دکھلا دیں تاکہ انہیں اپنے قیافہ سے پہچان لو۔ لیکن تم انہیں ان کی طرز گفتگو ہی سے پہچانتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے واقف ہے''۔ (محمدؐ۔۳۰)

(ب)۔ تیسری طرز آگاہی سے

علم غیب کی مدد سے جو نہ علم حسی ہے اور نہ عقلی۔ یہ حقیقت ذیل کی آیہ مبارکہ سے واضح ہوتی ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص

''یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان دار افراد کو اسی صورت میں چھوڑ دے جس میں کہ وہ اب ہیں، جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ فرما دے، یہ بھی ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اسرار مخفی سے مطلع فرمائے

سوائے اپنے رسولوں کے جن کو وہ اپنے اسرار مخفی سے آگاہ کرنا چاہتا ہے''۔ (آل عمران۔۱۷۹)

اس آیہ مبارکہ کے آغاز و اختتام پر غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں (مومنین ومنافقین) جماعتوں سے اپنے رسولوں کو بذریعہ علم غیب آگاہ فرمادیتا ہے، لہٰذا اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے طریقہ سے منافقین کی شناخت سے محروم رہے ہوں اور انہیں نہ بھی جان سکے ہوں تو دوسرے دو طریقوں سے آنحضرتؐ ان کو پہچان سکتے تھے۔ جو چیز اختیار سے نکل گئی اور جو قابل تلافی نہیں، یہ تھی کہ مومنین شناخت منافقین سے محروم رہے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے گناہ کا نام دیا جاسکے۔

(۴)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بخشش گناہ سے کیا مراد ہے؟

سوال:

اگر اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام، بالخصوص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر قسم کے گناہ ولغزش سے محفوظ ہیں تو پھر آنحضرتؐ کے لیے، ''مغفرت ذنب'' سے جو ''سورۂ فتح'' کی ابتداء میں آتا ہے، کیا مراد ہے؟

جواب:

مخالفین عصمت انبیاء جو سب سے بڑا سہارا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے خلاف رکھتے ہیں وہ یہی آیہ مبارکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کے لیے ''مغفرت ذنب'' کی، وہ پہلے کا گناہ ہو یا بعد کے زمانہ کا، خبر دیتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ‏ ﴿۱﴾ لِّيَـغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ‏ ﴿۲﴾ وَّيَنۡصُرَكَ اللّٰهُ نَصۡرًا عَزِيۡزًا ﴿۳﴾

''ہم نے آپ کو واضح کامیابی نصیب فرمائی تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے سب اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دے، آپ پر اپنی نعمت تمام فرمادے، آپ کی راہ راست کی جانب ہدایت فرمائے اور طاقتور نصرت کے ساتھ آپ کی مدد کرے''۔ (فتح۔۱ تا ۳)

ان تینوں آیات مجیدہ میں غور کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں کوئی اور بات مراد ہے، جس کا گناہ شرعی سے، جس کو قرآن وسنت گناہ قرار دیتے ہیں اور جس کے لئے یہ سزا معین کرتے ہیں کہ کوئی تعلق نہیں، اس کیفیت کی وضاحت کے لیے ہم کئی امور کا سطور ذیل میں ذکر کرنے سے آیہ مبارکہ کا ہدف روشن ہوجائے گا۔

۱)۔اس فتح سے کون سی فتح مراد ہے؟

مفسرین کے درمیان فتح کے بارے میں تین احتمال پائے جاتے ہیں:

۱)۔فتح مکہ؛

۲)۔فتح خیبر؛

۳)۔صلح حدیبیہ۔

پہلے دو احتمالات سیاق آیات سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ سورۂ مبارکہ کا موضوع، جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے، صلح حدیبیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

پہلے دو احتمالوں میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ ان پر غور کرنے والوں کا قول یہ ہے کہ آیہ مجیدہ کا مصداق ماضی کی کوئی فتح نہیں بلکہ اس میں تقدیر و فیصلہ پروردگار کا مقصود بیان کرنا ہے کہ اس قسم کی فتح مستقبل میں حاصل ہوگی۔ دراصل ''اِنَّا فَتَحۡنَا'' سے مراد ''اِنَّا قَضَيۡنَا الۡفَتۡحُ'' ہے یعنی اس قسم کی فتح ہم نے تمہارے لیے مقدر فرمادی ہے۔

تیسرے احتمال میں جو مشکل سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آیہ فتح و کامرانی کی بات کرتی ہے جب کہ صلح حدیبیہ ایک سازش نہ تھی کہ فتح و کامرانی کہلاتی لیکن یہ اعتراض کامل طور پر جواب قاطع رکھتا ہے، یہ صحیح ہے کہ صلح حدیبیہ ظاہری حیثیت میں ایک صلح و سازش تھی نہ کہ دشمن پر فتح و غلبہ، لیکن یہی فتح اسلام کے لیے اس قدر فائدہ مند ہوئی کہ فتح خیبر و مکہ کو اس کے ثمرات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ہم نے اس معاہدہ کے روشن و واضح نتائج کا اپنی کتاب ''فروغ ابدیت'' میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، قارئین کرام سے استدعا ہے کہ اس کی طرف رجوع فرمائیں۔ بہرحال تیسری صورت یعنی صلح حدیبیہ پہلی دو صورتوں سے زیادہ واضح ہے، اس بات کی تائید دو مطالب سے ہوتی ہے:

(۱)۔خود سورۂ مبارکہ فتح کی آیات شاہد ہیں کہ فتح سے صلح حدیبیہ مراد ہے جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے:

لَقَدۡ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ يُبَايِعُوۡنَكَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ

''خداوند عالم اس وقت مومنین سے راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے''۔ اور یہ بیعت صلح حدیبیہ کے موقع پر کی گئی تھی۔(فتح۔۱۸)

(۲)وَهُوَ الَّذِيۡ كَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ عَنۡهُمۡ بِبَطۡنِ مَكَّةَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا ﴿۲۴﴾

''وہ وہی ہے جس نے سرزمین مکہ پر ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے پھر اس کے بعد تمہیں ان پر کامیابی عطا فرمائی اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے''۔(فتح۔۲۴)

مفسرین کا بیان ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ کے موقع پر سرزمین تنعیم پر فروکش ہوئے تو اچانک اسی (۸۰) یا تیس (۳۰) مسلح قریش نوجوان درہ کوہ سے ظاہر ہوئے، ان کا مقصد آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کو قتل کرنا تھا۔ لیکن جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے زیر اثر وہ ایسا نہ کر سکے بلکہ سب کے سب اسیر کر لیے گئے۔ [۱]

۳)۔ حدیبیہ کے واقعہ کے بیان کے بعد آیت ستائیس (۲۷) میں واضح تر ''فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا'' کا جملہ آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس واضح فتح کے ساتھ ہی ایک اور فتح ہے جس کو فتح مکہ کہا جاتا ہے۔ اس جملہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ''فتح مبین'' ''فتح قریب'' سے الگ ہے اور ''فتح قریب'' سے یقیناً فتح مکہ ہی مراد ہے۔

(ب)۔ اپنی کتاب ''اسباب النزول'' میں جو آیات قرآن مجید کے شان نزول کے بارے میں نسبتاً ایک ثقہ کتاب ہے، واحدی خود کچھ روایات نقل کرتا ہے جو سب کی سب بیان کرتی ہیں کہ ان آیات کی شان نزول صلح حدیبیہ ہی ہے البتہ جو روایات شیعہ محدثین نے نقل کی ہیں مختلف ہیں۔ علیؑ بن ابرہیم قمی تفسیر میں [۲]۔ اس فتح سے صلح حدیبیہ مراد لیتا ہے لیکن شیخ صدوقؒ اپنی کتاب ''عیون اخبار الرضا'' میں اور ابن طاؤس اپنی کتاب ''سعد السعوذ'' میں ایک روایت کی بناء پر اس کو فتح مکہ ہی سے متعلق جانتے ہیں، اگر شیخ صدوق کی روایت سند کے اعتبار سے بے شک و شبہ ہو تو دوسری روایت کو بھی قابل قبول جاننا چاہیے۔ اور کلمہ ''فَتَحْنَا'' کی بھی ایک طرح پر فتح ہی کے حکم و تقدیر کے تحت تفسیر کرنا چاہیے۔ بہر حال اس سے مراد صلح حدیبیہ ہو یا فتح مکہ، یہ فرق اس ہدف و مقصد پر اثر انداز نہیں ہوتا جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔

۲)۔ ''ذنب'' سے کیا مراد ہے؟

''ذنب'' بروزن ''بند'' جرم کے معنی میں ہے جس کو ہماری زبان میں خطا یا گناہ کہتے ہیں، ابن فارس ''المقاییس'' میں کہتا ہے: ''ذنب'' کے معنی ہیں ''جرم''

''ذنب'' بروزن ''طَلَبْ'' کے معنی ہیں ''جانوروں کی دم''، کبھی کبھی ''حظ'' اور ''نصیب'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے [۳]۔

ابن منظور کہتا ہے کہ ''ذنب'' گناہ، جرم اور معصیت کے معنی میں آتا ہے اور ''ذنوب'' اس کی جمع ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی مناجات میں، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بعوث بر سالت فرمایا اور حکم دیا کہ فرعون کی طرف جائیں، اس طرح عرض کیا:

وَلَهُمۡ عَلَىَّ ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۱۴﴾

''اور وہ میرے ذمہ ایک جرم لگاتے ہیں اس لیے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں''۔ (شعراء۔ ۱۴)

---

[۱] اسباب النزول واحدی، ص ۲۱۸

[۲] تفسیر قمی، ج ۲

[۳] المقاییس، ج ۲، ص ۳۶۱

اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مراد اس قبطی کا قتل ہے جو ان کے ہاتھ سے مصر میں قتل ہوا تھا[1]۔ ایک اور آیت میں ''ذنب'' کے لیے عنوان سے اشارہ ہوا ہے، فرماتا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۳۳﴾

''میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے، اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے''۔ (قصص۔ ۳۳)

ان حالات میں اس بات سے انکار نہ ہونا چاہیے کہ ''ذنب'' کے معنی جرم و گناہ ہی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات موقعوں پر آیا ہے اور سب جگہ اس سے جرم ہی مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی توصیف فرماتا ہے:

غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ

''گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا''۔ (مؤمن۔ ۳)

اسی طرح زندہ درگور ہونے والی اولاد کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ﴿۹﴾

''اور جب زندہ درگور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلہ میں قتل ہوئی''۔ (تکویر۔ ۸ تا ۹)

اسی طرح کے دوسرے مواقع بھی ہیں۔ اہم بات یہ نہیں کہ ہم معلوم کریں کہ ''ذنب'' کے معنی کیا ہیں، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ جانیں کہ ''ذنب'' کے ایک نسبتی معنی ہیں جن کے سلسلہ میں ممکن ہے کہ نظریات اور افکار بالکل مختلف ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عمل کسی شخص یا جماعت کی نظر میں جرم و گناہ کے مقام پر ہو، جبکہ وہی عمل کسی اور شخص یا جماعت کے نزدیک کردار صحیح شمار ہو، ایسے بہت سے واقعات ہو سکتے ہیں جو ایک ظالم کی طرف سے مطابق توقع ہوں جبکہ وہی کسی اور شخص کی طرف سے غیر متوقع اور مذموم سمجھے جائیں۔

پاس معلوم ہوا کہ یہ تصور کہ ''ذنب'' خالصةً اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت ہی ہے، جس کی سزا ہوگی، قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس جرم و گناہ عصیان و طغیان کی حقیقت اصطلاحی طور پر قانون شکنی کے تحت آتی ہے، البتہ یہ سوچنا ہے کہ یہ کس قانون کی مخالفت ہے؟ کیا قانون خدا کی یا اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے قانون کی؟ کیا اس سے وہ قانون مطلق مراد ہے جو تمام انسانوں پر عائد ہوتا ہے یا ایسا قانون نسبتی جو کسی خاص جماعت کے لیے ہو؟

لفظ ''ذنب'' میں ایسی خصوصیت نہیں جس سے یہ مراد لی جاسکے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ، یا غیر خدا، یا قانون مطلق یا قانون نسبتی کی

---

[1] لسان العرب، ص ۳۸۹

خلاف ورزی ہے، دراصل؛ خصوصیات کا تعین قرائن خارجی سے کرنا لازم ہے آیہ مبارکہ سے حل مطالب میں یہی مشکل پیش آتی ہے جس کی بعد میں وضاحت کی جائے گی۔

۳)۔لغت میں ''غفران'' کے معنی

عربی زبان میں ''غفر'' کے معنی چھپانا یا اخفا کرنا ہے۔اسی لیے ''خود'' کو مغفر کہتے ہیں کیونکہ اس سے سر کو چھپایا جاتا ہے۔عرب لوگ گردن اور اس کے نیچے کے بالوں کو جن سے گردن ڈھکی ہوتی ہے ''غفر'' کہتے ہیں [1]

''لسان عرب'' میں مذکورہ عبارت کا مطلب بھی قریب قریب یہی ہے، یہاں تک کہ اس میں ''غَفَرَ اللهُ ذُنُوبَهُ'' کے معنی ''سَتَرَ اللهُ ذُنُوبَهُ'' کیے گئے ہیں، یعنی اللہ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے، تاہم یہ لفظ ایسے ہی موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں اس کے معنی غیر مطلوب و ناپسندیدہ کے کیے جائیں۔

۴)۔پیروی کس طرح سبب مغفرت ہے؟

۵)۔''ذنب'' سے کیا مراد ہے؟

آیہ مبارکہ سے ظاہری طور پر یہ مراد ہے کہ ایسی فتح سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم ﷺ کے سابقہ اور آئندہ کے گناہ بخش دے لیکن ''غفران ذنب'' صرف اس صورت میں ہدف و غایت شمار ہوگا جب ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی رابطہ پایا جاتا ہو، لیکن جبکہ ظاہری طور پر ان دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی رابطہ نہیں پایا جاتا، اس لیے پیغمبر اکرم ﷺ کی رضامندی اور دشمن پر غلبہ اسلام کی نشر و اشاعت یا خود آنحضرتؐ کی شہرت و بلندی کا سبب ہو سکتے ہیں، نہ کہ آنحضرتؐ کے گناہ کے بخشے جانے کا۔

آیہ مبارکہ میں یہی اہم نکتہ ہے کہ اگر اس کی صحیح تفسیر ہو جائے تو آنحضرتؐ کی عصمت کا مخالف بالکل نہتا رہ جاتا اور شکست کھا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس آیہ مجیدہ سے حضرت رسالتمآب ﷺ کے عدم عصمت پر استدلال کرتے ہیں وہ آیت کی اس وضاحت سے غفلت برتتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ گمراہی کا شکار ہیں۔آیہ مبارکہ کے صحیح مطالب تک پہنچنے کے لیے یہ جاننا کلید کامیابی کا درجہ رکھتا ہے کہ کسی طرح کامیابی اس بات کا سبب بن گئی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے گناہوں کے بخش دے۔

اگر ''ذنب'' سے کوئی گناہ شرعی یا تخلف امر الٰہی مراد لیا جائے تو اس قسم کی مغفرت ہدف کامیابی یا کامیابی کی غرض و غایت قرار نہیں دی جا سکتی کیونکہ دونوں کیفیات کے درمیان کوئی منفی رابطہ نہیں پایا جاتا، اس صورت میں تو مفہوم آیت ہی مبہم ہو جائے گا کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے

---

[1] مقاییس اللغہ، ج ۴، ص ۳۸۶

کہ لڑائی میں فتح پالینا کسی کا نسان کے سابقہ و آئندہ گناہوں کی بخشش کا سبب بن جائے۔ یہ تو بات لازمی طور پر اس ضرب المثل کے مطابق ہوگی جو اس طرح مشہور ہے:

گناہ کرو در بلخ آہنگرے

بہ شوستر زوند گردن مسگرے

یعنی ایک لوہار بلخ میں غلطی کرے اور شوستر کے ایک تانبہ ساز کی گردن اڑا دی جائے۔

پس ''ذنب'' سے مراد اگر وہ عمل ہو جس کا الزام قریش آنحضرتؐ پر لگاتے تھے جس کی تفصیل ہم ابھی ذکر کریں گے، تو پھر ان دونوں افعال کے درمیان رابطہ واضح ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت توحید کے سلسلہ میں ابتداء ہی سے مشرکین کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف قدم اٹھایا تھا۔ آپ نے ان کے طریق کار اور ان کے جھوٹے خداؤں کی مذمت سے آغاز فرمایا جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر آنحضرتؐ کا پیش کردہ دین ان میں تفرقہ و نفاق کا سبب بنا۔ اسی لیے آنحضرتؐ کی نظروں میں مجرم اور افتراق پیدا کرنے والی ہستی قرار پائے۔ لہٰذا سرداران قریش نے حضرت ابوطالبؑ سے ملاقات کر کے ان الفاظ میں آنحضرتؐ کی شکایت کی:

"اِنَّ ابْنَ اَخِیْكَ قَدْ سَبَّ اٰلِهَتَنَا وَعَابَ دِیْنَنَا وَضلل اٰبَآءَ نَا فَاَمَّا اَنْ تَكُفَّهٗ عَنَّا وَاَمَّا اَنْ تُخَلِّی بَیْنَنَا وَبَیْنَهٗ"۔ [1]

''آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے دین کو برائی سے یاد کرتا ہے، ہمارے افکار و عقائد کو باطل اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیتا ہے، یا تو آپ اس کو اس کام سے روکیں اور پھر اس کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں''۔

(مشرکین کے مطابق) ہجرت سے قبل آپ کے جرائم ایسے ہی مسائل کے محور کے گرد گھومتے تھے۔ ہجرت کے بعد قریش کی نظروں میں یہ جرائم شدید تر صورت اختیار کر گئے کیونکہ آنجنابؐ بعد ہجرت فوجی کشمکش اور بدر و احد و احزاب کی خونی جنگوں کا باعث بنے جن کے نتیجہ میں بزرگان قریش ایک جماعت خاک مذلت میں جا پڑی۔ اس طرح سرداران قریش اپنے زعم باطل میں آنحضرتؐ کو اور زیادہ قصوروار ٹھہرانے لگے اور وہ کسی طرح اب آنحضرتؐ کے جرائم سے چشم پوشی کرنے کو تیار نہ تھے۔

صلح حدیبیہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے بہت زیادہ نرمی اور مہربانی کا مظاہرہ فرمایا اب وہ آنحضرتؐ کی عظمت روحانی کو کسی قدر سمجھے لگے اور ان میں سے بہت سے لوگ سوچنے لگے کہ وہ اپنے مقام پر غلط فہمی اور اشتباہ سے دوچار ہیں۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۶۵

جب انہوں نے حدیبیہ کے بیابات میں مسلمان جوانوں کی جاں بازی کا نزدیک سے مشاہدہ کیا تو آنحضرتؐ کی اصلیت اور عظمت ان پر ظاہر ہونے لگی۔ پھر سال آئندہ جب آنحضرتؐ اپنے اصحاب باوفا کی ایک جماعت کے ہمراہ عمرکی بجا آوری اور خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہونے کے لیے تشریف لے گئے تو مشرکین مکہ نے اسلامی نظم وضبط کو دیکھا اور جو شیلے نعروں کو سنا جو روح پرور بھی تھے۔ پھر جب آنحضرتؐ کی شرائط صلح کی پابندے سے مکمل طور پر آشنا ہوئے تو نتیجہ کے طور پر آنحضرتؐ کی ایک مختلف شکل ان کے قلوب میں ابھرنے لگی۔ اب دن کے تصور میں ایک ایسا انسان آنے لگا جو ایک ہستی ملکوتی کا مالک، اصول اخلاق میں کامل و پابند، صلح وصفا کا خوگر اور بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہو۔ لہٰذا وہ سب لوگ اس قسم کے نیک صفات اور پسندیدہ کردار کر کے ماضی کی تلخ یادوں کو، وہ ہجرت سے پہلے کی تھیں یا اس کے بعد سے تعلق رکھتی تھیں، بھولنے لگے پس وہ لوگ انفرادی یا اجتماعی صورت میں آہستہ آہستہ جو بتدریج سرزمین شرک کو چھوڑ کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ملتے گئے۔ فتح مکہ سے پہلے خالد بن ولید، عمر بن عاص اور ایسے ہی دوسرے حضرات کا قبول اسلام صلح حدیبیہ یا دوسرے لفظوں میں فتح حدیبیہ ہی کے ثمرات سے ہے۔

خداوند عالم نے یہ کامیابی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مقدر فرمادی تا کہ آنحضرتؐ کے خلاف قریش کے تمام قبیح وخراب تصورات ختم ہو جائیں اور آنحضرتؐ کے مخالفین آپؐ کی عصمت اور طبع ملکوتی سے آشنا ہو جائیں۔ اگر یہ کامیابی رونما نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کے مخالفین آپ کے متعلق اپنے عقائد وفاسدہ پر قائم رہتے۔

اس کامیابی نے نہ صرف آپ کے خلاف اس قسم کے جرائم وگناہوں کو ختم کر دیا اور یہ سب باتیں مشرکین کے طاق نسیاں کی نذر ہوگئیں، بلکہ آنحضرتؐ کاہن، ساحر، مفتری، کذاب۔۔۔ کتب سابقہ سے اقتباسات حاصل کرنے والے اور اسی قسم کے دیگر اتہامات سے مکمل طور پر بری ہوگئے۔ اب وہ لوگ سمجھ گئے کہ ایک کاہن وساحر یثرب میں ایسی عظیم مملکت قائم نہیں کر سکتا، جس کی طاقت کے اثرات قلب جزیرہ نمائے عرب تک پہنچ کر وہاں کے تمام قبائل اور باشندگان اور آنحضرتؐ کے دین کی طرف متوجہ کر سکیں اور روز مرز یادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب کو مسخر کر سکیں۔

اصول یہ ہے کہ اجتماعی طریق ہائے کار کے مطابق جب کوئی شخص کسی مقام ومنصب بلند کا دعویٰ کرتا ہے کسی موضوع کو پیش کرتا ہے، اصلاح اجتماعی کا مدعی ہوتا ہے تو روز اول ہی سے اس کو قسم قسم کی ناسزا باتوں گالیوں بلکہ تہمتوں کا، جو اس پر لگائی جاتی ہیں، تختہ مشق بننا پڑتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے دعویٰ میں کامیاب ہو جاتا ہے، اپنے مقام ومنصب کو عملی طوعر پر حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے موضوع ودعویٰ کر عملی جامہ پہنا دیتا ہے، اپنی مجوزہ اصلاحات کو رائج کر دیتا ہے تو فطری طور پر اس قسم کی واقعیت تمام اندیشہ ہائے زبوں اور مخالف ذہنیتیوں کو ختم کر ڈالتی ہے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مقدس بھی اس اصول سے الگ نہیں۔ حدیبیہ میں جس فتح وکامیابی کو آنحضرتؐ کی بصارت مشاہدہ کر رہی تھی، یا آپ کی فتح مکہ نے قریش کے عائد کردہ آپ کے جرائم خیالی کو مخفی کر دیا، بلکہ تمام ناسزا جباتیں جن کا فتح نہ ہونے کی صورت میں باقی رہ جانا ممکن تھا، رخصت ہوگئیں۔ اب آنحضرتؐ اپنے مخالفین کی نظروں نہ مجرم تھے نہ گنہگار نہ کاہن تھے نہ غیب گو نہ ساحر تھے نہ جادوگر، بلکہ ایک ملکوتی انسان بن گئے تھے، جو واقعہ بینی، حقائق کے ادراک، قوانین افرینش سے واقفیت مصالح ومفاسد انسان کی شناخت کی موجودگی

میں قوم عرب کی طریق سعادت پر رہبری کر رہا تھا۔

٦)۔ متقدم و متاخر کے معنی

سورۂ مبارکہ کی آیات میں اگرچہ اس سباق و سیاق کی حدود زمانی کا ذکر نہیں ہوا تاہم متذکرہ بیان کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ اس سے واقعات قبل از ہجرت و بعد ہجرت مراد ہیں۔ ان دونوں زمانوں کے الگ الگ بیان کرنے کی علت صرف یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مشرکین کے عائد کردہ الزامات لفظی طور پر دائرہ جرائم سے باہر نہ تھے۔ یہ جرائم اسلام کی تبلیغ اور اس کے نتیجہ میں مشرکین مکہ جکے درمیان تفرقہ سازی پر مشتمل تھے، جب کہ بعد ہجرت آپ کے خلاف جرائم میں سے ایک تشکیل حکومت طاقتور تھی جس نے ایک منظم فوج کی مدد سے قوائے کفر کو درہم برہم کر دیا اور ان کے بہادروں کو خاک مذلت میں ملا کر رکھ دیا۔

یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے جرائم کا تعلق سورۂ مبارکہ کے نزول سے پہلے کے جرائم سے ہے کیونکہ جرائم پر پردہ پوشی کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کسی کا دامن واقعی طور پر الزامات سے آلودہ ہو یعنی ایسا ہو کہ قریش کی نظر میں پیغمبر اکرم ﷺ فتح حدیبیہ یا فتح مکہ کے بعد ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے ہوں جن کو فتح نے چھپا دیا ہو۔

ان مقدمات پر غور و خوض کرنے سے آیہ مبارکہ کے مطالب اس قدر واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آیت مبارکہ کے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل دو کیفیات کلیدی حیثیت رکھتی ہیں:

(ا)۔ ''ذنب'' سے مراد ''ذنب الٰہی'' نہیں بلکہ اس سے مراد وہ اتہامات ہیں جو قریش نے آنحضرت ﷺ پر عائد کیے تھے۔

(ب)۔ مغفرت اور پردہ پوشی ذنوب کا مقصد و ہدف اس صورت میں صحیح طور پر سامنے آتا ہے جب مراد ذنب کسی نسبت سے متعلق ہو اور اس کے فیصلہ کرنے کا اختیار قریش یا آنحضرتؐ کے دشمنوں کے پاس ہو، اور یہ الزامات ذنب الٰہی اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ تکالیف کی مخالفت کا درجہ رکھتے ہوں۔

اب ہم جناب امام علی رضا علیہ السلام کی اس موضوع پر گفتگو پیش کرتے ہیں کہ جب مامون الرشید نے اس آیہ مبارکہ کے مطالب کے متعلق حضرت سے سوال کیا۔ یہ گفتگو بصورت مکالمہ اس طرح ہوئی:

مامون: اے فرزند رسول! کیا آپ کا عقیدہ یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام ہر قسم کے گناہ کے معصوم اور محفوظ ہیں؟

امامؑ: کیوں نہیں؟

مامون: پھر ہمارے پیغمبر اکرم (ﷺ) کے بارے میں خداوند عالم کے کلام کے کیا معنی ہیں جب وہ فرماتا ہے:

''لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ''؟

امامؑ: مشرکین مکہ کے نزدیک کسی شخص کا جرم پیغمبر خدا ﷺ سے بڑا نہ تھا۔ وہ لوگ تین سو ساٹھ بتوں کو پوجتے تھے جب آنحضرتؐ نے انہیں توحید پرستی کی دعوت دی یہ بات ان پر بہت گراں گزری اور وہ کہنے لگے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

''کیا انہوں نے متعدد خداؤں کے بدلہ ایک خدا قرار دیا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے ان کے بڑے بوڑھے (حضرت ابوطالب کے گھر سے) باہر آئے اور کہا کہ اپنے خداؤں کی حفاظت میں بردباری اور استقامت سے کام لو، یہ وہ بات ہے کہ جو گھڑی گئی ہو ہم نے تو یہ بات آخری شریعت میں بھی نہیں سنی۔ (یعنی سابقین کے واقعات میں بھی) یہ بات جھوٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں''۔ (ص۔۵ تا ۷)

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کی اور پروردگار عالم نے آنحضرتؐ کو ''اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا'' کے خطاب سے مخاطب فرمایا تو اس وقت مشرکین مکہ کی ایک جماعت اسلام لے آئی۔ بعض لوگ مکہ چھوڑ گئے، جو لوگ شرک پر باقی رہ گئے وہ بھی توحید پرستی سے انکار نہ کر سکے۔ اس طرح آنحضرتؐ کا گناہ مکہ والوں کے نزدیک بخشا گیا اور چھپ گیا۔

مامون: اے ابوالحسنؑ! اللہ آپ کو خیر عطا فرمائے۔

(۵)۔ نابینا سے ترش روئی اور روگردانی کس طرح سازگار عصمت ہے؟

سوال:

سورۂ عبس کی ابتدائی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نابینا شخص کی طرف سے رخ مبارک پھیر لیا اور سرداران قریش کو تبلیغ کرنے لگے۔ پس آنحضرتؐ کی سرزنش میں وحی نازل ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تبلیغ میں ترجیح میں یہ ترجیح اور وہ عتاب و سرزنش کس طرح آنحضرتؐ کی عصمت سے سازگار ہیں؟

جواب:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے مخالفین کے پاس سورۂ فتح کی آیت مجید کے بعد سب سے بڑی دلیل سورۂ عبس کی شروع آیات ہیں۔ مخالفین عصمت اس موقع پر آنحضرتؐ کے ایک نابیان شخص کی طرف سے رخ موڑ لیے، اس سے ترش روئی سے پیش آنے اور مشرکین سرداروں کی طرف متوجہ ہونے کو آنحضرتؐ پر سبب عتاب الٰہی قرار دیتے ہیں جو آنحضرتؐ کے غیر صحیح اقدام کو ظاہر کرتا ہے۔

مشرکین کے دلائل کی وضاحت اور آیات مبارکہ کے مطالب کو روشن کرنے کے لیے ہم زیر نظریات کو سامنے لاتے ہیں اور پھر ان کا

تجزیہ وتفسیر پیش کریں گے۔ خداوند عالم اس سورۂ مبارکہ کی دس آیات کے ضمن میں فرماتا ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ⑦ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ⑧ وَهُوَ يَخْشٰى ⑨ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ⑩

''اس نے ترش روئی دکھائی اور منہ پھیر لیا جس وقت نابینا اس کی طرف آیا، تم کیا جانو شاید وہ تزکیہ کرے یا اس کا ذکر کرے اور اس کا ذکر فائدہ مند ہوگا مگر وہ شخص جو اپنے آپ کو (تیری ہدایت سے) بے نیاز خیال آتا ہے، تم اس کی طرف رخ کرتے ہو، تم پر کوئی بات (الزام) نہیں اگر وہ اپنے آپ کو پاک نہ کرے۔ باقی رہا وہ شخص جو تمہاری جانب آتا اور کوشش کرتا ہے اور (مخالفت خدا سے) ڈرتا ہے تم اس سے اعراض کرتے ہو''۔ (عبس۔ ۱ تا ۱۰)

آیات مبارکہ کے مقصود کی وضاحت اور دلائل لانے والوں کے استعمال کی پختگی کے سلسلہ میں ہم چند نکات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱)۔ آیات مبارکہ کا شان نزول:

آیات مبارکہ کے شان نزول کے بارے میں ہمارے پاس وہ روایات ہیں جن میں ایک دلائل پیش کرنے والوں کو مورد توجہ ہے:

(ا)۔ ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عباس ابن عبدالمطلب اور خلف کے بیٹوں ابی اور امیہ سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دے رہے تھے کہ وہ دین اسلام اختیار کریں، (اس قسم کے سرداران قریش کا اسلام لانا دین اسلام کی طرف بہت سے دیگر اشخاص جھکاؤ کا باعث بن سکتا تھا)۔ اس موقع پر اچانک عبداللہ ابن مکتوم، جو نابینا تھے اور آنحضرتؐ کے سرداران قریش سے باتیں کرنے سے آگاہ نہ تھے، آئے اور بلند آواز سے مکرر عرض کیا: ''يَارَسُوْلَ اللهِ عَلِّمْنِيْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ'': اے اللہ کے رسول! جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی تعلیم دیجئے''۔ ان کی دوسری بار درخواست سے آنحضرتؐ کی بات قطع ہوئی۔ یہ بات سبب ہوئی کہ عبداللہ کی بات سے آنحضرتؐ کے چہرۂ اقدس پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے عبداللہ کی طرف سے رخ پھیر لیا اور سرداران قریش کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ اس واقعہ کی بنا پر آیات مندرجہ بالا نازل ہوئیں، اس واقعہ کے بعد جب بھی عبداللہ کو دیکھتے تو فرماتے کہ آفرین ہے اس پر جس کے لیے میرے اللہ نے مجھ پر عتاب فرمایا''۔[1]

(ب)۔ دوسری روایت ان نظریات مبارکہ کے شان نزول کے متعلق یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاندان امیہ کے ایک شخص کے ساتھ مصروف

[1] اسباب النزول واحدی، ص ۲۵۲، بہت سے دیگر مفسرین نے بھی اس شان نزول کو نقل کیا ہے۔

گفتگو تھے کہ اچانک عبداللہ ابن مکتوم آ نکلے۔ آنحضرت ﷺ اس نابینا شخص کو اموی پر ترجیح دی۔ یہ بات باعث بنی کہ اس اموی نے عبداللہ سے ترش روئی کا اظہار کیا اور اس سے اعراض برتا۔ خداوند عالم اس واقعہ کو ان آیات کریمہ میں نقل فرماتا ہے۔[1]

۲)۔ پہلی شان نزول کی تفصیل

ان دونوں شان ہائے نزول کے درمیان فیصلہ کرنا آسان کام نہیں، دونوں کا کوئی نہ کوئی مرجو یا مرجع موجود ہیں جو اس فیصلہ میں مشکلات پیدا کرتے ہیں، بہرحال پہلی شان نزول کی دو باتوں سے تائید ہوتی ہے:

(ا)۔ اس شان نزول کو بیشتر مفسرین نے شان نزول منحصر کے عنوان سے نقل کیا ہے، یا دو میں سے ایک شان نزول کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے، شان نزول کو یکجا کرنے والے ''واحدی نیشاپوری'' نے بھی اس کو لکھا ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔

(ب)۔ متذکرہ بالا آیات مجیدہ میں سے چھ آیات میں خطاب ہونے والے کلمات اس شان نزول سے بہتر موافقت رکھتے ہیں کیونکہ آیات شان نزول اول کی طرح ظاہر کرتی ہیں کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ نے عبداللہ ابن مکتوم کے ساتھ ترش روئی کی اور اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ پس خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ سے فرمایا: ''وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ...'' جبکہ دوسری شان نزول کے مطابق ان باتوں کا باعث ایک فرد اموی تھا۔ اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس واقعے کا باعث کوئی اور شخص تھا تو پھر آنحضرتؐ اس قسم کے خطاب پر از عتاب کے مورد کیوں قرار پائے اور خداوند تعالیٰ نے کیوں آنحضرتؐ سے فرمایا: ''وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ''

مولانا جلال الدین رومی کو یہ عنایت حاصل ہے کہ اپنے بہت سے عرفانی مسائل کو جو کتاب وسنت سے متعلق ہیں، پہلی شان نزول کی حمایت میں اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

چونکہ اعمی طالب حق آمدہ راست
بہر فقر اور انیا ید سینہ خست
تو حریص بر رشاد مہتران
تابیا موزند علم از سرداران

ترجمہ:

ایک نابینا طلب حق کے لیے آیا ہے۔ اس کے فقر کی بناء پر تیرے سینہ میں رنج اور دکھ نہ ہونا چاہیے، تجھے بڑے لوگوں کے ہدایت پانے کا لالچ ہے تا کہ لوگ سرداروں سے علم حاصل کریں۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم قمی، ج ۳، و مجمع البیان، ص ۷ ۴۳ اور تنزیہ الانبیاء

۳)۔ پہلی شان نزول میں اشکالات

اس شان نزول سے متعلق کچھ اشکالات ہیں جن سے آسانی سے نہیں گزرا جا سکتا، ہم یہاں ان میں سے چند ایک ذکر کرتے ہیں:

(ا)۔ سورۂ مبارکہ میں کسی شخص کی مذمت کرنا مراد ہے جو امراء و تونگر لوگوں کی ہدایت کو کمزور اور حاجت مند لوگوں پر ترجیح دے رہا ہے، یہ ہدایت کرنے والا، خواہ ایک بار ہی سہی، اہل دنیا کی طرف توجہ دیتا ہے اور اہل آخرت کو نظر انداز کر رہا ہے، لیکن یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تمام رسالت کے دوران ایسے نہیں رہے۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے سب ہدایت اپنے خلق عظیم سے فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی صورت ترجیح کسی کی طرف کبھی ظاہر نہیں فرمائی تھی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ آنحضرتؐ نے سرداران مشرکین سے بحث کرتے ہوئے اس قسم کی ترجیح کو اختیار فرمایا اور ایک امر اہم میں مشغول رہے۔

(ب)۔ قرآن مجید جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلق عظیم کے الفاظ سے توصیف فرماتا ہے، مندرجہ بالا شان نزول آنحضرتؐ کی اس صفت سے موافقت نہیں رکھتی۔ جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴

''تو عظیم اخلاق کا مالک ہے''۔ (قلم۔ ۴)

مفسرین کہتے ہیں کہ سورۂ قلم قرآن مجید کا دوسرا سورہ ہے جو سورۂ علق کے بعد نزول ہوا اور سب جانتے ہیں کہ سورۂ علق وہ پہلا سورہ ہے جو آنحضرتؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا۔ اس صورت میں کیا یہ صحیح ہوگا کہ خداوند عالم آغاز بعثت میں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و مزاج کی تعریف فرمائے لیکن اس کے بعد ایک امیر آدمی کے ساتھ بات کرتے ہوئے ایک کمزور و ناتواں شخص سے آپ کے رخ موڑنے کی مذمت کرے؟ مختصر یہ کہ آنحضرتؐ خلق عظیم اس کیفیت سے موافقت رکھتا تھا سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ آپ کا یہاں رخ موڑ لینا مصلحت کی خاطر تھا اور یہ عمل آپ کے خلق عظیم کے خلاف قرار نہیں پاتا۔

(ج)۔ پہلی شان نزول عام حالات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ فرض کریں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام، بازار یا خانہ اقدس میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھے، ان مقامات پر عبد اللہؓ کا اپنی حاجت کے لیے آنا آنحضرتؐ کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ کرتا تھا اور کافی ہوتا اگر آنحضرتؐ عبد اللہؓ کو ایک لمحہ کے لیے خاموش رہنے کے لیے کہتے اور مشرکین کے ساتھ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ سے یہ بعید ہے کہ اس قسم کے آسان حل کی موجودگی میں عبد اللہؓ سے ترش روئی سے پیش آتے، اس کی طرف رخ موڑ لیتے۔ اور غصہ کی حالت میں ہی اپنی گفتگو مشرکین سے جاری رکھتے، عبد اللہؓ ایک پاکیزہ قلب مسلمان تھے۔ جب وہ جانتے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی آمد سے قبل دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف گفتگو میں جو عبد اللہؓ پر حق تقدم رکھتے ہیں، تو کبھی بھی آنحضرتؐ کی طرف سے ایک لمحہ خاموش رہنے کی ہدایت ہرگز ان کے لیے تکلیف و ناراضی کا سبب نہ بنتی۔

(د)۔ قرآن مجید اقربائے آنحضرتؐ کو دعوت توحید دینے کے بارے میں، جو بعثت کے تیسرے سال واقع ہوئی تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرماتا ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

''اور اپنے قریب ترین عزیزوں کو ڈرایئے اور اپنے شانوں کو ان صاحبان ایمان کے لیے جھکا دیں جو آپ کی پیروی کریں''۔ (شعراء)

یہی کیفیت سورۂ حجر کی آیت ۸۸ کی ہے جو مکی سورہ ہے اس میں فرمان ہوتا ہے:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

''مومنین کی طرف اپنے شانوں کا جھکا دیں''۔ (حجر۔۸۸)

پھر اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۹۴ میں حکم آتا ہے:

وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

''مشرکین سے اعراض کر دیں''۔ (حجر۔۹۴)

ان تمام تاکیدی فرامین کی موجودگی میں بالخصوص ان میں سے بعض یا تمام یقیناً سورۂ عبس سے قبل نازل ہوئے ہیں کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مومن سے ترش روئی کے ساتھ اور کافروں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئیں، خواہ یہ عمل کفار کے اسلام کی طرف کشش اور اسلام کی تقویت کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔

ان تمام اشکالات پر غور کرنے سے پہلی شان نزول کو کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی یہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ یہ تمام تاکیدی عتاب آمیز خطابات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آرہے ہیں اگرچہ ان اشکالات کا بڑا حصہ شان نزول کی حمایت ہی میں کیوں نہ ہو۔

تاہم مولانا جلال الدین رومی نے مذکورہ شان نزول کو قبول کیا ہے اور عارفانہ کیفیت میں اس میں پھول بوٹے بھی لگائے ہیں، جہاں وہ کہتے ہیں:

احمدا نزد خدا ایں یک زریں
بہتر از صد قیصر است و صد وزیر
احمدا ایں جاندارد مالِ سود
سینہ با ید پرز عشق و درد و دود

اعمی روشن دل آمد درمبند

پند او رادہ کہ حقِ اوست پند

ترجمہ:

اے احمد مجتبیٰؐ! اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک لاغر نابینا سینکڑوں بادشاہوں اور وزیروں سے بہتر ہے۔ اے احمدِ مجتبیٰؐ یہاں مال ودولت سے کچھ حاصل نہیں بلکہ یہاں ایسے سینے کی ضرورت ہے جو عشق و دردوسوز سے مملو ہو۔ ایک روشن دل نابینا آپ کے پاس آیا ہے، اس کے لئے اپنا دروازہ بند نہ کریں۔ اس کو نصیحت کریں جو اس کا حق ہے۔

پس اس شان نزول کی حمایت میں ناقلان روایت نے جو گفتگو کی ہے قابل تردید ہے اور وہ یہ ہے:

"وَقَالَ فِيْ نَفْسِهٖ يَقُوْلُ هٰٓؤُلَاۗءِ الصَّنَادِيْدَ اِنَّمَا اَتْبَاعُهُ الْعُمْيَانُ وَالْعَبِيْدُ فَاَعْرِضْ عَنْهُ وَاَقْبَلَ عَلَى الْقَوْمِ يُكَلِّمُهُمْ"

"اور آنحضرتؐ نے اپنے دل میں کہا کہ قریش کے یہ بڑے لوگ کہیں گے کہ اس کے پیرو نابینا اور غلام ہیں، پس آنحضرتؐ نے (ان نابینا کی طرف سے) رخ پھیر لیا ان (مشرکین) کی طرف منہ کر کے ان سے باتیں کرنے لگے"۔

راوی سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کس طرح جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک کی مخفی کیفیت سے آگاہ ہوا، کیا آنحضرتؐ نے خود یہ جملہ راوی سے کہا یا اس نے اسے خود اپنے گمان سے گھڑ لیا۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ کے پیروان کی کیفیت قریش پر کسی طرح مخفی نہ تھی کہ آنحضرتؐ ان کی وضع کے ظاہر ہونے سے پریشان ہو جاتے۔

۴)۔ دوسری شان نزول کی تفصیل

یہ شان نزول بھی پہلی شان نزول کی طرح اشکال سے خالی نہیں کیونکہ:

(ا)۔ آیات مبارکہ کی توضیح کرنے والا تمام دس کی دس آیات کی وضاحت نہیں کرسکتا کیونکہ اس کی مراد اس سے زیادہ نہیں کہ جب نابینا عبداللہؓ ابن مکتوم آئے تو وہ اموی شخص کی آمد سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موجودگی میں ناراض ہوا، اس نے نابینا کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا اور اس سے دوری اختیار کی، صرف اتنی سی بات ان آیات مبارکہ کی وضاحت نہیں کرتی

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝۱ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝۳ اَوْ يَذَّكَّرُ

فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠

''اور تم کیا جانو کہ وہ تزکیہ قبول کرے یا گفتگو اس کو نفع بخشے۔لیکن جس نے بے نیازی کا اظہار کیا تم اس کی طرف رخ کرتے ہو، اگر وہ تزکیہ نہ کرے تو آپ پر کوئی الزام نہیں سوائے اس شخص کے جو آپ کے قریب آتا ہے، کوشش کرتا ہے جبکہ وہ خود خوف زدہ بھی ہوتا ہے تو آپ کی اس طرف سے رخ موڑ لیتے ہیں''۔(عبس۔۳ تا ۱۰)

دوسری شان نزول اجمال واختصار کی بناء پر ان آیات مبارکہ کے مطالب کی وضاحت نہیں کرتی کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ نابینا عبداللہؓ اس اموی شخص کے پاس نہیں آئے تھے، اور نہ ہی انہوں نے اس اموی سے ہدایت کی درخواست کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اموی کے حق میں فرماتا ہے :''وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ، اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى '' پھر وہ اموی شخص کسی دولت مند شخص کو ہدایت بھی نہیں کر رہا تھا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:''اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۔۔۔''

پس اس شان نزول سے سورۂ مبارکہ کی صرف دو ابتدائی آیات کی وضاحت تو ہو سکتی ہے لیکن دوسرے مطالب یعنی نابینا کے کچھ کہنے کے امکان، یا دولت مند شخص کو بظاہر ہدایت کی اس سے کوئی موافقت نہیں، نہ ہی ان آیات مبارکہ کی اس قدر اختصار کے ساتھ وضاحت ممکن ہے۔

(ب)۔اگر اس تمام روگردانی کا مصدر نابینا عبداللہ ابن مکتوم ہے اور آنحضرتؐ کا اس اموی دولت مند شخص کی طرف رخ کرنا ہی مراد ہے تو پھر تیسری آیت کے بعد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کیوں مورد خطاب قرار پاتے ہیں اور وہ بھی غائب کی ضمیروں سے جو جملہ ''عَبَسَ وَتَوَلّٰى ، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى '' میں پائی جاتی ہیں اور پھر مخاطب سے جو''وَمَا يُدْرِيْكَ ۔۔۔'' میں نقل ہو رہی ہیں؟ اس کے باوجود دونوں اشکال جواب کے قابل ہیں۔

پس پہلے اشکال کے لیے کہنا چاہیے کہ شان نزول ناقص صورت میں بیان کی گئی ہے، احتمال ہو سکتا ہے کہ اصلیت واقعہ اسی طرح ہو کہ جس سے تمام دس آیات کی تفسیر ہو جاتی ہو کیونکہ، جیسا کہ سابق میں کہا گیا ہے کہ ایک اموی شخص کی روگردانی سے تمام دس آیت کی تفسیر نہیں ہو سکتی۔

دوسرے اشکال کے بارے میں تو واضح جواب دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر چہ بظاہر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہو رہا ہے لیکن اس خطاب سے کوئی شخص اور مراد ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نزول آیت سے قبل کوئی شخص موجود تھا جس نے نابینا شخص کے آنے پر ترش روئی سے کام لیا، اس نے منہ پھیر لیا اور اس امید پر دولت مند لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا کہ انہیں ہدایت کرے۔لیکن یہ شخص خواہ کوئی بھی ہو قرآن مجید اس کی نشان دہی نہیں

کرتا۔ اور (عَبَسَ، تَوَلّٰی، جَآءَہٗ) صیغہ ہائے کے غائب کے لانے سے مطالب آیت بالکل مبہم وغیرواضح رہتے ہیں۔ لہٰذا احتمال باقی رہتا ہے کہ یہاں آنحضرتؐ کے علاوہ کوئی اور شخص مراد ہے، تاہم یہ بات کہ اثنائے گفتگو میں ضمائر غائب سے ضمائر مخاطب کی طرف کیوں گفتگو کو منتقل کیا، تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو فن بلاغت کو ظاہر کرتی ہے یہی مخاطب کوئی اور ہو اور مراد کسی اور شخص سے ہو، علم معانی میں اس طرح کی گفتگو ایک خاص قاعدہ کو ظاہر کرتی ہے۔[1]

لہٰذا احتمال یہ ہے کہ ان خطابوں سے مراد وہی شخص ہو جو اس قسم کی لغزش کا مرتکب ہوا جب کہ بظاہر یہ خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کا خطاب ''ایاك اعنی واسمعی یاجارۃ'' کی مثال ہے یعنی ''کہتا تم سے ہوں لیکن پڑوسن تو بھی سنتی رہ۔'' ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں کئی ایسے مواقع تخاطب ہیں جہاں خود آنحضرتؐ سے خطاب ہوتا ہے لیکن مراد افراد امت یا چند مخصوص افراد ہوتے ہیں۔

۵)۔ خطاب کا مقصود جب مخاطب خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں

فرض کیجئے کہ پہلی شان نزول درست و صحیح ہے اور ان تمام باتوں کے مخاطب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں کیونکہ بات خود انہی سے ہو رہی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خطاب آنحضرتؐ سے صدور گناہ و خطا پر شاہد نہیں کیونکہ آنحضرتؐ نے ایک سلسلہ تقاضہ ہائے عقلی کے مطابق کہ ان چند افراد کا اسلام و ایمان لے آنا اسلام ک تبلیغ میں مدد و معاون ہوگا، اور اس فرد نابینا کی آمد سے ہوسکتا ہے کہ وہ افراد صحبت پیغمبر کو ترک کر دیں جس سے ایک منفی نتیجہ برآمد ہو، ایسا عمل عقل مند لوگوں کی منطق میں قابل قبول ہوگا، اگرچہ اخلاق اسلامی اس سے تھوڑا مختلف ہی ہو جس کا طریق کار بعد میں پیش ہوتا ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے:

''كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ‌، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ''

یعنی ''ایسا نہیں ہے بلکہ قرآن ذریعہ ہدایت ہے، اس سے ہدایت پائے''۔

یہ آیات مبارکہ پہلی شان نزول کے صحیح ہونے کے مفروضہ کے مطابق اس بات کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مورد توجہ الٰہی ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کے صرف حرکات و سکنات ہی وحی الٰہی کے مصداق نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ کی نگاہیں اور چہرۂ اقدس کے نقوش بھی عنایت پروردگار کے مظہر ہوتے تھے۔

خداوند تعالیٰ ''كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ'' کے جملہ سے سمجھاتا ہے کہ قرآن کا کام انسان کی فطرت اور اس کے ضمیر کے مطابق اس کو بنانا ہے، نیز اس شے کی ہدایت کرنا ہے جو وجود انسانی کی ساخت میں قضائے الٰہی کے مطابق لکھ دی گئی ہے۔ اس معاملہ میں تمام افراد برابر ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص کی طرف تزکیہ نفس و تعلیم وحی متوجہ نہ ہو جس کے باعث کوئی بے یار و مددگار شخص کسی معینہ صورت میں تزکیہ نفس اور تذکرہ

---

[1] تعبیر یہ ہے کہ ''من قصد به الخطاب غیر من القی الیه الخطاب'' خطاب کسی اور سے ہو رہا ہے اور مقصود کوئی اور ہو۔

سے محروم رہ جائے۔ تاہم ہر حالت میں کوئی کام اس اعتبار سے فعل گناہ نہیں ہوگا۔

یہ مطالب اس صورت میں واضح ہوجاتے ہیں کہ ہم اس طرح غور کریں کہ وہ شخص نابینا تھا جس کی طرف اظہار قریش روئی یا منہ پھیر لینا یا اس کے برعکس عمل کا صدور اس کے لیے یکساں تھا اور اس کی طرف خطاب کا سبب وہ امور تھے جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱)۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے پیغمبر کو خوبیوں سے زیادہ سے زیادہ آشنا فرمائے۔

۲)۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اپنے پیغمبر کو ہدایت یافتہ مومن کی عظمت شان سے آگاہ فرمائے اور آنحضرتؐ پر واضح فرمائے کہ ایک مومن کا اس لیے دل جیتنا کہ اس کا ایمان مزید پختہ ہو اس سے بہتر ہے کہ ایک مشرک کا دل اس امید سے رکھا جائے کہ اس طرح وہ شاید ایمان لے آئے گا۔

۳)۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ سرداران قریش، جو اپنے آپ کو ہدایت پروردگار سے بے نیاز جانتے ہیں جان لیں کہ وہ ہدایت و تزکیہ نفس کے اہل نہیں ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان سے متعلق کوئی ذمہ داری نہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

"وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا يَزَّكّٰى.... كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ"

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ بات واضح نہیں کہ کون شخص قرآن مجید کا مورد نظر ہے۔ فرض کریں کہ ان آیات مبارکہ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں، اس صورت میں نابینا شخص سے ترش روئی اور رخ پھیر لینا اس غرض سے کہ آنحضرتؐ ایسی جماعت کی ہدایت کی طرف متوجہ تھے جو قابل ہدایت تھی اور ان کا ہدایت پالینا تبلیغ اسلام کا سبب ہوتا۔ فعل حرام نہیں اگرچہ مقام نبوت کے شایان شان نہ بھی ہو بجائے اس کے کہ نابینا کی آواز پر آنحضرتؐ لبیک کہتے اور سرداران مشرکین کو چھوڑ دیتے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داریاں

منجملہ ان مسائل کے جن کو قرآن مجید نے خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے، اسلامی معاشرہ کے وہ فرائض ہیں جن کی نسبت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، ہم اس حصہ کتاب میں سے ان دس فریضوں کی طرف اشارہ کریں گے جن کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے، ان فرائض کی خصوصیات وتشریح وتفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

(۱)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لحاظ سے کہ آنحضرتؐ وحی الٰہی کو مقام ربوبیت سے حاصل کرتے ہیں نبی (اخبار غیبی سے واقف) کہتے ہیں ۔ نیز اس اعتبار سے کہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہیں رسول کا نام دیا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ ان دونوں مقامات میں امر ونہی اور اطاعت وعصیان سے محفوظ ہیں۔ آپ کے فرائض میں پیغام لینے اور پہنچانے کے علاوہ اور کوئی چیز شامل نہیں ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝

''رسول پر تبلیغ کے سوائے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو''۔ (مائدہ۔۹۹)

قرآن مجید حدود رسالت میں رسول کے حق اطاعت کو بیان فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

''اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ (نساء۔ ۶۴)

اطاعت سے مراد عملی اطاعت ہے، نہ کہ صرف زبان سے، یعنی رسول کے پیغام کو کان لگا کر غور سے سنا جائے اور اس کے اقوال مثلاً نماز بجالانے اور ادائے زکوٰۃ پر عمل کیا جائے۔ اس قسم کے فرائض کا بجالانا در حقیقت حکم خدا کی اطاعت ہے نہ کہ اطاعت پیغمبر، اگرچہ بظاہر یہ اطاعت پیغمبر بھی شمار ہوگی، قرآن مجید اس قسم کی اطاعت کی ماہیت کو ایک آیہ مبارکہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

''جس نے رسول کی اطاعت کی، گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی''۔ (نساء۔ ۸۰)

یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر جہاں قرآن مجید رسول کی رسالت کے عنوان سے ان کی اطاعت کا ذکر فرماتا ہے، وہاں حقیقتاً اطاعت

رسول مراد نہیں بلکہ اطاعت خداوند تعالیٰ سے مراد ہے اور اسے ایک پہلو سے ہی اطاعت رسول کی نسبت دی جاتی ہے اسی لیے قرآن مجید شخصیت رسول کی ''مقام رسالت'' کے اعتبار سے اس طرح تصویر کشی فرماتا ہے:

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾

''یقیناً تم بتا دینے والے ہو، ان پر مسلط نہیں ہو''۔ (غاشیہ، ۲۱ تا ۲۲)

جہاں تک حدود اطاعت کا تعلق ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت اگرچہ صرف ہدایت کرنے والے تربیت دینے والے اور پیغام پہنچانے والے کی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقام امامت پر فائز ہوتے ہوئے ''مفترض الطاعة'' قرار پاتے ہیں اور اس کیفیت میں آنحضرتؐ بذات خود مقام امر و نہی کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس حیثیت سے آنحضرت محض وحی کے ترجمان اور اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہی نہیں رہتے بلکہ حکومت اسلامی کے راس و رئیس قرار پاتے ہیں جو امور امت کے نظم و نسق کے لیے سپہ سالاروں، عاملوں، اور قاضیوں کے نصب و عزل کے ذمہ دار ہیں، نیز افواج کے سپرد مہمات کو دینا اور عقد معاہدات بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس صورت میں حقیقتاً امر و نہی کے حامل ہو جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور سربراہ حکومت اسلام ان کے قاضی، عدل کنندہ، اور ان کے تمام اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور دینی امور کے مدیر قرار پاتے ہیں، اس موقع پر آنحضرتؐ کو اطاعت طریقی کے علاوہ موضوعی کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے اور آنحضرتؐ کے مقرر کردہ آئین و احکام کی اطاعت کرنے والا مستحق اجر و ثواب اور نافرمانی کرنے والا موجب سزا قرار پاتا ہے۔

قرآن مجید اطاعت پیغمبر کی بہت سے مواقع پر تاکید فرماتا ہے، ایک محقق مفسر پر لازم آتا ہے کہ دونوں اقسام اطاعت (طریقی و موضوعی) میں امتیاز کو برقرار رکھے اور آیات مبارکہ کو دو اقسام میں تقسیم کرے۔

(ا)۔ وہ جماعت جو اطاعت رسول کا حکم دیتی ہے اور قرائن یہ شہادت دیتے ہیں کہ اطاعت رسولؐ سے احکام الٰہی کا بجالانا ہی مقصود ہے جن کو وہ تبلیغ کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے انجام فرائض اور اجتناب از محرمات کی تبلیغ کی جاتی ہے، تو اس صورت میں اطاعت رسولؐ اطاعت خدا کے لیے راہ ہموار کرتی ہے جب کہ رسول اکرمؐ بذات خود یقیناً اطاعت و نافرمانی کا موقع نہیں رکھتے۔

(ب)۔ وہ جماعت جو رسول کا تعارف بطور ''اولی الامر'' حکم دینے والا قاضی و حکم کراتی ہے، ان کے ہاتھوں کو اجتماعی امور کے انتظام کا ذمہ دار اور انہیں اوامر و نہی کا حقدار قرار دیتی ہے۔ ایسے مواقع میں اطاعت رسول اپنے مقام پر موضوعیت پیدا کر لیتی ہے اور احکام و خصائص کی حامل ہو جاتی ہے۔

حصہ اول سے متعلق آیات اپنی کثرت کی وجہ سے محتاج نہیں ہیں، حصہ دوم سے متعلق آیات مبارکہ اہمیت رکھتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم کرتے ہیں:

۱) أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ

''اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو، اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہیں''۔ (نساء۔ ۵۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیہ مجیدہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان حضرات میں شامل ہیں جن کو ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' کہا گیا ہے اور ازراہ بیشتر احترام آپ کا نام علیحدہ طور پر لیا گیا ہے۔ پھر ''اولی الامر'' حضرات واقعی اسلامی معاشرہ پر حاکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ اپنے مقام کی بدولت اوامر و نواہی کے لیئے اطاعت و نافرمانی کے مواقعات قرار پاتے ہیں۔

۲) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿۶۵﴾

''ایسا نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہوں گے جب تک وہ آپ کو اپنے اختلافات میں حکم قرار نہ دیں۔ پھر آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تکلیف محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں''۔ (نساء۔ ٦۵)

یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاضی و حکم کی صورت میں جلوگر ہو رہے ہیں اور تحفظ نظام کی خاطر مقام امر و نہی کے حامل قرار پاتے ہیں، اگر آنحضرتؐ کو قابل اطاعت تسلیم نہ کیا جائے آپ کے احکام جاری نہ ہو پائیں تو عدالت میں خلل واقع ہو جائے گا اور معاشرہ افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔

۳) فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۶۳﴾

''پس جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ فتنہ اور دردناک عذاب ان کے دامن گیر ہوگا۔ (نور۔ ٦۳)

یہاں ''عن امرہ'' کا جملہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت و تبلیغ سے قطع نظر، جہاں تک بھی سمجھ میں آتا ہے، حاکم امر و نہی ہیں جس کی مخالفت شدید ردعمل رکھتی ہے۔ اس بات کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ یہ آیہ مبارکہ مسئلہ جہاد اور میدان جنگ میں ثابت قدمی سے تعلق رکھتی ہیں، ان حالات میں آنحضرت صرف مبلغ احکام ہی نہیں بلکہ ایسے فرمانبردار ہیں جس کی اطاعت واجب ہے اور جس کی فرمانبرداریاں حرف بہ حرف واجب قرار پاتی ہے۔

۴) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٢﴾

''واقعی مومن وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر وہ کسی امر اہم میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس کی اجازت کے بغیر کسی جگہ نہیں جاتے۔ جو لوگ آپ سے اجازت لیتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوتے ہیں، ان حالات میں جب ان میں سے کچھ لوگ اپنے کاموں کے لیے آپ سے اجازت چاہیں تو جس کو آپ چاہیں اجازت دے دیں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں۔ اللہ یقینا بخشنے والا مہربان ہے''۔ (نور۔ ٦٢)

میدان جنگ کو چھوڑتے وقت یا ایسی مجلس مشاورت کو ترک کرتے وقت جس میں اہم امور پر مشورہ مطلوب ہو آنحضرتؐ سے اجازت لینا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم وجلیل مقام ومنصب کی نشان دہی کرتا ہے۔ تاکہ تمام لوگوں کی حرکات وسکنات آپ کے زیر نظر انجام پائیں۔

٥) اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

پیغمبرؐ جو مومنین کے نفوس پر خود ان سے اولیٰ ہیں''۔ (احزاب۔ ٦)

ایسی برتری نفوس کی دنیا کی کسی شریعت میں مثال نہیں دیکھی گئی۔ یہ برتری نفوس کے مالک (اللہ تعالیٰ) کی جانب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تفویض ہوئی ہے۔ اس برتری سے معاشرہ اسلامی کی مصلحتیں فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ افراد معاشرہ آنحضرتؐ کے احکام پر توجہ کرتے ہیں اور ان کے احکام کو اپنی خواہشات پر مقدم جانتے ہیں۔ اس آیہ مبارکہ کے مطالب اسی سورۂ مجیدہ میں وضاحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

٦) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿٣٦﴾

جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں حکم دے دیں تو کسی مومن مرد یا مومن عورت کو کسی قسم کا کوئی اختیار اپنے کاموں میں باقی نہیں رہتا جو شخص خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرے تو وہ ظاہر طور پر گمراہ ہے''۔ (احزاب۔ ٣٦)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر قدرت واختیارات کی تفویض کسی انفرادی حکومت اور شخصی استبداد کی علامت نہیں کیونکہ اللہ کے رسول

کوئی عام شخص ہوتے تو آپ کو اتنی قوت کا حامل بنانا جماعت پر استبداد و انفرادی حکومت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ لیکن درحقیقت آنحضرتؐ ایک عام شخصیت کے مالک نہیں۔ آپ ہر قسم کے ذاتی غرض سے بلند ہیں۔ آپ رضائے الٰہی کے سوائے کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ آنحضرتؐ گو اپنے قول و عمل میں ''روح القدس'' کی تائید حاصل ہے اور آپ ہر قسم کی خطا و لغزش سے محفوظ ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں آپ کے حکم و فرمان خداوند تعالیٰ کے احکام و فرمان کے مظہر ہیں، جو آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

یہی وہ مقام عصمت ہے جس کے لیے خداوند عالم درج ذیل دو آیات مجیدہ میں اپنے رسولؐ پر ہر قسم کی پیش دستی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

۷) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ①

''اے صاحبان ایمان! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر تقدم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اللہ سننے والا ،دانا ہے''۔ (حجرات۔۱)

۸) وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ؕ لَوۡ یُطِیۡعُكُمۡ فِیۡ كَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ

''اور جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری پیروی کرے تو تم زحمت و خرابی میں پڑ جاؤ گے۔ (حجرات۔۷)

لیکن اس مقام و عظمت کے باوجود خداوند عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعض مصلحتوں کی بناء پر مشورہ کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ اس طرح بزرگ اصحاب کرام کی جماعتی حیثیت کی حفاظت فرمائے۔ پس ارشاد ہوتا ہے:

۹) فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ

ان کو معاف کردیں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں اور ان سے (مختلف) امور میں مشورہ لیں''۔ (آل عمران۔۱۵۹)

اطاعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت زیادہ دلائل ہیں جن سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ سب سے اہم بات یہ آپ کی اطاعت کی حدود کا تعین ہے جو اختصار کے ساتھ ہم بیان کرتے ہیں:

اطاعت رسولؐ کے تین مواقع

جو آیات مجیدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی اطاعت، سیاسی

،عدالتی اور انتظامی مسائل میں محدود کی جاسکتی ،یعنی پیغمبر اکرم ﷺ تبلیغ احکام کے منصب کے علاوہ رہبر سیاسی ،سردار عدلیہ اور سالار فوج بھی ہیں۔آنحضرتؐ ان تمام شعبہ جات میں ''نافذ القول''اور واجب الاطاعت ہیں۔ہم تمام مواقع کے نمونے پیش کریں گے۔

(ا)۔مسائل سیاسی میں اطاعت

جنگ کے دوران واقع ہونے والے حساس مسائل میں سے ایک مورچوں کے حالات سے واقفیت اور فتح وشکست سے متعلق کیفیات معلوم کرنا ہوتا ہے۔ان حالات کے نشر وعدم نشر کے بارے میں غور وفکر اور سوچ و بچار، نیز عام مصلحتوں میں تفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں قرآن مجید ذات رسول اکرمؐ کا تعارت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾

''جب کوئی امن بخش یا ڈرانے والی (فتح یا شکست کی) خبر ان تک پہنچتی ہے تو وہ اسے آگے پھیلا دیتے ہیں،اگر وہ اس خبر کو پیغمبرؐ یا اپنے درمیان صاحبان امر کی طرف لوٹا دیں تو ان میں سے فیصلہ کرنے والے اور اصلیت کو سمجھنے والے لوگ مطالب کی حقیقت سے واقف ہوں گے (حقیقت کو ان سے بیان کریں گے)اگر اس (اللہ تعالیٰ) کا کرم ورحمت ان کے شامل حال نہ ہوتا تو سب کے سب ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ،شیطان کی پیروی کرنے لگتے''۔(نساء۔۸۳)

کامیابی کی خبر کا بے موقع ومحل پھیلنا اکثر تکبر وغرور کا باعث ہوتا ہے۔اسی طرح شکست کی خبر کی اشاعت قلوب کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔لہٰذا مسلمانوں کا فرض اس کے علاوہ کا اور کچھ نہیں کہ تمہیں ملنے والی خبروں کو پیغمبر اکرم ﷺ اور اپنے درمیان صاحبان امر (جو بحکم پیغمبر یہ مقام ومنصب حاصل کرتے ہیں) کے سامنے پیش کریں تا کہ یہ حضرات اصلیت وحقیقت معلوم کرنے کے بعد دیگر مسلمانوں کو حقیقت امر سے آگاہ کریں۔

یہ آیہ کریمہ پیغمبر اکرم ﷺ کی سیاسی حالات میں رہبری کی نشاندہی کرتی ہے۔اس میں اولی الامر کا ذکر کسی طرح بھی آنحضرتؐ کے بطور سیاسی رہبر ہونے کے منافی نہیں کیونکہ اولی الامر آپ ہی کے حکم سے صاحبان امر اور عوام الناس کے پیشوا قرار پاتے ہیں،بالخصوص جبکہ روایات کے پیش نظر اولی الامر سے ''پیشوایان معصوم'' مراد ہیں،جو آنحضرتؐ کے بعد سیاسی مرجع بنتے ہیں۔آنحضرتؐ کے مربی وحاکم ہونے سے متعلق آیات صرف اسی آیت پر منحصر نہیں بلکہ جو آیات آغاز بحث میں پیش کی گئیں ان کا کچھ حصہ آنحضرتؐ کے مقام سیاسی کا شاہد ہے۔

(ب)۔ مسائل عدلیہ میں اطاعت

اگر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیہ مبارکہ کے مطابق ایک یگانہ سیاسی رہبر ہیں تو دیگر آیات کے مطابق مسائل عدلیہ میں بھی یگانہ رہبر قرار پاتے ہیں، بلکہ دیگر حکام عدلیہ کے فیصلہ بھی صحت کے اعتبار سے آپ ہی کے فرامین ونصاب کے مرہون منت ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے درمیان سے صاحبان امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں نزاع واقع ہو تو اس کو اللہ اور رسولؐ کی جانب سے پلٹا دو۔ تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس میں بہتر انجام و عاقبت ہے''۔ (نساء۔۵۹)

یہ آیہ مبارکہ حکم دیتی ہے کہ اپنی مشکلات قضاوت کو خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے سے اس کے نمائندہ کی جانب رجوع کرنا مراد ہے۔ تاہم آیت زیر بحث میں سوالات سامنے آتے ہیں جن کے بارے میں مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔ [1]

اسی اصول کے تحت کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے احکام قضاوت میں مقام یگانہ رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کے موجود ہونے کے باوجود حکام باطل کی طرف رجوع کرنے والی جماعت کی سختی سے مذمت فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس چیز پر جو آپ پر اور آپ سے قبل نازل ہوئی، ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ مظاہر طغیان (حکام باطل) کو فیصلہ کرنے کے لیے بلائیں، تو شیطان چاہتا ہے کہ ان کی شدت سے گمراہ کرے''۔

طاغوت کی طرف رجوع شیطان کا جال ہے جو چاہتا ہے کہ انسان کو راہ راست یعنی پیغمبر معصوم سے انصاف طلب کرنے میں بے راہ روی کی طرف لے جائے۔

[1] (۱) اولی الامر سے کون مراد ہیں؟ (۲) فعل ''اطیعوا'' کا ذات رسول کیلئے تکرار ہوا ہے لیکن اولی الامر کیلئے ایسا کیوں نہیں ہوا (۳) آغاز آیت میں اطاعت اولی الامر کو لازم قرار دیا گیا ہے لیکن قضاوت کے مسائل میں اولی الامر کا نام نہیں اور فرمایا گیا ہے۔ ''فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' اسی قسم کے دوسرے سوالات ہیں جس پر کسی اور وقت بحث پیش کی جائے گی۔

یہ آیات پیغمبر اکرم ﷺ کا بطور ایک یکتا و یگانہ سیاسی رہبر اور مرجع قضا و عدل تعارف کرواتی ہے، مسلمانوں پر فرض عائد کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ کی طرف اپنے معاملات میں رجوع کریں اور آنحضرتؐ کے علاوہ دیگر لوگوں کی طرف ہرگز رجوع نہ کریں جو طاغوت و حکام باطل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیز انہیں لازم ہے کہ آنحضرتؐ کے احکام کا احترام کریں۔

(ج)۔ مسائل انتظامی میں اطاعت

قرآن مجید جناب رسول خدا ﷺ اور تنظیمی مسائل میں بھی ماہر و یکتا رہبر قرار دیتا ہے، اس سلسلہ میں حکم دیتا ہے کہ انتظامی مسائل کے معمولی سے معمولی پہلو کے لیے بھی مثلاً میدان جنگ سے رخصت وغیرہ میں آپ کی اجازت حاصل کی جائے اور اگر آپ کی اجازت حاصل کی جائے اور اگر آپ کی اجازت نہ ہو تو چاہیے کہ میدان جنگ میں اپنی موجودگی تمام امور پر مقدم رکھیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ط

''ایمان والے تو بس وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جہاں کہیں کسی امر میں اجتماع ضروری ہے وہاں سے ان کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتے''۔ (نور۔ ۶۲)

اس آیہ مبارکہ کا متن و ترجمہ بحث میں گزر چکے ہیں۔

''امر جامع'' کے معنی ہیں وہ اہم کام جس میں لوگوں کا اجتماع لازم ہو، اس کا مصداق واضح دشمن سے جہاد و مبارزہ ہے۔ آیہ مبارکہ کی شان نزول انہی معنی کی تاکید کرتی ہے۔

ان آیات مجیدہ کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ کا سیاسی و عدالتی و تنظیمی امور میں یگانہ و یکتا رہبر کے طور پر تعارف کرانا معاشرہ کے جملہ مصلحتوں کی حفاظت کی خاطر ہے تاکہ تمام معاملات کے لیے ایک ہی مرکز اصلاح قرار پائے، تمام شعبہ جات کے مختلف مسائل ایک ہی مرکز کے گرد گردش کریں اور تمام امور ایک ہی فکر و ذہن سایہ فگن رہے۔

یہی وہ مقام نظامی ہے جس کی خاطر خداوند عالم (ایسے وقت میں جب پیغمبر اکرم ﷺ دعوت جہاد دے رہے ہوں) اجازت نہیں دیتا کہ اہل مدینہ اور اس کے نواح میں رہنے والے آنحضرتؐ سے تخلف کریں اور اپنی جان کی حفاظت کی خاطر آنحضرتؐ کی حفاظت سے چشم پوشی کریں۔ اسی لیے فرماتا ہے:

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ط

''اہل مدینہ اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کے لیے یہ بات ہرگز روا نہیں کہ رسول اللہؐ سے تخلف اختیار کریں اور اپنی جانوں کی حفاظت کی خاطر آنحضرتؐ سے اعراض کریں''۔ (توبہ۔ ۱۲۰)

یہ آیات مبارکہ جن کی قرآن مجید میں اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، واضح کرتی ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سیاسی و عدالتی وانتظامی اور دیگر مسائل میں آنحضرتؐ کی طرف رجوع کریں اور آنحضرتؐ کے احکام سے تخلف وتجاوز نہ کریں۔ درحقیقت یہ احکام آنحضرتؐ کی لوگوں پر اطاعت کی حدود کو واضح روشن کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق مسلمانوں کے دیگر فرائض

۲)۔ احترام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بزرگان دین کی عزت وتکریم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ شخصیات کے احترام پر اعتقاد ان حضرات کی غلامی و بندگی کے جذبہ کے ساتھ، درحقیقت خداوند سبحانہ تعالیٰ ہی کی تعظیم وتکریم کہلاتی ہے۔ ان حضرات کا احترام صرف اس نظریہ کے تحت نہیں ہونا چاہیے کہ وہ انسان کامل تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کے سامنے راہ راست کو کھولا، بلکہ ان کی بزرگی کے احترام کے لیے ایک اور قسم کا جذبہ وفکر کارفرما ہیں جو عارف لوگوں کو ان کے احترام وتعظیم پر ابھارتے ہیں، ان حضرات کے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ایک محکم ارتباط اور مستقل تعلق کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ حضرات گرامی ایک لمحہ کے لیے حق تعالیٰ کی مخالفت نہ کرتے تھے اور ہمیشہ ہمیشہ کے فرامین کو جاری فرماتے اور اس کی راہ پر قائم رہتے تھے۔

اس بناء پر ان حضرات کی تکریم وتعظیم کے سلسلہ میں ان کی گناہ سے پاکیزگی وطہارت، اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے ان کے عشق وخلوص، آئین حق تعالیٰ کی تبلیغ میں ان کی قربانیوں اور جانبازیوں پر اعتقاد، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس سے عشق کے مترادف ہے، ہمارا ان حضرات کو دوست رکھنا اور ان کا احترام کرنا اسی بنیاد پر ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتے تھے، اس کے عشق میں سرشار تھے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو دوست رکھتا تھا۔

بالفاظ دیگر شعلہ عشق خدا اور اس کی آتش مہر ومحبت ہی ہیں جو قلوب عارفان میں شعلہ ہائے محبت اولیاء اللہ کو زندہ رکھتے ہیں، یہی کیفیت انسان کے ان حضرات کے ساتھ تعلق کو قائم رکھتی ہے، اگر یہ مستقل رشتہ اللہ کے اولیاء اور پروردگار عالم کے درمیان نہ ہوتا تو ہرگز لوگ ان حضرات سے اس حد تک عشق نہ رکھتے اور نہ ہی ان کی مہر ومحبت لوگوں کے قلوب میں جاگزیں ہوتی۔ قرآن مجید اس حقیقت معرفت کا ذیل آیہ مبارکہ میں اقرار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۳۱

''کہہ دیجئے! کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، پس خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا، تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔ (آل عمران۔۳۱)

اس آیہ مبارکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو خداوند تعالیٰ سے محبت کا معیار قرار دیا گیا ہے، یہ اس طرح ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار ہیں ان کی اس محبت کا معیار ان کی اطاعت رسولؐ میں رکھا گیا ہے۔ اس میں وہی نکتہ مضمر ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے

انبیاء علیہم السلام کی جانب ہر قسم کا رجحان وعقیدت بطور رفتار و کردار و اظہار و مؤدت اور ان کے مقام و فضیلت کے اعتبار سے، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے مقام ربوبیت سے تعلق کا اظہار ہے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ سے عشق کی گہرائی سے ہی حاصل ہوتا ہے اور اسی جذبہ کا آئینہ دار ہے۔

مذہب وہابیت کی بنیاد بڑی بڑی مخصوص شخصیات کی شان گھٹانے اور اولیائے خدا کی اہمیت کو نظر انداز کرنے پر ہے۔ یہ لوگ اولیائے الٰہی کی وفات کے بعد ان سے کسی طرح کی وابستگی یا تعلق کو ایک قسم کا شرک اور ان کی عبادت تصور کرتے ہوئے اس عمل کو بدعت اور اسلام میں ایک نئے عمل کا اضافہ جانتے ہیں درآنحالیکہ قرآن مجید جگہ جگہ شخصیت اولیاء اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے لیے ان کی طہارت و پاکیزگی و اخلاص کے پیش نظر، جذبہ احترام مملو ہے۔ ہم یہاں چند ایک آیات قرآن مجید شامل بحث کرتے ہیں جو وہابی نکتہ نظر سے (اس معیار کی بناء پر جو ان کے عقائد کا جزو ہیں) شرک کی طرف دعوت کے مترادف ہے جبکہ ایک واقعی موحد شخص کے لیے یہ آیات مبارکہ عین توحید کی دعوت قرار پاتی ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اعزاز وتکریم کے لیے تو بس اسی قدر کافی ہے کہ قرآن مجید ایک سلسلہ افعال کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتے ہوئے انہی افعال کی آنحضرتؐ کی طرف بھی نسبت دیتا ہے، حتیٰ کہ ان افعال کے لیے خدا اور رسولؐ دونوں کا ایک ہی جگہ نام لیتا ہے جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اگر وہ لوگ اس چیز پر جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے، راضی ہو جائیں اور کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کافی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اس کا رسولؐ جو ہمیں دیتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہیں''۔ (توبہ۔۵۹)

ہر مسلمان اس آیۃ مبارکہ کے مطابق جملہ ''حَسْبُنَا اللّٰهُ'' میں شامل ہے۔ اس کے باوجود اسی آیہ مجیدہ میں پروردگار عالم اپنے پیغمبر اکرم ﷺ کے احترام کو اس درجہ مدنظر فرماتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اسم گرامی کو خود اپنے نام کے ساتھ توأم کرتے ہوئے ایک ہی عمل کو دونوں کے ساتھ منسوب فرماتا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے:

۱)۔ ''سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗ''

۲)۔ ''مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ''

بعینہ اسی مطلب کا درج ذیل آیہ شریفہ میں اظہار ہو رہا ہے:

(ب) يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ

كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾

''تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتے ہیں کہ تمہیں راضی کریں گے حالانکہ خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ حقدار ہیں کہ وہ انہیں راضی کریں۔ (توبہ۔ ٦٢)

''وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ'' کا جملہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کی اس طرح تصویر کشی کر رہا ہے کہ ان کی رضا و پسند کو اللہ تعالیٰ کی رضا و پسند کے برابر قرار دیتا ہے:

(ج) وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ

''اور وہ صرف اس بات کا انتقام لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے (ان کو) اپنے فضل وکرم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ (توبہ۔ ٧٤)

اس سے زیادہ اور کیا احترام مقصود ہوگا کہ ''اَغْنَاء'' یعنی بے نیاز کو دینا جو اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس کی طرف اپنے رسولؐ کو بھی نسبت دے رہا ہے اور آنحضرتؐ کو بھی لوگوں کو بے نیاز کرنے والے کے طور پر متعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے:

''اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ''

ایسی واضح آیہ مبارکہ کے باوجود اگر آپ کسی وہابی سے کہیں کہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں بے نیاز کر دیا ہے تو وہ فوراً آپ پر شرک کا اتہام لگا کر کہے گا کہ آپ مشرک ہیں کیونکہ آپ نے کار خدا کی غیر خدا کی طرف نسبت دے دی ہے۔ لیکن وہابی اس بات سے غافل رہتے ہیں جو قرآن فرما رہا ہے یعنی ''اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ''

اس قسم کی نسبتیں واقعیت وصحت کے عین مطابق ہوتے ہوئے ایک طرح پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام عظمت کو ظاہر کرتی ہیں۔

(د) وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾

''اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں اور پھر انہیں اس کی طرف لوٹا دیتے ہیں جو آشکار و پنہاں سے بے نیاز سب سے واقف ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ تمہیں اس سے آگاہ کر دے گا''۔ (توبہ۔ ٩٤)

(ہ) وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾

''اور جب مؤمنین نے ''احزاب'' کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے، اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا اور اس کا (احزاب سے ٹکراؤ) نے ان (کے قلوب) میں سوائے ایمان وتسلیم کے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا''۔(احزاب۔۲۲)

یہ آیات مکرمہ کامل طور پر حقیقت وصداقت پر مبنی ہوتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کی عظمت وطہارت کی نشاندہی فرماتی ہے اور اس بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ امر قطعی طور پر مناسب وشائستہ ہے کہ ایک ہی فعل کو اللہ تعالی اور اس کے رسول دونوں سے منسوب کیا جائے اگرچہ اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف استقلالی اور اس کے رسولؐ کی طرف اکتسابی ووابستگی کی شکل میں ہو۔

طرز معاشرت معیار ایمان کی مظہر ہوتی ہے

قرآن مجید پیغمبر گرامی ﷺ کی تعظیم وتکریم کو لازم قرار دیتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر افراد کے ساتھ کسی شخص کی طرز معاشرت اس کی عظمت اور واقعیت کے سلسلہ میں اس کے معیار ایمان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جناب رسالتمآب ﷺ اپنی حیات اقدس کے دوران زہد و پرہیز گاری کے مالک تھے۔ آنحضرتؐ سیاسی، عدلیہ اور تنظیمی (فوجی) مناصب کو خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے تھے۔ آنحضرتؐ اپنے اصحاب کرام کے ساتھ ہمیشہ بغیر کسی قسم کے صدارتی یا ذیلی مقامات مقرر کرنے کے لیے رشریف فرما ہوتے تھے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے معاشرے میں آنحضرتؐ کی حیثیت کو نظر انداز کریں اور مقام پیغمبرؐ کے مناسب آداب ومراسم کی رعایت نہ کریں۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے احترام سے متعلق آیات قرآن مجید کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا)۔ وہ آیات قرآن کریم جو کلیۃً احترام آنحضرتؐ کا حکم دیتی ہے۔

۲)۔ وہ آیات قرآن مجید جزوی طور پر موارد متعلقہ کی نشاندہی کرتے ہوئے نمونہ ہائے احترام کی مظہر ہیں، ہم اس حصہ بحث میں دونوں قسم کی آیات مجیدہ کا ذکر کریں گے۔

ا)۔ تکریم واحترام پیغمبر ﷺ کے بارے میں ہدایات وحکم

قرآن مجید اپنی آیات مقدس میں اسلامی معاشرہ کو اپنے رسولؐ کی تکریم واحترام کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے:

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝٨ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝٩

''ہم نے تجھے، اے رسول! گواہ، بشارے دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ خدا اور اس

کے رسول کی طرف ایمان لے آئیں، اس کی مدد و احترام کریں اور اس (اللہ تعالیٰ) کی صبح و شام کے وقت تسبیح کریں"۔(فتح۔۸،۹)

مذکورہ آیہ مبارکہ میں "وَتُعَزِّرُوْهُ و۔۔۔" کے جملوں سے پہلے "لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کا جملہ وارد ہو رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ "وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" کی ضمائر کا مرجع کیا ہے؟

اگر ہم کہیں کہ یہ تینوں ضمیریں "اللہ" کی طرف لوٹتی ہیں تو اس صورت میں آیہ مجیدہ میں واردشدہ احکام اللہ تعالیٰ سے متعلق قرار پائیں ۔پس آیت ہمارے موضوع بحث سے خارج ہو جائے گی۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ پہلی ضمیریں "وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ" کے جملوں میں ذات رسولؐ سے متعلق ہیں اور جملہ "وَتُسَبِّحُوْهُ" کی تیسری ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو فطری طور پر دو پہلے حکم یعنی نصرت رسولؐ اور آپؐ کی تکریم، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت ہر مسلمان پر اسلامی فریضہ کے طور قرار پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض قاریوں نے "وَتُوَقِّرُوْهُ" کے جملہ کے بعد وقف کو لازم جانا ہے تا کہ احکام متعلق بہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ سے متعلق احکام کے ساتھ مل نہ جائیں۔

لیکن آیہ مبارکہ کے متن میں دونوں احتمالات میں کسی ایک کی تعین پر کوئی شہادت موجود نہیں لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ دوسری آیت میں لفظ "عَزَّرُوْهُ" آنحضرتؐ مومنین کے فرائض کے لیے استعمال ہوا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ دوسرا تصور پہلے پر برتری رکھتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۱۵۷

"وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے پھر اس کو برگزیدہ جانا، اس کی مدد کی اور اس نور کی، جو اس کے ساتھ نازل ہوا، پیروی کی، وہی فلاح پانے والے ہیں"۔(اعراف۔۱۵۷)

اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

"اور تم میرے رسولوں پر ایمان لائے، ان کی مدد کی اور اس طرح تم نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دیا"۔(مائدہ۔۱۲)

اس آیہ مبارکہ میں خود مومنین کو انبیاء کی مدد کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ شاید ان دونوں آیات کریمہ کے بیان سے کہا جا سکے کہ مذکورہ آیت میں بھی دوسرا احتمال ہی مراد ہے، یعنی خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام کیا جائے۔

(ب)۔ بات کرنے میں متانت و سنجیدگی

اس موضوع پر ہم صرف سورۂ حجرات میں آنے والی آیات پر ہی اکتفا کریں گے:

۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴿۲﴾

''اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو، اونچی آواز میں ان سے بات نہ کرو (چیخ و پکار ان کے سامنے نہ کرو) جس طرح ایک دوسرے سے بلند آواز میں باتیں کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں معلوم بھی نہ ہو''۔ (حجرات۔ ۲)

۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴿۳﴾

''وہ لوگ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور اپنی آوازوں کو نیچا رکھتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاری میں آزما لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے''۔ (حجرات۔ ۳)

۳) اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ﴿۴﴾

''وہ لوگ جو آپ کو آپ کے گھر کے باہر سے بلند آواز میں پکارتے ہیں ان میں اکثر عقل و فہم نہیں رکھتے''۔ (حجرات۔ ۴)

۴) وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴿۵﴾

اگر وہ صبر کریں یہاں تک کہ آپ خود باہر آ جائیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔ (حجرات)

تہذیب سے عاری معاشرہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روح لطیف کے مالک اور آزاد شخص تھے، آنحضرتؐ ایسے افراد کے درمیان پھنس گئے جو اخلاقی خوبیوں اور اقدار

سے اکثر حد تک عاری تھے۔ لہٰذا وہ آنحضرتؐ ایسی شخصیت کے ساتھ اس طرح بات کرتے گویا کسی چرواہے سے مخاطب ہوں۔

ہجرت کے نویں سال جس کو "عام الوفوذ" کا نام دیا جاتا ہے، مختلف وفود اور ہیت کے لوگ اردگرد کے قبائل سے اسلام سے مشرف ہونے کے لیے مدینہ آتے تھے، یہ نو وارد بے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانہ اقدس کی پشت کی طرف سے، جو زیادہ دور نہ تھا، کھڑے ہو جاتے اور اس طرح چلانے لگتے "یا مُحَمَّدُ اخرُج: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھر سے باہر آ جاؤ"۔[۱]

یہ عمل نہ صرف آنحضرتؐ کی استراحت میں خلل انداز ہوتا بلکہ ایک طرح پر آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عدم احترام کا بھی مظہر تھا، اسی لیے قرآن پاک نے اس سورۂ مبارکہ کی چوتھی آیت میں ایسے لوگوں کو کم فہم اور بے عقل شمار فرمایا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے لوگوں سے تنگ تھے جو آداب معاشرت سے ناواقف تھے یا بیابان عرب کے باشندے تھے بلکہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض قریبی دوست واصحاب بھی آپ کی بارگاہ میں آداب گفتگو کو ملحوظ نہ رکھتے تھے۔

امام بخاریؒ جو عالم تسنن کے مشہور و معروف محدث ہیں، تحریر فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنی تمیم کی ایک نمائندہ جماعت مدینہ میں وارد ہوئی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے جس شخص کو بھی ان سے ملاقات کے لیے مقرر کرنا چاہا اس کا فیصلہ نہ کر سکے اور یہ تقرر فرد اختلاف سے بڑھ کر نزاع تک جا پہنچا۔ اس بارے میں اس قدر شور و غوغا ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے پریشانی خاطر کا باعث ہو گیا۔ ایسے پیشوائے بزرگ کے حضور اس قسم کے تکرار اور ناشائستہ حرکات کو روکنے کی خاطر آیات دوم سوم نازل ہوئیں اور اس عمل کو اس قدر برا شمار کیا گیا کہ اس کے نتیجہ ان کے اعمال نیک کو بھی حبط قرار دیا گیا۔[۲]

اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا احترام ظاہری، یہاں تک کہ آنحضرتؐ کے حضور طرز گفتگو آپ کی موجودگی میں کسی اور شخص سے قابل اعتراض لہجہ میں بات کرنا آنحضرتؐ کے لیے احترام باطنی کے معیار کو ظاہر کرتا ہے، اس بات میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ ہمارا کردار عمل ہمارے ایمان وعقیدہ کے مراتب سے متناسب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں آنحضرتؐ جیسی عظیم شخصیت کے سامنے ایسے ناشائستہ حرکات آپ کی طرف بے اعتنائی آنحضرتؐ کی ذات وتقدس دینی سے قلبی بے اعتنائی ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔

پھر احترام کا یہ سلسلہ صرف حیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں۔ آنحضرتؐ کو اپنی اہمیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ جب ام المومنین حضرت عائشہؓ نے امام حسن بن علی علیہ السلام کی شہادت کے موقع پر مزار آنحضرتؐ کے پاس شور وغل کیا اور فرزند رسول کے ان کے جد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہونے کو روکنے کے لیے ایک دستہ فوج کی مدد حاصل کی تو حضرت امام حسین بن علی علیہ السلام نے ان کو خاموش کرنے کے لیے یہی آیہ مبارکہ تلاوت فرمائی:

"يَآاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِىِّ"

---

[۱] نور الثقلین، ج ۵، ص ۸۰

[۲] التاج، ج ۴، ص ۲۱۳۔ ۲۱۴

اس کے بعد آپؑ نے یہ جملہ فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَمْوَاتًا مَّا حَرَّمَ مِنْهُمْ اَحْيَآءً"

یعنی اللہ تعالیٰ نے جس عمل کو مومن کی زندگی میں حرام قرار دیا ہے، اس کی موت میں بھی اس عمل کو حرام قرار دیا ہے۔[1]

جو کچھ علمائے کرام نے اس آیہ مبارکہ کے متعلق سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کے احترامات صرف پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام پیشوایان وعلماء واستاد ووالدین اور عام جنگ افراد بھی اسی طرح کے احترام کے مستحق ہیں۔ اسی لیے مقدس حرموں اور مزارات پر کسی طرح کے شوروغوغا وغیرہ سے احترام کرنا چاہیے۔

۳)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مناقشہ ممنوع ہے

مجادلہ اور مقابلہ میں آنے والے کے مسلمات کی مدد سے استدلال کرنا وہ طریقہ ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے، اس بارے میں خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت فرماتا ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ

''اوران لوگوں کے ساتھ احسن طریقہ سے استدلال کرو''۔ (نحل۔ ۱۲۵)

اس ہدایت کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مجادلہ ومناقشہ حرام اور ممنوع ہے، اس سے مراد ''مراء'' (اختلاف رائے) اور باطل پر رہتے ہوئے تعصب سے کام لینا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

''جو شخص علامات حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد بھی رسولؐ کے ساتھ جدال ومناقشہ کے لیے کھڑا ہوجائے اور طریق مومنین کے خلاف عمل کرے، ہم اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔ پس اس کا کیسا برا انجام ہوگا''۔ (نساء۔ ۱۱۵)

جملہ ''مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى'' اس واقعیت کو بیان کرتا ہے، نیز یہ کہ جب مقصد ومناقشہ حقیقت کا حصول نہ ہو بلکہ اس میں ہٹ دھرمی کے علاوہ کوئی بات نہ پائی جائے، اسی لیے دوسری آیات مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾

---

[1] نور الثقلین، ج ۵، ص ۸۰۔ ۱۸

''اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو خداوند عالم شدید عذاب دینے والا ہے''۔(انفال ۔ ۱۳)

اس سے ایک اور آیہ مبارکہ کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مناقشہ کرنے کی مذمت کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

''(یہ لوگ) اصلیت (حق) معلوم ہونے کے بعد بھی آپ سے مجادلہ کرتے ہیں''۔(انفال۔۶)

اس قسم کے مباحث جو حقیقت یابی اور واقع بینی کے لیے نہ کیے جائیں، حرام اور ممنوع ہیں اس کے برعکس اگر کوئی شخص حقیقت کو سمجھنے کے لیے بحث اختیار کرے اور حق کی وضاحت حاصل کرنے کے بعد حق کی پیروی کرے تو ایسی بحث ہرگز حرام نہ ہوگی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی اس قسم کے مذاکرات کو شرف سماعت بخشتے تھے، نجران کے لوگوں کے ساتھ آپ کے مذاکرات اسی نوعیت کے تھے۔ قرآن مجید میں سورۂ آل عمران کی آیت ۵۹۔۶۰ میں ایسے ہی مذاکرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وقت کا احترام

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعض صحابہ کرام چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کچھ وقت خصوصی طور پر ان کے ہمراہ گزاریں۔ لیکن اس درخواست کا قبول کرنا، آنحضرتؐ کے قیمتی وقت کے ضیاع کا باعث ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف اس دروازہ کو قطعی طور پر بند کر دینا قرین مصلحت نہ تھا کیونکہ بسا اوقات ایسی چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن کا اس طرح آنحضرتؐ کے گوش مبارک تک پہنچنا ضروری ہوتا تھا کہ کوئی اور شخص ان سے آگاہ نہ ہوجائے۔ ایسے حالات میں آنحضرتؐ کے قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے طے پایا کہ جو شخص آنحضرتؐ سے کوئی خصوصی بات کرنا چاہے تو اس کو بات کرنے سے پہلے کچھ رقم بطور صدقہ دینا ہوگی، یہ اس لیے کیا گیا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ صرف وہی لوگ خاص طور پر بات کر پائیں جو واقعی ضروری باتیں کرنا چاہتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اگرچہ بعض مصالح کی بناء پر منسوخ ہوگیا تاہم عملی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ جماعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قیمتی وقت ایک دینار کے برابر بھی نہیں جانتے تھے۔ یعنی نزول آیت کے بعد اس جماعت کا کوئی شخص آنحضرتؐ سے سرگوشی کے لیے تیار نہ ہوا کیونکہ ایسی سرگوشی کے لیے لازمی شرط یہ قرار پا گئی تھی کہ پہلے ایک دینا صدقہ کریں۔ اس دوران صرف جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی اس حکم پر عمل کر پائے جب بھی کوئی ضروری بات کرنا ہوتی آپ ایک دینار صدقہ دیتے اور آنحضرتؐ کے ساتھ سرگوشی فرما لیتے۔

مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس حکم کے بعد کسی شخص نے پیغمبر اکرم کے ساتھ سرگوشی نہ کی سوائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے جو ایک دینار صدقہ کرتے اور آنحضرتؐ کے ساتھ خصوصی بات چیت کر لیتے۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اے ایمان والو! جب بھی تم رسولؐ سے راز کی بات کرنا چاہوتو اس سے قبل صدقہ دے لیا کرو۔ یہ کام تمہارے لیے نیکی اور پاکیزگی کا باعث ہوگا،، اگر صدقہ دینے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہ ہوتو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تم فقر کے باعث راز داری سے قبل صدقہ دینے سے ڈر گئے، اب جب کہ انہوں نے ایسا کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی تمہاری توبہ قبول فرمالی ہے۔ تو نماز کو قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے آگاہ ہے''۔ (مجادلہ۔ ۱۲، ۱۳)

۵)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینا حرام ہے

اسلام میں حرام کی جانے والی باتوں میں ایک مسلمان کو اذیت پہنچانا ہے۔ یہ حکم صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے مخصوص نہیں ،تاہم آنحضرتؐ کے بارے میں اس حکم پر تاکیدا کید وارد ہوئی ہے۔ یہی واجب ہے کہ قرآن مجید کی آیات تاکید کے ساتھ آنحضرتؐ کو اذیت دینے کو حرام قرار دیتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾

''وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت (دونوں) میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور خوار کرنے والا عذاب ہے''۔ (احزاب۔ ۵۷)

اصول ہے کہ روح جس قدر لطیف ہوگی اسی قدر وہ ناشائستہ اور حدود ادب سے باہر افعال سے زیادہ متاثر ہوگی۔ اسی لیے قرآن مجید ان امور کا تذکرہ فرماتا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اذیت کا سبب ہوئے اگر چہ ان کا براہ راست کی ذات اقدس سے تعلق نہ ہو، سورۂ

مبارکہ احزاب میں ایسے بعض امور کا ذکر آتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔــلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝۵۳

''اے ایمان والو! پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک وہ تمہیں اجازت نہ دیں (اور اگر تمہیں کھانے کی دعوت دیں تو مقررہ وقت سے پہلے نہ آجاؤ) اور کھانے کے انتظار میں نہ بیٹھے رہو، جس وقت کی دعوت ہو اس وقت آجاؤ، جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور بحث و گفتگو کے لیے نہ بیٹھے رہو، اس بات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے، وہ تم سے شرم کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ (حق) کہنے سے نہیں شرماتا''۔ (احزاب۔ ۵۳)

اس آیہ مبارکہ میں ایسے امور کا ذکر کر رہا ہے جن سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روحانی اذیت پہنچتی تھی اور صحابہ کرام جن سے غفلت برتتے تھے، ان تکلیف دہ امور کی تفصیل یہ ہے:

۱)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں میں بغیر اجازت وارد مت ہو جاؤ:''

اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ (احزاب۔ ۵۳)

۲)۔ جب کھانے کی دعوت دی جائے تو وقت مقررہ سے پہلے مت جاؤ اور نہ ہی کھانے کے انتظار میں بیٹھے رہو:

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ

(احزاب۔ ۵۳)

ایک اور آیہ مبارکہ کے مطابق حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے لیے ''سادگی'' اور ''خوش بینی'' کے اتہام آپؐ پر لگانا ہیں،

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾

''منافقین میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو پیغمبر خدا کو اذیت پہنچاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ سادہ اور کچے کانوں والے ہیں (ہر شخص کی بات سن لیتے ہیں خواہ وہ ایک دوسرے کی ضد یا نقیض ہی ہوں) ان سے کہہ دیں کہ ان (رسولؐ) کا سادہ دل ہونا تمہارے نفع میں ہے، آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے اور مومنین کے فائدہ کی تصدیق فرماتے ہیں، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ (توبہ۔۶۱)

''خوش بینی'' سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ آنحضرتؐ ہر بات کی ہر جگہ تصدیق فرما دیتے ہیں کیونکہ ایسی بات نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ایسا کرنا اسلامی معاشرہ کے لیے سودمند ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ سب کی باتیں سنتے ہیں اور بظاہر کسی کی تکذیب نہیں فرماتے لیکن مقام عمل میں ہر بات کی تحقیق کر لیتے ہیں اس سلسلہ میں سورۂ مبارکہ ''توبہ'' کی تفسیر میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔

۶)۔ ازواج النبی (امہات المومنین) کے بارے میں مسلمانوں کے فرائض

قرآن مجید امہات المومنین کے بارے میں دو حکم دیتا ہے:

(ا) وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ

''جب وسائل زندگی سے کسی چیز کے متعلق ان سے سوال کرو تو پردہ کے پیچھے سے سوال کرو، یہ تمہارے اور ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے''۔ (احزاب۔۵۳)

عربوں میں یہ رواج تھا کہ ضرورت کے وقت وسائل زندگی اپنی ہمسایہ سے عاریۃً لے لیتے تھے، خانہ رسول بھی اس سے مستثنیٰ تھا، مسلمان وقت بے وقت اپنی ضروریات کی خاطر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانہ اقدس کی طرف رجوع کرتے اور آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات سے ضرورت کی چیزیں مانگ لیتے۔ اس سلسلہ میں حکم ہوا کہ مسلمان ازواج النبی سے بالمشافہ گفتگو نہ کریں بلکہ پردہ یا دروازے کے پیچھے سے ان کے ساتھ گفتگو کریں۔ آیہ مبارکہ میں حجاب سے خالصۃً وہ حجاب مراد نہیں جو تمام خواتین پر لازم و واجب ہے بلکہ اس سے صرف وہ پردہ مقصود

ہے جو طرفین کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتا ہے۔

اس مطلب کی دو چیزیں تائید کرتی ہیں:

۱)۔حجاب اسلامی سے متعلق جو آیات قرآن مجید سورۂ مبارکہ ''نور'' میں پائی جاتی ہیں وہ اس حکم سے قبل نازل ہوئیں ہیں۔لہٰذا فطری طور پر بعد میں آنے والی آیت سے نیا حکم مقصود ہونا چاہیے۔اس تاکید کے بجائے قرینہ تاکید یعنی تاکید مزید مراد لینا ہوگا۔

۲)۔اس موقع کی جو علت پیش کی گئی ہے ہماری دلیل حق میں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ

''یہ بات تمہارے اور ازواج النبی کے قلوب کے لیے مزید پاکیزگی کا باعث ہے''۔(احزاب۔۵۳)

یقیناً اگر اس سے حجاب اسلامی مقصود ہوتا تو بیان علت کسی اور صورت میں ہوتا۔

(ب) وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾

''اور مسلمانوں کے لیے (ہرگز) جائز نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد آنحضرتؐ کی ازواج (مطہرات) سے ازدواج (کی خواہش) کریں، یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے''۔(احزاب۔۵۳)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات کے ساتھ ازدواج کا حرام قرار دینا صرف غیرت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس میں ایک خاص نکتہ مضمر ہے جس کو ہم ابھی بیان کرتے ہیں۔اس حکم کا مختصر طور پر فلسفہ یہ ہے کہ ازواج پیغمبرؐ کو بیت وحی کے ساتھ نسبت کے باعث اور اس احترام کے نتیجہ میں قرآن مجید نے انہیں عطا فرمایا، یہاں تک کہ ان کو ''امہات المومنین[1]'' کا خطاب مرحمت ہوگیا۔اسلامی معاشرہ میں ایک خاص قسم کا احترام حاصل ہوگیا جس کی وجہ سے ان کی طرف عوام کا رجحان اور میلان ایک خاص احترام کا موجب بنا۔

ان حالات میں قرآن مجید نے وفات پیغمبر اکرمؐ کے بعد ان کی ازواج مطہرات کے ساتھ ازدواج کو حرام قرار دیا کیونکہ ایسا ازدواج اور رشتہ زناشوئی ان کی موجودگی میں ان کے دوسرے شوہروں کے لیے سیاسی مفاد کے حصول کی بنیاد بن سکتا تھا، جو خاندان وحی کے ساتھ رشتہ داری کو اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دے سکتے تھے۔

تاریخ بہترین معلم استاد ہے، جنگ جمل میں حضرت زبیرؓ کی جناب ام المومنین عائشہؓ صدیقہ سے قرابت رشتہ داری اس بات کا سبب بن گئی کہ اول الذکر صاحب سادہ لوح افراد کو اپنی پشت پر جمع کرلیں اور ایک خونی جنگ کی راہ پر ڈال دیں۔اگر ام المومنین

---

[1] وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (احزاب۔٦)

عائشہؓ صدیقہ حضرت زبیرؓ وطلحہؓ کی پشت پر نہ ہوتیں تو زبیرؓ اور ان کے ساتھی طلحہؓ ہرگز اس قسم کی فوج اکٹھی کرنے کے قابل نہ ہو پاتے، اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

وَلَآ اَنۡ تَنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا ؕ

۷)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد سے متعلق مسلمانوں کے فرائض

تمام انبیاء علیہم السلام کا شعار واعلان یہ رہا ہے۔

وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور ہم تم سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغام لانے کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، ہمارا معاوضہ تو صرف پروردگار عالمین کے پاس ہے''۔ (شعراء۔۱۰۹)

اصولی طور پر حقیقت بھی یہی ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جائے اس کی مزدوری ومعاوضہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے سے مزدوری کا مطالبہ نہ ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کے فرائض بزرگ اس بات سے بالاتر ہیں کہ ان کی قیمت درہم ودینار کے سکوں میں جانچی جائے اور مال دنیا کو ان کا معاوضہ قرار دیا جائے۔ اسی لیے قرآن مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کے معاوضہ کا ان الفاظ میں تعارف کرواتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِنَّ لَكَ لَاَجۡرًا غَيۡرَ مَمۡنُوۡنٍ‌ۚ ﴿۳﴾

''اور تمہارا اجر منت واحسان سے مبرا ہے''۔ (قلم۔۳)

لیکن اس کے باوجود قرآن مجید ایک اور آیہ مجیدہ میں مختلف انداز سخن اختیار کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے کہ تمہاری ہدایت کی خاطر میری سعی کی اجرت ومعاوضہ میرے اقرباء کے ساتھ مودت ومحبت میں شامل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى ؕ

''کہہ دیجئے کہ میں تم سے (اپنی رسالت کا) کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے قرابت داروں کے ساتھ مودت کرو''۔ (شوریٰ۔۲۳)

ایک اور آیہ شریفہ میں یاد دلاتا ہے کہ جو اجر ومعاوضہ تم سے طلب کیا گیا ہے وہ تمہارے ہی نفع میں ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَـكُمۡ‌ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ‌ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۴۷﴾

''کہہ دیجئے کہ جو کچھ میں نے تم سے بطور معاوضہ (رسالت) طلب کیا ہے وہ تمہارے ہی فائدہ میں ہے، میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ ہر چیز پر شاہد و ناظر ہے''۔ (سباء۔۴۷)

خاندان رسالت کے ساتھ یہی دوستی یعنی مودت، جس کو سورۂ سباء کی آیہ ۲۳ میں اجر رسالت قرار دیا گیا ہے، اپنے اندر مکمل طور پر تربیت کی حامل ہے اوران بزرگ ہستیوں کے ساتھ قربت کا باعث بنتی ہے کیونکہ ایسی جماعت کی دوستی جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشین آنحضرتؐ کے احکام بیان کرنے والی اسلامی معاشرہ کی تربیت کی ذمہ داری ہو، ہمیشہ ہمیشہ انسان کے لیے اصول وفروع اسلام سے واقفیت کے لیے لازم اوراس کے احکام کی اطاعت و پیروی کا موجب ہوگی۔ اس لحاظ سے ایسے مقتدر صاحبان کی دوستی معاشرہ کے لیے نجات اور تمام مسلمانوں کے لیے سعادت کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس معیار مودت کا فائدہ خود معاشرے کی طرف پلٹے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اہل بیت عظام سے مودت کا رشتہ ایسی خواہش رکھنے والے کے لیے متن شریعت پر عمل کرنے میں معاون ہوگا، دراصل اس قسم کے اجر رسالت کی خواہش وآرزو ایک طبیب معالج کی درخواست کی مانند ہے جن کو مثال ذیل کے ذریعے سمجھنا چاہیے۔

ایک معالج طبیب کسی مریض کا بلا معاوضہ علاج کرتا ہے اوراس کے مفصل ودقیق معائنہ کے بعد نہایت عمدہ قسم کا نسخہ لکھ کر کہتا ہے کہ میں تم سے اس کے سوائے اور کوئی معاوضہ نہیں چاہتا کہ تم اس نسخہ پر عمل کرو۔

یہ بات سننے والا ہر شخص واضح طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے گا اور کہے گا کہ طبیب نے اس خاص مریض سے کسی قسم کی کوئی فیس یا معاوضہ طلب نہیں کیا۔ پھر اگر وہ طبیب یہ کہے کہ میرا معاوضہ یہ ہے کہ مریض اس نسخہ پر عمل کرے تو یہ معاوضہ سطحی اور ظاہری تو ہوسکتا ہے درحقیقت یہ کوئی معاوضہ نہیں۔

مناسب ہوگا کہ ہم اس سلسلہ میں خاندان رسالت کی ایک حدیث کا تذکرہ کریں، اس حدیث کو شیخ طوسی نے اپنی کتاب ''امالی'' میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے، جو اس طرح ہے کہ جناب امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر ابن یزید جعفی سے فرمایا:

''یَا جَابِرُ اَیَکْفِیْ مَنِ انْتَحَلَ التَّشَیُّعَ وَاَحَبَّنَا اَهْلَ الْبَیْتِ ؟ فَوَاللهِ مَا شِیْعَتُنَا اِلَّا مِنِ اتَّقَی اللهَ وَاَطَاعَهٗ...یَا جَابِرُ لَا تَذْهَبَنَّ بِكَ الْمَذَاهِبَ حَسَبَ الرَّجُلَ اَنْ یَّقُوْلَ: اُحِبُّ عَلِیًّا وَاَتَوَلَّاهُ ثُمَّ لَا یَکُوْنُ مَعَهٗ ذٰلِكَ فَلَوْ قَالَ: اُحِبُّ رَسُوْلَ اللهِ ،وَرَسُوْلُ اللهِ خَیْرٌ مِنْ عَلِیٍّ وَلَا یَتَّبِعُ سِیْرَتَهٗ وَلَا یَعْمَلُ بِسُنَّتِهٖ مَا نَفَعَهٗ حُبُّهٗ اِیَّاهُ شَیْئًا .اِتَّقُو اللهَ وَاَعْلَمُوْا لَیْسَ بَیْنَ اللهِ

وَبَيْنَ اَحَدٍ قَرَابَةٌ اَحَبَّ الْعِبَادِ اِلَى اللهِ وَاَكْرَمُهُمْ عَلَيْهِ اَتْقَاهُمْ لَهُ"۔[1]

''اے جابر! کیا یہ کافی ہے کہ انسان اپنے آپ کو تشیع کی طرف صرف نسبت دے اور ہم اہل بیت سے محبت کرے؟ خدا کی قسم ہمارا واقعی شیعہ وہ شخص ہے جو اپنے لیے تقویٰ کو اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے (یہاں تک فرمایا اور پھر کہا) اے جابر! ادھر ادھر نہ جاؤ، یہ ہرگز خیال نہ کرو کہ کسی شخص کے لیے صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ میں علیؑ کو دوست رکھتا ہوں درآنحالیکہ عملی طور پر ان کے ہمراہ نہ ہو (ان کی پیروی نہ کرے) اگر کوئی کہے کہ میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوست رکھتا ہوں اور آنحضرت صلی علیہ السلام سے افضل ہیں اور حضرت علیؑ کے کردار و عمل کی پیروی نہ کرے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اس کو کوئی فائدہ نہ دے گی، پس اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے پرہیز کرو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کسی قسم کی رشتہ داری نہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین بندے اور پھر ان میں سے بزرگ بندے وہ ہیں جو ان میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہیں''۔

البتہ جہاں پیشوایان اسلام کی محبت کے ساتھ ان کے کردار و گفتار کی پیروی توأم و لازم ہے تو فطری طور پر یہ محبت بھی اجر و معاوضہ کے بغیر نہیں ہوگی، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق ''حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ'' (علی کی محبت نیکی ہے) ظاہر ہے کہ یہ محبت و مؤدت بے معاوضہ نہ جائے گی لہٰذا اہل بیت، درآنحالیکہ یہ اہل بیت کی پیروی کا سبب بھی ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی لازم ہو تو اپنے ساتھ ثواب بھی لائے گی۔

اسی لیے شیعوں کے استاد شیخ مفید مرحوم فرماتے ہیں:

''پہلے جملے سے مراد ''مودت فی القربیٰ'' کی استثنائے منقطع ہے[2]۔ نہ کہ متصل کیونکہ ''مودت فی القربیٰ'' وہ معاوضہ نہیں جو ''اجر'' کے مفہوم میں داخل کیا جا سکے اور پھر لفظ استثناء ''اِلَّا'' کے ذریعے خارج ہو جائے بلکہ قربیٰ کی مؤدت شروع ہی سے ''اجر'' کے مفہوم میں داخل نہ تھی کہ اس سے خارج قرار پائے بلکہ یہ ایک درخواست فوق العادہ ہے جو امت کی طرف سے پیش ہوئی ہے۔

اس قسم کا استثناء قرآن مجید اور عربی زبان میں بہت زیادہ سامنے آتا ہے، چنانچہ قرآن مجید اہل بہشت کے بارے میں فرماتا ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ط

''وہاں سوائے سلام کے کوئی لغو بات نہیں سنیں گے''۔ (مریم۔ ۶۲)

---

[1] امالی شیخ طوسیؒ مجلس یوم الترویہ، جز دوم، ص ۹۵ مطبوعہ سنگی

[2] ''استثنائے منقطع'' کی حقیقت کے بارے میں ''مفاہیم القرآن'' کی جلد چہارم کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہاں اس آیہ مبارکہ میں لغویت سے دور کلام (سلام) موضوع کے اعتبار سے لغو میں شامل نہیں کہ اس سے خارج ہونے کا سوال پیدا ہو۔

اس معنی کی تائید (اہل بیت علیہم السلام کی دوستی سے مراد ان سے رابطہ کو مستحکم رکھنا اور ان کے علوم و معارف سے استفادہ کرنا ہے) متواتر روایات سے ہوتی ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی اہل بیت سے مؤدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، آنحضرتؐ حدیث ثقلین [۱]، اور حدیث سفینہ [۲]، کے ذریعے لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے اصول و فروغ اور حلال و حرام اسی خاندان سے حاصل کریں اور اپنی زندگی کے لائحہ عمل کو ان کے گفتار و عمل کے مطابق ڈھالیں۔

ان تصریحات پر نظر رکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم خاندان سے محبت و مؤدت کے واجب ہونے سے مراد اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ لوگ دینی و دنیوی ضروریات کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کریں اور ان لوگوں کی طرف متوجہ نہ ہوں، بلکہ ان سے پرہیز کریں، جو گناہ و خطا سے محفوظ نہیں۔

لہٰذا مؤدت اہل بیت کے لازم و واجب کرنے اس کے علاوہ اور کوئی چیز مراد نہیں کہ بقائے دین، شریعت کی تفصیلات سے آگاہی اور احکام دین پر عمل کرنے کے لیے ان کو وسیلہ کے طور پر تلاش کریں اور ان کے احکام کے مطابق عمل کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خاندان کے ساتھ دوستی اور ان کے ساتھ راہ و رسم تشنہ انسانوں کے لیے اسلام کے نورانی حقائق سے آگاہی کا سبب اور امت کے لیے فکری و علمی تکمیل کو موجب ہے، حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی تفصیلات سے واقفیت انسان کو عمل کی طرف مائل کرتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ پیدا کرتا ہے۔

اس بحث سے دو آیات مجیدہ، کہ وہ بھی اجر رسالت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، کا مطلب واضح ہوجاتا ہے:

۱) مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ ؕ

''میں نے تم سے جس اجر کا سوال کیا ہے، وہ خود تمہارے نفع میں ہے''۔ (سباء۔ ۴۷)

اس آیہ مبارکہ کے مطالب آیہ زیر بحث سے کامل طور منطبق ہیں کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت داروں سے محبت ہر چند کہ ظاہری صورت میں آنحضرتؐ کے مفاد میں نظر آتی ہے لیکن اس عمل کی اصلیت میں امت کی منفعت ہے اور یہ ہر طرح امت کے فائدہ میں ہے، اس خاندان کے ساتھ رابطہ اور اس معصوم جماعت کے ساتھ مستحکم دوستی کا تعلق مسلمانوں کے لیے مایہ نجات، شریعت کے مطابق عمل کا وسیلہ اور

---

[۱] ''اِنِّیۡ تَارِكٌ فِیۡكُمُ الثَّقَلَیۡنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتۡرَتِیۡ'' میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت۔

[۲] ''مَثَلُ اَهۡلِ بَیۡتِیۡ كَسَفِیۡنَةِ نُوۡحٍ مَنۡ رَّكِبَهَا نَجٰی وَمَنۡ تَخَلَّفَ عَنۡهَا غَرَقَ'' میرے اہل بیت کشتی نوح کی مانند ہیں جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور جس نے مخالفت کی، وہ غرق ہوگیا۔

اسلامی آئین کی پیروی کے ذمہ دار ہیں، یہ معصوم حضرات صراط مستقیم کے صحیح مصداق قرار پاتے ہیں، دین کے تمام احکام و معارف ان کے اختیار میں تھے اور ان کے ساتھ دوستی سے فطری طور پر اسلام کے اصول و فروع سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ان سے محبت رکھنے والے لوگ خود بخود عمل و کردار نیک کی طرف کھینچتے چلے آتے ہیں۔ اس پاکیزہ گھرانے سے دوستی ان کی صحیح پیروی سے الگ کوئی چیز نہیں۔

۲) قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

''میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میں تو اس شخص کو چاہتا ہوں جو اپنے پروردگار کی راہ کو اختیار کرے''۔ (فرقان۔۵۷)

اس آیہ مبارکہ میں بھی انسان کی تلاش راہ خدا کو اجر رسالت قرار دیا گیا ہے، اور لفظ ''سبیل'' سے اس آیہ مبارکہ میں بہت ممکن ہے کہ خاندان رسالت ہی سے دوستی کا رشتہ قائم کرنا مراد ہو، جو اپنے مقام پر اسلام کے احکام و معارف سے انسان کی واقفیت کا ذریعہ ہے، یہ رشتہ داری ہی شریعت کے مطابق عمل کرنے کا موجب ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اس عمل کا مقصد احکام اسلام کی پابندی ہو، جو بذات خود باری تعالیٰ کی طرف راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان احکام اسلام اور اللہ تعالیٰ کے آئین کے مطابق عمل کرے جو اللہ تعالیٰ کی جناب سیدھا و یکتا راستہ ہے۔

بہر حال یہ تینوں آیات شریفہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجر رسالت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ایک ہی معنی پر منطبق ہوتی ہیں، ایک ہی نتیجہ پر رجوع کرتی ہیں اور وہ ہر صورت میں احکام شریعت پر عمل کرنا ہے۔

۸)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود

قرآن مجید فرائض مومنین میں ایک بات یہ بھی قرار دیتا ہے کہ وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے پیغمبرؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرو'' (احزاب۔۵۶)

محدثین نقل فرماتے ہیں کہ جب یہ آیہ نازل ہوئی تو لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپؐ پر کس طرح درود بھیجیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاٰلِ

اِبۡرٰهِيۡمَ "۔[1]

۹)۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت حرام ہے

مومن سے خیانت مطلقاً حرام ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اس حرمت پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَخُوۡنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ وَتَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۲۷

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے خیانت مت کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو، درآنحالیکہ تم جانتے ہو''۔(انفال۔۲۷)

۱۰)۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار کی درخواست

خداوند عالم کی رحمت و مغفرت و معافی کے دروازے بندوں پر کھلے ہوئے ہیں۔پروردگار عالم کا یہ فیض کبھی بلا واسطہ اور کبھی اس کے اولیاء کے واسطہ سے بندوں تک پہنچتا رہتا ہے۔لہٰذا قرآن مجید گناہگار بندوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت کے حصول کے لیے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش ہو کر آنحضرتؐ سے التماس کریں کہ ان کے لیے پروردگار عالم سے مغفرت طلب فرمائیں، چونکہ آنحضرتؐ کی دعا درجہ قبولیت پر فائز ہوتی ہے اس لیے بندے سایہ مغفرت کے نیچے لیتے ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ۝۶۴

جب بھی وہ لوگ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوتا ہے، آپ کے پاس آتے تھے وہ خود طلب مغفرت کرتے اور پیغمبرؐ بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتے تو وہ اللہ تعالیٰ کو قبول کرنے والا رحیم پاتے''۔(نساء۔۶۴)

ایک اور آیہ مجیدہ میں منافقین کی مذمت فرماتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں تاکہ وہ حضرتؐ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں تو وہ اعتراض کے طور پر اپنے سر پھیر لیتے ہیں، قرآن مجید میں

[1] مسند الشافعی، ج ۲، ص ۹۷

ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا يَسۡتَغۡفِرۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ لَـوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ‏ ﴿۵﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کے رسول تمہارے لیے طلب مغفرت کریں تو وہ اعتراض کے طور پر اپنے سروں کو پیچھے موڑ لیتے ہیں، ان کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ انکار کر دیتے ہیں اور اس طرح بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں''۔(منافقون۔۵)

جس طرح فیض مادی اسباب ظاہری کے ذریعے انسانوں کو پہنچتا ہے، مثلاً روشنی کی حیات بخش شعاعیں سورج کے وسیلہ سے ہمارے اختیار میں دی گئی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فیض معنوی بھی کبھی بغیر واسطہ اور کبھی انبیاء و اولیائے باری تعالیٰ کی وساطت سے انسانوں کو پہنچتا رہتا ہے، یہ حقیقت دو آیات مبارکہ میں مکمل طور پر جلوہ گر ہوتی ہے:

۱)۔ خداوند عالم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ زکوۃ ادا کرنے والوں کے حق میں دعا فرمائیں کیونکہ آنحضرتؐ کی دعا ان لوگوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہوگی، اس سلسلہ میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

صَلِّ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ‌ؕ

''اور ان کے لیے دعا کریں کیونکہ آپ کی دعا ان کے لیے سکون و آرام کا باعث ہے''۔(توبہ۔۱۰۳)

۲)۔ یہ حقیقت اس قدر روشن و واضح تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خطا کار بیٹے خانہ خدا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس بات سے واقف تھے۔ لہٰذا جب ان کا راز بے نقاب ہو گیا تو اپنے پدر بزرگوار سے استغفار کی درخواست کرتے ہوئے کہنے لگے:

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِيۡنَ‏ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَـكُمۡ رَبِّىۡ‌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ‏ ﴿۹۸﴾

''انہوں نے کہا: بابا جان! ہمارے لیے گناہوں کے بارے میں مغفرت طلب فرمائیں کیونکہ ہم خطا کار تھے، (حضرت یعقوب علیہ السلام نے) فرمایا، میں عنقریب تمہارے لیے (اللہ تعالیٰ سے) مغفرت طلب کروں گا، بے شک وہ بخشنے والا رحیم ہے''۔(یوسف۔۹۷ تا ۹۸)

یہاں تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مسلمانوں کے اہم فرائض واضح کیے گئے، اگرچہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے فرائض کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن یہ دس فرائض اہم ترین کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کے مقامات معنوی و بلند، جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں، ان صفحات میں پیش کریں گے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات معنوی اور صفات بلند

قرآن مجید میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا بیان

اس بحث میں ہمارا مقصد معجزہ کی ماہیت اور اس کے امکان یا وقوع، اس کی کیفیت پر دلائل اور معجز نما کی صداقت پر دلائل کرنا نہیں کیونکہ اس میں علم کلام کی طویل مباحث کا ایک سلسلہ درپیش ہوگا۔ جو عملی طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ان صفحات میں ہمارے پیش نظر صرف ان معجزات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان ہے جو خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر کیے گئے ہیں تاکہ ہم اس طریق سے قرآن مجید کی نظر سے آنحضرتؐ کی سیرت مبارکہ کو مکمل کرسکیں جس کی ہم نے ابتداء کی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں جو آیات مجیدہ قرآن شریف میں نازل ہوئی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں:

(ا)۔ وہ آیات مبارکہ جو واضح طور پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت مقدس دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح معجزات وکرامات کے ایک سلسلہ کی حامل تھی۔

(ب)۔ وہ آیات شریفہ جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درخواست کرنے والوں کے مطالبہ کو قبول کرنے اور معجزات پیش کرنے سے انکار فرماتے ہیں۔

یہاں ہمارا محور بحث (ا) سے متعلق آیات قرآن مجید کو پیش کرنا ہے۔ حصہ (ب) سے متعلق آیات مبارکہ پر بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''راز بزرگ رسالت'' میں سیر حاصل بحث کی ہے[1]۔ اگرچہ اسی موضوع پر اہم ترین آیات قرآن مجید ''واکنش دعوت ہمگانی'' (عمومی دعوت کا ردعمل) کی فصل بھی ہم بحث وگفتگو کرچکے ہیں۔

تاریخ کے صفحات جھوٹے اور غیر صادق مدعیان نبوت کے دعوؤں اور حالات سے بھرے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کی طویل تاریخ میں حضرت انسان کی سادگی اور اس فطری جذبہ سے جو ابتداء سے انہائے انسانی سے متعلق ہے، غلط فائدہ اٹھایا ہے اور دھوکہ وفریب سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور سفیر غیب کے طور پر متعارف کرایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹ کے علاوہ کوئی حیثیت اور فریب کے سوائے کوئی اور قوت نہ رکھتے تھے اور ان کا مطمح نظر لوگوں پر سرداری وحکومت کے علاوہ کچھ نہ تھا، جاننا چاہیے کہ اللہ کے سچے انبیاء علیہم السلام کی جعلی مدعیان نبوت سے شناخت کے لیے بہت سے طریقے اور علامات موجود ہیں جن کی مدد سے صادق کی کاذب اور نبی کی مدعی نبوت سے تمیز وتشخیص کی جاسکتی ہے۔

ان طریقوں میں سے ایک (ایسا نہیں کہ صرف یہی طریقہ ہو) یہ ہے کہ نبوت دعویٰ کا کرنے والا معجزہ کا حامل ہوتا ہے، یعنی وہ مدعی

---

[1] راز بزرگ رسالت، ص ۴۱۶۔۴۵۸

خارق العادہ فعل پر قدرت رکھتا ہو، کوئی شخص حتیٰ کہ دنیا کا کوئی عظیم ترین شخص بھی اس سے مبارزہ و مقابلہ پر قادر نہ ہو۔

ان آیات مبارکہ قرآن مجید میں غور کرنے سے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے، استفادہ ہوتا ہے کہ ان حضرات سے معجزہ کا مطالبہ ایک فطری امر رہا ہے۔ امم سابقہ جن کی طرف انبیاء علیہم السلام تشریف سے پہلے ہی مرحلہ میں ان سے معجزہ کی درخواست کرتے تھے۔ مثلاً جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود کو عذاب خدا سے ڈرایا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے طور پر متعارف کرایا تو انہوں نے جواب دیا:

مَآ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ فَاۡتِ بِاٰيَةٍ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۵۴﴾

''آپ تو ہماری طرح ہی کے ایک بشر ہیں، اگر آپ اپنے دعویٰ میں صادق ہیں تو کوئی آیت یا نشانی پیش کریں''۔ (شعراء۔ ۱۵۴)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگوں انبیائے کرام سے معجزہ طلب کرنے سے پہلے ہی وہ حضرات بذات خود لوگوں کے سامنے اعلان فرما دیتے تھے کہ وہ معجزہ کے حامل ہیں، یہاں تک کہ یہ حضرات دعوت دیتے تھے کہ لوگ بڑے بڑے اجتماعات میں ان کے معجزہ کا مشاہدہ کریں۔ ان واقعات کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں:

(ا)۔ حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام فرعون کے سامنے تشریف لائے، اپنی رسالت کا دعویٰ فرمایا اور اس نے اس طرح فرمایا:

حَقِيۡقٌ عَلٰٓى اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِبَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِىَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾

''میرے مقام کے لیے شائستہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں سچ کے علاوہ اور کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار کی طرف سے آیات و برہان لے کر آیا ہوں تم بنی اسرائیل کو اپنے قید و بند سے آزاد کر کے میرے ساتھ روانہ کردو۔ فرعون نے ان کو جواب دیا کہ اگر آپ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو سچائی کی کوئی علامت پیش کریں (اپنے معجزہ کو عملی شکل میں پیش کریں)''۔ (اعراف۔ ۱۰۵، ۱۰۶)

(ب)۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو اپنی رسالت کی دعوت دی تو لوگوں کے مطالبہ سے پہلے ہی آپ نے اپنے معجزات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙ

''اور میں بنی اسرائیل کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور تمہاری طرف نشانیاں اور معجزات لے کر آیا

ہوں''۔(آل عمران۔۴۹)

آپ کے معجزات کی آیات قرآن مجید میں تشریح کی گئی ہے، یہ اور ایسی ہی دیگر آیات قرآن کریم، جن کو ہم اختصار کے پیش نظر معرض تحریر میں نہیں لارہے، گواہی دیتی ہیں کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو فوراً انہیں لوگوں کی طرف سے معجزہ کی علامت کی درخواست کا سامنا کرنا پڑا اور ہر مرتبہ لوگوں نے ان سے معجزہ طلب کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر نہ صرف قرآن مجید شاہد ہے بلکہ تاریخ انبیاء بھی اس پر گواہ ہے۔

کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے علاوہ بھی کوئی معجزہ رکھتے ہیں۔

اس حصہ کتاب میں ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے کہ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف قرآن ہی کا معجزہ رکھتے تھے یا قرآن مجید کے علاوہ دیگر معجزات بھی آپ کو حاصل تھے؟

سب سے پہلے عیسائیوں نے اس موضوع کو چھیڑا۔ان لوگوں نے آنحضرتؐ کی عظمت و مقام کو گھٹانے کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس قرآن مجید کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہ تھا۔آنحضرتؐ صرف قرآن ہی کا سہارا لیتے تھے اور جب بھی کوئی آنحضرتؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتا تو آپ اپنی کتاب یعنی قرآن کریم ہی پیش کرتے تھے۔

مشہور آلمانی پادری ''فندر'' جو کتاب ''میزان الحق'' کا مؤلف ہے، اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۷ پر پیغمبر اسلامؐ کی نبوت پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: ''شرائط نبوت میں ایک شرط معجزہ ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی معجزہ کے حامل نہ تھے''۔اس نے اپنے دعویٰ کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات قرآن مجید سے استدلال کیا ہے:

۱)۔سورۂ عنکبوت۔۔۔آیہ ۵۰

۲)۔سورۂ اسرائی۔۔۔آیات ۸۹ تا ۹۳

۳)۔سورۂ انعام۔۔۔آیات ۱۱۰ تا ۱۹۰

یہ بحث خصوصیت کے ساتھ اسی سے تعلق نہیں رکھتی ۔ بلکہ کتاب ''منار الحق'' کے مؤلف کی طرح جس کی کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، دوسرے پادریوں نے بھی اپنی کتابوں میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔[1]

مرحوم فخر الاسلام کہتے ہیں کہ مسٹر ''زرڈ دودی'' نے پیغمبر اسلامؐ کی حیات مقدس کے سلسلہ میں ایک کتاب تحریر کی ہے، اس کتاب کے صفحہ ۱۵۷ پر اس نے آنحضرتؐ کی تصویر بنائی ہے، بس میں قرآن مجید کا ایک ورق آنحضرت کے دست مبارک میں ہے۔تصویر کے نیچے یہ الفاظ تحریر ہیں:

''جب ان بزرگوار سے معجزہ طلب کیا جاتا تھا تو جواب میں فرماتے تھے: معجزہ میرے اختیار میں نہیں، یہ نعمت مجھے عنایت نہیں ہوئی''[2]

اس پادری کی بات کا پہلا حصہ حقیقت کے عین مطابق ہے اور یہ کہ معجزہ لانا کسی پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا، نیز جب تک اذن الٰہی نہ ہو کوئی پیغمبر اس قسم کے کام نہیں کر سکتا۔قرآن مجید اس بات کی واضح طور پر شہادت دیتا ہے جب کہ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ

---

[1] انیس الاعلام، ج ۵، ص ۲۴۹

[2] انیس الاعلام، ج ۵، ص ۳۵۱

''اور کوئی رسول آیت و معجزہ نہیں لاسکتا مگر صرف خداوند عالم کی اجازت سے''۔(رعد۔۳۸)

لیکن پادری کی بات کا دوسرا حصہ یعنی ''یہ نعمت مجھے عنایت ہی نہیں ہوئی'' افتراء اور اس کے خیال کی پیداوار ہے۔حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرگز ایسی کوئی بات نہیں کہی، بلکہ کئی مواقع پر آنحضرتؐ کو یہ نعمت حاصل رہی ہے اور آنحضرتؐ اذن باری تعالی سے معجزات دکھایا کرتے تھے۔

عیسائیوں میں سب سے پہلے لاہور کے بازار انارکلی سے شائع ہونے والی کتاب ''مشکات صدق'' میں جو ۱۹۰۱ء میں چھپی تھی، اس مسئلہ پر قلم اٹھایا گیا ہے، اس کتاب میں دیگر عیسائی مؤلفین میں سب سے زیادہ اس مسئلہ کو ہوا دیتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ بعض آیات قرآن مجید سے اپنے اس دعویٰ پر استدلال کیا جائے۔

بعض معاصر سیرت نگاروں نے ان عیسائیوں کے مباحث اور استدلالات کو اپنے نام سے منسوب کرایا ہے۔اس کا دعویٰ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منکرین معجزہ طلب کرتے تھے تو آنحضرتؐ سکوت اختیار کر لیتے یا انکار کرتے ہوئے صرف اس بات پر اکتفا کرتے تھے کہ میں تو تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں اور اپنے آپ کو تبلیغ پر مامور جانتا ہوں نیز فرماتے کہ میں مبشر و منذر یعنی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا ہوں۔

اس مؤلف نے ہرگز نہیں چاہا کہ اس بحث کے کسی حصہ کے عیسائیوں کی طرف سے اختراع ہونے کا اشارہ کرے۔گویا وہ خود ہی اس کا بانی و موجد ہے۔

ایک محاسبہ عقلی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم ایک برگزیدہ الٰہی شخصیت جانیں یا ایک مفکر اجتماعی شخصیت تسلیم کریں، آنحضرتؐ نے اپنے آپ کو ہر حالت میں قرآن مجید میں حضرات موسیٰ و عیسیٰؑ جیسے انبیاء کے ہم پلہ، بلکہ ان سے بلند تر مراتب کے حامل کے طور پر متعارف کروایا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے آپ کو خاتم الانبیاء اور اپنی کتاب کو کتب آسمانی میں آخری کتاب کے طور پر پیش کیا ہے۔آنحضرتؐ بطور برگزیدۂ پروردگار ہستی، یا دوسروں کو اصطلاح کے مطابق ایک اجتماعی مصلح، جس وقت انبیائے سابقین کی زندگی کو پیش کرتے تھے، تو ان میں بہت سے حضرات سے متعلق خارق العادہ وواقعات و معجزات کو ثابت کرتے ہیں، مثلاً جب آنحضرتؐ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو انہیں اس طرح متعارف کرواتے ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ

''اور ہم نے موسیٰ کو نو واضح معجزات عطا فرمائے''۔(اسراء۔۱۰۱)

اسی سلسلہ میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَقَوۡمِہٖ ؕ

''اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں لے جاؤ، جب اسے باہر نکالو گے تو بغیر کسی عیب کے وہ نورانی اور چمکدار ہوگا ،اور تم معجزات لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ''۔(نمل۔۱۲)

اور اسی طرح جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طریق دعوت کا ذکر کرتے تھے تو ان کا اس طرح تعارف کرواتے تھے:

وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۙ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾

''اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے،انہوں نے کہا کہ میں تمہاری طرف معجزات لے کر آیا ہوں، میں مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، نابیناؤں، برص کے مریضوں کو درست اور مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کر دیتا ہوں، جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں اور معجزات میں با ایمان لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں''۔(آل عمران۔۴۹)

آنحضرتؐ نہ صرف حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام جیسے انبیاء ہی کو معجز نما جانتے ہیں بلکہ دیگر انبیاء کے لیے بھی معجزات کو ثابت کرتے ہیں، یہ حقیقت ان آیات مجیدہ کے مطالعہ سے بخوبی و واضح ہوجاتی ہے جو انبیائے آسمانی کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔

کیا یہ بات صحیح سمجھی جائے گی کہ کوئی شخص اپنے لیے نبوت اور رسالت کا دعویٰ کرے، تمام انبیائے سابق کی دعوت سے ان کے معجزات سمیت واقف ہو، ان انبیاء کی جماعت کے معجزات کی خصوصیت کو نقل کرے اور جب خود اس سے ہی لوگ معجزہ طلب کریں تو وہ خاموشی اختیار کرے یا معجزہ دکھانے سے انکار کرے؟

یہ تجزیہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو موقف کو لوگوں کی معجزہ کی درخواست کے سلسلہ میں بخوبی واضح کر دیتا ہے کیونکہ اگر آپؐ پیغمبر آسمانی میں تو اس صورت میں قطعی طور لازم ہے کہ آپ تمام مواقع پر لوگوں کی ہدایت کے لیے معجزہ کے مؤثر امکانات کو دوسرے انبیائے کرام کی طرح

،جن کے معجزات کو خود اپنی کتاب میں ذکر فرماتے ہیں، پیش کریں اور اپنی طرف سے خارق العادہ امور دکھلائیں۔

اسی طرح اگر آنحضرتؐ ایک اجتماعی مفکر ہیں، جو شخصی افکار کے اظہار کی مدد سے عالم بشریت کو نجات دلانا چاہتے ہیں، پھر بطور مفکر اجتماعی اپنی دعوت کو نبوت اور مبعوث بخدا ہونے کا رنگ بھی دیتے ہیں، تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ دے، پھر اس سے بڑا بہانہ یا موقع اور کیا ہوگا کہ وہ خود انبیائے سابقہ کے معجزات کو تو ثابت کرتا ہو لیکن اپنے مقام پر خود اپنے دعویٰ کے بالمقابل لوگوں کی طرف سے معجزہ کے مطالبہ کے جواب میں پس و پیش کرے، یا اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرے۔

یہی وجہ ہے کہ جھوٹے مدعیان نبوت کی تاریخ حیات میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ وہ ہمیشہ معجزہ کی مخالفت کرتے اور انبیائے ماسبق سے معجزات کا اظہار کرتے تھے، ایسے لوگ کوشش کرتے تھے کہ ان آیات کی تاویلات پیش کریں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف سے صدور معجزہ کا ذکر کرتی ہوں، یہ تمام کوششیں صرف اس لیے ہوتی تھیں کہ وہ اپنے آپ کو ان مشکلات سے دور رکھیں۔ جو معجزات پیش کرنے کے سلسلہ میں ان کے سامنے آتی تھیں، مبادا کہ لوگ ان سے معجزات طلب کریں اور اس بارے میں ان کی کمزوری و عجز ظاہر کریں۔

لیکن ایسے جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف پیغمبر اسلام ﷺ انبیائے سابقہ کے لیے معجزات کو ثابت فرماتے ہیں، حتیٰ کہ بڑی صراحت کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں، (جیسا کہ اس بحث کی ابتداء میں واضح کیا گیا) کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کبھی بھی لوگوں کی طرف سے معجزہ کے مطالبہ سے جدا نہیں رہی۔

ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص اپنے دعویٰ کے ثبوت میں معجزہ پیش کرنے سے انکار کرے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ مندرجہ ذیل حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ پیغمبر اسلام ﷺ فاقد معجزہ قرار پاتے:

۱)۔ پیغمبر اکرم ﷺ واضح الفاظ میں فرماتے تھے کہ جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے لیے رہبری و رسالت کا دعویٰ کرتا تو لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے تھے۔ اور اس کا دعوائے نبوت کبھی بھی لوگوں کی طرف سے مطالبہ معجزہ اور مدعی کی جانب سے اس کے عملی مظاہر سے جدا شے نہیں ہوتی تھی۔

۲)۔ آنحضرتؐ نے بہت سے انبیائے کرام کے معجزات کو ثابت کیا اور ان کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔

۳)۔ آنحضرتؐ نے اپنا تعارف افضل ترین اور خاتم الانبیاء کے طور پر کرایا ہے، پس افضل انبیاء ہونے کے لیے کیا یہ لازم نہیں آتا کہ آپؐ تمام معجزات یا انبیائے سابقہ کے کامل ترین معجزات کے حامل ہوں؟ یہ بات کسی طرح صحیح اور قابل تسلیم نہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو دیگر تمام افراد سے بلند تر جانے اور پھر ان سے بعض صفات میں پیچھے ہو۔ مثلاً یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے کہ کوئی طبیب اپنے آپ کو دیگر اطباء کا سردار سمجھتا ہو، فن طبابت میں سب سے بلند تر جانا جاتا ہو لیکن ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کرے کہ بعض دیگر طبیب چند ایک شدید امراض کا علاج کر سکتے ہیں جن کے علاج پر وہ خود قادر نہیں لہٰذا اگر ہم حضرت محمد مصطفی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا نبی اور پیغمبر تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں ان تمام صورتوں میں تسلیم کرنا ہوگا کہ آنحضرتؐ معجزات کے بدرجہ اتم حامل تھے۔ اس کے برعکس اگر ہم انہیں صرف مفکر و مصلح کی حیثیت ہی سے تسلیم کریں تو آنحضرتؐ کو اس قسم ہی کی گئی کیفیات کا اپنے لیے اعتراف کرنا ہوگا، نہ صرف یہ بلکہ بہت سے جھوٹے مدعیان

نبوت کی طرح وجود معجزہ ہی کا بالکل انکار کرنا ہوگا۔

یہ مختصر تجزیہ منصف مزاج اور واقع بین حضرات کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے، تاہم قرآن مجید کی آیات مبارکہ واضح کرتی ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے علاوہ اور معجزات کے حامل بھی تھے اور قرآن مجید کو کوئی عیسائی اللہ کی کتاب تسلیم نہ بھی کرے تاہم یہ اس کے لیے ایک قطعی تاریخی سند تو ضرور شمار ہوتی ہے۔ پس ہم یہاں اپنے دعویٰ کے استدلال کی خاطر ایک سلسلہ آیات قرآنی پیش کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات کی معجزات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شہادت

قرآن مجید کی آیات مبارکہ گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے معجزہ جاوید کے علاوہ دوسرے معجزات کے بھی حامل تھے۔ آنحضرتؐ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کی ہدایت کے لیے صرف قرآن کریم ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں تک عقل وخرد ومصالح تبلیغ کی رسائی ہوتی، آنحضرتؐ معجزات سے بھی مدد لیتے تھے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل موارد میں آیات قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا:

(۱)۔ شق القمر

ارشاد ہوتا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝۱ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝۲

''قیامت قریب آ گئی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور جب وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے روگردانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو سحر اور مسلسل جادو ہے''۔ (قمر)

اسلامی مفسرین مثلاً زمخشری کشاف میں طبرسی مجمع البیان میں، فخر الدین رازی مفاتیح الغیب میں ابن مسعود اپنی تفسیر میں۔۔۔ رقم طراز ہیں: آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کے مطالبہ کو پورا فرما دے۔ پھر آپ نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا۔ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ''گواہ رہنا''۔

ہم اس وقت اس معجزہ کی خصوصیت سے سروکار نہیں رکھتے، نہ ہی وہ بچگانہ اشکالات ہمارے موضوع بحث میں شامل ہیں، جو اس معجزہ کے بارے میں پیدا کیے گئے ہیں، جو چیز ہمارے لیے اہم ہے وہ اس معجزہ کے واقع ہونے پر آیت قرآن مجید سے دلیل ہونے کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم آیہ مبارکہ کی تفسیر پیش کرتے ہیں: ''اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ'': قیامت قریب آ گئی ہے:

اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيۡبًا ۝۷

''وہ قیامت کو دور اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں''۔ (معارج۔۶، ۷)

۔''وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ'': چاند دو ٹکڑے ہو گیا''۔

بے شک لفظ انۡشَقَّ ماضی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کو بلاوجہ مستقبل پر حمل کیا جا سکے نہ یہ کہہ سکتے ہے کہ چاند آئندہ دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور نہ ہی اصطلاح کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ یہ ''انۡشَقَّ'' کے معنی میں ہے۔

اس کے علاوہ جملہ ''اِقْتَرَبَتِ'' ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ''قریب ہوا'' میں لہٰذا اصولی طور پر اس پر معطوف جملہ بھی ماضی ہی ہوگا۔ یعنی یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں جب قیامت برپا ہوگی تو چاند دو ٹکڑے ہوجائے گا ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا قیامت کے آمد کس طرح متناسب ہے کہ دونوں باتوں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

اس سوال کو جواب بالکل واضح ہے کیونکہ چاند کا دو ٹکڑے ہوجانا اور پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور شرائط علامات قیامت سے ہیں۔ اسی لیے ان دو جملوں کا ایک دوسرے پر عطف واقع ہوا اور قرآن مجید کے مطابق علامات قیامت محقق ہو رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾

''وہ انتظار کر رہے ہیں کہ قیامت اچانک آجائے گی لیکن (انہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ اس کی علامات محقق ہو چکی ہیں''۔ (زخرف۔۶۶)

۲) وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴿۲﴾

'' اور جب معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سحر اور مسلسل جادو ہے''۔ (قمر۔۲)

یہاں ''آیہ'' سے جو علامت کے معنی لیے گئے ہیں وہ قرآن کے علاوہ کوئی چیز ہے جس کی دلیل ''يَرَوْا'' ہے یعنی وہ دیکھتے ہیں۔ اگر اس سے قرآن مراد ہوتا تو مناسب تھا کہ ''دیکھتے ہیں'' کے بجائے ''نزول'' یا اسی قبیل کا کوئی لفظ استعمال ہوتا۔ یہاں ''معجزہ دیکھا گیا'' سے مراد ''شق القمر'' ہی ہے جو آیہ سابقہ میں وارد ہوا ہے۔

اس حصہ بحث میں غور کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا زمانہ اس دنیا میں ہے نہ کہ مقام آخرت میں کیونکہ اس زمانہ میں کوئی شخص نہ یہ کہہ سکے گا کہ یہ وہی استمراری جادو ہے جو ہمارے بزرگوں کو بھی درپیش تھا۔

مختصر یہ کہ ان لوگوں کے یہ کہنے سے کہ یہ استمراری جادو ہے، شق القمر سے مراد چاند کا ایک آنحضرتؐ کے ذریعے دو ٹکڑے ہونا ہے جس کو وہ لوگ جادو کا نام دیتے ہیں۔ مفسرین روایت کرتے ہیں کہ اس بزرگ معجزہ کو دیکھ کر ابو جہل نے کہا:

''سَحَرَكُمْ ابْنُ اَبِيْ كَبْشَةَ'': ابو کبشہ کے بیٹے نے تم پر جادو کر دیا''۔

ابو کبشہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجداد مادری سے تھا اور مشرکین آنحضرتؐ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔

(ب)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معراج آپ کا ایک اور معجزہ تھا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رات کا تاریکی مسجد الحرام مسجد اقصیٰ تک معراج آنحضرتؐ کے معجزات میں سے ایک ہے جس کا خود آنحضرتؐ نے دعویٰ فرمایا ہے اور قرآن مجید بھی صراحت کے ساتھ اس کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

''پاک ومنزہ ہے (خدا) جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا تا کہ اس کو اپنی قدرت کی کچھ آیات مشاہدہ کرائے، وہ (اللہ تعالیٰ) سننے والا اور دیکھنے والا ہے''۔(اسراء۔۱)

دور حاضر کے وسائل سفر کے بغیر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نصف شب میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر معجزاتی سفر اور قوت بشری سے باہر تھا۔خود قرآن مجید اس معجزہ کو آنحضرتؐ کے لیے ثابت فرماتا ہے اور ایک سورۂ مبارکہ (سورۂ نجم) میں سختی سے اس کا دفاع کرتا ہے۔ یہاں تک ارشاد ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ آنحضرتؐ کے سفر کی آخری منزل نہ تھی بلکہ آنحضرتؐ نے وہاں سے عالم بالا کی جانب بھی عروج فرمایا۔

یہاں ہمارا مقصد اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کے بارے میں بحث وگفتگو کرنا نہیں ہے (نجم۔۱۳،۱۸) آنحضرتؐ کے معراج جسمانی کے آغاز کے دلائل پیش کریں گے جو عام طور پر اس واقعہ کیے جاتے ہیں، ہم اس سلسلہ میں بس ایک بات سے زیادہ پیش نہیں کریں گے جو عام طور پر اس واقعہ پر کیے جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید خود اس معجزہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت فرماتا ہے۔قرآن پاک نے دو سورہ ہائے مبارک (اسراء اور نجم) میں اس واقعہ پر بحث کی ہے، اور اس کا دفاع فرمایا ہے، حیرت ہے کہ اس کے باوجود عیسائی اور ان کے ہم خیال لکھتے ہیں: ''مسلمان اپنے پیغمبر کے کچھ معجزات کے روایات کرتے ہیں لیکن انسان قرآن میں اس واقعہ کے بیان سے متعجب ہوتا ہے کیونکہ اس میں معجزہ کی کوئی بات نہیں ملتی''۔

معلوم نہیں یہ لوگ کس طرح آیات قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔معراج نبی کے بارے میں اسلامی روایات پر ہے۔احادیث اس قدر کثیر المقدار ہیں کہ انہیں ہرگز جعلی یا موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔حیرت اس شخص پر ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے بارے میں ایک خبر واحد سے جسے طبری نے نقل کیا ہے استناد کرتے ہوئے ''افسانہ غرانیق'' کو آنحضرتؐ کے لیے سازش روحانی کا گواہ بناتا ہے، یا آنحضرتؐ اور جناب خدیجۃ الکبریٰ کی ورقہ بن نوفل سے گفتگو کو ان کے عدم یقین کی علامت جانتا ہے۔لیکن وہ ان تمام احادیث کو کہ جنہیں طبری وغیرہ نے بطور متواتر نقل کیا ہے۔نظرانداز کرتے ہوئے اپنے عقیدہ کے پیش نظر ان سب کو قلمزد کر دیتا ہے۔

اس قسم کے لکھنے والے ایسے متعصب ہیں جو پہلے ہی سے فیصلہ کر کے بیٹھتے ہیں ایک دعویٰ قائم کرتے ہیں اور پھر اس کے دلائل اس کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔لہٰذا وہ ان موارد میں جو ان کے ذاتی عقائد کے ساتھ سازگار پائے جاتے ہوں، ایک ہی خبر پر اکتفاء کرتے ہیں، جب کہ دوسرے موضوعات پر جن کے خلاف انہوں نے سوچ رکھا ہوتا ہے، سینکڑوں روایات واحادیث کی کسی قدر وقیمت کے قائل نہیں ہوتے۔

(ج)۔ اہل باطل کے ساتھ مباہلہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نصارائے نجران کے ساتھ مباہلہ بھی ایسا موضوع ہے جس کا ذکر قرآن مجید سورۂ آل عمران میں آیت اکسٹھ میں فرماتا ہے بتایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ اپنے دین کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے نجران کے سرداران کے ساتھ مباہلہ کے لیے تیار ہوئے۔ آنحضرتؐ نے قطعی وعدہ فرمایا کہ اگر مباہلہ کے لیے فریقین آمادہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب کاذب نصارائے نجران کو گھیر لے گا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ پر آمادہ ہوئے تھے اسی سلسلہ میں آنحضرتؐ کی صدا بہت وسیع و عریض تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو حکم دیا کہ کہیں:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۞ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١

''علم و یقین کے بعد بھی اگر کوئی آپ سے حجت بازی کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی خواتین کو بلائیں اور تم اپنی خواتین کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلائیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر باہم مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت قرار دیں''۔ (آل عمران۔ ٦١)

نجران کے عیسائی مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے لیکن جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت اور میدان مباہلہ میں آنحضرتؐ کی آمد کے طریق نے نصاریٰ کو مباہلہ سے مانع رکھا سمجھ گئے کہ اس مباہلہ میں اللہ تعالیٰ کا عذاب لازمی طور پر ان پر آن پڑے گا۔

اس مباہلہ کا اثر ہوا کہ نہ صرف نجران کے عیسائی مقابلہ پر نہ آئے بلکہ اس قدر وسیع و بلند صدا کے باوجود جب تک آنحضرتؐ زندہ رہے کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ یہ درست ہے کہ عیسائیوں کے مباہلہ آنحضرتؐ اس مقام پر معجزہ کے لیے تیار تھے، ان لوگوں کے لیے دنداں شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ آنحضرت معجزہ کے مدعی ہی نہیں تھے۔ یہ کیفیت ان لوگوں کے خلاف قطعی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ جب بھی لوگ آنحضرتؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے تو آنحضرتؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے تو آنحضرتؐ معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیتے اور یہ کہہ دیتے کہ میں صرف منذر اور بشر ہوں۔

(د)۔ وہ معجزات دیکھتے تھے

قرآن مجید کی متعدد آیات واضح طور پر شاہد ہیں کہ جب بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معجزہ کے لیے تیار ہوتے تو کفار بہانے بنانے لگتے اور

کہتے کہ ہم یہ معجزہ نہیں چاہتے۔ بلکہ تمہارا معجزہ دوسرے انبیاء کی طرح ہونا چاہیے، جیسا کہ قرآن مجید ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ

''جب کوئی معجزہ ان کے سامنے آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ جو کچھ اللہ کے پہلے رسول لے کر آئے تھے، اس کی مثل ہمارے لیے لاؤ''۔ (انعام۔ ۱۲۴)

یہاں ''آیہ'' کے لفظ سے وہی عمومی معجزات مراد ہیں، اس سے ان کی مراد نہ تو قرآن ہوتی تھی اور نہ ہی قرآن پاک کی آیات کیونکہ:

اولاً: لفظ ''آیہ بطور نکرہ وارد ہوا ہے جو ایک طرح کی وحدت اور ایک قسم کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے، اگر اس سے مراد قرآن پاک ہوتا تو مناسب تھا کہ کلام کی صورت مختلف ہوتی۔

ثانیاً: اگر مقصود قرآن مجید ہوتا تو اس کے لیے کلمہ ''نزول'' لانا صحیح ہوتا اور ''نزلت اٰیۃ'' کہا جاتا۔ آیت کے متن اور دیگر قرائن کی موجودگی میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کے علاوہ معجزہ مراد ہے۔ مشرکین چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کا معجزہ عصائے موسیٰ اور ید بیضا کی مانند ہو جس کے علاوہ وہ کسی طرح کے معجزہ کو درخور اعتنا نہ جانیں گے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعینہ اس قسم کے معجزات کیوں پیش نہیں کرتے تھے، اس کا جواب آپ علم کلام کی کتب میں پڑھتے رہتے ہیں۔

(ھ)۔ پیغمبر اکرمؐ کے معجزات کو دیکھتے تھے لیکن ان کو جادو سے تعبیر کرتے تھے

قرآن مجید کی کئی ایک آیات مبارکہ شاہد ہیں کہ مشرکین اور بت پرست جب بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی معجزہ دیکھتے تھے تو اسے جادو سے تعبیر کرنے لگتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا رَاَوۡا اٰيَةً يَّسۡتَسۡخِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۵﴾

''اور جب بھی وہ کوئی معجزہ دیکھتے تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ یہ تو کھلم کھلا جادو کے سوائے اور کچھ نہیں''۔ (صافات۔ ۱۴، ۱۵)

لفظ ''رأوا'' اور لفظ ''ایہ'' کا نکرہ ہونا اس بات کے شاہد ہیں کہ اس سے مراد قرآن نہیں بلکہ اس کے علاوہ معجزہ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مفسرین اس آیہ مبارکہ اور ایک دوسری آیت کو، جسے بعد میں نقل کریں گے، اس بات پر شاہد مانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے علاوہ بھی دیگر معجزات کے حامل تھے۔

(و)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''بینات'' کے حامل تھے

درج ذیل آیہ مبارکہ وضاحت کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حامل ''بینات'' تھے، جس سے معجزات مراد ہیں، وہ آیہ مبارکہ ہے:

كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ‌ؕ

''اللہ تعالیٰ کس طرح ایسی قوم کو ہدایت فرمائے جو ایمان کے بعد کافر ہو گئے ہوں، اور جب کہ وہ گواہی دے چکے ہوں کہ پیغمبر برحق ہیں کہ پیغمبر برحق ہیں اور ان کی حقانیت کے دلائل ان (مشرکین) تک پہنچ چکے ہیں''۔(آل عمران۔۸۶)

غور کے قابل ''وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ'' کا جملہ ہے، ''بیّنات'' ''بینه'' کی جمع ہے جس کے معنی دلیل اور شاہد ہیں جو حقیقت کو روشن اور واضح کرنے والا ہو۔

پہلی نظر میں ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ ''بَيِّنَات'' سے قرآن یا وہ بشارات ہی مراد ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے بارے میں سابقہ کتب آسمانی پائی جاتی ہیں، لیکن دوسری آیات میں غور کرنے سے جہاں یہ لفظ (بینا) معجزات اور خارق العادہ امور کے معنی میں آیا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں یہ لفظ خاص طور پر یا تو معجزات وخارق العادہ کے معنی میں ہے اور یا اس کے کوئی وسیع معنی ہیں جس میں معجزات بھی شامل ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ آیت کے مطالب کو قرآن یا عہدین (عہد قدیم کو جدید یعنی تورات وانجیل) میں آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت میں منحصر سمجھا جائے۔ وہ آیات یہ ہیں:

۱) وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ

''اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے''۔(بقرہ۔۸۷)

۲) وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ

''ان معجزات کے بعد جو انہوں (بنی اسرائیل) نے دیکھے، انہوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنالیا''۔(نساء۔۱۵۳)

۳) اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ

''جب معجزات سمیت آپ ان کی طرف آئے''۔(مائدہ۔۱۱۰)

۴) وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ۚ

''اور ان کے رسول ان کی طرف معجزات لے کر آئے''۔(اعراف۔۱۰۱)

علی ہذا القیاس دوسری آیات مجیدہ ہیں جن میں بینات سے مراد معجزات اور امور خارق العادہ ہیں، ان کے لیے مندرجہ ذیل آیات

ملاحظہ فرمائیں:

۱)۔سورۂ یونس۔۔۔۔۔آیات ۱۳، ۷۴

۲)۔سورۂ نحل۔۔۔۔۔۔آیہ ۴۴

۳)۔سورۂ مومن۔۔۔۔۔آیہ ۲۸

۴)۔سورۂ طٰہ۔۔۔۔۔۔آیہ ۷۲

۵)۔سورۂ حدید۔۔۔۔۔آیہ ۲۵

۶)۔سورۂ تغابن۔۔۔۔۔آیہ ۱۶ وعلی ہذا

یہ صحیح ہے کہ لفظ ''بینات'' کے لغوی معنی معجزات اور امور خارق العادہ نہیں ہیں، بلکہ یہ لفظ وسیع معنی رکھتا ہے، جس کے مصادیق میں ایک معجزہ بھی ہے، نیز ''بینہ'' کے معنی ہیں وہ شے جو کسی حقیقت کو بیان یا روشن کرے ''بینہ'' کو معجزہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ معجزہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب الٰہی اور آپ کی رسالت کی صداقت سے تعلق رکھتا ہے۔لیکن چونکہ کثیر آیات میں لفظ سے معجزہ مراد لیا گیا ہے اس لیے زیر بحث آیہ مبارکہ میں لفظ ''بینات'' کی تفسیر اس طرح کرنا چاہیے کہ اس میں معجزہ اور امور خارق العادہ ہی مراد لیے جائیں گے۔

(ز)۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح غیب کی خبریں دیا کرتے تھے۔

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ایک چیز یہ بیان فرماتا ہے کہ وہ حضرت غیب کی خبریں دیا کرتے تھے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا تھا:

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ

''اور میں اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں، جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو''۔(آل عمران۔۴۹)

یہ جملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باقی معجزات کے ساتھ ہی آتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی مدد سے متعدد واقعات غیب کی خبریں دیا کرتے تھے۔قرآن میں مذکورہ اخبار غیب کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ یہ صفحات ان کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، نمونہ کے طور پر:

۱)۔آنحضرتؐ نے پروردگار عالم کی طرف سے وحی کے ذریعے رومیوں کی شکست کے بعد ان کی فتح کی خبر دی۔[1]

---

[1] کتاب مفاہیم القرآن مین قرآن کی اخبار غیب کے بارے میں کسی حد تک تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔اس کی ج ۳، ص ۵۰۳۔۵۰۸ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲)۔ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل کی بحالت کفر موت کی خبر دی۔[۱]

۳)۔اسی طرح کفر و شرک کی حالت میں ولید بن مغیرہ کی موت کی خبر دی۔[۲]

۴)۔جنگ بدر میں قریش کی شکست کی اطلاع دی۔[۳]

۵)۔ ۔۔۔۔خبر دی ہے کہ کیا یہ اخبار غیب اس بات پر گواہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے علاوہ دیگر معجزات بھی رکھتے تھے؟

(ح)۔اسلامی احادیث اور معجزات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

احادیث اسلامی بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے علاوہ بھی معجزات رکھتے تھے۔علمائے اسلام نے معجزات میں اختلاف کے باوجود اس موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جو حضرات شوق رکھتے ہیں کہ اس بارے میں تفصیلات حاصل کریں، وہ ان کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کے بارے میں اسلامی روایات یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات پر، جو انہوں نے اپنے انبیائے کرام کے معجزات کے سلسلے میں پیش کی ہیں دو لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں:

ایک چیز تو زمانہ اور فاصلہ کی کمی ہے کیونکہ ہم جس قدر حوادث زمانہ سے (زمان و مکان کے اعتبار سے) قریب ہوں گے اسی قدر ان کے متعلق آسانی سے اطمینان حاصل کر سکیں گے۔

دوسری چیز راویان کی کثرت ہے۔جن لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کو قریب مشاہدہ کیا اور ان کی روایت کی، ان کی تعداد بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں سے کہیں زیادہ وکثیر ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کے زمانہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے ان کی تعداد بہت قلیل تھی، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی روایات صرف انہی چند افراد پر ختم ہو جاتی ہیں، ان حالات میں اگر معجزات کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ کی اپنے انبیائے کرام کے بارے میں روایات کو درجہ تواتر پر تسلیم کر لیا جائے، تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کو بطریق صحیح ماننا پڑے گا کیونکہ انبیائے سابق کے معجزات متواتر طریق سے ہم تک نہیں پہنچے اور اس سلسلہ میں ان کے پیروان کا دعوائے متواتر بے بنیاد ہے۔

ایک قابل توجہ نکتہ

ہم اس بحث سے ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہر قسم کے معجزات و کرامات کی نسبت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جانشینوں کی طرف دی

---

[۱] ''تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ ۔۔۔'' سورہ لہب۔تا آخر

[۲] سَاُصۡلِیۡہِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا سَقَرُ ﴿ؕ۲۷﴾ ''سورہ مدثر۔آیات ۲۶۔۲۷

[۳] ''سَیُہۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَ یُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ ''سورہ قمر)

جاتی ہے، حمایت کریں اوران سب کو صحیح دوست تسلیم کریں، کیونکہ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ تاریخ مذاہب میں جھوٹے افراد بہت زیادہ ہوئے ہیں جو بے بنیاد مطالب سے زیادہ کہہ گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علماء ودانشمندان اسلام نے صحیح وغیر صحیح احادیث میں امتیاز کرنے کے لیے قواعد ورجال ودرایہ کی بنیاد رکھی ہے۔ان حضرات نے مختلف موضوعات پر احادیث کی صحت قبول کرنے کے لیے قواعد وضوابط مقرر فرمائے ہیں۔ یہ قواعد وضوابط اہل علم وفضل حضرات کے لیے، جو علوم اسلامی سے سروکار رکھتے ہیں، اچھی طرح واضح وروشن ہیں۔

ہم منکرین معجزہ سے چند ایک سوال کرنا چاہتے ہیں، اگر چہ دوران بحث ہم اس طرف اشارہ کر چکے ہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ حضرات جن کی ایک جماعت مستشرقین اور مغرب زدہ لوگوں کی ہے اور جو حیات پیغمبر اسلام ﷺ کے تجزیہ اور تفصیلات کے لیے تاریخ اسلام کی طرف رجوع کرتے رہتے ہیں اور اس سے استفادہ کرتے ہیں، جب اظہار خیال کرتے ہیں تو واقع بینی وحقیقت جوئی کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتے، لیکن جب یہ ہی حضرات معجزہ کی بحث پر پہنچتے ہیں تو ان سینکڑوں روایات کو جو انہیں کتابوں میں معجزات پیغمبر اکرم ﷺ کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، درخور اعتنا نہیں سمجھتے، بلکہ انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں؟ پھر یہی حضرات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے بارے میں مختلف ذہن کے لوگ بن کر ان معجزات وکرامات کے حامل تسلیم کرنے لگتے ہیں۔

ہم ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات زندگی کے تجزیہ وجستجو میں ضعیف وکمزور ترین روایت سے بھی استفادہ کرتا ہے لیکن جب آنحضرتؐ کے معجزات پر پہنچتا ہے تو اس کے قلب اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں؟

راقم الحروف ابھی تک کسی ایسے شخص سے آشنا نہیں جس نے معجزات پیغمبر اسلام ﷺ اور کرامات آئمہ معصومین کو شمار کیا، لیکن عظیم شیعہ عالم شیخ حر عاملی مرحوم نے ایک کتاب بنام ''اثبات الهداة بالنصوص والمعجزات'' تحریر فرمائی ہے جس میں اس موضوع میں مندرج احادیث واسناد کی تعداد اور ان کتب کے نام جن سے روایات نقل کی گئی ہیں، کچھ اس طرح بیان کی ہیں۔انہوں نے کتاب ہذا میں پیغمبر اسلام ﷺ اور آئمہ معصومین کے معجزات کے بارے میں بیس ہزار احادیث نقل کرتے ہوئے ستر ہزار اسناد پیش کی گئی ہیں۔انہوں نے یہ احادیث ایک سو بیالیس شیعہ کتب اور چوبیس اہل تسنن کے علماء کی کتابوں سے استخراج کی ہیں۔یہ ان کتب کی تعداد ہے جن سے یہ روایات بلا واسطہ نقل ہوئی ہیں، باقی رہیں وہ کتب جن سے بالواسطہ احادیث وروایات نقل کی گئی ہیں ان میں شیعہ کتب کی تعداد پچاس ہے جبکہ اہل تسنن کی ۲۲۳ کتب شامل ہیں۔کتاب سات جلدوں میں فارسی ترجمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں درج ذیل احادیث صحیح ودرست ہیں، بلکہ لازم ہے کہ ان سب پر اسناد ودلائل کے ساتھ تنقید کی جائے۔تاہم کسی طرح بھی ان تمام روایات کو بے بنیاد وبے اساس بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (خاتم النبیین)

بہت کم مسائل ہیں جو ہدایت و وضاحت کے اعتبار سے ختم نبوت کے مسئلہ کے برابر قرار پاتے ہوں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے بارے میں درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

(ا)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔

(ب)۔ آنحضرتؐ کا دین آخری دیں اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے۔

(ج)۔ آنحضرتؐ کی کتاب (قرآن مجید) آسمانی کتب میں آخری کتاب ہے۔

(د)۔ آنحضرتؐ کے اس عالم فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال کے بعد باب وحی وتشریع امت مسلمہ پر بند ہو چکا ہے۔

(ھ)۔ آنحضرتؐ کے بعد نہ تو کوئی پیغمبر مبعوث ہوگا، نہ کوئی شریعت آئے گی اور نہ ہی کسی شخص پر وحی کا نزول ہوگا۔

یہ حقیقت قرآن مجید، متواتر احادیث اسلامی، بزرگان دین کے خطابات وتقاریر اور شعراء کے اشعار میں اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرتؐ کے القاب میں ایک لقب ''خاتم النبیین'' قرار پا چکا ہے۔ اس حقیقت میں کسی نے شک نہیں کیا سوائے ''بہائیت'' نامی ایک سیاسی جماعت کے جنہوں نے دین کا نام لے کر مذہب میں فرقہ اندازی کی ابتداء کی۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہندوستان جو مذاہب کا عجائب خانہ ہے، ایک اور سیاسی جماعت نے، جن کی انگریز سامراجی حکومت کی طرف سے سرپرستی اب بالکل واضح ہو چکی ہے۔ امت مسلمہ میں سادہ لوح کے اذہان پر شاندار ہو کر دین میں شک وتردید کے بیج بوئے۔ اس جماعت کو قادیانی جماعت کہتے ہیں جنہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کی خاطر آیات قران مجید کی بہت ہی غلط قسم کی تاویلات وتفسیرات پیش کی ہیں۔

اس بحث میں ہمارا مقصد ختم نبوت کے بارے میں شبہات اور سوالات کا جواب دینا نہیں، بلکہ ہمارا مقصد اس سلسلہ میں نظریہ قرآن مجید کو پیش کرنا ہے۔ ہم اپنی اس بحث میں بعض بہت ہی واضح آیات قرآن مجید پیش کریں گے۔ [1]

آیہ ختم نبوت میں پہلی آیہ مبارکہ

ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط

[1] ختم نبوت کے موضوع پر ہم سابق میں ''مفاہیم القرآن'' میں مباحث کے سلسلہ میں، جو تفسیر موضوعی ہی ہے، قرآن مجید کے عربی زبان میں نزول کے بارے میں مفصل بحث کر چکے ہیں یہ حصہ ہم اپنے عزیز دوست جناب آقائے استادی کے ذریعے مستقل شکل میں بزبان فارسی پیش کررہے ہیں جو کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ لہٰذا ہم اسکے ترجمہ کے اقتباسات مختصراً ہدیہ قارئین کررہے ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا

''محمدؐ تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور (اس کے) انبیاء میں آخری نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے کو جانتا ہے''۔ (احزاب۔۴۹)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کی غلط رسوم ورواج میں ایک یہ بھی تھی کہ منہ بولے بیٹے یعنی متبنیٰ کو حقیقی کے برابر جانتے تھے اور اس کے حقیقی بیٹوں جیسا سلوک کرتے تھے، مثلاً اگر کوئی منہ بولا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو اس کی مطلقہ کے ساتھ نکاح کو جائز نہیں جانتے تھے۔ اسلام نے اس قسم کی غلط رسوم کو ختم کرنے کے لیے آنحضرتؐ کو مامور فرمایا کہ آپ زیدؓ بن حارثہ، جو آپ کا منہ بولا بیٹا تھا اور جس نے اپنی زوجہ زینب بنت حجش کو طلاق دے دی تھی۔ اس کی مطلقہ بیوی زینب کے ساتھ ازدواج کریں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینبؓ سے شادی کر لی۔ اس ازدواج نے ان لوگوں کے درمیان جو اللہ تعالیٰ اس کے رسول پر صدق دل سے ایمان نہ لائے تھے اور جو شدت سے اپنے رسم ورواج کے پابند تھے، شدید اختلاف پیدا کر دیا جو یہ تھا کہ وہ لوگ معترض تھے کہ آنحضرتؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے کیوں شادی کر لی؟

خداوند عالم ان عقائد وافکار کو ختم کرنے کے لیے آیہ مذکور میں اس طرح فرماتا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے کسی ایسے مرد کے باپ نہیں جو اس کی نسل سے نہ ہو اور زیدؓ بھی تمہارے مردوں میں سے ایک ہے، لہٰذا زیدؓ کی سابقہ بیوی کے ساتھ آنحضرتؐ کا ازدواج کسی قسم کا اشکال نہیں رکھتا، آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہیں اور یہ ازدواج بھی اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے انجام پایا ہے، وہ ہرگز تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والے اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں جن کے ذریعے نبوت و پیامبری کا دروازہ بند ہو چکا ہے، ان کے بعد نہ تو کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ ہی کوئی شریعت آئے گی، آنحضرتؐ کی نبوت وشریعت اب قیامت کے دن تک باقی رہے گی''۔

''خاتم النبیین'' میں لفظ ''خاتم'' کے معنی

آیہ مبارکہ میں لفظ ''خاتم'' کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے لیکن اختلاف تلفظ سے اس کے معنی ومراد میں معمولی سا فرق بھی نہیں پڑتا، یہ مختلف ہائے تلفظ اس طرح ہیں:

(ا)۔ ''خَاتِمْ'' بزوزن حافظ، اسم فاعل کی شکل میں ہے، اس کے معنی ہیں ''ختم کرنے والا''۔

(ب)۔ ''خَاتَمْ'' تا پر زبر کے ساتھ، بروزن عَالَمْ (دنیا) اس کے معنی ہیں آخر اور آخرین۔

(ج)۔''خَاتَمْ ''اوپر درج کردہ دوسری شکل ہی میں،اس کے معنی ہیں ایسی چیز جس سے اسناد اور خطوط پر مہر لگاتے ہیں۔

(د)۔''خَاتَمَ ''تا اور میم دونوں پر زبر کے ساتھ،بروزن''ضَارَبَ''(باب مضاربہ کا فعل ماضی)،اس کے معنی ہیں وہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رسالت کے دروازہ کر بند کر دیا گیا ہو۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ لفظ''خاتم''کو جس طرح بھی پڑھا جائے،آیہ مبارکہ کے یہی معنی ہوں گے کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ اللہ تعالی کے آخری پیغمبر ہیں،آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی،رسول،کتاب،شریعت،اور دین ہرگز نہیں آئے گا۔

آغاز اسلام سے لے کر ۱۴ صدیوں کے طویل زمانہ کے گزر جانے کے دوران لغت و تفسیر کی تمام کتابوں میں لفظ''خاتم''اور''خاتم النبیین'' کی یہی تفسیر کی گئی ہے جو ہم نے بیان کی ہے،کسی شخص نے ان معانی میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔مزید اطمینان کی خاطر قارئین کرام قرآن مجید کی تفاسیر،لغت و فرہنگ ہائے عربی کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔

ہم یہاں بطور نمونہ بعض علماء کے اقوال اس سلسلہ میں پیش کریں گے لیکن اس سے قبل ہم قرآن مجید اوران موارد پر غور کرنے سے ابتداء کرتے ہیں جہاں''خ ت م'' کا مادہ استعمال ہوا ہے۔ہم قرآن کریم ہی سے''خاتم النبیین'' کے معنی معلوم کرنے کے لیے امداد و استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ مندرجہ ذیل آیات کریمہ میں وارد ہوتا ہے:

(ا) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝۲۵

''ان کو خالص،مہر شدہ شراب پلائی جاتی ہے''(مطففین۔۲۵)

(شراب کے خالص ہونے کی علامت یہ ہے کہ شراب کی شیشی اوراس کا برتن مہر شدہ ہیں''۔

(ب) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ

''اور پر مشک سے مہر لگائی گئی ہے''،(یعنی اس کو پیتے ہوئے آخری شے جس کا ادراک ہوتا ہے وہ بوئے مشک ہے)۔(مطففین۔۲۶)

(ج) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ

''اس دن (روز قیامت) ان کے دہن پر مہر لگا دیں گے،ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے اور ان کے اعمال کی گواہی دیں گے''۔(یس۔۶۵)

(د) اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ

وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی ہوا و ہوس کو اپنا خدا قرار دیا ہے اور علم ہوتے ہوئے گمراہی اختیار کی ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے''۔(جاثیہ۔۲۳)

(۵)خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ

اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اوران کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے''۔(بقرہ۔۷)

جس کسی کا فر کا تعصب اس حد تک تجاوز کر جائے کہ اس کے ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنے سے ناامیدی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس طرح ہم شیشی کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں، اس صورت میں ان کے قلوب ظرف مہر شدہ بند ہو جاتے ہیں جس میں کوئی سوراخ باقی نہیں رہتا، پھر ان قلوب میں نہ تو ایمان داخل ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے کفر خارج ہوتا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس آیہ مبارکہ میں لفظ ''ختم'' کسی کام کے ختم ہونے کے معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی ان کا کفر و الحاد تاریکی روح اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ پھر ان میں نور حق اور اللہ تعالیٰ کے کلمات تاثیر کے نفوذ کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، یہ اس طرح ہے جیسے کسی خط کے آخر میں مہر لگا دینا اس بات کی علامت ہے کہ لکھنے والے نے اپنا مقصد مکمل طور پر تحریر کر دیا ہے اور کوئی شے اب اس میں باقی نہیں رہی۔

اس اعتبار سے ختم نبوت کے معنی یہ قرار پائیں گے کہ نبوت کا موضوع اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔پیغمبر ﷺ کے ذریعے باب نبوت ورسالت پر مہر لگ چکی ہے اور اب یہ دروازہ قیامت تک کبھی نہیں کھلے گا۔

''خاتم'' کے معنی کے لیے اقوال علماء

(ا)۔''ابن فارس'' علم لغت کے بزرگ ترین علماء سے ہے، وہ لکھتا ہے کہ ختم کے اصلی معنی آخر تک پہنچنا ہے۔عربی زبان میں کہتے ہیں: ''خَتَمْتُ الْعَمَلَ ''یعنی میں نے کام کو آخر تک پہنچا دیا، اسی طرح کہتے ہیں:''خَتَمَ الْقَارِئُ السُّوْرَةَ''یعنی قرآن مجید کے قاری نے سورہ کو آخر تک پہنچا دیا اور اسے آخر تک پڑھا، لفظ ختم اسی باب سے ہے جس کے معنی ہیں مہر کرنا، کیونکہ بعض چیزوں کی حفاظت کا آخری مرحلہ یہی ہوتا ہے کہ شیشی برتن کو مہر کیا جائے اور پر موم لگا دیا جائے۔

اسی طرح ''خاتم'' خواہ 'تا' پر زبر ہو یا زیر، اسی باب سے ہے کیونکہ اصل مروجہ یہی ہے کہ خاتم یعنی مہر یا انگھوٹھی کے ذریعے خطوط اور

تحریروں کو ختم کیا جاتا ہے، اور کسی خط کے آخر میں مہر لگانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خط اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''خاتم الانبیاء'' کہتے ہیں، اس لیے کہ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں اور ''ختامه مسك'' جو قرآن مجید میں آیا ہے کے معنی وہ آخری چیز ہے جس سے اس شراب کے پینے کا اندازہ کرتے ہیں اور وہ بوئے مشک ہے [۱]

(ب)۔''ابو البقاء عکبری'' مشہور عالم، آیہ مبارک ''وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ'' کے سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

خاتم۔ تا پر زبر کے ساتھ، یا تو فعل ماضی ہے، باب مفاعلہ سے یعنی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے سلسلہ کو ختم فرمایا۔

یا یہ لفظ مصدر ہو سکتا ہے جس کی بناء پر ''خاتم النبیین'' کے معنی ہوں گے پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کرنے والا، کیونکہ اس قسم کے مواقع میں مصدر اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے۔

یا اس طرح ہے جیسے دیگر علماء نے کہا کہ ''خاتم'' تا پر زبر کے ساتھ، اسم ہے جو آخر یا آخری کے معنی ہیں، یا جیسا کہ بعض اور علماء نے کہا ہے کہ یہ اسم مفعول کے معنی میں آتا ہے، یعنی ''مَخْتُوْمٌ بِهِ النَّبِيُّوْنَ''۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے سلسلہ پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مہر لگا دی گئی اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

یہ چار احتمالات اس صورت میں سامنے آتے ہیں کہ خاتم کی قرأت پر زبر کے ساتھ کی جائے گی، اگر ''خاتم'' کو تا کے نیچے زیر سے پڑھا جائے۔۔۔ جیسا کہ ''قراء سبعه'' (سات قاریوں) میں سے چھ نے پڑھا ہے۔۔۔ پھر اس کے معنی آخر اور آخری ہی قرار پاتے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان پانچوں احتمالات میں آیہ مبارکہ کے معنی یہی بنتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخر پیغمبر ہیں اور آنحضرتؐ کے بعد اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ [۲]

(ج)۔''فیروز آبادی'' اپنی لغت میں رقمطراز ہے:

''ختم'' مہر کرنے کے معنی میں ہے، عربی زبان میں کہتے ہیں: ''خَتَمَ عَلٰى قَلْبِهٖ'' یعنی اس کے قلب و دل کو ایسا بنا دیا کہ وہ کوئی چیز نہیں سمجھتا اور اس کے خیالات و جذبات بد اس میں سے نہیں نکلتے۔ (ایک سربمہر برتن کی طرح جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہے اور نہ ہی اس میں داخل ہوتی ہے) نیز کہتے ہیں ''خَتَمَ الشَّيْءَ'' یعنی اس شے کے آخر تک پہنچ گیا''۔

علی ہذا القیاس ''خِتَام'' بروزن کتاب، اس مٹی کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی برتن یا شیشی کے منہ پر مہر لگاتے ہیں، اسی طرح ''خاتم'' اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر مٹی لگائی جاتی ہے اور یہ ''انگوٹھی'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔ [۳]

ماضی میں زیادہ تر لوگ اپنے نام انگوٹھی پر نقش کرتے تھے، وہی انگوٹھی ان کی مہر ہوتی تھی جس کو خطوط اور اپنی تحریروں پر لگاتے تھے

---

[۱] المقاییس مادہ خ ت م

[۲] التبیان فی اعراف القرآن، ج ۲، ص ۱۰۰

[۳] قاموس اللغہ، ج ۴، ص ۱۰۲

،اسی لیے لفظ ''خاتم'' انگشتری یعنی ختم کرنے اور آخر تک پہنچانے کے معنی میں آتا ہے۔

(د)۔''جوہری'' اپنے لغت نامہ میں لکھتا ہے کہ ختم کے معنی آخر تک پہنچانا ہے۔''اِخْتَتَمَ'' لفظ ''اِفْتَتَحَ'' کا الٹ ہے۔یعنی افتتاح کے معنی شروع، آغاز اور ابتداء کرنا ہے جبکہ اختتام کے معنی مکمل کرنا اور ختم کرنا اور کسی کام کو آخر تک پہنچانا ہے۔لفظ ''خاتم'' تا پر زبر ہو یا اس کے نیچے زیر ،دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی رکھتا ہے۔اسی لیے ''خاتم الشّی ء'' کے معنی ہیں ''اس چیز کا آخر'' اور ''خاتم الانبیاء'' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے القاب سے ہے۔[1]

(ھ)۔''ابن مسطور'' اپنے ضخیم لغت نامہ میں لکھتا ہے:

''ختام القوم'' یعنی قوم کا آخری فرد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی میں ایک نام خاتم ہے۔آیہ مبارکہ ''ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین'' میں خاتم النبیین کے معنی آخری پیغمبر ہیں آنحضرتؐ کے اسمائے گرامی میں ایک ''عاقب'' بھی ہے اور اس لفظ کے معنی بھی آخری پیغمبر کے ہیں۔[2]

(و)۔''ابو محمد دمیری'' اپنے دیوان میں کہتا ہے:

وَالْخَاتِمُ الْفَاعِلُ قُلْ بِالْكَسْرِ

وَمَا بِهٖ يُخْتَمُ فَتْحًا يُّجْرِیٰ''

یعنی خاتم تا کی زیر کے ساتھ ختم کرنے والے کے معنی ہیں اور تا پر زبر کے ساتھ اس کے معنی وہ مہر ہے جس سے خطوط یا دوسری چیزوں کو سربسر کرتے ہیں۔[3]

(ز)۔مشہور مفسر بیضاوی لکھتا ہے:

خاتم النبیین یعنی آخری پیغمبر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبران محترم کو ختم فرمایا اور سلسلہ انبیاء کو اختتام تک پہنچایا۔اگر عاصم کی قرأت کے مطابق اس لفظ کو تا پر زبر کے ساتھ پڑھیں تو معنی یہی ہوں گے کہ وہ پیغمبر جن کے ذریعے سلسلہ انبیائے الٰہی آخر تک پہنچا اور اختتام پذیر ہوا۔بالکل اسی طرح جیسے کوئی خط جب ختم ہوتا ہے تو اس کے آخر میں اس پر مہر لگا دیتے ہیں۔[4]

(ح)۔''راغب اصفہانی، اپنے قیمتی فرہنگ ''مفردات'' میں لکھتا ہے:

عربی زبان میں کہتے ہیں: ''خَتَمْتُ الْقُرْاٰنَ'' یعنی میں نے قرآن مجید ختم کیا،اسے آخر تک پڑھا، اسی طرح حضرت پیغمبر

---

[1] مختار الصحاح،ص ۱۳۰

[2] لسان العرب، ج ۱۵، ص ۵۵

[3] التیسیر فی علوم القرآن، ص ۹۰

[4] انوار التنزیل: ص ۳۴۲

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''خاتم النبیین'' کہتے ہیں، یہ اس لیے ہے کہ آنحضرتؐ نے نبوت باری تعالیٰ کو ختم کیا یعنی اپنی تشریف آوری سے آپ نے سلسلہ نبوت کو اختتام تک پہنچایا۔[۱]

(ط)۔تفسیر جلالین میں لکھا ہوا ہے:

''خاتم'' تا پر زبر کے ساتھ ذریعہ اختتام کے معنی رکھتا ہے،یعنی وہ چیز جس سے خطوط یا کسی اور شے کو سر مہر کرتے ہیں،اس طرح ''خاتم النبیین'' کے جملہ کے معنی یہ بنتے ہیں ''اللہ تعالیٰ کے انبیاء جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوئے۔[۲]

جہاں تک خطوط وسندات پر مہر لگانے کا تعلق ہے،اسلام سے قبل کے بادشاہوں اور اسلام کے بعد بھی یہ مروج تھا۔ بخاری اور مسلم اپنی صحیحین میں لکھتے ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہ روم کو خط لکھنا چاہا تو آنحضرتؐ کے اصحاب کرامؓ نے یاددلایا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو قبول نہیں کرتے تھے جو سربمہر نہ ہوتے تھے۔آنحضرتؐ نے حکم فرمایا کہ چاندی کی ایک انگوٹھی بنائی جائے۔اس انگوٹھی پر ''محمدؐ رسول اللہ'' کندہ کیا گیا۔اس کے بعد آنحضرتؐ اپنے خطوط پر اس انگشتری سے مہر لگایا کرتے تھے۔

عربی زبان میں کہتے ہیں ''خَتَمْتُ الْاَمْرَ'' یعنی اس امر کے آخر تک پہنچ گیا۔

اسی طرح کہتے ہیں ''خَتَمْتُ الْقُرْاٰنَ'' یعنی میں نے قرآن مجید آخر تک پڑھا۔

علی ہذاالقیاس ''خاتم النبیین'' یعنی آخری پیغمبر۔

نیز یہ بھی کہتا ہے کہ خاتم وانگشتری سے خط پر مہر لگانا،خط کے ختم ہونے،لکھنے والے کے اپنے مقصود کے آخر تک پہنچ جانے اور تحریر کے صحیح ہونے کی علامت ہے،اگر کسی خط،تحریر یا سند پر مہر نہ ہوگی تو وہ نامکمل ہوگی اور ناقابل اعتبار رہے گی۔[۳]

عربی زبان کے اہل لغت کے اس نظریہ پر متفق ہونے سے استفادہ ہوتا ہے کہ مادہ ''خ ت م'' ایک سے زیادہ معنی نہیں رکھتا اور وہ معنی ہیں ''آخر تک پہنچنا'' اسی طرح ''خاتم'' تا کی زیر کے ساتھ ختم کرنے والے اور آخر یا آخر کے معنی رکھتا ہے۔اگر اس کی تا پر زبر تسلیم کیا جائے تو یہ فعل ماضی ہوگا جس کے معنی ہوں گے اس نے ختم کر دیا اور آخر تک پہنچا دیا۔یا یہ لفظ اس صورت میں اسم ہے جس کے معنی ہیں آخری۔یا اس کے معنی مہر یا انگشتری ہیں جس سے خط کو ختم کر کے مہر لگاتے ہیں تا کہ خط کے ختم ہونے کی علامت قرار پائے۔یہ سب معانی اس بنیاد کی طرف پلٹتے ہیں اور اس کے ہر جگہ استعمال میں آخر تک پہنچنا مراد ہوتا ہے۔

نیز یہ جو بعض کتب لغت میں آیا ہے،کہ خاتم کے معنی انگشتری ہیں تو یہ بات اس لفظ کے لغوی اور بنیادی معنی کے ساتھ مکمل مناسبت رکھتی ہے۔اس کے کوئی الگ معنی نہیں ہیں کہ کوئی اس طرح سمجھنے لگے کہ اس لفظ کے معانی میں ایک انگشتری ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے کہ از منہ

---

[۱] مفردات راغب،ص ۴۲

[۲] تفسیر جلالین،اسی آیت کے ذیل میں۔

[۳] مقدمہ ابن خلدون،ص ۲۶۴۔۲۶۵

سابقہ میں یہی بات مروج تھی کہ انگشتری سے، جس پر اس کے مالک کا نام کندہ ہوتا تھا، خطوط، تحریروں اور سندات پر مہر لگایا کرتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کی انگشتری ان کی مہر ہوتی تھی، جس طرح حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک انگشتری رکھتے تھے جو آنحضرتؐ کی مہر تھی اور اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگایا کرتے تھے۔[1]

''قاموس اللغه'' میں آتا ہے:

''اَلْخَاتَمُ مَا یُوْضَعُ عَلَی الطِّیْنَۃِ وَحُلِیّ الْاِصْبَع''[2] (خاتم وہ چیز ہے جسے مخصوص مٹی اور انگلی کے زیور پر لگایا جاتا ہو) لیکن صاحب قاموس کی مراد یہ ہے کہ خاتم انگشتری کے معنی میں بھی آتا ہے اور ''حلی الاصبع'' کا جملہ انگوٹھی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ یہ نہیں کہنا چاہتا کہ خاتم زینت کے معنی میں آیا ہے۔ بعض بہائی مبلغین نے کہا ہے کہ خاتم لغت میں زینت کے معنی میں آیا ہے اور انہوں نے اس معنی میں صاحب قاموس سے استدلال کیا ہے، یہ بات ان کی لاعلمی اور مغالطہ کی دلیل ہے کیونکہ کوئی شخص بروئے انصاف اس عبارت سے استناد کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب قاموس نے خاتم کے معنی زینت بتلائے ہیں۔

---

[1] طبقات الکبریٰ، ج ۱، قسم دوم، ص ۱۶۰۔۱۶۱

[2] قاموس اللغۃ، ج ۴، ص ۱۰۲

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی خاتم ہونے پر قرآن مجید کی دوسری گواہی

ارشاد ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝۱

''بزرگ ہے وہ ذات (اللہ تعالیٰ) جس نے فرقان (قرآن) کو اپنے بندہ پر نازل فرمایا تا کہ وہ عالمین کو ڈرائے''۔(فرقان۔۱)

یہ آیہ مبارکہ واضح طور پر بتلاتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم یا خود آنحضرتؐ نزول قرآن کے دن سے قیامت تک تمام لوگوں کے لیے نذیر اور ڈرانے والے قرار پائیں۔

راغب اصفہانی نے اپنی لغت میں لفظ ''عالم'' پر سیر حاصل بحث کی ہے۔طویل تحقیق و بحث کے بعد وہ کہتا ہے کہ تمام جہاں افرینش کو ''عالم'' کہتے ہیں اس کی وجہ یہ کہ یہ لفظ جمع کی شکل میں آیا ہے۔ یہ ہے کہ انواع جہان کی ہر نوع اپنے مقام پر خود ایک ''عالم'' ہے، جیسے ہم کہتے ہیں عالم خاک، عالم انسان، عالم حیوان وغیرہ۔اس لفظ کو بصورت جمع کرنے کی یہ وجہ ہے کہ ایسے الفاظ کو عام طور پر جمع کی صورت میں استعمال کرتے ہیں جن کے جم غفیر صرف عاقل کے لیے بولے جاتے ہیں۔اب عالم انسان تمام عالموں کا ایک جزو ہے۔انسان چونکہ ''ذوی العقول'' ہے اس لیے عاقل کے غیر عاقل پر غالب ہونے کی وجہ سے انسان کے لیے مناسب صیغہ جمع لایا جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ صیغہ جمع کے استعمال یہ ہے کہ ''عالمین'' سے صرف فرشتے، جنات اور انسان مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک لاگ عالم شمار فرمایا ہے، نیز آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ عالم دو ہیں، بڑا عالم جس سے جہان خلقت مراد ہے اور چھوٹا عالم جس سے انسان مراد ہے، یہ اس لیے ہے کہ خلقت انسان کا طریق کار خلقت جہان سے مشابہ ہے۔[۱]

---

[۱] مفردات راغب، ص ۳۴۵ کلام امام جعفر صادق علیہ السلام حضرتؑ نے فرمایا کہ ''عالمین'' سے مراد انسان ہیں قرآن مجید کی آیات مبارکہ اس بات کی تائید کرتی ہیں۔''اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۰ ''(حجر) لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا: کیا ہم نے آپ کو انسان کی حمایت کرنے سے منع نہیں کیا؟''اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۵ ''(شعراء) حضرت لوط علیہ السلام نے لوگوں سے کہا:''انسانوں میں کیا تم مردوں کی طرف رُخ کرتے ہوئے اور طبیعی و شرعی طریق کار سے جو عورتوں سے ازدواج کرنا ہے، رُوگردانی کرتے ہو؟ ان دونوں آیت میں ''عالمین'' سے انسان ہی مراد ہیں۔

آیہ مجید ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ '' کے ذیل میں زمخشری لکھتا ہے:

یہاں لفظ عالم سے فرشتے، جنات اور انسان مراد ہیں، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے وہ تمام مخلوقات خدا مراد ہیں جن کے ذریعے عالم کے خالق کے وجود کا علم حاصل ہوتا ہے یہاں صیغہ جمع اس لیے آتا ہے کہ اس میں تمام افراد مخلوق کو شامل سمجھا جائے۔ [1]

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ دیگر آیات قرآن مجید اس لفظ ''عالمین'' خواہ صرف انسان کے معنی میں آیا ہو، یا انسان جن اور ملائکہ کے معنی ہیں، یا تمام عالم خلقت کے لیے، لیکن زیر نظر آیت یقیناً انسان یا تمام صاحبان عقل ہی مراد ہیں۔ ایسے صاحب عقل جو مکلف ہوں، یعنی جن کو پروردگار کی طرف سے ذمہ دار ٹھہرا گیا ہو کہ اپنے ارادہ و اختیار کے تحت کار ہائے زندگی کو انجام دیں۔ آیہ شریفہ میں لفظ ''نذیر'' آیا ہے۔ اس کلمہ کا اس جگہ وجود اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ ''عالمین'' سے مراد یقیناً صرف وہ موجودات ہو سکتی ہیں جو اس قابل ہوں کہ ان کو ڈرایا اور خوف دلا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی موجودات کے لیے لازم ہے کہ صاحبان عقل ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے غرائض بجالانے کے سلسلہ میں مکلف بھی ہوں۔

لہٰذا اس آیہ مبارکہ سے اچھی طرح وضاحت ہو رہی ہے کہ رسالت، انداز قرآن اور پیغمبر اکرم ﷺ کا تمام لوگوں اور تمام زمانوں سے رابطہ ہے، یعنی ان سب کا کسی مخصوص زمانہ اور انسانی برادری کے ساتھ تعین نہیں ہوتا۔ آیہ مبارکہ مطلقاً بغیر کسی قید و شرط کے بتلا رہی ہے کہ قرآن مجید یا پیغمبر اکرم ﷺ کو خداوند عالم نے اس لیے بھیجا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ڈرانے والے اور خوف دلانے والے ہوں۔ پس ان کو کسی خاص زمانہ و مقام میں محدود نہیں کیا گیا۔

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ چونکہ بعض آیات قرآن کریم اور عربوں کے انداز کلام میں لفظ ''عالمین'' بنی نوع انسان کی اکثریت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس لفظ سے زیر بحث آیہ مبارکہ میں حتمی اور قطعی طور پر 'عالمین' سے تمام انسان مراد ہوں گے کیونکہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آیہ مجیدہ میں بھی اکثریت ہی مراد لی گئی ہو۔ یعنی خداوند متعال نے اس لیے قرآن کریم نازل فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو ڈرائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم یہ کہنے لگیں کہ قرآن قیامت تک کے افراد کو ڈرانے کے لیے آیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ 'عالمین' کلام عرب اور قرآن مجید کی اصطلاح میں تین معنی میں استعمال ہوتا ہے:

(ا)۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کیلئے مثلاً:

قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۴﴾

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۱ ص ۱۱

''فرعون نے کہا پروردگار ''عالمین'' کون ہے؟ (موسیٰؑ نے کہا) جواب دیا وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اگر تم اہل یقین ہو؟'' (شعرائ۔ ۲۳، ۲۴)

(ب)۔ ان مخلوقات پروردگار کے لیے جو عقل و شعور رکھتے ہیں، یعنی ملائکہ، انسان و جنات جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

''اور اللہ تعالیٰ مخلوقات عالمین کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا''۔ (آل عمران۔ ۱۰۸)

(ج)۔ انسانوں کے لیے مثلاً:

اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۵﴾

''تم کیوں انسانوں میں مردوں کی طرف رخ کرتے ہو؟ (فطری و مشروع طریقہ پر جس کے مطابق جائز ازدواج عورت سے ہوتا ہے) فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟''۔ (شعرائ۔ ۱۶۵)

ان حالات میں اگر ان تینوں صورتوں کے علاوہ کسی صورت یعنی اکثریت کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو پھر اس کے لیے کوئی قرینہ ہونا لازم ہے۔ کیونکہ آیہ زیر بحث میں کسی قرینہ کا وجود نہیں پایا جاتا اس لیے یہ احتمال کہ 'عالمین' سے انسانوں کی اکثریت مراد ہے، بلا دلیل ہو کر رہ جائے گا۔ زمخشری درج ذیل آیہ مبارکہ کے بارے میں کہتا ہے کہ عالمین سے اکثریت مراد ہے:

يٰبَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾

''اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو جو تم پر (نازل) کی کہ تمہیں تمہارے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی''۔ (بقرہ۔ ۴۷)

زمخشری کی گفتگو کئی پہلو سے درست نہیں:

اول: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ میں عالمین سے اس زمانہ کے تمام انسانوں کو مراد لینا، درست نہیں۔

دوم: اگر مذکورہ بالا آیت میں زمخشری کی بات یا ابن عباسؓ کے نظریہ کو قبول کر لیا جائے تو یہ دوسری آیت کے قرینہ کے مطابق ہوگا جو کہتی ہے کہ امت اسلامی تمام امم سابقہ پر فضیلت و برتری رکھتی ہے۔ وہ آیہ مبارکہ یہ ہے:

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے ظاہر ہوئی ہے کیونکہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو''۔ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

اس آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ امت اسلامی تمام امم پر برتری رکھتی ہے، یہ آیہ مبارکہ اس بات کی دلیل بن رہی ہے کہ بنی اسرائیل اپنے زمانہ کے لوگوں یا ان کی اکثریت پر فضیلت و برتری کے مالک تھے۔ دنیا کے تمام انسانوں پر روز قیامت تک جن میں امت اسلامیہ بھی شامل ہے، فضیلت نہیں رکھتے تھے۔

زیر بحث آیت قرآن مجید کے مشابہ ایک اور بھی آیت بھی سورۂ آل عمران ہی میں ہے، جو حضرت مریمؑ میں کہتی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

''(اے مریمؑ) اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا۔ پاک و پاکیزہ کیا اور تمہارے زمانہ کی تمام عورتوں پر تمہیں برتری عطا فرمائی''۔ (آل عمران ۔ ۴۲)

اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہاں حضرت مریم کی اپنے زمانہ کی عورتوں پر برتری مراد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت زیادہ روایات اس حقیقت کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا عالمین کی تمام عورتوں پر برتری فضیلت رکھتی ہے۔ ہم ان روایات میں سے ایک بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جناب عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری ایام میں جناب فاطمہ زاہرہ سلام اللہ علیہا سے فرمایا: ''کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمام باایمان عورتوں کی سیدہ و سردار بنو؟ [۱] ''علامہ مجلسی نے اس بارے میں بحارالانوار میں روایات درج کی ہیں۔ محققین حضرات اس کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ [۲]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ان دونوں آیات میں 'عالمین' سے انسانوں کی کثرت ہی مراد ہو، نہ کہ تمام انسان تو یہ قرینہ خارجی کسی اور دلیل کی بناء پر ہوسکتا ہے۔ اگر یہ قرینہ خارجی اور دلیل دیگر وجود نہ رکھتے ہوں تو دونوں آیات میں 'عالمین' کے معنی جہان اور تمام انسان ہی ہیں، چونکہ ہم قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ آیہ زیر بحث میں کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی، لہٰذا کہنا پڑے گا کہ اس سے وہی پہلے اور ظاہری معنی مراد ہیں، یعنی آیہ مبارکہ کے معنی یہ ہوں گے، بزرگ ہے وہ پروردگار جس نے قرآن کو اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرمایا تا کہ وہ قرآن کی مدد سے تمام (انسانوں کو ڈرائیں اور خوف دلائیں، اس طرح ان کی رسالت و نبوت قیامت تک کے تمام انسانوں پر قائم رہے گی''۔

---

[۱] الطبقات الکبریٰ، ج ۸، ص ۱۷، التاج، ج ۳، ص ۳۵۵

[۲] بحارالانوار، ج ۴۳، ص ۳۶

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے نبی خاتم ہونے پر قرآن مجید کی تیسری گواہی

قرآن مجید میں ارشاد ہورہا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾

''ان لوگوں کو جو اس کے نزول کے وقت اس سے انکار کے لیے کھڑے ہو گئے ہم انہیں سزا دیں گے، بے شک قرآن بلند وعزیز کتاب ہے، باطل اس میں ہرگز راہ نہیں پاتا، نہ آگے اور نہ پیچھے سے اور یہ کتاب حکیم وحمید خداوند تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ (حم سجدہ)

۔اس آیہ مجیدہ میں ذکر سے قرآن مجید مراد ہے۔اس بات کی دلیل درج ذیل آیات ہیں:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾

''ہم نے قرآن نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ونگہبان ہیں''۔ (حجر۔۹)

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿٦﴾

اور وہ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہنے لگے: اے وہ کہ جس پر قرآن نازل ہوا ہے تم تو مجنون ہو''۔ (حجر۔٦)

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٤﴾

''اور ہم نے آپ پر قرآن نازل فرمایا تا کہ آپ اسے ان لوگوں کے سامنے بیان کریں جن کے لیے یہ نازل ہوا ہے۔شاید وہ (اس میں غور وفکر کرنے لگیں''۔ (نحل۔۴۴)

ان تمام آیات مجیدہ میں ''ذکر'' سے قرآن مجید ہی مراد ہے اور ''لا یأتیہ'' کی ضمیر ''ذکر'' ہی کی طرف لوٹتی ہے۔لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوں گے ''قرآن وہ کتاب ہے کہ باطل کسی طرح بھی اس میں راہ نہیں پاتا''۔

قرآن مجید میں باطل کے نفوذ کا چند صورتوں میں تصور کیا جا سکتا ہے:

(ا)۔آیات قرآن کی تحریف

(ب)۔احکام قرآن کسی اور کتاب کے ذریعے نسخ و باطل کیے جانے لگیں۔

(ج)۔قرآن مجید جن واقعات وحادثات کی خبر دیتا ہے واقعہ کے مطابق نہ ہوں اور ان کا بطلان لوگوں پر واضح ہو جائے۔

آیہ مجیدہ سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ان میں سے کوئی شے قرآن میں راہ نہیں پاتی اور یہ کتاب اپنی حقانیت کے بناء پر مستقل طور پر قیامت تک کے لیے حجت واقع ہوئی ہے۔

اسی آیہ مبارکہ ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ'' کے بھی یہی معنی نکلتے ہیں۔ان دونوں آیات مجیدہ کے معانی و مقاصد کے مطابق قرآن مجید ایسی برحق اور مستقل کتاب ہے کہ اس میں باطل راہ نہیں پاتا۔ہم نے قرآن کو نازل فرمایا اور ہم ہی قیامت کے دن تک کے لیے اس کے باطل ہونے یا باطل کے کسی طرف سے اس میں راہ پانے کے خلاف مکمل حفاظت فرمائیں گے۔یہ کتاب قیامت تک باطل کے نفوذ سے قطعی محفوظ ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی حجت ابدی ہے۔نیز قرآن مجید کی حجت کا ابدی ہونا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور شریعت اسلام کے ابدی ہونے کا ثبوت ہے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد نہ تو کوئی دوسرا پیغمبر آئے گا اور نہ ہی کوئی دوسری شریعت ہوگی۔

دوسرے لفظوں میں جب قرآن مجید کی حقانیت اور شریعت اسلام کی قیامت تک کی ہمیشگی اور استقلال ثابت ہوگئی اب اگر کوئی اور کتاب وشریعت آجائے تو وہ یا تو شریعت اسلام کے عین مطابق ہوگی، یا اس سے بالکل مختلف۔اگر وہ شریعت اسلام کے عین مطابق ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی ضرورت و احتیاج نہ ہوگی۔اسی طرح اگر نئی آنے والی شریعت خلاف شریعت اسلام ہو،یعنی اس کے احکام میں بعض احکام اسلام کے خلاف اور ان کی نقیض ہوں تو پھر لازم آئے گا کہ یا تو دونوں حق پر ہوں گے یا ان میں ایک حق پر اور دوسرا باطل پر ہوگا،اگر ہم یہ کہیں کہ دونوں حق ہیں تو یہ نتیجہ ہوگا کہ دو متضاد احکام کو حق سمجھا جائے اور یہ بات امر محال ہے۔لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک حکم حق ہے اور دوسرا باطل۔اب چونکہ قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ شریعت اسلام اور خود اپنی ابدی حقانیت کی تصدیق فرماتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بعد والی شریعت وکتاب کو باطل ہونا چاہیے۔یعنی یہ بعد میں آنے والی کتاب اور شریعت دونوں آسمانی نہیں اور اس کو پیش کرنے والے نے اس کی جھوٹی نسبت خداوند عالم سے دی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے نبی خاتم ہونے پر قرآن مجید کی چوتھی گواہی

ارشادہ باری تعالیٰ ہے:

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ؕ

''کہہ دیجئے! کہ یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور ہر اس شخص کو جس تک یہ پہنچے، اس کے ذریعے خوف دلاؤں اور ڈراؤں۔(انعام۔۱۹)

شیخ طبری مرحوم اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ قرآن بذریعہ وحی مجھ تک پہنچا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور تمام لوگوں کو جن تک قیامت تک یہ قرآن پہنچے گا، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤں، اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت توحید و خدا پرستی کی خبر پہنچ گئی تو گویا قرآن مجید پہنچ گیا، یعنی اس پر حجت تمام ہوگئی، بلکہ بعض علمائے کرام نے یہاں تک کہا ہے کہ ہر وہ شخص جس تک قرآن مجید پہنچ جائے، وہ ایسا ہے گویا اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا شرف پایا اور خود آنحضرتؐ سے معارف وحقائق اسلام کو سنا، حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن کریم جہاں کہیں بھی ہو، لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتا اور عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے۔[1]

اسی لیے اس آیہ مبارکہ سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ''مَنۡۢ بَلَغَ'' کے ''لِاُنۡذِرَکُمۡ'' ہونے کی حیثیت میں تاقیامت قائم و دائم ہے۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جملہ ''مَنۡ بَلَغَ'' کا عطف ''لِاُنۡذِرَکُمۡ'' کی ضمیر فاعل ہے۔ اس صورت میں آیہ مجیدہ سے یہ مراد ہوگا کہ مجھے اور ہر اس شخص کو جس تک قرآن پہنچے لوگوں کو عذاب خدا سے ڈرانا چاہیے۔

اس احتمال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص تک بھی قرآن کریم پہنچے گا وہ خود قرآن کا مبلغ بن جائے گا نہ کہ اس سے تبلیغ حاصل کرنے والا۔ یہ احتمال قواعد عربی کے لحاظ سے صحیح قرار نہیں پاتا کیونکہ کبھی بھی ضمیر مرفوع متصل پر ایک ضمیر متصل کا فاصلہ قرار دیے بغیر عطف انجام نہیں پاتا، جیسا کہ کہتے ہیں: ''نَصَرۡتَ اَنۡتَ وَزَیۡدٌ'' ''یعنی زید اور تو نے مدد کی''۔ اس مثال میں زید کا عطف ''نصرت'' کی ضمیر متصل پر ہوا ہے، لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں لفظ ''اَنۡتَ'' کا معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ واقع ہوا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۴، ص ۲۸۲

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے نبی خاتم ہونے پر قرآن مجید کی پانچویں گواہی

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۝۲۸

''اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا لیکن اکثر لوگ نا سمجھ ہیں''۔(سباء۔۲۸)

غور وخوض کے بعد اس آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''کافۃ'' عامہ کے معنی میں ہے اور ''الناس'' کے لیے حال ہے، آیت کی تقدیر اس طرح ہے: ''وَمَآ اَرۡسَلۡنَا اِلَّا كَآفَّةً النَّاسِ'' یعنی ہم نے نہیں مبعوث نہیں کیا اور نہ بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لیے''، یہ جملہ اس بات کے برابر ہے کہ کہا جائے: ''آپ کی رسالت عمومی، عالمی اور ابدی ہے''۔ کیونکہ اور کسی صورت کے بغیر آنحضرتؐ تمام لوگوں کے لیے پیغمبر تصور نہیں کیے جائیں گے، تاہم اگر یہ احتمال کیا جائے کہ ''كَآفَّة'' ''لوگوں کو گناہ سے روکنے کے معنی میں ہے، اور ''ارسلنك'' کے ك سے حال مراد لیا جائے، تو یہ بات دو دلائل کی بناء پر بہت ہی ضعیف ہے۔

(ا)۔آیہ مبارکہ میں ''نذیرا'' کے لفظ کی موجودگی میں کلمہ ''كَآفَّة'' ان معنی میں نہیں آتا کیونکہ اگر ''كَآفَّة'' کے معنی روکنے والا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خداوند عالم کے مقرر کردہ عذابوں سے گفتگو اور تنبیہ کے ذریعے لوگوں کو باز رکھیں، مثلاً آنحضرتؐ کہیں کہ شراب مت پیو کیونکہ پینے والا اللہ تعالیٰ کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوگا، ظاہر ہے کہ ''انذار'' کے معنی بھی یہی ہیں کیونکہ انذار کے معنی لوگوں کو عذاب پروردگار سے ڈرانا ہے۔

(ب)۔قرآن مجید میں ہر جگہ کلمہ ''كَافَّة'' عامہ (سب کے سب) کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً (بقرہ۔۲۰۸)

وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ كَآفَّةً (توبہ۔۳۶)

وَمَا كَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِيَنۡفِرُوۡا كَآفَّةً (توبہ ۱۲۲)

ان تمام آیات کریمہ میں ''كَآفَّة'' کے معنی ''عامۃ'' ہی ہیں، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل روایات پیش کی جاتی ہیں جو ان معنی کی

تائید کرتی ہیں:

۱)۔ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اُرْسِلْتُ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً وَّبِيَ خُتِمَ النَّبِيُّوْنَ"[۱]

یعنی "میں سب لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں اللہ تعالیٰ کے پیغمبران وانبیاء مجھ پر ختم ہو گئے اور میرے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں آئے گا"۔

۲)۔خالدؓ بن معدان کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً"

یعنی "میں سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں"[۲]

غور فرمائیں کہ ان دونوں روایات میں "كَآفَّة" بمعنی "عامة" اور "الناس" حال آیا ہے۔یہ بذات خود اس امر کی ایک عمدہ دلیل ہے کہ زیر بحث آیہ مبارکہ میں بھی "كَآفَّة" "عامة" ہی کے معنی میں ہے اور "الناس" حال ہے،لہٰذا حقیقتاً یہ کہنا چاہیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری پیغمبر ہونے پر استدلال ہوا ہے۔وہ دلائل کے اعتبار سے دو قسم کی ہیں:

۱)۔آیہ مبارکہ "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" جو پوری صراحت کے ساتھ بتلاتی ہے کہ باب نبوت مطلقاً بند ہو چکا ہے،خواہ دعویٰ کرنے والا اپنے آپ کو حامل کتاب وشریعت دونوں ہی کا حاصل قرار دیتا ہو یا اپنے آپ کو سابقہ پیغمبر کی شریعت کا مبلغ ہی ظاہر کرے۔

۲)۔دیگر آیات قرآن مجید صرف اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شریعت اسلام کے بعد کوئی دوسری ایسی شریعت اور آسمانی کتاب،جو قرآن مجید اور شریعت اسلام کی ناسخ ہو،ہرگز نہیں آئے گی،یہ آیات سے زیادہ اور واضح کوئی چیز بیان نہیں کرتیں اور ان چاروں آیات مبارکہ سے استدلال کا ہمارا مقصد یہی تھا،ہم نے چاہا بھی یہی تھا کہ ان لوگوں کے اعتقاد کو باطل کریں جنھوں نے کبھی بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت،کتاب اور نئی شریعت لانے کا دعویٰ کیا ہے۔[۳]

---

[۱] الطبقات،الکبریٰ،ج۱ص۱۲۸

[۲] الطبقات،الکبریٰ،ج۱ص۱۲۸

[۳] لازم ہے کہ ہم یاد دلائیں کہ قرآن مجید میں ان پانچ آیات کے علاوہ اور آیات بھی وارد ہوئی ہیں جن سے بوجہ اختصار ہم صرف نظر کرتے ہیں۔

علم غیب

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطور ایک عالم غیب انسان متعارف کرواتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ آگہی آنحضرتؐ کے درون ذات سے نہیں ابھری، بلکہ آنحضرتؐ کے دیگر علوم و آگاہیوں کی طرح باہر سے آپ پر القاء ہوتی ہے، یعنی آنحضرتؐ وسائل خاص کی مدد اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے پردۂ غیب کے پیچھے کی خبروں سے مطلع فرماتے ہیں۔

ہم نے ضروری جانا کہ مختصراً اس موضوع پر گفتگو کریں تا کہ حقیقت روشن ہو جائے۔ لیکن بطور اجمال ہم واضح کر دیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عظیم اور اس کی الوہیت کی علامت اس کا لامحدود اور بے پایاں علم ہے، کوئی محدود یا کسی مکتب سے حاصل شدہ علم کے ساتھ اس کا کوئی تناسب نہیں کہ اسے علم الٰہی تصور کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیائے کرام کا علم دوسری کیفیت میں آتا ہے۔ قول اول یعنی لامحدودیت میں نہیں آتا۔ سب سے پہلے ہم معرفت کے تین تدریجی مقامات کی وضاحت کرتے ہیں:

اس میں کوئی گنجائش کلام نہیں کہ ہر انسان کی زندگی کی ابتداء لاعلمی سے ہوتی ہے، وہ آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ واقفیت کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد بتدریج اس کا ذہن عالم خارج کے لیے کھلنے لگتا ہے، سب سے پہلے جو اس ظاہر کے ذریعہ وہ حقائق سے روشناس ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد عقل وفکر کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان حقائق سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ جو احساس اور لمس کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معقول فرد، مالک قوت استدلال ہو کر ایک سلسلہ حقائق واقعی اور قوانین علمی سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔

کبھی کبھی نسل انسانی علمائے عظیم پیدا ہوتے ہیں جو الہام کے ذریعے ایسے مطالب سے آگاہ ہوتے ہیں، جن سے بذریعہ استدلال واقفیت پانا ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر عقلاء وعلماء نے ادراک انسان کو تین قسم کے ادراکات میں تقسیم کیا ہے، جو یہ ہیں:

۱)۔عوم الناس کا ادراک

۲)۔استدلال کرنے والوں اور مفکرین کا ادراک

۳)۔عارف اور روشن ضمیر لوگوں کا ادراک

یعنی ظاہرین عوام احساس کی مدد سے، مفکرین استدلال کی مدد سے اور روشن ضمیر لوگ جہان بالا سے الہام واشراق کی مدد سے کشف حقائق تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔

دنیا کے عقلمند لوگ، فلاسفر اور علماء داعی ہیں کہ ان کے پہلے سے نہ جانے ہوئے حاصل کردہ تخیل اور ان کے اپنے ساختہ و پرداختہ افکار زیادہ تر روشنی بخش والہام آمیز شعلہ ہائے نور کے زیر اثر ان کے اذہان میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ روشن افکار تجربہ یا استدلال کی روش سے گزر کر سرعت کے ساتھ منازل پرورش تکمیل وتحقیق کو عبور کرنے لگتے ہیں۔

معرفت کے تین طریق

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقصد کے حصول کے لیے تین راستے رکھتا ہے، جس میں عوام الناس کی اکثریت زیادہ تر طریق اول کو اختیار کرتی ہے۔ ایک جماعت دوسرے راستہ اور صرف چند گنے چنے لوگ تکامل روحانی کے زیر اثر تیسری راہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان تینوں طریقہ ہا یعنی راستوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(ا)۔ تجربات واحساس کا طریق

اس سے مراد ادراکات کا وہ سلسلہ ہے جو حواس بیرونی کے راستہ سے قلمروئے ذہن میں وارد ہوتا ہے، مثلاً ہر وہ چیز جو باصرہ، ذائقہ ،شامہ۔۔۔وغیرہ کے ذریعے محسوس کی جاسکتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز سے ہمارے محل ادراک میں قرار پاتی ہے۔ دور حاضر میں ٹیلی سکوپ (دوربین)، مائیکروسکوپ (خود بین)، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اس قسم کی دیگر ایجادات و مشاہدات انسانی کی اس طرح مدد کی ہے کہ اب انسان دورونزدیک کی اکثر اشیاء پر قابض ہے۔

(ب)۔ استدلال وعقل کا طریق

مفکرین عالم عقل کی وسعت کو کام میں لاکر علوم عالم میں بدیہی، واضح اور ثابت شدہ مقدمات کے مطالعے اور ان میں جستجو کر کے ایسے سلسلہ قوانین کلی کو بے نقاب کر ڈالتے ہیں جو قوت احساس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ معرفت وکمال کی بلند بالا چوٹیوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔

علوم کے یہ قوانین کلی، بشرطیکہ منزل کلیت تک پہنچ چکے ہوں، مسائل فلسفہ، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک، اس کی صفات، اس کے افعال اور ان مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جو عقائد و مذاہب کے علم میں آمنے سامنے ہیں، یہ سب قوانین کلی فکر ونظر کی دستگاہ کی پیداوار اور عقل انسانی کی قوت کے استعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(ج)۔ الہام واشراق کا طریق

واقعیت شناسی کی یہ تیسری راہ ہے جو حس وعقل کی منازل سے ماوراء قرار دی گئی ہے۔ یہ واقعیت شناسی کی ایک خاص قسم ہے جس کا مقام علم ودانش کی نظر میں قابل انکار نہیں، البتہ مادی جہان بینی کا محدود نظام اس قسم کے کسی ادراک کو قبول نہیں کر سکتا جو احساس وتعقل کے ماوراء ہو، تاہم اصول علمی کے اعتبار سے اس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ تجربہ میں آنے والے امور کو حواس کی مدد سے پہچانا جاتا ہے۔ امور متعلق بہ عقل کا فکر منطقی سے اندازہ کرتے ہیں، امور ریاضی مراحل ادراک طے کرنے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ لیکن منازل اشراق والہام کے حصول کے لیے ایسے جلووں کی

ضرورت ہے، جو احساس و استدلال کی حدود سے ماوراء مقام پر پائے جاتے ہیں، برق آسا روشن بینی اور تنو ہر شعاع ہائے نور جن سے بزرگ عظیم الشان لوگوں کے ذہن حساس مملون ہوتے ہیں، مقام رویت تک پہنچاتے ہیں۔

مشہور ماہر نفسیات پروفیسر، ''سوروکین'' ان افراد میں سے ایک ہے جنہوں نے ان تین طریق ہائے معرفت کے وجود کی واضح طور پر تصدیق کی ہے۔ یہ شخص ادراک عرفانی اور اصطلاحی طور پر ''الہام'' کے لیے ایک خاص مقام ومنزلت کا قائل ہے۔ اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ:

''اس راستہ کو غلط وحقیر قرار نہیں دیا جا سکتا، کیا یہ ممکن ہے کہ بڑے بڑے ادیان و مذاہب کی وسیع تعلیمات کو نظام مادری کے کوتاہ بین لوگوں کی تقلید میں یکسر بے عقلی شمار کرتے ہوئے ان کی قدر و قیمت سے انکار کر دیا جائے؟''

پس ان طرف معرفت کو مندرجہ ذیل نام دیئے جا سکتے ہیں:

۱)۔ راہ احساس یعنی حس سے واقفیت

۲)۔ راہ عقل یعنی واقفیت

۳)۔ راہ الہام یعنی دل کی آگہی

دور حاضر میں علم نفسیات الہام کو ایک نفسیاتی حقیقت کی شکل میں قبول کرتے ہوئے اس کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

''ادراک ناگہانی، اچانک اور بغیر مقدمہ وتمہید، واضح طور پر آگہی دینے والا، جو برقی شعاع کی طرح صفحہ، ذہن کو منور کرے، بغیر اس کے کہ اس سے قبل اس کے بارے میں کبھی کسی طرح کا غور وفکر کیا گیا ہو''۔

علمی مکاشفات میں الہام کی اہمیت ونفوذ کو ماہرین کی تائید حاصل ہے۔ ''البرٹ آئینیشٹائن'' (۱۸۷۹۔۱۹۵۵ئ) اس بارے میں بہت سے فلاسفہ و عارفین سے متفق ہے، کئی ایک اسلامی علماء و دانشمندوں کی طرح جو الہام کو کلید معارف جانتے ہیں، یہ شخص بھی الہام کو مکاشفات علمی کے لیے ایک حامل عظیم جانتا ہے۔

۱۹۳۱ء میں یلات و پیکر نامی دو امریکی ماہرین طبیعات نے ایک سوال نامہ علمی مشکلات کے حل اور مکاشفات کے سلسلہ میں اہمیت کی تحقیق کی خاطر ایک جماعت ماہرین کے سامنے پیش کیا۔ اس سے بہت سے نہایت قیمتی نتائج سامنے آئے۔

ماہرین میں سے ایک نے سوال کرنے والے کو اس طرح جواب دیا ہے: ''میں اس مسئلہ کے حل کے بارے میں غور وفکر میں مصروف تھا لیکن اس سے متعلق اس قدر شکوک وابہام سامنے آئے کہ میں نے اس بات کو نیز اس سے متعلق تمام امور کو ایک طرف ہٹا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دوسرے روز جب میں کسی اور کام میں بے حد مشغول تھا ایک دم بجلی کی چمک کی طرح اچانک ایک خیال میرے ذہن میں لپکا۔ حیرت ہے کہ یہ اسی مسئلہ کا حل تھا جس نے مجھے بالکل مایوس کر دیا تھا''۔

اس قسم کے واقعات ونظریات فرانس کے نامی گرامی ریاضی دان ہنری پوانکارو (۱۸۵۴۔۱۹۱۲ئ) اور دیگر ماہرین طبیعات و ریاضی وفزکس نے بھی پیش کیے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے الہامات علمی جو نہایت قیمتی مکاشفات کا سبب ہوتے ہیں، لازم نہیں کہ ماہرین متعلقہ کے ان تجربات تفکرات کا نتیجہ ہوں جن پر ان کی فکر و توجہ کسی وقت مرتکز رہی ہو۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ مکاشفات ان کے علم خصوصی و تجربات کے ساتھ کوئی قریبی رابطہ بھی رکھتے ہوں، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مثلاً لوئی پاسچر نے (۱۸۲۲۔۱۸۹۵ئ) باوجود یہ کہ طبیعات کا مرہ تھا، بہت سے انکشافات و قیمتی خدمات انسانی معاشرہ میں علم الحیات اور علم طب کے سلسلہ میں پیش کی ہیں۔

الہام اور نظریہ الیکس کارل

ماہرین معاصرین میں ''الیکس کارل'' ان حضرات میں سے ہیں جو مسئلہ الہام کی خصوصی اہمیت وقدر و قیمت کے قائل ہوئے ہیں۔ یہ معتقد ہیں کہ روشن بین افراد اپنے اعضائے احساس کی مدد کے بغیر دوسروں کے افکار کا ادراک کر لیتے ہیں۔ یہ حضرات زمان و مکان کے اعتبار سے دور کے حوادث کو بھی محسوس کر لیتے ہیں، کارل اس کیفیت کو ایک خاص نعمت قرار دیتا ہے جو استثنائی حالات میں حاصل ہوتی ہے جس سے سوائے چند گنے چنے لوگوں اور کوئی بہرہ مند نہیں ہوتا۔ اس مشہور و دانشمند نے کوشش کی ہے کہ اس بحث میں علمی و یقینی مطالب کو احتمالات سے علیحدہ کرے اور ان تمام مطالعات و تجربات کو انسان کے سامنے رکھے جو تمام ادوار اور مقامات پر اس سلسلہ میں کیے گئے ہیں، یہ شخص بہت سی مختلف انسانی فعالیات کا مطالعہ کر سکا ہے۔ ہم یہاں اس دانشمند کے نظریات سے واقفیت کی خاطر اس کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تا کہ اس کے الہام کے بارے میں قلم کردہ نظریات سے ہمارے قارئین کرام آگاہ ہو سکیں۔

حقیقت و یقینی امر یہ ہے کہ مکاشفات علمی صرف فکر انسانی کا ماحصل اور اثر نہیں ہوتے۔ علماء و دانشمند قوت مطالعہ و فیصلہ کے علاوہ بھی الہام و آمد ذہنی و کشف جیسے خصائص سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کشف ذہنی کی مدد سے ان چیزوں کا ادراک بھی کر لیتے ہیں جو قضایا کے دوران بظاہر آپس میں کسی قسم کا رابطہ رکھتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اس طرح وہ مجہول و غیر معروف علوم کو بھی اپنی عقل و فراست سے پا لیتے ہیں۔ اس طرح تمام بزرگ و عظیم دانشور نعمت و استعداد کشف سے مالا مال ہوتے ہیں اور ان چیزوں کے علم کے حامل ہوتے ہیں جن کا بغیر دلیل و تجزیہ کے جاننا ان کی دانست میں اہم ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک مدیر جو واقعی ایک صحیح مدیر ہے، اپنے ماتحتوں کا اپنی ذہنی کاوش اور وصول شدہ اطلاعات سے انتخاب کا سلسلہ میں محتاج نہیں ہوتا؟ ایک سمجھدار قاضی مقدمہ کی جزئیات اور قانونی تبصروں کے بغیر بھی حتیٰ کہ کبھی کبھی بقول ''کاردوزو'' غلط دعووؤں کے حصول کے باوجود، مقدمہ پر صحیح حکم دے سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک ماہر بزرگ اس راستہ کی طرف خود بخود کھینچتا چلا جاتا ہے، جو اس کی تازہ بہ تازہ انکشافات کی طرف رہبری کرتا ہے۔ یہ سب وہ کیفیات ہیں جن کو پیشتر ازیں الہام کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛ ایک جماعت علمائے منطق کی ہے اور دوسری علمائے اشراق کی۔ علوم میں ترقی ان دونوں جماعتوں کی مرہون منت ہے۔ علوم ریاضی میں بھی، اگر چہ اس کی بنیاد مکمل طور پر منطقی ہے، اشراق کا حصہ کافی حد تک ہے، ریاضی والوں میں اشراق بھی پائے جا سکتے ہیں اور منطقی بھی۔ مثلاً ''ہرمیت'' اور ''ایرشتراس'' اشراقی تھے جبکہ ''برتران'' اور ''ریلمان''، منطقی تھے۔ تاہم

روشن ضمیر لوگ اپنے حواس واحساس سے استفادہ کیے بغیر دوسروں کے افکار کا اندازہ کرتے اور ایسے حوادث سے کم وبیش آگاہ ہوجاتے ہیں جو بہ لحاظ زمان ومکان ان سے دور ہوتے ہیں، یہ حضرات بعض مواقع اور مقدمات کے بارے میں اس سے بہتر اطلاع دے سکتے جس قدر اعضائے احساس سے ممکن ہو، ایک روشن ضمیر انسان کے لیے کسی کے افکار کا اندازہ لگانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کسی کے چہرہ کے اوصاف بیان کرنا لیکن دیکھنے اور احساس کرنے کے بعد بیان کیفیت اس بات کی تشریح کے لیے کافی نہیں، جو شعور میں گزر رہی ہو کیونکہ جب کوئی چیز دکھلائی نہیں دیتی تو پھر کوئی شخص اس کی جستجو نہیں کرتا بلکہ فقط اس کو جاننے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ موت کے موقعوں پر یا کسی بہت بڑے خطرہ سے دوچار ہوتے وقت کسی فرد یا افراد میں رابطہ قائم ہوجاتا ہے۔ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص بستر مرگ پر ہو، یا کسی حادثہ کا شکار ہو رہا ہو تو ایک لمحہ کے لیے اپنی عام شکل وصورت میں اپنے کسی قریبی دوست کی نظروں میں آجاتا ہے۔اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ خیالی جسم یا ہیولیٰ خاموش وساکن رہتا ہے۔لیکن کبھی کبھی بات کرتے ہوئے اپنی موت کی خبر بھی دے دیتا ہے، کبھی ایک روشن ضمیر شخص طویل فاصلہ سے کسی منظر، کسی شخص یا کسی کیفیت کو نہ صرف دیکھ بھی لیتا ہے بلکہ بڑی وضاحت کے ساتھ اس کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ایسے بہت سے لوگ ہیں جو عام حالات میں روشن ضمیر نہیں ہوتے لیکن اپنی زندگی کے دوران ایک دوبار اس قسم کے رابطوں کا تجربہ کر چکے ہوتے ہیں۔

لہٰذا اس طرح ہوجاتا ہے کہ کبھی کبھی اعضائے احساس کے علاوہ دیگر راستوں سے بھی ہمیں خارجی دنیا سے واقفیت میسر آجاتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر انسانی فاصلہ بعید سے بھی دو افراد کے درمیان براہ راست رابطہ قائم کردے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مقدمات کو جن کا مطالعہ علم جدید میں (METAPHYSICS) مابعد الطبیعات کے مطابق ہوتا ہے۔بالکل اپنی اصلی ہیت کے طور پر قبول کرلیا جائے کیونکہ یہ مطالعہ حقائق کا حامل ہوتا ہے۔یہ مقدمات انسانی وجود کے ایک جزو سے، جو ابھی تک اچھی طرح پہچانا نہیں گیا۔اپنے آپ کو متعارف کرادیتے ہیں۔اس طرح ممکن ہے کہ بعض حضرات کی حد سے زیادہ روشن ضمیری کی علت پر روشن ہوجائے۔[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روح انسانی کے لیے ادراک حسی و تعقلی کی صورت میں دو ایسے ذرائع ہیں جو اس کے جہان خارج پر تسلط کو کسی حد تک پورا کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ روح انسانی کے لیے ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کی تشریح وتعریف ممکن نہیں، اور جو اس کے جہان خارج سے رابطہ کو برقرار رکھتا ہے اس کا نتیجہ مندرجہ ذیل موارد کی شکل میں آتا ہے جن کی تمام علماء سے تصدیق ہوتی ہے:

(ا)۔مکاشفات علمی صرف فکر انسان ہی کا ماحصل ونتیجہ نہیں ہوتے اور علمائے بزرگ قوت مطالعہ اور ادراک مقدمات کے علاوہ الہامی قوت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔

(ب)۔روشن ضمیر حضرات اعضائے احساس سے استفادہ کیے بغیر دوسروں کے افکار کو درک کرسکتے ہیں۔بلکہ ایک روشن ضمیر کے لیے دوسرے شخص کے افکار کا مطالعہ اسی قدر آسان ہوتا ہے جیسے اس کے چہرہ کا مطالعہ آسان ہوتا ہے۔

---

[1] انسان موجود ناشناختہ، ص ۱۳۵۔۱۳۷

(ج)۔موت کے وقت یا خطرہ درپیش ہوتے ہوئے ایک شخص کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بستر مرگ پر پڑا ہوا شخص لحہ کے لیے اپنی عام صورت میں اپنے دوستوں کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

(د)۔روشن ضمیر شخص فاصلہ بعید سے کسی منظر یا شخص یا میدان عمل کا نہ صرف ملاحظہ کرسکتا ہے بلکہ اس کی تصویر کشی وتعریف بھی کرسکتا ہے۔

برگساں کا شہودو فلسفہ

مغرب کے اہل علم دانشمندوں میں برگساں (۱۸۵۹۔۱۹۴۱ء) دیگر لوگوں سے زیادہ شہود کو اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مکتب فکر کے مخالفین اس کو عقلی واستدلالی کیفیات کے مخالف کے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔ایک طبقہ تو اسے (IDEALIST) تصور کرتا ہے۔تاریخ علم میں اس قسم کے تضاد اور غلط کوشیاں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔تاہم برگساں نے بھی دیگر ماہرین اہل علم کی طرح حس کے مقابلہ میں شہود اور عقل کو معرفت منابع سے قرار دیا ہے۔

بے جا غرور

الہام اور امور غیبی سے آگاہی کا انکار ایک بے جا غرور کا نتیجہ ہے جس کا اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مادیین (METERIALIST) شکار ہوئے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہر چیز کو سمجھ لیا ہے۔اب ان کے لیے عالم ہستی ووجود میں کوئی مجہول یعنی ان جانی شے باقی نہیں رہی۔انہوں نے کائنات کی تمام پیچیدگیوں پر دسترس حاصل کر لی ہے۔تمام موجودات سے متعلق طبیعی علتوں کو واضح کر دیا ہے اور وہ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ عالم وجود کا ہر حادثہ ایک علت مادی رکھتا ہے۔

اس قسم کے غرور علمی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہر بات سے بے پرواہ ہو کہ جو کچھ سابقین نے بطور یادگار چھوڑا ہے، اس کو شک وتردید بلکہ بہ نظر انکار دیکھتے ہیں۔

یہ کیفیت غرور علمی جب بیسویں صدی میں داخل ہوئی، بلکہ جونہی کہ اس کی حرارت وشدت میں کمی واقع ہوئی تو انسان پر آہستہ آہستہ یہ بات واضح ہونے لگی کہ ابھی تک رموز خلقت اکثر حد تک جہالت کے پردہ میں ہیں۔ بلکہ عالم آفرینش سے متعلق سوائے چند ایک امور کے بیشتر تعجب انگیز اسرار ورموز ابھی تک ذہن انسانی پر کسی طرح بھی ظاہر ہو پائے۔حقیقت یہ ہے کہ علمائے تحقیق اور ماہر علوم شخصیات نے علم ودانش کے میدان میں جزوی کامیابیوں سے فریب نہیں کھایا، نہ ہی انہوں نے یہ جرأت وجسارت کی ہے کہ ان امور ومسائل کو قبول کرنے سے بالکل انکار کر دیں جن کا صحیح یا غلط ہونا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا اور جن کو ابھی تک دنیائے علم نے قبول یا مسترد نہیں کیا۔

اسرار آمیز عالم غیب کی طرف کھلنے والے راستے

اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم کی بناء پر، جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے۔ عالم غیب کی طرف کچھ راستے کھلے رکھے ہیں تا کہ سب انسان جان لیں کہ علم غیب کوئی محال یا ناممکن چیز نہیں۔ بلکہ غیب پر انسان کا تسلط کلیۃً ممکن ہے اور اس بات میں کسی قسم کے شک وشبہ وتردید کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کیفیت کے کئی پہلو ہیں جن کی ہم آئندہ سطور میں نشاندہی کریں گے۔

۱)۔حیوانات کی طرف وحی خداوندی

عالم حیوان کے تعجب انگیز کلام کا ذکر حیوانوں، جانوروں اور حشرات کے علوم سے متعلق کتب میں مفصل طور پر ہوتا ہے، حیوانات کی طرف الہام کے واضح نمونے پیش کرتا ہے۔

حیوانات کے محیر العقول یعنی ان کی تقسیم کار، ذمہ داری وانجام دہی فرائض، مفقود اعضائے جسم کا بنانا اور زندگی کی تمام ضروریات ایسے امور ہیں جن کی توجیہ عقل وفکر سے ممکن نہیں کیونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ حیوان عقل وفکر کی دستگاہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح یہ ہوسکتا کہ وہ اپنے جسم کی داخلی کیفیات اور وجود خارجی کی ساخت سے واقف ہوں، علیٰ ہذا القیاس کسی جاندار کے ابتدائی وفطری امور کی انجام دہی، مثلاً اس کے تقسیم کار، انتخاب فرائض اعضائے مفقود کی ساخت نو، اور اپنے معاشرہ اور ہم جنسوں سے مطابقت کو جاننے کے لیے اس کے جسم سے متعلق طبیعی و کیمیائی خواص کا علم ہرگز کافی نہیں ہوتا۔

حساب کرنے کی ایک مشین کا ایسے منظم طریقہ سے بنانا کہ وہ جمع وتفریق وضرب وتقسیم کے عمل باریک بینی سے انجام دے سکے۔ بالکل ممکن ہے لیکن ایسا ہرگز ممکن نہیں کہ یہ مشین حساب قاعدہ ہائے ریاضی کو ایجاد وآغاز کرسکے۔ ایک ترجمہ کرنے والی مشین کسی شخص کو گفتگو یا تحریر کا دوسری زبان میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ تو کرسکتی ہے لیکن کہنے والے کے اغلاط واشتباہات کی تصحیح پر ہرگز قادر نہیں ہوسکتی۔

زندگی حیوان ہم ایسے کاموں کا آغاز کرنا دیکھتے ہیں جو کسی حیوان نے سابق میں تجربہ نہیں کیے ہوتے۔ اس کیفیت کی کوئی توجیہ اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ ان کو عالم بالا سے الہام ہوتا ہے اور قرآن مجید اس قسم کے الہام کو وحی کا نام دیتا ہے۔[1]

۲)۔روشن ضمیری اور انتقال فکر (TELEPATHY)

علماء کہتے ہیں کہ انسانی ذہن بعض پوشیدہ استعدادات کا حامل ہوتا ہے جس کی مدد سے انسان دوسروں کے افکار کو پڑھ سکتا ہے اور ایسے حوادث سے ایک مخصوص حس کی مدد سے واقفیت حاصل کرلیتا ہے جو دور دراز فاصلہ پر واقع ہوئے ہوتے ہیں۔ دور دراز فاصلوں سے ایسی

---

[1] سورہ نحل، آیہ ۶۸ اس بحث کی تفصیل مولف کی کتاب ''راہ خدا شناسی'' ص ۲۴۵۔۲۶۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

مخصوص قوت احساس کی مدد سے افکار واحساسات کا تبادلہ مکمل طور پر ایک عملی امر ہے۔تبادلہ فکر دور حاضر کے فنی وسائل مثلاً ٹیلی ویژن ،ریڈیو،ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے ذریعے بھی ہوتا ہے لیکن علم ودانش اس تبادلہ فکر کے لیے ایک اور اصطلاح پیش کرتے ہیں جن کی ٹیلی پیتھی (TELEPETHY) یا حس روشن ضمیری کہتے ہیں۔

ٹیلی پیتھی اور روشن ضمیری میں یہ فرق ہے کہ روشن ضمیری اتفاقی اور اچانک ادراک کی ایسی قوت جس کی مدد سے وسائل احساس کے بغیر زمان ومکان کے فاصلوں کے باوجود تبادلہ فکر ہوجاتا ہے۔جب کہ ٹیلی پیتھی وہ کیفیت ہے جس کی مدد سے افکار و ہیجانات واحساست بغیر وسائل احساس کے ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک منتقل ہوتے ہیں۔حقیقت میں اس طرح جاننا چاہیے کہ روشن ضمیری ٹیلی پیتھی ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں۔یہ دونوں انسان کی قوت متخیلہ کے دومناسب نام ہیں،خواہ انسان حالت خواب میں ہو یا بیداری میں۔

دور حاضر میں ''یوگیسم'' اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ وسعت نظر کا قائل ہے۔وہ زندگی کو ایک موج قرار دیتا ہے جس کے لیے وہ پکڑنے اور ارسال کرنے کی امواج کی موجودگی کا قائل ہے۔اس کا عندیہ یہ ہے کہ جس طرح برقی تار امواج کو حاصل کر کے آگے پہنچاتی ہے ،اسی طرح امواج فکر کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔وہ فکر کو ایک ایسی موج قرار دیتا ہے جو وجود میں آکر ارتعاش پیدا کرتی ہے اور وصول کرنے والا اس کو وصول کرتا ہے۔

۳)۔ارواح کے ساتھ رابطہ

ارواح کے ساتھ رابطہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ان میں واضح اور قابل اعتماد صورت یہ ہے کہ ماہر فن استاد اس شخص کو جو روح سے رابطہ کے لیے آمادہ ہو،اپنی نظر وتلقین سے سلا دیتا ہے۔اور اس کی روح استاد کے سوالات کا جواب دینے لگتی ہے۔اس رابطہ کے ذریعے بعض اوقات خفیہ رموز سے بھی پردہ اٹھ جاتا ہے۔

علمی سطح پر ارواح سے رابطہ بہت سے پہلوؤں سے قابل مطالعہ ہوتا ہے۔اس موضوع پر مشرق ومغرب کے ماہرین وعلماء نے بہت زیادہ کتب ورسائل قلمبند کیے ہیں اور علمی دائرۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کے بہت سے صفحات اس موضوع کے لیے مخصوص کیے ہیں اس فن کے ماہرین، نیز وہ لوگ جنہوں نے اس راہ میں سالہا سال سعی کی ہے، وہ اس بات کے داعی ہیں کہ انہوں نے جہد مسلسل اور بے شمار آزمائشوں کی مدد سے عالم ارواح کے خفیہ و پر اسرار گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔اس طرح انہوں نے ارواح کے ذریعے بہت سے خارق عادت اور حیرت انگیز کاموں کا نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے۔بیسویں صدی کے دارۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کے مؤلف نے اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں ان ماہرین وعلماء کے ناموں کی ایک فہرست پیش کی ہے۔جنہوں نے اس علم میں دسترس رکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔اور اس علم کی واقعیت کا اعتراف فرمایا ہے۔یہ فہرست فرانس،انگلستان،اٹلی،اور امریکہ کے علماء وماہرین کے سینتالیس اسماء پر مشتمل ہے۔اس سلسلہ میں یہ بات یقین کے ساتھ سمجھنا ہوگی کہ رابطہ با ارواح اجمالی طور پر تو ایک صحیح چیز ہے،تاہم ہر مدعی کے دعویٰ کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا لازم ہوگا کہ قرائن وعلامات کی مدد سے مدعیان صادق کا جھوٹے دعویداروں سے امتیاز کیا جائے۔

۴)۔افراد پر الہام

بعض اوقات یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ ایک بات دل میں القاء ہو اور انسان فوراً اپنے آپ کو کسی مطلب سے واقف و آگاہ پائے۔اس قسم کے ارتقاء کو ہی اصطلاح میں الہام کہا جاتا ہے۔اس قسم کے الہامات ہر زمان و مقام پر اتنی کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں کہ انہیں عام حوادث کی فہرست میں رکھا جاتا ہے، حتیٰ کہ بہت سی اختراعات و مکاشفات علمی و ایجادات اور بلند ترین شعری کیفیات کا منشاء اسی قسم کا الہام ہی ہوتا ہے۔قرآن مجید اس سلسلہ میں ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ

''اور ہم نے مادرِ موسیٰ کو وحی فرمائی کہ اپنے بچہ کو دودھ پلائے۔۔۔۔۔''۔(قصص۔۷)

۵)۔رویائے صادقہ

خواب کئی اقسام کے ہوتے ہیں، ان کی ایک قسم اس وقت ہمارے زیر تبصرہ و مطالعہ ہے، یہ وہ خواب ہیں جو کسی ایسے واقعہ کے بارے میں نظر آتے ہیں جو فکر و ذہن سے الگ ہوتا ہے اور یہ خواب اس کے بارے میں محکم و مستقل ویقینی کیفیت پیش کر دیتے ہیں۔اس قسم کے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوتے ہیں جو ہمیں کو اپنے سے الگ عالم خارجہ کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔اس طرح یہ خواب ذہن و فکر سے ماوراء حقائق و بے نقاب کرتے ہیں۔ایسے خوابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔قرآن مجید ایسے خوابوں کا ایک پیچیدہ نمونہ سورۂ یوسف میں نقل فرماتا ہے۔پیغمبر اکرم ﷺ نے اس قسم کے خوابوں کے بارے میں فرمایا ہے:

''اِنَّ الرُّؤْیَا الصَّادِقَةَ جُزْءٌ مِّنَ النُّبُوَّةِ'' [1]

''رویائے صادقہ نبوت کا حصہ ہوتے ہیں''۔

[1] بحار الانوار، ج ۱۴ ص ۶۳۵ طبع قدیم۔اس قسم کے خواب جو براہ راست مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں، نہ کہ ماضی سے، کسی علت مادی کے حامل نہیں ہو سکتے، نہ ہی ان خوابوں کو کسی سابقہ سلسلہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔بلکہ ایسے خواب تو کسی سلسلہ یا مسلسل کا حصہ بنتے ہی نہیں ہم نے اس قسم کے خوابوں کے بارے میں اپنی کتاب ''راز بزرگِ رسالت'' میں بحث کی ہے۔

پیش گوئی کے بارے میں فلاسفران اسلام کے نظریات

۱)۔شیخ الرئیس بوعلی سینا اپنی کتاب ''اشارات'' کے آٹھویں حصہ میں رقمطراز ہیں:

اگر کوئی عارف غیب کی کوئی خبر دے، اس کی صحت کو بھی ثابت کرے تو چاہیے کہ اس کی تصدیق کریں اور اس پر ایمان لائیں کیونکہ اس قسم کی آگہی کے لیے اسباب طبیعی کا ایک سلسلہ وجود رکھتا ہے۔ پر اس حصہ کی تشریحات میں اس کیفیت کے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب روح کے مشاغل حواس کے ذریعے کم ہو جائیں تو روح انسان کو اتنا وقت مل جاتا ہے کہ وہ آپ کو قوائے طبیعی سے الگ کر کے جانب قدس پرواز کرے۔ وہاں کی صورتیں ملاحظہ کرے، یہی کیفیت کبھی خواب اور کبھی بیماری کے عالم میں ایک عام آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی آپ سے کہے کہ فلاں عارف کوئی خاص کام انجام دیتا ہے۔ یا کسی جسم کو متحرک کر دیتا ہے۔ یا خود اس طرح حرکت کرتا ہے جو دوسروں سے ممکن نہیں، تو اس بات کو ماننے سے انکار نہ کریں کیونکہ ان کو کاموں کے لیے ایک سلسلہ اسباب موجود ہوتا ہے، جس کو اگر آپ بھی اختیار کر لیں تو ایسے ہی مقاصد حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں:

تجربہ و آزمائش سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان حالت خواب میں جہان خارج سے رابطہ قائم کرتا اور اطلاعات حاصل کر سکتا ہے۔ پھر اگر حالت بیداری میں انسان ان کیفیات کا حامل ہو جائے تو اس میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے تجربہ و آزمائش بھی اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔[۱]

۲)۔شیخ شہاب الدین سہر وردی، جن کی مثال فلسفہ الٰہی اور عملی ریاضت نفسانی میں کم ملتی ہے، انسان کی غیب دانی کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں: جب بھی انسان کے حواس ظاہری کے مشاغل میں کمی واقع ہوتی ہے تو نفس انسانی قوائے طبیعی سے آزاد ہو جاتا ہے اور امور غیب کے ایک سلسلہ پر مسلط ہوتا ہے، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر انبیاء و اولیائے خدا جیسے انسان کامل اخبار غیب سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تو یہ اس لیے ہے کہ وہ ایسی تحریروں کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ایسی امواج اور دل انگیز و ہولناک صداؤں کو سنتے ہیں جن کو لوگ نہیں سنتے، یا ایسی صورتوں کو دیکھ لیتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں اور اس کے بعد غیب کی خبریں دیتے ہیں۔[۲]

۳)۔صدر المتالہین نے ''حکمت اشراق'' پر دیے گئے اپنے حاشیہ جات میں علم غیب سے آگاہی کے امکانات پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''نفس انسانی عقل سے اتصال کے زیر اثر یا عالم مثل یعنی اشیاء کی صورتوں کا مشاہدہ کر کے آگاہی کی منازل طے کرتا ہے، اس کے بعد متعلقہ مطالب کو دلائل عقلی سے واضح کرتا ہے''۔

---

[۱] اشارات، ج ۳ ص ۳۱۴، ۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۷

[۲] حکمتِ اشراق، مقالہ پنجم

ان مقولہ جات کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ماضی وحال کے ماہرین وعلماء ومحققین کو انسان کے لیے ایک امر ممکن بلکہ واقعی قرار دیتے ہیں، اس صورت میں جبکہ غیب سے آ گہی ایک عام انسان کے لیے نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے تو انبیاء اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے لیے علم غیب سے واقفیت میں کس طرح کے شک وشبہ وتردید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اختتام بحث سے قبل ضروری ہے کہ ہم ایک نکتہ پیش کریں:

علمائے متقدمین اور دور حاضر کے ماہرین کے اقوال کے درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم جان لیں کہ انسان کے علوم میں غیب سے آ گہی کے موضوع کو نہ صرف ممکن بلکہ متعلق تسلیم کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی اس قدر تصدیق وتشریح کی موجودگی میں انسان کے لیے علم غیب کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہنا چاہیے۔ تاہم اس قدر جاننا لازمی ہے کہ انبیاء وآئمہ معصومین کے علم غیب سے واقف ہونے کا طریقہ ان عام طریقوں سے مختلف ہے جن پر ہم سطور سابقہ میں بحث کر چکے ہیں اور غیب آ گہی کے مشترک نتائج بھی دونوں اصناف کے قدر مشترک ہونے کو ثابت نہیں کرتے۔ ہم نے اس حصہ بحث میں کشف وشہود والہام اور ارواح کے ساتھ رابطہ کے بارے میں جس قدر گفتگو کی ہے اور جس قدر شواہد اس سلسلہ میں پیش کیے ہیں اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ہم کشف والہام کے ہر دعویدار کی بات کو تسلیم کر لیں یا ہر ایسے شخص کی بات کی تصدیق کرنے لگیں جو ارواح کے ساتھ رابطہ مدعی ہو۔ اس کے برعکس ہماری بحث ایک قسم کا اجمال ہے۔ جہاں تک علوم غیب کی حدود نوعیت و خصوصیات کا تعلق ہے یہ ایک الگ بات ہے کہ جو ہماری موجودہ بحث سے خارج ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب کے بارے میں آیات قرآن مجید کے چند نمونے

اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان آیات مبارکہ کو پیش کریں جو آنحضرتؐ کے ان علوم سے متعلق ہیں تا کہ ہم آپ کی پس پردہ علوم سے واقفیت یعنی علم غیب سے آگہی سے آشنائی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں چند آیات مکرمہ کو پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

(ا) عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

''خداوند تعالیٰ عالم الغیب ہے، وہ کسی قدر شخص کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں فرماتا سوائے اپنے مرتضیٰ بندوں کے جو اس کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے رسولوں کا سامنے سے اور پس پشت کے پیچھے سے نگہبان ہے''۔ (جن۔ ۲۶، ۲۷)

آیہ مبارکہ کے مطالب و مقاصد خوب روشن ہیں اور یہ آیہ مجیدہ اچھی طرح سمجھا رہی ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور وہ اپنے فرستادگان یعنی اپنے رسولوں کو غیب سے آگاہ فرماتا ہے۔[1]

(ب) وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾

''تمہارے صاحب (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیوانہ نہیں ہیں۔ انہوں نے فرشتہ کو افق روشن میں دیکھا ہے۔ وہ اپنے علم غیب میں بخیل نہیں ہیں۔ (جو علم غیب ان پر القاء ہوتا ہے وہ مصلحت نہیں اس سے مطلع کرتے ہیں، اس میں بخل نہیں کرتے اور نہ ہی تم سے چھپاتے ہیں)۔ (تکویر۔ ۲۲ تا ۲۴)

(ج) وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ

---

[1] تفسیر تبیان، ج ۲، ص ۶۳، مجمع البیان، ج ۲، ص ۵۴۵، تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۳، ص ۲۶۸ اور المیزان ج ۴، ص ۷۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

عَلَيۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۳﴾

''پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک راز کی بات اپنی ایک زوجہ کو بتائی (اوران کو ہدایت کی کہ راز کو ظاہر نہ کریں) لیکن انہوں نے یہ راز کسی دوسری کو بتلا دیا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو اس بات سے مطلع کیا کہ ان کی زوجہ نے اس راز کو دوسری زوجہ پر ظاہر کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے نبی نے اس کے ایک حصہ کی طرف اشارہ فرمایا اور دوسرے کی طرف اشارہ نہ کیا یعنی اپنی زوجہ سے فرمایا کہ تم نے میرے راز کو فاش کر دیا ہے اس زوجہ نے اس بات کی تصدیق کی اور پوچھا کہ آپ کو کس نے اس بات سے آگاہ کیا ہے''۔(تحریم۔۳)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ''یعنی مجھے اس (اللہ) نے بتایا ہے جو دانا و آگاہ ہے۔

اس تمام آیہ مبارکہ، بالخصوص''نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ''کے جملہ پر غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے رسولؐ کو وحی قرآن کی راہ کے علاوہ پردہ غیب کے پیچھے سے بتائی ہے۔ان آیات شریفہ سے جو یہاں تک پیش کی گئی ہیں اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے دیگر انبیاء مثلاً حضرات آدم، یعقوب، یوسف، صالح، داؤد، سلیمان اور عیسیٰ علیہم السلام کی طرح غیب کی خبریں دیا کرتے تھے۔

علم غیب صرف انبیاء ہی سے مخصوص نہیں

بحث کے آخر میں ہم کچھ ایسی آیات بھی پیش کرتے ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی کچھ افراد غیب رکھتے تھے تاکہ بات واضح ہوجائے کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کے انبیاء ان کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں جس میں پرچائے یہ عنایت فرماتا ہے اور اسے اس عالم سے متعلق اخبار غیب سے مطلع فرما دیتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ ۖ اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۴۶﴾

''اور جب فرشتوں نے مریم سے کہا خدا تجھے ایک بیٹے کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح ابن مریم ہے، وہ دنیا و آخرت میں آبرومند اور مقربان بارگاہ خدا سے ہے۔وہ گہوارے میں لوگوں سے کلام

کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہوگا''۔ (آل عمران۔ ۴۵،۴۶)

اب صرف حضرت مریم علیہ السلام ہی وہ ہستی نہیں ہیں جن کو اس طریقہ سے آئندہ پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کیا گیا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بھی حضرت مریم کے ساتھ اس کیفیت آگاہی از غیب میں شامل ہیں، قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ .... وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝۷۱

''ہمارے فرستادگان (ملائکہ) خوشخبری لے کر ابراہیمؑ کے پاس آئے اور ان پر سلام کیا۔۔۔اور ان کی زوجہ جو وہاں کھڑی تھی، ہنسنے لگی اور اسے ہم نے جناب اسحاق علیہ السلام اور پھر اسحاق علیہ السلام کے بعد یعقوبؑ کی بشارت دی''۔ (ہود۔ ۶۹ تا ۷۱)

قرآن مجید مادر حضرت اسحاق علیہ السلام کے بارے میں جو اپنے بیٹے کی کیفیت سے طریق غیب کے ذریعے مطلع ہوجائیں، اس طرح فرماتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷

''اور ہم نے مادر موسیٰ کو وحی کی کہ انہیں دودھ پلائیں، جب تم ان کے بارے میں خوف زدہ ہو تو انہیں دریا میں ڈال دو، ڈرو نہیں اور نہ ہی غم کھاؤ، ہم انہیں تمہاری طرف واپس پلٹا دیں گے اور انہیں پیغمبر مرسل میں قرار دیں گے''۔ (قصص۔ ۷)

آپ مشاہدہ فرما سکتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ میں ان رسولوں کا ذکر ہے جو طبقہ انبیاء سے نہیں ہیں اور آئندہ پیش آنے والے واقعات سے طریق غیب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات و قابلیت

اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں منصب رہبری جتنا کوئی مقام اہم اور مشکل نہیں، جب تک کوئی شخص انسانی کمالات و اقدار اور محاسن اخلاقی کا بڑی حد تک حامل نہ ہو منزل رہبری کے لائق نہیں ہوسکتا، دوسرے لفظوں میں لازم ہے کہ ایک رہبر ایسی متضاد خوبیوں کا حامل ہو جن سے وہ ہر شعبہ زندگی میں بہرہ مند ہوسکے۔

مثلاً وہ اس قابل ہو کہ قوت فیصلہ کو دور اندیشی کے ساتھ، تصیح احوال کو نرمی کے ساتھ، شان و شوکت کو درویشی کے ساتھ، روشن فکری کو ضروری احتیاط کے ساتھ ملا کر نفسیات کے مطابق موقع شناسی کرتے ہوئے ہر موقع پر مناسب لائحہ عمل اختیار کرے۔

رہبر کے لیے صفات کے ایک سلسلہ کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا منفی اوصاف سے پاک ہونا بھی لازم ہونے سے کم نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص جو خود اپنے متعلق تنقید کا متحمل نہیں ہوتا، مخالف عقیدہ کو سننے کی تاب نہیں رکھتا۔

مشکلات کے مقابلہ میں مناسب صبر و شکیبائی کو اختیار کرنے سے قاصر ہے اور اس کے ذہن پر منصب پر قبضہ کرنے اور دوسروں سے اپنی اندھی اطاعت کی توقع کا جذبہ غالب ہو تو اس کی رہنمائی نقصان دہ فاسد قرار پائے گی، ان کیفیات کے حامل شخص کے لیے بہتر ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو اور اس کے بعد دوسروں کی قیادت کے متعلق فکر کرے۔

اس قسم کی مثبت و منفی صفات کے مجموعہ کا نہ ہونا منزل رہبری کے لیے شعلہ آتش سوزاں کی مانند ہے، اور بہت زیادہ مشکلات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کا انسان قیادت سے متعلق امور کو حل کرنے کی خاطر کانگریسیں، سیمینار، مجالس مشورہ اور علاقائی و بین الاقوامی کانفرنسیں تشکیل دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس طرح قیادت کے امور کی گرہ کشائی کرے۔

دور حاضر میں مسئلہ قیادت مغربی کے لیے دردسر بنا ہوا ہے، اسلام کے عظیم قارئین اور پیشواؤں نے اس سلسلہ میں دقیق مباحث پیش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں چاہیے کہ مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے مالک اشتر کے نام فرمان، اپنے فرزند حضرت امام حسن علیہ السلام کے لیے وصیت اور محمد بن ابوبکر کے نام آپ کے مختصر پیغام کا مطالعہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی قیادت کا مسئلہ دھاگہ کی گچھی کا مانند ہے جس کا ابتدائی سرا گم ہوگیا ہو، اس میں جتنی بھی کوششیں کریں اور اس قیادت کے لیے بہت کم افراد دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح قیادت الٰہی کا مسئلہ جس میں قیادت کرنے والے انسان رسول یا پیغمبر کا نام لے کر سامنے آتے ہیں جو ایسے ماہرین ہوتے ہیں جو تمام مراحل حیات میں، وہ مراحل مادی ہوں یا معنوی، عہدہ برآ ہونے کی قابلیت کے حامل ہوتے ہیں۔

ان حضرات کا عام قیادت کی نسبت سینکڑوں گنا زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالی کی جانب سے عظیم ذمہ داری پانے والے افراد کو اس قدر بزرگ امتیازات اور حد سے بڑھی ہوئی قابلیت کا حامل ہونا لازم ہے، جو اپنی قوت و صلاحیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتے ہوں

، یہاں تک کہ کبھی ایک بہت بڑی امت کے درمیان صرف ایک ہی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس مقام پر پہنچنے کے قابل ہو۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ نبوت بہت سے انبیاء سے متعارف کرواتی ہے تاہم رسولان صاحب کتاب یا ان سے بڑے صاحب شریعت پیغمبران بہت کم ہوئے ہیں حتیٰ کہ عہدۂ خاتم النبیین صرف ایک ہی بزرگ شخصیت کے لیے مخصوص ہوا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات بزبانِ قرآن مجید

پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قائدانہ دشواریاں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالمی قیادت ایک طرف اور آپ کا خاتم النبیین اور اللہ کا آخری پیغمبر ہونا بے انتہا دشواریوں کو آپ نے دامن میں لیے ہوئے تھا۔ وہ اقوام جن کی ہدایت کا آنحضرتؐ نے بیڑا اٹھا رکھا تھا علم وتمدن، عقل و آگہی، اخلاق و تنظیم کے اعتبار سے برابر سطح پر نہ تھیں۔ اسی اختلاف نے بے انتہا مشکلات آنحضرتؐ کی قیادت کے راستہ میں کھڑی کر رکھی تھیں۔ اللہ تعالی نے ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے آنحضرتؐ کو ایسی عظیم استعداد مرحمت فرمائی تھی، جو کمالات کے مجموعہ کی مظہر تھی۔ لہذا ملائکہ مقربین میں بزرگ ترین فرشتہ کے زیر اثر چالیس سال کی تربیت کے بعد خداوند عالم نے آنحضرتؐ کی قیادت عالم انسانی کے لیے منتخب فرمایا[1]۔ اس کے نتیجہ میں آنحضرتؐ نے افکار حکیمانہ کے سایہ میں اپنے مقاصد اور امت سے ہمدردی کی خاطر اس تمام مشکلات کو حل فرما کر ایسے تمدن کی بنیاد رکھی جس کی صفحہ ہستی پر اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔

پروردگار عالم قرآن مجید میں نہایت خوبصورت الفاظ میں اپنے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات روحانی اور میدان قیادت میں آنحضرتؐ کی کامیابی کے علل واسباب کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس عظیم شخصیت محبوب پروردگار کی عظیم صفات سے آگاہ ہونے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں ہم مندرجہ ذیل عنوانات پر گفتگو کریں گے:

۱)۔ ہدف و مقصد سے ارتباط اور خلوص

ہدف و مقصد کے ساتھ ارتباط و محبت ایک ایسا خود کار عامل ہے جو کسی بھی بڑے یا چھوٹے معاشرہ کے ذمہ دار قائد کو سعی وکوشش اور مشکلات پر قابو پا لینے کے لیے تیار و آمادہ کرتا ہے اور اس کے چہرہ روحانی سے خستگی کے غبار کو پاک وصاف کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص جو اپنے لیے قیادت کو اختیار کرتا ہو، اس غرض سے احساس خلوص کو اختیار نہ کرے جس کے لیے اسے منتخب کیا گیا ہو، تو اس قسم کی قیادت فاسد ہوگی، قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لوگوں کی ہدایت کے سلسلہ میں قابل تحسین خلوص کی اس طرح صراحت فرماتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ⑥

''شاید، اگر وہ آپؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائیں، تو آپ ان کے لیے جان دے دیں گے''۔ (کہف۔۶)

---

[1] وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِهٖ مِنْ لَّدُنْ اَنْ كَانَ فَطِيْمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِنْ مَّلَآئِكَتِهٖ يَسْلُكُ طَرِيْقَ الْمَكَارِمِ وَمَحَاسِنَ اَخْلَاقِ الْعَالَمِ لَيْلَهٗ وَنَهَارَهٗ (نہج البلاغہ، خطبہ اشباح، خطبہ ۱۸۷ طبع عبدہ)

یہ جملہ ایک قائد اجتماعی کے اس انتہائی خلوص و تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو بطور طبیب اخلاق وہ اپنے مریضوں کے علاج کے لیے رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں اس قدر کوشش و محنت کرتا ہے کہ اپنی ہلاکت اور جان دے دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایک اور آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۝۷۰

''اور کافروں کی گستاخی پر غم نہ کھائیں اور ان کے مکر و حیلہ سے دل تنگ نہ ہوا کریں''۔ (نمل۔۷۰)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۝۸

''پس ان پر شدت تاسف سے اپنی جان نہ دے بیٹھو، اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہے جو وہ کرتے ہیں''۔ (فاطر۔۸)

پھر فرماتا ہے:

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ۝۷۶

''پس ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں، ہم اس سے واقف ہیں جو وہ چھپا کر کرتے ہیں یا اعلانیہ کرتے ہیں۔ (یس۔۷۶)

ہم اختصار کرتے ہوئے صرف انہی آیات مبارکہ پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ اس موضوع پر اس سے بہت زیادہ آیات قرآن مجید موجود ہیں جو اس قائد آسمانی کے امت کی ہدایت کے بارے میں حد سے زیادہ خلوص اور گہرے تعلق کو بیان کرتی ہیں۔

۲)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔ مظہر خلق عظیم

اصولی طور پر غصہ و تیز مزاجی، نظر انداز کرنے اور معافی کے جذبہ کا فقدان، کسی قائد کو زیادہ سے زیادہ مشکلات اور انجام کار شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تربیت و تنظیم کا ذائقہ نہیں چکھا ہوتا قائد سے پراگندہ ہو کر اس کی دوستی سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنے کلمات قصار میں ایک جملہ فرماتے ہیں:

"آلَةُ الرِّيَاسَةِ سِعَةُ الصَّدْرِ" [1]

''قیادت کے لیے ہتھیار روح و نفس کی کشادگی ہے''۔

---

[1] غرر الحکم، باب الف، ج ۱ ص ۴۴

قرآن مجید کی صراحت کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عطوفت وحلم کی اس منزل پر فائز تھے جس پر ایک قائد کو نرمی و درگزر کے سلسلہ میں صحیح طور پر ہونا چاہیے یعنی شیوہ اخلاق کے آخری درجہ پر آپ کا مقام تھا وحی الٰہی اس عطوفت وحلم کو آنحضرتؐ کی کامیابی کے علل واسباب سے شمار کرتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ

''رحمت الٰہی کے سایہ میں ان کی خشونت وسختی کے مقابلہ میں آپ نرم ہو گئے، اگر آپ غصیل وسخت و سنگدل ہوتے تو لوگ آپ کی اطراف سے پراگندہ ہو جاتے، پس ان سے درگزر کریں، ان کے لیے طلب بخشش کریں اور ان سے اپنے کاموں میں مشورہ کریں''۔ (آل عمران۔۱۸۹)

قرآن مجید کی سورتوں میں سے ایک میں لوگوں میں گھل مل جانے کے طریقہ اور قیادت کی ذمہ داری کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝۳۴ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵

''نیکی و بدی ہرگز یکساں نہیں۔ بدی کو نیکی کے ذریعے دور کریں تا کہ سخت ترین دشمن گہرے اور دلی دوست بن جائیں، اس اخلاقی منزل پر وہ لوگ فائز ہوتے ہیں جو صبر و بردباری کے حامل ہوتے ہیں اور (ایمان وتقویٰ) عظیم حصہ کے مالک ہوتے ہیں''۔ (حم سجدہ۔ ۳۴،۳۵)

اس شیوۂ اخلاق کے مؤثر ہونے کا سبب یہ ہے کہ بدکار لوگ انتقام ومکافات کے منتظر ومتوقع رہتے تھے۔ جب انہوں نے اپنی توقع کے خلاف بدی کا جواب اچھائی میں پایا تو ان کا وجدان ملامت گر یعنی نفس لوامہ بیدار ہو کر ان کے اندر تنقید وسرزنش کو ہوا دینے لگتا، یہ وہ موقع ہوتا ہے جہاں عداوت اور کینہ کی جگہ آہستہ آہستہ مہر ومحبت والفت وخلوص پیدا ہونے لگتے ہیں۔

ان حالات میں یہ ایک امر فطری سامنے آتا ہے کہ ایک موقع شناس قائد اس منزل اخلاق سے مناسب موارد فائدہ اٹھاتا ہے، یہ وہ موقع ہوتا ہے جب لوگوں کی شخصیت انسانی کلیۃً محو نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا نفس لوامہ ترنگ آلود ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ان سے دوسری شکل میں معاملہ کرنا چاہیے، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ:

"مِنَ النَّاسِ مَنْ لَّا یُقِیْمُھُمْ اِلَّا السَّلْفِ" [1]

یعنی "کچھ لوگ اس قدر ہٹ دھرم اور بداندیش ہوتے ہیں کہ چکنا چور کر دینے والی تلوار کی ضربات کے نیچے ہی انسان بنتے ہیں اور بدکرداری سے دستبردار ہوتے ہیں"۔

قرآن مجید کفار کی ایک جماعت کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرزِ عمل کی شائستگی کی تعریف فرماتا ہے اور آپ کے کردار کو 'عظیم' کے لفظ سے یاد کرتا ہے جبکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بہت محدود مواقع پر استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّيكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝

"اور آپ کے لیے اجر غیر ممنون ہے اور آپ خلق عظیم پر فائز ہیں، عنقریب آپ دیکھیں گے کہ کون مجنون ہے؟"۔ (قلم۔ ۳ تا ۶)

فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطوفت اور مہربانی کا واضح مظاہرہ ہوا۔ یہ وہ موقع تھا جب آنحضرتؐ نے مکہ کے ان لوگوں پر فتح و اختیار حاصل کیا جنہوں نے سالہا سال آنحضرتؐ کو تکلیف و اذیت پہنچائی تھی اور خون آشام جنگیں آپ پر مسلط کی تھیں۔ ایسے حالات میں آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "مَاذَا تَقُوْلُوْنَ وَمَاذَا تَظُنُّوْنَ" "یعنی اب تم کیا کہتے اور میرے بارے میں کیا گمان رکھتے ہو؟" اس وقت قیدی اور مبہوت لوگ یکایک آپ کی جوانمردی، بزرگی اور خلق عظیم کو یاد کرنے لگے اور سب بول اٹھے: "لَا تَظُنَّ اِلَّا خَيْرًا اَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ" "یعنی ہم آپ کی طرف سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی گمان نہیں رکھتے، ہم آپ کو ایک کریم بھائی اور کریم بھائی کا فرزند جانتے ہیں"۔ اسی لمحہ مکہ کے لوگوں کو گویا رحمت کی ایک موج نے گھیر لیا۔ آپ نے ان سب کی طرف رخ کر کے فرمایا: "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ" "یعنی آج تمہارے لیے کوئی سرزنش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو معاف فرمائے، وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے"۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا: "اگرچہ تم نے تو میری رسالت کی تکذیب کی اور مجھے گھر سے باہر نکال دیا تھا، لیکن اس کے باوجود میں تمہاری گردنوں سے غلامی کا طوق نکال دیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں:

"اِذْهَبُوْا وَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ" "یعنی جاؤ! تم سب کو آزاد کیا جاتا ہے"۔ [2]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق عظیم اور انسان دوستی کے سلسلہ میں آپ کی حجت و مہربانی صدیوں تک طول تاریخ میں زبان زد خلائق رہی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱، کتاب جہاد

[2] مغازی واقدی، ج ۳، ص ۸۳۵، بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۱۰۷ و ۱۳۲

ہے۔شعرائے اسلام جنہوں نے ہمیشہ آپ کی مدح وثناء کی ہے۔ہجری کے مشہور شعراء وادباء سے ہے،حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں مشہور ومعروف ''قصیدہ بردہ''میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق عظیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:[1]

"فَاقَ النَّبِیِّیْنَ فِیْ خَلْقٍ وَّ فِیْ خُلُقٍ
وَلَمْ یُدَانُوْهُ عِلْمٍ وَّلَا کَرَمٍ

''تمام انبیاء پر آپ نے خلقت واخلاق وبرتری پائی اور کوئی بھی دانش وکرم میں آپ تک نہیں پہنچتا

اَکْرِمْ بِخَلْقِ نَبِیٍّ وَّ اِنَّهٗ خُلِقَ
بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمٍ"

کتنی خوبصورت آپ کی خلقت ہے اور کتنا حسین آپ کا اخلاق ہے۔کشادہ روئی کے ساتھ آپ کے ساتھ آپ کے لبوں پر ہمیشہ تبسم رہتا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے بالکل سچ اور درست کہا گیا ہے:''حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ''یعنی آپ انتہائی حسین خصائل کے ساتھ خلق ہوئے ہیں۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خوبصورت اور پسندیدہ اخلاق سے اس خطاب قرآنی کو تحقق فراہم کیا ہے جس میں آپ کا حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾

''اور اپنی رحمت وکرم کے بادلوں سے مومنین پر سایہ کریں اور اگر کفار آپ کی مخالفت کریں تو کہہ دیں کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں''۔(شعرائ۔۲۱۵،۲۱۶)

۳)۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم۔۔پیکر صبر وبردباری

پروردگار عالم نے آغاز بعثت میں ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس ذمہ داری کی سنگینی سے،جو آپ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی،آگاہ کرتے ہوئے فرمادیا تھا:

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾

---

[1] قصیدہ''بردہ''عالم اسلام کے بہت مشہور قصائد سے ہے جس کی بہت سی شرحین لکھی گئی ہیں ہر عربی جاننے والے کیلئے مناسب ہے کہ اسے حفظ کرے۔

''ہم ایک سنگین قول کی آپ پر وحی کرتے ہیں''۔(مزمل۔۵)

یہ قول سنگین آپ کی عالمی رسالت ہے جس کی آپ پر ادائیگی اور جس پر آپ کے پیروان کا عمل دونوں سنگین ومشکل امور ہیں۔اس قسم کی بلند مرتبہ رسالت کا ایک روح مستقل وصابر وشکیبا وبردبار کے بغیر انجام دینا ممکن نہیں،یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات مجیدہ میں آنحضرتؐ کو صبر وشکیبائی کی دعوت دی گئی ہے جن میں سے چند ایک کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

نزول وحی کے آغاز میں سورۂ مدثر میں آنحضرتؐ سے اس طرح خطاب ہوتا ہے:

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

''اور اپنے رب کے لیے(ابلاغ رسالت کے سلسلہ میں)بردبار ہیں''۔(مدثر۔۷)

ایک مرتبہ انبیائے اولوالعزم کے صبر واستقامت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ

''پس انبیائے اولو العزم کی طرح صبر کریں اور ان لوگوں کے بارے میں جلدی نہ کریں''۔(احقاف۔۳۵)

۴)۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔تضرع نیم شب

انسان جذبہ خضوع اور تضرع وزاری کی کیفیت اس کے رموز شعور اور صفحہ ہستی میں ایک عظیم وجود قدرت وعلم بے پایاں کی موجودگی سے واقفیت کی نشاندہی کرتے ہیں،نیز یہ کہ اس کی ذات کا ایسے مقام بزرگ سے تعلق استوار ہے،ایک وجود برتر کے ساتھ وابستگی کا احساس انسان پر دریچہ ہائے خشوع کو کھولتا ہے جس کے نتیجہ میں خشوع عبادت کے قالب میں ظاہر ہوتا ہے۔لیکن اس طرح تضرع زاری کرنے ولاے گریہ کناں کسی ایک جماعت سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ مختلف شکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ایک جماعت رفع احتیاج،حصول منفعت یا عذاب کے خوف سے اس احساس کو خوش آمدید کہتی ہے جبکہ ایک اور جماعت بہتر معرفت سے بہرہ مند ہونے کے لیے کوشاں ہے،یہ لوگ کمال مطلق پروردگار کے سمجھنے اور اس مہر ومحبت کی بناء پر جو وہ خلاق عالم سے رکھتے ہیں،اس کی عبادت وپرستش کرتے ہیں۔تاہم طریق کار میں اختلاف کسی طرح ان کی طہارت عمل کی بنیاد پر اثر انداز نہیں ہوتا۔بلکہ یہ سب افراد آیہ ذیل کے مطالب کے مطابق بارگاہ پرورگار میں اجر وثواب اور پاداش بزرگ کے حامل ہوتے ہیں۔اراشاد ہوتا ہے:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۲

''اور ہر شخص کے لیے اس کے عمل کی مناسبت سے درجات ہیں اور آپ کا پروردگار ان کے اعمال سے

غافل نہیں ہے"۔(انعام۔۱۳۲)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام عبادت تضرع زاری کرنے والوں کو تین جماعتوں میں تقسیم فرماتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کا ارشاد بہت ہی اہم ہے جس کو ہم پیش کرتے ہیں۔ امام ارشاد فرماتے ہیں:

"قَوْمٌ عَبَدُو اللهَ خَوْفًا فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْعَبِيْدِ، وَقَوْمٌ عَبَدُ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ طَلَبَ الثَّوَابِ فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْاُجَرَاءِ، وَقَوْمٌ عَبَدُو اللهَ حُبًّا لَّهٗ فَتِلْكَ عِبَادَةُ الْاَحْرَارِ وَهِيَ اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ" [1]

"ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی عبادت خوف سے کرتی ہے، پس یہ غلاموں کی عبادت ہے، ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی عبادت طلب ثواب میں کرتی ہے، یہ اجرت پانے والے مزدوروں کی عبادت ہے، اور ایک جماعت اسی محبت کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے جو وہ اللہ تعالیٰ سے رکھتی ہے۔ پس یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے۔ اور یہ افضل ترین عبادت ہے"۔

کلمہ "حُبًّا لَّهٗ" پروردگار عالم کی عظمت اور اس کے کمال وسیع کے بارے میں گہرے شعور اور عمیق آگہی کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ محبت انسان کے قلب میں مرکز کمال کے ساتھ تعلق و عشق عظیم پیدا کرتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان مہر و محبت وخلوص کے ساتھ ہر قسم کے اجر و ثواب سے بے نیاز ہو کر یا سزا کا خوف دل میں لیے بغیر عبادت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں اس کو اپنے خضوع وخشوع میں مزہ آتا ہے اور یہ وہ مزہ ہے جو دیگر لذات کو فراموش کر دیتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت بہ نظر قرآن مجید

اولیائے خدا عبادات ہائے نیم شب جن میں اشک شوق اور سوز دل شامل ہوتے ہیں، ان کی اس عظیم معرفت کی دلیل ہیں جو وہ اللہ تعالیٰ سے رکھتے ہیں۔ اسی کامل شوق و عشق کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے قلوب میں ایک خاص احساس پیدا کر لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اپنے کام و دہن میں لذت شہود معبود کی شیرینی محسوس کرتے ہوئے خواب لذیذ بالش ناز و بستر گرم کو بھلا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ حضرات اپنے پروردگار سے گھنٹوں راز و نیاز کی حالت برقرار رکھتے ہیں، یہ ہی وہ کیفیت ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اوقات رات کی دو تہائیاں محراب عبادت میں صرف کر دیتے تھے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی آنحضرتؐ کی منازل عبادت سے واقعیت حاصل کریں۔

۱)۔ خداوند عالم سورۂ اسراء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز 'تہجد' کا حکم دیتا ہے کہ یہی عبادت نیم شب کہلاتی ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۳۱، باب عبادت، ج ۵۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾

''اور رات کے ایک حصہ میں اٹھ جایا کریں اور قرآن و نماز کے ذریعے عبادت بجالائیں، یہ ایک اضافی عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے''۔(اسراء۔۷۹)

۲)۔ خداوند عالم سورۂ مزمل میں عبادت نیم شب میں کمی اور اس کی لذت کو بیان فرماتا ہے، اس عبادت کا وقت رات کا ہے۔ اللہ تعالیٰ مقدار عبادت کو رات کی ایک تہائی سے دو تہائی تک مقرر فرماتا ہے اور رات میں قیام و تہجد کے فلسفہ کو ایک ایسا امر قرار دیتا ہے جو عبادت کے اہداف و مقاصد کے آگے بڑھتے ہیں پورے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم یہاں اس موضوع پر آیات قرآن مجید کو یکجا کر کے پیش کرتے ہیں تا کہ آیات مبارکہ کے منطقی روابط پوری طرح واضح ہو جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿٤﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴿٦﴾ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ﴿٧﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴿٨﴾

''اے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹنے والے! سوائے تھوڑی دیر کے رات کو قیام کریں، آدھی رات سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ، قرآن کو آرام سے پڑھیں، عنقریب ہم ایک قول گراں آپ پر القاء کریں گے، رات کے اوقات وساعات گہری تاثیر اور گفتگو میں پختگی کا سبب ہوتی ہے، آپ کے لیے دن میں طویل آمدورفت کا سلسلہ ہے، اپنے پروردگار کے نام کو یاد کریں اور اس کی طرف توجہ دیں''۔(مزمل۔۱ تا ۸)

آیئے آیات مبارکہ پر غور کریں، خداوند عالم پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت اور نزول وحی کے آغاز میں ہی، جیسا کہ ان آیات شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے، حبیب کو عبادت نیم شب کا حکم دیتا ہے، اور آنحضرتؐ کو مقدار عبادت کے سلسلہ میں دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی شب عبادت میں صرف کرنے اور اختیار دیتا ہے تا کہ حالات و امکانات کے مطابق تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کو عبادت کے لیے منتخب کر لیں۔ یہ تقسیم اوقات ''قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ'' کے جملہ میں بیان کی گئی ہے۔

رات کی تاریکی میں قیام کے معنی صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ اس میں تلاوت قرآن مجید بھی لازمی ہے اور وہ بھی بصورت ترتیل جس میں قرآن کریم کے الفاظ و معانی پر بھی مکمل توجہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ جب نماز بجالاتے ہوئے اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے اور اپنے خالق کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی قرآن مجید کے ذریعے، جو اس کا کلام ہے، اپنے بندہ کے ساتھ ہم کلام

ہوکر اس سے رابطہ قائم کر لیتا ہے، یہی وہ مطلب ہے جو ''وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا '' میں بیان ہورہا ہے۔

بعد کی آیہ مبارکہ میں عبادت نیم شب کے رموز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ عنقریب وہ بارگراں اور عظیم ذمہ داری رسالت جن کی حامل اور جن کی تبلیغ رسالت کے لیے لازم ہے، آپ پر القاء ہوگی، اس ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے لازم ہے کہ اپنے کردار کو بنایا جائے اور ایک مسلسل رابطہ خالق اکبر کے ساتھ برقرار رکھا جائے، ''اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا '' کے فرمان سے یہی مراد ہے۔

اس کے بعد والی آیہ مبارکہ تہجد کے لیے رات کے انتخاب کی علت بیان کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ عبادت کی تاثیر کی مقدار ماحول کے سکون اور حضوری قلب سے متناسب ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عبادت نیم شب تاثیر کے اعتبار سے عمیق تر اور گفتگو کے لحاظ سے زیادہ تر استوار ہوتی ہے، ان حالات میں بات دل سے نکلتی ہے اور اسی کیفیت پر منطبق ہوتی ہے جبکہ دن کے اوقات شوروغل، سعی وکوشش اور آمدورفت سے خالی نہیں ہوتے۔ ان مجبوریوں کے علاوہ نہ تو وقت ہی عبادت کے لیے کافی ہوتا ہے اور نہ ہی رجوع قلب ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝

ایک انسان کامل، اس بناء پر کہ وہ وجود امکانی کا حامل ہوتا ہے اور روحانی قوت وسکون کے اعتبار سے محدود کیفیات کا مالک ہوتا ہے، ذمہ داری کو انجام دیتے وقت، بالخصوص جب اس کا مقابلہ جاہل و نادان افراد سے آن پڑے، تو وہ ایک طرح کی بے سکونی اور افسردگی سے دوچار ہو جاتا ہے، جو اگر بڑھ جائے تو ذمہ داری کی انجام دہی سرمہری کا باعث ہو جاتی ہے۔ لہٰذا دل سے ہر قسم کے زنگ کو دور کرنے اور کمال قدرت ومرکز کمال کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے عبادت بہترین ذریعہ ہے جو روح ونفس کو زیادہ سے زیادہ قوت و سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔

۳)۔ سورۂ مزمل میں ایسی آیات ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مومنین کی ایک جماعت کے ہمراہ رات کے وقت عبادت کے لیے قیام کا ذکر کرتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ

''آپ کے پروردگار کو علم ہے کہ آپ ان افراد کی ایک جماعت کے ساتھ جو آپ کے ہمراہ ہیں، رات کا دوتہائی یا نصف یا ایک تہائی حصہ عبادت میں گزارتے ہیں''۔ (مزمل ۲۰)

حالانکہ خداوند تعالیٰ اپنے رسولؐ کے لیے رات کی عبادت کو ''نافلہ'' قرار دیتا ہے، اس کے باوجود آنحضرتؐ عبادت میں اس قدر قیام فرماتے ہیں کہ آپ کے قدم ہائے مبارک ورم کر آتے تھے، لہٰذا اسی بارے میں ذیل کی آیہ مبارکہ نازل ہوئی:

طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ﴿۲﴾ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ﴿۳﴾

''ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ آپ اپنے آپ کو زحمت و مشقت میں ڈال دیں ، بلکہ یہ تو لوگوں کے لیے اشارہ ہے جو خدا کی مخالفت سے ڈرتے ہیں''۔ (طٰہ۔ ۲، ۳)

۵)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔۔ وسعت علم و آگہی

کرۂ ارض پر قدم رکھنے والے قدم روز ازل سے صفحہ ہستی پر آنے والے انسانوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دانا ترین اور آگاہ ترین انسان ہیں، قرآن مجید آنحضرتؐ کے علم و آگہی کا ان الفاظ میں ذکر فرماتا ہے:

وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی، جو نہیں جانتے تھے اس کی آپ کو تعلیم دی اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے''۔ (نساء۔ ۱۱۳)

اس آیہ مبارکہ کے تین جملوں پر غور کرنے سے ہمیں آنحضرتؐ کے وسعت علم کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

(ا)۔ ''وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ'' یعنی ''خداوند عالم نے کتاب اور حکمت آپ پر نازل فرمائی''۔

ظاہر ہے کہ کتاب سے قرآن مجید مراد ہے اور حکمت سے دانش مستقل، جس سے زندگی کا ہر دور سعادت سے مملو ہو جاتا ہے اس کے نمونے لقمان حکیم کے اقوال میں ملتے ہیں، لیکن آنحضرتؐ کا علم ہرگز اس قسم کے اقوال و احکام تک محدود نہیں بلکہ ان سے بہت زیادہ وسیع ہے۔

(ب)۔ ''وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ'' یعنی جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے ہم نے آپ کو اس کی تعلیم دی''۔

جس علم و آگہی کا اس جملہ میں ذکر ہوا ہے وہ قانون تغایر معطوف و معطوف علیہ کے تحت اس کتاب و حکمت کے علاوہ ہے، جس کا جملہ اول میں ذکر ہوا، اس کی منزل عظیم کے لیے یہی کافی ہے جس کا ذکر مندرجہ ذیل سوم میں ہوتا ہے۔

(ج)۔ ''وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ﴿۱۱۳﴾'' یعنی ''اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم، علم و آگہی جس کی شاخیں ہیں، آپ پر بہت عظیم ہیں''

علم و دانائی سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں اور عظمت کے ساتھ کرم کی تعریف آنحضرتؐ کی عظمت علم اور قوت ادراک پر شاہد ہے، یہ علم ، جس کی خداوند عالم عظیم کے لفظ سے تعریف فرماتا ہے، اس کی اہمیت واضح و روشن ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پہلے پیغمبر ہیں جو بحکم آیہ مبارکہ ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا'' اور ہم نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی'' اسرار ہستی سے آگاہ ہوئے، آپ نے ایسا علم حاصل کیا جس سے فرشتگان الٰہی ناواقف تھے۔ اسی بناء پر حضرت آدمؑ کو ملائکہ پر برتری حاصل ہوئی ، اور آپ مسجود ملائکہ قرار پائے۔ اب حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام سے افضل اور ان کے سردار ہیں۔ امت

اسلامیہ کی روایات میں اس حقیقت پر مکمل اتفاق ہے۔لہٰذا آپ کو کمالات نفسانی اور فضیلت وعظمت کی تمام حدود میں خاتم الانبیاء اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پر مکمل برتری حاصل ہے۔

''برید'' جو امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک امام معصوم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسعت علم وحکمت کے بارے میں آیہ ذیل سے استدلال فرماتے ہیں:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ

'' (متشابہات یا) پورے قرآن کی تاویل خدا اور راسخین علم کے سوا کوئی نہیں جانتا ''۔(آل عمران۔۷)

اس سلسلہ میں امام علیہ السلام نے اس طرح فرمایا:

"وَرَسُولُ اللهِ أَفْضَلُ الرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ قَدْ عَلَّمَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ جَمِيعَ مَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ مِنَ التَّنْزِيلِ وَالتَّأْوِيلِ وَمَا كَانَ اللهُ لِيُنْزِلَ عَلَيْهِ شَيْئًا لَمْ يُعَلِّمْهُ تَأْوِيلَهُ"۔[1]

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راسخان فی العلم میں سب سے زیادہ افضل ہیں، اللہ تعالیٰ نے تنزیل وتاویل قرآن مجید کی آپ کو تعلیم دی اور یہ بات پروردگار عالم کے شایان شان نہیں کہ کوئی چیز آپ پر نازل فرمائے اور اس کی حقیقت سے آپ کو آگاہ نہ فرمائے''۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ معصومین کا علم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کا پرتو ہے۔تمام صحیح ومستند وثقہ احادیث جو ہمارے پاس موجود ہیں، سب آنحضرتؐ پر منتہی ہوتی ہیں اور ان کا مطالعہ آنحضرتؐ کے عظیم علم پر واضح وروشن گواہ ہے۔

٦)۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔لوگوں کے لیے تحفظ عذاب کا سبب

شناخت کے معنی

انسان کے اعمال بد دنیا میں اپنا عکس العمل رکھتے ہیں اور دوسری دنیا میں سزا کا باعث ہوتے ہیں کسی معاشرہ میں آثار گناہ میں سے ایک معاشرہ پر نزول عذاب ہے جس کی آیات قرآن مجید اور احادیث شریف میں تصریح کی گئی ہے اس بارے میں سرکش اقوام کے نیست

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۱۳۰

ونابود ہوتے سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا مطالعہ ہی کافی ہے البتہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود ذیجود کے آثار میں ایک یہ ہے کہ جب آپ لوگوں کے درمیان موجود ہیں ان پر اللہ تعالیٰ نزول عذاب نہیں فرماتا۔ آیۂ ذیل میں اس کیفیت کی تصریح ہورہی ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳

''اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز عذاب نہیں کرے گا جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں جیسا کہ عذاب نہیں بھیجے گا جب تک وہ طلب مغفرت کرتے رہیں گے۔''

سب سے پہلے جس ہستی نے قرآن مجید سے اس خصوصیت کا استخراج فرمایا وہ مولائے کل حضرت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات والاصفات ہے اپنے کلمات قصار میں ایک جگہ حضرت فرماتے ہیں:

كَانَ فِي الْاَرْضِ اَمَانَانِ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ وَقَدْ رُفِعَ اَحَدُ هُمَا فَدُوْنَكُمُ الْاٰخَرَ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ اَمَّا الْاَمَانُ الَّذِيْ رُفِعَ فَهُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وَاَمَّا الْاَمَانُ الْبَاقِيْ فَالْاِسْتِغْفَارُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ .... [1]

''روئے زمین پر دو مؤثر ذرائع امان ہیں جن میں ایک کو اُٹھالیا گیا ہے پس دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے رہو (اس سے متمسک رہو) جو اُٹھالیا گیا وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور جو باقی ہے اس کو طلب مغفرت کہتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس (اللہ تعالیٰ) کے شایاں شان نہیں کہ ان کو عذاب کرے جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں ....

۷۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ...... شفیع روز جزا

شناخت کے معنی ہم سب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جب کسی شخص کی جرم و گناہ کے سلسلہ میں مذمت کی بات ہوتی ہے اور کوئی اور شخص دخل انداز ہوکر اول الذکر یعنی مجرم کی حمایت وسفارش کرنے لگتا ہے تاکہ موت و پھانسی یا قید و بند سے نجات دلا سکے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجرم کی شفاعت یعنی سفارش کی۔

---

[1] نہج البلاغہ، حصہ حکمت، شمارہ ۸۵

لفظ 'شفاعت' مادہ "شفع' ہے، اس کے معنی جفت کے ہیں، جو 'وتر' یعنی طاق کے برعکس ہے۔اس کی علت یہ ہے کہ کسی مجرم کے لیے کسی دوسری شخص کی طرف سے حمایت، مجرم کی نجات کے لیے شفاعت کہلاتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ شفاعت یا سفارش کرنے والے کا مقام وحیثیت اور اس کی قوت وتاثیر مجرم کی نجات کے عوامل شفاعت کے ساتھ مل کر (یہ عوامل کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں) آپس میں ایک ضمیمہ بن جاتے ہیں (یعنی جفت ہوجاتے ہیں) اور یہ دونوں امور ایک دوسرے کی مدد سے مجرم کی خلاصی اور چھٹکارے کا سبب بن جاتے ہیں۔

گنہگاروں کے لیے اولیائے خدا کی شفاعت کے معنی ظاہر میں یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معزز بندے بارگاہ پروردگار میں اپنے قرب و حیثیت کی بناء پر اس قابل ہوتے ہیں کہ مجرم اور گنہگار لوگوں کے لیے واسطہ بن سکیں اور بارگاہ ایزدی میں التماس کریں کہ ان کی خطا و گناہ سے درگزر فرمائے۔ تاہم ان کی شفاعت کرنا اور اس شفاعت کا قبول ہونا ایک سلسلہ شرائط کے تحت ہوتا ہے جن میں بعض شرائط تو مجرم سے متعلق ہوتی ہے اور بعض شفاعت کرنے والے سے تعلق رکھتی ہیں، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہنا چاہیے کہ شفاعت اولیائے خدا کی اس مدد کو کہتے ہیں جو اللہ کے اذن سے صرف ان مجرمین کے لیے ہوتی ہے جو گنہگار ہوئے بھی اپنے دامن ایمان کو اللہ تعالیٰ اور اپنے تعلق معنوی کو اللہ تعالیٰ کے اولیاء سے منقطع نہیں کرتے۔

شفاعت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ایک نچلے درجہ کا وجود جو تحرک در پیش رفت کی استعداد رکھتا ہو، اپنے سے بلند تر ہستی سے ایک قانونی امر کے تقاضے کے تحت حمایت و امداد طلب کرے، یہ طلب کردہ مدد، خواہ کمال روحی ہی کے لیے کیوں نہ ہو، اس حد سے تجاوز نہ کرے جہاں مدد طلب کرنے والا اپنی قوت تحریک وتکمیل ہی چھوڑ بیٹھے اور ایک پاک انسان کے مقام تک پہنچنے کے امکانات ہی اس کے لیے ختم ہو جائیں۔

عقیدۂ شفاعت مسلمانوں میں اس قدر راسخ ہے کہ جہاں بھی چلے جائیں اور جس سے بھی دریافت کریں اس عقیدہ کو عقائد اسلامی میں شمار کرتا ہے، کوئی شخص اسلامی نقطہ نظر سے عقیدہ شفاعت کی اصلیت میں کسی قسم کے شک وشبہ وتردید کو تسلیم نہیں کرتا۔ہم سب جانتے ہیں کہ جب بھی مسلمان اپنے اللہ سے راز و نیاز کی منزل میں آتے ہیں، یا اسلام کے بزرگ رہنماؤں کی قبور پر حاضر ہوتے ہیں، تو گنہگار افراد کے قلوب و افکار بارگاہ پروردگار میں شفاعت کرنے والوں کی طرف کھینچنے لگتے ہیں اور وہ ان بزرگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خدائے بزرگ کی بارگاہ میں التماس کریں تا کہ یہ گنہگار عفو ورحمت الٰہی کے مورد قرار پائیں۔

اس قسم کے راسخ ومستحکم عقائد جعلی اور بے بنیاد نہیں ہو سکتے۔ یقیناً یہ عقیدہ معاشرہ اسلامی کے استحکام قرآن مجید کے ایک ارب انسان ، بالخصوص ان کے علماء و دانشمند ایک ایسا عقیدہ اختیار کرلیں جو کہیں بھی آسمانی الہامی کتاب اور مدارک دینی میں نہ پایا جاتا ہو۔ تاہم ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بنیادی اسلامی مسئلہ بعض دوسرے بلند تر معارف کی طرح غلط پیرایہ اختیار کر چکا ہے، لہٰذا علماء و دانشمنوں پر لازم آتا ہے کہ لوگوں پر اس مسئلہ کو واضح و روشن کریں اور بنیادی اسلامی مطالب کو ان کے مخالف نظریات سے جدا کر کے لوگوں کو سمجھائیں۔

مسئلہ شفاعت، یعنی کسی بلند درجہ شخصیت کا کسی پست درجہ شخص کی مدد کرنا، کسی قسم کی جماعت سازی یا انسانی دستگاہ کی ظالمانہ وسیلہ تراشی سے بالکل مختلف ہے۔ اگر کوئی نااہل فرد یا ناواقف جماعت اس عقیدہ اسلامی کو صحیح محور سے ہٹا دے اور اس کی صورت کو مسخ کردے تو یہ

بات صحیح فکر اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور شافعین صادق دنیا کے یزیدوں، حجاجوں اور چنگیزوں کو بھی اپنے سایہ شفاعت کے نیچے پناہ دے دیں گے، ایسے سب ظالمین بھی شافعین کے مراکز معنویت ونورانیت سے بہرہ مند ہو جائیں گے اوران کے مرکز وجود میں پاکیزگی ونیکی کی طرف تحریک پیدا ہو جائے گی۔لیکن ایسے لوگ اپنے اندیشہ وفکر میں سخت قسم کے اشتباہ کا شکار ہیں کیونکہ شافعان صادقین کی شفاعت صرف ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کے نفس وروح کمال و پاکیزگی کی جانب تحرک وسعی کی قوت وجذبہ رکھتے ہوں گے لیکن جن لوگوں میں یہ قوت وکمال بالکل وجود ہی نہ رکھتے ہوں گے ہرگز ہرگز ان کے وجود تاریک شافعین کی نورانیت سے کسی قسم کی روشنی نہ پائیں گے۔

شفاعت کے مسئلہ میں ہمیں اس طرح سوچنا چاہیے کہ فرض کریں کہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی عمر کا ایک حصہ فسق وفساد میں بسر کیا ہے لیکن صالح اور پاکباز افراد کے قرب کی وجہ سے ایک چنگاری اس کے قلوب میں روشن کرتی ہے، جس سے اس کے دل میں انقلاب آتا ہے اور وہ اس انقلاب سے ایک مختلف انسان بن جاتا ہے۔یہی بات ہم اخروی انسانوں کے بارے میں سوچیں، یعنی ایسے انسان جن کے روح ونفس میں آلودگی موجود ہو لیکن ان حالات میں بھی کمال کے حصول کی قوت کو ان کے نفوس نے بالکل خیر باد نہ کہہ دیا ہو، تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں سے رابطہ کے زیر اثر اور نورانی ہستیوں کے مرکز نورانیت سے ملحق ہونے کے باعث ایک قسم کی تبدیلی کے وجود میں رونما ہوجاتی ہے اور انقلاب وکمال کی طرف تحریک کا ایک شعلہ اس کے نفس وروح میں پیدا ہو جاتا ہے۔

شفاعت اخروی کی حقیقت کی یہ نامکمل اور کم رنگ تصویر ہے جو شافعان صادقین کے ذریعے اذن پروردگار سے انجام پائے گی اور جب تک ہم خود اس کی طرف قدم نہ بڑھائیں اس کی حقیقت سے ہرگز واقف نہ ہو پائیں گے۔

شفاعت کے بارے میں ہمیں اسی طرح غور کرنا چاہیے جس طرح توبہ وندامت کے بارے میں سوچتے ہیں۔اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ماضی کے اعمال سے توبہ وندامت، ان حالات میں جن کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر ہوا ہے، انسان کو پاک وصاف کر دیتی ہیں اور اس کے مرکز وجود میں انقلاب کی ایک چنگاری پیدا کرتی ہیں۔ یہ بات کبھی کسی نے نہیں کہی کہ توبہ کا اقرار مجرموں کے لیے جرأت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح شفاعت کے عقیدہ کو سبب جرأت برائے گناہ یا گناہ کے پھیلنے کا ذمہ دار جاننا چاہیے بلکہ شفاعت کو دروازۂ امید بطرف طہارت وپاکیزگی سمجھنا چاہیے۔

عقیدۂ شفاعت کا اصلاحی پہلو اور اس کے آثار تربیت

ہم نے یہاں حقیقت شفاعت اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دینی موضوع کے آثار تربیت اور اس کی خصوصیت پر بحث کریں۔

قدیمی مباحث کے مطابق ضروری تھا کہ ہم پہلے پیغمبر اکرم ﷺ کی شفاعت کے دلائل بہ نظر قرآن کریم زیر بحث لاتے اور

اس کے بعد شفاعت کے آثار تربیت پر گفتگو کرتے کیونکہ جب تک کسی چیز کا وجود بذریعہ عقل ونقل ثابت نہ ہو اس کے بارے میں بحث ایک فرضی عندیہ پر بحث سمجھی جائے گی ،لیکن چونکہ دور حاضر میں اکثر قارئین کسی مذہبی عقیدہ کی اہمیت وملزوم پر اس کے آثار تربیت و اصلاح کے پہلو سے بحث کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی عقیدہ دین اس سطح پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کو دوسرے درجہ کے مذہبی مسائل میں شمار کرنے لگتے ہیں ۔ پس کبھی کبھی ہم بھی اس عقیدہ پر غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ اس طرز فکر کے پیش نظر اس بحث کو سامنے رکھتے ہوئے، نیز اس حقیقت کی خاطر کہ ان کے مقرر کردہ معیار کے مطابق بھی جو انہوں نے مسائل مذہبی کی ترتیب و درجہ بندی کے لیے قائم کر رکھا ہے ۔عقیدہ شفاعت کا مسئلہ درجہ اول کے مسائل سے ہے، ہم نے اس مسئلہ کے آثار تربیت و اصلاح کو دیگر مباحث پر مقدم رکھا ہے ۔ لہٰذا ہم اسی پہلو سے مسئلہ پر بحث وگفتگو کرتے ہیں ۔

شفاعت امید کا پہلو رکھتی ہے

شفاعت کا عقیدہ گنہگار افراد کے قلوب میں جذبہ امید کو جنم دیتی ہے اور کم از کم زندگی کے نصف سے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرنے کا سبب بنتا ہے ۔ اگر شفاعت کی حقیقت کا صحیح بنیادوں پر مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیائے کرام کی شفاعت پر اعتقاد نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی سے دوری و بغاوت کا سبب نہیں بنتا بلکہ اس بات کا باعث قرار پاتا ہے کہ ایک جماعت اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی ودرگزر کے امکانات کو دیکھ سکتے ہیں، اپنے گناہ وعصیان وسرکشی سے دستبردار ہو کر حق تعالیٰ کی طرف لوٹ آئے گی ۔

صرف شفاعت ہی وہ چیز نہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی میں یہ اثرات پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے ۔ بلکہ توبہ کی قبولیت اور وسیع تر سطح پر ''غم واندوہ سے رہائی'' اور معاشرہ کے مستقبل کے حالات کی بہتری کی امید وتوقع ایسے اصلاحی عوامل سے ہے جو تبدیلی حالات پیدا کرتی ہے اور نوع بشر کی بے سروسامانی کے خلاف انسان کو قوت بخشتی ہے ۔یعنی یہی وہ اقدار ہیں جو انسان کو یاس وناامیدی کے تاریک ماحول سے نجات دلا کر اس کو رجاء وامید کی روشن فضا میں لے آتی ہے ۔

اولیائے حق تعالیٰ کی شفاعت کا عقیدہ (مخصوص شرائط کے تحت) گنہگاروں کے لیے اس بات کا سبب بنتا ہے کہ گنہگار انسان یہ اعتقاد رکھنے لگتا ہے کہ وہ اب اپنی کیفیت کو بدل سکتا ہے اور اس کے سابقہ اعمال ایسے نہیں کہ جن کی وجہ سے اس کی حالت قطعی طور پر نا قابل تغیر ہو چکی ہے ۔ بلکہ اسے سمجھ آنے لگتی ہے کہ وہ اولیائے پروردگار کی مدد سے عزم راسخ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کر کے اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور در ہائے سعادت اپنے لیے کھول سکتا ہے ۔ اس کے برعکس یاس اور ناامیدی اور یہ بات کہ وہ خود یا دوسرے اس کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتے، زندگی بھر کے لیے چراغ امید کو اس کے لیے خاموش کر دیتی ہے ۔

وہ شخص جس کی تمام زندگی گناہ وعصیان میں بسر ہوئی ہو، اگر یہ یقین کرے کہ اس کی سابقہ بداعمالیوں نے اس کے محل سعادت کو اس قدر برباد کر دیا ہے کہ اب وہ قابل مرمت واصلاح رہا ہی نہیں، اس کے لیے ایک ایسی قطعی کیفیت پیدا ہو چکی ہے کہ کسی طرح بھی اس میں کوئی

تمیز ممکن نہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت سے اپنے لیے حاصل ہی نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ اس کی توبہ وندامت، اولیائے باری تعالیٰ کی شفاعت اور ان سے مدد کی درخواست بھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی، تو ایسا عقیدہ نہ صرف یہ کہ اس کے حجم گناہ میں کسی طرح کی کمی نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اب اس کے لیے واپسی کی کوئی راہ کھلی ہوئی نہیں ہے۔ اور اب وہ نیکی کا کوئی قدم بھی اطاعت خداوند تعالیٰ میں اٹھائے تو اسے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، تو اب اس کے لیے اور کوئی صورت باقی نہ رہے گی کہ وہ یہ سوچنے لگے کہ اپنی باقی عمر میں اپنے اوپر اطاعت خدا کا بوجھ کیوں ڈالے اور لذت گناہ سے کیوں دستبردار ہو۔ اس کے برعکس ایک گنہگار شخص اگر در امید اپنے لیے کھلا ہو پائے اور جان لے کہ وہ اب بھی اپنی حالت کو آئندہ کے لیے درستی کی طرف بدل سکتا ہے تو وہ کوشش کرے گا کہ اپنے ماضی کو فراموش کر کے اپنی آئندہ کی حالت کو بہبودی کی طرف بدل ڈالے۔

اس حقیقت سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ اولیائے باری تعالیٰ کی شفاعت اذن پروردگار کے تابع ہے۔ جب تک پروردگار جب تک پروردگار عالم کی اجازت نہ ہو کوئی شخص کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی بحث کے بغیر یہ تسلیم شدہ ہے کہ اذن پروردگار بلا وجہ و بغیر حکمت نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ کہنا چاہیے کہ اذن پروردگار ان لوگوں کے شامل حال ہوگا جو عفو و درگزر کے قابل ہوں، یعنی اگر ان کی عمر لغزش و گناہ میں بسر ہوئی ہے تو ان کی حالت بے شری و بغاوت کے مرحلہ تک نہیں پہنچی اور اگرچہ انہوں نے اپنے تعلق کو بعض صورتوں میں ضعیف و کمزور کر دیا ہے تاہم اسے بالکل منقطع نہیں کر لیا۔ تو ایسے لوگ جنہوں نے حق وحقیقت سے اپنے گونا گوں تعلقات توڑے نہیں، شفاعت میں شامل اور اس کے اہل ہوتے ہیں۔

ان حالات میں شفاعت کی خوشخبری گنہگاروں کو خبردار کرے گی کہ ہوش میں آئیں اور جس قدر جلدی ممکن ہو ارتکاب گناہ سے باز رہیں نیکی سے اپنے رشتہ کو شکستہ نہ کریں، بے حیائی اختیار نہ کریں، شعاع شفاعت سے دور نہ ہوں، کیونکہ اس صورت سے سوا ان کے لیے کوئی راہ نجات نہ ہوگی۔ یہی احساس فکر گنہگار افراد کے راہ حق کی طرف پلٹنے اور غلط لائحہ عمل پر تجدید نظر میں معاون و مؤثر ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے تاریک نقاط کو پاک و روشن کیفیت میں بدلنے کے لیے دروازۂ امید ہی مددگار ہوتا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ اگر مجرم افراد پر در امید کھل جائے اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ اپنے غلط و بے جا غلط لائحہ عمل میں تجدید نظر کرنے لگیں تو راہ نجات انہی کے لیے ہوگی، تو ان میں سے اکثر افراد اپنی بے راہروی سے راہ راست کی طرف لوٹنے لگتے ہیں۔

تمام قوموں کے قوانین جزا و سزا میں قیدیوں، بڑے بڑے ملزموں اور عمر قید کے مجرموں کے لیے قانون معافی پایا جاتا ہے۔ اس کی علت یہ ہے کہ ایسے افراد کے لیے راہ امید کھلی رہے اور وہ اپنی زندگی کے نصب العین میں تجدید نظر کر سکیں۔ اگر یہ راہ کھلی نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ لوگ ایسے ماحول میں آرام سے بیٹھے رہیں اور مزید ارتکاب جرم کے لیے ہاتھ نہ بڑھائیں کیونکہ بہر حال عمر قید سے تاریک تر تو اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

قابل و شائستہ افراد کی شفاعت کے بارے میں حیات دینی و اخلاقی کے لیے امکانات جدید کے پیدا کرنے کے لیے راہ امید کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ راہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جنہوں نے اپنے پروردگار اور اولیائے دین کے ساتھ اپنے روابط محفوظ کر رکھے

ہوں۔ایسا شخص جو اعمال نیک نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے بہرہ ور نہیں ہوا اور اس نے اپنی تمام عمر گناہ و فساد میں بسر کی ہے، وہ ہرگز سزاوار شفاعت نہ ہوگا۔ان دونوں جماعتوں کے درمیان فرق کو ہم ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں جو اس طرح ہے۔

فرض کریں کہ فوج کے کچھ سپاہیوں کو ایک ایسے قلعہ کا دروازہ کھولنے کا حکم ملتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی ہے ہے، اس قلعہ کا کھولنا ملک کی باہر کے تجاوزات سے حفاظت کے لیے اشد ضروری و موثر ہے۔اس صورت میں ماہر و تجربہ کار سپہ سالار آگے بڑھنے اور قلعہ کو سر کر کے دروازہ کھولنے کے وسائل ان سپاہیوں کے لیے مہیا کر کے انہیں پہاڑ پر چڑھنے کا حکم دیتا ہے۔

اب ایسی جماعت سپاہ جو منظم نہ ہو اور بزدل بھی ہو، جو سپہ سالار کے فرمان پر کان نہیں دھرتی اور پہاڑ کے نیچے ہی کھڑی رہتی ہے، تو وہ اپنے سپہ سالار کی حمایت کی مستحق نہیں ہوگی، البتہ وہ جماعت جو فرمانبردار رہے اور تیزی سے پہاڑ پر چڑھ جاتی ہے، اگر بعض مواقع میں لغزش کھانے والے مقام سے انہیں عبور کروائے گا۔

نگرانی و مدد کی یہی وہ قسم ہے جس کو ہم ان حضرات کی جانب سے ایک طرح کی شفاعت کہہ سکتے ہیں جو حصول مقاصد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں۔اس بات میں ہرگز کسی طرح کا کوئی شک و اشکال نہیں ہوگا اگر کوئی ہمدرد سپہ سالار اپنے سپاہیوں کے لیے ان کے پہاڑ چڑھنے سے پہلے یہ اعلان کر دے کہ اگر وہ اس چڑھائی کے دشوار گزار مقامات میں پھنس گئے تو سالار کی طرف سے ہر ممکن مدد سے کسی طرح محروم نہ رہیں گے۔ بلکہ یہ بھی یقین دلا دے کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرے گا کہ ہدف کو سر کرنے والوں کو مکمل امداد مہیا کی جائے۔

اس قسم کا قبل از وقت اعلان ارکنان کے لیے ادائیگی فرائض میں شوق و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ان کے قلوب میں شعاع امید روشن کرتا ہے اور ان کی قوت و استقامت میں افزائش کا باعث بنتا ہے، یہی وہ طریق کار ہے جو دراصل افراد کی تربیت کرتا اور انہیں ذریعہ تکامل فراہم کرتا ہے۔

اس مقام پر ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ مسئلہ شفاعت پر اعتقاد اسی صورت میں مؤثر ہو سکتا ہے جب اس کی ہر قسم کی عوام فریبی سے ہٹ کر تفسیر وتشریح کی جائے۔قرآن و حدیث یا عقل کے نقطہ نظر سے اس تخیل کی طرف دعوت دی جائے جو درحقیقت اس تصورت سے بالکل مختلف ہوگی جو بعض ایسے افراد پیش کرتے ہیں جن کے ذہن اسلامی تعلیمات سے دور ہیں۔یہ اس لیے لازم ہے کہ بعض اوقات شفاعت کی نامناسب لوگوں کی طرف سے غلط تشریح عوام الناس کو حقیقت شفاعت کے ادراک سے روک دیتی ہے۔ہمیں یہاں حاجب نامی شاعر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جس کا خیال تھا کہ قیامت کے دن حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا دست شفاعت گنہگاروں کے لیے کھلا ہوا ہے اور اب وہ لوگ حضرت امیر المومنین کی شفاعت کے بھروسے پر جس قدر گناہ کر لیں۔ ؎

حاجب اگر معامله حشربا علی عليه السلام ست

حسن ضا منم تو ہر چه بخواہی گناه کن

یعنی اے حاجب اگر قیامت کا معاملہ علیؑ کے ہاتھوں میں ہے تو میں ضامن ہوں کہ جس قدر تو چاہے

گناہ کر لے۔

اتفاق یہ ہے کہ اسی شاعر کا کہنا ہے کہ اس نے خواب میں امیر المومنین علیہ السلام کی زیارت کا شرف پایا اس نے خواب میں اس قسم کے بے ہودہ شعر پر حضرت کے غم وغصہ کو محسوس کیا۔ حضرت نے ہدایت فرمائی کہ اپنے اس شعر کے مصرع ثانی کو بدل کر یہ کہے:

حاجب اگر معامله حشر با علی علیہ السلام ست

شرم از رخ علی علیہ السلام کن و کمتر گناه کن

یعنی اے حاجب اگر قیامت کے معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے تو اس کے سامنے جاتے ہوئے شرم کر اور گناہ کم کر۔

لہٰذا جوانان عزیز اور مکتب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق ورابطہ رکھنے والے کو چاہیے کہ اپنے دینی معارف کو محقق علماء اور اسلامی بنیادی کتب سے حاصل کریں تا کہ وہ شفاعت کے حقیقی مفہوم کا تحریف شدہ مطالب سے امتیاز کر سکیں اور ہر افسانہ گو یا پیشہ ور داستان گو کے کہنے یا لطیفہ گو لوگوں کی تحریروں کو تسلیم نہ کرنے لگیں، جو ان کے قلم سے معرض تحریر میں آتی ہے، جن میں صلاحیت تحریر کا فقدان ہوتا ہے۔

شفاعت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مسئلہ شفاعت کی اصلیت کو سمجھنے اور اس کے اصلاحی پہلوؤں کو جاننے کے لیے ممکن ہے یہ مختصر بحث بہت سے سوالات کا جواب مہیا کر سکے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث دیگر مباحث ہی کی طرح تفصیل طلب ہے جن کو سر دست یہاں پیش کرنے سے ہم معذور ہیں، جو صاحبان شفاعت سے متعلق دیگر مباحث سے آشنا ہونا چاہتے ہوں وہ ''مؤلف کتاب ہذا کی کتاب'' شفاعت در قلمرو عقل وقرآن وحدیث'' کی طرف رجوع فرمائیں۔[1]

اس موضوع میں جس بات کی اس وقت اشد ضرورت ہے، وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روز قیامت شفیع قرار پانے سے تعلق رکھتی ہے ،اس بارے میں ہم قرآن مجید کی وہ آیات مبارکہ کو بطور سند پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

۱۔ وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۝۷۹

''نماز نافلہ کے لیے رات کے ایک حصہ میں کھڑے ہو جائیں تا کہ پروردگار عالم آپ کو انتہائی پسندیدہ مقام پر مبعوث فرمائے''۔ (اسراء۔۷۹)

---

[1] یہ کتاب مؤلف ہذا کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے جس میں مسئلہ شفاعت پر دس مباحث پیش کی گئی ہیں: ۱۳۵۶ ھ ش میں طبع ہوئی ہے۔

طبرسی فرماتے ہیں کہ مفسرین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آنحضرتؐ کا مقام شفاعت ہی ہے اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن لواء الحمد (پرچم سپاس وستائش کو اپنے دست مبارک میں لیں گے، جملہ انبیاء علیہم السلام کے نیچے جمع ہوں گے اور آپ وہ پہلے فرد ہوں گے جو شفاعت فرمائیں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی) [1]

زمخشری لکھتے ہیں کہ اس مقام شفاعت سے کونسا مقام بلندتر ہوگا جو تمام اہل محشر کے لیے حمد وستائش کا سبب بنے گا، [2] تمام روایات اسلامی اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد آنحضرتؐ کا مقام شفاعت ہے۔

سیوطی نے کتاب الدر المنثور اور سید ہاشم بحرانی نے تفسیر برہان میں وہ احادیث نقل فرمائی ہیں جو مقام محمود کی مقام شفاعت کے طور پر تفسیر کرتی ہیں۔ [3]

۲۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝

''اور آخرت کا گھر آپ کے لیے اس جہان سے بہتر ہے، خدا آپ کو عنقریب اس قدر عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے''۔ (الضحٰی۔ ۴،۵)

پہلی آیہ مبارکہ قیامت کے دن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ طبعی وفطری طور پر اس راضی کر دینے والی عطا کی تکمیل کے لیے وہی مقام اور وہی زمانہ ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم للعالمین ہیں۔ لہٰذا یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ ایسے دن آنحضرتؐ فکر امت سے بے فکر ہوں۔ آج کے دن جو چیز آنحضرتؐ کی رضا مندی اور خوشی کا سب سے بڑا سبب بن سکتی ہے وہ آپ کی امت کی ان جماعتوں کی نجات ہے جنہوں نے اپنے رشتہ ایمان میں اللہ تعالیٰ اور رابطہ وحی آنحضرتؐ سے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔ یہ کام ہر صورت شفاعت آنحضرتؐ کے زیر سایہ ہی انجام پا سکتا ہے۔

روایات اسلامی میں بھی آیہ مبارکہ کی تفسیر بطور شفاعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''رَضَاهُ اَنْ تَدْخُلَ اُمَّتُهُ الْجَنَّةَ ''یعنی آنحضرتؐ کی رضا اسی بات میں ہے کہ آپ کی امت جنت میں داخل ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شفیع ہونے کے دلائل صرف انہی آیات میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اس بارے میں ہمارے سامنے ایسی آیات مبارکہ موجود ہیں جو انبیاء علیہ السلام کو حکم دیتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں اور درخواست کریں کہ آنحضرتؐ ان کے بارے میں اللہ سے مغفرت طلب فرمائیں۔ ہم ان آیات مجیدہ پر آنحضرتؐ کی نسبت مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے موضوع کے سلسلہ پر بحث وگفتگو کر چکے ہیں، جس کی تکرار کی اب ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اب ہم اپنی گفتگو کو مختصر کر کے حضرت حق تعالیٰ، عز وجل کے

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۳۵

[2] کشاف، ج ۳، ص ۵۳۴

[3] الدر المنثور، ج ۴، ص ۱۹۷۔ برھان، ج ۲، ص ۴۳۸۔ ۴۴۰

حضور دست بدعا ہیں کہ ہمیں حضور خاتم النبیین کے قابل قرار نہ پائیں تو ہمیں خود اپنے آپ پر افسوس ہونا چاہیے، نہ کہ اور محشر کی ذات پر، جیسا کہ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے:

گر خواجه شفاعت تکند روز قیامت
باید که زمشاط نه رنجیم که زشتیم

اگر قیامت کے دن وارث محشر ہماری شفاعت نہ فرمائیں تو ہمیں آپ پر کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہم خود ہی بد عمل ہوں گے۔

۸)۔حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔رؤف ومہربان

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں سے ایک آپ کا ایماندار معاشرہ کے ساتھ تعلق، آپ کی شفقت اور مہربانی ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾

''خود تم ہی سے ایک رسول تمہارے پاس آیا جس پر تمہاری مشقت وتکالیف سخت گراں ہیں، وہ تمہارے ایمان لانے کا خواہشمند ہے اور تم سے تعلق رکھتا ہے اور وہ مؤمنین پر شفیق و مہربان ہے''۔(توبہ۔۱۲۸)

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰهُ ۖٞ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

''پس اگر وہ پیروی سے روگرداں ہوجائیں (تو پریشان نہ ہوں) تو کہہ دیجئے کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے''۔(توبہ۔۱۲۹)

پہلی آیہ مبارکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ صفات عالیہ کا ذکر کرتی ہے جن میں چوتھی اور پانچویں صفات ہمارے موضوع بحث میں شامل ہیں۔ ہم ان سب صفات کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں:

(ا)۔''مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ '' ''خود تمہیں میں سے''۔ اس سے مراد ہے کہ وہ بشر ہیں اور جن کی ہدایت کے لیے انہیں بھیجا گیا ہے ان کی خصوصیات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

مطالب و ذوق قرآن سے بہت بعید ہوگا اگر اس لفظ کی تفسیر 'عربی' اور 'قریش' کے الفاظ سے کی جائے، بالخصوص جبکہ آیہ مبارکہ کے نزول کے زمانہ میں، جو ۹ ھ میں نازل ہوئی، روم و فارس کے لوگوں کی ایک جماعت بھی آنحضرتؐ کے پاس موجود تھی اور ایمان لا چکی تھی۔

(ب)۔''عزیز علیہ ماعنتم'' وہ تمام مشقتیں اور رنج و تکالیف جن کے تم جہاد اور دیگر مواقع پر متحمل ہوئے ہو، ان کے مکمل طور پر آگاہ ہے اور ان سے لاپرواہ نہیں ہے''۔ بنی نوع انسان کو شرک کے چنگل سے آزادی دلانے کا جذبہ و شوق اس بات کا سبب ہے کہ وہ تمہیں سخت و دشوار منازل سے گزرنے کا حکم دے۔

(ج)۔''حریص علیکم'' تمہارے ایمان و ہدایت اور دونوں جہانوں میں سعادت کے پہلوؤں سے شدید لگاؤ رکھتا ہے''۔ سابق ہم اس خصوص کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

(د، ھ)۔''بالمؤمنین رؤف رحیم'' مومنین پر مشفق و مہربان ہیں''۔

اس جملہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف دو صفات یعنی رؤف اور رحیم سے کی گئی ہے ان دونوں صفات میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ شاید آنحضرتؐ کی رافت یعنی شفقت فرماں بردار مومنین کے لیے مخصوص ہو، جبکہ آپ کا رحم عام ہو جو مومنین اور گنہگار افراد دونوں پر واقع ہوتا ہو۔ کتب حدیث و سیرت میں افراد باایمان کے ساتھ آپ کی شفقت کے نمونے اس قدر وارد ہوتے ہیں کہ جن کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

۹)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔ صاحب کوثر

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو صاحبزادے، جن کے اسمائے گرامی قاسم اور عبداللہ تھے، یکے بعد دیگر وفات پا گئے۔ اس پر عاص بن وائل وغیرہ جیسے آپ کے حتمی دشمنوں نے آپ کو ''عقیم'' اور ''ابتر'' کہنا شروع کر دیا۔ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں ایک خاص سورۂ مبارکہ کے ذریعے آپ سے خطاب فرمایا جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۞ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ۞ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ ٱلْأَبْتَرُ ۞

''ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی پس (اس نعمت کے شکرانہ کے طور پر) اپنے پروردگار کی نماز بجا لائیں اور قربانی کریں، آپ کے بدخواہ ہی عقیم ہیں''۔ (سورۂ کوثر)

مفسرین نے ''کوثر'' کے معنی میں بہت اختلاف کیا ہے، تاہم اختلاف کے دائرہ کو جتنا بھی وسیع کر دیا جائے کسی طرح ممکن نہیں کہ آنحضرتؐ کی وسیع نسل کے مصادیق کو ان معانی سے خارج کیا جا سکے۔ یہ اس لیے کہ آیات مبارکہ کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جملہ اول ان بدخواہوں کی گفتگو کی گفتگو کا جواب ہے جو آنحضرتؐ کو عقیم و ابتر کہتے تھے۔ لہٰذا اس قسم کی گفتگو کے لیے آتا ہے کہ لفظ ''کوثر'' کی اس طرح تفسیر کی جائے جو اس بدخواہ کی گفتگو کا جواب اس بات کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ کہا جائے کہ اس بدخواہ کے کہنے کے خلاف آپ نہ صرف ابتر اور عقیم نہیں ہیں بلکہ آپ ایک ایسی نسل و اولاد کے مالک ہیں جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہو سکتی۔

آیہ مبارکہ قرآن مجید کی ایک غیبی خبر سے مطلع کرتی ہے جس کو سب لوگ سمجھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں باوجود یہ کہ آنحضرتؐ کی اولاد کئی

انسانوں میں اموی اور عباسی جلادوں کے ہاتھوں انفرادی یا مجموعی طور پر جام شہادت نوش کرتے رہے ہیں۔[1]

ان تمام حالات کے باوجود آج کی اسلامی دنیا رسول خدا ﷺ کی نسل کے پھیلنے کی قرآن خبر غیبی سے مکمل طور پر مطلع ہے اور نسل رسولؐ کی روز افزوں وسعت کی شاہد ہے۔

علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں کوثر کے متعلق بحث کے دوران لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم طول تاریخ میں نسل پیغمبر اسلامؐ کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر مزید کہتے ہیں:

"فَانْظُرْ كَمْ قُتِلَ مِنْ اَهْلِ الْبَيْتِ ثُمَّ الْعَالَمُ مُمْتَلِئٌ مِنْهُمْ وَلَمْ يَبْقَ بَنِي اُمَيَّةَ فِي الدُّنْيَا اَحَدٌ يُعْبَأُ بِهِ ثُمَّ انْظُرْ كَمْ فِيهِمْ فِي الْاَكَابِرِ مِنَ الْعُلَمَاءِ كَالْبَاقِرِ وَالصَّادِقِ وَالْكَاظِمِ وَالرِّضَا عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَالنَّفْسُ الزَّكِيَّةِ وَاَمْثَالِهِمْ"[2]

"دیکھ لیجئے کہ اہل بیت پیغمبر کتنے افراد قتل کئے گئے ہیں اور پھر دنیا ان سب سے بھری ہوئی ہے، لیکن بنی امیہ کا ایک بھی قابل ذکر شخص باقی نہیں، پھر یہ بھی دیکھیں کہ اہل بیت پیغمبرؐ میں کیسے کیسے عظیم علماء مثلاً حضرات باقرؑ، صادقؑ، کاظمؑ، رضاؑ نفس زکیہ ہوئے ہیں"

یہ بات خلاصہ فخر الدین رازی چھٹی صدی ہجری میں کہہ رہے ہیں جبکہ ہم اب پندرھویں صدی کے آغاز میں عالم اسلام اب مغرب، تیونس، الجزائر اور مصر سے لے کر عرب، شامات، ترکی، ایران، وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے، ان سب ممالک میں ہم رسول خدا ﷺ کی درخشندہ نسل کی موجودگی کے شاہد ہیں اور سب کہتے ہیں

"صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ؛ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ"

یہاں ایک خاص نکتہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ ادوار سابقہ میں، بالخصوص امام رضا علیہ السلام کے زمانہ کے بعد ایک منصب "نقابة

---

[1] منصف مزاج مؤرخین معترف ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنے خاندان کیلئے مودت و محبت کی تاکید کے بجائے اسکے برعکس سلوک کی وصیت فرماتے تو اس سے زیادہ بے مہری ان کی طرف نہ دکھائی جاتی جتنی دکھائی گئی۔ طالبی، حسنی، حسینی اور موسوی سادات کی تاریخ حیات اس بے رحمانہ کشت و خون کی گواہ ہے جو ان کے بارے میں روا رکھا گیا اس سلسلہ میں کتاب "مقاتل الطالبین" مولفہ ابوالفرا اصفہانی ۳۵۶ھ کی طرف رجوع کرنا کافی ہے۔ اس کتاب میں وہ دردناک مظالم اور تلخ حوادث ذکر کیے گئے ہیں جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلامی دنیا یا میدان جنگ میں اولاد ابوطالبؑ پر زمانہ کے طاغوتی کے ہاتھ ڈھائے گئے اور ان کو قتل کیا گیا۔

[2] مفاتیح الغیب، ج ۸، ص ۴۹۸، طبع مصر، ۱۳۰۸

الطالبین'' کے نام سے قائم تھا، فائق ترین افراد جس کے عہدہ دار قرار دیے جاتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہر مقام و علاقہ میں ''طالبین'' کے لیے ایک ''نقیب'' مقرر ہوتا تھا جن میں ایک امام معصوم اور دوسرے ان کے ایک فرزند جو اس عظیم منصب کے حامل تھے۔ ان دونوں حضرات میں ایک تو حضرت امام رضا علیہ السلام مامون الرشید کے زمانہ حکومت میں اور دوسرے شریف رضی ۳۸۰ھ میں بہاء الدولہ کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ نقیب کا کام انساب کی حفاظت، ولادات و اموات کا انضباط لوگوں کے خاندانوں سے متناسب آداب، ان کو پست و ذلیل کاموں سے روکنا، ارتکاب گناہ سے ممانعت وغیرہ ہوتا تھا۔ ''ماوردی'' نے کتاب ''احکام سلطانیہ'' میں اس کے بارے میں مفصل بحث کی ہے۔[۱]

۱۰)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔ شاہد بر اعمال امت

اس کتاب کی آخری خصوصیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی امت کے اعمال پر شاہد ہونے کا بیان ہے[۲] آنحضرتؐ اس مقام کے لیے درج ذیل آیات مبارکہ وارد ہوتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

''اے نبی ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن بنا کر بھیجا ہے''۔ (احزاب۔ ۴۵)

اس آیہ مبارکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مندرجہ ذیل پانچ صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے، جس میں سے ہر ایک بحث و گفتگو کی متقاضی ہے:

(ا)۔ شاهِدًا

(ب)۔ مبشّرًا

(ج)۔ نَذِيرًا

(د)۔ دَاعِيًا اِلَى الله

---

[۱] ''الاحکام السلطانیہ'' ص ۸۲۔۸۶۔ خواہشمند حضرات اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں جو نقابت خاصہ کی ذمہ داریوں کو نقابت عامہ سے ممتاز کرتی ہے۔

[۲] دگر یہ، کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست کہ تر کنم سر انگشت و صفحہ بشمارم

تیرے فضائل کی کتاب کیلئے سمندر بھی کافی نہیں جس میں میں صرف انگلی تر کر کے صفحات ہی شمار کرتا رہوں۔

(ھ)۔ سِرَاجًا مُّنِيرًا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بطور "شاہد" دوسری آیات قرآن مجید میں بھی وارد ہوئی ہیں جو بعض اوقات تو آیہ متذکرہ بالا کے ہم معنی مطلب ادا کرتی ہیں۔[1] اور کبھی کبھی مختلف معنی میں بھی آئی ہے۔ مثلاً

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾

"پس ان کی حالت اس روز کیسی ہوگی جب ہم ہر امت سے ان کے اعمال پر گواہ لائیں گے اور آپ کو ان سب کے اعمال پر گواہ قرار دیں گے"۔ (نساء۔ ۴۱)۔

اس آیہ مبارکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سابقہ انبیاء علیہم السلام پر گواہ ہیں جبکہ پہلے پیش کی گئی آیات مجیدہ اور اس آیہ شریفہ میں جسے ہم ابھی پیش کرتے ہیں، آنحضرتؐ خود اپنی امت کے اعمال پر شاہد و گواہ قرار پاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

"اور کہہ دیجئے کہ جو کام چاہو کرلو، بہت جلد اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور افراد باایمان تمہارے اعمال کو دیکھیں گے، اور جلد ہی تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹا دیا جائے، جو تمہارے مخفی وظاہر سب سے آگاہ ہے اور جو عمل کرتے رہے ہو، ان کی تمہیں خبر دے گا"۔ (توبہ۔ ۱۰۵)

اس آیہ مبارکہ میں مومنین کو بھی خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح اعمال منافقین سے واقف کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے، یقیناً اس سے تمام باایمان افراد نہیں ہیں بلکہ اس سے ایک خاص جماعت مراد ہے، ہمارا موضوع بحث نہیں، تاہم حقیقت یہ ہے کہ امت کے اعمال کے سامنے یقیناً پیش ہوتے ہیں۔ اس گواہی کی واقعیت، اعمال امت کے پیش ہونے ان کو حافظہ میں رکھنے اور پھر ان کے بارے میں شہادت دینے کی کیفیت کے لیے ایک مفصل بحث درکار ہے جس کو ہم نے اپنی کتاب "مفاہیم القرآن" میں "الشھداء من القرآن" کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب جلد شائع ہوجائے گی۔ اب قرآن مجید میں ذکر شدہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور آنحضرتؐ کی خصوصیات کے متعلق بحث کو ختم کرتے ہیں، ہمیں اقرار ہے کہ یہ سب بحث آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کی ایک نامکمل تصویر و تجزیہ پیش کرتی ہے۔ فطری طور پر مؤلف کی معذرت مستقل کو اس بارے میں قبول کرلیا جائے گا اور امید ہے کہ مؤلف کی آنحضرتؐ کے مقام عالی کی تعین میں غلطیوں اور لغزشوں کو عفو و درگزر سے دیکھا جائے گا کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی اس بحث کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ ختم کریں، جس میں ذات باری تعالیٰ خود اپنے حبیب کی دس صفات عالیہ کو بیان فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورہ فتح، آیہ ۸ اور سورہ مزمل آیہ ۱۵ کی طرف رجوع کریں۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰىهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

''وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ، نبی امی (جس نے کسی سے درس نہیں لیا) کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ شخص جس کی صفات کو وہ لوگ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو ان کے پاس ہے، وہ (رسول خداؐ) ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال اور ناپاک اشیاء کو ان کے لیے حرام قرار دیتا ہے، ان سنگین وزنوں اور زنجیروں کو، جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، ہٹا دیتا ہے، اس کی اعانت کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو اس (رسول خدا) کے ساتھ نازل ہوا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں''۔ (اعراف۔۱۵۷)

اس آیہ مبارکہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جن دس صفات سے متعارف کروایا گیا ہے وہ اس طرح ہیں:

(ا)۔ الرّسول: بھیجا ہوا

(ب)۔ النبی: خبر دینے والا

(ج)۔ الامی: وہ جس نے کسی سے درس نہیں لیا۔

(د)۔ مکتوبًا عندھم فی التوراۃ والانجیل: اس کی صفات تورات و انجیل میں تحریر ہوئی ہیں۔

(ھ)۔ یأمرھم بالمعروف: نیک کاموں کا حکم دیتا ہے۔

(و)۔ وینھٰھم عن المنکر: برائیوں سے روکتا ہے۔

(ز)۔ ویحل لھم الطیبات: پاک و پاکیزہ اشیاء کو ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے۔

(ح)۔ ویحرم علیھم الخبائث: ناپاک اشیاء کو ان کے لیے حرام قرار دیتا ہے۔

(ط)۔ ویضع عنھم اصرھم: سنگین بار (بنی اسرائیل پر عائد شدید تکالیف) کو ان کے کاندھوں سے دور کرتا ہے۔

(ی)۔ والاغلال التی کانت علیھم: عادات قبیح اور وہ خرافات جو زنجیروں کی طرح ان کے دست و پا کو جکڑے ہوئے ہیں ان سے ان کے ہاتھ پاؤں کو آزاد کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت قبل بعثت

مخالفین عصمت کے پانچ دلائل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعد از بعثت عصمت کے بارے میں عمیق و دقیق مباحث پیش کی جا چکیں اور آنحضرتؐ کے ہر قسم کے انحراف و عصیان کے خلاف معصوم ہونے کو مکمل طور پر ثابت کر دیا گیا۔ تاہم بد اندیش لوگوں کی ایک جماعت جو پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفحہ زندگی میں کوئی نقطہ سیاہ تلاش نہیں کر سکی۔ اس فکر میں ہے کہ اب وہ آنحضرتؐ کی قبل بعثت کی حیات پاک میں کوئی ضعیف پہلو تلاش کریں اور اس طرح آنحضرتؐ کی منزل عصمت کی تمام عمر کی حقیقت کو متزلزل کر سکیں۔

اس موضوع پر اس جماعت نے پانچ آیات قرآن مجید کو اپنے لیے حجت قرار دے کر اپنے مقاصد پر استدلال قلم کیا ہے۔ اگر چہ ہم نے اپنی اس کتاب میں آنحضرتؐ کی عصمت سے متعلق تمام آیات قرآن کو اپنا موضوع بحث قرار دیا ہے تاہم لازم معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل بحث کی خاطر ان پانچ آیات مبارکہ کو بھی جن سب کا تعلق آنحضرتؐ کی حیات بعد از بعثت سے ہے، پیش کر کے مخالفین کو مسکت جواب دیں، ان تمام آیات کو ہم بالترتیب واضح کرتے ہیں۔

پہلی آیات

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (الضحیٰ۔ ۷)

قرآن مجید سورہ ''الضحیٰ'' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک فرد 'ضال' کے طور پر متعارف فرماتا ہے، یہ تعارف آنحضرتؐ کے لڑکپن اور جوانی سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝

''کیا آپ کو یتیم نہیں پایا، پس پناہ دی، ضال پایا اور ہدایت کی، تہی دست پایا اور آپ کو تونگر کر دیا''۔ (الضحیٰ۔ ۶ تا ۸)

ان مدعیان نے لفظ ''ضال'' کی امور دین میں گمراہی سے تفسیر کی اور اسے کفر و شرک کے برابر جانا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات طیبہ کے ایک مرحلہ میں اسی حالت پر تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی نعمت کے سایہ میں آنحضرتؐ سے مشرف ہوئے اور پھر لوگوں کی ہدایت کے لئے منتخب کئے گئے۔

جواب

اس آیہ مبارکہ کی وضاحت میں ہم ان تمام متعدد احتمالات سے صرف نظر کرتے ہیں جن کا علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔اور خود اپنی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ ''ضال'' مندرجہ ذیل تین معانی میں استعمال ہوتا ہے:

۱)۔گمراہ

۲)۔گمشدہ

۳)۔گمنام

ان تینوں معنی میں جس سے بھی ہم اس آیہ مجیدہ کی تفسیر کریں جناب رسالت مآب ﷺ کی مقدس ذات اور آپ کی عصمت پر کسی قسم کا کوئی خدشہ وارد نہیں ہوتا، بشرطیکہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہم صبر وحوصلہ سے کام لیں، اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے:

(ا)۔''ضال'' بمعنی گمراہ

۱)۔انسان اپنی عمر کا کچھ حصہ شرک وکفر یا عصیان ونافرمانی میں گزارے جس سے اس کا آئینہ روح مکمل طور پر تیرہ وتاریک ہوجائے۔آیہ مبارکہ ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' میں لفظ ''ضال'' انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔اس کیفیت میں ضلالت سے ایک حالت وجودی اور ایک سایہ وتاریکی کے مترادف ہے، جو انسان کے نفس وروح پر وارد ہوجاتی ہے، جس کے نتیجہ میں تیرگی وتاریکی عقل وخرد کی روشنی پر غالب آجاتی ہے۔

۲)۔ایک انسان جس کی عمر ابھی زیادہ نہ ہوئی لیکن اپنے آپ کو فکری وعقلی قوت کا مالک جاننے لگے، یعنی ایسا شخص جو ابھی بچپن اور لڑکپن سے گزر رہا ہو، ایک معنی میں ''ضلال'' یعنی فاقد ہدایت کہلائے گا، اس کیفیت میں ضلالت اس کے نفس وروح میں ایک حالت وجودی یا وصف ثبوتی قرار نہیں پائے گی بلکہ یہ مکمل طور پر ایک عدمی پہلو کی حامل ہوگی۔اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ شخص ابھی عملی طور پر فاقد ہدایت ہے۔اگر یہی کیفیت اپنے اسلوب کو برقرار رکھے تو سابقہ بیان کردہ معیار ضلالت یعنی تیرگی روح، صادق آئے گی۔

اس صورت میں اگر آیہ مبارکہ میں لفظ 'ضال' سے 'گمراہ' مراد لیا جائے تو اس قسم کی ضلالت مقصود ہوگی۔جو فقدان ہدایت کے مترادف ہوگی، تیرگی، وسیاہی قلب یا نفس وروح کی نجات اس سے مراد نہ ہوگی۔

اس دلیل پر یہ حقیقت شاہد ہے کہ آیہ مبارکہ ان نعمات کے بیان کی منزل میں ہے، جو خداوند عالم نے اپنے حبیب پر لڑکپن کے دور میں میں ارزانی فرمائی ہیں۔ان نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرتؐ ہنوز شکم مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد بزرگوار کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ابھی چھ برس کے ہوئے تھے کہ آپؐ کی والدہ گرامی رحلت فرما گئیں، اس قدر شدید حالات میں پردادا نے آنحضرتؐ کو پناہ مرحمت

فرمائی اور آپؐ اپنے جد بزرگوار حضرت عبدالمطلب اور اپنے عم نامدار حضرت ابوطالبؑ کی آغوشہائے عاطفت میں پرورش پا کر جوان ہوئے۔

ان حالات میں آنحضرتؐ اپنے آغاز حیات میں اس لیے فاقد ہدایت قرار پاتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذات سے حامل کمال نہیں ہوتا۔ ہر شخص اور ہر شے جو اوصاف بھی رکھتی ہے وہ اس کو خداوند عظیم کی طرف سے روایت ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا لطف شامل نہ ہو تو کوئی شخص اپنی منزل کی راہ نہیں پا سکتا۔ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام فرعون کے سامنے خداوند عالم کی اس طرح توصیف فرماتے ہیں:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾

''ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر وجود کو خلق فرمایا اور پھر اس کو ہدایت فرمائی''۔ (طٰہٰ۔ ۵۰)

لہٰذا یہ آیہ مبارکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے ابتدائی دور کے بارے میں ہے اور ہدایت ہائے ذاتی کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے، نیز یہ کہ ہر فرد کی، حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی بھی، ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتی ہے اور ایسی 'ضلالت' شرک نہیں کہلاتی، یہ دراصل ایسے فقدان کمال کے معنی رکھتی ہے جس کا کوئی شخص بذات خود عامل نہیں ہوتا بلکہ یہ کمال اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس فقدان کی ابتداء انسان کے شکم مادر میں استقرار کے لمحہ سے ہوتی ہے اور ہدایت الٰہی آہستہ آہستہ اس فقدان کی جگہ لیتی رہتی ہے۔ جوں جوں انسان ہدایت پروردگار اس کے قدم بہ قدم بڑھتی رہتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اصول سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جونہی آنحضرتؐ ہدایت پروردگار کے لائق ہوئے تو ظاہر و مخفی ہر طرف سے اس ہدایت کے سایہ میں استقرار فرمایا۔

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ارشادات سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس ہدایت کی ابتداء اس لمحہ سے ہوئی جب آپ کا دودھ بڑھایا گیا، حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ قرن الله به من لدن ان کان فطیما اعظم ملك من ملائکته به طریق المکارم و محاسن اخلاق العالم لیلًا ونهارا"۔[1]

''جس دن پیغمبر اکرمؐ کا دودھ بڑھایا گیا اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ ترین فرشتہ آپؐ کے ہمراہ کر دیا تا کہ وہ راہ بزرگان اور نیک عادات کو آپ پر واضح کرے''۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ وہ ہدایت جس کا ذکر آیہ مبارکہ ''وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی'' میں ہو رہا ہے وہی ہدایت جو فرعون سے حضرت موسیٰ کی گفتگو میں نظر آتی ہے جب حضرت نے فرمایا تھا ''اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہُدٰی ''یعنی ہر انسان کی ہدایت ایک بخشش ہے جو کاملاً ذاتی حق تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ ہدایت کی یہ بخشش فرمان خدا سے کفر و شرک و نافرمانی کی ہرگز شاہد نہیں، ایسی ضلالت بھی جس کو کلمہ 'ضال' سے اخذ کیا جاتا ہے، نقصان و زیان کے وہی پہلو ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں اور سب انسان ان کے محکوم ہیں، لیکن اس نقصان کا بڑھنا اس بات

---

[1] نہج البلاغہ عبدہ، خطبہ، ۱۸۷

کے مانع نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو اس وقت بے اثر کردے جب انسان فہم وادراک کے حصول کی منزل میں آئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

''سب انسان زیان ونقصان میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح بجا لاتے ہیں''۔(العصر۔۱،۲)

ضرر ونقصان کا رجحان ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ اگر وہ پروردگار کو قبول کرلے تو اس ضرر کا اثر ختم ہوجاتا ہے جبکہ اس کے برعکس صورت میں قوت نقصان وضرر اور اس کے اثرات اپنے اندر فعال کیفیت اختیار کرلیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے رجحان ضلالت ہر شخص میں موجود ہوتا ہے لیکن ہدایت پروردگار اس کے اثرات کو زائل کردیتی ہے لیکن سرکشی کرنے والے ضرر اور اس کے اثرات کو فضیلت، تحقق اور ثبات فراہم کرتے ہیں، جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ ہَدَی اللّٰہُ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَیۡہِ الضَّلٰلَۃُ ؕ

''پس ایک جماعت کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہوئی جبکہ دوسری جماعت کے لیے ضلالت وگمراہی لازم ہوئی''۔(نحل۔۳۲)

ایک اور آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَرِیۡقًا ہَدٰی وَ فَرِیۡقًا حَقَّ عَلَیۡہِمُ الضَّلٰلَۃُ ؕ

''ایک جماعت کو ہدایت بخشی لیکن دوسری جماعت کو خدائی ہدایت سے بہرور نہ ہونے کی وجہ سے ضلالت وگمراہی دامن گیر ہوتی ہے''۔(اعراف۔۳۹)

اس بناء پر انسان کی کیفیت معنوی میں ہدایت وضلالت دونوں ایسی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی چیز ضلالت ونقصان وضرر ذاتی ہے جس کی بازگشت فقدان کمال کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ کیفیت تمام عالم امکان پر حاوی ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ورہنمائی طرح طرح کے راستوں سے اس کے بندوں اور تمام اشیاء کو گھیر لیتی ہے۔

اس ہدایت کے سلسلہ میں لوگ دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو لطف الٰہی کو قبول کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو لطف الٰہی سے اثر انداز نہیں ہوتے پہلے گروہ والے اپنی ذاتی ضلالت اور طبیعی زیان کو اپنے اندر ختم کردیتے ہیں جبکہ دوسرے گروہ والے ان دونوں کیفیات کو اپنے لیے ثابت ومستقل کردیتے ہیں۔

آیت زیر بحث میں لفظ ''ضآلًا'' سے مراد پہلی والی ضلالت ہے۔ اسی طرح کلمہ ''فھدیٰ'' میں ہدایت سے مراد تکوینی وتشریعی ہے۔ اس کے برعکس ''حقت علیه الضلالة'' میں ''ضلالت'' سے مراد وہ کیفیت نہ رہے جس کو انسان ہدایت پروردگار کو ٹھکرا کر اختیار کرتا ہے

اور جس سے روح کی فضا کو تیرگی و تاریکی گھیر لیتی ہے۔

ضلالت کی پہلی کیفیت وجود امکانی کے لیے لازم ہے اور کسی وجود ممکن سے بالاتر ہونا ممکن نہیں۔ اس کے برعکس ضلالت کی دوسری کیفیت عیب باعث مذمت اور موجب سزا ہے اور انسان اس کیفیت کے قبول کرنے یا کرنے میں قطعی طور پر مختار و آزاد ہے۔

(ب)۔ ''ضال'' بمعنی گمشدہ

لفظ 'ضال' عربی زبان بعض اوقات کسی گمشدہ شخص یا گمشدہ مال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے یہ معنی مطابق رواج ہیں اور ان معنی کے فقہ و حدیث میں بہت سے شواہد پائے جاتے ہیں۔

فقہ اسلامی میں ایک باب بنام 'جعالۃ' ہے۔ اس باب میں کہتے ہیں کہ جس شخص کا کوئی سامان گم ہو جائے وہ شخص بصورت کلی، نہ کسی خاص شخص سے، معاہدہ کرکے کہہ سکتا ہے کہ ''من رد ضلالی فلہ کذا'' یعنی جو شخص میری گمشدہ چیز تلاش کرے اور مجھے لوٹا دے تو اس کا یہ انعام ہوگا، اس جملہ میں ''ضالہ'' گمشدہ کے معنی میں ہے۔ عرب صحراء میں سرگرداں اونٹوں کو ''ضوال الابل'' کہتے ہیں، یعنی اونٹ گم ہو گئے اور ان کا مالک ان کے بارے میں اطلاع کے لیے سرگرداں ہے۔ ابن منظور ''لسان العرب'' میں لکھتا ہے کہ عرب کلمات حکیمانہ کو ''ضالہ'' کہتے ہیں اور حدیث میں اس طرح آیا ہے:

"الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن"

یعنی ''سخن ہائے حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہیں''۔ کیونکہ انسان گمشدہ شے کی تلاش میں پھرتا ہے جو بہت قیمتی اور انمول ہوتی ہے۔ اگر کوئی بے قیمت شے گم ہو جائے تو اس کا پیچھا نہیں کرتا۔

لہٰذا بعید نہیں کہ یہ آیہ مبارکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے زمانہ کے حوالہ دیتی ہو جب آپ مکہ کی وادیوں میں گم تھے اور اگر رحمت پروردگار آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو آنحضرتؐ اپنی جان گنوا بیٹھتے۔ آپ کی تاریخ حیات سے بات کی گواہی دیتی ہے۔[1]

(ج)۔ ''ضال'' بمعنی گمنام

عربی زبان میں لفظ ''ضال'' گمنام مخفی اور پوشیدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں ''ضل الشیء'' یعنی اے خفی و غائب''۔ قرآن مجید میں مشرکین کی زبان سے جو منکر معاد ہیں، اس طرح نقل ہوتا ہے:

وَقَالُوٓا ءَإِذَا ضَلَلۡنَا فِي ٱلۡأَرۡضِ ءَإِنَّا لَفِي خَلۡقٖ جَدِيدِۭۚ

''کیا جب ہم زمین میں مخفی و پوشیدہ ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی خلقت میں آئیں گے؟'' (سجدہ۔ ۱۰)

---

[1] لسان العرب، ج ۱۱ ص ۳۹۲، بحار الانوار، ج ۱۶ ص ۱۳۷

ابن منظور لسان العرب میں لغت عربی سے اس معنی پر شواہد نقل کرتا ہے، اس صورت میں احتمال ہوسکتا ہے کہ ''ضال'' سے مراد آپ کی گمنامی وعدم پہچان ہو اور فیض نبوت ونزول وحی سے آپ مشہور ومعروف ہوئے ہوں، آیہ مجیدہ ''وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ'' جو بعد والے سورۂ میں آئی ہے، اس معنی پر شاہد ہے۔ یہ دونوں سورے مضامین کے اعتبار سے مکمل طور پر باہم ملتے جلتے ہیں اور دوسرا سورہ ان مطالب کے اسباب کی وضاحت کرتا ہے جو پہلے سورہ میں آئے ہیں۔

بہر حال لفظ ''ضال'' سے اگر گمنامی اور عدم شناخت مراد ہو تب بھی ''فھدیٰ'' سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت مراد نہیں، بلکہ اس سے آنحضرتؐ کی جانب سے لوگوں کی ہدایت مراد ہے۔ درحقیقت آیہ مجیدہ کی ترکیب اس طرح ہے:

''فھدی الناس علیك۔۔۔لوگوں کو ہدایت کی آپ کی طرف''، یہ تیسری تفسیر بعض آئمہ معصومین علیہم السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔[1]

ان تینوں تفسیروں میں غور کرنے سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ اس آیہ مبارکہ عصمت کے تصور کے حق میں کوئی معمولی سا اشارہ بھی نہیں ملتا اور جو لوگ اس آیت سے غلط مفہوم لیتے ہیں وہ جلد بازی کرتے ہیں۔ اگر آیت کی تفسیر میں صبر وتحمل سے کام لیں تو آیات قرآن کے مشکل مطالب حل ہو جائیں۔

دوسری آیت

''وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ''(مدثر۔۵)

قرآن مجید سورۂ مدثر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ''رجز'' سے اجتناب کریں، اگر اس سے مراد بت ہوں تو ان سے دور رہنے کے حکم کا کیا مطلب ہوگا، جبکہ ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ ۝۴ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۝۵ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ۝۷

''اے اپنے اوپر چادر لپیٹنے والے! کھڑا ہو جا، پس ڈرا، اپنے خدا کو بڑا (بیان کر) اپنے کپڑوں کو پاک کر ''رجز'' سے دوری اختیار کر، احسان مت جتلا تا کہ زیادہ کا طالب ہو اور اپنے پروردگار کی طرف سے صبر وشکیبائی اختیار کر''۔ (مدثر)

[1] بحار الانوار، ج ۶۱، ص ۲۴۱

جواب

عربی زبان میں لفظ ''رجز'' مندرجہ ذیل تین معنی میں استعمال ہوتا ہے اور شاید یہ معانی ایک ہی وسیع و کلی معنی کے حصے ہیں:

(ا)۔عذاب

(ب)۔آلودگی

(ج)۔بت (صنم)

اب ہم ان تینوں احتمالات کا آیہ مبارکہ کی تفسیر کا ذکر کرتے ہیں تاکہ واضح ہوجائے کہ ان میں سے کوئی بھی بعثت قبل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی طرح کی لغزش فکری کو ظاہر نہیں کرتا۔

(ا)۔''رجز'' بمعنی عذاب

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ ''رجز'' ''را'' کی زیر کے ساتھ، قرآن مجید میں نو (۹) مرتبہ وارد ہوا ہے۔سوائے ایک موقعہ کے ان سب میں لفظ 'عذاب' مراد لیا گیا ہے۔ہم ان تمام موقع کو فہرست وار پیش کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ۔۔۔۔۔آیت ۵۹

سورۂ اعراف۔۔۔۔آیات ۱۳۴، ۱۳۵۔ ۱۶۲

سورۂ انفال۔۔۔۔۔آیت ۱۱

سورۂ سباء۔۔۔آیت ۵

سورۂ جاثیہ۔۔۔۔آیت ۱۱

سورۂ عنکبوت۔۔۔۔آیت ۲۹

یہ لفظ ''رجز'' ''را'' پر پیش کے ساتھ صرف ایک بار سورۂ مدثر میں ہی وارد ہوا ہے جس کی ہم ابھی وضاحت کرتے ہیں اور اس میں تینوں احتمالات کو پیش کرتے ہیں۔

(ا)۔''رجز'' بمعنی عذاب

اگر اس سے عذاب مراد ہو تو اس سے ایسے اعمال و کردار سے دوری مراد ہوگی جو عذاب کا سبب بنتے ہیں۔اس قسم کا خطاب اس بات کی علامت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک بھی ایسے وسائل کو وجود نہیں پایا جاتا جو عذاب کا موجب ہوں اور جو آپ کی عصمت کے لیے ناسازگار کیونکہ قرآن کے خطابات عمومی پہلو رکھتے ہیں۔اور جہاں بھی قرآن مجید آنحضرتؐ کو ذاتی طور پر مخاطب کرتا ہے وہاں دوسرے

لوگوں کی تعلیم اور پوری ملت کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور ہے: ''ایاك اعنی و اسمعی یا جارۃ'': یعنی کہتا تجھ سے ہوں لیکن پڑوسن تو بھی سن لے''۔

اس طرح کی گفتگو ایک خاص قسم کی بلاغت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں ہر قسم کا تجزیہ درمیان میں نہیں رہتا، سب لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عزیز ترین انسان کو اس طرح کے خطاب و ذمہ داری کا حامل قرار دیا جائے تو پھر معاملہ درست ہے۔

آپ اس طریقہ سے قرآن مجید کے بہت سے خطابات کے اہداف و مقاصد پر مطلع ہو سکتے ہیں جو سرسری نظر میں آنحضرتؐ کی عصمت کے لیے سازگار معلوم نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید 'مضرات شرک'' نیز یہ کہ شرک جملہ اعمال نیک کی تباہی و نیستی کا سبب بن جاتا ہے، کے موضوع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتا ہے تاکہ دنیا بھر کے تمام مشرکین اپنی حقیقت کو سمجھ لیں۔ ارشاد ہوتا ہے

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

''اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کے تمام نیک اعمال تباہ ہو جائیں گے''۔ (زمر۔ ٦٥)

ظاہر ہے کہ اس آیہ مجیدہ میں مخاطب تو آنحضرتؐ کی ذات پاک ہی ہے لیکن اس سے مراد افراد امت ہیں اور اس سے تمام افراد انسانی کی تربیت مقصود ہے۔

(ب)۔ ''رجز'' بمعنی آلودگی ظاہری

اگر لفظ ''رجز'' سے مراد ظاہری آلودگی ہو تو اس سے صرف ایک لائحہ عمل قرار ہوگا اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ نماز بجالائیں، اس سلسلہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس حکم سے صرف یہی معنی مراد ہیں۔ اس نظریہ کی حمایت میں وہ عبداللہؓ بن مسعود کی روایت بیان کرتے ہیں جو اس طرح کہتے ہیں: ''ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مسجد الحرام میں تھے کہ ابو جہل وہاں آیا اور کہنے لگا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس غلاظت کو محمدؐ پر ڈال دے۔ فوراً ایک شخص اٹھا، غلاظت کو اٹھایا اور اسے آنحضرت کی طرف پھینک دیا۔[1]

اگر یہاں روحانی یا اخلاقی آلودگی مراد ہو کہ قبیح صفات سے دوری اختیار کی جائے تو اس سے عذاب کے وہی معنی مراد ہوں گے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس گفتگو سے تعلیمی پہلو مراد ہے۔

(ج)۔ ''رجز'' بمعنی بت (صنم)

ہم فرض کرتے ہیں کہ ''رجز'' سے بت یعنی اصنام مراد ہیں اگرچہ اس لفظ کے یہ معنی کہیں ثابت نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ وسیع

---

[1] عیون الاثر، ج ۱ ص ۱۰۳

معنی کا حامل ہے اور آلودگی بمعنی بت کو ظاہر کرتا ہے جو اس کی جزئیات میں ہوسکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے قمار اور اس کے آلات ہوں، یا شراب جن کو قرآن مجید لفظ ''رجس'' سے ذیل کی آیہ مجیدہ میں تعبیر فرماتا ہے:

اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ

''شراب وقمار و بت پرستی اور ازلام (ایک طرح کی قسمت آزمائی) یقیناً نجاست ہیں اور شیطان کے کاموں میں شمار ہوتے ہیں''۔ (مائدہ۔۹)

''رجز'' بھی یہی معنی رکھتا ہے جیسے ''رجس'' کا اس کے وسیع معنی میں ان سب چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ لفظ ''رجز'' سے براہ راست بت واصنام مراد ہیں۔ لیکن بتوں سے دور رہنے کا حکم مخاطب کے بت پرست ہونے پر شاہد نہیں ہوسکتا بلکہ اس لفظ سے ایک عمومی خطاب مقصود ہے، ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ خطابات قرآنی ہمیشہ مشہور مقولہ ''تجھ سے کہتا ہوں لیکن پڑوسن تو بھی سن لے'' کا مصداق ہوا کرتے ہیں۔

اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ آیہ مجیدہ کے نزول کے وقت نہ صرف یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بت پرستی نہیں کرتے تھے (بلکہ کبھی بتوں کے قریب بھی نہیں گئے تھے) بلکہ اس زمانہ میں آنحضرتؐ نے بت شکنی کے لیے کمر ہمت باندھی ہوئی تھی اور آپ مشرکین اور بت پرستوں کے خلاف انتہائی قسم کا مبارزہ فرما رہے تھے۔

تیسری آیت

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝۵۲

''اور آپ پر بھی سابقہ پیغمبروں کی طرح ہم نے ایک روح کی اپنے فرمان سے وحی کی اور اس سے پہلے آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب و ایمان کیا ہیں لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا کہ اپنے بندوں میں جسے چاہیں ہدایت کرتے ہیں اور آپ بھی راہ راست کی طرف ہدایت کرتے ہیں''۔ (شوریٰ۔۵۲)

مخالفین عصمت نے جملہ ''مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتَابُ وَالۡاِيۡمَانُ'' کو اس بات کا شاہد قرار دیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی سے پہلے فاقد ایمان تھے۔ آپ وحی کے زیر اثر ایمان لائے اور فاقد ایمان شخص کی کیفیت عصمت کے اعتبار سے واضح و روشن ہے۔

یہ افراد پہلے ہی فیصلہ کیے ہوئے ہیں جو قبل از وقت ایک سدعا بنا لیتے ہیں پھر اس مدعا کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں ورنہ آیہ مجیدہ

کے مطالب اور ملتی جلتی آیات پر غور کرنے سے اس آیہ مجیدہ کے مقصد کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس طرح عاملان وحی اور بارگاہ حق تعالیٰ کے متعلمین یعنی دنیا کے عام انسانوں سے اختلاف اور مناقشہ سے بچ سکتے ہیں۔اس بارے میں ہم کچھ نکات پیش کرتے ہیں۔

نکتہ اول

جو روح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب وحی کی گئی تھی وہ یہی قرآن کریم ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک کو اس لیے روح قرار دیتا ہے کہ قرآن انسان کی حیات اخروی کا ذمہ دار ہے۔یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے روح اس عالم میں انسان کی حیات دنیوی کے لیے لازم ہے۔اس آیہ مبارکہ کے قرائن اس سے قبل آیات سمیت ان معانی مکمل طور پر تائید کرتے ہیں۔

سورۂ شوریٰ میں اہم ترین اور مرکزی بحث وحی پروردگار کے مسئلہ پر ہی کی گئی ہے جو ایک فیض معنوی کی شکل میں انسان کی ابتدائے آفرینش سے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک جاری چلا آیا ہے۔[1]

اس سے قطع نظر پہلے والی آیہ مبارکہ میں خداوند عالم کے اپنے انبیائے سے بات کرنے کے تین طریقے بیان ہوئے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱

''اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی سے کلام کرے مگر بہ طریق وحی (القاء بقلب) یا حجاب کے پیچھے سے (جیسی کہ موسیٰ کے ساتھ کوہ طور پر بات کی تھی) یا وہ کوئی رسول (مانند جبرئیل) بھیج دیتا ہے جو اللہ کے حکم سے جو کچھ وہ جانتا ہے وحی پہنچا دیتا ہے وہ بلند مقام و حکیم ہے۔(شوریٰ۔۵۱)

علاوہ ازیں پیغمبر اکرمؐ 'روح کا وحی کرنا'' تمام باقی انبیاء پر وح کی وحی کا معطوف ہے اور فرماتا ہے:''وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا'' یعنی جس طرح ہم نے انبیائے سابقین پر وحی فرمائی تھی اسی طرح ہم نے آپ پر اپنے احکام وحی فرمائے۔اس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت کو انبیائے سابقہ کی کیفیات پر عطف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے آپ پر بھی سابقین کی طرح ''روح'' کو وحی فرمایا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'روح' سے مراد اللہ تعالیٰ کی بات اور اس کا کلام ہے جس کی شکل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے قرآن پاک ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے لیے صحف و تورات و انجیل کی صورت میں ہے۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ مطالب پر غور کرنے سے سمجھا یا جا سکتا ہے کہ ''روح'' سے مراد وحی پروردگار ہے، وہ تین مطالب یہ ہیں:

---

[1] اس سے مراد وحی تشریعی ہے جو اسباب نبوت کو تشکیل دیتی ہے نہ کہ ہر وحی ہم نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ''مفاہیم القرآن'' ج ۲،ص ۲۴۴۔۲۵۹ میں پیش کی ہے۔

۱)۔اس سورہ میں بحث کا اساسی مرکز مسئلہ وحی ہے۔

۲)۔اس سے پہلی آیت اللہ تعالیٰ کے بشر سے گفتگو کرنے کے طریقوں کی وضاحت کرتی ہے۔

۳)۔زیر نظر آیہ مبارکہ میں ''وَ كَذٰلِكَ'' کے جملہ سے شروع کرتی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت کو بالکل انبیائے سابقہ کی کیفیت جیسی ہی متعارف کرواتی ہے۔اس صورت میں ہم بطور اطمینان کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''روح'' جس کی آنحضرتؐ پر وحی ہوئی ہے وہ قرآن مجید اور اس کا معجزہ جاودانی ہے۔

بعض روایات میں ''رُوْحًا'' کی ''روح القدس'' سے تفسیر کی گئی ہے۔لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے مطابق نہیں کیونکہ آیہ مجیدہ کہتی ہے ''ہم نے آپ کی طرف ایک روح کی وحی فرمائی''۔ظاہر ہے کہ آیت میں ''روح'' چونکہ ''اَوْحَيْنَا'' کا مفعول ہے اس لیے وہ چیز ہے جس کی وحی ہوئی ہے،جبکہ روح القدس وحی کرنے والا پیغام پہنچانے والا ہے نہ کہ وحی شدہ۔[1]

عربی زبان میں ''ما كُنتُ'' یا ''مَا كَانَ'' کے جملے عام طور پر ایسی جگہ استعمال کیے جاتے ہیں جہاں کہنے والا کسی چیز سے امکان یا شان وشائستگی کی نفی کرنا چاہتا ہو۔قرآن مجید بھی اس قسم کے جملے ایسے ہی مقامات پر استعمال کرتا ہے،ہم اس کے نمونے قرآن سے پیش کرتے ہیں۔

(ا)وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

''اور ممکن نہیں کہ کوئی نفس اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر مر جائے''۔(آل عمران۔۱۴۵)

(ب)وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ

''پیغمبر کی یہ شان نہیں کہ خیانت کریں''۔(آل عمران۔۱۶۱)

(ج)مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ

اور مشرکین کے لیے شائستہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مساجد تعمیر کریں''۔(توبہ۔۱۷)

(د)مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ۝۳۲

میرے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ (ایسے بڑے مسئلہ میں) آپ کی حضوری کے بغیر قطعی فیصلہ کروں''۔(النمل ۳۲)

اس اصول کی طرف توجہ کرتے ہوئے ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ'' کے معنی یہ ہوئے کہ اے پیغمبر!اگر ہم

---

[1] اصطلاح کے مطابق ''روح القدموحی (وحی کرنے والا) ہے نہ کہ موحا (وحی کیا گیا) لہٰذا بعض ایسی روایات کی توجیہہ کرنا پڑے گی جن میں روح کی ''روح القدس'' سے تفسیر کی گئی ہے۔

آپ پر وحی نہ کرتے تو آپ میں کتاب سے آ گا ہی اور ایمان سے واقفیت کا امکان ہی نہیں تھا۔

نکتہ دوم

ظاہر آیت یہ ہے کہ وحی قرآن سے قبل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتاب وایمان کے بارے میں درایت وآ گہی سے قطعاً ناواقف تھے۔علم وآ گہی آپ کو نزول قرآن کے بعد حاصل ہوئی۔دیکھنا ہوگا کہ کتاب وایمان کی یہ کس قسم کی آ گہی تھی جو فقط نزول قرآن کی مرہون منت تھی، جس کے لیے کسی انسان یا پیغمبر کے لیے ممکن نہیں کہ امداد وحی کے بغیر اس پر دسترس حاصل کر سکے اور جس سے واقفیت صرف اور صرف نزول وحی ہی سے امکان پذیر ہو سکتی ہے۔اس سلسلہ میں دو احتمال سامنے آتے ہیں:

۱)۔نزول کتاب اور ایمان سے متعلق اصلی آ گہی، خدائے واحد پر ایمان سے ساتھ ہے۔

۲)۔قرآن مجید کے مضامین اور تجزیہ سے واقفیت، نیز عقائد، قصص، احکام، فرائض اور اس کے تفصیلی مطالب پر ایمان۔

احتمال اول کوئی ایسی چیز نہیں جس سے آ گہی کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول وحی لازم قرار پائے کیونکہ اہل کتاب پہلے ہی آنحضرتؐ کی نبوت ورسالت سے واقف تھے، اور خود آنحضرتؐ نے بھی اپنی نبوت ورسالت کے بارے میں اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا، علیٰ ہذا القیاس اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت کوئی ایسی بات نہیں جو حدود وعقل میں نہ آتی ہو، نیز آنحضرتؐ کے زمانہ کے پیروان دین حنیف، بغیر اس کے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہو نسب کے سب موحد تھے۔احتمال دوم سے بھی طبعی طور پر یہی مراد ہے، یعنی ممکن نہیں کہ کوئی شخص وحی کا سہارا لیے بغیر ایسے اصول ومعارف احکام ووظائف، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق قصص وحکایات سے صحیح طور پر مطلع وآ گاہ ہو کر ان پر ایمان لا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی سے پہلے معارف الٰہی کی تفاصیل اور تشریعی طریق کار سے واقف نہ تھے۔آنحضرتؐ وحی الٰہی کی بدولت ان تمام اسرار ورموز سے آ گاہ ہوئے اور ان پر ایمان لائے، یہ بات اس امر سے مختلف اور الگ ہے کہ آنحضرتؐ کے بارے میں کہا جائے کہ آپ کسی چیز سے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت سے بھی آ گاہ نہ تھے۔

آیہ مبارکہ زیر بحث کے مطالب کو آپ ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ'' اور ''وَلَا الْاِيْمَانُ'' کے مطالب کے علاوہ اور آیات کریمہ کی مدد سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً:

(ا) تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۚ فَاصْبِرْ ۚ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

''یہ (انبیاء کے حالات) اخبار غیبی سے ہیں جس کی ہم آپ پر وحی فرماتے ہیں، آپ خود اور آپ کی قوم پہلے ان سے آ گاہ نہ تھے۔پس صبر و بردباری سے کام لیں اور (نیک) انجام تو پرہیزگاروں کے لیے

ہے''۔(ہود۔۴۹)

اس آیہ مبارکہ کا جملہ ''مَا كُنْتُ تَعْلَمُهَا'' آیہ زیر بحث کے جملہ ''مَا كُنْتُ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ'' کے ہم وزن ہے اور دونوں سے کتاب خدا کے مضامین کی تفاصیل سے آگاہی مراد ہے۔

(ب) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چیز پر جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوئی ہے، ایمان لائے اور اسی طرح سب کے سب با ایمان افراد اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، کتابوں اور اس کے انبیاء پر ایمان لائے (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں (اس نظر سے کہ سب اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں) کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ان کی اطاعت کی، خداوندا! ہمیں بخش دے اور ہماری بازگشت تیری ہی طرف ہے''۔(بقرہ۔۲۸۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس معیار ایمان کو جملہ ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' میں توصیف کی گئی ہے وہ نزول وحی کے بعد والا ایمان ہے۔اس کا مطلب نزول وحی کے بعد اصل کتاب یا وجود پروردگار پر ایمان نہیں بلکہ اس کا تعلق اس چیز پر ایمان ہے جو آپ پر نازل ہوئی ہے، ''بِمَآ اُنْزِلَ'' اور جو کچھ آپ پر نازل ہوا''۔اس سے مراد ہی اصول معارف، قصص، حالات، احکام، اور فرائض ہیں۔ان تمام اقدار سے مربوط ایمان نزول وحی کے بعد آنحضرتؐ کو حاصل ہوا ہے کیونکہ ایمان علم وآگہی کی فرع ہے اور چونکہ ایسی آگہی نزول وحی کے بعد ہوئی تھی لہٰذا طبیعی طور پر ایمان بھی اس کے بعد ہی حاصل ہوا۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ ''وَلَا الْاِيْمَانُ'' والے جملہ ''ایمان'' کے لفظ سے وہی کچھ مراد ہے، جو ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' میں ہے اور یہ ایمان اسی مفہوم سے متعلق ہے جس کا ذکر جملہ ''بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ'' (جو کچھ پروردگار عالم کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے) میں ہو رہا ہے۔لیکن اس بات کی علت وسبب کہ زیر نظر آیت میں ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری آیت میں اس بات کا اثبات ہے، یہ ہے کہ یہ آیہ مبارکہ زیر بحث میں موضوع سخن آنحضرتؐ کی کیفیت قبل بعثت ہے جبکہ دوسری آیہ مجیدہ میں بعد بعثت کی کیفیت موضوع گفتگو ہے۔ان قرائن وتوضیحات کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آپ کی بعثت سے قبل کے زمانہ سے متعلق ہر قسم کے بے جا تصور مکمل طور پر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔بزرگ مفسرین نے اپنی کتب میں ہماری یہی بحث اجمالی طور پر پیش کی ہے۔آپ اس موضوع پر حاشیہ میں دی ہوئی کتب و

حوالہ جات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔[1]

چوتھی آیت

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''کہہ دیجئے کہ اگر خداوند عالم چاہتا تو میں تم پر قرآن کی تلاوت نہ کرتا، نہ ہی تمہیں اس سے آگاہ کرتا، میں نے اس سے قبل مدتوں تم میں زندگی بسر کی ہے، تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ؟''۔(یونس۔۱۶)

آیہ مجید کا ہدف ومقصد اس سے پہلے کی آیات میں غور کرنے سے بالکل واضح ہوجاتا ہے۔اس سے پہلی آیہ مجیدہ میں مشرکین کی طرف سے دوشرائط پیش ہوئی ہیں۔یہ آیہ مجیدہ ان کی پہلی شرط کا جواب ہے۔پہلی آیہ شریفہ یہ ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

''اور جب (پیغمبر کے بارے میں) ان پر روشن وواضح آیات کی تلاوت ہوتی ہے اس کے تو وہ لوگ جو (قیامت کے دن) ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آ، یا اس کو بدل ڈال، کہہ دیجئے کہ مجھے اس میں کسی طرح کے تغیر وتبدل کا حق حاصل نہیں، میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔اگر میں اپنے پروردگار کی مخالفت کروں تو عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔(یونس۔۱۵)

اس آیہ مبارکہ میں ان کفار نے جو آپ کی نبوت اور کتاب کے الہامی ہونے کے منکر تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دوشرائط

[1] تفسیر کشاف ج۳،ص۸۸۔۸۹۔تفسیر رازی ج۲۷،ص۱۹۰روح البیان ،ج۹،ص۳۴۷،روح المعانی ،ج۲۵،ص۵۸۔المیزان ،ج۱۸،ص۸۰

پیش کی ہیں:

۱)۔کوئی اور قرآن اس کے علاوہ (اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ) لے آئیں؟

۲)۔ایسی چند ایک آیات جو بتوں کی مذمت کرتی ہیں، بدل ڈالیں۔

اتفاق یہ ہے کہ ان دونوں شرائط اور خواہشات کا جواب دونوں آیات میں آ گیا ہے، اگر چہ جوابات کی ماہیت مختلف ہے۔ دوسری شرط پر تنقید کے سلسلے میں بات اس کے امکان و عدم امکان کے تعلق نہیں ہوئی۔ صرف اس قدر اظہار ہوا ہے کہ میں تو وحی پروردگار کا تابع ہوں ،اس میں تغیر و تبدل کرنے کا مطلقاً حق نہیں رکھتا۔ اور وحی کے بارے میں ہر قسم کی مخالفت، انحراف اور معصیت سے ڈرتا ہوں۔ کیونکہ یہ مخالفت قیامت کے دن سزا کا پیش خیمہ ہے۔"قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ..." حالانکہ پہلی شرط پر تنقید کے بارے میں اس کے ناممکن ہونے کا ذکر ہوا ہے اور فرماتے ہیں:" قرآن میرا بنایا ہوا یا میرا ترتیب دیا ہوا نہیں ہے اس کی آیات اور سورتوں کی تنظیم و تدوین وانشاء میری طاقت میں نہیں، کہ ایک کو لے جاؤں اور دوسری کو لے آؤں، قرآن مجید میں جو بھی ہے خداوند عالم کی جانب سے ہے۔ اس نے اسی کو میرے اختیار میں دیا ہے، میں اس کے فرمان کے تحت قرآن کو تمہارے سامنے پڑھتا ہوں اور تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو نہ میں خود اس کو پڑھتا اور نہ ہی تمہیں اس کی تعلیم دیتا۔

اس بات کی دلیل قرآن مجید میرے غور و فکر کا نتیجہ نہیں، یہ ہے کہ میں سالہا سال سے تم لوگوں کے درمیان ہوں اور تمہارے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل عرصہ میں تم نے قرآن کی آیات اور سورتوں کے مشابہ کوئی بات مجھ سے نہیں سنی۔ اگر یہ میرا کلام ہوتا تو کم از کم کوئی بات تو تم نے قرآن مجید کے مشابہ مجھ سے ضرور سنی ہوتی۔ آخر تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں؟

"نتیجہ اس بحث کا یہ ہے کہ یہ آیہ مبارکہ پہلی آیہ مجیدہ کی طرح اس بات پر گواہ ہے کہ قرآن من جانب اللہ ہے، اسی نے مجھے قرآن کی تعلیم دی ہے، اور میں نزول وحی سے پہلے اس سے ہرگز واقف نہ تھا"۔

یہ ایسی حقیقت ہے جس کے سب مسلمان معتقد ہیں، یہ بات بعثت سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان اور توحید سے کسی طرح منافات نہیں رکھتی۔ لہٰذا یہ بات مسلم و یقینی ہے کہ آنحضرتؐ کی کیفیت بعد از نزول وحی آپ کی قبل از وحی کی کیفیت سے مختلف تھی، اور کیفیت مؤخر الذکر اصول و احکام و معارف سنن و قصص و واقعات کی تفصیلات کی حامل ہیں۔

پانچویں آیت

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤى اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ﴿۸۶﴾

"اور آپ ہرگز یہ امید نہ رکھتے تھے کہ آپ پر کتاب نازل ہوئی مگر آپ کے پروردگار کی رحمت کے

طریق سے (پس اس نعمت کے ہوتے ہوئے) کفار کے حامی نہ بنیں"۔ (قصص۔۸۶)

آغاز آیہ مبارکہ نزول کتاب کے متعلق پیغمبر اسلام ﷺ کی امید کی نفی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد "اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ" کے جملہ سے اس امر، یعنی نزول کتاب، کے بارے میں استثناء وارد ہو رہا ہے۔ لازم ہے کہ اس سلسلہ میں غور و فکر کے مفہوم آیت سمجھنے کی کوشش کریں، آیہ مجید کا بعد کا حصہ اس بات کے ثبوت پر زور دیتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ قبل بعثت اپنے اوپر القائے کتاب کی ایک طرح امید رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ایک لحاظ سے تو آپ ناامید تھے جبکہ دوسرے طریق سے نزول کتاب کی امید رکھتے تھے۔ اس جملہ کی توضیح یہ ہے کہ استثناء کے بارے میں تین احتمال پائے جاتے ہیں جن میں احتمال سوم سب سے زیادہ مستحکم ہے۔

۱)۔ لفظ "اِلَّا" جملہ "اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ" میں استثناء کے معنی نہیں رکھتا جو جملہ ما قبل سے کسی چیز کی نفی کرتا ہو۔ یہ لفظ دراصل "لیکن" کے معنی میں ہے جو سابقہ کلام کے استدراک کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس جملہ کے معنی اس طرح کیے جائیں گے، آپ کو امید نہیں تھی کہ کتاب آپ پر القاء ہوگی لیکن اس ناامیدی میں ہی رحمت پروردگار نے لازم جانا کہ یہ نعمت آپ کے شامل حال ہو، یہ نظریہ "فراء" نے پیش کیا ہے جو عربی زبان کے ادیبوں میں سے ایک ہے۔ [1]

اس مفروضہ کے مطابق کوئی چیز پہلے جملہ سے مستثنیٰ یعنی اصطلاح کے مطابق منع نہیں ہوئی، پہلا جملہ نفی کی حالت میں مطلقاً باقی ہے اور وہ یہ کہ پیغمبر اکرم ﷺ نزول کتاب کی کوئی امید نہ رکھتے تھے۔ حقیقت میں آیہ مبارکہ کے مطالب کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی کی مادی امداد کرتا ہے اور اس امداد کی توضیح ان الفاظ میں کرتا ہے اس نے جس کی مدد کی ہے اس کا کچھ دینا نہیں تھا بلکہ اس نے یہ امداد رشتہ داری کی بناء پر کی ہے۔

اس قسم کی تفسیر لفظ "اِلَّا" کے باوجود استثناء کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ ظاہری معنی کے استدراک کو اور فصیح و بلیغ افراد کے کلام میں اس کو وجود بالکل نادر ہے۔

۲)۔ "اِلَّا رَحۡمَةً" کا لفظ استثناء کے معنی میں اور سابقہ جملہ سے کسی چیز کو خارج کرنے کے معنی میں ہے، نہ کہ استدراک کے معنی میں۔ لیکن "اِلَّا رَحۡمَةً"، جس جملہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس سے استثناء کرتا ہے۔ آیت کے مطالب سے ظاہر ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے گویا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وما القی علیك الكتاب بسبب من الاسباب الا رحمة" قرآن مجید کسی وجہ سے آپ پر نازل ہوا، سوائے حق تعالیٰ کی رحمت کے، یہی نظریہ زمخشری نے بھی تفسیر کشاف میں نقل کیا ہے۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس جملہ کی تقدیر خلاف قاعدہ ہے اور جب تک کوئی خاص ضرورت لاحق نہ ہو اس کے پیچھے نہ جاگنا چاہیے۔

۳)۔ لفظ "اِلَّا رَحۡمَةً" خود آیت میں موجود جملہ سے استثناء کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں "آپ اپنی طرف نزول قرآن کی کوئی امید نہ

---

[1] مجمع البیان، ج ۴، ص ۲۶۹۔ تفسیر رازی، ج ۶، ص ۲۹۸۔ اس مفروضہ کی بناء پر اس جملہ کا مفاد کچھ اس طرح ہے، ولكن رحمة ربك القى اليك (یا) لكن ربك رحمتك وانعمه به عليك

رکھتے تھے سوائے ایک صورت کے اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم آپ کے شامل حال ہو اور اس طرح اعزاز وافتخار آپ کو نصیب ہو۔ دوسرے لفظوں میں نزول قرآن مجید دو صورتوں میں متصور ہوتی ہے۔

(ا)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عام صورت اجراء کے طور پر اپنے لیے نزول قرآن کے امیدوار ہوتے ہیں اور آیہ مبارکہ آپ کی اس قسم کی امید کی نفی کرتی ہے کیونکہ عمومی اجراء و جریان کی کوئی قسم نزول قرآن کی شہادت نہیں دیتی۔

(ب)۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اس کے پاکیزہ ترین بندہ کے شامل حال ہے اور اسے اس قسم کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے، اس مطلب وطریق سے آنحضرتؐ کی امید منفی نہ تھی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطمئن تھے کہ ایک نہ ایک دن رحمت پروردگار آپ کے شامل حال ہو گی اور کتاب ہدایت آنحضرتؐ کے اختیار میں آجائے گی۔

تیسری تفسیر مکمل طور پر آیہ مبارکہ کے ظاہر سے مطابقت رکھتی ہے اور جو کچھ ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مقدس قبل بعثت کے بارے میں جانتے ہیں، اس سے بالکل سازگار ہے۔ مفسرین میں علامہ فخر رازی نے وضاحت کے ساتھ اس نظریہ کو بیان فرمایا ہے۔ نیز علامہ طباطبائیؒ مرحوم سے بھی ایک طرح پر یہی استفادہ ہوتا ہے۔[1] سمجھدار مفسرین کی جماعت نے آیہ مبارکہ کے مطالب پر کسی طرح کے عمیق فکر کے بغیر ہی ان نظریات کو اپنے لیے سند قرار دیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی

اس فصل میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حساس اور سبق آموز مدنی زندگی نظریات کے حوالہ سے معرض تحریر میں لائی گئی ہے۔ آپ کی حیات مقدس کے اس حصہ کا قرآن کریم کی آیات مبارکہ کی بنیاد پر تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس فصل کے اختتام کے ساتھ ہی پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے تمام حصوں کی وضاحت و بیان بہ نظریہ قرآن مجید اختتام کو پہنچتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کا تجزیہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مقدس کے ادوار از ولادت تا بعثت اور بعثت تا ہجرت ہم پیش کر چکے، نیز آنحضرتؐ کی روحانی واخلاقی خصوصیات اور مسلمانوں کے اپنے عظیم رہبر سے متعلق فرائض وضاحت از روئے قرآن، ہم نے تحریر کیں۔ اب ہم اس موقع تک آن پہنچے ہیں کہ آنحضرتؐ کی دس سالہ مدنی زندگی پر قرآن مجید کے حوالہ سے تبصرہ کریں۔ اس سلسلہ میں لازم ہو گا کہ ہم مجبوری بیان کے علاوہ آیات قرآن مجید سے دور نہ جائیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی عظیم کتاب میں اس بارے میں آیا ہے، اسی کی تشریح و تفصیل بیان کریں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۶ ص ۴۸۶، المیزان، ج ۱ ص ۹۱

دو معاشروں کا فرق

اللہ تعالیٰ کے حالات مکہ سے بالکل مختلف تھے۔ اس تفاوت کو ہم مندرجہ ذیل نکات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

۱)۔ مکہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل مشرکین کے مقابل تھے۔ آپ کا روئے سخن ان لوگوں سے تھا جو اللہ تعالیٰ کی پرستش کے منکر تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے اور ان کی پرستش پر اصرار کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مکہ میں زیادہ تر ایسی آیات قرآن مجید نازل ہوئیں جن کا تعلق الٰہیات و معارف سے تھا۔ اس کے برعکس مدینہ میں آپ کے گرد پیش انصار کے پرجوش مسلمان نوجوان تھے۔ یہ نوجوان آنحضرتؐ کے ساتھ سایہ کی طرح اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی طرف سے عائد کردہ فرائض کے منتظر رہتے تھے۔ اسی لیے کی زندگی میں آنحضرتؐ پر زیادہ تر احکام حیات بخش لے کر آیات نازل ہوتی رہیں۔

۲)۔ مکہ میں آپ کے گرد صرف ایک چھوٹی سی جماعت اکٹھی ہوسکی جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ مومنین کی یہ مختصر سی جماعت ہر وقت مشرکین کے دباؤ میں رہتی تھی۔ یہ دباؤ بعض اوقات سے اس قدر بڑھ جاتا کہ انہیں ترک وطن پر مجبور کر دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ اپنی قوم میں زندگی بسر کرنے کی نسبت حبشہ میں جا کر رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ اس قسم کے پر آشوب و پرخطر ماحول میں، یار و مددگاروں کی کمی کے پیش نظر مشرکین کے خلاف دفاع و قتال و جہاد کی بات کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ مدینہ کے حالات اس کے بالکل برعکس تھے۔ آنحضرتؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد شہر اور اس کے اطراف کے لوگ جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے اور اسلام کی بڑھتی ہوئی امواج اطراف مدینہ کو اپنے گھیرے میں لینے لگیں، اس طرح آنحضرتؐ کو اس قدر قوت حاصل ہوگئی کہ مشرکین کے خلاف جہاد و دفاع کی بات کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد سے متعلق تمام آیات قرآن مجید مدینہ میں نازل ہوئیں۔

۳)۔ جزیرہ نمائے عرب کی آبادی کی اکثریت بت پرستوں پر مشتمل تھی، اس کے باوجود اہل کتاب کی ایک معتقد جماعت مدینہ اور اس کے نواح میں رہائش پذیر تھی۔ مدینہ اور خیبر جزیرہ نمائے عرب میں یہودیوں کے مرکز تھے ادھر حجاز و یمن کی سرحی پٹی میں 'نجران' نامی مقام عیسائیوں کا مرکز تھا۔ یہ دونوں جماعتیں کتب آسمانی سے واقفیت رکھتی تھیں، اس لیے ان لوگوں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان طویل مناظرے و مباحث ہوتے رہے جن میں آنحضرتؐ کا کافی وقت صرف ہوا اور اس سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات بھی نازل ہوئیں۔

۴)۔ اس ماحول کی خصوصیات میں سے ایک جماعت منافقین ہے جن کی اپنی ایک قوت تھی، یہ لوگ مجبور تھے کہ مسلمانوں کے خوف سے بظاہر اظہار ایمان اور مسلمانوں سے یکجائی کا مظاہرہ کریں۔ لیکن باطنی طور پر ان کے ہمنوا نہ ہوں۔ اس قسم کی کوئی خاص جماعت مکہ میں وجود نہ رکھتی تھی کیونکہ وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ مکہ میں مسلمان اقلیت میں تھے اور مشرکین کی بہت بڑی اکثریت تھی جبکہ مدینہ میں طاقت صرف اسلام کو حاصل تھی اور مخالفین اسلام اقلیت سے تھے۔ منافقین کئی وجوہات و اسباب کے تحت بت پرستی کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور کئی اسباب ایسے تھے جن کی بناء پر وہ اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ اس بناء پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کا اہم حصہ منافقین کی سرگرمیوں سے پیدا شدہ حادثات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے اگر ہم منافقین سے متعلق تمام آیات قرآن کو جمع کریں تو شاید وہ قرآن مجید کے دو پاروں

سے تجاوز کر جائیں۔

۵)۔سرداران قبائل کی دنیا کی اہم شخصیات اور بادشاہوں کو دعوت اسلام دینا مدینہ میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے لوازمات سے ہے۔اسی کیفیت کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے اطراف واکناف عالم میں خطوط ارسال فرمائے اور سرداران قبائل کے ساتھ مختلف شرائط پر معاہدے تشکیل فرمائے۔اس طرح آپ نے نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ عالمی سطح پر اپنے وجود کا اعلان فرمایا ۔ظاہر ہے کہ مکہ کی زندگی کے دوران حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ آنحضرتؐ اس قسم کے تحرکات ومساعی کو بروئے کار لائیں۔مختلف اور گونا گوں حالات کے پیش نظر جوان دو مختلف ماحولوں پر حکم فرما تھے ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ مکی و مدنی آیات قرآن مجید کو موضوعات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا کریں۔انہوں نے صحابہ کرام وتابعین حضرات کی روایات کی طرف رجوع کرنے کے بجائے خود مطالب آیات میں غور وفکر کرنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے چاہا ہے کہ دونوں معاشروں سے مطابقت رکھنے والے موضوعات کے اعتبار سے ایک مکی و مدنی کا تعین کریں۔اس کیفیت کے پیش نظر شرک وبت پرستی سے متعلق آیات کو انہوں نے مکی قرار دیا جبکہ جہاد وقتال اور اسلامی مملکت کے دفاع کے بارے میں آیت، نیز وہ جو فرائض واحکام عملی کو بیان کرتی ہیں، ان کو مدنی آیات جانا ہے۔یہ طریق کار اگرچہ سو فیصد مقیاس وضابطہ عمومی قرار نہیں پاتا۔تاہم اکثر و بیشتر موقع پر رہنما ثابت ہوتا ہے۔

مدنی آیات کی خصوصیات

ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبل بعثت حیات مقدس اور ہجرت سے قبل کے واقعات کے بیان سے فارغ ہو چکے ہیں۔اب چونکہ ہمارا موضوع آنحضرتؐ کی مدنی زندگی کے حالات وموضوعات کو پیش کرنا ہے اس لیے ضروری ہے کہ مدنی آیات قرآن کی خصوصیات کی طرف ایک اور پہلو سے اشارہ کریں۔ہم اس حصہ کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی کے مدنی واقعات کو آیات قرآن کے زیر اثر پیش کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے بہتر ہوگا کہ مدنی آیات کی دس خصوصیات کا مناسب پہلو سے ذکر کریں۔یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(ا)۔مدنی آیات قرآن کے شمار کے اعتبار سے ایک تہائی، سورتوں کے لحاظ سے ایک چوتھائی، حجم کے اعتبار سے (مدنی آیات کے طولانی ہونے کا باعث) قرآن مجید کے ایک تہائی سے زیادہ ہے۔

(ب)۔مدنی آیات طولانی ہونے کی وجہ سے ایک خاص طرز رکھتی ہیں اور مکی آیات کی طرح زیادہ مسجع نہیں ہیں۔

(ج)۔مدنی آیات میں سابقین کے قصص سے مربوط مسائل کی تشریح، بہشت ودوزخ کی تفصیلات، مناظر قیامت کی طرف اشارہ جات اور نوید وانذار پر ہی اکتفا کی گئی ہیں اور تفصیلات پر گفتگو نہیں کی گئی جبکہ مکی آیات متذکرہ موضوعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(د)۔آیات مدنی کا ایک حصہ عقائد یہود ونصاریٰ، ان کے اخلاق وروحانیات کے مسائل پر مشتمل ہے جبکہ مکی آیات میں یہ موضوع بہت کمیاب ہے۔

(ھ)۔جہاد، دفاع، فتح وشکست، سے متعلق مسائل مدنی آیات کی خصوصیات سے ہیں۔

(و)۔اخلاقی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا بیان، وہ بھی امر و نہی کی صورت میں مدنی آیات کے ساتھ مخصوص ہے۔

(ز)۔جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت عظام اور آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات کے بارے میں مدنی آیات میں گفتگو ہوئی ہے جبکہ مکی آیات میں یہ موضوع نہیں پایا گیا۔

(ح)۔ہجرت اور اہل یثرب کے استقبال مہاجرین کے بارے میں مدنی آیات قرآن تفصیلات پیش کرتی ہیں۔

(ط)۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کبار کی تعریف یا مذمت آیات مدنی میں سامنے آتی ہے۔

(ی)۔بیرون مدینہ کے حوادث مدنی آیات قرآن پیش کرتی ہیں کیونکہ متعلقہ مسافرتیں اور تحرکات برائے جہاد و مدینہ میں استقرار و استحکام کے بعد واقع ہوئے۔لہٰذا فطری طور پر اس قسم کی آیات مدنی ہی ہو سکتی ہیں۔

ان دس موضوعات کے تحت مدنی آیات قرآن مجید کو مکی آیات سے الگ کیا جا سکتا ہے، لہٰذا مدینہ میں آنحضرتؐ کے کوائف کے لیے انہی آیات مبارکہ میں جستجو کرنا ہو گی۔

تاریخ اسلام میں مخفی ہاتھ

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات اقدس کے دوران اور تاریخ اسلام کی تدوین میں بہت سے خفیہ ہاتھوں نے کام کیا ہے، جن کی وجہ سے کئی قسم کی تحریفات واقع ہوئی ہیں۔ان باتوں کو سادہ لوح مؤرخین نے نقل کیا ہے اور انہوں نے محققین کے لیے تاریخ میں مشکلات پیدا کی ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ صحیح تاریخ کو غیر صحیح سے جدا کرنا، ایسی تاریخ کی تحقیق و محبت کے اثرات سے پاک ہو، اور جس کی پیش نظر واقع نگاری سے ہٹ کر کوئی ہدف و مقصد نہ ہو، بے حد مشکل ہو گیا ہے۔یہ بالکل ایک فنی عمل ہے جس کے لیے اس قسم کے قواعد کلی اور وسیع ضوابط موجود نہیں ہیں جن کی مدد سے حق و باطل میں امتیاز ممکن ہو مزید مشکل یہ ہے کہ اقوام عالم میں عوامل تحریف کبھی بھی یکساں نہیں رہے۔

انقلاب اسلامی کے بعد تاریخ اسلام، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور آپ کی تعلیمات پر تحریف کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، خود غرض لکھنے والے قرآن فہمی یا اسلام کی معرفت کے لیے خارجی مصادر کی طرف جو یہود و نصاریٰ کے زہر آلود قلم کا نتیجہ ہیں، رجوع کرتے ہیں۔

ان غلط نتائج نے ہمیں مجبور کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک پر موثق ترین مصادر سے قلم اٹھائیں۔لہٰذا ہم نے اس ناہموار وادی میں قدم رکھا اور ہم آنحضرتؐ کی سیرت اقدس ولادت سے بعثت اور بعثت سے ہجرت تک آپ کے خصائص و اخلاقی اقدار اور آپ کی طرف مسلمانوں کے فرائض قرآن مجید کی آیات کریمہ سے استناد کرتے ہوئے معرض تحریر میں لائے۔اب وقت آن پہنچا ہے کہ ہجرت کے بعد سے آپ کی زندگی کے حالات کو تحریر کریں۔

اہم ترین مسائل جو اس حصہ کتاب میں پیش کئے جائیں گے ان کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا)۔دور و نزدیک کے لوگوں کی مدینہ کی طرف ہجرت

(ب)۔مدینہ میں مسلمانوں کے مرکز قوت کے بارے میں یہودیوں کا ردعمل

(ج)۔آنحضرتؐ کے ساتھ یہودیوں کے مناظرے

(د)۔نصارائے نجران کے ساتھ آنحضرتؐ کے مناظرے

(ھ)۔مشرکین و یہود کے ساتھ آنحضرتؐ کی مقدس لڑائیاں

(و)۔فرائض کی تشریع اور احکام و ذمہ داری کی تعیین

(ز)۔مدنی زندگی میں منافقت کے آثار اور منافقین کی کوششیں

(ح)۔اطراف مدینہ میں مبلغین اور قاریان کی ارسالگی

(ط)۔اطراف عالم اور دنیا کی اہم شخصیات کی طرف سفیروں کی ارسالگی

(ی)۔قبائل عرب کے سرداروں کے ساتھ عہد و پیمان کی تنظیم

(ک)۔عربوں کا قبول اسلام پر غیر متوقع، ہجوم اور اسلامی نمائندگان کی ارسالگی

(ل)۔بقائے اسلام کے لیے رسالت کے اقدامات

یہ بارہ عنوانات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی میں پیش آنے والے، اہم ترین مسائل کی نوعیت کا پتہ دیتے ہیں جن پر درج ذیل دو صورتوں میں تبصرہ کیا جا سکتا ہے:

۱)۔ہر عنوان سے متعلق آیات قرآن مجید۔۔۔۔یہ آیات کریمہ اگرچہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں، تاہم انہیں یکجا کیا جائے اور ہر عنوان سے متعلق مسائل کو ایک جگہ لکھا جائے۔

۲)۔واقعات کو تاریخی صورت میں منظم کیا جائے اور ان کے تحریر کرنے میں کسی خاص فصل و عنوان کی پیروی نہ کی جائے۔کتاب کے سابقہ دو حصوں میں ہم نے تاریخی تسلسل (ولادت سے بعثت اور بعثت سے ہجرت) کو برقرار رکھا ہے۔لہٰذا اس تیسرے حصہ میں ہم نے اسی طریق کار کو قائم رکھتے ہوئے واقعات کو ترتیب تاریخ کے مطابق تحریر کریں گے۔

یہاں ہم ایک اور بات کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ہم اس سے پیشتر منافقین اور منافقت کے بارے میں مفصل تجزیہ اور واقعات پیش کر چکے ہیں۔اس لیے ہم اس حصہ کتاب میں ان تفصیلات کو دہرانا ضروری نہیں سمجھتے۔اگر ضرورت ہوئی تو اس سلسلہ میں ہم اختصار کے ساتھ گزر جائیں گے۔

یاد رہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا قرآن مجید سے استخراج و استنباط آنحضرتؐ کی سوانح عمری کے تجزیہ و تحلیل کی ایک نئی طرز ہے جس کے ذریعے ہم سب آنحضرتؐ کے نورانی و آسمانی خصائل سے، جن کی وحی الٰہی سے وضاحت ہوتی ہے، واقف و آگاہ ہوں گے۔

قرآن مجید جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی حیات اقدس میں جو چیز سب سے پہلے پیش کرتا ہے وہ آنحضرتؐ کی ان مشکلات کا بیان ہے جو مشرکین نے حرام مہینوں میں جنگ کی حرمت کے بارے میں آنحضرتؐ کے راستہ میں پیدا کیں۔انہی مشکلات کو مستشرقین نے اپنا

آلہ کار بنایا۔ ہم سب سے پہلے اسی موضوع پر بحث پیش کرتے ہیں۔

ماہ حرام میں جنگ

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت مبارکہ کے دسویں سال گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی درمیانی شب کو میدان منیٰ میں ''اوس'' اور ''خزرج'' قبائل کے افراد کے ساتھ معاہدہ فرمایا، جس میں طے پایا کہ آنحضرتؐ مدینہ تشریف لے جائیں گے اور یہ دونوں قبائل آنحضرتؐ کی جان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس معاہدہ کے ٹھیک تین ماہ بعد جناب سرور کائناتؐ نے بارہ ربیع الاول کو بروز دوشنبہ، سرزمین قبا کو، جو مدینہ کے مضافات میں واقع ہے، اپنے قدم مبارک سے سرفراز فرمایا۔ اس روز آنحضرتؐ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں تشریف لائے، جو قبیلہ اوس کی ایک شاخ تھی۔ آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے قبل مکہ سے ہجرت کرنے والے کچھ اور لوگ اس قبیلہ میں پہنچ چکے تھے، جن کو قبیلہ والوں نے خوش آمدید کہا تھا۔ آنحضرتؐ کی تشریف آوری کے تین روز بعد یعنی اس ماہ کی پندرہ تاریخ کو حضرت علی علیہ السلام بھی ''فواطم [1]'' کو ساتھ لے کر آنحضرتؐ سے آن ملے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جگہ اپنے چار روزہ قیام کے دوران ایک مسجد کی بنیاد رکھی جس کو مسجد ''قباء'' کہتے ہیں۔ اس کے ایک روز بعد آنحضرتؐ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مسجد کی شان وعظمت معنوی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ قرآن مجید اس کی ان الفاظ میں توصیف فرماتا ہے:

لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا ؕ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ اَحَقُّ اَنۡ تَقُوۡمَ فِيۡهِ ؕ فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

''وہ مسجد جس کی روز اول سے ہی تقویٰ و پرہیزگاری پر بنیاد رکھی گئی، زیادہ حق رکھتی ہے کہ آپ اس میں نماز کے لیے کھڑے ہوں، اس میں ایسے جوان مراد ہیں جو مہذب و پاکیزہ رہنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک وطاہر لوگوں کو دوست رکھتا ہے''۔ (توبہ۔۱۰۸)

مؤرخ یعقوبی لکھتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''بنی عمرو بن عوف'' کے اس مقام کی جلدی سے ترک کردینے کی وجہ یہ ہے کہ اس قبیلہ کے کچھ لوگ ابھی بت پرستی پر قائم تھے جو رات کے وقت آنحضرتؐ کی خواب گاہ پر سنگ باری کرتے تھے، اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے مدینہ پہنچنے کی غرض سے اس مقام کو بہت جلد چھوڑ دیا۔ [2]

---

[1] امتاع الاسماء مقریزی، ص ۴۸

[2] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۳

آنحضرتؐ اپنے دوران سفر جمعہ کے دن قبیلہ ''بنی سالم'' کے محلہ سے گزر رہے تھے کہ آپ کا اونٹ کی مسجد کے سامنے جوانہوں نے آنحضرتؐ کی آمد سے قبل بنا رکھی تھی، زمین پر بیٹھ گیا لہٰذا آنحضرتؐ نے سب سے پہلی نماز جمعہ ایک سو افراد کے ہمراہ اسی مسجد میں ادا فرمائی اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو کتب سیرت میں منقول ہے۔[1]

اس کے بعد آپ اپنے اونٹ پر سوار ہوئے، دونوں قبیلوں (اوس وخزرج) کی ہر شاخ اس بات کی خواہش رکھتی تھی کہ آنحضرتؐ ان کے پاس نزول اجلال فرمائیں لیکن سب لوگ آنحضرتؐ کی طرف سے ایک ہی جواب پاتے تھے جو یہ تھا،''جس جگہ میرا ناقہ خود بخود بیٹھ جائے گا میں وہیں اتروں گا''۔

اتفاقاً آپؐ کا اونٹ حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہاں لوگوں نے آنحضرتؐ کو گھیر لیا۔ ہر شخص اصرار کرتا تھا کہ آنحضرتؐ اس گھر میں سکونت اختیار فرمائیں۔

حضرت ابوایوبؓ کی والدہ محترمہ نے حالات سے فائدہ اٹھایا اور آنحضرتؐ کا سامان اپنے گھر لے گئیں۔ جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو آنحضرتؐ نے اپنے سامان کے بارے میں دریافت فرمایا کہ کہاں ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ اسے والدہ ابوایوبؓ اپنے گھر لے گئی ہیں۔ پس آنحضرتؐ نے فرمایا:''جہاں سامان ہے وہیں ہماری سکونت ہوگی''

اس موقع پر''اسعد بن زرارہ'' نے آنحضرتؐ کے ناقہ کی مہار پکڑی اور ابوایوب کے گھر کی طرف لے گئے۔ ابوایوبؓ کے گھر کی دو منزلیں تھیں۔ آنحضرتؐ نے نچلی منزل کو اپنے لیے منتخب فرمایا کیونکہ یہاں لوگوں سے ملنا جلنا آسان تھا۔

مثلثِ مخالف

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں قیام اس بات کا باعث بنا کہ تمام متفرق و دربدر مسلمان اسی مقام پر جمع ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ ایک سلسلہ واقعات واقعات کا مرکز قرار پائے جن سب کو، یا اکثر کو، کتب تاریخ وسیرت نے منضبط کیا ہے۔ یہ اہم حادثہ ساز عوامل ان امور سے عبارت تھے:

۱)۔ اہل کتاب کی مدینہ، اس کے مضافات اور نجران میں، جو حضاز و یمن کی سرحد پر واقع تھا موجودگی

۲)۔ شرائع آسمانی سے ناواقف دشمن مشرکین کا وجود

۳)۔ دوست نما دشمن یعنی منافقین کو وجود، جو پیچھے سے خنجر گھونپتے تھے

اس کے نتیجہ میں اس علاقہ کے مشرکین کتب سماوی سے دور ہونے اور نظام شرائع سے ناواقف ہونے کی بناء پر اپنے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف تعصب کی بناء پر جنگہائے خونین کی ابتداء کرنے لگے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۲۸۷۔۲۸۷

اس کے ساتھ ہی دوست نما دشمنوں یعنی منافقین کا معاملہ تو واضح ہی تھا کیونکہ یہ لوگ منافقت کے پردہ میں سازشیں کرتے، مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرتے اور مسلمانوں کے خفیہ رموز چوری کرتے رہتے۔

یہ وہ تین عوامل تھے جن کے لیے جناب سرور کائنات ﷺ کے اوقات مدینہ میں مخصوص ہو کر رہ گئے۔ یہی عوامل آنحضرتؐ کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ آپ رسالت کے دیگر اہداف کو مجتمع کر پائیں اس بناء پر جب کبھی آنحضرتؐ کو فراغت نصیب ہوتی تو آپ اپنی رسالت کی دیگر ذمہ داریوں کی طرف توجہ فرماتے، جن میں اہم ترین ذمہ داریوں کو ہم مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا)۔ تعلیم قرآن و احکام و فرائض انفرادی و اجتماعی

(ب)۔ مبلغین و معلمین قرآن مجید کی اطراف و جوانب کو ارسالگی

(ج)۔ سفیروں کے ذریعے اس زمانہ کے سربراہان ممالک اور بزرگ شخصیات کو دین اسلام کی دعوت

(د)۔ قبائل کے ساتھ فوجی، سیاسی اور اقتصادی معاہدوں کا قیام

(ھ)۔ سیاسی وفود جماعات سے ملاقات جو فتح مکہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجوم کرتے تھے، حتیٰ کہ ۹ ھ سال وفود مشہور ہو گیا

(و)۔ کامل اور نمونہ کے انسانوں کی تربیت جو دوسرے مسلمانوں سے مختلف نوعیت کے مالک تھے

(ز)۔ مسلمانوں کی نور ہدایت کے منابع اسلام کے حقیقی نمائندگان کی طرف ہدایت، جن کا خلاصہ لفظ ''عترت'' ہے

(ح)۔ مختلف افراد کے درمیان مسائل حقوقی و اختلافی کا فیصلہ اور دادرسی

ہم ان تمام حوادث و واقعات کو، جو اس دس سال کے عرصہ میں رونما ہوئے اور جن کی اطراف قرآن مجید نے اشارہ فرمایا ہے، یا جن کی تصریح فرمائی ہے، بالترتیب پیش کریں گے۔ ان واقعات کو چھوڑ دیں گے جن کی طرف قرآن کریم نے اشارہ نہیں فرمایا۔ اس کے لیے عذر یہ ہے کہ ہمارا موضوع صرف ''تعارف پیغمبر اسلام ﷺ بزبان قرآن'' ہے۔

قریش کا حربہ مبارزہ

سب سے پہلی جماعت جو جناب رسالت مآب ﷺ نے قرین کی نقل و حرکت کے بارے میں خبریں حاصل کرنے کے لیے ''نخلہ'' (بروزن جرقہ، جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے) کی طرف ارسال کی، وہ ''عبداللہ بن جحش'' کی جماعت تھی۔ آنحضرتؐ نے عبد اللہ بن جحش کو آٹھ آدمیوں پر سردار بنا کر بھیجا، جو سب کے سب مہاجر تھے۔ آپ نے ان لوگوں کے ساتھ ایک خط بھی روانہ فرمایا۔ انہیں حکم دیا کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولیں۔، اس میں مندرجہ احکام پر عمل کریں اور اپنے ساتھیوں کو سفر جاری رکھنے پر مجبور نہ کریں۔

اس جماعت کے سردار عبداللہ بن جحش نے دو روز کے سفر کے بعد مذکورہ خط کو کھولا اور دیکھا کہ آنحضرتؐ نے اس میں حکم دیا تھا کہ ''نخلہ'' کے مقام پر جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے، رک جائیں، قریش کے عقب میں چھپ کر بیٹھیں اور آنحضرتؐ کو قریش کی کارکردگی سے مطلع کریں۔

عبداللہ ابن جحش نے اپنی جماعت کو خط کے مضمون سے آگاہ کیا، انہیں بتایا کہ وہ خود آنحضرتؐ کے حکم کو قبول کرتے ہیں جنہوں نے جماعت کے لوگوں کو مجبور کرنے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا ان میں سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت کا شوق و رغبت رکھتا ہو ان کے ساتھ سفر میں شریک رہے جس کو شہادت کا شوق نہ ہو بے شک واپس چلا جائے۔ سب ساتھیوں نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور نخلہ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھا۔

اس جماعت کا سفر ماہ رجب میں، ہجرت کے ٹھیک پندرہ مارہ بعد، تبدیلی قبلہ کے واقعہ سے پہلے، ہو رہا تھا۔ اس جماعت کے دو افراد کا، جن کے نام سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان ہیں، منزل پر پہنچنے سے پہلے، ایک اضافی اونٹ جو پیچھے پیچھے آتا تھا، گم ہو گیا۔ لہٰذا یہ دونوں اپنے اونٹ کی تلاش میں جماعت سے پیچھے رہ گئے۔ اس طرح عبداللہ کی سربراہی میں صرف چھ شخص اس مقام پر جا اترے۔ جہاں آنحضرتؐ نے جاسوسی قریش کے لیے حکم دیا تھا اور انہوں نے قافلہ ہائے قریش کی آمد و رفت کو نظر میں رکھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک قافلہ ''عمر بن الحضری'' کی قیادت میں اس مقام سے گزر رہا ہے۔ جب جماعت کے قائد اور اس کے ساتھیوں کی نظر اس قافلہ پر پڑی تو وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس قافلہ کے ایک آدمی نے اپنا سر منڈا رکھا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور انہوں نے سوچا کہ ان لوگوں نے اس لیے سر منڈا رکھا ہے کہ یہ عمرہ کر کے واپس آ رہے ہیں، لہٰذا انہوں نے قافلہ سے فطری طور پر کوئی سروکار نہ رکھا۔

اس منظر سے وہ بظاہر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس قافلہ کی نسبت کسی خاص احتیاط کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے سوچا کہ قافلہ والے رات کو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اس مقام کو چھوڑ کر سرزمین حرم میں وارد ہو جائیں گے۔

ان حالات میں یہ جاسوس جماعت آپس میں مشورہ کرنے لگی کہ قافلہ والوں سے، جو چار افراد سے زیادہ نہ تھے، چھیڑ چھاڑ کریں یا نہ کریں۔ آخرکار انہوں نے ارادہ کر لیا کہ قافلہ پر قبضہ کر کے افراد کارواں کو قیدی بنا لیں۔ لیکن اپنے ارادہ کو پورا کرنے میں وہ دو خدشات میں پھنس گئے، سوال یہ تھا کہ جس مقام پر دونوں جماعتیں رکی ہوئی تھیں، اگرچہ سرزمین حرم سے باہر تھی اور کسی خاص احترام کی متقاضی نہ تھی، تاہم موقعہ یہ تھا کہ وہ ماہ رجب کی آخری شب تھی جو حرام مہینوں کا حصہ تھی جس میں جنگ و پیکار کی حرمت عرب کے قدیم مراسم میں سے تھی، اس کے برعکس حملہ میں تاخیر یعنی اگلا دن، ماہ شعبان کا پہلا دن، اگرچہ اس احتیاط سے باہر تھا، اس بات کا سبب ہو سکتا تھا کہ لڑائی حدود حرام میں واقع ہو جبکہ زمین حرم ایک خاص احترام کی حامل تھی۔ مختصر یہ کہ اب وہ اس مشکل میں تھے کہ حملہ کی صورت میں یا تو شب آخر رجب کے احترام کو نظر انداز کریں یا حدود حرم کے احترام کو پامال کریں کیونکہ حملہ میں عجلت ماہ حرام کی حرمت اور تاخیر زمین حرم کی حرمت کے منافی ہو رہی تھی اور حرم بہرحال مقام امن الٰہی ہے۔ آخر انہوں نے اپنے ہی ارادہ کو ہدف بنا کر عملی جامہ پہنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالف قافلہ کا رئیس ''عمرو حضرمی'' وقف تمیمی'' کے تیر کا نشانہ بن گیا، ان کے دو آدمی جن کے نام ''عثمان'' اور ''حاکم'' تھے، گرفتار کر لیے گئے اور ایک شخص ''نوفل'' لڑائی سے بھاگ گیا، عبداللہ بن جحش کی جماعت ضبط شدہ سامان کارواں، جو شیرہ و چمڑے پر مشتمل تھا، وہ قیدیوں کو لے کر مدینہ آن پہنچی اور تمام معاملہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش کر دیا۔

چار محترم مہینے آسمانی احکام کے حامل ہیں

قرآن مجید چار مہینوں (رجب، ذیقعد، ذی الحجہ، اور محرم) کے احترام کی طرف ایک طرح اشارہ فرماتا ہے اور ان مہینوں کی حرمت کو آئین مستقل کا حصہ قرار دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہی ہے، جو خدا کی کتاب میں اس دن سے مقرر ہو چکی ہے جس دن آسمانوں اور زمین کو خلق کیا گیا، ان میں چار حرام مہینے ہیں، یہی دین مستقل ہے، ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو''۔ (توبہ۔۳۶)

''ذالك الدين القيم'' کے جملہ کی ''منها اربعة حرم'' کے جملہ کے بعد موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان چاروں مہینوں کا احترام اللہ تعالیٰ کے مستقل دین کا حصہ ہے، اور یہ پابندی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت قرار پاتی ہے نہ کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے رسم ورواج سے۔

آیہ مبارکہ بظاہر ان چار مہینوں میں تحریم جنگ کے مشہور نظریہ کی تائید نہیں کرتی ۔عرب قبائل ہمیشہ آپس میں مصروف پیکار رہتے تھے۔جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی کھیتی باڑی اور تجارت کے بالکل برباد ہو جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔لہٰذا انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ چار ماہ کے لیے جنگ و پیکار کو بالکل حرام کر دینے کا اعلان کر دیا تا کہ لوگ آزادی سے قبائل کے درمیان آمد و رفت کر سکیں اور آپس میں ان کا رشتہ کاروبار نہ ٹوٹنے پائے۔

اس صورت میں اس رواج کا فروغ پانا عرب قوم ہی کی جانب سے قرار پاتا ہے، یعنی عرب معاشرہ نے آسمانی ہدایت والہام کے بغیر ہی ان چار ماہ میں جنگ و پیکار کو حرام قرار دے رکھا تھا۔حالانکہ آیہ مبارکہ ان مسئلہ کو دین مستقل کا حصہ قرار دیتی ہے جو دین ابراہیمی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ قانون آسمانی اصل وبنیاد پر قائم ہے، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں اقوال ونظریات کو کیسے یکجا کیا جائے؟ بہرحال یہ دونوں اقوال اس طرح یکجا ہو سکتے ہیں کہ عرب قبائل نے اپنی مصلحتوں کی بناء پر ان چار مہینوں کو محترم قرار دے رکھا تھا جبکہ یہی ایک نظریہ دین ابراہیمی کی یادگار کے طور پر باقی تھا۔

ظاہر ہے کہ اسی بناء پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے لوگوں سے زیادہ ان چار مہینوں کے احترام کے محافظ ونگہبان تھے، لہٰذا آنحضرتؐ نے اپنی ارسال کردہ جماعت کی طرف رخ کر کے فرمایا: میں نے تمہیں ماہ حرام میں جنگ کرنے کا ہرگز حکم نہیں دیا تھا، اس لیے میں نہ تو مال

غنیمت قبول کرتا ہوں اور نہ ہی ان دونوں قیدیوں کو"۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ گفتگو آپ کی ارسال کردہ جماعت کے لیے گھبراہٹ کا باعث ہوئی اور انہوں نے سوچا کہ وہ بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خصوصیت کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کی طرف سے حد سے زیادہ ملامت وسرزنش کے مورد قرار پائے۔

اس حادثہ میں قریش کا مفاد

قریش مسلمانوں کے مدینہ میں استقلال سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے، پھر قبائل عرب کے اسلام کی طرف رجحان ومیلان سے وہ اور بھی زیادہ گھبراہٹ ودہشت کا شکار ہو رہے تھے، انہوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اس واقعہ سے پیغمبر اکرم ﷺ کے خلاف فائدہ اٹھائیں گے اور انقلاب اسلام کو زنگ آلود کریں گے۔ مشہور کریں گے کہ محمد (ﷺ) بزرگوں کے رسم ورواج کا احترام نہیں کرتے۔ وہ ماہ حرام میں قتل نفوس، لوگوں کو قید کرنے اور ان کے اموال کو لوٹنے کا حکم دیتے ہیں، انہوں نے اس تہمت کی نشر واشاعت میں مکمل طور پر کوشش اور تگ ودو کی اور مسلمانوں پر شدید انگشت نہائی ونکتہ چینی کی کہ ان کے رہبر نے احترام ماہ حرام کو ختم کر دیا ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس اس کا جواب اس کے سوائے اور اور کچھ نہ تھا کہ یہ واقعہ ماہ شعبان میں رونما ہوا ہے، ماہ رجب میں نہیں۔

مدینہ اور اس کے مضافات کے یہودی مدینہ میں اس تیسری قوت کے قیام سے سخت پریشان تھے۔ وہ لوگ ذہنی کشمکش میں سرگرداں تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کو فال بد تصور کیا۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ بہت جلد ان دونوں جماعتوں یعنی مسلمانوں اور مشرکین کے مابین جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔

دشمن کا شور وغل اور مکہ کے بے خبر دوستوں کی طرف سے دفاع دونوں باتیں حقیقت سے دور تھیں۔ اس بے تنظیمی کا سبب وہ جماعت تھی جس کو صرف قریش کی نقل وحرکت کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن بڑے افسوس ورنج سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے نظم وضبط کی اقدار کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا اور اپنے عظیم رہبر کو معرض اتہام میں قرار دیا۔ جب اس سلسلہ میں بات بڑھی تو حالات کا تقاضا ہوا کہ حرام مہینوں کے احترام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی صراحت پیش کرے اور معترضین کا کسی حد تک جواب مہیا فرمائے۔ اس سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ

اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۝۲۱۷ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓـئِكَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ۝۲۱۸

''ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں آپ سے پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اس (مہینہ) میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے، لیکن راہ خدا سے انحراف اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا، (مسلمانوں کو مسجد الحرام میں آنے سے) روکنا، وہاں کے رہنے والوں کو نکالنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑا (گناہ) ہے، اور فتنہ (ابن حضرمی کے) وقت سے بہت بڑا ہے، مشرکین آپ سے مسلسل آمادۂ پیکار رہتے ہیں تا کہ اگر ان سے ہو سکے تو آپ کو دین سے منحرف کر دیں، تم میں سے جو شخص اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے اور حالت کفر میں مر جائے تو اس کے دنیا و آخرت کے اعمال باطل ہو جائیں گے، وہ اہل دوزخ سے ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا ، وہ رحمت خدا کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔ (بقرہ۔۲۱۷، ۲۱۸)

ان آیات شریفہ میں بعض اہم نکات کی طرف ہم آپ کی توجہ مبذول کرواتے ہیں:

۱)۔ آیہ مجیدہ نہایت وضاحت کے ساتھ حرام مہینوں کے احترام کے لازم ہونے کا اعلان کرتی ہے، اور ان مہینوں میں جنگ وقتال کو بہت بڑا گناہ شمار کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''قل قتالٌ فیه کبیرٌ '' (کہہ دیجئے کہ قتال بہت بڑا گناہ ہے)۔

۲)۔ یاد دلاتی ہے کہ اعتراض کرنے والے مشرکین کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دوسروں کو روکے اور خود کھجوریں کھانے سے نہ رکے، یعنی ماہ حرام میں انہوں نے ایک انسان کے قتل کو بہانہ بنا لیا جبکہ وہ خود بہت بڑے جرائم کے مرتکب ہو چکے ہیں مثلاً:

(ا)۔ ''صدٌّ عن سبیل اللّٰهِ'' راہ خدا سے انحراف اور لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف رجحان کو روکنا۔

(ب)۔ ''والمسجد الحرامِ'' اور مسجد الحرام کا راستہ روکنا اور مسلمانوں کو مسجد میں آنے سے روکنا۔

(د)۔ ''واخراج اهله منه'' اور ساکنان حرم کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے جرم میں حرم سے نکالنا وہ حرم جو تمام انسانوں بلکہ چرند و پرند کے لیے بھی جائے پناہ وامن ہے

(ھ)۔ ''والفتنة اکبر من القتل' ' ایمان لانے والوں کے لیے نامساعد حالات پیدا کرنا، کفر کی طرف لوگوں کو شوق دلانا، حق کے متلاشیوں کو دباؤ میں رکھنا تا کہ وہ بت پرستی کی طرف پلٹ آئیں، ایک انسان کے قتل سے بڑا گناہ ہے۔

بالفاظ دیگر عبداللہ ابن جحش کی جماعت ایک مرتبہ بدنظمی کی مرتکب ہوئی، یعنی انہوں نے ایک شخص کو قتل اور دو افراد کو قید کر لیا اور ان کا

مال بھی چھین لیا۔اس کے نتیجہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقتول کی دیت ادا کر دی اور دونوں قیدیوں کو آزاد بھی کر دیا۔اس کے برعکس مشرکین کی حرکات شمار کر کے دیکھیں ۔وہ لوگ ہمیشہ برے اعمال کے مرتکب ہوئے،لوگوں کو ہدایت پانے سے روکنے،اپنے خدائے حقیقی تعالیٰ کے حرم امن کے ساکنین کو وہاں سے نکال باہر کرتے،کفر کی پرورش اور ایمان کی بہادری کے لیے ماحول فراہم کرتے،اس کے باوجود اپنے آپ کو بے گناہ اور دوسروں کو مجرم گردانتے۔

ایسے موقع پر آیہ مبارکہ کسی قدر مسلمانوں کو خبردار کرتی ہے کہ اگر بعض مسلمان ان حالات میں بھی دین حق سے منحرف ہو جائیں تو ان کے وہ نیک اعمال جو انہوں نے مسلمان رہنے کے دوران انجام دیئے ہوں گے، بیکار و رائیگاں جائیں گے،جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ۔۔۔۔"

۳)۔دوسری آیہ مبارکہ جماعت متجاوزین کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے،وہ یہ کہ پروردگار عالم ان لوگوں کے سابقہ اعمال نیک،ہجرت،جہاد اور ان کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہونے کی بناء پر ان کو مغفرت کا اہل قرار دیتی ہے،جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا

ابن ہشام لکھتا ہے کہ جماعت کا سردار اور اس کے ساتھی اپنے عمل پر نادم ہوئے،جب پہلی آیہ مبارکہ نازل ہوئی تو ان کی ندامت کسی حد تک کم ہوئی،پس اخروی اجر کے لالچ میں انہوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:''ہمیں امید ہے کہ کوئی جنگ درپیش ہو تو ہم مجاہدین کے اجر و ثواب کو حاصل کریں''۔اس موقع پر دوسری آیہ مبارکہ کا نزول ہوا جس میں ان لوگوں کی مغفرت اور بخشش کا ذکر ہوا۔

۴)۔طبرسی کی روایت کے مطابق [۱] جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے''عمرو حضرمی'' کا خون بہا ادا فرما دیا۔قریش نے اپنے دونوں قیدیوں عثمان وحکم کے آزاد کروانے کی غرض سے کچھ رقم آنحضرتؐ کی طرف بھیجی جس کو آنحضرتؐ نے قبول نہ فرمایا۔آپ کو خیال تھا کہ سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہؓ جو اپنے اونٹ کی تلاش میں عبداللہ ابن حجش کی جماعت سے جدا ہو گئے تھے۔وہ قریش کے ہاتھوں قید یا قتل نہ ہو گئے ہوں،جب یہ دونوں مدینہ واپس پہنچ گئے تو قریش کے دونوں قیدیوں کو ارسال کردہ رقم کے عوض آنحضرتؐ نے آزاد فرما دیا۔[۲]

تغیر قبلہ کے مسئلہ پر یہودیوں سے اختلافات

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ تشریف آوری سے ہر چند کہ مشرکین مکہ کے مظالم سے نجات مل گئی اور اوس وخزرج کے جوان شمع

[۱] مجمع البیان،ج ۱ص ۳۱۲۔ ۳۱۳

[۲] سیرۃ ابن ہشام،ج ۲ص ۲۵۵

رسالت کے پروانوں کی طرح آپ کے گرد رہ کر آپ کا دفاع کرتے۔ تاہم مدینہ کے اندر و باہر یہودیوں کی موجودگی آنحضرتؐ کے لیے سب سے بڑی مشکلات میں سے ایک ثابت ہو رہی تھی۔ یہودیوں کی آنحضرتؐ سے دشمنی کی کوئی ایک یا دو وجوہ نہ تھیں بلکہ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک نبوت کا آل اسحاق سے آل اسماعیل میں منتقل ہونا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہودی مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے اقتصادیات پر قابض تھے۔ مدینہ کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج کے کے درمیان اختلافات کے باعث یہودیوں کی سرداری کو استحکام حاصل ہو رہا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرزمین مدینہ تشریف آوری، ان دونوں بڑے قبیلوں میں یگانگت و اتحاد کا استحکام، ایک دین جدید کی بنیاد رکھنے کا عزم جس کو دنیا کے آخری آباد نقطہ تک اپ نے تسلط کو پھیلانا تھا۔ ان سب باتوں نے یہودیوں کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ لہٰذا ظاہری طور پر ان کے علمی اختلافات اور بنی اسرائیل کے مناقشات اس ردعمل کی واضح نشاندہی کرتے تھے۔

یثرب اور اس کے مضافات میں "بنی قینقاع" "بنی النضیر" اور "بنی قریظہ" یہودیوں کے مشہور قبائل تھے، جن میں ہر ایک کو کسی نہ کسی وجہ سے مدینہ سے باہر نکال دیا گیا تھا یا ان کی بیخ کنی کی گئی۔ ہم ان تینوں قبائل سے متعلق قرآن مجید کی آیات کو تاریخی حوادث کی ترتیب سے پیش کریں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاذ شرک کے ساتھ اور محاذ مخالفت کھلنے سے بچنے کے لیے یہودیوں کے ساتھ ایک صلح و مصالحت کا دروازہ کھولنے کی کوشش فرمائی۔ آنحضرتؐ نے مدینہ کے لیے ایک دفاعی لائحہ عمل کے طور پر عرب کے یہودیوں اور اوس و خزرج کی مختلف شاخوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر عہد و پیمان باندھے جن کو ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔ [1]

یہودیوں کی یہ جماعت اسرائیلیوں کی معاشرت سے متاثر ہو کر شرک سے دین یہود کی طرف متوجہ ہوئی اور یہودی بنی تھی۔ انہوں نے یمن کے دو بڑے قبیلوں کی شاخوں "بنی النجار"، "بنی عوف"، "بنی ساعدہ"، "بنی ثعلبہ" اور "بنی اوس" کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرائض تبلیغ کی تکمیل کی خاطر اسرائیلی یہودیوں کے تینوں قبائل "بنی قینقاع"، "بنی النضیر" اور "بنی قریظہ" کے ساتھ الگ الگ معاہدات طے فرمائے، جن کی تفصیل علامہ مجلسی مرحوم نے "بحار" میں تحریر فرمائی ہے۔

بعض ناواقف افراد مؤرخین پہلے معاہدات کو اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ آنحضرت کا معاہدہ تصور کرتے ہیں جب کہ معاہدہ میں موجود یہودی فرق کے نام واضح کرتے ہیں کہ فریق معاہدہ وہ عرب تھے جو یہودی ہو گئے تھے، وہ لوگ نسب کے اعتبار سے یہودی نہیں تھے اور بعد میں دین یہود کی طرف مائل ہوئے تھے۔

یہودیوں کے ساتھ اختلافات

[1] سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۴۸

اور یہودیوں کی جانب سے علمی رکاوٹ

اہل کتاب کے ساتھ قرآن مجید کی گفتگو کا بنیادی طریق کار ملائمت اور قساوت وشدت سے دوری پر منحصر ہے، جس سے مخالفین سے جھگڑے اور دشمنی میں کمی کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اس سے مخالفین قبول حقیقت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں ۔ یہ وہ طریق کار ہے جس کو درج ذیل آیہ مبارکہ وضاحت کے ساتھ بیان فرماتی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ۝۴۶

''اہل کتاب کے ساتھ احسن طریقہ کے علاوہ احتجاج (بحث) نہ کرو، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ظلم کیا ہے، ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ ہم اور تم پر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارا تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم سب اس کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں''۔ (عنکبوت ۔ ۴۶)

آیہ مبارکہ میں غور وخوض کرنے سے ہمیں مباحثہ کی بہترین اقدار کا سبق ملتا ہے اور اس سلسلہ میں دو نمونے پیش کرتا ہے:

ا)۔ دین اسلام شرائع سابقہ اور ادیان قدیم سے کوئی الگ دین نہیں ہے ۔ یہ دین اسی فیض پروردگار کی تکمیل ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور جناب خاتم النبیین ﷺ تک قائم و مستقل رہا ہے ۔ ایک مسلمان کو جس طرح اس چیز پر ایمان رکھنا لازم ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوئی اسی طرح شرائع سابقہ پر ایمان لانا اور سب کو محترم اور شریعت الٰہی تسلیم کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل اور اس پر واجب ہے ، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اٰمَنَّا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ

نیز ایک اور آیہ مجیدہ میں زیادہ واضح صورت میں اس حقیقت کے بارے میں تاکید ہوئی ہے جس سے اسلام کی رسالت کے موضوع پر واقعیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہ آیہ شریفہ شرائع آسمانی کو رحمت معنوی قرار دیتی ہے جو پیغمبر اول کی بعثت سے شروع ہوتی ہے اور پیغمبر آخر کے عہد رسالت تک مستحکم و مستقل چلی آتی ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَاۤ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ

رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''کہہ دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اس پر جو ہم پر نازل ہوا، اور جو ابراہیم واسماعیلؑ اور اسحاقؑ واسباط (انبیائے بنی اسرائیل) پر نازل ہوا۔ اور جو کچھ موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو ان کے پروردگار کی جانب سے عطا ہوا، ہم ان کے درمیان (ایمان وحقانیت کے اعتبار سے) کوئی فرق نہیں رکھتے، جبکہ ہم فرمان حق تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں''۔ (بقرہ۔۱۳۶)

۲)۔ یہودیوں کے ذہن کی نخوت اور نسل پرستی کی ہوس خالی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نبیاد تکوینی کا سہارا لیں جو یہ ہے کہ سب کا خدا و خالق ایک ہی ہے اور سب کے حضور برابر ہیں۔ لہٰذا یہ بات بے معنی ہے کہ ایک نسل دوسری نسل پر مقدم وفائق ہو، سوائے اس کے کہ کوئی کسی طرح کے فضیلت اور کمال حاصل کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا:

وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

بعد والی آیہ مبارکہ میں ایک طرح کی علمی بحث اور فکری مناقشہ انجام پاتا ہے، اور پیغمبر اکرم ﷺ جو یہ دعویٰ فرمارہے تھے کہ قرآن مجید وحی الٰہی ہے، میری استعداد فکر کا نتیجہ نہیں، کی صداقت پر استدلال کرتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور اس سے قبل ہرگز آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، نہ ہی اپنے ہاتھ سے آپ کوئی چیز لکھتے تھے، مبادا کہ وہ لوگ جو آپ کی باتوں کے ابطال کے درپے ہیں اس کی تردید کرنے لگیں''۔ (عنکبوت۔۴۸)

اس آیہ مبارکہ کا مضمون پیغمبر اکرم ﷺ کی بات کی صداقت پر شاہد ہے کیونکہ ایسا شخص جس نے اپنے طول عمر میں نہ کوئی کتاب پڑھی، نہ کچھ لکھا، یکا یک ایک ایسی کتاب لے آتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان اس کے سامنے عاجز وناتواں نظر آتے ہیں؟ فطری طور پر اس کتاب کی دعوت خود اس کی طرف سے ہی قرار نہیں پاسکتی، نہ ہی اس کا نتیجہ فکر ہوسکتی ہے۔

تغییر قبلہ کے سلسلہ میں مستقل مباحثہ

سورۂ مبارکہ ''البقرہ'' کی دس آیات مبارکہ ''۱۴۲ تا ۱۵۱'' میں ایک عملی استدلالی بحث اقدار کے ساتھ انجام پاتی ہے، جو خود اپنے مقام پر ممتاز ہے اور جو یہودان مدینہ کے معاشرہ کے ساتھ سب سے پہلا مباحثہ ہے، یہ مباحثہ تاریخی اعتبار سے آنحضرتؐ کی ہجرت کے سترہ ماہ

بعد واقع ہوا۔ مسلمان واقعات کی تاریخ کا ہجرت کے چند ماہ بعد تک حساب رکھتے تھے۔ اس کے بعد سال ہجری کا قیام واقع ہوا۔

پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں پورے تیرہ (۱۳) سال اور مدینہ میں سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز بجالاتے رہے، اس عرصہ کے بعد بوجوہ، جن کا ہم اب ذکر کریں گے، اس بات پر مامور ہوئے کہ کعبہ یا مسجد الحرام کی جانب رخ کر کے نماز پڑھیں۔ اس سلسلہ میں یہودان مدینہ نے تبدیلی قبلہ سے پہلے یا بعد میں احتجاج وشور وغوغا بلند کیا۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہ لوگ مسلمانوں پر طنز کرتے تھے کہ اگر مسلمان الگ اور مستقل امت ہیں تو یہودیوں کے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کیوں بجالاتے ہیں؟ لیکن جب بعض مصالح کی بناء پر تبدیلی قبلہ کا حکم صادر ہوا، بالخصوص جب کہ آنحضرتؐ نماز ظہر کی دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ جبریل امین نے آنحضرتؐ کا ہاتھ تھاما اور آپ کو کعبہ کی جانب پھیر دیا، تو یہودیوں نے پہلے سے بڑا جھگڑا کھڑا کر دیا اور کہنے لگے کہ کیا وجہ ہے کہ دشمنان قبلہ یہود کو چھوڑ کر نئے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے لگے ہیں؟

قرآن مجید اپنی چند آیات میں دونوں طریق ہائے نماز کا تجزیہ فرماتا ہے، اور منطقی طریقہ پر دونوں صورتوں کو سامنے لاتا ہے۔ اب ہم تمام سوالات اور پہلوؤں کو طبیعی طور پر پیش کر کے آیات قرآن پاک کے ذریعے فراہم کردہ جوابات کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

۱)۔ روز اول ہی سے کعبہ کیوں قبلہ قرار نہ پایا

یہودیوں کا پہلا سوال یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کا قبلہ واقعی کعبہ یا مسجد الحرام تھا تو پھر کیوں مسلمانوں نے روز اول ہی سے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھی؟ اس میں کیا راز مضمر تھا کہ مسلمان ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز بجالاتے رہے اور پھر تقریباً پندرہ برس کے عرصہ دارز کے بعد ان کی نماز کا قبلہ تبدیل ہو گیا؟

۲)۔ عمل سابقہ کا اب کیا بنے گا؟

اب جبکہ قبلہ تبدیل ہو گیا ہے اور واجب قرار پا گیا کہ اس کے بعد مسلمان کعبہ مکہ مکرمہ کی جانب رخ کر کے نماز ادا کریں گے تو لوگوں کے سابقہ اعمال کا کیا حشر ہو گا؟

لطف کی بات یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہودی اعتراض کرنے پر آمادہ ہوں، قرآن مجید پیغمبر اکرم ﷺ کو تبدیلی قبلہ کے بارے میں آگاہ فرما دیتا ہے۔ قبل اس کے کہ یہودی زبان اعتراض دراز کریں، قرآن ان کے اعتراضات کے جوابات پیش فرما دیتا ہے۔ قرآن مجید درج ذیل آیہ مجیدہ میں یہودیوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات تصریحاً اور اشارۃً بیان فرماتا ہے:

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ
قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

''عنقریب کچھ بے وقوف لوگ کہنے لگیں گے کہ کس چیز نے انہیں اس قبلہ سے موڑ دیا جس کی طرف وہ نماز پڑھتے تھے، کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب اللہ ہی کے ہیں اور وہ جس کی چاہتا ہے راہ راست کی جانب ہدایت فرماتا ہے''۔(بقرہ۔۱۴۲)

''مَاوَلّٰھُمۡ ۔۔۔''اس اعتراض کو بیان کرتا ہے جو تھوڑے عرصہ بعد یہودیوں سے سنا گیا۔

''قُل للهِ المشرق۔۔۔'' کا جملہ ایک بنیادی کلیہ پیش کرتا ہے جو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی زمان ومکان سے مبرا و بلند تر ہے، اس عالم کے ہر نقطہ ومقام کی طرف توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کے مترادف ہے۔ اگر کوئی خاص سمت قبلہ کے عنوان سے معین ہوتی ہے تو وہ اجتماعی مصالح کی خاطر ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وجود باری تعالیٰ اس مقام میں محدود ہے۔ لہٰذا بیت المقدس کی طرف نماز کے لیے متوجہ ہونا خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے، اسی طرح کعبہ کی طرف متوجہ ہونا بھی ذات باری تعالیٰ ہی کی جانب متوجہ ہونا قرار پاتا ہے۔

(ب)وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِىۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَآ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ يَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ يَّنۡقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيۡهِ ؕ وَاِنۡ كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴۳﴾

''جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت فرمائی تمہیں ممتاز ونمونہ قرار دیا کہ لوگوں پر شاہد وگواہ بنو اور پیغمبر تم پر گواہ ہوں، (اسی طرح) ہم نے اس کو قبلہ قرار نہیں دیا جس پر تم پہلے تھے، مگر مطیع وفرمانبردار کو ممتاز و جدا کرنے کے لیے مخالفین اور زمانہ جاہلیت کی طرف رجوع کرنے والوں سے، اور خداوند عالم تمہارے ایمان (اعمال) کو ضائع نہیں کرتا، پروردگار عالم اپنے بندوں پر رؤف ومہربان ہے''۔(بقرہ۔۱۴۳)

اس آیہ مجیدہ میں بعض نکات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جن کا تعلق تعدد قبلہ کے مسئلہ سے ہے۔ وہ نکات مختصراً یہ ہیں:

(ا)۔امت اسلامیہ ایک ممتاز اور نمونہ امم۔(امةً وسطًا)

(ب)۔امت اسلامیہ دیگر امم پر شاہد وگواہ۔(لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ)

(ج)۔بیت المقدس کا ایک وقت تک قبلہ قرار پانا اس لیے تھا کہ معاشرہ عرب کے لوگ عام اس سے کہ موحد ہوں یا مشرک، کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے، یا اس کے مقابلہ میں کم از کم بتوں کی خاطر اس طرف سجدہ کرتے تھے، اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آغاز رسالت ہی سے کعبہ کو قبلہ قرار دے دیا جاتا تو موحد ومشرک میں تمیز باقی نہ رہتی، لہٰذا مومن وموحد کو مشرک وبت پرست اور دور جاہلیت کے لوگوں سے الگ کرنے کے لیے

لازم تھا کہ ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر لیا جائے تا کہ مٹھی بھر موحدین مکہ اور اس کے قرب و جوار کے بے شمار مشرکین سے تمیز قرار پائیں اور پہچانے جا سکیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ

(د)۔ آغاز رسالت میں عرب کے متعصب معاشرہ کے پیش نظر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا بہت ہی سنگین و دشوار بات تھی۔ بہت مشکل تھا کہ تمام قبائل عرب کے مورد توجہ مقام سے صرف نظر کر کے یہودیوں کے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ لیکن یہ بات ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے، جو پروردگار عالم کے حضور سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے، بہت آسان تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ [1]

(ھ)۔ یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ کعبہ مکرمہ اگر پہلے دن سے ہی واقعی قبلہ تھا تو ان لوگوں کے اعمال عبادت کا کیا ہوگا جو تبدیل قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور اس تبدیلی سے پہلے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے، مثلاً سعد بن زرارہ جیسے حضرات؟ آیہ مبارکہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتی ہے: ''وما كان الله ليضيع ايمانكم'' یعنی خداوند عالم تمہارے مظاہر ایمان کو جو نماز و تہجد پر مشتمل ہیں، ضائع نہیں فرماتا۔ کیونکہ اجر و ثواب مطیع بندوں کے ساتھ مخصوص ہے اور سزا سرکشوں کے لیے ہے۔ پس اس صورت میں دونوں جماعتیں خواہ انہوں نے قبلہ اول کی طرف نماز پڑھی ہو یا جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف، یا صرف دوسرے قبلہ کی طرف نماز ادا کی ہو یا ادا کرتے ہوں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں برابر ہیں۔ آیہ مجیدہ میں ''ایمان'' سے مراد اعمال صالح ہیں جو تجلیات ایمان میں شمار ہوتے ہیں۔

پیغمبرؐ جو دو قبلوں کی طرف نماز بجالائے

تیسری آیہ مبارکہ میں قرآن مجید یاد دلاتا ہے کہ اہل کتاب اپنی کتب میں پڑھتے تھے کہ پیغمبر آخر دو قبلوں کی جانب نماز ادا کرے گا، اس لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت اور آنحضرتؐ کی نبوت کی مستحق علامات میں سے ایک جو تورات میں پائی جاتی ہے، آپ کا نماز کے لیے

[1] آیہ مبارکہ تفسیر اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ''القبلہ'' سے بیت القدس مراد ہوا اور وہ ''جعلنا'' کا پہلا مفعول ہو۔ چنانچہ اس کا دوسرا مفعول ''التی کنت علیھا'' کا جملہ ہے، گویا اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ''وما جعلنا القبله التی کنت علیھا'' اس صورت میں ''النعلم من یتبع الرسول'' کا جملہ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کے نکتہ کو بیان کرتا ہے جیسا کہ ''ممن ینقلب'' سے مراد عربوں کا وہ متعصب معاشرہ ہے جو ہرگز حاضر نہ تھا کہ کعبہ کے ہوتے ہوئے بیت المقدس کی جانب نماز بجالاتا۔ نیز ''الذین ھدی الله'' سے مراد صدر اسلام کے وہ واقعی مومنین مراد ہیں جن کیلئے فرمان خدا واضح تھا نہ کہ تعصب یہ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح کعبہ کی طرف نماز ادا کرتے تھے۔

بیت المقدس سے کعبہ مکرمہ کی جانب مڑنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''آپ کے چہرہ کا آسمان کی طرف مڑنا، (قبلہ کی تعیین کے لیے حکم خدا کے انتظار میں) ہم دیکھ رہے ہیں، ہم آپ کو اس قبلہ کی جانب موڑ دیں گے جس سے آپ خوش ہوں پس اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلیں، اور تم (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اس سمت کرلیا کرو اور جن کو کتاب دی گئی ہے، جانتے ہیں کہ تبدیلی قبلہ کا حکم صحیح و استوار ہے اور ان کے پروردگار کی جناب سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے''۔ (بقرہ۔ ۱۴۴)

''اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ' کا جملہ حقیقت معنی میں مخالفین کے ساتھ خود ان کی اپنی منطق کے اعتبار سے مناقشہ اور احتجاج کو ظاہر کرتا ہے۔ تبدیلی قبلہ کے سلسلہ میں اہل کتاب کے ساتھ قرآن مجید کا مباحثہ یہاں ختم ہوتا ہے، اگرچہ اس بحث میں آیات کی تعداد ایک سو پچاس تک پہنچتی ہے، تاہم یہاں ہم متذکرہ آیات قرآن مجید پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

تذکرہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات اقدس کے آئندہ حصہ جات میں ہم اپنے اسی سلسلہ کی ساتویں جلد میں پیش کریں گے۔ ہم خداوند بزرگ و عظمت نعماوہ کے حضور درخواست گزار ہیں کہ ''تفسیر موضوعی'' کے طریق پر ہماری اس تفسیر کے جاری رہنے اور ہماری استعانت فرمائے۔

والسلام ـــــــــــــــــــــ جعفر سبحانی۔ قم۔

ترجمہ کتاب بزبان اُردو بروز جمعۃ المبارک بوقت پونے ۹ بجے شب بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ بمطابق 13۔ اکتوبر 1989ء بر مکان سیٹھ نوازش علی صاحب۔ ۸۱۔ ای ماڈل ٹاؤن لاہور بدست سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ